مفردات القرآن (اردو)
تصنیف
امام راغب اصفہانی
ترجمہ وحواشی
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری رحمہ اللہ
جلد اول
اسلامی اکادمی
اردو بازار لاہور۔ فون: ۷۳۵۷۵۸۷-۰۴۲

مفردات القرآن (اردو)

جلد اول

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

شیخ شمس الحق
۲۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

اہتمام: محمد رمضان محمدی، محمد سلیم جلالی

تعداد: 1000

ناشر: .... شیخ شمس الحق

مطبع: .... عرفان افضل پریس

ملنے کا پتہ:

اسلامی اکیڈیمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور

Phone: 042-7357587

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا:

قرآنِ پاک نوع انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے انسانی عقل وفکر کے لیے ہر دور میں رہنما بن سکتا ہے اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیری کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس زبان میں نازل کیا جاتا جو اس وسعت کی متحمل ہو سکے اور اس کے اعجاز بیان کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہ ادعاء نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے فصاحت و بلاغت کے جو زاویے اس زبان میں پنہاں ہیں دوسری سامی اور ایریائی زبانوں کا دامن ان سے یکسر تہی ہے اشتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں۔ محسنات بدیعہ کے خدوخال اور آثار جو اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ دوسری زبانیں ان سے عاری نظر آتی ہیں الغرض عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور دوسری زبانوں پر فائق نظر آتی ہے۔

اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیس و معاجم لکھے گئے ہیں دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا ان معاجم کے ملاحظہ سے عربی زبان کی فراخ دامانی اور جامعیت بخوبی سمجھ آسکتی ہے۔ صحاح جوہری ❶ کو لیجیے کہ وہ چالیس ہزار مواد (Roots) پر مشتمل ہے۔ قاموس فیروز آبادی ❷ میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں، لسان العرب میں ابن منظور افریقی ❸ نے اسّی ہزار مواد سے بحث کی ہے ان کے بعد تاج العروس شرح قاموس ملاحظہ فرمایئے، جس میں سید مرتضٰی زبیدی نے اپنے تتبع سے ایک لاکھ بیس ہزار مواد جمع کر ڈالے ہیں۔ ❹

ان تصریحات کے پیش نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآنِ پاک ایسی جامع کتاب کو، جو ابدی حقائق پر مشتمل ہے، عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیے تھا اور یہی زبان ایسی تھی جو لسانِ وحی کی ترجمان بن سکتی تھی۔ ❺

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے اجمال و تفصیل سے کماحقہٗ آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کے مفہوم و معنی کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے جیسا کہ ابن خلدون اور ان کے بالتبع بعض دوسرے مؤلفین نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ ایسی بات کہنا کسی قوم یا معاشرے کے احوال طبعی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے موجودہ دور ہی کو لیجیے کہ کسی زبان میں جو علمی کتابیں تالیف کی جارہی ہیں کیا اس زبان کے جاننے اور بولنے والے محض اہل زبان ہونے کی بنا پر ان کتابوں کو سمجھ رہے ہیں جب یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے معرفت لسانی کے علاوہ خاص درجہ کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ تو ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ میں جو عام اہل عرب یا صحابہ کرام موجود تھے محض عربی ہونے کی بنا پر خود ہی قرآن سمجھ لیتے تھے اور انہیں کسی معلم یا رہنما کی

---

❶ اسماعیل بن حماد الجوهری المتوفی سنه ۳۳۲ھ یا ۳۹۳ھ.

❷ القاموس المحیط والقابوس الوسیط فیما ذهب من کلام العرب شماطیط لمجد الدین ابی طاهر محمد بن یعقوب بن محمد الشیرازی الفیروز آبادی (۷۲۹ھ ۔ ۸۱٦)

❸ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری (٦۳۰ھ ۔ ۷۱۱)

❹ محمد بن محمد بن عبدالرزاق الحسینی الزبیدی الملقب بمرتضٰی (۱۱٤۵ ۔ ۱۲۰۵ھ)

❺ راجع شرح دیباچه القاموس للعلامه نصر الهورینی، ص ۲۷.

طرف مراجعت کی ضرورت نہ تھی۔

مزید برآں! ہم صحابہؓ میں سے اہل علم حضرات کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن پاک کے بعض الفاظ کے معنی کے ادراک سے عجز کا اظہار فرمایا ہے۔علامہ سیوطیؒ الاتقان میں لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ: ﴿ وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا ﴾ میں " أَبًّا " کے معنی سمجھنے سے عجز کا اعتراف کیا ہے۔ ❶

نیز منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہوکر آیت کریمہ اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ تلاوت فرمائی اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت فرمائے۔اس پر بنی ہذیل سے ایک شخص کھڑا ہوکر کہنے لگا "اس آیت میں "تخوف" بمعنی "تنقص" ہے اور اس پر یہ شاہد پیش کیا۔ ❷

تخوف الرجل منها تامكا قرداً كما تخوف عود النبعة السفن

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں مگر مجاہد رحمہ اللہ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ ﴾ کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا حتی کہ دو اعرابی ایک کنویں کے متعلق نزاع میرے پاس لائے ان میں سے ایک نے اپنے حق ملکیت کے ثبوت میں کہا: ﴿ أَنَا فَطَرْتُهَا ﴾ کہ اس کنویں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا ہے۔یہ کلمہ سن کر میری مشکل حل ہوگئی اور فاطر السمٰوٰت کا صحیح مفہوم میں نے سمجھ لیا۔

صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عدی بن حاتم کا قصہ مشہور ہے جو دلچسپ بھی ہے یعنی کہ جب آیت کریمہ ﴿ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ (البقرہ:۱۸۷) نازل ہوئی تو عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے سیاہ اور سفید دو عقال اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گے تو کھانا پینا بند کردوں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّكَ لَعَرِيْض القفا إِنَّمَا هِيَ سَوَاد الليل وبياض النهار))

کہ......اس سے مراد تو صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی ہے۔ ❸

مندرجہ بالا سطور سے یہ امر بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ صحابہ کرام کو بعض مفرد اور مرکب کلمات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اپنے رفقاء میں سے کسی دوسرے سے دریافت کرتے تھے اور قرآن فہمی میں سب یکساں صلاحیتوں کے مالک نہ تھے، ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں:

عرب قرآن فہمی میں مساوی درجہ پر نہ تھے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے غریب اور متشابہات کا ادراک کرلیتا ہو بلکہ وہ مختلف مدارج کے حامل تھے۔

اسی طرح مسروق کا بیان ہے:

میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجالس میں بیٹھتا رہا اور ان سے مستفید بھی ہوتا رہا، میں نے دیکھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال پانی کے جوہڑ کی ہے بعض جوہڑ وہ ہیں جو پورے علاقہ کی ضروریات کو پورا کررہے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں جن سے بصد مشکل ایک دو آدمی سیر ہوسکتے ہیں۔

---

❶ الجامع الفيض الخير على نهج التيسير، ص ۳۲۔۳۳ بحث ترجمه قرآن۔

❷ ملاحظہ ہو: مقدمه ابن خلدون، ص ۴۸۰۔

❸ المسائل والاجوبه، ص ۸ طبع سعادت مصر ۱۳۴۹.

اس مختصر تمہید سے بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے ہر مقام کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کی ضرورت تھی اور یہ کہ علم وفضل میں سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مساوی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ طبعی اور فطری طور پر ان میں بھی تفاوت درجات موجود تھا اس کے بعد اب ہم ان وسائل ومصادر سے بحث کرتے ہیں جو دور صحابہ میں موجود تھے جن سے بے نیازی دراصل تفسیر بالرأی کا دروازہ کھولتی ہے۔

تتبع اور جستجو سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن فہمی کے چار ذرائع تھے جن سے صحابہ وتابعین مستفید ہوتے رہے اور آج بھی ان ذرائع کی وہی حیثیت حاصل ہے جو اس دور میں سمجھی جاتی تھی۔

(۱) قرآنِ کریم (۲) احادیث نبویہ (۳) اسرائیلیات (۴) آثارِ صحابہ

(۱) قرآنِ کریم نے اپنے اسلوبِ بیان میں اگر ایک مقام پر اجمال سے کام لیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بھی فرمادی ہے اور بعض آیات میں اگر اطلاق یا عموم پایا جاتا ہے تو دوسرے مقامات پر ان کی تقیید وتخصیص بھی موجود ہے اس بنا پر علماء کرام نے لکھا ہے کہ بفحویٰ "القراٰن یفسر بعضہ بعضاً" لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے پہلے قرآن ہی کا مطالعہ کیا جائے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو یکجا کرکے مجموعی حیثیت سے ان پر غور کیا جائے۔علمائے تفسیر نے اس طریقِ تفسیر کو سب سے مقدم اور بہتر قرار دیا ہے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کے لیے سب سے بہتر طریقہ کیا ہوسکتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ❶

اس سلسلے میں اختلاف قراءات کو بھی ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے، صحابہ کرام اور تابعینؒ بعض آیات کو سمجھنے کے لیے اختلاف قراءت سے بھی استفادہ کرتے تھے، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی قراءت بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔حضرت مجاہدؒ بیان فرماتے ہیں:

اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوال ابن عباسؓ سے استفسار کے بغیر ہی حل ہوجاتے۔ ❷

بلکہ بعض علماء نے تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مدارج کے سلسلہ میں اختلاف قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہؓ اور تابعین نے اختیار کیا، مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءتِ متواترہ تو نصوص کی حیثیت رکھتی ہیں ہاں قراءت غیر متواترہ کو تفسیر کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اختلاف قراءت کو غلط رنگ دے کر اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے قراءت کے قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا، حالانکہ نصوص قرآن کا ایک ہی شکل پر ہونا ضروری تھا اور یہ کہ ان قراءت کے موجد صحابہ کرام ہیں مگر یہ تعصب کی ہرزہ سرائی ہے۔اگر یہ لوگ قراءت کی صحت اور اس کی قبولیت کی شرائط پر غور کرلیتے تو کبھی بھی صحابہ کی طرف تساہل کی نسبت نہ کرتے۔

"تفسیر القرآن بالقرآن" کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں ان میں سے ایک تفسیر، امام راغب کی طرف بھی منسوب ہے، جس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

---

❶ تفسیر ابن کثیر: ص ۳. ❷ المذھب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن، ص ؟؟؟؟

((وطرز ہٗ انّہ اوردجُملًا من الآیات ثم فسرھا تفسیراً مشبعًا))

متاخرین میں سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز تفسیر کا اعتناء کیا ہے اور نہایت سہولت سے اسے اپنایا ہے حتیٰ کہ علماء نے ان کی تفسیر کو ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کا منبع قرار دیا ہے ان کی یہ تفسیر نہایت صحیح اور قابلِ اعتماد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ سلفؒ کے مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے اس لیے راقم کو اس تفسیر سے خصوصی شغف ہے اور تفسیری حواشی ''اشرف الفوائد'' میں خاص طور پر اس کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری مرحوم نے بھی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے عربی زبان میں نہایت اہم تفسیر تالیف کی ہے جو گو مختصر ہے لیکن قابل قدر ہے تبویب القرآن وغیرہ بھی اسی قسم میں داخل ہوسکتی ہیں۔

(۲) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں سنت نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ائمہ دین نے سنت کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے قبول کیا ہے آیت کریمہ (نحل، آیت ۴۴) ﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی تبلیغ کے علاوہ اس کی تبیین بھی لازم تھی۔ علماء نے احادیث کو مدون کر کے اس تبیین (تفسیر نبوی) کو محفوظ کر دیا ہے، علمائے بدعت نے اس تفسیر کو رد کر کے گویا ایک طرف تو تفسیر بالرأی کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف سنت کی حجیت کے انکار کی بھی طرح ڈال دی ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لیے اس کو لازم قرار دیا ہے، چنانچہ امام شافعی ''الرسالہ'' میں لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ نے جو فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے سمجھ کر صادر فرمایا ہے۔ ❶

امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں یہاں پر ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنت قرآن کی شارح ہے اور قرآن فہمی کے لیے قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے۔ ❷

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے، مثلاً نمازوں کی تعداد، ان کا طریقِ اداء، احکام نکاح وطلاق اور بیوع وغیرہا معاملات وہ ہیں کہ ان کا بیان سنت ہی سے مل سکتا ہے۔ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

جہاں تک قرآن میں احکام کا ذکر ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں، لہٰذا تفسیر قرآن کے لیے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ ❸

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں پر ایک بہت بڑا اشکال لازم آتا ہے کہ تفسیری روایات اگر مستند اور قابل اعتناء ہوتیں تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے محدث یہ نہ فرماتے۔ ❹

((ثلاثة لیس لھا اصل التفسیر والملاحم والمغازی))

کہ تین قسم کی کتابیں یا روایات بالکل بے بنیاد ہیں یعنی تفسیر، ملاحم اور مغازی۔ مگر خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول سے

---

❶ الرسالہ، رقم ۳۰۳. ❷ مقدمہ تفسیر، ص ۳.
❸ ص ۳۳۔ ❹ موضوعات ملا علی قاری، ص ۸۵.

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پیش نظر خاص قسم کی روایات یا کتابیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

((اما کتب التفسیر فمن اشهرها کتابا الکلبی ومقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اوله الی اخره کذب))

ورنہ تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے تفسیری روایات پر مشتمل ایک صحیفہ کی خود تحسین فرمائی ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی ہے۔ ❶

ایک اہم مبحث:

بعض علمائے تفسیر مرفوع تفسیر کو تو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ صحت کے ساتھ ثابت ہو مگر ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی تفسیر نہایت قلیل ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے احتجاج کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں ❷:

((لم یکن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یفسر شیئًا من القراٰن الا اٰیات تعد۔ علمهن ایاہ جبرئیل))

اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ اس موضوع پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں:

((الذی صح من ذالك قلیل جداً بل اصل المرفوع منه فی غایة القلة))❸

یعنی حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث مناسبہ کو پیش کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر آیات قرآنیہ اور دلائل سے (جو آگے آرہے ہیں) ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے جس طرح صحابہؓ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے اسی طرح ان کے سامنے قرآن کے مطالب و معانی بھی بیان کیے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ سورۂ نحل (آیت ۴۴) میں قرآن کی تبیین کو آنحضرت ﷺ کے فرائض سے قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتبع دوسرے علماء کا بھی یہی رجحان ہے۔ ❹

ابوعبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی سنہ ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عثمان، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ، جو ہمیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے...... کا بیان ہے کہ ''جب ہم آنحضرت ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک ان کے معنی مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملی طور پر اپنا نہ لیتے ان سے تجاوز نہ کرتے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے؛

ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی سیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے تھے۔ مؤطا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ❺:

((انه اقام علی حفظ البقرہ ثمان سنوات))

''کہ انہوں نے سورۂ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے۔''

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

---

❶ الفوز الدهلوی۔ ❷ القرطبی، ج ۱، ص ۳۱، طبری، ص ۲۱

❸ الاتقان، ج ۲، ص ۱۷۹۔

❹ دیکھئے رسالہ اصول تفسیر لابن تیمیه۔

❺ ابن کثیر، ص ۳۔

اور اس بات کو ہم عادۃ باور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مثلاً حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر معنی سمجھنے کے پڑھنا آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہوسکتا ہے مگر صحابہ کرامؓ کے متعلق اس قسم کا تصور بھی بعید ہے، خصوصاً جب کہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق بھی حاصل کرنے پر حریص تھے۔

جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں ان کا حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔ اولاً تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہے جس پر امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبری رحمہ اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

((انه ممن لا يعرف في اهل الآثار))

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرط صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد قرآن کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق مغیبات سے ہے، مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیت الٰہی کے خلاف تھا، جب کہ آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے جواب میں " ما المسئول عنها باعلم من السائل " کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔ نیز امام طبریؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں [1]:

تفسیر چار قسم پر ہے ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی...... تیسری قسم تفسیر کی وہ ہے جسے علماء ہی جان سکتے ہیں (جیسے متشابہات) اور چوتھی قسم وہ ہے جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا ادراک نہیں کرسکتا۔

الغرض قرآن کی تفسیر و تشریح بھی آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث وسنن میں محفوظ ہے اسی بنا پر علماء کرام نے قرآن وسنت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو بھی وحی کا حصہ قرار دیا ہے اور امام اوزاعی رحمہ اللہ، حسان بن عطیہ رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں:

آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی پھر حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کی تفسیر کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔ [2]

یہی امام اوزاعی، مکحول سے روایت کرتے ہیں:

((القراٰن احوج الى السنة من السنة الى القرآن.))

کہ قرآن اپنی تشریحات کے لیے جس قدر سنت کا محتاج ہے، سنت کے مطالب کی وضاحت کے لیے قرآن کی ضرورت نہیں ہے، خود آنحضرت ﷺ نے ﴿ اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ ﴾ فرما کر سنت کے اصل مقام کی وضاحت فرمادی ہے کہ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطورِ نص مذکور نہیں ہیں۔ [3]

۳۔ اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جاہلی عرب اہل کتاب کے عادات واطوار اور لغت عرب کے اوضاع واسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن احوال وظروف میں قرآن نازل ہورہا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے تھے پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گردو پیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی بنا پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

صحابہ کرامؓ قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن پاک ہم سے زیادہ سمجھتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ [4]

---

[1] ص ۲۵ [2] مراسیل ابی داؤد، قرطبی، ج ۱، ص ۳۷۔۳۸۔ [3] قرطبی، ص ۳۹۔ [4] دیکھئے رسالہ امام شافعی۔

اس بنا پر علمائے تفسیر نے قرآن وسنت کے بعد اقوال وآ ثارِ صحابہ کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے۔ان کے اقوال کی بنیاد تین چیزوں پر تھی:

(۱) اسبابِ نزول کی معرفت۔

(۲) توراۃ وانجیل (اسرائیلیات)

(۳) اوضاع لغت کی معرفت۔

اب ہم ان تینوں کی تفسیری حیثیت سے بحث کرتے ہیں، تاکہ ان سے استفادہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر کلی طور پر اعتماد کرکے قطعیت کا حکم لگایا جائے۔

ا۔اسبابِ نزول:

قرآنِ پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے اس کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداءً موعظت وعبرت یا تشریعی احکام کے لیے نازل ہوا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اترا ہے۔علماء نے ان حوادث یا سوالات کو ''اسبابِ نزول'' سے تعبیر کیا ہے۔ [1]

اسبابِ نزول کی معرفت سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے، اس لیے علم تفسیر میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور علماء نے علوم تفسیر پر جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں اسبابِ نزول کے عنوان کو مستقل جگہ دی ہے، بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

((افردہٗ بالتصنیف جماعۃ اقدمھم علی بن المدینی شیخ البخاری رحمہ اللہ.))

''کہ علماء کی ایک جماعت نے اس پر مستقل تالیفات لکھی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تالیف علی بن المدینی رحمہ اللہ کی ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ہیں۔'' [2]

فائدہ:...... امام سیوطی رحمہ اللہ نے بعض دوسری تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد سنہ ۴۲۷ھ) [3] کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا گیا ہے مگر ساتھ ہی ''فیہ اعواز'' لکھ کر طنز بھی کر دی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۸۵۲ھ) کی اسبابِ نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مات عنہ مسودۃ فلم نقف علیہ کاملاً۔'' صاحب کشف نے اس باب میں ابن الجوزی، محمد بن اسعد القرانی اور شیخ ابوجعفر مازندرانی کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔امام سیوطی رحمہ اللہ خود بھی اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

((وَاَلَّفْتُ فِیہ کتابًا حَافِلاً مُوْجِزًا محررًا لم یؤلف مثلُہٗ فی ھٰذَا النوع سمیتہٗ ((لباب النقول فی اسباب النزول.))

بہرحال ''سبب النزول'' کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں تالیف کی ہیں۔شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''الفوز الکبیر'' میں اس کی معرفت کو ''مواضع صعبہ'' سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے، [4] لہٰذا جن علماء نے اس فن کو تاریخی حیثیت دے کر اس کے ''لا طائل'' ہونے کا گمان کیا ہے ان کا یہ موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کذا قال السیوطی فی اتقانہ. [5]

دو گروہ:

بعض علماء نے اس فن کی معرفت کو تفسیر قرآن کا موقوف علیہ قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ واحدی رحمہ اللہ اپنے ''اسباب'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

((لا یمکن معرفۃ تفسیر الآیۃ دون الوقوف علی قصتھا وبیان نزولھا.)) [6]

---

[1] مقدمہ التفسیر، ص ۳.
[2] الاتقان، ج ۱، ص ۲۸۔ ص ۲۸ ایضاً، کشف الظنون، حاجی خلیفہ، ۳.
[3] حاجی خلیفہ سنہ ٤٦٨ھ
[4] ص ۱۔۲۵ سلفیہ لاہور۔
[5] الاتقان، ص ۲۸، ج ۱۔
[6] ص ۳.

اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ بھی اپنے ''لباب'' میں اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر پر اقدام کو حرام قرار دیتے ہیں مگر امام ابن دقیق العید قشیری رحمہ اللہ نے اس فن کی معرفت کو فی الجملہ معاون تسلیم کیا ہے نہ یہ کہ اس کے بغیر تفسیر ہی ممکن نہیں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

((معرفة سبب النزول تعين على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبب.)) ❶

اصل میں صحابہؓ یا تابعین کرام رحمہم اللہ نے جو اسباب نزول بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم پر ہیں، اسباب نزول کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً مغازی یا دوسرے واقعات کہ جب تک تفصیلی واقعات سامنے نہ ہوں متعلقہ آیات میں جو جزئیات مختصراً مذکور ہیں صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتیں اس قسم کے ''اسباب نزول کے متعلق واقعی کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسرِ قرآن کو ان کا جاننا لازم ہے جیسا کہ علامہ واحدی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ لیکن دوسری قسم اسباب نزول کی وہ ہے جسے صحابہؓ یا تابعین کسی آیت کے تحت (نزلت فی کذا یا انزل اللہ قولہ کذا) کے الفاظ سے ذکر کردیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی مناسبت سے محولہ آیات کے تحت ذکر کردیئے جاتے ہیں۔ ورنہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں اس واقعہ کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

((وقد ذكر القدماء المفسرون تلك الحادثة بقصد الاحاطة بالآثار المناسبة للآية او بقصد بيان ما صدق عليه العموم وليس هٰذا القسم من الضروريات.....وكان غرضهم تصوير ما صدقت عليه الآية..... الخ.)) ❷

پہلی قسم کے اسباب نزول میں چونکہ ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بنیاد روایت وسماع پر ہوتی تھی اس بنا پر علماء نے بلا اختلاف اس کو حدیث مسند کا درجہ دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واذا ذكر سببًا نزلت عَقَبَهُ فَانهم كلهم يدخلون مثل هٰذ فى المسند لان مثل ذالك لا يقال بالرأى.)) ❸

اور دوسری قسم یعنی جب کوئی صحابی (نزلت فی کذا) کے الفاظ استعمال کرے، میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد ورائے پر ہے امام حاکم رحمہ اللہ اپنے علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

((اذا اخبر الصحابى الذى شهد الوحى والتنزيل عن آية من القرآن (انها نزلت فى كذا) فانه حديث مسند ومشٰى على هٰذا ابن الصلاح وغيرهٗ۔))

یعنی جب کسی آیت کے متعلق صحابی، جس نے وحی وتنزیل کا مشاہدہ کیا ہو یہ بیان کرے کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ابن الصلاح رحمہ اللہ وغیرہ محدثین کے نزدیک مسند حدیث شمار ہوگی۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل وتوزیع کے قائل ہیں۔ یعنی اگر ان الفاظ سے سبب النزول مراد ہے تو تمام کے نزدیک حدیث مسند میں داخل ہے کما مرّ اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے، گو اس کا سبب نزول نہیں ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں امام بخاری رحمہ اللہ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں مگر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو مسانید میں شامل نہیں کیا، اکثر علماء حدیث وتفسیر کا میلان امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے قول کی طرف ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ❹

---

❶ الاتقان للسيوطى ١/ ٤٨۔ البرهان للزركشى ١/ ٢٢.

❷ الفوز: ٤٤. ❸ منهج الفرقان، ص ٣٩.

❹ ج ١، ص ٣١۔٣٢، الاتقان: ١/ ٣١.

((قد عرف من عادة الصحابة والتابعين ان احدهم اذا قال نزلت هٰذه الآية فى كذا فانه يريد بذالك انها تتضمن هذا الحكم لا ان هٰذا كان السبب فى نزولها فهو من جنس الاستدلال على الحكم بالآية لا من جنس النقل لما وقع.))

الغرض اسباب نزول کے بیان میں صحابہؓ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو خود صحابی کو بھی اپنے بیان پر یقین نہ ہوتا اور وہ (احسب هٰذه الآية نزلت فى كذا) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ ❶ لہٰذا اسباب نزول کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم، صحابہؓ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ واحدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((لا يحل القول فى اسباب نزول الكتاب الا بالرواية والسماع ممن شاهد واالتنزيل ووقفوا على الاسباب وبحثوا عن علمها.))

سلف تو اسباب نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک صحتِ سند کے ساتھ اس کا صحابی سے مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدۃ رحمہ اللہ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ❷

((اتق الله وقل سدادا ، ذهب الذين يعلمون فيما انزل القرآن.))

لیکن اُن کے بعد علماء نے تشدد کو ترک کر کے تساہل سے کام لینا شروع کر دیا، حتی کہ اس سلسلہ میں کذب بیانی کی بھی کچھ پروا نہ کی گئی علامہ واحدی رحمہ اللہ اسی قسم کے علماء پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما اليوم فكل احد يخترع شيئًا ويختلق افكا وكذبا ملقيًا زمامه الى الجهالة ، غير منكر فى الوَعِيدِ للجاهل بسبب الآية))

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متأخرین نے ہر آیت کے تحت شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور رطب و یابس سے تفاسیر کو بھر دیا مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا اور امام طبری رحمہ اللہ جیسے مؤرخ بھی ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اسباب نزول کی روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی حادثہ کا صحت اسناد سے سبب ہونا ثابت نہ ہو جائے اسے قبول نہ کیا جائے اور پھر آیت کے مفہوم کو سبب نزول کے ساتھ مختص نہ کیا جائے بلکہ آیت کے معنی و مفہوم کو عموم پر رکھا جائے علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ❸

''صحیح یہ ہے کہ نظم قرآن کو عموم پر محمول کیا جائے اور اسباب خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے...... کیونکہ صحابہ کرام پیش آمدہ وقائع کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گویا ان کے اسباب نزول خاص تھے۔''

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسباب نزول دو قسم پر ہیں۔ بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو اسباب نزول کے طور پر علمائے تفسیر نے ذکر کر دیئے ہیں مگر نہ وہ درحقیقت اسباب نزول ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کرنے پر آیت کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی صعوبت پیش آتی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے الفوز میں تصریح کی ہے۔

---

❶ الاتقان: ١/ ٣١.　❷ الاتقان: ١/ ٣١.

❸ الاتقان: ١/ ٣١.

روایات اہل کتاب یا اسرائیلیات:

قرآن پاک نے بعض مسائل اور واقعات کے بیان میں توراۃ سے موافقت کی ہے۔اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج اور اسلوب بیان سے گریز کیا ہے اور قصص کی غیر ضروری جزئیات ترک کر کے صرف ان حصوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن کا تعلق عبرت و موعظت سے تھا۔

اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اہل کتاب علماء کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایت بھی لی تاہم نقل و روایت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث ((حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج)) کے تحت جواز کی حد تک ان سے استفادہ کیا اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن و حدیث اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوتیں۔ ❶

جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل کتاب سے روایت نقل کی ہے ان میں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کی مرویات سے ہمارے دعویٰ کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ❷

اسرائیلی روایات اور تابعین:

البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین نے اہل کتاب سے اخذ و روایات میں توسع سے کام لیا چنانچہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اس دور میں مفسرین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب و یابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنا لیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس شغف علمی نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کے خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔حتی کہ دورِ تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔

ایک مفسر کا فریضہ:

اہلِ کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ الفوز میں لکھتے ہیں:

((ان النقل عن بنی اسرائیل وسیلة دخلت فی دیننا))

لہٰذا ایک مفسر پر یہ ذمہ واری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے نقل میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور و فکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل و روایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد ہوں اور پھر سنت سے بھی ثابت ہوں۔ ❸

البتہ جب اس قسم کے خیالات کے بیان میں متقدمین کا اختلاف ہو تو گو ایک شخص مؤلف کی حیثیت سے ان سب کو نقل کر کے ان میں

---

❶ مقدمه اصول تفسیر ابن تیمیه ص ۲٦.

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ "عدالت صحابہ"

❸ دیکھیے روح المعانی ج ۱۵ ص۹۳.

سے صحیح بات کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے ایسے موقع پر اسرائیلیات کو کلیۃً ترک کر کے قرآن پاک پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے جیسا کہ قرآن پاک نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف راہنمائی کی ہے۔❶ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت باریک نکتہ ہے جو طالب علم کے لیے رہنما اُصول کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے:

((انها قد تذكر في القرآن قصة في موضع الاجمال و في موضع بالتفصيل...... فيمكن ان يعلم من التفصيل تفسير الاجمال وينتقل من التفصيل الى الاجمال والله اعلم))

خلاصہ بحث:

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان کی روایت کو بھی جائز سمجھا ہے تاہم ان میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلے میں قبول تو کیا جا سکتا ہے مگر میزان صحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لغت ومحاورات:

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے روشنی نہ پڑتی ہو تو پھر لغت ومحاورات عرب کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((الشعر ديوان العرب فاذا تعاجم علينا شيءٌ من القرآن رجعنا اليه))❷

مگر لغت ومحاورات عرب سے قرآن فہمی ہر ایک کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عربی زبان کا خصوصی ذوق اور اہلیت شرط ہے کیونکہ معاجم وقوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بلا اسناد جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً اشعار وامثال جن کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دیوان العرب قرار دے رہے ہیں علمائے ادبیات جانتے ہیں کہ ان کی نسبت میں اختلاف واختلاط کا بے حد دخل ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی ایسی روایت ہوگی جس پر اعتماد ہو سکے اور پھر محاورات کے بیان میں بھی ان میں باہم اختلاف ہے اور ان علماء نے تشریحات میں عمومی محاورات کو ملحوظ رکھا ہے خاص طور پر الفاظ قرآن کی تشریحات ان کے پیش نظر نہیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عام محاورہ قرآن کے مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہو اور اگر انہوں نے قرآنی الفاظ کو پیش نظر رکھا بھی ہو تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ لوگ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق محاورات عربیہ کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لہٰذا لغت ومحاورہ عرب سے استفادہ کے لیے چند اُمور کی رعایت ضروری ہے:

۱۔ لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے ان معانی کو سامنے پیشِ نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت مفہوم ہوتے تھے اور پھر قوانینِ اعراب و بلاغت سے اس کے ترکیبی معنی پر غور کیا جائے اور سیاق وسباق پر بھی نظر ڈالی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنی مقصود کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لان الكلمة الواحدة تجيء في لغة العرب لِمعان شتى))❸

۲۔ لغت ومحاورہ عرب سے جو تفسیر بھی کی جائے اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی وسیرت کے بھی مطابق ہے

---

❶ الفوز الكبير ص ٤٥-٤٦.

❷ دیکھیے: مقدمہ أصول التفسیر لابن تیمیہ ٢٠.

❸ تفسیر طبری ج١٧ ص ١٢٩ مذاهب التفسير الاسلامي ٨٩-٩٠ الفوز الكبير ص٤٦.

اور آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور تفسیرِ صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کوئی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام تر غور وفکر اور مساعی اس بنا پر بھی ضروری ہیں کہ کتب لغت بہر حال کتب لغت ہیں ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے، وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر صورت قاصر ہیں اور جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے پر تفسیر کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں، اس کا پہلا نمونہ ابوعبیدہ کی مجاز القرآن ہے اور پاک وہند میں جن لوگوں نے تفسیر باللغۃ کی ہے انہوں نے دراصل لغت کا سہارا لے کر مغربی افکار ونظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس طرح پہلے ایک دور میں قرآن کو اسرائیلیات کے لیے تختہ مشق بنانے کی کوشش کی گئی تھی، تفسیر القرآن سرسید اور بُرہان القرآن وغیرہ کی اساس بھی اس قسم کے نظریات پر رکھی گئی ہے اور قرآن جو کتاب ہدایت تھی ان مضحکہ خیز تفاسیر نے اس کی آب وتاب کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں مقاصدِ قرآن کی وضاحت کے لیے سنت نبوی کی طرف رجوع ضروری ہے چنانچہ علامہ طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مفردات القرآن کے معانی معلوم کرنے کے لیے تو لغت کی طرف رجوع ہوسکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارہ کار نہیں۔''

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موارد استعمال کے تتبع سے کسی حد تک صرف مفردات کے حل میں مدد ملتی ہے ورنہ یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت ومحاروات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لیے شواہد تک کو چھان مارا ہے وہ بھی اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوال صحابہ سے بے نیاز نہیں ہو سکے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے، حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کا سہارا ضرور لیتے رہے ہیں ''الکشاف'' زمخشری کے مطالعہ سے ہر صاحب علم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس وقت کے اعتزال اور اس زمانہ کے اعتزال میں نظریاتی اختلاف پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے اسلاف تو اعتزال کے ساتھ صفاتِ علم سے بھی متصف تھے اور معتزلہ کا موجودہ گروہ تدلیس وتلبیس میں تو شاطر نظر آتا ہے مگر صفاتِ علم سے عاری ہے۔

بعض علماء نے شرح غریب القرآن کا خصوصی اعتناء بھی کیا ہے مفردات راغب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس لیے اب ہم ان کتابوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

غریب القرآن پر جن علماء نے خصوصی توجہ دی ہے ان میں سرفہرست حبرِ امت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عطار رحمہ اللہ مقدمہ الصحاح للجوہری میں لکھتے ہیں۔

((وکانوا یستعینون بالشعر وکلام العرب لبیان معانی القرآن .... وکان اوّل اتجاه للعنایة اللغویة هو رغبة دینیة محضة ولهذا نسب الی ابن عباس کتاب غریب القرآن)) [1]

بروکلمن نے ''تاریخ ادب العرب'' میں اس کے بعض خطی نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ [2] اور التفسیر الکبیر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے اس میں علی بن ابی طلحہ اور ابن الکلبی کی روایت سے غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں اور علی بن لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابو صالح کاتب اللیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطہ سے روایت کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کی تحسین کی ہے۔ [3]

ان تفاسیر کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما غریب القرآن کی

---

[1] مقدمۃ الصحاح ص ٤٣۔ [2] ج ١ص ٧٢١۔

[3] فتح الباری ج ٨ص ٣٢٢ الاتفاق للسیوطی ج ٢ص١٨٨۔١٨٩ منه نسخه بمكتبه "شیخ الاسلام معارف حکمت بالمدینة المنورة١٢.

تشریح کے سلسلہ میں شعر اور کلامِ عرب سے استشہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے گو بعض دیگر صحابہ سے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرز پر غریب القرآن کی تشریحات منقول ہو۔ ❶

۳۔ غریب القرآن کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد ابان بن تغلب الجریری ۱۴۱ھ کا نام لیا جاتا ہے جو کہ قاری وفقیہ ہونے کے علاوہ نعت میں بھی عظیم پایہ رکھتے تھے اور علی بن علی بن حسین ابوجعفر اور ابوعبداللہ رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں، استاذ عطار لکھتے ہیں:

((.........سمع من العرب والف غریب القرآن وذکر شواھدہ من الشعر))❷

اور یہ ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم رحمہ اللہ اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے یہ گو تشیع میں غالی تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کے قائل تھے، تاہم رافضی نہ تھے اور پھر روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت لی ہے۔ ❸

ان کے بعد بہت سے علماء نے معانی القرآن، مجاز القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر جمع کیں جن کے نام فہرست ابن الندیم کشف الظنون حاجی خلیفہ اور مفتاح السعادۃ میں مذکور ہیں ان میں حسب ذیل ائمہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء ۲۰۷ھ
۲۔ ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ التیمی ۲۱۰ھ
۳۔ ابوعلی محمد بن المستنیر المعروف بہ قطرب ۲۰۶ھ.
۴۔ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یحییٰ الیزیدی ۲۶۰ھ
۵۔ ابومحمد عبداللہ بن مسلم الدینوری المعروف بہ ابن قتیبہ ۲۷۶ھ
۶۔ ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن السری الزجاج ۳۱۰ھ
۷۔ امام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ

علاوہ ازیں ابوعبید قاسم بن سلام اور ابن ترکمانی نے غریب القرآن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور ابوالمعالی احمد بن علی البغدادی المعروف بابن سمین (۵۹۶ھ) کی مفردات القرآن کے متعلق امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وھو من احسن الکتب المؤلفۃ فی ھذا الشان))

سجستانی کی غریب القرآن حروف معجم کی ترتیب پر ہے اس لیے اس سے اخذ وتناول میں سہولت پائی جاتی ہے حجم کے اعتبار سے تقریباً راغب کی مفردات کے برابر ہے۔ ❹

ابوعبیدہ کے حالات میں مذکور ہے کہ انہوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر تالیف کیں، ❺ ان الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مستقل تین کتابیں تصنیف کی ہیں مگر بعض علماء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تالیف کے تین نام ہیں، مثلاً زبیدی طبقات النحویین میں لکھتے ہیں: ❻

((سألت اباحاتم عن غریب القرآن لابی عبیدہ الذی یقال لہ المجاز))

اسی طرح ابن خیر الاشبیلی الفہرست میں لکھتے ہیں: ❼

---

❶ مقدمہ الصحاح ٤٧.
❷ یاقوت ج١، ص١٠٨ کشف الظنون ج٢، ص١٠٧ طوسی ج٦، ص٤.
❸ ملخص من المیزان للذھبی ص ٦٠٥
❹ کشف الظنون مع حاشیہ کالم ١٢٠٧ـ١٢٠٨.
❺ الفہرست لابن الندیم ص ....
❻ ص ١٢٥.
❼ ١٣٤ ....

((واوّل کتاب جمع فی غریب القرآن ومعانیه کتاب ابی عبیدة معمر بن المثنیٰ هو کتاب المجاز))

علاوہ ازیں مجاز القرآن کے مختلف نسخوں پر نام میں اختلاف ہے جس سے ہماری تائید ہوتی ہے چنانچہ اسماعیل صائب کے نسخہ میں پہلی جزء پر کتاب ''مجاز القرآن'' کا عنوان ہے اور اس کے آخر میں کتاب غریب القرآن ہے اور مراد منلا کے نسخہ میں یہ عنوان ہے ''کتاب المجاز التفسیر غریب القرآن''

ابوعبیدہ کے معاصرین نے ان پر تنقید بھی کی ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ابوعبیدہ میں شعوبیت کے علاوہ خارجیت بھی تھی اور خالص عربی کلام سے قرآن کی تفسیر کے قائل تھے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ تفسیر بالرائی کی طرف مائل تھے اور محدثین وفقہاء اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ فراء (۔۲۱۱) اور اصمعی نے ابوعبیدہ کی مخالفت کی ❶ اور ابو حاتم نے ان کی مجاز القرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زجاج، زہری اور نحاس نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ ❷

مگر اس مخالفت کے باوجود ان کے بعد جن علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ ابو عبیدہ سے بے نیاز نہ ہو سکے۔ ابن قتیبہ نے اپنی ''المشکل'' اور ''الغریب'' دونوں کتابوں میں مجاز القرآن پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں مجاز القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ ❸

امام طبری (......۳۱۰) نے اپنی تفسیر میں ان پر اعتماد تو کیا ہے مگر دوسرے علما کے اقوال وآراء نقل کر کے مناقشہ اور مقارنہ بھی کیا ہے، طبری کے علاوہ ابوعبداللہ الیزیدی الزجاج ابن درید نے ''الجمہرہ'' اور سجستانی نے غریب القرآن میں ان سے نقل کیا ہے اور متاخرین میں سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ہیں جنہوں نے فتح الباری میں کتاب المجاز سے استفادہ کیا ہے۔

ابن قتیبہ کی غریب القرآن جو دراصل ان کی کتاب ''مشکل القرآن'' کا تتمہ ہے جیسا کہ اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے اس موضوع پر اہم کتاب ہے، مؤلف نے اپنی ان دونوں کتابوں میں اہلِ بدعت پر تنقید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔

ابن قتیبہ نے اپنے وقت کے تمام ائمہ سے استفادہ کیا ہے حتی کہ آداب میں جاحظ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی بعض کتابوں کی اجازت بھی حاصل کی، بعض مخالفین نے ان پر تشبیہ اور خارجیت کی تہمت لگائی ہے مگر یہ شدۃ تعصب کی بنا پر ہے ورنہ تو ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کو اہل سنت میں وہی اہمیت حاصل ہے جو جاحظ کو معتزلہ میں حاصل ہے یعنی جاحظ اگر خطیب معتزلہ ہیں تو ان کے مقابلے میں ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت کے خطیب مانے گئے ہیں۔

ان کی مشکل اور غریب کو کنانی نے ''القرطین'' کے نام سے یکجا کر دیا ہے جو مصر میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، امیر قنوجی نے الاکسیر میں ابن قتیبہ کو مفسرین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ کی مفردات اس موضوع پر اہم کتاب ہے، قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں یہ واضح کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ امام راغب رحمہ اللہ کے بعد بھی متاخرین نے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ......تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب'' لابی حیان نحوی (المتوفی ۷۴۵ھ) تراجم الاعاجم تالیف زین المشائخ محمد بن ابو القاسم الخوارزمی (۵۶۲ھ) اور مفردات القرآن سمین حلبی (۷۶۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان سب کتابوں میں مفردات راغب کو جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

---

❶ تاریخ بغداد ۱۳/ ۲۵۵

❷ مقدمہ مجاز القرآن بحوالہ الزبیدی، ص ۱۲۵۔۱۲۶

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ ''امام بخاری رحمہ اللہ اور مجاز القرآن''

مفردات میں راغب رحمہ اللہ نے تقریباً پندرہ سونواسی مواد سے بحث کی ہے قرآن کے بعض مواد متروک بھی ہیں تاہم وہ غیر اہم ہیں۔ مؤلف نے اپنی کتاب کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروف اصلیہ میں سے اوّل حرف کی رعایت کی ہے۔ طریق بیان فلسفیاتی ہے یعنی پہلے ہر مادہ کے جوہری معنی متعین کرتے ہیں پھر قرآن پاک میں مختلف آیات پر اس معنی کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تشریح لغت میں یہ طریق اُصولی حیثیت رکھتا ہے، اُصول لغت پر جن علماء نے تالیفات لکھی ہیں، انہوں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے، تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ لینے سے اس کلمہ کے صحیح معنی سمجھ میں آجاتے ہیں اور سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پھر مؤلف، الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں اشعار ومحاورات اور احادیث کو بھی بطورِ شواہد پیش کرتے ہیں اور بعض علمائے تفسیر ولغت کے اقوال بھی بطورِ تائید پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر وضاحت کے لیے اختلاف قراءات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ اصحاب تفسیر کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہ اللہ جیسے شارحین حدیث بھی امام راغب سے استفادہ کرتے ہیں، حضرت الامیر القنوجی ان کی مفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ومن احسنها المفردات للراغب ....)) ودریں باب اعتماد وجمہور مفسرین بر تحقیقات اوست

اس کتاب کا پورا نام "المفردات فی تحقیق مواد لغات العرب المتعلقة بالقرآن" ہے، مطبوعہ نسخوں پر ''المفردات فی غریب القرآن'' کا عنوان مرقوم ہے، ہم اس کے اُردو ترجمہ کو ''مفردات القرآن'' کے نام سے پیش کر رہے ہیں، عربی ایڈیشن کے چار نسخے مطبوعہ ایران ومصر راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں، طبع کراچی میں بھی مصری نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اتنی بڑی اہم کتاب کا اب تک محقق ایڈیشن شائع نہیں ہوا، ہم یہ دوسرا ایڈیشن پوری تحقیق سے شائع کر رہے ہیں، اور اس کے ترجمہ وتحقیق میں مندرجہ ذیل کو ملحوظ رکھا ہے:

۱۔ بعض اہلِ علم احباب کے مشورہ کے مطابق عموماً لفظی یا حرفی ترجمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم اس میں حتی الوسع سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ ہر آیت کے تحت آیت اور سورۃ کا نمبر دے دیا ہے تاکہ سہولت سے مراجعت ہو سکے، مثلاً (۲۔۲۸) سے ہماری مراد سورۃ نمبر۲ اور آیت نمبر ۲۸ ہے۔

۳۔ آیات کا ترجمہ عموماً مولانا فتح محمد صاحب جالندھری کا ہے لیکن بعض مقامات پر مؤلف کا مقصود ترجمہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ پوری کوشش کی ہے کہ حاشیہ میں احادیث واشعار کی مکمل تخریج آجائے۔

۵۔ کتاب کے متن کی تصحیح میں عموماً تاج العروس اور لسان العرب پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیگر مراجع۔ سے بھی بلا واسطہ استفادہ کی کوشش کی گئی ہے۔

۶۔ ابتداء میں یہ خیال تھا کہ متروکہ مواد کو آخر میں بطورِ ضمیمہ شائع کر دیا جائے مگر عدیم الفرصتی اس میں حائل رہی اور ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا اُمور کی رعایت سے اس اُردو ایڈیشن میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو عربی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کے بعد ''مفردات الحدیث'' کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

امام راغب اصفہانی

امام راغب پانچویں اور چھٹی صدی کے علماء سے شمار ہوتے ہیں، ان کا پورا نام حسین بن محمد بن مفضل بن محمد ہے اور راغب اصفہانی کے

نام سے مشہور ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

((توفی سنة خمس مائة ونیف))

یعنی ۵۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر امام سیوطی رحمہ اللہ ''بغیۃ الوعاۃ'' میں لکھتے ہیں:

((کان فی اوائل المائة الخامسه))

اور امام سیوطی رحمہ اللہ اور ان کے بالتبع طاش کبریٰ زادہ نے ان کا نام فضل بن محمد رحمہ اللہ لکھا ہے، مگر یہ ان کی فروگزاشت ہے، صحیح نام حسین بن محمد ہی ہے اور وفات ۵۰۲ھ ہے۔

تاریخ اخبار البشر کی غلطی:

سید محسن بن الحسینی صاحب ''روضات الجنات' کے حوالہ سے اپنی کتاب اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں:

''صاحب ''تاریخ اخبار البشر'' نے امام راغب کی وفات ۵۶۵ھ نقل کی ہے مگر یہ ان کی فاش غلطی ہے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے خود ہی یہ تصریح کی ہے کہ امام موصوف علامہ جار اللہ زمخشری سے پہلے فوت ہوئے ہیں حالانکہ علامہ رحمہ اللہ کی وفات بالاتفاق ۵۳۸ھ ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام موصوف کا سنہ وفات ۵۶۵ھ ہو۔''

علاوہ ازیں حاجی خلیفہ امام راغب رحمہ اللہ کی کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

((ان الغزالی کان یستصحب کتاب الذریعه))

کہ امام غزالی مؤلف کی کتاب ''الذریعہ'' ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ ہے، لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ امام راغب رحمہ اللہ ان سے پہلے فوت ہوئے ہیں۔

امام راغب رحمہ اللہ کی شخصیت:

مؤلف کی تالیفات خصوصاً مفردات القرآن اور محاضرات الادباء کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف جامع علوم وفنون ہونے کے ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے چنانچہ صاحب ''روضات الجنات'' ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

((الراغب الاصفهانی صاحب لغة العرب والحدیث والشعر والحکمة والکلام وعلوم الاوائل وغیر ذالك و فضله اشهر من ان یوصف وکفاه منقبة قبول العامة والخاصة وفیما تحقق له من اللغة خاصة))[1]

اسی طرح یاقوت معجم الادباء میں لکھتے ہیں:

((احد اعلام العلم بغیر فن من العلوم ادبها وحکمتها له کتاب فی تفسیر القرآن قیل وهو الکبیر))

یعنی موصوف ''کوہ علم'' تھے اور ادب وفلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور انہوں نے قرآن پاک کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔

الغرض موصوف علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے فضل ومرتبہ کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا تذکرہ ''طبقات المفسرین'' میں کیا ہے اور امام سیوطی رحمہ اللہ ان کو لغت ونحو کے ائمہ سے شمار کرتے ہیں، علی بن محمد البیہقی نے اپنے ''تتمہ صوان

---

[1] ص ۲۴۸۔۲۵۵.

الحکمة" میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یاقوت نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہمہ فنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر ولغت کے امام ہونے کے ساتھ بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ اور شیعیت:

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے زمانہ میں جب راقم الحروف کو ایک سلسلے میں مفردات القرآن کا استیعاب سے مطالعہ کا اتفاق ہوا کہ بعض مقامات پر امام راغب رحمہ اللہ ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بجائے نام امیر المؤمنین کے لقب سے ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ غالباً مؤلف شیعہ ہوں گے کیونکہ علمائے شیعہ کی یہ عادت ہے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ نام کی بجائے انہیں امیر المؤمنین لکھتے ہیں مگر یہ خیال کر کے کہ بہت سے علماء واہل سنت بھی ایسے ہیں جو حضرت علی، حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کی بجائے امیر المؤمنین لکھنے والا ضرور شیعہ ہی ہو۔

اب جب کہ مفردات کی اشاعت کے سلسلہ میں مؤلف کے تعارف کے لیے کتب تراجم اور تذکروں کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مسلکاً شیعہ ہونے کی علامت ہی یہی ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے لقب سے یاد کرے جیسا کہ صاحب ''روضات الجنات'' نے تصریح کی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے: ❶

((وهذه آية الفطن))

کہ یہ اس کے ذہین وفطین ہونے کی علامت ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھیے، صاحب ''اعیان الشیعہ'' لکھتے ہیں:

''اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ امام راغب رحمہ اللہ معتزلی تھے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بھی تھے کیونکہ معتزلہ اور شیعہ عموماً اصول میں متحد ہیں اور اصحاب تراجم معتزلہ اور شیعہ کا تذکرہ ایک ساتھ کرتے ہیں۔'' ❷

پھر صاحب روضات لکھتے ہیں:

''ان کی کتاب ''محاضرات الادباء'' کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے وہ کٹر سنی تھے۔''

پھر اس پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں مگر امام کی علمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلکاً سنی شافعی تھے، علامہ سیوطی رحمہ اللہ "بغية الوعاة" میں لکھتے ہیں:

''پہلے پہل میرا گمان یہ تھا کہ امام موصوف معتزلی تھے مگر جب میں نے ''القواعد الصغریٰ'' لابن عبدالسلام کی پشت پر زرکشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا پایا کہ امام فخر الدین رازی نے ''تاسیس التقدیس'' میں تصریح کی ہے کہ امام راغب ائمہ سنت میں سے تھے اور غزالی کے ہم پایہ تو میری یہ بدظنی دُور ہوگئی خصوصاً جب کہ امام رازی جیسی شخصیت ان کی تقدیس کررہی ہے۔'' ❸

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ گو امام موصوف کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے مگر سیوطی رحمہ اللہ کی رائے اور ان کا آخری میلان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف علمائے سنت سے تھے۔صاحب ''روضات الجنات'' کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((كان من الشافعية كما استفيد لنا من محاضراته))

تالیفات:

سید محسن نے ''اعیان الشیعہ'' میں اور بروکلمن نے تاریخ ادب العرب میں ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کل دس کتابوں کا تذکرہ

❶ ص ۲٤۸. ❷ ص ۲٤۸. ❸ جزء ۲۷ ، ص ۲۲۱، اعيان الشيعه.

کیا ہے جوحسب ذیل ہیں:

(۱) محاضرات الادباء: ...... یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور ۱۵۰۲ھ میں ابراہیم بن زیدان کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا ہے، یہ کتاب عجائب وغرائب سے پر ہے اور نہایت دلچسپ۔خوانشاری نے اسی کتاب کی بنا پر ان کے سنی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

(۳) حل متشابہات القرآن: ......نام سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے متشابہات پر سیر حاصل بحث کی ہوگی اس موضوع پر شیعہ علماء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن علمائے سنت نے عموماً اہل بدعت کی تردید کی غرض سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔

(٤) الذریعہ الی مکارم الشریعہ: ......اخلاق ناصری کی طرز پر فارسی میں ہے اس میں مؤلف نے کلیلہ ودمنہ سے بہت سی حکامات نقل کی ہیں اور عجیب وغریب اشعار نقل کیے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

زِصد ہزار محمد کہ درجہاں آید | یکے بمنزلۂ جاہِ مصطفیٰ نشود!
وگرچہ عرصۂ عالم ہزار علیؓ گردد | یکے بعلم و سخاوت بہ مرتضیٰ نشود
جہاں گرچہ زِموسیٰ وچوب خالی نیست | یکے کلیم نہ گردد یکے عصا نشود

(۵) درۃ التاویل فی غرۃ التنزیل: ......اس کتاب میں مؤلف نے آیات کے تکرار کی حکمت اور متشابہات کے رموز بیان فرمائے ہیں، مفردات میں بعض مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ذکر انه صنفه بعد ما عمل کتاب المعانی الاکبر و املیٰ کتاب کتاب احتجاج القراء))

(٦) تحقیق البیان فی تاویل القرآن: ......مصنف نے اپنی کتاب الذریعہ کے دیباچہ میں اس تالیف کا نام لیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کے تحت امام سیوطی رحمہ اللہ کے طبقات النحاۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفردات القرآن ہی کا دوسرا نام ہے۔لیکن علماء نے الگ تالیف کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) افانین البلاغۃ: ......صاحبِ کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) کتاب الایمان والکفر: ......عجیب وغریب طرز پر لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اصول میں اشعری تھے۔

(۹) تفصیل النشأتین: ......یہ کتاب پہلے ۱۳۱۹ھ میں بیروت سے شائع ہوئی، پھر امرتسر سے اُردو ترجمہ کے ساتھ دو کالموں میں اس کا خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۱۰) المفردات فی غریب القرآن: ......جس کا اُردو ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔

(۱۱) کتاب المعانی الاکبر **(۱۲) کتاب احتجاج القراء**

هٰذَا آخر ما اَرَدْنَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

محمد عبدہ الفلاح

قاسم منزل حاجی آباد لائل پور ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

❀❀❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلٰوتُهٗ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ اَجْمَعِيْنَ))

اما بعد ...... بندۂ ناچیز شیخ ابو القاسم حسین بن محمد بن افضل الراغب (خدا اس پر رحم فرمائے) درگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے انوار قدسیہ سے نور ایمان عطا فرمائے جس کے ذریعہ ہم خیر وشر کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں اور حق و باطل میں کما حقہ تمیز کر سکیں حتیٰ کہ اس پسندیدہ گروہ میں شامل ہو جائیں جن کا نور ایمان قیامت کے دن ان کے سامنے اور دائیں طرف سے ضوء افشانی کرتا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۔۴۸)

''وہ ذات ہے جس نے مومنین کے دلوں میں طمانیت اور تسلی نازل فرمائی۔''

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸۔۲۲)

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو راسخ کر دیا اور ان کی روحانی تائید فرمائی ہے۔''

قبل ازیں ہم اپنی کتاب ''الرسالۃ المنبھۃ علی فوائد القرآن'' میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اور دین اسلام کو تمام ادیان کا ناسخ اور اسے ہر پہلو سے جامع و مکمل بنایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۵۔۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور بحیثیت دین تمہارے لیے اسلام پسند کیا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پاک میں تمام سابقہ کتب سماویہ کے مطالب ومضامین کا نچوڑ اور خلاصہ جمع کر دیا ہے چنانچہ قرآن پاک کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ (البلد)

''وہ (نبی کریم) پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جس میں سیدھے (اور دین کو قائم رکھنے والے) نوشتے ہیں۔''

اور اس نے قرآن پاک کو یہ اعجاز بخشا ہے کہ ضخامت وحجم میں مختصر ہوتے ہوئے بھی معنوی عظمت اور مضامین کی وسعت کے لحاظ سے وہ اتھاہ سمندر ہے کہ انسانی عقل وفراست ان کے ادراک سے عاجز ہے اور اس کائنات کے اسباب ووسائل اس کے مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں، چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (۳۱۔۲۷)

''اور زمین کے جتنے بھی درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سات گنا بڑھ جائیں، ان سے سیاہی کا کام لیا

جائے تو بھی اللہ کے کلمات ختم ہونے کے نہیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

ہم نے اپنی کتاب "الذریعة الی مکارم الشریعة" میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن پاک کے انوار و برکات سے ہر شخص اپنی (علمی و روحانی) استعداد کے مطابق روشنی حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس کی تلاوت سے بقدر ظرف مستفید ہوسکتا ہے، اس لیے کہ بقول: ❶

(۱) كَالْبَدْرِ مِنْ حَيْثُ الْتَفَتَّ رَأَيْتَهُ ۔۔۔ يُهْدِي إِلَى عَيْنَيْكَ نُوْرًا ثَاقِبًا

(۲) كَالشَّمْسِ فِيْ كَبِدِ السماء وَضَوءُهَا ۔۔۔ يَغْشَى الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

"اس کی مثال ماہ کامل کی ہے جس پہلو سے بھی اس کی جانب دیکھو گے وہ تمہاری آنکھوں کو نور اور بینائی بخشے گا دیا، سورج کی مانند ہے جو وسط آسمان میں نمودار ہوتا ہے، مگر اس کی روشنی مشرق و مغرب تک پھیلی ہوتی ہے۔"

لیکن اس کے محاسن انوار سے صرف اصحاب بصیرت ہی مستنیر ہو سکتے ہیں اور اس کے پاکیزہ معانی اور مطالب سے پاک باز اور برگزیدہ نفوس ہی فیض یاب ہوتے ہیں اور اس کے اکسیری نسخوں سے صرف پاکیزہ طبائع ہی شفایاب ہوسکتی ہیں چنانچہ قرآن پاک نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ:

﴿إِنَّهُ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَا يَمَسُّهٗٓ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝﴾ (۵۶۔۷۷،۷۸،۷۹)

"یقیناً یہ ایک باعزت کتاب مکنون میں محفوظ ہے صرف پاک باز اور صالح لوگ ہی اس کے حقائق (ومعارف) تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔"

نیز اس کے سامعین کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى﴾ (۴۱۔۴۴)

"آپ کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن پاک) ایمان والوں کے لیے ہدایت و شفا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں پر گر انبار گزرتا ہے اور ان پر اس کے معانی مخفی رکھے جاتے ہیں۔"

اور اپنے رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس طرح خیر و برکت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر اور کتا موجود ہو اسی طرح بصیرت افروز اور اطمینان بخش کیفیت اس دل میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی جو حرص اور کبر و نخوت سے بھر چکا ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿الْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ (۲۴۔۲۶)

"ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور (اس طرح) پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاک باز مرد پاکباز عورتوں کے لئے۔"

نیز اپنی کتاب میں ہم نے اس زاد راہ کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں جن کے ذریعہ انسان امکانی حد تک علوم و معارف میں بلند مقام حاصل کرسکتا ہے اور کتاب الٰہی کی مدد سے آسمان و زمین کے رازہائے سربستہ پر آگاہ ہوجاتا ہے اور پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ اپنے کلام کی توصیف میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۶:۳۸) کہ ہم نے الکتاب

❶ قاله المتنبي في مدح سيف الدولة والبيت في ديوانه (۲۰۰۱) بشرح العكبري ومجموعة المعاني والاتقان للسيوطي ۱۲۸/۲ و بينهما ثالث كالبحر يقذف للقريب جواهراً جوداً و يبعث للبعيد سحائباً.

میں کسی چیز (کے ذکر کرنے) میں کوتاہی نہیں برتی ۔ بالکل صحیح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کی ہدایت کا اس نے ذمہ لیا ہے اور ان کی رفاقت میں بلند مرتبہ اور عالی مقام پر فائز فرمائے اس لئے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب نہ ہو اسے کوئی بھی راہ راست پر نہیں لاسکتا چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۵۶:۲۸)

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔''

ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کردی ہے کہ علوم قرآن میں سب سے پہلے ان علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں سب سے پہلے مفرد الفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہٰذا قرآن کے مطالب ومعانی کی تحقیق کے لئے مفردات قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لئے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لیے کہ قرآن مجید کے کے مستعمل الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لب لباب اور مغز ہیں احکام ومسائل اور حِکم ومصالح کے استنباط میں فقہاء اور حکماء نے انہی الفاظ کو مبنی قرار دیا ہے اور شعروسخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔قرآن کے استعمال کردہ مواد اور ان کے مشتقات کے علاوہ جو الفاظ بھی عربی زبان میں مستعمل ہیں ان کی حیثیت قرآن کے مستعمل الفاظ کے مقابلہ میں وہی ہے جو مغز اور رس کے مقابلہ میں گٹھلی اور چھلکے کو حاصل ہے۔

چنانچہ مفردات قرآن کو حرف ہجا کی ترتیب پر ایک جامع کتاب کی شکل میں تالیف کیلئے میں نے خدا کے حضور استخارہ کیا اس کتاب کی ترتیب میں ہم سب سے پہلے وہ کلمات لکھیں گے جن کے شروع میں الف آتا ہے اور پھر وہ جو حرف باؤ سے شروع ہوتے ہیں اس طرح پوری کتاب میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی اس ترتیب میں ہم زوائد کو نظر انداز کر کے حروف اصلی (مادوں) کو پیش نظر رکھیں گے اسی طرح اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ان تعلقات کو بھی زیر بحث لایا جائے جو مستعار الفاظ اور ان کے مشتقات میں پائے جاتے ہیں اور الفاظ کے تعلقات کے متعلق اصول وقواعد اور ان کی تحقیق کو کسی دوسری کتاب میں زیر بحث لائیں گے جو مستقل اسی موضوع پر لکھی جائے گی اور جس کا ہم جابجا حوالہ بھی دیتے جائیں گے۔

اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہم نے سپرد قلم کیا ہے اس پر کلی اعتماد کر لینے سے تمام وہ دشواریاں دور ہوجاتی ہیں جو مسابقت الی الخیر کی راہ میں حائل ہوسکتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۲۱:۵۷) (اپنے رب کی بخشش حاصل کرنے کے لیئے مسابقت کرو) کے فرمان سے ترغیب دی ہے۔خدائے عزوجل ہمارے لئے اس راہ پر گامزن ہونا آسان فرمائے۔

انشاء اللہ بشرط زندگی اس کے بعد ایک ایسی جامع کتاب کی پیشکش کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں الفاظ مترادف کی تحقیق اور ان کے معانی میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے بالوضاحت بیان کیا جائے گا۔جس سے کہ قرآن مجید کے ایک ہی مضمون میں استعمال کردہ مختلف الفاظ،مثلاً ایک جگہ قَلْبٌ دوسرے موقع پر فُؤَادٌ اور تیسرے مقام پر صَدْرٌ کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے......کی توجیہ معلوم ہوسکے گی اسی طرح وہاں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ایک ہی قصہ کے خاتمے پر قرآن مجید میں ایک جگہ پر ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۹:۱۶) ارشاد ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (۲۱:۳۰) اسی طرح تیسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ (۲۴:۳۰) اور کہیں پر ﴿لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ﴾ مذکور ہے۔تو اس میں کون سی لطافت پائی جاتی ہے۔علیٰ ہذا القیاس۔قرآن میں ﴿لِّاُولِي الْاَبْصَارِ لِذِيْ حِجْرٍ﴾ اور ﴿لِّاُولِي النُّهٰى﴾ وغیرہ کلمات جو مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں اور انھیں دیکھ کر سطحی اور ظاہر بین حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔اور وہ انہیں مترادف الفاظ قرار دے کر بزعم خود سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کی تفسیر ﴿الشکر لِلّٰهِ﴾ یا ﴿لا

رَیْبَ﴾ کی تفسیر لاشک سے بیان کرکے بس قرآنِ مجید کی تفسیر کا پورا پورا حق ادا کردیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے ہماری رہنمائی فرمائے اور خلوص ہمارے شامل حال رہے اور جو علم ہمیں بخشا ہے اس کے ذریعہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور اسے ہمارے زادِ آخرت بنائے جس کے لیے ہمیں بدیں الفاظ تاکید فرمائی ہے۔ ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ (۲:۱۹۷) اور زادِراہ تیار کرو اور بہترین زادِراہ تقویٰ ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ نِعْمَ الْوَكِيْل﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا

کتاب الھمزۃ

أ: الف بامعنی کی تین قسمیں ہیں۔ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(۱) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔اس کی چند قسمیں ہیں:

(۱) الف اْلاِسْتِخْبَار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام و انکار نفی، تبکیت، (زجر و توبیخ) تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (۲:۳۰) (انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور تبکیت ❶ یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اوّل کے متعلق) فرمایا: (۱) ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ﴾ (۴۶:۲۰) تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(۲) ﴿اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ (۲:۸۰) کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) ﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ (۱۰:۹۱) کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟ اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

(۴) ﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا﴾ (۱۰:۲) کیا لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے؟

(۵) ﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾ ❷ (۳:۱۴۴) تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(۶) ﴿اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ﴾ (۲۱:۳۴) بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

(۷) ﴿آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (۶:۱۴۴) بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادوں کو۔

اور معنی تسویۃ ❸ میں فرمایا: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَا

---

❶ ھو شامل للانکار التوبیخی والابطالی وھما قسمان متقابلان معنی الاوّل ان ما بعد الھمزۃ واقع و ان فاعلہ معلوم کما یظھر من الامثلہ ۱، ۳، ۴ و معنی الثانی ان ما بعد الھمزۃ لم یقع و ان مدعیہ کاذب کمایظھر من ۲، ۵، ۶، ۷۔

❷ انقلبتم علی اعقابکم و بہ یتم المثال۔

❸ ولیکن علی ذکر منک ان الھمزۃ التی تدخل علی جملۃ یصح حلول المصدر محلھا یقال لہ ھمزۃ التسویۃ ولا یلزم ان یکون بعد کلمۃ "سواء کمال توھم نحو ما ابالی اقمت ام قعدت نعم لم یرد فی القرآن الابعد کلمۃ "سواءٌ" رضی علی الکافیۃ ج۲ ص۲۷۵ ذذ بعد سواء او جملۃ لا ابالی۔

اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۲۱:۱۴)اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۶:۲)تم خواہ انہیں نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اَخَرَجَ (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلامِ منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے۔ [1] چنانچہ فرمایا:

﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (۷۔۱۷۲) کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ (یعنی ضرور ہوں)

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾ (۹۵۔۸) کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ یعنی ضرور ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ﴾ (۱۳۔۴۱) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں؟

﴿اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ﴾ (۲۰۔۱۳۳) کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

﴿اَوَلَا يَرَوْنَ﴾ (۹۔۱۲۶) اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ﴾ (۹۔۱۲۶)اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی؟

(۲) الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور ''میں'' کے معنی رکھتا ہے جیسے اَسْمَعُ وَاَبْصُرُ یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

(۳) ہمزۂ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا: ﴿اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (۶۶۔۱۱) اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

(۴) الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لیے آیا ہے جیسے فرمایا اَلْعَالَمِيْنَ (۱۔۱) تمام جہانوں۔

(۵) الف نداء جیسے أَزَيْدُ (اے زید) [2]

(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے، (مثلاً رَجُلَانِ) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے، مثلاً مُسْلِمَاتٍ وَمَسَاكِيْنَ

(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لیے ہوتا ہے جیسے حُبْلٰى اور بَيْضَآءُ میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں ضمیر کے لیے جیسا کہ اِذْهَبَا میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے، جیسے ﴿وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا﴾ (۳۳۔۱۰) ﴿فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾ (۳۳۔۶۷) تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لیے آخر میں بڑھا دیا

---

[1] ولهذا عطف المثبت على المنفى فى سورة الانشراح (۱۔۲) والضحى (۶۔۷) والفيل (۲۔۳) والمعانى الهمزة غير الاستفهام راجع امالى الشجريه (۶۴ ۲+ ۲۶۸).

[2] ليس فى التنزيل نداء بغيرياء الاما قال الفراء فى الاية اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ (۳۹۔ ۱۰) ان الهمزة فيه للنداء خلافا للجمهور ولجوازه وجوه انظر المغنى لابن هشام ج ۱، ص ۵.

جاتا ہے (جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف اشباع بڑھادیتے ہیں۔)

ا ب ب

اَلْاَبُّ: اس گھاس کو کہتے ہیں جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لیے بالکل تیار ہو یہ اَبَّ لِکَذَا اَبًّا وَاَبَابَةً وَاَبَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی کوئی کام کرنے کے لیے تیار ہوجانا کے ہیں، جیسے محاورہ ہے۔ اَبَّ اِلٰی وَطَنِہٖ وطن کا مشتاق ہوکر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔اَبَّ لِسَیْفِہٖ تلوار سونتنے کو مستعد ہوجانا اور اسی سے اِبَّانُ ذٰلِكَ کی ترکیب ہے جس میں اِبَّانَ بروزن فِعْلَانَ ہے، ❶ یعنی وہ زمانہ جو کسی کام کرنے کے لیے بالکل مناسب ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (۸۰۔۳۱) اور میوے اور چارہ۔

ا ب د

اَلْاَبَدُ: ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں۔ جس کے لفظ زمان کی طرح ٹکڑے نہ کیے جاسکیں۔یعنی جس طرح زَمَانَ كَذَا (فلاں زمانہ) کہا جاسکتا ہے اَبَدُ كَذَا نہیں بولتے، اس لحاظ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بننا چاہیے۔اس لیے کہ اَبَدٌ تو ایک ہی مسلسل جاری رہنے والی مدت کا نام ہے جس کے متوازی اس جیسی کسی مدت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ اسے ملا کر اس کا تثنیہ بنایا جائے۔قرآن میں ہے: ❷

﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾ (۹۸۔۱۱) وہ ابدالاباد ان میں رہیں گے۔

لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت کے معنی میں لے کر اٰبَادٌ اس کی جمع بنالیتے ہیں جیسا کہ اسم جنس کو بعض افراد کے لیے مختص کرکے اس کا تثنیہ اور جمع بنالیا جاتا ہے بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ اٰبَادٌ جمع مُوَلَّدْ ہے۔خالص عرب کے کلام میں اس کا نشان نہیں ملتا اور اَبَدُ اَبِيْدِ وَاَبَدُ اَبِيْدِ (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) میں دوسرا لفظ محض تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔تَاَبَّدَا الشَّیْءُ کے اصل معنی تو کسی چیز کے ہمیشہ رہنے کے ہیں مگر کبھی عرصہ دراز تک باقی رہنا مراد ہوتا ہے۔اَلْاٰبِدَةُ وحشی گائے والجمع اوابد (وحشی جانور تَاَبَّدَ الْبَعِيْرُ (وابد) اونٹ بدک کر وحشی جانور کی طرح بھاگ گیا۔تَاَبَّدَ وَجْهُ فُلَانٍ وَاَبِدَ (اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے) بعض کے نزدیک اس کے معنی غضب ناک ہونا بھی آتے ہیں۔ ❸

ا ب ق

ابق (س ص) اَلْعَبْدُ اَبَاقًا۔ غلام بھاگ گیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۳۷۔۱۰۴) جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے آبِقٌ (صفت فاعلی) بھاگا ہوا غلام والجمع

❶ وعند البعض وزن فِعّال: النون اصلية ...... اللسان والنهاية (ابن)

❷ وفی حديث الحج أَلِعَامِنَا هٰذَا اَمْ لِاَبَدٍ قَالَ بَلْ لِاَبَدِ اَبَدٍ اللسان (ابد).

❸ قال فی اللسان وأَبِدَ عليه اَبَدًا غضب وفی اتباع فی الغيب (ص ۱۱) عَبِدَ عليه وأَبِدَ وهما واحد غضب عليه فهما ای العين والهمزة من الابدال والمزدوج وجمع ايضًا الابدال لابی الطيب ج: ص ۱۰، ۶۱ والنوادر لابی سهل ۷۸۔۱۸۷.

أُبَـاق۔ تَـأَبَّقَ الرجل۔ وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح چھپ گیا اور شاعر کے قول ❶

(۳) قد أُحْكِمَتْ حَكَمَاتُ الْقَدِّ وَالْاَبَقَا

''ان گھوڑوں کے چمڑے کے تسمے اور جوٹ کی کنپٹیاں کسی ہوئی ہیں۔''

میں بعض نے کہا ہے کہ اَبَـقٌ کے معنی جوٹ یا اس کی رسی کے ہیں۔

ا ب ل

اَلْاِبِلُ۔ اونٹ کا گلہ۔اس کا واحد اس مادہ سے نہیں آتا قرآن میں ہے: ﴿وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۴) اور دو انٹوں میں سے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اَفَلَا يَـنْـظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُـلِـقَـتْ﴾ (۸۸۔۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ اِبِلٌ بمعنی سحاب ہے یہ قول صرف معنی تشبیہ کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ کثرت اسفار میں بادل اور اونٹ میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ❷

اَبَـلَ الْوحشی ابولا واَبِلَ اَبَلاً۔وحشی جانور کا اونٹ کی طرح پانی سے بے نیاز ہونا۔تَـأَبَّلَ الرجل عـن امـرءتـہ۔عورت سے مقاربت ترک کرنا اَبَّـلَ الرجل۔ بہت اونٹوں والا فلاں لا يأبل فلاں اونٹ پر جم کر سوار نہیں ہوسکتا۔رجـلٌ اٰبِلٌ واَبِلٌ اونٹوں کا اچھی طرح انتظام کرنے والا ابـل مـؤبَّـلَة اکٹھے کیے ہوئے اونٹ الاِبَّالة۔لکڑیوں کا گٹھا۔ ❸ اور آیت کریمہ: ﴿وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ (۱۰۵۔۳) میں اَبَابِيل کے معنی یہ ہیں کہ ان پر پرندے اونٹوں کی مختلف ٹکڑیوں کی طرح قطار در قطار بھیجے گئے اور ابابیل کا واحد اِبِّيْلٌ ہے۔ ❹

ا ب و

اَلْاَبُ۔اس کے اصل معنی تو والد کے ہیں (مجازاً) ہر اُس شخص کو جو کسی شے کی ایجاد، ظہور یا اصلاح کا سبب ہوا سے اَبُوْہُ کہہ دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ (۳۳۔۶) میں آنحضرت کو مومنین کا باپ قرار دیا گیا ہے۔ایک قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے۔ ❺ نیز مروی ہے کہ آنحضرت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ❻ (ا) انـا وانت ابو هٰذه

---

❶ قـالہ زهير بن ابی سلمٰی بن رباح المزنی وصدرهٗ القائد الخيل منكوبًا دوابرها ..... انظر للبيت ديوانه ۱۲ بمشرحه للاعلم الشنتمری (ليدن) ۱۳۰٦) والمختارات ٤۹ ومختار الشعر، مجاهلی ج ۱ ص ۱۷۲ والعقد الثمين ۸۵ والمحكم (حكم) والاشتقاق ۷٦.

❷ قـال ابو عمرو بن العلاء من جعله السحاب قرء الی الابل (بتشديد اللام) اعراب ثلاثين ۷۰، الكشاف ٤ : ۲۰۷، والبحر المحيط (۸ : ٤٦٤ واللسان (ابل) وروح المعانی ۳۰ : ۱۱٦ وفی غريب القرآن للقتبی ٤ اشارة اليه.

❸ وفی المثل ضغث علی ابالة ومعناه البلية علی اخری الميدانی رقم ۲۲۰۲.

❹ وعـنـد الـفراء والاخـفـش لا واحدله وعند الكسائی واحده ابول مثل عجاجيل وعجول ويمكن ان يكون واحدهٗ ايالة مثل دينار ودنانير رابع.

❺ ذكـر الـمؤلف هذا القراءة ايضًا فی المحاضرات (٤ : ٤۳٤) وهذه قراة ابی فی مصحفه ومنقول عن ابی عباس. مجاهد وعكرمة ثم نسخ كما يعلم من رواية كنز العمال ۱۸٦٤ والدر ۵ : ۱۸۳.

❻ لم اجدهٗ فلينظر من اخرجهٗ ۱۲.

الامة کو میں اورتم اس امت کے باپ ہیں۔ نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا۔ ❶

کل سبب ونسب منقطع یوم القیامة الا سببی ونسبی کہ قیامت کے دن میرے تعلق ورشتہ کے سوا تعلقات اور رشتے منقطع ہوجائیں گے۔ اور میزبان کو ابوالاضیاف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

ابو الحرب ۔لڑائی کا بھڑکانے والا۔ بڑا جنگجو

ابو عُذْرِتھَا ۔مرد دوشیزگی ربائے زن (مجازا) موجد

اَلْاَبْوَان ۔یہ لفظ ماں باپ، باپ دادا۔ نیز باپ چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَائِكَ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (۲۔۱۳۲) میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے (تو) انہوں نے کہا آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ، دادا ابراہیمؑ، اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔ میں حضرت اسماعیل کو یعقوب علیہا السلام کے آباء کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ اور کبھی استاد اور معلم پر بھی اَبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کا روحانی مربی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَجَدْنَآ اٰبَاءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ﴾ (۴۳۔۲۲) میں بعض نے کہا ہے ❷ کہ آباء سے مراد وہ علماء ہیں جو ان کی علمی اور روحانی تربیت کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری جگہ آیت: ﴿رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا﴾ (۳۳۔۶۷) میں ان آباء کو سادۃ اور کبراء کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ آیت: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ﴾ (۳۱۔۱۴) میں وَالِدَیْن سے باپ اور معلم مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (۳۳۔۴۰) کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ...... میں نفی ابوۃ بلحاظ ولادت کے ہے۔ نیز تنبیہ کی ہے کہ متبنیٰ حقیقی اولاد کا حکم نہیں رکھتا۔

اَبٌ کی جمع آبَاءٌ سے کبھی بُعُوْلَةٌ اور خُئُوْلَةٌ (جمع بعل وخال) کی طرح اس کی جمع اُبُوَّةٌ بھی آجاتی ہے، اصل میں اَبٌ (اَبَوٌ) بروزن فَعَلٌ ہے اور شاعر کے قول ❸

---

❶ رواه الدار قطنی عن ابن عباس مرفوعًا فی حدیث طویل وقال فی آخره۔ تفرد به خارجة ولیس بثقة قال السیوطی روی له الترمذی وابن ماجه وقال ابن عدی هو ممن یكتب حدیثهٗ اللالی للسیوطی: ۲٦٥ والحدیث فی المجاز لابی عبیدة ۲: ۱۷۸ رواه الحاكم فی المستدرك (۳: ۱٤۲) من حدیث عمرؓ فی قصة نكاح ام كلثوم وقال فی آخره فانا احببت ان یكون بینی وبین رسول الله صلی الله علیه وسلم سبب ونسب قال الذهبی فی تلخیص المستدرك منقطع وایضًا راجع التذكرة للذهبی.

❷ قد بلغنا من المجد غایتاها۔ وفی العینی (شرح شواهد الكبری علی هوامش الخزانه ۱: ۱۳۳) انه لابی النجم ویقال انه لروبة ولیس فی دیوانه وفی النواد رلابی زید الانصاری بروایة المفضل الضبی عن ابی الغول لبعض اهل الیمن قال السیوطی فی شرح شواهده ٤۸: قیل ان الرجز لرؤیة وعزاه الجوهری لابی النجم وراجع للشطر الاول اللسان (ابا) والخزانة البغدایة (۳: ۳۳۷) وابن عقیل (۱: ٤۱) ومعانی القرآن (المنسوب الی الزجاج) ۲۰٤ والمغنی (۱: ۱۳۱) والشطر الثانی (۱: ۳۷) واسرار الانصاری ٤٦ وعزاه صاحب التحقیق الیٰ ابی النجم (العجل من بنی بكر بن وائل المتوفی سنه ۱۳۰ھ) وفی البلدان (ابو قبیس) وذكر الیاقوت نحتا فی اعراب ابی قبیس (جبل فی مكة) وقال ینسب فیه لحن الی ابی حنیفة والقصة ایضًا فی العقد الفرید (۲: ٤۸۲) والعهدة علیه وانظر ایضًا دفاع الكهنوی فی التعلیق الممجد (مقدمه) وقد فارهنا عرق العینی واطال البحث فی شرح شواهد (۱: ۱۳۸۔ ۱۳۹).

(۴) اِنَّ اَبَاھَا وَاَبَا اَبَاھَا۔

''اس کا باپ اور دادا۔''

میں اسے قفًا کا حکم دیا گیا ہے یعنی قفًا کی طرح اسم مقصور سمجھ کر نصبی جری حالت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے،

محاورہ ہے: اَبَوْتُ الْقَوْمَ (میں قوم کا باپ بن گیا) فلان یـأبُـوبَهْـمَـهٗ۔(وہ اپنے جانوروں کی باپ کی طرح حفاظت کرتا) اور ندا کی حالت میں اَبٌ پر تا زیادہ کرکے یا اَبَـتِ (اے میرے باپ) کہا جاتا ہے۔ ❶ بَـأبَـأ الصَّبِیّ (حکایت) بچے نے بابا کہا۔

ا ب ی

اَلْاِبَـاءُ کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہٰذا ہر اباء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو ابَـاءٌ نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔ ﴿وَیَأْبَـی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ﴾ (۹۔۳۲) اور خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں۔ ﴿وَتَـأْبـٰی قُـلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿اَبـٰـی وَاسْتَـكْبَـرَ﴾ (۲۔۳۴) اس نے سختی سے انکار کیا اور تکبر کیا اِلَّآ اِبْـلِیْسَ اَبٰی (۱۵۔۳۱) مگر ابلیس نے انکار کردیا۔

ایک روایت میں ہے ❷ (۳) ﴿كُـلُّـكُـمْ فِـی الْـجَنَّةِ اِلَّا مَنْ اَبٰی﴾ (کہ) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔

رَجُـلٌ اَبِیٌّ۔ خوددار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے اَبَیْتَ الضَّیْرَ (مضارع تَأْبٰی) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تَیْـسٌ آبـٰی۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہوا پانی پی کر بیمار ہوجائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مؤنث اَبْوَاءُ ہے۔

ا ت ی

اَلْاِتْیَانُ۔ (ص ض) کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اَتِـیٌّ کہا جاتا ہے ❸ اور اسی سے بطور تشبیہ مسافر کو اَتَاوِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔

الغرض اِتْیَـان کے معنی ''آنا'' ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم ونسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر وشر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّـاعَةُ﴾ (۶۔۴۰) اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو اَتـٰی اَمْـرُ الـلّٰـهِ (۱۶۔۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔

اور آیت کریمہ ﴿فَـاَتَـی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ (۱۶۔۲۶) میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت وَجَاءَ رَبُّكَ (۶۔۴۰) میں ہے اور شاعر نے کہا ہے۔ ❹

---

❶ انظر الایات (۳۷۔۱۰۲) (۱۹۔۴۲۔۴۵).

❷ رواه البخاری من حدیث ابی هریرة ۱۲.

❸ قارن النوادر لابی مسحل وفی النهایة (۱ : ۱۷) عکسه الاتیّ والاتاوی فی الاصل الغریب ویقال للسیل الذی یاتی من بعید اتی واتاوی ومنه قیل الطریق مسلوك " میتاء کما فی حدیث اللقطة الفائق (۱۔۷).

❹ انظر الکلمة النوادر لابی مسحل (۶۔۷) وهو منسوب الی اتی والقیاس اتوی کما فی عدی وعدوی زیدت فیه الالف للنسبة اولاشباع اللفتحه (۱۔۱۷)، ❺ لم اجده ولعله للاعشی وصدرهٗ: لکی یعلم الناس انی امرءٌ ...... وفی دیوانه المعیشة بدل المروءة فلعل احد اللفظین مصحف مکان الآخر ۱۲.

(۵)اتیت المروءۃ مِنْ بَابِھَا۔

تو جوانمردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا اور آیت کریمہ:﴿وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی﴾ (۹۔۵۴)میں یَأْتُون بمعنی یَتَعَاطُوْنَ ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ:یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ (۴۔۱۵)میں الفاحشۃ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:﴿لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا﴾ (۱۹۔۲۷) فری کے متعلق مجیٔ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔(یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں)

اور آیت (مذکورہ) میں ایک قراءت تَاْتِی الْفَاحِشَۃَ بھی ہے اور یہ اَتَیْتُہٗ وَاَتَوْتُہٗ (واوی اور یائی) دونوں طرح آتا ہے۔ ❶ چنانچہ (دودھ کے) مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آجاتا ہے،اسے اتوۃٌ کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اَتُوَّۃ اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَرض کثیرۃ الاِتَاءِ۔زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو اور آیت کریمہ:﴿اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا﴾ (۱۹۔۶۱) بے شک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے) میں مَاْتِیًّا (فعل)اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں مَاْتِیًا بمعنی آتِیًا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیتُ الْاَمْرَ وَاَتَانِی الْاَمْرُ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ ❷

اَتَیْتُہٗ بکذا واتیتُہٗ کذا ۔کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے:

﴿وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا﴾ (۲۔۲۵)اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔﴿فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَھُمْ بِھَا﴾ (۲۷۔۳۷)ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔﴿وَآتَیْنَاھُمْ مُلْکًا عَظِیْمًا﴾ (۴۔۵۴)اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الٰہی کے متعلق آتَیْنَا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اُوْتُوْا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اُوْتُوْا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتَیْنَا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے،جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ ﴿اٰتُوْنِی زُبَرَ الْحَدِیْدِ﴾ (۱۸۔۹۶)تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔ میں ہمزہ نے الف موصولہ (ائْتُوْنِی) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جِیئُونِیْ کے ہیں۔

اَلْاِیْتَاءُ (افعال)اس کے معنی اِعْطَاءٌ یعنی دینا اور بخشنا کے ہیں۔قرآن پاک میں بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ (۲۔۲۷۷)اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں﴿وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءَ الزَّکٰوۃِ﴾ (۲۔۷۳)اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا﴿ولا

---

❶ الواو لغۃ ھذیل یقال: ما احسن اَتُویدی الناقۃ واتیٰ یدیھا قال خالد بن زھیرہ یا قوم مابال ابی۔ کنت اذا اتواتہ من غیب (انظر الامالی ۲۔۲۰۵) واللسان (اتی)۔

❷ یعنی یعدی بحرف الجر وھمزۃ الافعال ۱۲۔

یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ آتَیْتُمُوْھُنَّ﴾ (۲۔۲۲۹) اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکو اس میں سے کچھ واپس لے لو ﴿وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ﴾ (۲۔۲۴۷) اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

ا ث ث

اَلْاَثَاثُ۔وافر رخت خانہ اصل میں یہ اَثَّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونا کے ہیں۔ پھر یہ لفظ (اَثَاث) ہر قسم کے فراواں مال پر بولا جانے لگا ہے اور مَتَاعٌ کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا اس کی جمع اِثَاث (بکسر الہمزہ) ہے۔ نِسَاءٌ اَثَائِثُ۔ پر گوشت عورتیں گویا گوشت ان پر وافر سامان کی طرح چڑھا ہوا ہے تَاَثَّثَ فُلَانٌ۔ فلاں بہت زیادہ مالدار ہو گیا قرآن میں ہے ﴿ھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا﴾ (۱۹۔۷۴) وہ ساز و سامان میں زیادہ تھے اور خوش منظر بھی ﴿اَثَاثًا وَّمَتَاعًا﴾ (۱۶۔۸۰) یعنی ساز و سامان

ا ث ر

اَثَرُ الشَّیئِ (بقیہ علامت) کسی شی کا حاصل ہونا جو اصل شی کے وجود پر دال ہو اس سے فعل اَثَرَ (ض) و اَثَّرَ (تفعیل) ہے اَثَرٌ کی جمع آثَارٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی آثَارِھِمْ بِرُسُلِنَا﴾ (۵۷۔۲۷) پھر ہم نے ان کے پیچھے اور پیغمبر بھیجے ﴿وَآثَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۴۰۔۲۱) اور زمین میں نشانات بنانے کے لحاظ سے ﴿فَانْظُرْ اِلٰٓی آثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (۳۰۔۵۰) تم رحمت الٰہی کے نشانات پر غور کرو، اسی سے ان طرق کو آثار کہا جاتا ہے جن سے گزشتہ لوگوں) کے اطوار و خصائل) پر استدلال ہو سکے جیسے فرمایا: ﴿فَھُمْ عَلٰٓی آثَارِھِمْ یُھْرَعُوْنَ﴾ (۳۷۔۷۰) سو وہ انہیں کے نقش قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ ﴿ھُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ﴾ (۲۰۔۸۵) وہ میرے طریقہ پر کاربند ہیں۔

اسی سے مشہور محاورہ ہے سَمِنَتِ الْاِبِلُ عَلٰی اَثَارَةٍ اَثَرٍ من شَحْمٍ فربہ شدند شتران پر بقیہ پیہ کہ پیش ازیں بود اَثَرْتُ الْبَعِیْرَ۔ میں اونٹ کے تلوے پر نشان لگایا تا کہ (گم ہو جانے کی صورت میں) اس کا کھوج لگایا جا سکے۔ اور جس لوہے سے اس قسم کا نشان بنایا جاتا ہے اسے اَلْمِئْثَرَةُ کہتے ہیں۔

اَثَرُ السَّیْفِ۔ تلوار کا جوہر جو اس کی عمدگی کا نشان ہوتا ہے۔ سَیْفٌ مَأْثُوْرٌ۔ جوہر دار تلوار۔

اَثَرْتُ (ن) الْعِلْمَ اَثْرُہٗ اَثْرًا و اِثَارَةً وَّ اُثْرَةً۔ کے معنی ہیں علم کو روایت کرنا دراصل اس کے معنی نشانات علم تلاش کرنا ہوتے ہیں اور آیت ﴿اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾[1] (۴۶۔۴) میں اَثَارَةٍ سے مراد وہ علم ہے جس کے اثار (تا حال) روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں ایک قراءت میں اَثَرَةٍ ہے یعنی اپنے مخصوص علم سے اَلْمَآثِرُ انسانی مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے ہیں اسی سے بطور استعارہ اَثَرٌ بمعنی فضیلت بھی آ جاتا ہے اور اَلْاِیْثَارُ (افعال) کے معنی ہیں (ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے دوسری پر) ترجیح دینا اور پسند کرنا اس سے آثَرْتُہٗ ہے۔ یعنی میں نے اسے پسند کیا۔ قرآن پاک میں ہے:......

﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ﴾ (۵۹۔۹)

---

[1] انظر ایضًا (۱۸۔ ٦٤) (۲۰۔٩٦).

دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں ﴿تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ (۱۲۔۹۱) بخدا اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے۔ ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ (۸۷۔۱۶) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

(۵) حدیث میں ہے:...... سَيَكُوْنُ بَعْدِيْ اَثَرَةٌ[1] (میرے بعد تم میں خود پسندی آجائے گی) یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے بہتر خیال کرے گا۔

اَلْاِسْتِئْثَارُ۔ یعنی کسی چیز کو اپنے لیے مخصوص کر لینا اور (محاورہ میں) اِسْتَأْثَرَ اللّٰہُ بِفُلَانٍ فلاں کی موت سے کنایہ ہوتا ہے اس میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرف بخشی کے لیے اسے چن لیا ہے اور اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔

رَجُلٌ اَثِرٌ جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے۔ لحیانی[2] نے حکایت کی ہے خُذْ اَثِرًا ما، وَاِثْرًا مَّا، وَاَثِرَ ذِی اَثِیْرٍ یعنی سب سے پہلے یہ کام کرو۔[3]

ا ث ل

اَثْلٌ (جھاؤ کا درخت) قرآن میں ہے:...... ﴿ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ﴾ (۳۴۔۱۷) "یعنی دو ایسے باغ دیئے" جن کے میوے بدمزہ اور جھاؤ اور کچھ سبزیاں تھیں

اَثَّلَ۔ یعنی وہ درخت جس کی جڑ خوب مضبوط ہو اسی سے شَجَرٌ مُتَأَثِّلٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ درخت جس کی جڑ اثل کی طرح مضبوط ہو۔ تَأَثَّلَ كَذَا وہ چیز اثل کی طرح مضبوطی سے جم گئی اس نے جڑ پکڑ لی اور آنحضرت ﷺ کا وَصِیّ کے متعلق ﴿غَیْرَ مُتَأَثِّلٍ مَالًا﴾ (۵) فرمایا ہے[4] (یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت لے اور ذخیرہ اندوزی نہ کرے) یہ مال کے اذخار اور اقتناء سے کنایہ ہے اور اسی سے بطور استعارہ نَحَتَّ اَثْلَتَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غیبت اور بدگوئی کرنا کے ہیں۔

ا ث م

اَلْاِثْمُ وَالْاَثَامُ۔ وہ (اعمال وافعال) جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہوں اس کی جمع آثَامٌ آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بُطْءٌ (دیر لگانا) کا

---

[1] قاله صلی اللّٰه علیه وسلم للانصار والحدیث باختلاف الفاظه وطرقه فی البخاری ومسلم (۱۔۳۳۸) طبع انصاری ولیس فی شئی من الطرق سیکون فتنبه لذالك والحدیث فی الکشاف ۲۰۶/۲ وفی الحدیث قصة ابی قتادة مع معاویة راجع الحاکم والبیهقی (تخریج احادیث الکشاف ۸۶ رقم ۱۸۷) والحدیث ایضًا فی النهایة واللسان (اثر).

[2] ابو الحسن علی بن مبارك او ابن خازم اللحیانی من بنی لحیان بن هذیل بن مدرکه اخذ عن الکسائی وابن زید وابی عمرو الشیبانی وطبقتهم وعمدتهم الکسائی راجع لترجمته بغیة الوعاة ۳۴۶ والفهرست ۷۲ و ۱۲۰ طبقات زبیدی ۲۱۳ والانباه ۱: ۱۰۹۔ ۲/۲۵۵، ومعجم الادباء ۱۴/۱۰۶۔۱۰۸.

[3] راجع للکلمة المعاجم.

[4] راجع للحدیث الکشاف (۱: ۲۴۸) والمصنف لعبد الرزاق والطبری عن الحسن العرنی ومسند احمد وابن ماجه والنسائی وابو داؤد من روایة عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده وابن حبان من روایة صالح بن رستم عن جابر والکامل لابن عدی (ترجمه صالح بن رستم) وابو نعیم فی الحلیة فی ترجمة عمر بن دینار وقال تفرد به الخزان (صالح بن رستم ابو عامر الخزان) وهو من ثقات البصریین وضعفه ابن معین (راجع تخریج الکشاف ص ۳۸۔۳۹ رقم ۳۲۳) والنهایة ۱/ ۱۹ والفائق ۱/ ۸ وقاله صلی اللّٰه علیه وسلم فی وصی الیتیم وعمرؓ حین وقف ارضهٗ لمن ولیها ایضًا مجمع البحار (اثل).

مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے شاعر نے اونٹنی کے متعلق کہا ہے۔ ❶ (المتقارب)

(۲) جَمَالِيَّةٌ تغتلی بالرادف
اذا كَذَبَ الآثماتُ الهجيرا

وہ اونٹ کی طرح مضبوط ہے جب سست رفتار اونٹنیاں دوپہر کے وقت چلنے سے عاجز ہوجاتی ہیں تو یہ ردیف کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (۲:۲۱۹) میں خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔ اَثِمَ (س) اِثْما وَاَثَامًا فَهُو آثِمٌ وَاَثِمٌ وَاَثِيْمٌ (گناہ کا ارتکاب کرنا) اور تَاَثَّمَ (تفعل) کے معنی گناہ سے نکلنا (یعنی رک جانا اور توبہ کرنا) کے ہیں جیسے تَحَوَّبَ کے معنی حوب (گناہ) اور تحرج کے معنی حرج یعنی تنگی سے نکلنا کے آجاتے ہیں۔ ❷

اور (الکذب) (جھوٹ) کو اثم کہنا اس وجہ سے ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کو حیوان کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حیوان کہہ دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ ﴾ (۲۔۲۰۶) کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عزت نفس (اور ہٹ دھرمی) اسے گناہ پر اکساتی ہے اور آیت: ﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ (۲۵۔۶۸) میں آثام سے (مجازا) عذاب مراد ہے اور عذاب کو اثام اس لیے کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ (یعنی قتل و زنا) عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسا کہ نبات اور شحم (چربی) کو ندی (نمی) کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ نمی سے نباتات اور (اس سے) چربی پیدا ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ (طویل)

(۷) تعلى الندى فى متنه وتحدرا

اس کی پیٹھ پر تہ بر تہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔ بعض نے آیت کریمہ میں يَلْقَ اَثَامًا کے یہ معنی بھی کیے ہیں کہ مذکورہ افعال اسے دوسرے گناہوں پر برانگیختہ کریں گے کیونکہ (عموماً) صغائر گناہ کبائر کے ارتکاب کا موجب بن جاتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ (۱۹۔۵۹) کی تفسیر بھی ان ہر دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

اَلْآثِمُ۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والا۔ قرآن پاک میں ہے: آثِمٌ قَلْبُهٗ (۲۔۲۸۳) وہ دل کا گنہگار ہے۔

اور اِثم کالفظ بِرّ (نیکی) کے بالمقابل استعمال ہوتا

---

❶ قاله الاعشى فى مدح ناقته وقبلهٗ: بناجية كاتان الثَمِيل. تقضى السرى بَعْد اين عسيرا۔ وفى رواية تعتلى بالعين المهملة ومعناه تنهض وتطيق راجع ديوانه ۷۰ والاقتضاب ۱۹۹ واللآلى مع السمط (۸۳۱۱) والبحر (۲: ۵۷) واللسان (اثم، غلا) والاعشى هو ميمون بن قيس ادرك الاسلام.

❷ ههنا سقط وخرم فى النسخ المطبوعة ولعل الصواب وتحرج خرج من حرجه اى ضيقة.

❸ البيت لعمرو بن احمر الباهلى واوله: كثور العداب الفرد يضر به الندى ...... وفى رواية المنعدآب بدل العداب والبيت فى اللسان (ندى) والاقتضاب ٤٤٠ والصاحبى ۹٥ وابن احمر هو ابو الخطاب عمرو بن احمر الباهلى شاعر فحل مخضرم مشهور بالفصاحة والغريب توفى فى خلافة عثمان (قبل سنة ۳٥ هـ) راجع الشعراء ۳۱٥ والخزانة ۳: ۳۸ والبيت ايضًا فى الصحاح والتاج والمحكم (عدب) ۱۲.

ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (٦)

(٦) اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ [1] کہ نیکی وہ ہے جس پر طبیعت مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس کے متعلق دل میں تردد ہو۔ یاد رہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے البر والاثم کی تفسیر نہیں بیان کی ہے بلکہ ان کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ﴾ (۶۸۔۱۲) میں اثیم بمعنی آثم آتا ہے اور آیت: ﴿یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵۔۶۲) (کہ وہ گناہ اور ظلم میں جلدی کر رہے ہیں) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ آثم سے آیت: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۵۔۴۴) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے (یعنی عدم الحکم بِمَا انزل اللّٰہ کفر) اور عُدْوَان سے آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (۵۔۴۵) کے مفہوم کی طرف اشارہ (یعنی عدم الحکم بِمَا انزل اللّٰہ ظلم) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ اثم عدوان سے عام ہے۔

ا ج ج

اَلْاُجَاجُ کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ (۲۵۔۵۳) ایک کا پانی نہایت شیریں اور دوسرے کا سخت گرم ہے۔ یہ (اُجاج) اجیج النار (شعلہ نار یا اس کی شدید تپش اور حرارت) وَاَجَّتُهَا وَقَدْ اَجَّجْتُ۔ میں نے آگ بھڑکائی چنانچہ وہ بھڑک اٹھی (وغیرہ محاورات) سے مشتق ہے۔

اِئْتَجَّ النَّهَارُ۔ دن گرم ہوگیا۔ اسی (اَجَّ) سے ﴿یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ﴾ (۱۸۔۹۴) (۲۱۔۹۶) ہے ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے مشتعل آگ یا موجزن اور متلاطم پانی کے ساتھ تشبیہ دے کر یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔

اَجَّ الظَّلِیْمُ اَجِیْجًا۔ شتر مرغ نہایت سرعت رفتار سے چلا۔ یہ محاورہ اشتعال نار کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

ا ج ر

اَلْاَجْرُ وَالْاُجْرَةُ کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۲۹) میرا اجر تو خدا کے ذمے ہے۔ ﴿وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (۲۹۔۲۷) اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔ ﴿وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۱۲۔۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے ...... ان کے لیے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

اَلْاُجْرَةُ (مزدوری) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ اَجْرٌ کی جمع اُجُوْرٌ ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (۴۔۲۵) اور ان کے مہر بھی

---

[1] کلمة من حدیث وابصة الاسدی انظر (حم، طب، فی الدلائل عنه حب) ذکرهٗ فی کنزل العمال ۳: ۲۱۸۴، ۲۱۵۸ وبمعناه روایة واصلة ۲۱۷۷، ۲۱۸۲ وذکره الغزالی فی الاحیاء فی مواضع ۳/ ۴۳ بتخریج العراقی.

انھیں ادا کردو میں کنایہ عورتوں کے مہر کو اُجُوْرٌ کہا گیا ہے پھر اَجْرٌ اور اُجْرَۃٌ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان یا تقریباً اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔ اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے، جیسے فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۲۔۲۷۷) ان کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا۔ ﴿فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۴۲۔۴۰) تو اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے۔

اَلْجَزَاء ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا﴾ (۷۶۔۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریں گے۔ ﴿فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ (۴۔۹۳) اس کی سزا دوزخ ہے۔

محاورہ میں ہے اَجَرَ (ن) زیدٌ عمراً یا جُرُہ اجرًا کے معنی ہیں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی اور اٰجَرَ عمر زیدًا کے معنی ہوں گے عمرو نے زید کو اجرت دی قرآن میں ہے:

﴿عَلٰى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ﴾ (۲۸۔۲۷) کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔ اور یہی معنی اٰجَرَ (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد (اَجَرْتُهٗ) میں مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے۔ اٰجَرَهُ اللّٰهُ وَاَجَرَهٗ دونوں طرح بولا جاتا ہے، یعنی خدا اسے بدلہ دے۔

اَلْاَجِيْرُ بروزن فَعِيْلٌ بمعنی فاعل یا مفاعل ہے یعنی معاوضہ یا اجرت پر کام کرنے والا۔ اَلْاِسْتِجَارُ کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جس طرح کہ استیجاب (استفعال) بمعنی اَجَاب آ جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اِسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ﴾ (۲۸۔۲۶) اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجیے کیونکہ بہتر ملازم جو آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو میں (استئجار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ا ج ل

اَلْاَجَلُ کے معنی کسی چیز کی مدت مقررہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا مُّسَمًّى﴾ (۴۰۔۶۷) اور تا کہ تم (موت کے) وقت مقررہ تک پہنچ جاؤ۔ ﴿اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ﴾ (۲۸۔۲۸) ان دو معینہ مدتوں میں سے جونسی مدت میں پوری کردوں۔

محاورہ ہے دَيْنُهٗ مُؤَجَّل اس کے قرضہ وصول کرنے کے لیے ایک مدت معین ہے قَدْ اَجَّلْتُهٗ میں نے اس کے لیے مدت مقرر کردی اور انسان کی زندگی کے لیے جو مدت مقرر ہوتی ہے، اسے بھی اَجَلٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے، دَنَا اَجَلُهٗ یعنی اس کی موت کا وقت قریب آ پہنچا۔ اصل میں اس کے معنی مدتِ حیاۃ (زندگی) پورا کر لینا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا﴾ (۶۔۱۲۹)

اور (آخر) ہم اس وقت معین کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔

یہاں اَجَلٌ سے مراد حدِّ موت ہے اور بعض نے بڑھاپے کی انتہا مراد لی ہے درحقیقت ان دونوں کا ایک مفہوم ہے (کیونکہ) جب انسان بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ جائے تو موت کے قریب ہو جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ﴾ (۶۔۲) میں اجل اول سے حیات دنیوی اور اجل ثانی سے بقاءِ اخروی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اوّل سے دنیا میں بقا اور ثانی سے (برزخی زندگی مراد ہے جو) موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ مراد ہے، یہ حسنؒ سے مروی ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا﴾ (۳۹۔۴۲) میں جو دو موتیں مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے یعنی اوّل اجل سے نیند اور ثانی سے موت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں جگہ اَجَلٌ سے مراد موت ہی ہے لیکن بعض کی موت کسی حادثہ مثلاً قتل، آتش زدگی، غرق وغیرہ ناموافق اسباب کی وجہ سے جو اس کی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنتے ہیں اور بعض ان حوادث سے محفوظ اور عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں حتی کہ ان کو طبعی موت آ جاتی ہے۔ انہی دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] ((مَنْ اَخْطَأَتْہُ سَہْمُ الرَّزِیَّۃِ لَمْ تُخْطِئْہُ سَہْمُ الْمَنِیَّۃِ .)) اگر کوئی مصیبت کے تیر سے بچ بھی جائے تو موت کا تیر اس سے خطا نہیں کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ انسان کی اجل (یعنی موت) دو قسم پر ہے۔ بعض جوانی کی حالت میں (کسی حادثہ کی وجہ سے) مرجاتے ہیں اور بعض عمر کی اس انتہا کو پہنچ کر مرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کی آخری حد مقرر کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۲۲۔۵) اور بعض (قبل از پیری) مرجاتے ہیں اور بعض (شیخ فانی ہو جاتے اور بڑھاپے کی) نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور شاعر نے کہا ہے۔[2] (طویل)

(۸) رَأیت المنایا خَبْطَ عشواء من تُصِبْ تُمِتْهُ ......۔

''موت اندھی اونٹنی کی طرح مخبوط پھر رہی ہیں جس کو پہنچ جائیں اسے ختم کر ڈالتی ہیں۔''

اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے[3] (المنسرح)

---

[1] اخرجه.

[2] زهير في معلقته وتكملتهٔ ...... ومن تخطئ يُعَمّر فيهرم راجع للبيت اللسان والمحكم (عشو، خبط) وديوانه ۲۹ وامالی المرتضى ۱ : ۲٦۲ ومختار الشعر الجاهلی ۱ : ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف ۳ : ۳۲۹ والجمهرة (۱) والحيوان للجاحظ ۲ : ۱۰۲ و ٦ : ۵۰۹، والعقد الثمين ۹٦ وايام العرب ۲۷٦ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۸۸.

[3] وتمامه: للموت كأس والمرءُ ذائقها۔ البيت لامية بن ابی ابی الصلت الجاهلی كما فی المحكم واللسان (عبط) وراجع للبيت الكامل للمبرد ٦٦ وقال فی ۲۹۷ : قال ابو الحسن الاخفش الاصغر وصاعد اللغوی انه لرجل من الخوارج واحرىٰ ان يكون هو الصواب راجع السمط للميمنی والبيت ايضًا فی امالی المرتضى ۱۔۵۳۳، وعيون الاخبار ۲ : ۳۷٤، والاغانی ۳ : ۱۷۹ والقرطبی ٤ : ۲۹۷، والعينی ۲ : ۱۸۸ وديوانه رقم ٤۰ وذيل الامالی ۱۳۵۔۱۳٦ فی ثلاثة وفيه لابد ذائقها والنقائض ۷۳ والادبار للمؤلف ٤/۴۸۸ وفی اسد الغابة انشدتهٔ الفادعة اخت امية بين يدی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قصيدةً لاخيه وفيها البيت.

(۹) مَنْ لَّمْ یَمُتْ عَبْطَةً یَمُتْ هَرْمًا
''جو شخص جوانی میں فوت نہ ہو آخر کار پیر فرتوت ہو کر مرجائے گا۔''

اَلْاٰجِلُ (دیر سے ہونے والا) یہ عَاجِلٌ کی ضد ہے اور ہر اس جنایۃ کو اَجْل کہہ دیا جاتا ہے جس کے انجام بد کا جلد ہی اندیشہ نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہر اجل جنایۃ ہوتا ہے لیکن ہر جنایۃ اجل نہیں ہے محاورہ ہے:

فَعَلْتُ کَذَا مِنْ اَجْلِهٖ میں نے فلاں کی وجہ سے یہ کام کیا۔ قرآن میں ہے: ﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ﴾ (۵۔۳۲) اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا۔ یعنی اس قتل کے ارتکاب کی وجہ سے، ایک قراءت میں اِجْـل (بکسر الھمزہ) ہے [1] یعنی اِس جرم کی وجہ سے۔

اَجَلْ (ہاں بے شک) یہ حرف ایجاب ہے اور کسی خبر کی تصدیق کے لیے آتا ہے [2] اور آیت کریمہ:

﴿ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ﴾ اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں...... نکاح میں رہنے دو۔ (۲۔۲۳۱) میں بلوغ الاجل سے وہ مدت مراد ہے جو طلاق اور انقضاء عدت کے درمیان ہوتی ہے (نیز بلوغ اجل سے عدت کا ختم ہونا یا عدت کے ختم ہونے تک کی مدت کے قریب پہنچ جانا مراد ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ (۲:۲۳۴) میں بھی انقضاء عدت کی طرف اشارہ ہے یعنی اس وقت ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ ﴾ (۲:۲۳۴) ان پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اپنے حق میں جو پسند کریں کر گزریں۔

ا ح د

اَحَدٌ کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی صرف نفی مین اور کبھی صرف اثبات میں۔ نفی کی صورت میں ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور استغراق جنس کے معنی دیتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر مجتمع ہو یا متفرق جیسے مَا فِی الدَّارِ اَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) یعنی نہ ایک ہے اور نہ دو یا دو سے زیادہ نہ مجتمع اور نہ ہی متفرق طور پر اس معنی کی بنا پر کلام مثبت میں اس کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہوسکتی ہے لیکن دونوں کا اثبات نہیں ہوتا جب فِی الدَّارِ وَاحِدٌ کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک اکیلے کا گھر میں ہونا تو ثابت ہوگا ہی مگر ساتھ ہی دو یا دو سے زیادہ کا بھی اجتماعاً و افتراقاً اثبات ہو جائے گا پھر احد کا لفظ چونکہ مَا فَوْقَ الْوَاحِدِ کی بھی نفی کرتا ہے اس لیے مَا مِنْ اَحَدٍ فَاضِلِیْنَ کہنا صحیح ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے [3] ﴿ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِیْنَ ﴾ (۶۹:۴۷) پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوگا۔

کلام مثبت میں احد کا استعمال تین طرح پر ہوتا ہے،
(۱) عشرات کے ساتھ ضم ہو کر جیسے اَحَدَ عَشَرَ (گیارہ)

---

[1] هذه قراءة ابی جعفر وحده راجع فتح القدیر ۱: ۳۳ وشرح الدرة للخفاجی.
[2] وكذا جیرو ان راجع الرضی علی الكافیه (۲: ۳۸۳) وابن یعیش (۷: ۱۲۴) وفیه الشواهد.
[3] وایضًا قال: وَمَا یُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ (۲: ۱۰۲).

اَحَـدٌ وَّعِشْـرُوْنَ (اکیس) وغیرہ۔(۲) مضاف یا مضاف الیہ ہو کر اس صورت میں یہ اول (یعنی پہلا) کے معنی میں ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿ اَمَّـا اَحَـدُ كُـمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ﴾ (۱۲:۴۱) یعنی تم میں سے جو پہلا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔

یَـوْمُ الْاَحَـدِ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار۔(۳) مطلقاً بطورِ وصف استعمال ہو تو اس صورت میں یہ باری تعالیٰ کا وصف ہی ہوگا (اور اس کے معنی ہوں گے یکتا، یگانہ بے نظیر، بے مثل) جیسے فرمایا:

قُلْ هُـوَ اللّٰـهُ اَحَدٌ (۱۱۲:۱) کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے، ایک ہے۔

اَحَدٌ اصل میں وَحَدٌ ہے لیکن وَحَدٌ کا لفظ غیر باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہے۔ چنانچہ نابغہ نے کہا ہے [1] ع (بسیط)

(۱۰) كَاَنَّ رِجْلِيْ وَقَدْ زَالَ النَّهَارُ بِنَا
بِذِی الْجَلِيْلَ عَلٰى مُسْتَأْنِسٍ وَحَد

دن ڈھلے وادی ذی الجلیل میں میری اونٹنی کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے میرا پالان بجائے اونٹنی کے اس گورخر پر کسا ہوا ہے جو تنہا ہو اور انسان کی آہٹ پا کر ڈر کے مارے تیز بھاگ رہا ہو۔

ا خ ذ

اَلْاَخْـــذُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا، جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ مَعَـاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ ﴾ (۱۲:۷۹) خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا ہم کسی اور کو پکڑ لیں اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں، جیسے فرمایا: ﴿ لَا تَـاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ (۲:۲۵۵) نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی ہے اور نہ ہی نیند۔

محاورہ ہے: اَخَـذَتْـهُ الْـحُمّٰى (اسے بخار چڑھ گیا) قرآن میں ہے: ﴿ وَاَخَـذَ الَّـذِيْـنَ ظَـلَـمُـوا الـصَّيْحَةُ ﴾ (۱۱:۱۱۷) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آ پکڑا۔

﴿ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾ (۷۹:۲۵) تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔

﴿ وَكَـذٰلِكَ اَخْـذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَـذَ الْـقُـرٰى ﴾ (۱۱:۱۰۲) اور تمہارا پروردگار (جب نافرمان) بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اُس کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے۔ اور قیدی کو مَاْخُوْذٌ اور اَخِيْذٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَلْاِتِّخَاذُ (افتعال) ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر جَعَلَ کے جاری مجری ہوتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ﴾ (۵:۵۱) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ ﴿ وَالَّـذِيْـنَ اتَّخَذُوْا مِـنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ﴾ (۳۹:۳) جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔ ﴿ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا ﴾

---

[1] قاله النابغة يصف سرعة سيره والبيت فی ديوانه وشرح العشر للتبريزی واللسان (انس۔ زول، وحد) وشواهد الكشاف (۳٤) وامالی الشجريه ۲: ۲۷۱ والمعانی الكبير للقبتی ۷۳۲ والخزانة البغداديه (۱: ۵۲۱) ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۷۵) والمحاضرات للمؤلف (٤: ٦٦۳) والشطر الثانی فی البلدان (اسم حليل) وفی رواية اللسان والثمين ٦ يوم الحليل بدل بذی الحليل ومستوجس برل مستأنس.

(۲۳:۱۱۰) تو تم نے اسے تمسخر بنالیا۔ ﴿ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ ﴾ (۵:۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ ﴾ (۱۶:۶۱) میں صیغہ مفاعلہ لاکر معنی مجازات اور مقابلہ پر تنبیہ کی ہے کہ جو انعامات خدا کی طرف سے انھیں ملے ان کے مقابلہ میں انھوں نے شکر گذاری سے کام نہیں لیا۔ فُلَانٌ مَاْخُوْذٌ وَبِهٖ اَخْذَةٌ مِنَ الْجِنِّ فلاں جن کے اثرات میں گرفتار ہے۔ فُلَانٌ یَاْخُذُ مَاْخَذَ فُلَان یعنی فلاں اس جیسا کام کرتا ہے یا اس کے مسلک پر چلتا ہے اور اسی سے محاورہ ہے: ذَهَبُوْا وَمَنْ اَخَذَ اَخْذَهُمْ وَاِخْذَهُمْ وہ اور ان کے ہم مشرب سب چلے گئے۔

رَجُلٌ اُخُذٌ اَوْ بِهٖ اُخُذٌ کنایۃً وہ شخص جو آشوب چشم میں مبتلا ہو۔ اَلْاِخَاذَةُ وَالْاِخَاذُ وہ زمین جسے کوئی شخص اپنے لیے خاص کرلے۔

اخ ر

اٰخِرٌ۔ اوّل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور اٰخَرُ (دوسرا) وَاحِدٌ کے مقابلہ میں آتا ہے اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے، جس طرح کہ اَلدَّارُ الدُّنْیَا سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح کہ ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ (۲۹:۶۴) ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے لیکن کبھی الدَّار کا لفظ حذف کر کے صرف اَلْاٰخِرَةُ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ﴾ (۱۱:۱۶) وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دَارٌ کا لفظ کبھی اٰخِرَة کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہوکر آتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ﴾ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ (۶:۳۲)

﴿ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (۱۶:۴۱) اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ اگر وہ اسے جانتے ہوتے۔ یہ اصل میں وَلَاَجْرُ دَارِ الْحَیَاةِ الْاٰخِرَة ہے (اور دار کا لفظ اَلْحَیَاةِ الْاٰخِرَةِ کی طرف مضاف ہے)

اور اُخَرُ (جمع الاخریٰ) کا لفظ الاٰخَرُ (معروف باللام) سے معدولؒ ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ اَفْعَلُ مِنْ كَذَا (یعنی صیغہ تفضیل) کے ساتھ اگر لفظ مِنْ لفظاً یا تقدیراً مذکور ہو تو نہ اس کا تثنیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اگر مِنْ مذکور نہ ہو تو معرف باللام ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع دونوں آسکتے ہیں۔ ❶ لیکن لفظ آخَرَ میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اَلْاٰخَر سے معدول ہے۔

اَلتَّاْخِیْرُ: یہ تقدیم کی ضد ہے (یعنی پیچھے کرنا چھوڑنا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ (۷۵:۱۳) جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے۔

---

❶ وفی القرآن او آخرون اعترفوا بذنوبهم (۹۔۱۰۵) وآخر شیئاً (۹۔۱۰۵) نیز فی الاخرین (۲۶۔۴۳) الاستخار (استفعال) راجع الایات (۱۵۔۱۵) (۱۵).

﴿ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (۴۸:۲) تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ۔

﴿ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ (۱۴:۴۲) وہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جب کہ (دہشت کے سبب) آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

﴿ رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ﴾ (۱۴:۴۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا کر۔ محاورہ ہے: بِعْتُهٗ بِـاٰخِرَةٍ میں نے اسے تاخیر اجل کے ساتھ بیچ ڈالا یہ لفظ و معنی نَـظِرَةٍ کی طرح ہے اور اَبْـعَـدَ الـلّٰهُ الْاٰخِرَ میں اَلْاٰخِرَ کے معنی مُتَاَخِّرَ عَنِ الفَضِیْلَةِ او عن تحری الْـحَقِّ کے ہیں یعنی اللہ فضیلت اور حق کی تحری میں کوتاہی کرنے والے کو ہلاک کرے یا اپنی رحمت کو دور رکھے۔

ا خ و

اَخٌ (بھائی) اصل میں اَخَــوٌ ہے اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کا ولادت میں ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو وہ اس کا اَخٌ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو جو قبیلہ، دین و مذہب، صنعت وحرفت، دوستی یا کسی دیگر معاملہ میں دوسرے کا شریک ہو، اسے اَخٌ کہا جاتا ہے [1] چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ لَا تَـــکُـوْنُوْا کَـالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ (۳:۱۵۶) ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں۔ میں اِخْوَان سے ان کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور فرمایا: ﴿ اِنَّــمَـا الْـمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ (۴۹:۱۰) مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

﴿ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا ﴾ (۴۹:۱۲) کیا تم میں سے کوئی ایسی بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ فَـاِنْ کَـانَ لَهٗ اِخْوَةٌ ﴾ (۴:۱۱) اگر میت کے بھائی بھی ہوں۔ میں اِخْــوَةٌ کا لفظ بہن بھائی دونوں کو شامل ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اِخْـوَانًـا عَـلٰـی سُـرُرٍ مُّتَـقٰـبِلِیْنَ ﴾ (۱۵:۴۷) گویا بھائی بھائی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں متنبہ کیا ہے کہ اہل جنت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔

اَلْاُخْـــتُ (بہن) یہ اَخٌ کا مؤنث ہے اور اس میں تاء بمنزلہ عوض عن المحذوف کے ہے اور آیت کریمہ: ﴿ یَـــا اُخْتَ هٰرُوْنَ ﴾ (۱۹:۲۸) اے ہارون کی بہن میں بہن بلحاظ نسب مراد نہیں ہے بلکہ صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے مریم علیہا السلام کو اخت ہارون کہا گیا ہے۔ جس طرح کہ یَا اَخَاتِمِیْمٍ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿ اَخَا عَادٍ ﴾ (۴۶:۲۱) میں ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان پر بھائیوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:

﴿ وَاِلٰـی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ﴾ (۱۱:۶۱) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔

﴿ وَاِلٰـی عَـادٍ اَخَاهُمْ ﴾ (۱۱:۵۰) اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو بھیجا۔

﴿ وَاِلٰـی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ﴾ (۱۱:۸۴) اور مدین کی

---

[1] اس کی جمع اخوۃ اور اخوان آتی ہے۔

طرف ان کے بھائی (شعیب علیہ السلام) کو بھیجا۔اور آیت کریمہ:
﴿ وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ﴾
(۴۳:۴۸) اور جو نشانی ہم ان کو دکھادیتے تھے وہ اس کی بہن سے بڑی ہوتی تھی۔ میں اُخْتِهَا پہلی نشانی سے ہے اور اس کو اخت اس لیے کہا ہے کہ صحت وصداقت اور اظہارحق میں دونوں ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ (۷:۳۸) جب ایک جماعت وہاں داخل ہوگی تو اپنی بہن پر لعنت کرے گی۔ میں اُخْتَهَا سے ان کے دیگر ہم مشرب لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر ﴿ اَوْلِيٰٓـؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ﴾ (۲:۲۵۷) ان کے دوست طاغوت ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر آیات میں پایا جاتا ہے۔

تَـاَخَّيْتُ کسی کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا اور چونکہ دو بھائی مل کر رہتے ہیں اس جہت سے اس مادہ میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس کھونٹے کو اَخِيَّةُ الـدَّابَّـه کہہ دیتے ہیں جس سے جانور بندھا رہتا ہے۔

ا د د

قرآن پاک میں ہے:
﴿ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴾ (۸۹:۱۹) یہ تو تم نازیبا اور ناپسندیدہ بات زبان پر لائے ہو۔

اِدًّا کے معنی ہیں: نہایت ہی ناپسندیدہ بات جس سے ہنگامہ بپا ہوجائے گا۔ یہ اَدَّتِ النَّاقَةُ تَئِدُّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اونٹنی (اپنے بچے کی جدائی میں) سخت روئی اور گریہ کیا۔

اَلْاَدِيْـدُ شور ہنگامہ اور اُدٌّ (نام پدر قبیلہ) یا تو وُدٌّ سے مشتق ہے یا پھر اَدَّتِ النَّاقَةُ سے۔

ا د م

اٰدَمُ۔ابوالبشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے کہ یہ اِدِيْمُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم علیہ السلام اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم ارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اُدْمَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے، اس لیے انھیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رَجُـلٌ اٰدَمُ کے معنی گندمی رنگ کے مرد کے ہیں۔ اور بعض نے آدم علیہ السلام کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ وہ مختلف عناصر اور متفرق قویٰ کے امتزاج سے پیدا کیے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت ﴿ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ ﴾ (۷۶:۲) مخلوط عناصر سے ...... کہ اسے آزماتے ہیں سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جَعَلْتُ فُـلَانًا اُدْمَةَ اَهْلِيْ میں نے فلاں کو اپنے اہل وعیال میں ملالیا مخلوط کرلیا۔

بعض نے کہا ہے کہ آدم اِدَامٌ سے مشتق ہے اور اِدَامٌ (سالن وغیرہ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنادیا تھا جیسے کہ آیت ﴿ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ﴾ (۱۵:۲۹) اور اس میں اپنی روح پھونک دی میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل وفہم اور فکر عطا کرکے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَفَضَّلْنَا هُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (۱۷:۷۰)

اور ہم نے انھیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بنا پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں [1] ہے

(۸) لَوْ نَظَرْتَ اِلَیْھَا فَاِنَّہٗ اَحْرٰی اَنْ یُّؤْدَمَ بَیْنَکُمَا. اگر تو اسے (اپنی منگیتر کو) ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگواری پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

ا د ی (و)

اَلْاَدَاءُ کے معنی ہیں یکبارگی اور پورا پورا حق دے دینا۔ چنانچہ خراج اور جزیہ کے دے دینے اور امانت کے واپس کر دینے کو اداء کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ﴾ (۲:۲۸۳) تو امانت دار کو چاہیے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کرے۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا﴾ (۴:۵۸) خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کر دیا کرو۔

﴿وَاَدَآءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲:۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے خون بہا اسے پورا پورا ادا کرنا۔ اصل میں یہ اَدَاۃٌ سے محاورہ ہے اَدَوْتَ تَفْعَلُ کَذَا کسی کام کے لیے حیلہ اور تدبیر کرنا اصل میں اس کے معنی اداۃ (کسی چیز) کو پکڑنے کے ہیں جس کے ذریعے دوسری چیز تک پہنچا جا سکے۔

ا ذ ا

اِذَا (ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے [2] کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے [3] اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور اِذْ (ظرف) ماضی کے لیے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اِذْمَا) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [4]

(۱۱) اِذْ مَا اَتَیْتَ عَلَی الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَہٗ.

جب تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

ا ذ ن

اَلْاُذُنُ کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اُذُنُ الْقِدْرِ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اُذُنٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَیَقُوْلُوْنَ ھُوَ اُذُنٌ. قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّکُمْ﴾ (۹:۶۱) اور کہتے ہیں یہ شخص نرا کان ہے ان سے کہہ دو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لیے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا﴾ (۲۵:۵۶) اور ان کے

---

[1] لفظ حدیث من روایة ابی عبیدفی غریبه والذی فی الترمذی والنسائی وأبن ماجة وابن ابی شیبه وابن ابی حبان والحاکم واحمد والبزار وغیرھم فی حدیث المغیرة انه خطب امرأة فقال له صلی اللّٰه علیه وسلم انظر الیها الخ (راجع تخریج الکشاف للحافظ ص ۱۳۱ رقم: ح ۸۹) والفائق ۱/۱۱ والمنتقیٰ بشرحه النیل(۶: ۱۰۶-۱۰۷)والاخیاء بتخریج العراقی ۲/ ۳۹ واللسان (ادم) قال الزمحشری فی الحدیث اوبمعنی لیت فان الغرض منه الحث علی النظر ومثله قولهم لوتاتینی فتحدثنی ۱۲.

[2] وایضًا الاطلاق کمافی التنزیل اَنْ اَدُّ اِلَیَّ عبادَاللّٰه (۴۴-۱۸) ۱۲.

[3] وان دخل علی الماضی نحو اذا جاء نصر اللّٰه (۱۱۰/۱).

[4] وتارة تدل علی معنی الفجائة نحو اذاهی حیة تسعیٰ (۲۰-۲۱). قاله العباس بن مرداس یمدح النبی صلی الله علیه وسلم وتمامه .... حقاً علیك اذااطمان المجلس والبیت فی السیرة ۴ : ۱۹۷) والکامل ۲۴۹ والکتاب السیبویه (۱ : ۴۳۲)قال الشنتمری والبیت مضمن وتمامه فیما بعده والبیت ایضاً فی الصحاح (اذا)وفی روایة الامیر بدل الرسول وهو محرف وفی اللسان "الامین".

کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہو گئے ہیں بلکہ اس سے ان کی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اور اَذِنَ (الیہ) کے معنی توجہ سے سننا کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴾ (۸۴:۲، ۵) اور وہ اپنے پروردگار کا فرمان سنے گی اور اُسے واجب بھی ہے اور اِذْنٌ کا لفظ اس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۲:۲۷۹) تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ اور اِذْنٌ و اَذَانٌ ہر سنی ہوئی بات کو کہتے ہیں اور ان سے علم مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا اکثر علم مسموعات پر مبنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ﴾ (۹:۴۹) مجھے اجازت دے دیجیے اور آفت میں نہ ڈالیے۔

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ ﴾ (۷:۱۶۷) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا۔ اَذِنْتُهٗ بِكَذَا وَاٰذَنْتُهٗ کے ایک معنی ہیں یعنی اطلاع دینا اور اعلان کرنا اور اعلان کرنے والے کو مُؤَذِّنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ ﴾ (۱۲:۷۰) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو۔

﴿ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ ﴾ (۷:۴۴) (تو اس وقت) ان میں سے ایک پکارنے والا پکار دے گا۔

﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۲:۲۷) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو۔

اَلْاَذِيْنُ وہ خاص جگہ جہاں اذان کی آواز پہنچتی ہو۔

اَلْاِذْنُ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں یہ بتا دینا کہ کسی چیز میں اجازت اور رخصت ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۴:۶۴) اور ہم نے پیغمبر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ میں اِذْن بمعنی ارادہ اور حکم ہے (اسی طرح فرمایا):

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۳:۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دن واقع ہوئی سو خدا کے حکم سے واقع ہوئی۔

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲:۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ﴿ وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۵۸:۱۰) مگر خدا کے حکم کے سوا انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم الٰہی کے ہیں مگر اِذْن اور علم میں فرق ہے کیونکہ اِذْنٌ کا لفظ خاص ہے اور اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں علم کے ساتھ مشیت بھی شامل ہو عام اس سے کہ وہ فعل پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ لیکن علم میں مشیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۱۰:۱۰۰) ''حالانکہ کسی شخص کو قدرت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایمان لائے۔''

میں ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت اور اس کا امر دونوں پائے جاتے ہیں۔ [1] اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

---

[1] ایضاً راجع الآیة ویمسك السماء ان تقع علی الارض الا باذنه (۲-۲۱۳)-(۲۲-۶۵).

(۱۰۲:۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں مشیت من وجہ پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طبعی طور پر ایسا بنایا ہے کہ دوسرے کی ضرب سے متاثر ہو اور اسے اس سے گزند پہنچے۔ وہ پتھر کی طرح نہیں ہے کہ کسی قسم کی ضرب سے اسے تکلیف نہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان میں اس قسم کی قوت کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہے۔ اس اعتبار سے جب کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کے اذن اور مشیت سے ہی پہنچی ہے۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے دوسری کتاب درکار ہے۔

اَلْاِسْتِئْذَانُ کے معنی اجازت طلب کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (۴۵:۹) اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ﴾ (۶۲:۲۴) سو جب یہ لوگ تم سے (کسی کام کے لیے) اجازت مانگا کریں۔

اِذَنْ۔ یہ جواب اور جزا کے لیے آتا ہے یعنی لفظاً یا تقدیراً جواب کو چاہتا ہے اور اس کے بعد کا کلام جزا کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ جب یہ شروع کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو حتماً اس کو نصب دے گا۔ اِذَنْ اَخْرُجَ لیکن جب اثنائے کلام میں آئے اور پھر اس کے بعد فعل مضارع ہو تو فعل مضارع پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں جیسے اَنَا اِذَنْ اَخْرُجُ وَاَخْرُجَ مگر جب فعل کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل مضارع ہی نہ ہو تو عمل نہیں کرتا[1] جیسے اَنَا اَخْرُجُ اِذَنْ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (۱۴۰:۴) ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

اذی

اَلْاَذٰی ہر اس ضرر کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو پہنچتا ہے[2] وہ ضرر جسمانی ہو یا نفسانی یا اس کے متعلق سے ہو اور پھر وہ ضرور دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾ (۲۶۴:۲) اپنے صدقات (وخیرات) کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاٰذُوْهُمَا﴾ (۱۶:۴) میں مار پٹائی (سزا) کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سورۃ توبہ میں فرمایا: ﴿وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾ (۶۱:۹) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (۶۱:۹) اور جو لوگ رسولِ خدا کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لیے عذاب الیم (تیار) ہے۔ ﴿لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى﴾ (۶۹:۳۳) تم ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف دی (عیب لگا کر) رنج پہنچایا۔ ﴿وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۳۴:۶) اور ایذا (پر صبر کرتے رہے) یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔

---

[1] راجع للتفصیل الرضی علی الکافیۃ ۲/ ۲۳۵۔۲۳۶۔

[2] وفی حدیث شعب الایمان وادناھااماطۃ الاذیٰ عن الطریق وفی العقیقۃ امیطو عنہ الاذیٰ ۱۲۔

﴿ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ ﴾ (۶۱:۵) تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو؟ اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى ﴾ (۲۲۲:۲) میں حیض (کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے) کو اَذًى کہنا یا تو از روئے شریعت ہے یا پھر بلحاظ علم طب کے جیسا کہ اس فن کے ماہرین بیان کرتے ہیں۔ اٰذَیْتُہٗ (افعال) اِیْذَاءً وَاَذِیَّۃً وَاَذًی کسی کو تکلیف دینا۔

اَلْاٰذِیُّ ۔ موج بحر جو بحری مسافروں کے لیے تکلیف دہ ہو۔

ا ر ب

اَلْاَرَبُ کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لیے حیلہ اور تدبیر کرنی پڑے پس اَرَبٌ خاص اور حَاجۃٌ عام ہے پھر کبھی اَرَبٌ کا لفظ صرف حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی محض حیلہ اور تدبیر کرنے کے لیے آتا ہے گو حاجت نہ ہو۔ مثلاً محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ذُوْ اَرَبٍ وَاَرِیْبٌ! فلاں صاحب حیلہ اور چالاک ہے۔ اَرِبَ اِلٰی کَذَا، اَرَبًا وَاُرْبَۃً وَ اِرْبَۃً وَمَاْرَبَۃٌ کے معنی ہیں وہ کسی چیز کا سخت محتاج ہوا۔ (مَاْرَبَۃٌ۔ سخت حاجت ج مَاٰرِب) قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴾ (۱۸:۲۰) اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔

وَلَا اَرَبَ لِیْ فِیْ کَذَا: مجھے اس کی کوئی شدید ضرورت نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ (۳۱:۲۴) نیز وہ خدمت گزار مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں۔ میں اِرْبَۃٌ سے بطور کنایہ حاجت نکاح مراد ہے۔

اَلْاُرْبٰی: بڑی مصیبت جس کے دور کرنے کے لیے تدبیر اور حیلہ کرنا پڑے۔

اَلْاٰرَابُ (واحد اِرْبٌ) وہ اعضاء جن کی انسان کو سخت ضرورت رہتی ہے کیونکہ اعضاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کے ذریعہ ہر جاندار چیز اپنی ضروریات پورا کرتی ہے جیسے ہاتھ پاؤں اور آنکھ اور دوسرے وہ جو محض زینت کے لیے بنائے گئے ہیں جیسے بھویں، داڑھی وغیرہ پھر وہ اعضاء جو حوائج کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جن کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور دوسرے وہ ہیں جن کی سخت احتیاج رہتی ہے اور ان کے بغیر جسم انسانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس دوسری قسم کے اعضاء کو اٰرَابٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے [1] (۹) اِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَہٗ سَبْعَۃُ اٰرَابٍ کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اُس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں، چہرہ، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے اور دو پاؤں اور جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق (وافر) حصہ لے تو کہا جاتا ہے اَرَّبَ نَصِیْبَہٗ اس نے بڑا حصہ لیا اور وافر۔ اسی سے محاورہ ہے: اَرَّبَ مَالَہٗ اس نے اپنا مال بڑھالیا اَرَّبْتُ الْعُقْدَۃَ میں نے مضبوط گرہ لگائی۔

ا ر ض

اَلْاَرْضُ: (زمین، سَمَاءٌ: (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع اَرْضُوْنَ ہے۔

[1] رواہ الاربعۃ من حدیث ابن عباس ﷺ وفی الصحیحین عنہ امرت ان اسجد علی سبعۃ اعظم وفی لفظ "اعضاء" وفی ابی داؤد ایضاً امرنبیکم راجع تخریج الکشاف للحافظ ابن حجرؒ ۱۷۸ رقم: ۲۳۲. والفیل ۲: ۲۶۷ والعون باب اعضاء السجود ۱۲.

جس کا صیغہ قرآن پاک میں نہیں ہے۔ کبھی اَرْض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے گھوڑی کے وصف میں کہا ہے ❶ (طویل)

(۱۲) وَاَحْمَرَ کَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُھَا فَرَیَّا وَاَمَّا اَرْضُھَا فَمَحُوْلُ

وہ دیبا کی طرح سرخ ہے اس کا اوپر کا حصہ موٹا گداز ہے لیکن اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں وغیرہ) خشک اور سخت ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ﴾ جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (۱۷:۵۷)

میں فساد کے بعد تکوین اور بدء کے بعد عود کی طرف اشارہ ہے وہ نظام جو عالم میں جاری و ساری ہے اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے دلوں کو ان کے سخت ہونے کے بعد نرم کرنا مراد ہے۔ محاورہ ہے: اَرْضٌ اَرِیْضَۃٌ زرخیز زمین تَاَرَّضَ النَّبْتُ نباتات زمین پر جم گئی اور زیادہ ہوگئی تَاَرَّضَ الْجَدْیُ بکری کے بچہ نے گھاس کھائی اور اَرَضَۃٌ کے معنی دیمک کے ہیں اور اُرِضَتِ الْخَشَبَۃُ کے معنی ہیں لکڑی دیمک خوردہ ہوگئی اور دیمک خوردہ لکڑی کو مَارُوْضَۃٌ کہا جاتا ہے۔

ا ر ک

اَلْاَرِیْکَۃُ (مسہری) حجلہ (چھپر کھٹ) جو سریر یعنی تخت کے اوپر رکھا ہو اس کی جمع اَرَائِکُ ہے اور اسے اَرِیْکَۃَ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ارض یعنی دنیا میں اراک، (پیلو کی لکڑی) سے بنایا جاتا ہے جو ایک قسم کا درخت ہے اور یہ اَرَاكَ بِالْمَكَانِ اُرُوْكًا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر اراك (یعنی پیلو) کے پتے چرنے کے لیے ٹھہرنا کے ہیں پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ (اس لیے جنت کے چھپر کھٹوں کو جو اہل جنت کی اقامت گاہ ہوں گے۔

﴿ اَرَائِكُ ﴾ (۲۱:۱۸) کہا گیا ہے۔

ا ر م

اَلْاِرَمُ۔ دراصل اس نشان کو کہتے ہیں جو پتھروں سے بنادیا جاتا ہے اس کی جمع ارامٌ ہے اور پتھروں کو اُرَّم کہا جاتا ہے اور اسی سے غضب ناک آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ یَحْرِقُ الْاُرَّمَ یعنی فلاں مارے غصے کے دانت پیتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ (۸۹:۷) ارم ستونوں والے۔ میں ارم سے بلند اور مزین ستون مراد ہیں (جو قوم عاد نے بنائے تھے) مَا بِھَا اَرِمٌ وَاَرِیْمٌ یعنی اس میں کوئی نہیں اصل میں اس کے معنی اَللَّازِمُ لِلَّازِمِ کے ہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ (حرف) نفی کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ مَابِھَا دِیَّارٌ کا محاورہ ہے اور اس کے اصل معنی مقیم فی الدار کے ہیں۔

---

❶ البیت لطفیل الغنوی وفی اللسان (ارض) ارضہ وسماءہ بالتذکیر ایضا راجع الاقتضاب ۳۳۵ وتھذیب الاصلاح (۱:۴۰) والعقد (۱:۱۸۵) ومعانی العسکری ۲:۱۰۶) والسمط(۲:۸۸۱) والقالی ۲:۲۴۸ والمعانی للقبتی (۱:۱۵۵)قال وسماء الفرس ماکان من عجب الذنب الی العذر وارضہ قوائمہ وارض الفرس فی غیر ھذاالمواضع حوافرہ والبیت فی دیوانہ ۶۲ (ملحقاتہ) وقانون البلاغہ ضمن رسائل البلاغہ (صنعۃ کرد علی) وامالی المرتضی (۲:۱۶۹) وفیہ کالدنیا بدل کالدیباج وھو احسن.

ا ز ز

آیت کریمہ: ﴿تَـؤُزُّهُـمْ اَزًّا﴾ (۸۳:۱۹) کے معنی ہیں کہ وہ ان کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں یہ اَزَّتِ الْقِدْرُ سے ہے جس کے معنی ہیں: ہنڈیا میں جوش اور ابال آ گیا (اسی مناسبت سے ورغلانا یا ابھارنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) ایک روایت میں ہے:

(۷) اَنَّـهٗ عَـلَيـهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُصَلِّيْ وَلِـجَـوفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ کہ آنحضرت نماز پڑھتے تو آپ کے اندرون سے ہنڈیا کے کھدکھدانے کی (طرح رونے کی) آواز آتی۔ اَزَّهٗ اس کو بھڑکایا اور جھنجھوڑا۔ یہ هَزَّهٗ سے ابلغ ہے۔

ا ز ر

اصل میں ازر اور اِزَار کے معنی لباس (یعنی تہبند) کے ہیں اِزَارٌ اِزَارَةٌ وَمِئْزَرَةٌ تینوں ہم معنی ہیں کنایہ کے طور پر اِزَارٌ سے عورت مراد لی جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] ع

(۱۳) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُولًا
فِدًى لَكَ مِنْ اَخِي ثِقَةٍ اِزَارِي

ابوحفص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو میرا پیغام پہنچا دو تجھ جیسے قابل اعتماد بھائی پر میری بیوی قربان ہو۔

اور عورت کو اِزار اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مرد کے لیے بمنزلہ لباس کے ہے، جیسے فرمایا: ﴿هُـنَّ لِبَـاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (۱۸۶:۲) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اَلْاَزْرُ کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اُشْـدُدْ بِـهٖ اَزْرِيْ﴾ (۳۱:۲۰) اس سے میری قوت کو مضبوط فرما یعنی مجھے اس سے تقویت حاصل ہوگی۔ اٰزَرَهٗ۔ اعانت کرنا اور تقویت بخشنا۔ اصل میں یہ شَـدُّ الْاِزَار سے ہے جس کے معنی ہیں چادر باندھنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَـزَرْعٍ اَخْـرَجَ شَـطْـاَهٗ فَاٰزَرَهٗ﴾ (۲۹:۴۸) وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے) زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا۔ محاورہ ہے: اٰزَرْتُهٗ فَتَاَزَّرَ میں نے اسے تہبند پہنائی تو اس نے پہن لی۔ اٰزَرْتُ الْبِنَاءَ وَاَزَرْتُهٗ میں نے عمارت کی بنیاد کو مضبوط کیا تَـاَزَّرَ النَّبَات نبات بڑھ گئی اور مضبوط ہوگئی اٰزَرْتُـهٗ و وَازَرْتُهٗ میں اس کا وزیر بن گیا اصل میں یہ مثال واوی (وزر) سے ہے (جس کے معنی دوسرے کا بوجھ اٹھانا کے ہیں)

فَرَسٌ اٰزَرُ گھوڑا جس کی ٹانگیں محل اِزار تک سفید ہوں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذْ قَـالَ اِبْـرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ﴾ (۷۴:۶) اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ تھا اور آزر اسی کا معرب ہے اور بعض نے کہا کہ (یہ لقب ہے

---

[1] قالہ ابو المنهال بقبلة الاكبر الاشجعي فی قصيدة ۱٤ الی عمرؓ عرض فيها بجعدة بن عبدالله السلمي والی الكوفة والبيت القصة فی اللسان (ازر) فی ستة ابيات والموتلف للامدی ۸۲ فی خمسة ابيات وابواب مختارة او العقد الفريد (۲ : ٦۳) والفائق (۱ : ۱۷) والعمدة (۱ : ۳۱۲) فی اربعة والمشكل للقتبی ۱۰۸، ۲۰۵ فی خمسة ابيات ومجازات القرآن للشريف الرضی ۳۵۳ والاصابة ۷۲۱، ۲۸۸، رقم وكنزا لعمال برواية ابن سيرين : ج ۵ رقم ۱۸٤٦ وفی الصناعتين غير منسوب ۱۲.

اوران کی زبان میں آزَرُ کے معنیٰ گمراہ کے ہیں۔

ازف

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ (۵۳:۵۷) یعنی قیامت قریب آپہنچی اَزِفَ وَاَفِدَ دونوں قریب المعنی ہیں قیامت کو اَزِفَ کہنا بلحاظ ضیق وقت کے ہے جیسے کہا جاتا ہے اَزِفَ الشُّخُوصُ (کاوقت قریب آپہنچا) اور اَزَفٌ کے معنیٰ ضیق وقت کے ہیں اور قیامت کو اٰزِفَةٌ کہنا اس کے قرب وقت کے اعتبار سے ہے اور اسی بنا پر اس کو سَاعَةٌ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔اور نیز آیت کریمہ:

﴿اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ﴾ (۱:۱۶) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔

میں قیامت کو لفظ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا ہے نیز فرمایا: وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ (۴۰:۸) اوران کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔

اس ر

اَلْاَسْرُ کے معنیٰ قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پالان کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قیدی کو اَسِیر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ رسی وغیرہ سے باندھا ہوتا ہے۔قرآن میں ہے:

يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۷۶:۸) اور یتیموں اور قیدیوں کو۔پھر ہر اس شخص کو جو گرفتار اور مقید ہو کر آئے الاسیر کہہ دیا جاتا ہے گو وہ باندھا ہوا نہ ہو اَسِيْرٌ کی جمع اَسَارٰی وَاُسَارٰی وَاَسْرٰی ہے [1] اور مجازاً۔اَنَا اَسِيْرُ نِعْمَتِكَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی تیرے احسان کی رسی میں بندھا ہوا ہوں۔اور اُسْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی افراد خاندان کے ہیں جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔اور آیت کریمہ: وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ (۷۶:۲۸) اور ان کی بندش کو مضبوطی سے باندھ دیا۔میں اس حکمت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی ہیئت ترکیبی میں پائی جاتی ہے جس پر کہ آیت وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱:۲۱) میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اَلْاُسْرُ کے معنی ہیں: پیشاب بند ہو جانا۔اور جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو اسے مَاسُوْرٌ کہا جاتا ہے گویا اس کی پیشاب کی نالی بند کردی گئی ہے اس کے مقابلہ میں پاخانہ کی بندش پر حُصرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس س

﴿اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ﴾ (۹:۱۰۹) کے معنی ہیں: اس نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسٌّ وَاَسَاسٌ کہا جاتا ہے۔اُسٌّ کی جمع اِسَاسٌ اور اَسَاسٌ کی جمع اُسُسٌ آتی ہے محاورہ ہے: كَانَ ذٰلِكَ عَلٰی اُسِّ الدَّهْرِ (واست الدهر) (بود آں برہمیشگی زمانہ واول آن) یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے جیسا کہ عَلٰی وَجْهِ الدَّهْرِ کا محاورہ مشہور ہے۔

اس ف

اَلْاَسَفُ: حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کبھی آسَفَ کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔اصل میں اس کے معنی جذبۂ

[1] قرآن پاک میں ہے وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسَارٰی (۲۔۸۵) وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی (۸۔۶۶).

انتقام سے دَمِ قلب کے جوش مارنا کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے۔ اس لیے جب حضرت ابن عباسؓ سے حزن اور غضب کی حقیقت دریافت کی گئی تو انھوں نے فرمایا: لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور کے ساتھ جھگڑتا ہے تو غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے اور جب اپنے سے قوی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو واویلا اور غم کا اظہار کرتا ہے اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ ع البسیط

(۱۴) فَحَزْنُ كُلِّ اَخِيْ حُزْنٍ اَخُو الْغَضَبِ کہ ہر غمزدہ کا حزن غضب کا ساتھی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (۴۳:۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ یہاں ابوعبداللہ الرضا کا قول ہے کہ اللہ میاں ہماری طرح خفا نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خفا ہونے سے اس کے اولیاء کا خفا ہونا مراد ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کے معنی اس کے اولیاء کے راضی ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے: (۱) مَنْ اَهَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ یعنی جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔ اور قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۴:۸۰) جو شخص رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔ اور آیت کریمہ: ﴿غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ (۷:۱۵۰) میں اَسِفٌ کے معنی بھی غضب ناک ہی کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ماتحت غلام کو نیز جس کا (بوجہ کراہت کے) نام لینا پسند نہ ہو اسے اَسِفٌ (بیچارہ) کہہ دیا جاتا ہے۔ ❷

ا س ن

اَسَنَ (ـُ) اَلْمَاءُ پانی کا سخت بدبودار ہو جانا مَاءٌ اٰسِنٌ متغیر اور بدبودار پانی۔ چنانچہ فرمایا: مِنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ (۴۷:۱۵) اس پانی کی (نہریں ہیں) جو کبھی بدبودار نہیں ہوگا۔

اَسَنَ الرَّجُلُ پانی کی بدبو سے بیمار اور بیہوش ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۱۵) يَمِيْدُ فِی الرُّمحِ مَيْدَ الْمَائِحِ الاَسِنِ۔

نیزے پر اس طرح تڑپتا ہے جیسے کنویں پر اترنے والا بیہوش آدمی تڑپ رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے

---

❶ وصدره جزاك ربك بالاحزان مغفرة ...... قاله المتنبی فی رثاء اخت سیف الدولة فی (٤٤) بیتاً مطلعها یااخت خیراخ یا بنت خیراب كناية بهما عن اشرف النسب راجع دیوانه ٣٢٩ طبقة طبعة مصر ١٣٤٢ء وبشرح العكبری (١: ٩٤) والشطرایضافی محاضرات المؤلف (٤: ٥٠٦ و ١: ٢٢٣)، اصله فی الصحیحین وراوه ابن ابی الدنیا فی كتاب الاولیاء والحكیم الترمذی فی جامعه وابن مردویة حل فی الاسماء وابن عساكر عنها انس انظر للحدیث باختلاف الفاظه كنزالعمال (ج: ١ رقم ١١٥٦ و ١١٦١ـ ١١٦٢) ١٢.

❷ ایضاً اَسَفٰی وفی القران یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (١٢: ٨٤) ایضاً رجل اسیف ای سریع الحزن والبكاء كمافی حدیث عائشة : ان ابابكر رجل اسیف راجع الفائق : ١/ ١٩.

❸ قاله زهیر السلمی وصدرهٗ = وقد اترك القِرن مصفراً انامله.......... وفی روایة اللسان (اسن) یغادر بدل اترك وهو الصواب لانه من صفة الممدوح ای ابن سنان راجع للبیت ملحقات دیوانه ١٩٤ والعقد الثمین والمختارات ٥٢ والسمط (١ـ ١٩٩) والبحر٧: ٧٠) والطبرسی (٢٦ـ ٣٣) وفی روایة التارك القرن مصفراً انامله ویمیل بدل یمید.

طور تَأَسَّنَ الرَّجُلُ محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بیمار پڑنے کے ہیں۔

ا س و

اَلْاُسْوَۃ وَالْاِسْوَۃُ (قُدْوَۃٌ اور قِدوۃ کی طرح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، سرور بخش ہو یا تکلیف دہ۔ اسی لیے آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۱:۲۲) تمہارے لیے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے۔ میں اُسْوَۃٌ کی صفت حَسَنَۃ لائی گئی ہے۔ ❶

تَأَسِّیْتُ بِهٖ: میں نے اس کی اقتداء کی۔

اَلْاَسٰـی: بمعنی حزن آتا ہے اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا ہوتے ہیں۔

اَسِیْتُ عَلَیْهِ اَسًی وَاَسِیْتُ لَهٗ کسی چیز پر غم کھانا قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۶۸:۵) تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔

شاعر نے کہا ہے: ❷ ع

(۱۶) اَسِیْتُ لِاَخْوَالِیْ رَبِیعه۔

میں نے اپنے اخوال بنی ربیعہ پر افسوس کیا۔

یہ اصل میں (ناقص) واوی سے ہے کیونکہ محاورہ میں غمگین آدمی کو اَسْوَانُ (بالفتح) کہا جاتا ہے۔ اَلْاَسْوُ کے معنی زخم کا علاج کرنے کے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی ازالۂ غم کے ہیں اور یہ کَرَبْتُ النَّخْلَ کی طرح ہے جس کے معنی: کھجور کے درخت کی شاخوں کی جڑوں کو دور کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اَسَوْتُهٗ: اَسُوْءُہٗ اَسْوًا (از باب نصر) یعنی میں نے اس کا غم دور کیا اس کو تسلی دی۔

اَلْاٰسِیْ: صالح۔ مرہم پٹی کرنے والا۔ اس کی جمع اِسَاءٌ وَاُسَاۃٌ ہے اور زخمی آدمی کو مَاْسِیٌّ وَاَسِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اَسِیْتُ بَیْنَ الْقَوْمِ: باہم صلح کرانا۔ اٰسَیْتُهٗ (مفاعلہ) کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ (مال وغیرہ کے ذریعہ)۔ شاعر نے کہا ہے ❸ ع

(۱۷) آسیٰ اخاہ بنفسہ (طویل)

جس نے خود کو اپنے بھائی پر نثار کردیا ہو۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ❹

(۱۸) فَآسٰی وآداہ فکان کمن جنٰی

اس نے ہمدردی کی اور سامان حرب دیا تو گویا اس نے

---

❶ نیز فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۶۰ : ۴).

❷ قطعة من البيت قاله البحری فی قصيدة له فی ۴۵ بيتا يمدح المتوكل ويذكر صلح بنی تغلب وتمامه .... ان عفت مصايفها واقوت ربوعها والبيت فی الحصری (۱ : ۱۱۱) وفی رواية ديوانه ۱۲۹۸ بشرح حسن كامل صير فی ۔ اذا عفت بدل ان عفت ومصانعها بدل مصايفها .

❸ قطعة من البيت من قصيدة جمهرية فی ۲۵ بيتاً قالها دريدبن الصمة احد بن بكر بن حشم فی رثاء اخيه عبدالله وتكملته: قتال امرء آسی اخاه بنفسه ويعلم ان المرء غير مخلد ۔ والبيت فی الحمهرة ۲/۲ والشطر الثانی فی اشعار حطيئة (العمدة لابن رشيق ۲ : ۱۳۷) ودیدهذا شاعر شجاع فارس قتل يوم حنين مع المشركين (بنی هوازن) راجع المعمرين ۲۱۔۲۲ والاستقاق ۱۷۷۔۱۷۸ والاغانی ۹/۲۰۹ اوالـلا لی ۳۹۔۴۰ والمؤتلف اوالخزانة ۴ : ۴۴۲۔۴۴۷/۱۳ : ۴۶۱۔ ۴۶۲ والسيرة ۸۴۱۔۸۴۲ (جوتنحن) والشعراء ۷۵۔۷۲۹.

❹ قاله سويد المرتد الحارثی وصدره : ولم يحنها ولكن حناها وليها ۔ وفی البيت آواه (بالمهملة) من الاداة ای عدة الحرب آواه اصله اعداه بالعين فابدلت همزةً (راجع المرزوقی ص ۸۱۷۔رقم ۲۷۱ ، والكامل ۲۰۲ ۱فی ابيات والعيون ۱ : ۱۹ واللسان (رحنی) وف ی النسخ المطبوعة اذاه (بالمعجمة) مصحف .

جنایت کی۔

یہاں آسٰی بروزن فَاعَلَ یُواسی سے ہے اسی طرح شاعر کے قول [1]

(۱۹) یَکْفُوْنَ اثْقَالَ ثأی المستأسی

المستأی بروزن مستفعل بھی اسی مادہ سے مگر اَلْاِسَاءَۃُ (افعال) جس کے معنی تکلیف پہنچانے کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ سَاءَ (س و ء) سے منقول ہے۔

ا ش ر

اَلْاَشَرُ: بہت زیادہ اترانا اَشِرَ یَاْشَرُ اَشْرًا (س) اَلْاَشِرَ: بہت زیادہ اِترانے والا) قرآن پاک میں ہے: ﴿ سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ (۲۶:۵۴) ان کو کل ہی معلوم ہوجائے گا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔ پس اَشَرٌ بَطَرٌ سے ابلغ ہے اور بَطَرٌ میں فَرَحٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور فَرَحٌ اگرچہ عام حالات میں مذموم ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ﴾ (۷۶:۲۸) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن ایسے موقع پر جب خوشی کا اظہار ضروری ہو اور وہ اظہار بھی جب ضرورت ہو تو فرحت ممدوح ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ﴾ (۵۸:۱۰) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ کیونکہ کبھی سرور کی وجہ سے فرحت کا حصول تقاضائے عقل کے مطابق ہوتا ہے مگر اَشَرٌ اس فرحت کو کہتے ہیں جو مبنی برہوائے نفس ہو اور اسی سے بطور تشبیہ نَاقَۃٌ مِئْشِیْرٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی چست اونٹنی کے ہیں اور اس کے معنی دبلی اونٹنی بھی آتے ہیں اس صورت میں یہ اَشَرْتُ الْخَشَبَۃَ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لکڑی چیرنا کے ہیں۔

ا ص ب ع

اَلْاِصْبَعُ: (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرا خم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے [2] اور بطورِ استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لَکَ عَلَیْہِ یَدٌ کی طرح لَکَ عَلٰی فُلَانٍ اِصْبَعٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ا ص ر

اَلْاَصْرُ: (ض) کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور اس کو زبردستی روک لینا کے ہیں اَصَرَ یَأْصِرُ اِصْرًا فَھُوَ مَاصُوْرٌ اور مَاْصَرٌ وَمَاصِرٌ بندرگاہ پر جہاز کھڑا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَاھُمْ ﴾ (۷:۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ...... اتارتے ہیں۔ یہاں اِصْرٌ سے وہ دشواریاں مراد ہیں جو خیرات اور ثواب تک پہنچنے سے ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اور آیت:

﴿ وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا ﴾ (۲:۲۸۶) میں بھی اِصْرٌ اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اِصْرٌ کے معنی بوجھ کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کردی ہے۔

نیز اِصْرٌ اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] لم اجده۔

[2] وجمعه: اصابع راجع الآیة (۲۔۱۹).

﴿ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ﴾ (۳:۸۱) بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پختہ عہد لیا؟
اَلْاِصَارُ: رسی یا میخ جن کے سہارے پر خیمہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مَا يَاْصِرُنِی عَنْكَ شَيْءٌ مجھے تیرے پاس پہنچنے سے کوئی چیز مانع ہے۔ اَلْاَبْصَرُ: وہ کمبل جس میں خشک گھاس بھر کر اونٹ کی کوہان کے گرد لپیٹا جاتا ہے تاکہ اس پر آسانی کے ساتھ سواری ہو سکے۔

ا ص ل

اَصْلُ الشَّيْءِ: (جڑ) کسی چیز کی اس بنیاد کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتفاع فرض کیا جائے تو اِس شے کا باقی حصہ بھی معلوم ہو جائے قرآن پاک میں ہے: ﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ﴾ (۱۴:۲۵) اِس کی جڑ (زمین میں) پختگی سے جمی ہے اور شاخیں آسمان میں۔
اور تَاَصَّلَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے جڑ پکڑنا ہیں اسی سے اصل اور خاندانی بزرگی مجد کو اَصِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا اَصْلَ لَه وَلَا فَصْلَ یعنی نیست اور احسب ونہ زبان۔ اَلْاَصِيْلُ وَالْاَصِيْلَة کے معنی (عَشِيَّة) عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔﴿ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ (۳۳:۴۲) اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کرتے رہو۔
اَصِيْلَ کی جمع اُصُلٌ وَاٰصَالٌ اور اَصِيْلَةٌ کی جمع اَصَائِلُ ہے، قرآن پاک میں ہے، ﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۷:۲۰۵) صبح اور شام۔

ا ف ف

اَلْاُفُّ: اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو کہتے ہیں میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ اور محاورہ میں کسی بری چیز سے اظہار نفرت کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۱:۶۷) تف ہے تم پر اور جنھیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی۔
﴿اَفَفْتُ لِكَذَا﴾ کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا اُفٍّ کہنا۔ اسی سے اَفَّفَ فُلَانٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل برداشتگی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

ا ف ق

اَلْاُفُقُ: کنارہ جمع آفَاقٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ﴾ (۴۱:۵۳) ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی ...... نشانیاں دکھائیں گے، آفاق کے معنی اطراف کے ہیں اس کا واحد اُفُق وَاُفْقٌ ہے [1] اور نسبت کے وقت اُفُقِیٌّ کہا جاتا ہے اور اَفِقَ فُلَانٌ کے معنی آفاق (اطراف عالم) میں جانے کے ہیں اور افق کے اطراف میں انتہائی بُعد اور وسعت سے تشبیہ کے طور پر اٰفِقٌ کا لفظ انتہائی سخی پر بولا جاتا ہے۔

ا ف ک

اَلْاِفْكُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بناء پر ان ہواؤں کو جو اپنا رخ چھوڑ دیں، مُؤْتَفِكَةٌ کہا جاتا ہے اور آیاتِ کریمہ: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ﴾ (۶۹:۹) اور الٹنے والی بستیوں نے گناہ کے کام کیے تھے۔
﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی﴾ (۵۳:۵۳) اور الٹی ہوئی

[1] وفی القرآن ﴿ولقد راٰه بالافق المبين﴾ (۸۱-۲۳) ﴿وهو بالافق الاعلیٰ﴾ (۵۳).

بستیوں کو دے پٹکا۔(میں مؤتفکات سے مراد وہ بستیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کے بسنے والوں کو الٹ دیا تھا) ﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ (۹:۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔یعنی اعتقاد وحق سے باطل کی طرف اور اچھے کاموں سے برے افعال کی طرف پھر رہے ہیں۔اسی معنی میں فرمایا:﴿يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ﴾ (۵۱:۹) اس سے وہی پھرتا ہے جو(خدا کی طرف سے) پھیرا جائے۔﴿فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ (۹۵:۶) پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو؟ اور آیت کریمہ:﴿اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا﴾ (۴۶:۲۲) کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمارے معبودوں سے پھیر دو؟

میں اِفك کا استعمال ان کے اعتقاد کے مطابق ہوا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں آلہہ کی عبادت ترک کرنے کو حق سے برگشتگی سمجھتے تھے۔

جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لیے اس پر بھی اِفْكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ﴾ (۱۱:۲۴) جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تمہی لوگوں میں سے ایک جماعت ہے۔﴿لِكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ (۷:۴۵) ہر جھوٹے گنہگار کے لیے تباہی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ﴾ (۸۶:۳۷) کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو۔میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْكًا مفعول نہ ہو اَیْ اٰلِهَةً مِنَ الْاِفْكِ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْكًا تُرِيْدُوْنَ کا مفعول ہو اور اٰلِهَةً اس سے بدل......اور باطل معبودوں کو (مبالغہ کے طور پر) اِفْكًا کہہ دیا ہو۔ [1]

اور جو شخص حق سے برگشتہ ہوا سے مَاْفُوْكٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے [2] ع (منسرح)

(۲۰) فَاِنْ تَكُ عَنْ اَحْسَنِ الْمُرُوْءَةِ مَأْفُوْا
كَافِفِيْ اٰخَرِيْنَ قَدْ اُفِكُوْا

اگر تو حسن مروت کے راستہ سے پھر گیا ہے تو تم ان لوگوں میں ہو جو برگشتہ ہو چکے ہیں۔

اُفِكَ الرَّجُلُ يُؤْفَكُ کے معنی دیوانہ اور باؤلا ہونے کے ہیں اور باؤلے آدمی کو مافوک العقل کہا جاتا ہے۔

ا ف ل

اَلْاُفُوْلُ کے معنی ماہتاب اور نجوم (وغیرہ نَيِّرَاتِ) کے غروب ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ (۷۶:۶) جب وہ غائب ہوگیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔

﴿فَلَمَّآ اَفَلَتْ﴾ (۷۸:۶) مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا۔بھیڑ بکری کے چھوٹے بچوں کو افال اور اونٹ کے کمزور اور چھوٹے بچے کو اَفِيْلٌ کہا جاتا ہے۔

[1] ذكر الزمخشري ههنا ثلاثة اوجه من الاعراب اثنان ذكرهما المؤلف والثالث ان يكون افكا حالا من ضمير الفاعل (٤٩٠٤) طبع مصر.

[2] قاله عمر ابن اذينه والبيت في اللسان والصحاح (انك) والطبرى (٢٦ـ١٩) وشواهد الكشاف ٨٧ وتهذيب الاصلاح (١:٣٤) والاصلاح ٢٣ وتهذيب الالفاظ ٥٥٢ والبحر٣: ٥٠٦/٧: ٤٩٤ والغريب القتبى ٣٠.

ا ک ل

اَلْاَکْلُ کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اَکَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اُکُلٌ (بضم کاف وسکون) کہا جاتا ہے ارشاد ہے: اُکُلُھَا دَآئِمٌ (۳۵:۱۳) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

اَلْاَکْلَۃُ: مرۃ کا صیغہ ہے یعنی ایک مرتبہ کھانا اور اَلْاُکْلَۃُ بمعنی لُقْمَۃ ہے۔

اَکِیْلَۃُ الْاَسَدِ شیر کا شکار کیا ہوا جانور جسے وہ کھاتا ہے۔

اَلْاَکُوْلَۃُ بکری جو کھانے کے لیے موٹی کی گئی ہو۔

اَلْاَکِیْلُ: ہم پیالہ کو کہتے ہیں اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے: فُـلَانٌ مُؤْکَلٌ وَمُطْعَمٌ (کنایہ مالدار تونگر) ثَوْبٌ ذُوْ اُکلٍ: سخت بنا ہوا کپڑا، گھنی بناوٹ کا کپڑا۔ اَلتَّمْرُ مَأْکَلَۃٌ لِلْفَمِ: کھجور خوردنی چیز ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ذَوَاتَی اُکُلٍ خَمْطٍ﴾ (۱۶:۳۴) اور کبھی اُکُلٌ کا لفظ نصیبہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فُـلَانٌ ذُو اُکُلٍ مِنَ الدُّنْیَا یعنی وہ دنیا سے بہرہ یاب ہے۔ اِسْتَوْفٰی فُـلَانٌ اُکُلَہٗ کنایہ از موت یعنی رزق پورا لے لیا۔ اَکَلَ فُـلَانٌ فُلَانًا اس نے فلاں کی غیبت کی اور یہی معنی اَکَلَ لَحْمَہٗ کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (۴۹:۱۲) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۲۱) فَاِنْ کُنْتُ مَاکُوْلًا فَکُنْ اَنْتَ اٰکِلِیْ اگر مجھے کھایا جانا ہے تو تم خود ہی کھالو۔

مَـا ذُقْتُ اُکُلًا میں نے کوئی چیز نہیں کھائی اور چونکہ کھانے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت مال کی ہوتی ہے اس لیے اَلْاُکُلُ کے معنی مال خرچ کرنا بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (۴:۲۹) ایک دوسرے کا مال ناحق صرف نہ کرو۔ اور آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا﴾ (۴:۱۰) میں یتامیٰ کا مال کھانے سے اس کو ناجائز طور پر صرف کرنا مراد ہے اور پھر بعد میں ﴿اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ (۴:۱۰) کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ یہ انھیں جہنم میں لے جائے گا۔ اَلْاَکُوْلُ وَاَلْاَکَّالُ (مبالغہ) زیادہ کھانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (۵:۴۲) اور (رشوت کا) حرام مال بہت زیادہ کھانے والے ہیں۔

اٰکِلٌ کی جمع اَکَلَۃٌ ہے محاورہ ہے: هُمْ اَکَلَۃُ رَأْسٍ۔ یعنی وہ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ (بکری کا) ایک سر ہی انھیں

---

[1] قاله الممزق العبدی حینما غضب علیه النعمان بن المنذر وعمرو ابن هند وتمامه .... والافادرکنی ولمامزّق وفی اللسان (مزق) خیر آکلی بدل انت اکلی والبیت ایضاً فی اللسان (اکل) وذیل امالی المرتضیٰ (۱۔۳۲۵) والکامل للمبرد (۱: ۱۸) والسیوطی: ۷ او الاصمعیات ۵۸ والاشباه النحویه (۲: ۲۲۲) فی بحث الفرق بین لم ولماو البحر (۷: ۵۵) والمؤتلف للآمدی ۲۸۳ وکتب عثمان ایام الفتنة الی علیؓ مکتوباً یستنجده وختمة لهٰذا البیت انظر العمدة (۱: ۴۷، ۲۶) وابن حشام (۱: ۳۰۹) واعراب ثلاثین ۲۰۲ والحصری (۱: ۷۵) وامالی ابن الشجری (۱: ۱۳۵) والعقد (۱۶۳۔۱۶۴) والعیون (۱: ۳۴) وایضاً السیوطی ۲۳۳ والشاعر اسمه شاس بن نهار العبدی ولقب بالممزق لقوله فی هذا فی هذا البیت (ومما امزق) راجع الآمدی ۱۸۵، ۱۸۶.

[2] راجع للبحث عن حروف الهجاء المقدمه .

کافی ہے ❷ کبھی اَکْـلٌ کے معنی خراب کرنا بھی آ جاتے ہیں (یعنی کھانے کے بعد جو خراب سارہ جاتا ہے) جیسے فرمایا: کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ: یعنی کھایا ہوا بھس۔

تَاَکَّلَ کَذَا: کسی چیز کا خراب ہو جانا اَصَابَهٗ اُکَالٌ فِیْ رَاْسِهٖ وَفِیْ اَسْنَانِهٖ سر کا کھجلی اور دانتوں کا خوردہ سے خراب ہو جانا واکــلنی رأسی یعنی میرے سر کے بال جھڑ گئے میــکائیل ایک فرشتے کا نام ہے اور وہ عربی لفظ نہیں ہے۔

ا ل ل

اَلْاِلُّ: ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن ہو، عہد قرابت داری۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا یَرْقُبُوْنَ فِــیْ مُـؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً﴾ (۹:۱۰) یہ لوگ کسی مؤمن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔

اَلَّ الْـفَرَسُ: گھوڑے کا تیز چلنا اس کے اصل معنی چمکنے کے ہیں اور پھر تیز روی کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسے کہ بَـرَقَ وَطَارَ کے الفاظ ہیں۔ اَلْاَلَّةُ چمک دار برچھا اَلَّ بِهَـــا اس نے نیزہ یا برچھا سے مارا اور اسی سے تیز کان کو اُذُنٌ مُـؤَلَّـلَةٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اِلٌّ وَاِیْــــلٌ اسماء حسنٰی سے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اَلْاِلَالُ: چھری کے دنوں پہلو۔

ا ل ف

اَلْاَلِفُ: حروف تہجی کا پہلا حرف ہے ❶ اور اَلْاَلِفُ (ض) کے معنی ہیں: ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہونا۔ محاورہ ہے: اَلَّفْتُ بَیْنَهُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی اور اسی سے اُلْفَةٌ (بمعنی محبت) ہے اور کبھی ہر مألوف چیز کو اِلْفٌ و آلِفٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ﴾ (۳:۱۰۳) جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۸:۶۳) اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔

اور مُـــؤَلَّفٌ اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو یکجا جمع کر دیا گیا ہو اور ہر جزء کو تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اس کی صحیح جگہ پر رکھا گیا ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿لِاِیْـلٰفِ قُـرَیْــشٍ﴾ (۱۰۶:۱) قریش کے مالوف کرنے کے سبب میں اِیْـلَافٌ (افعال کا) مصدر ہے اور آیت: ﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹:۶۰) ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ میں مُـؤَلَّـفَةُ الْقُلُوْب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بہتری کا خیال رکھا جائے حتی کہ وہ ان لوگوں کی صف میں داخل ہو جائیں جن کے وصف میں قرآن پاک نے ﴿لَـوْ اَنْـفَـقْـتَ مَـا فِی الْاَرْضِ جَـمِـیْـعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ فرمایا ہے یعنی مخلص مسلمان ہو جائیں۔

اَوَالِفُ الطَّیْرِ: مانوس پرندے جو گھروں میں رہتے ہیں۔

اَلْاَلْفُ: ایک خاص عدد (ہزار) کا نام ہے اور اسے اَلْفٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعداد کے تمام اقسام جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ اعداد کی چار قسمیں ہیں۔ اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار تو اَلْف میں یہ سب اعداد جمع ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو عدد بھی ہو وہ مکرر آتا ہے۔

---

❷ وایضاً (اوك).

بعض نے کہا ہے کہ الف، حروف تہجی بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ مبدأ نظام بنتا ہے۔ اَلَفْتُ الدَّرَاهِمَ میں نے درہموں کو ہزار کردیا جس طرح مَـاءَيْتُ کے معنی ہیں: میں نے انھیں سو کردیا۔ اٰ لَـفَـتْ دہ ہزار کو پہنچ گئے جیسے اَمَاتْ سو تک پہنچ گئے۔

ا ل ک

اَلْـمَلٰئِكَةُ (فرشتے) اور مَلَكٌ اصل میں مَاْلَكٌ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مَلْأَكٌ سے مقلوب ہے اور مَـاْلَكٌ وَمَـاْ لَـكَةٌ وَاُلُوْكٌ کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے اَلِـكْنِی کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ''اسے میرا پیغام پہنچادو۔''

اَلْمَلَائِكَةُ کا لفظ اسم جنس ہے اور واحد وجمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا ﴾ (۷۵:۲۲) خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ مَـاْلَـكَةٌ کے معنی ہیں پیغام اور اسے مَألكة اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فَـرَسٌ يَـاْلَكُ اللِّجَامَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

ا ل م

اَلْاَلَمُ کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے اَلِمَ يَاْلَمُ (س) اَلَـمًـا فَهُوَ اٰلِمٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَـاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ﴾ (۱۰۴:۴) تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔ اٰ لَمْتُ فُـلَانًا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَهُـمْ عَـذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (۱۰:۲) میں اَلِيْمٌ بمعنی مُـؤْلِمٌ ہے یعنی دردناک، دکھ دینے والا۔ اور آیت: ﴿ اَلَـمْ يَـاْتِكُمْ ﴾ (۶۴:۵) کیا تم کو...... نہیں پہنچی؟ میں الف استفہام کا ہے جو لَـمْ پر داخل ہوا ہے (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

ا ل ہ

اَللّٰهُ (۱) بعض کا قول ہے کہ اللہ کا لفظ اصل میں اِلٰهٌ ہے ہمزہ (تخفیفا) حذف کردیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لاکر باری تعالیٰ کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے اسی تخصیص کی بنا پر فرمایا: ﴿ هَـلْ تَـعْـلَـمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ (۶۵:۱۹) کیا تمھیں اس کے کسی ہمنام کا علم ہے۔

اِلٰـهٌ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو اِ لَاهَة کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انھوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

اِلٰـهٌ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ اَلَـهَ (ف) يَاْلَهُ فُـلَانٌ وَتَاَلَّهَ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر اِلٰـهَ کے معنی ہوں گے: معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلِـهَ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے ادراک سے چونکہ عقول، متحیر اور درماندہ ہیں اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے فرمایا ہے: [1]

((كَـلَّ دُوْنَ صِـفَـاتِـهٖ تحبيرُ الصِّفاتِ وَضَلَّ هُنَاكَ تَصَارِيْفُ اللّغاتِ .))

اے برون از وهم وقال وقيل من

[1] نثر مقفی قاله رضی الله عنه فی خطبة المغراء والخطبة بطولها فی العقد وفيه "صفته" بذل صفاته وايضاً ابن الحديد.

خاك بر فرق من و تمثيل من

اس لیے کہ انسان جس قدر صفات الٰہیہ میں غور وفکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:❶ (۱۱) تَفَكَّرُوْا فِي آلاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ اِلٰـہ اصل میں وِلَاہٌ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاہ بنالیا ہے اور وَلِـہَ (س) کے معنی عشق و محبت میں وارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں ❷ اور ذاتِ باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان۔ اسی لیے بعض حکماء نے کہا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (۱۷:۴۴) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لَاہَ يَلُوْهُ لِيَاهًا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (۶:۱۰۳) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

نیز آیت کریمہ:

﴿وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۵۷:۳) میں ''الباطن'' کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِلٰـہ: یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا، اس لیے اٰلِهَةٌ صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا﴾ (۲۱:۴۳) کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچائیں۔

﴿وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ﴾ (۷:۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہوجائیں۔ ایک قرأت میں وَاِلَاهَتَكَ ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں لَاهِ اَنْتَ۔ یہ اصل میں لِلّٰهِ اَنْتَ سے ایک لام کو تخفیف کے لیے حذف کردیا گیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی يَا اَللّٰهُ کے ہیں اور اس میں میم مشدد یاء حرف ندا کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اصل میں يَا اللّٰهُ اُمَّنَا بِخَيْرٍ (اے اللہ! تو خیر

---

❶ انظر للحديث اللسان (الا) و (ابوالشيخ طس، عدهب عن ابن عمرؓ) وفى رواية فى خلق الله (حل عن ابن عباس وابو الشيخ عن ابى ذر) وروى فى كل شئى (ابو الشيخ فى العظمة عن ابن عباسؓ) راجع كنزالعمال ۳/ ۵۷۷۔۵۸۱ ومعناه ۵۸۶۔۵۸۷ (ابو الشيخ فى العظمة حل عن عبدالله بن سلام).

❷ نسبه الطبرسى الى ابى عمرو.

کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرتِ استعمال کی بنا پر)...... حَیْھَلًا کی طرح مرکب کرکے اَللّٰھُمَّ بنالیا گیا ہے۔ ❶ (جیسے ھَلُمَّ)

اِلٰی: حرف (جر) ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایۃ حد بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔

ا ل و

اَلَوْت فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا یہی ہے۔اور اَلَوْتُ فُلَانًا کے معنی اَوْلَیْتُہٗ تَقْصِیْرًا (میں نے اسے کوتاہی کا والی بنادیا) کے ہیں جیسے کَسَبْتُہٗ: ایْ اَوْلَیْتُہٗ کَسَبًا (میں نے اسے کسب کا والی بنادیا) مَا اَلَوْتُہٗ جُھْدًا: میں نے مقدور بھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جھدًا تمیز ہے جس طرح مَا اَلَوْتُہٗ نُصْحًا میں نُصْحًا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا﴾ (۳:۱۱۸) یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

اورآیت کریمہ: ﴿وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ﴾ (۲۴:۲۲) اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل (صاحب وسعت) ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَوْتُ سے باب افتعال ہے اور بعض نے اَلَیْتُ بمعنی حَلَفْتُ سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح رضی اللہ عنہ کی مالی امداد نہیں کریں گے۔لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ صیغہ افتعال اَفْعَلَ (مزید فیہ) سے نہیں آتا بلکہ فَعَلَ (مجرد) سے بنایا جاتا ہے، جیسے: کَسَبْتُ سے اِکْتَسَبْتُ اور صَنَعْتُ سے اِصْطَنَعْتُ اور رَاَیْتُ سے اِرْتَاَیْتُ اور روایت۔ ❷

(۱۲) لَادَرَیْتَ وَلَا ائْتَلَیْتَ میں بھی مَا اَلَوْتُہٗ شَیْئًا سے افتعال کا صیغہ ہے۔گویا اس کے معنی وَلَا اسْتَطَعْتَ کے ہیں (یعنی تونے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی) اصل میں اِیْلَاءٌ وَاَلِیَّۃٌ اس قسم کو کہتے ہیں جس پر (قسم کھانے والے کو) تکلیف اور کوتاہی کا سامنا کرنا پڑے اور اصطلاح شریعت میں اِیْلَاءٌ اس قسم کو کہتے ہیں جو عورت کے ساتھ جماع پر اٹھائی جائے اس قسم کی کیفیت اور احکام کا بیان کرنا کتب فقہ کے ساتھ مختص ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْکُرُوْا اٰلَاءَ اللّٰہِ﴾ (۷:۷۴) پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو میں اٰلَاءٌ کا واحد اَلًی وَ اِلًی ہے جس طرح کہ اٰنَاءٌ کا واحد اَنًا وَاِنًی آتا ہے بعض نے آیت کریمہ: ﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ﴾ (۷۵:۲۳،۲۴) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے) میں اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ کے معنی اِلٰی نِعْمَۃِ رَبِّھَا مُنْتَظِرَۃٌ کئے ہیں۔یعنی اپنے پروردگار کی نعمت کے منتظر ہونگے لیکن بلاغت قرآن کی رو سے یہ سراسر تعسف ہے۔

---

❶ راجع للبحث فی (اللھم) المسائل والاجوبۃ لابن سیدہ: ۱/ ۱۰۹ معالم ص: ۲/ ۲۲ المطرزی علی المقامات: ص ۵۳ الکناش الکواکبی ص ۸۱ والکلام فی میم (اللھم) ومناقشتہ فیھا: ذخائر القصر لابن طولون آخرص ۵۱۔

❷ رواہ البخاری ومسلم من حدیث انسؓ لکن فی روایتھما ولا تلیت والحدیث ایضاً فی مسند البزار واحمد عن عبداللہ بن عمرو والطبرانی فی الاوسط۔

اَلَا

اَلَا یہ حرف استفتاح [1] ہے (یعنی کلام کے ابتداء میں تنبیہ کے لیے آتا ہے)

اِلَّا

اِلَّا یہ حرف استثناء ہے۔ [2]

اُولَاءِ (اُولَا)

یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر و مؤنث کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس کا مفرد من لفظہٖ نہیں آتا (کبھی اس کے شروع میں ھا تنبیہ بھی آجاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿ هَا اَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّوْنَهُمْ ﴾ (۳:۱۱۹) دیکھو! تم ایسے لوگ ہو کچھ ان سے دوستی رکھتے ہو ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى ﴾ (۲:۵) یہی لوگ...... ہدایت پر ہیں اور کبھی اس میں قصر (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کرلیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [3]

(۴۲) هُؤُلَا ثُمَّ هُؤُلَا كُلًّا اَعْطَيْهِ
تُ نَوالًا مَحْذُوْةً بِمِثَال

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیے دیئے ہیں۔

ا م م

اَلْاُمُّ یہ اَبٌ کا بالمقابل ہے اور ماں قریبی حقیقی ماں اور بعیدہ یعنی نانی پرنانی وغیرہ سب کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام کو اُمُّنَا کہا گیا ہے اگرچہ ہمارا ان سے بہت دور کا تعلق ہے۔ پھر ہر اس چیز کو اُمٌّ کہا جاتا ہے، جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح وتربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔ خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات منضم ہوجائیں یا سما جائیں...... وہ ان کی اُمٌّ کہلاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ (۴۳:۴) اور یہ اصلی نوشتہ (یعنی لوح محفوظ) میں ہے۔ میں اُمِّ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اسی کی طرف تمام علوم منسوب ہوتے ہیں اور مکہ مکرمہ کو اُمَّ الْقُرٰی کہا گیا ہے (کیونکہ وہ خطہ عرب کا مرکز تھا) اور بموجب روایت تمام روئے زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے (اور یہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (۴۲:۷) تاکہ تو مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ بدعملی کے انجام سے ڈرائے۔ اُمُّ النُّجُوْم ۔ کہکشاں۔ شاعر نے کہا ہے [4] (طویل)

---

[1] يكون لتوبيخ والتمنى والاستفهام عن النفى والعرض والتحصيص نحو ﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ لَكُمُ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (۲۴-۲۲) وفى معنى التنبيه ﴿ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ ﴾ (۱۱/۷).

[2] وقد يكون صفة بمنزلة غيرنحو ﴿ لوكان فيهما الهة الا الله لفسدتا ﴾ (الانبياء : ۲۱-۲۲) وفيه بحث وعاطفة بمنزلة الواو راجع الاية (۲ : ۱۵۰) (۲۷ : ۱۱۷۱) وزائدة فهذه اربعة اوجه واما الاالحرف تخصيص اومركب من ان (ان الناصبة المخففة) راجع للبحث المغنى ج ١ص ۷۳-۷۸.

[3] قاله الاعشى وفى جمهرة اشعار العرب نعالا بدل نوالا ومعناه سقيتهم كاس الروى والبيت فى البحر (۱/۱۳۸) اوديوانه ۱۶۷ .

[4] قاله تابط شراد صدره يرى الوحشة الانس الانيس ويهتدى...... والبيت فى الحماسه مع المرزوقى رقم ۱۳ فى تسعة ابيات والبيت فى الضاعتين ۳۲۲ والالى (۲-۱۳۵) ونقد الشعر ۲۹ والحيوان (۶ : ۲۵۶) فى ستة ابيات و خمار القلوب ۲۰۴ وزهر الآداب (۲ : ۲۱) فى عشرة ابيات وام النجوم الشوابك هى الشعرى والبيت فى التحان ۲۴۲ منسوب لسليك بن سلكة وراجع للبيت ايضاً السمط ۷۶۲ وادباء للمولف (۴ : ۶۱۸).

(۲۳) بحیث اھدَتْ ام النَّجوم الشوابك .

یعنی جہاں کہ کہکشاں راہ پاتی ہے۔

أُمّ الاضیاف ۔مہمان نواز۔أُمّ المساکین ۔مسکین نواز۔ مسکینوں کا سہارا۔ ایسے ہی جیسے بہت زیادہ مہمان نواز کو ''ابوالاضیاف'' کہا جاتا ہے اور رئیس جیش کو ام الجیش ۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۲۴) وام عیال قَدْ شَهِدْتُ تقوتُهُمْ

اور وہ اپنی قوم کے لیے بمنزلہ ام عیال ہے جو ان کو رزق دیتا ہے۔

أُمُّ الکتاب ۔سورۃ فاتحہ کا نام ہے، کیونکہ وہ قرآن پاک کے لیے بمنزل دیباچہ اور مقدمہ ہے۔

اور آیت کریمہ:﴿ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ﴾ (۱۰۱:۹)مثویٰ یعنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ دوزخ کے متعلق مَأْوَاكُمُ النَّارُ (۲۹:۲۵)فرمایا ہے (اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ أُمُّهُ هَاوِيَةٌ ایک محاورہ ہو) جس طرح کہ وَيْلُ اُمِّهِ وَهَوَتْ أُمُّهُ ہے یعنی اس کے لیے ہلاکت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:﴿ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ﴾ (۶:۳۳) میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین قرار دیا ہے جس کی وجہ بحث (اَبٌ) میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا:﴿ يَابْنَ أُمَّ ﴾(۲۰:۹۴) کہ بھائی۔

أُمٌّ (کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے) بعض نے کہا ہے کہ أُمٌّ اصل میں أُمَّهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع أُمَّهَاتٌ اور تصغیر أُمَيْهَةٌ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مضاعف ہی ہے کیونکہ اس کی جمع أُمَّاتٌ اور تصغیر أُمَيْمَةٌ آتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ عام طور پر حیوانات وغیرہ کے لیے أُمَّاتٌ اور انسان کے لیے أُمَّهَاتٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْاُمَّةُ: ہر وہ جماعت جن کے مابین رشتہ دینی ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک ہوں پھر وہ رشتہ اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس کی جمع أُمَمٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ﴾ (۶:۳۸) اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے (حیوان) دو پروں سے اُڑنے والے پرند ہیں وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ میں أُمَمٌ سے ہر وہ نوع حیوان مراد ہے جو فطری اور تسخیری طور پر خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ مثلاً: مکڑی جالا بنتی ہے اور سرفۃ (اموریپید تنکوں سے) اپنا گھر بناتی ہے اور چیونٹی ذخیرہ اندوزی میں لگی رہتی ہے اور چڑیا کبوتر وغیرہ وقتی غذا پر بھروسہ کرتے ہیں الغرض ہر نوع حیوان اپنی طبیعت اور فطرت کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے اور آیت کریمہ:﴿ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ﴾ (۲:۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگ ایک اُمت تھے۔ کے معنی

❶ قاله الشنفری عمرو بن مالك الاروی (۷۰ق هـ ۵۲۷۵ق م) شاعرجاهلی من الصعالیك صاحب لامیة العرب التی شرحها الزمخشری فی اعجب العجائب وارادبام عیال تابط شر لانهم حین غزو اجعلوا زادهم الیه فكان یقترعلیهم مخافة ان تطول الغزاة فیموتوا جوعاً والازد تسمی راس القوم وولی امرهم اماً وتمام البیت : اذ اطعمتهم اوتحت واقلت والبیت من كلمةمفضلیة رقم ۲۰: فی ۳۶ بیتاً والبیت فی اللسان (ام) والا فما فی (۲۱ : ۹۰) وفی المطبوع نفوسهم بدل تقویتهم مصحف وفی روایة اتهفت بدل او تحت واحترتهم بدل اطعمتم وارجع للبیت تهذیب الالفاظ ۷۲، ۵۶۵ واللسان (حترام) والتاج (ام) والجمهرة (۱ : ۲۱) والمخصص ۳،۱۳ وكتاب الابدال لابی الطیب والسمط ۴۱۳ والانمانی(۲۱ : ۱۳۴) والخزاز۲ : ۱۶)فالحماسة مع المزروقی ۷۵۷ والتبریزی (۲ : ۲۳) ومجمع الامثال(۱ : ۳۲۱) والعینی : ۲ : ۱۱۷.

یہ ہیں کہ تمام لوگ صنف واحد اور ضلالت و کفر کے ہی مسلک پر گامزن تھے اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ (۵:۴۸) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ہی شریعت پر کردیتا۔ میں أُمَّةً وَّاحِـدَةً سے وحدۃ بلحاظ ایمان مراد ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ ﴾ (۳:۱۰۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو علم اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کے لیے اسوہ بنے اور آیت کریمہ: ﴿ إِنَّا وَجَدْنَا آبَآءَنَا عَلٰى أُمَّةٍ ﴾ (۴۳:۲۲) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک متفقہ دین پر پایا ہے میں أُمَّةٍ کے معنی دین کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۵) وَهَلْ يَأْثَمَنْ ذُوْ أُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ (طویل)

بھلا کوئی متدین آدمی رضا اور رغبت سے گناہ کرسکتا ہے

اور آیت کریمہ: ﴿ وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ ﴾ (۱۲:۴۵) میں أُمَّةٍ کے معنی حین، یعنی عرصہ دراز کے ہیں اور ایک قرأت میں بعد أُمَهٍ (بِالْهَاء) ہے ❷ یعنی نسیان کے بعد جب اسے یاد آیا۔ اصل میں بَعْدَ أُمَّةٍ کے معنی ہیں ایک دور کسی ایک مذہب کے متبعین کا دور گذر جانے کے بعد اور آیت کریمہ: ﴿ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ ﴾ (۱۶:۱۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) عبادت الٰہی میں ایک جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے۔ جس طرح کہ محاورہ ہے: فُلَانٌ فِيْ نَفْسِهِ قَبِيْلَةٌ کہ فلاں بذاتِ خود ایک قبیلہ ہے۔ یعنی ایک قبیلہ کے قائم مقام ہے۔ (۱۳) وروی انه يحشر زيد بن عمرو بن نفيل امة وحده. اور ایک روایت میں ہے کہ حشر کے دن زید بن عمرو بن نفیل اکیلا ہی امت ہوگا۔ ❸ اور آیت کریمہ: ﴿ لَيْسُوْا سَوَآءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ ﴾ (۳:۱۱۳) وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں۔

میں أُمَّةٌ بمعنی جماعت ہے زجاج ❹ کے نزدیک یہاں قَآئِمَة بمعنی استقامت ہے یعنی ذو وطَرِيْقَةٍ وَاحِدَةٍ تو یہاں مضمر متروک ہے۔

اَلْاُمِّـيُّ وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (۶۲:۲) وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں

---

❶ قاله النابغة واوله : حلفت فلم اترك لنفسك ريبة .... والبيت من القصدية التى يعتذر بها الى النعمان بن المنذر عما وشت به بنو قريع وهو فى ديوانه من الستة ۱۹ واللسان والصحاح (امم) وذيل مجالس ثعلب ۱ / ۵۰ ومجاز القران لابى عبيده ۱۰۰ رقم ۱۲۲ مختار الشعر الجاهلى (۱ : ۸۳) والبلدان (رسم : ثبرة) والعقد الثمين ۱۹ والمعانى والمشكل للقتبى ۳۴٦ وفى رواية المرتضىٰ حلفت......... وليس وداء الله للمرء مذهب ـ وهو اطبق لرواية الديوان (۲ : ۱۷) .
والنوادر لابى مسهل الاعرابى ٤٤۸ والفائق ۱ : ۲٦).

❷ قرء بذالك ابن عباس وكان ابو الهيثم يقرء به ايضاً انظر اللسان (امه)

❸ رواه الطبرانى وفى الحديث قصة والبزار باختصار عنه وفيه المسعودى وقد اختلط وبقية رجاله ثقات وابو يعلىٰ وكذا قال ابن مسعود فى معاذ وقد ورد ذالك فى حديث مرفوع راجع مجمع الزوائد : ج ۹ ص ٤۱۷ ـ ٤۱۸ وتخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم : ۲٦۵ ـ ۲٦٦.

❹ ابو اسحاق ابراهيم بن السرى بن سهل الزجاج توفى بين ۳۱۰ ھ ۳۱٦ وكان من اشهر تلاميذ المبرد استاذ الزجاجى ومن مؤلفاته ...... طبقات زبيدى ٤۲ تاريخ بغدادى ٦ : ۸۹ ـ ۹۳ ابن خلقان رقم ۱۲ واعلام زركلى .

سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا۔

میں اُمِّیِّیْنَ سے یہی مراد ہے۔ قطرب ❶ نے کہا ہے کہ أُمِّيَّةٌ بمعنی غفلت و جہالت کے ہے اور اسی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ﴾ (۷۸:۲) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں۔

یہاں اِلَّآ اَمَانِيَّ کے معنی اِلَّآ اَنْ يُّتْلٰى عَلَيْهِمْ کے ہیں یعنی مگر یہ کہ انھیں پڑھ کر سنایا جائے۔ فَرَّاءَ ❷ نے کہا ہے کہ أُمِّيُّوْنَ سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:

﴿ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ (۱۵۷:۷) اور وہ جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتی ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ أُمِّيٌّ اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو جس طرح کہ عَامِيٌّ اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو أُمِّيٌّ کہنا اس بنا پر ہے کہ آپؐ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور خدا کی اس ضمانت پر کہ ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ﴾ (۶:۸۷) ہم تمھیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لیے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کی طرف نسبت ہے۔ ❸

اَلْاِمَامُ وہ ہے جس کی اقتداء کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا اس کے قول و فعل کی اقتداء کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر ہو اس کی جمع اَئِمَّةٌ (اَفْعِلَة) ہے اور آیت:

﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ أُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ﴾ (۷۱:۱۷) جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ میں امام سے وہ شخص مراد ہے جس کی وہ اقتداء کرتے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امام بمعنی کتاب ہے۔ ❹ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ (۷۴:۲۵) اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ امام (مفرد) کی جمع ہے ❺ اور دوسرے علماء کے نزدیک یہ دِرْعٌ دِلاص ودروع دِلاصٌ کے باب سے ہے ❻ (یعنی فِعَال مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے) اور آیات: ﴿ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً ﴾ (۵:۲۸)

❶ محمد بن المستنير بن احمد ابو علی النحوی المعروف بقطرب (۰۰ـ۲۰۶) للغوی البصری مولیٰ سالم بن زیاد ولازم سیبویه وكان يدلج اليه فسماه قطر باراى دويلبسة الليل ۴۷ ومن تصانيفه معانى القرآن وهو اوّل من وضع المثلث فى اللغة (وفيات الاعيان ۴۹۴/۱ :)طبقات النحويين ۱۰۶ بغية الوعاة ۱۰۴ الفهرست ۵۲ معجم المطبوعات ۵۱۷ نزهة الالباء ۱۱۹ .

❷ ابوزكريا يحيىٰ بن زياد الفراء (۰۰ـ۳۷۰) روى عن الكسائى وطبقته صاحب التصانيف بغية الوعاة ۴۱۱ـ۴۱۲ الفهرست ۱۰۰ ـ۱۳۰۷ والانباه ۹/۱ ۱۰و۲/ ۲۵۵ ومعجم الادباء ۲۰/ ۱۴ اوكشف الظنون ۲/ ۱۹۲۰ .

❸ نسب هذا القول الى الامام الباقر(انظر روح المعانى ص ۷۰ ج ۹).

❹ قراءة الحسن بكتابهم (الكشاف ص : ۶۸۲ ج ۲).

❺ كذا فى الصحاح وعند البعض جمع ام كصائم وصيام كذافى لسان العرب والكشاف للزمخشرى ص: ۲۹۶ ج ۳).

❻ وقال الزمخشرى ارادائمه فاكتفى بالواحد لدلالته على الجنس ولعدم اللبس : ص ۲۹۶ ج ۳۰.

اوران کو پیشوا بنائیں ﴿ وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ (۲۸:۴۱) اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔

میں اَئِمَّةٌ کا واحد امام ہے اور آیت: ﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (۳۶:۱۲) اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْاَمُّ (ن) کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی جانب متوجہ ہونا (اور کسی طرف مائل نہ ہونا) اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ﴾ (۵:۲) اور نہ ان لوگوں کی جو عزت والے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں۔ میں اٰمِّيْنَ اسی پر محمول ہے:

اَمَّهٗ بمعنی شَجَّهٗ کسی کا سر پھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے اصل معنی ام دماغ پر مارنا کے ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب کسی عضو پر مارنے کے لیے اس سے فَعَلْتُ کا صیغہ بنالیتے ہیں جیسے رَأَسْتُهٗ، رَجَلْتُهٗ، كَبَدْتُهٗ، بَطَنْتُهٗ

ام حرف

اَمْ: جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہوتو بمعنی او ہوتا ہے، جیسے اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ اَمْ عَمْرٌو یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بَلْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴾ (۳۸:۶۳) (یا) ہماری آنکھیں ان (کی طرف) سے پھر گئی ہیں۔

امّا حرف

اَمَّا: یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے اور احد الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ ﴾ (۱۲:۴۱) تم میں سے ایک (جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ) تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا۔ اور کبھی ابتداء کلام کے لیے آتا ہے جیسے اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّهٗ كَذَا۔

ا م د

اَلْاَمَدُ: (موت، غایت) قرآن میں ہے: ﴿ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ﴾ (۳:۲۹) تو آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور اس برائی میں انتہائی بعد ہوتا۔ اَلْاَمَدُ وَالْاَبَدُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن اَبَدٌ غیر متعین اور غیر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہٰذا اَبَدُ كَذَا (اتنی مدت) کا محاورہ صحیح نہیں ہے اور اَمَدٌ غیر معین مگر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہٰذا اَمَدُ كَذَا (اتنی مدت) کہنا صحیح ہے جس طرح کہ زمان کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ زَمَانٌ اور اَمَدٌ کے لفظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اَمَدٌ کا لفظ کسی مدت کی نہایت اور غایت کے لیے بولا جاتا ہے اور زمان کا لفظ کسی مدت کے لیے مبدأ اور غایت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے اَلْمَدى وَالْاَمَد دونوں قریب المعنی ہیں (یعنی کسی چیز کی مدت کی غایت بیان کرنے کے لیے آتے ہیں)

ا م ر

اَلْاَمْرُ (اسم) کے معنی: نشان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع اُمُوْرٌ ہے اور اَمَرْتُهٗ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں اَمْرٌ کا لفظ جملہ اقوال و

افعال کے لیے عام ہے۔چنانچہ آیات:
﴿ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ ﴾ (۱۱:۱۲۳) اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ ﴾ (۳:۱۵۴) تم کہہ دو کہ بیشک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ یہ لوگ (بہت سی باتیں) دلوں میں مخفی رکھتے تھے جو تم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی۔
﴿وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ﴾ (۲:۲۷۵) اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے سپرد۔ میں امر سے یہی معنی مراد ہیں۔ اور کبھی امر بمعنی ابداع بھی آ جاتا ہے جیسے فرمایا:﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ (۷:۵۴) دیکھو! خلق اسی کے اختیار میں ہے اور ابداع بھی۔ اور امر بایں معنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس معنی میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور آیت:
﴿ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ﴾ (۴۱:۱۲) اور ہر آسمان میں اس (کے امر) کا حکم بھیجا۔ میں بھی امر اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور حکماء امت نے آیت کریمہ:
﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ﴾ (۱۷:۸۵) کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ میں بھی مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے معنی مِنْ اِبْدَاعِهٖ کیے ہیں [1] اور آیت کریمہ:
﴿وَاِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴾ (۱۶:۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو (ہماری) بات یہی ہے کہ اس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ میں بھی امر اِبْدَاعِی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے جو اہتمام ہوتا ہے اسے نہایت اختصار اور بلاغت سے اس آیت میں بیان فرمادیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ کَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ﴾ (۵۴:۵۰) اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک (بات) ہوتی ہے۔ میں بھی سرعت ایجاد سے کنایہ ہے اور عالم میں ایجاد و تکوین کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تیز رفتاری کو بتانے کے لیے ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہماری قوت واہمہ سے بھی بلند ہے اور امر بمعنی اَلتَّقَدُّم بِالشَّیْءِ (یعنی حکم دینا) عام ہے کہ بصیغہ امر ہو یا بلفظ خبر ہو جیسے فرمایا:
﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ﴾ (۲:۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں۔ اور یا بطریق اشارہ وغیرہ ہو چنانچہ آیت کریمہ:﴿ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ (۳۷:۱۰۲) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے انھوں نے کہا: ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجیے۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب میں اپنے بچے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھنے کو امر (مَا تُؤْمَرُ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

---

[1] وفیه لغة أیما وهو حرف شرط وتفصیل وتوکید ولزمت الفاء بعدها وقد تحذف الفاء للضرورة والدیات التی بغیرفاء کمافی (۳:۱۰۶) و (۴۵-۳۱) فهناك یقدر لفظة فیقال راجع للبحث المغنی ج ۱ص ۵۷۔ وقد یاتی للتوکید والشرط ویفصل بین اما والفاء بواحد من امور ستة (۱) المبتدا (۲) الخبر (۳) جملته الشرط (۴) اسم منصوب لفظا ومحلا بالحواب کما فی سورة الضحی ۹-۱۰-۱۱ (۵) اسم منصوب معمول لمحذوف یفسده بعدالفاء (۶) ظرف معمول لامّا (راجع المغنی ج ۱ص ۶۰-۵۹) والرضی علی الکافیة ج ۲ص ۳۹۵-۴۰۰) وفیه وقد یحذف کمافی نحو وثیابك فطهر والرجز فاهجر الایة .

﴿ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴾ (۱۱:۹۷) اور فرعون کا معاملہ درست نہیں تھا۔ میں امر کا لفظ فرعون کے جملہ اقوال اور افعال کو شامل ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ (۱۶:۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔ میں امر سے مراد قیامت ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ عام لفظ استعمال کیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ﴾ (۱۲:۱۸) بلکہ تمہارے لیے تمہارے دلوں نے بات کو خوشنما بنالیا ہے۔ میں اَمْرًا سے مراد یہ ہے کہ یہ ان برے کاموں سے ہے جن پر نفس امّارہ انسان کو اکساتا رہتا ہے۔

اَمِرَ (س) الْقَوْمُ کے معنی ہیں قوم زیادہ ہوگئی کیونکہ آبادی بڑھ جائے تو امیر (حاکم) کا تقرر ضروری ہو جاتا ہے جس کے بغیر انتظام صحیح نہیں رہ سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (بسیط)

(۲۶) لَا يَصْلُحُ النَّاسُ فَوْضٰى لَا سَرَاةَ لَهُمْ

جس قوم کا رئیس نہ ہو اس کا معاملہ درست نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا امر بمعنی کثرت استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا ﴾ (۱۷:۱۶) (تو) وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیا۔ میں امر بمعنی حکم ہے یعنی ہم انھیں اطاعت الٰہی کا حکم دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَمَرْنَا بمعنی كَثَّرْنَا ہے یعنی وہاں کے خوشحال لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔

ابوعمرو کا قول ہے کہ معنی کثرت کے لیے اَمَرْتَ (مجرد) نہیں آتا بلکہ اَمَّرْتُ (تفعیل) وَاٰمَرْتُ استعمال ہوتا ہے لیکن ابوعبیدہ کا قول ہے ❷ کہ کبھی اس معنی کے لیے اَمَرْتُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ❸ (۱۴) خَيْرُ الْمَالِ مُهْرَةٌ مَأْمُوْرَةٌ وَسِكَّةٌ مَأْبُوْرَةٌ کہ بہتر مال پرورش کیا ہوا بچھڑا اور پیوند کیے کھجور کے درخت ہیں۔ تو مَأْمُوْرَةٌ اَمَرْتُ سے ہے ایک قرأت میں اَمَّرْنَا ہے جس کے معنی ہیں: ہم ان کو امراء بنا دیتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ﴾ کہ ہم نے اسی طرح اس کے اکابر کو مجرم بنا دیا تا کہ اس میں مکر و فریب کریں (۶:۱۲۳) اور ایک قرأت میں اَمَرْنَا بمعنی اَكْثَرْنَا بھی ثابت ہے۔ ❹

اَلْاِئْتِمَارُ کے اصل معنی حکم بجالانا کے ہیں اور تَشَاوُرٌ

---

❶ قاله الافوه الاودى واسمه صلاءه بن عمرو ويكنى ابا ربيعة والبيت فى العقد: ۱۰، ۴۳) والسمط: ۲۷۰) والامالى ۲: ۲۲۲) قال الاستاذ الميمنى والبيت من كلمة ۱۷ بيتاً فى نسخة ديوان الافوه (الطرائف ۹۔۱۰) ولاتوجد كاملة فى الكتب المعروفة وبعضها فى آخر ديوان ابى الاسود صنعة السكرى قال وقد زعم لى بعض الرواة انها للافوه ۱هـ والبيت فى مجموعة المعانى ۱۶، ۱۹۔۱۳۰) والشعراء ۱۷۵ ابن الحديد ۴: ۵۳۱ والصحاح واللسان (فوض) والمزهر ۱: ۱۶۴) والنوادر (۱: ۲۹۸) وروضة العقلاء ۲۴۶ والبيت ثالث ثلاثة للافوه التى ذكرها المولف (ا س و) ص ۳۵۵.

❷ انظر لقول ابى عبيدة فى مجازه: ج ۱ص ۳۷۲۔۳۷۳ واللسان (امر) ثم القراءة بالتخفيف مروية عن الصحابة والتابعين الا الحسن فانه قراء التشديد وتبعه ابو عبيده فى مجازه عن ابى العاليه الرياحى امّرنا بالتشديد و رويت عن علىؓ ۱۲.

❸ راجع للحديث الفائق ۱: ۳۰۰ والنهاية ۱/ ۱۱ واللالى ۳۱۸ والحديث اخرجه ابن كثير من مسند احمد و(حم طب) عن سويد بن هبيرة والماوردى فى ادب الدنيا والدين ۳۶۷ مع شرح المنهاج وهو مثل انظر البيان ۲/ ۱۰ والعيون والمستقصىٰ والقالى ۲/ ۲۰۴ و ۲۱۰ والالفاظ ۳ و ۶۸۳ واللسان (امر) وراجع ايضاً ذيل تفسير الكشاف ۲/ ۶۵۵ وفيه التخريج قال البكرى وحمل الحديث على هذه اللغة الفصيحة اولى من حمله على الاتباع.

❹ هى قراءة شاذة عن ابى عثمان النهدى والليث عن ابى عمرو وا بان بن عاصم انُظر القراءات الشاذة لابن خالويه ۷۵.

یعنی باہم مشورہ کرنے کو بھی اِئْتِمَار کہا جاتا ہے، کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کے حکم کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ ﴾ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاح مشورے کرتے ہیں۔ (۲۸:۲۰) اور شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۷) اَمَرْتُ نَفْسِيْ اَيَّ اَمْرٍ اَفْعَلُ

میں نے اپنے جی میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴾ یہ تو آپ نے بڑی ناپسندیدہ بات کی (۱۸:۷۱) میں امر بمعنی منکر ہے اور یہ اَمِرَ الْاَمْرُ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی کسی معاملہ کے حد سے بڑھ جانا کے ہیں جس طرح کہ اِسْتَفْحَلَ الْاَمر کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَأُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ (۴:۵۹) اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ میں بعض کے نزدیک عہد نبوی کے امراء مراد ہیں۔ اور بعض ائمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اولی الامر کے معنی اَلْاٰمِرُوْنَ بِالمعروف کے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے وہ فقہاء اور اہل علم مراد ہیں۔ جو احکام الٰہی کے فرمانبردار ہوں اور یہ سبھی اقوال صحیح ہیں کیونکہ اولی الامر جو لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں چار قسم پر ہیں۔ (۱) انبیاء: جن کا حکم عوام وخواص کے ظاہر و باطن پر نافذ ہوتا ہے۔ (۲) حکام: جن کا حکم صرف لوگوں کی ظاہری حالت پر جاری ہوسکتا ہے۔ دلوں پر ان کی حکومت نہیں ہوتی۔ (۳) حکماء: خواص کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ (۴) وعاظ: جن کا حکم صرف عوام کے قلب ضمیر پر ہی جاری ہوسکتا ہے۔ ❷

ا م ن

اَلْاَمْنُ: اصل میں امن کا معنی نفس کے مطمئن ہونے کے ہیں۔ اَمْنٌ، اَمَانَةٌ اور اَمَانٌ یہ سب اصل میں مصدر ہیں اور امان کے معنی کبھی حالت امن کے آتے ہیں اور کبھی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس بطور امانت رکھی جائے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ (۸:۲۷) یعنی وہ چیزیں جن پر تم امین مقرر کیے گئے ہو ان میں خیانت نہ کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہم نے (بار) امانت آسمان اور زمین پر پیش کیا ہے (۳۳:۷۲) کی تفسیر میں بعض نے ''عدل و انصاف'' مراد لیا ہے۔ بعض نے حروف تہجی اور بعض نے عقل مراد لی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ معرفتِ توحید، عدل و انصاف کا قیام اور حروف تہجی کی معرفت عقل کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ انسان کے لیے علوم ممکنہ کی تحصیل اور افعال حسنہ کی سرانجام دہی عقل کے بغیر مشکل ہے۔ اور عقل کے باعث ہی انسان کو اکثر مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ اور جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔ (۳:۹۷) میں امن پانے سے مراد دوزخ

---

❶ قاله كعب بن زهير وصدره انخت قلوصي وكتلات بعينهاء راجع السمط (۱: ۲۰۰) واللسان وكلاء ديوانه والبحر (۶: ۱۹) وفي روايتهم جميعاً اي امرى بدل اي امر.

❷ لم يذكر بعده (ا م س) و (ا م ل) راجع المستدرك.

کی آگ سے بے خوف ہونا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان دنیوی مصائب سے بے خوف ہونا مراد ہے جو اُن لوگوں کو پہنچتے ہیں جن کے بارے میں ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے۔ (۹:۵۵) ارشاد فرمایا ہے اور نہ زیر بحث آیت میں خبر بمعنی انشاء ہے یعنی جو شخص حرم میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہلاکت سے بے خوف ہونا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اسے پرامن رہنے دیا جائے۔ جیسے محاورہ ہے: هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور دوسری حرام ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مجرم جب تک حرم کے اندر ہے نہ اس سے قصاص لیا جائے اور نہ ہی کسی جرم میں اسے قتل کیا جائے۔ ❶ اسی طرح آیت: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا ﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے۔ (۲۹:۶۷) اور آیت ﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ﴾ اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔ (۲:۱۲۵) میں بھی امن کے یہی معنی مراد ہوسکتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ اَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾ تسلی (یعنی) نیند (نازل فرمائی) (۳:۱۵۴) میں اَمَنَةً بمعنی امن ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ كَتَبَةٌ کی طرح اٰمِنٌ کی جمع ہے۔ نزول مسیح والی حدیث میں ہے۔ ❷ (۱۵) وَتَقَعُ الْاَمَنَةُ فِي الْاَرْضِ اور زمین میں امن قائم ہوجائے گا اور آیت کریمہ:

﴿ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔ (۹:۶) میں مَاْمَن ظرف ہے جس کے معنی "جائے امن" کے ہیں۔

اٰمَنَ (افعال) دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) متعدی بنفسہٖ جیسے اٰمَنْتُهٗ (میں نے اسے امن دیا) اور اسی معنی کے اعتبار سے اسماءِ حسنیٰ میں مُؤْمِنٌ آیا ہے۔

(۲) لازم جس کے معنی ہیں پرامن ہونے والا۔

اَلْاِيْمَانُ کے ایک معنی شریعت محمدی کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئُوْنَ ﴾ اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (۲:۶۲) میں اٰمَنُوْا کے یہی معنی ہیں اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوسکتا ہے جو توحید و نبوۃ کا اقرار کر کے شریعت محمدی میں داخل ہوجائے اور بعض نے آیت: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔ (۱۲:۱۰۶) کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(۲) اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے اور اس سے "حق کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہوجانا مراد ہوتا ہے اور یہ چیز تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل

---

❶ كما روى عن عمر رضى الله عنه لوظفرت فيه بقاتل الخطاب مامسسته حتى يخرج منه (راجع الكشاف ج۱ ص ۳۸۹).

❷ والحديث باختلاف الفاظه رواه ابن حبان واصحاب السنن الاربعة والشيخان والبيهقى فى الاسماء والصفات وانظر تخريجه ابن كثير ۱/۵۷۸-۵۸۳ وللشوكانى رسالة سماها التوضيح فى تواتر ماجاء فى المنتظر والدجال والمسيح.

بالجوارح سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے فرمایا:
﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ (۱۹:۵۷) اور جولوگ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں وہی صدیق ہیں یہی وجہ ہے کہ اعتقاد، قول صدق اور عمل صالح میں سے ہر ایک کو ایمان کہا گیا ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھودے۔ (۲:۱۴۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے اور (۱۶) آنحضرت ﷺ نے حیا اور راستہ سے تکلیف کے دور کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور حدیث جبریل میں آنحضرت ﷺ نے چھ باتوں کو اصل ایمان کہا ہے [1] اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ اور آپ ہماری بات کو، گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے۔ (۱۲:۱۷) میں مُؤْمِن بمعنی مصدق ہے، لیکن ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تردد جاتا رہے اور آیت کریمہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (۴:۵۱) میں ان کی مذمت کی ہے کہ وہ ان چیزوں سے امن واطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں جو باعث امن نہیں ہو سکتیں کیونکہ انسان فطری طور پر کبھی بھی باطل پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں يُؤْمِنُوْنَ کا لفظ ایسے ہی (بطور طنز کے ہے۔ جس طرح آیت: ﴿مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (بلکہ) وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے۔ (۱۶:۱۰۶) میں کفر کے ساتھ شرح صدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو یہ اِيْمَانُهُ الْكُفْرُ وَتَحِيَّتُهُ الضَّرْبُ کے قبیل سے ہے۔ رَجُلٌ اَمَنَةٌ وَّاُمَنَةٌ ہر ایک پر اعتماد کرنے والا۔ رَجُلٌ اَمِيْنٌ وَاَمَانٌ امانتدار آدمی اَلْاَمُوْنُ۔ وہ اونٹنی جس کے تھک جانے اور لغزش کھانے سے سوار بے خوف ہو۔

اٰمِين: یہ ممدود اور مقصود دونوں طرح بولا جاتا ہے اور صَهْ وَمَهْ کی طرح اسم فعل ہے [2] حسن کے نزدیک آمین بمعنی استجب ہے یعنی میری دعا قبول فرما اور اَمَّنَ (تفعیل) کے معنی آمین کہنے کے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آمین اسماء حسنٰی سے ہے۔ [3] ابوعلی الفسوی فرماتے ہیں [4] کہ اسم

---

[1] حدیث شعب الایمان فی الصحیحین مرفوعاً عن ابی ھریرۃ : الایمان بضع وسبعون شعبة اعلاھا قول لااله الا الله وادناھا اماطة الاذی عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان والحدیث ایضاً فی ابی داؤد وابن ماجة والنسائی وحدیث جبریل مروی فی الصحیحین عن عمر بن الخطاب وفیه ان تؤمن بالله وملئکته وکتبه ورسله والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیره وشره.

[2] راجع للبحث عن کلمة آمین الرضی علی الکافیه ٦٧ ج ٢ القرطبین ٩٩۔١٠٠ وزن آمین : المسائل الحلبیه ص ٨٠.

[3] وفی ابن کثیر ١ : ٣١ وحکی القرطبی عن مجاھد وجعفر الصادق وبلال بن یساف ان آمین اسم من اسماء الله تعالیٰ قال وروی عن ابن عباس مرفوعا ولایصح قاله ابوبکر ابن العربی المالکی بل وروی ابن مردویه عن ابی ھریرۃ مرفوعاً آمین خاتم رب اللعالمین وفی الدعاء لابن ابی شیبة ان جبریل لقن رسول الله وقال قل آمین فقال آمین واختلف الفقھاء فی انه یستحب برفع الصوت ام باخفائه راجع کتب الخلاف.

[4] ابوعلی الحسن بن احمد (اومحمد) بن عبدالغفار الفسوی الفارسی الشیرازی (٢٨٨۔٣٧٧) من تلامذة السراج والزجاج صاحب التصانیف الشھرة انظر الفھرست ٦٤ ونزھة الاولیاء ٣٨٧ تاریخ بغداد : ٢٧٥/٧ ابن خلکان ١٣٥ الارشاد وللیاقوت ٣ : ٢٩۔٢٢ والکامل لابن اثیر ٩ : ٣٦ شذرات ٤/ ٨٨۔٩٩ بغیه ٢١٦.

الٰہی کہنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بمعنی اِسْتَجِبْ کے ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ (بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں ......عبادت کرتا ہے۔(۹:۳۹) میں اَمَّنْ اصل میں اَمْ مَنْ ہے اور ایک قرأت میں اَمَنْ ہے۔ بہر حال اس کا تعلق اس مادہ سے نہیں ہے۔

اِنَّ حرف

اِنَّ وَاَنَّ (حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں ❶ اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ جملہ مستقل پر آتا ہے اور اَنَّ کا مابعد ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے: اَعْجَبَنِیْ اَنَّكَ تَخْرُجُ وَعَجِبْتُ اَنَّكَ تَخْرُجُ اور تَعَجَّبْتُ مِنْ اَنَّكَ تَخْرُجُ جب اِنَّ کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ﴾ مشرک تو پلید ہیں (۹:۲۸) یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ ﴾ اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو......حرام کر دیا ہے۔(۲:۱۷۳) یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تنبیہ ہے کہ مطعومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

اَنْ

یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اَنْ مصدریہ یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے، جیسے: اَعْجَبَنِیْ اَنْ تَخْرُجَ وَاَنْ خَرَجْتَ.

(۲) اَنْ المخففه مِنَ المثقلة یعنی وہ اَنْ جو ثقیلہ سے خفیفہ کر لیا گیا ہو (یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے: اَعْجَبَنِیْ اَنْ زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ (۳) اَنْ (زائدہ) جو لَمَّا کی توکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا: فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔(۱۲:۹۲)

(۴) اَنْ مفسرہ۔ یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو (خواہ وہ لفظاً ہو یا معنی جیسے فرمایا: وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو (۳۸:۶) یہاں اَنِ امْشُوْا، قَالُوْا کے معنی کو متضمن ہے۔ ❷

اِنْ

اَنْ کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اِنْ شرطیہ: جیسے فرمایا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔(۵:۱۱۸)

(۲) اِنْ مخففہ جو اِنَّ ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:

---

❶ تحقیق نفیس فی الفرق بینهما الروض الانف ج ۲ ص ۳۱٤ بحث انما ۔ بدائع الفوائد لابن قیم ص ۱۰۲ علة تخفیف النون فی اشهد ان لااله وتشدیدها فی وان محمدا(ازاهیر الریاض الربعة للبیهقی فی اللغة۱۹).

❷ راجع المغنی ج ۱ ص ۲٤۔۳٥ وبحث ان ۱۷۔۲٤ ایضاً.

اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا (تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا (۴۲:۲۵)

(۳) اِنْ نافیہ اس کے بعد اکثر اِلَّا آتا ہے جیسے فرمایا: اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ......ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔ (۳۲:۴۵)

اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے۔ (۲۵:۷۴)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ. ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔ (۵۴:۱۱)

(۴) اِنْ (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لیے آتا ہے، جیسے: مَا اِنْ یَخْرُجُ زَیْدٌ۔ زاید باہر نہیں نکلے گا۔

ا ن ث

اَلْاُنْثٰی (مادہ) یہ ذَکَرٌ یعنی نر کی ضد ہے اصل میں انثٰی و ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں پھر اس معنٰی کے لحاظ سے (مجازاً) یہ دونوں نر اور مادہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ﴾ جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت۔ (۱۲۴:۴) اور چونکہ تمام حیوانات میں مادہ بنسبت نر کے کمزور ہوتی ہے لہٰذا اس میں معنی ضعف کا اعتبار کر کے ہر ضعیف الاثر چیز کو انثٰی کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ کمزور لوہے کو حَدِیْدٌ اَنِیْثٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۸) ......عِندی جراز لا افلٌ ولا أَنِثٌ

میرے پاس شمشیر براں ہے جو کند اور کمزور نہیں ہے۔ اور انثٰی (مادہ) کے ساتھ تشبیہ دے کر نرم اور زرخیز زمین کو بھی ارض انیث کہہ دیا جاتا ہے یہ تشبیہ یا تو محض نرمی کے اعتبار سے ہے۔ اور یا عمدہ اور پیداوار دینے کے اعتبار سے سے اسے انیث کہا گیا ہے جیسا کہ زمین کو عمدہ اور پیداوار کے اعتبار سے حرۃ اور وَلُود کہا جاتا ہے۔

پھر بعض اشیاء کو لفظوں میں مذکر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لیے صیغہ مذکر استعمال کیا جاتا ہے اور بعض کو مؤنث کے ساتھ تشبیہ دے کر صیغہ تانیث استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یَدٌ، اُذُنٌ اور خُصْیَۃٌ چنانچہ خصیتین پر تانیث لفظی کی وجہ سے انثیین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۲۹) وَمَا ذَکَرٌ وَاِنْ یَّسْمَنْ فَاُنْثٰی

اور کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہو جائے تو مؤنث ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد قراد یعنی چیچڑ ہے کہ جب وہ بڑھ کر خوب موٹا ہو جاتا ہے تو اسے حَلَمَۃٌ بلفظ مؤنث کہا جاتا ہے، اسی طرح آیت کریمہ: ﴿ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اِنَاثًا ﴾ (۱۱۷:۴) وہ خدا کے سوا جن کی بھی

---

❶ لصخراء لغی واوله: فیعلمه بان العقل .... ۔ والبیت فی اللسان (انث) والبحر (۳۵۲:۳) والاقتضاب ۴۵ وقبله: ولیت مبلغایاتی بقولی ۔ لقاء ابی المثله لایرث.

❷ وفی التنبیه للبکری قاله بیاض والبیت فی المخصص (۱۰۲:۱۶) والمفضلیات بشرح ابن الانباری ۳۶۰ واللسان والصحاح (ضرس) غیر منسوب والاقتضاب ۴۱۸ وفی روایتهم جمیعاً وان یکبر بدل وان یسمن وهو الصواب راجع السمط (۱۷۵:۱) وتمامه: شدید الازم لیس بذی ضروس۔ قال البکری وکذا انشده ابوعلی الفارسی وفی روایة لیس له ضروس والصواب الاول قاله ابن البری وراجع حواش الصحاح والتنبیه للبکری ۳۰ والمزهر (۲۷۵:۱) وشرح ابیات الایضاح للشنمتری ۱۴۷ (مخطوطه) والمعانی للقبتی ۶۳۲ و بعده: انا وجدنا بن سلمة بمنزلة مثل القراد علی حالیه فی الناس وبعده ابیات لغیر فی الشطرنج.

پرستش کرتے ہیں وہ مادہ ہیں، (میں اِنَاث، اُنْثٰی کی جمع ہے) بعض مفسرین نے احکام لفظیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو جن اسماء سے پکارتے تھے جیسے لات، عزیٰ، منات الثالثہ یہ سب مؤنث ہیں اس لیے قرآن نے اناث کہہ کر پکارا ہے [1] اور بعض نے معنیٰ کا اعتبار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر منفعل اور ضعیف چیز کو انیث کہا جاتا ہے، جیسے کمزور لوہے پر انیث کا لفظ بولتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی باہمی نسبت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔(۱) فاعل غیر منفعل، یہ صفت صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔(۲) منفعل غیر منفعل، یہ خاصہ جمادات کا ہے۔(۳) ایک اعتبار سے فاعل اور دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن و انس اور ملائکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے فاعل سے منفعل اور اپنی مصنوعات کے لحاظ سے فاعل ہے اور چونکہ ان کے معبود جمادات کی قسم سے تھے جو منفعل محض ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انھیں اناث کہہ کر پکارا ہے اور اس سے ان کی اعتقادی جہالت پر تنبیہ کی ہے کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی کوئی کام سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (توحید کی طرف دعوت کے سلسلہ میں) اپنے باپ سے کہا۔﴿ یَـٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْئًا ﴾ (۱۹:۴۲) کہ ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں

لیکن آیت کریمہ:﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ (۴۳:۱۹) اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں (مادہ، خدا کی بیٹیاں) بنا دیا۔ میں ملائکہ کو اناث قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

ا ن س

اَلْاِنْسُ یہ جن کی ضد ہے اور اُنْسٌ (بضمہ الہمزہ) نُفُوْرٌ کی ضد ہے اور اِنْسِیٌّ۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے اور اِنْسِیٌّ اسے کہا جاتا ہے، جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اُنس کیا جائے اسے بھی اِنْسِیٌّ کہہ دیتے ہیں اور جانور یا کمان کی وہ جانب جو سوار یا کمانچی کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جانب کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں، اِنْسٌ کی جمع اَنَاسِیٌّ ہے قرآن پاک میں ہے:

وَاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا (۲۵:۴۹) بہت سے (چوپایوں) اور آدمیوں کو۔ اور نفس انسانی کو اِبْنُ اِنْسِكَ کہا جاتا ہے۔

اٰنَسَ (افعال) کے معنی کسی چیز سے انس پانا یا دیکھنا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا ﴾ (۴:۶) اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو۔

اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷:۷) میں نے آگ دیکھی۔

اور آیت کریمہ: حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا (۲۴:۲۷) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ان سے اجازت لے کر انس پیدا نہ کرلو۔

اَلْاِنْسَانُ: انسان چونکہ فطرۃً ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے

[1] چنانچہ حسن سے مروی ہے: لَمْ یَكُنْ حَیٌّ من احیاء العرب الا ولهم صنم یعبدونه یسمونه انثی بنی فلان الكشاف.

بغیر نہیں بن سکتا، اس لیے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرسکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی سے مانوس ہوجاتا ہے۔ اس لیے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انسان اصل میں اِنسِیَان بروزن اِفْعِلَان ہے اور (انسان) چونکہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لیے اسے انسان کہا گیا ہے۔

ا ن ف

اَلْاَنْفُ اصل میں اَنْفٌ بمعنی ناک ❶ ہے۔ مجازاً کسی چیز کے سرے اور اس کے بلند تر حصہ کو بھی اَنْفٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ پہاڑ کی چوٹی کو اَنْفُ الْجَبَلِ اور کنارہ ریش کو اَنف اللحیۃ کہہ دیتے ہیں۔ اور حمیت وغضب اور عزت و ذلت کو انف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ؎

(۳۰) اِذَا غَضِبَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعَتْبٰی وَلٰكِنْ اَزِيْدُهَا

اور جب وہ ناراض ہوں گے تو میں انھیں راضی نہیں کروں گا، بلکہ ان کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔

اور متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ شَمَخَ فُلَانٌ بِاَنْفِهٖ فلاں نے ناک چڑھائی یعنی تکبر کیا۔

تَرِبَ اَنْفُهٗ وہ ذلیل ہو۔

اَنِفَ فُلَانٌ مِنْ كَذَا: کسی بات کو باعث عار سمجھنا اَنَفْتُهٗ اس کی ناک پر مارا۔ اور اَلْاَنَفَةُ بمعنی حمیت بھی آتا ہے۔

اِسْتَاْنَفْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی شے کے سرے اور مبدأ کو پکڑنے (اور اس کا آغاز کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد ہے۔ ﴿مَاذَا قَالَ اٰنِفًا﴾ (۱۶:۴۷) انھوں نے ابھی (شروع میں) کہا تھا؟

ا ن م ل

آیت کریمہ:

﴿عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۱۱۹:۳)

(تو) تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کھاتے ہیں۔ میں اَنَامِلُ اَنْمُلَة کی جمع ہے جس کے معنی انگلی کے اوپر کے پور کے ہیں جس میں ناخن ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُؤَنْمَلُ الْاَصَابِعِ فلاں کی انگلیوں کے پور غلیظ اور چھوٹے ہیں۔ اس میں ہمزہ زائدہ ہے کیونکہ نَمِلُ الْاَصَابِعِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے ہم نے یہاں بیان کردیا ہے۔

اَنّٰی

اَنّٰی: یہ حالت اور جگہ دونوں کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی اَیْنَ اور كَیْفَ کے آتا ہے پس آیت کریمہ: ﴿اَنّٰی لَكِ هٰذَا﴾ (۳۷:۳) کے معنی یہ ہیں کہ کھانا تجھے کہاں سے ملتا ہے۔

اَنَا

ضمیر واحد متکلم ہے ایک لغت میں وصل کے وقت اس کا الف حذف کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ﴾ (۳۸:۱۸) مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی میرا پروردگار ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ لٰكِنَّا اصل میں لٰكِنْ اَنَا ہے اَنَا کے ہمزہ کو حذف کرکے

❶ وفي القران ۔ والانف بالانف (٥۔٤٥).

لٰکِنْ کے نون کو نَا کے نون میں ادغام کردیا گیا ہے ایک قرأت میں لٰـکِنَّ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ ہے، جس میں اَنَا کے آخری الف کو حذف کردیا گیا ہے۔ أَنِیَّةُ الشئِ وَاُنِّیَتَهٗ کے معنی ذات شی کے ہیں اس سے کسی شے کے وجود کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہ ترکیب عربی نہیں ہے بلکہ محدث ہے۔

ا ن ی

اٰنَ (ض) الشيءُ: اس کا وقت قریب آ گیا۔ وہ اپنی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ گئی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَـمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا﴾ کیا ابھی تک مومنوں کے لیے وقت نہیں آیا؟ (۵۷:۱۶)

غَیْـرَ نَـاظِرِیْنَ اِنَاهُ (۳۳:۵۳) تم کھانے کے وقت کا انتظار کررہے ہو (انـی الحمیم۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا) قرآن میں ہے حَمِیْمٍ آنٍ (۵۵:۴۴) مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ (۸۸:۵) گرم کھولتے ہوئے چشمے سے۔

اَنَـی (بتثلیث الهمزہ) وقت کا کچھ حصہ۔ اس کی جمع اَنَاءٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

یَتْـلُـوْنَ آیـاتِ اللّٰهِ اٰ نَاءَ اللَّیْلِ (۳:۱۱۳) جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ ﴿ وَمِنْ آنَاءِ الَّیْلِ فَسَبِّـحْ ﴾ (۲۰:۳۰) اور رات کے اوقات میں (بھی) اس کی تسبیح کیا کرو۔

اِنَـــی: ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں اسم مقصور ہوگا اور ہمزہ مفتوح ہونے کی صورت میں اسم ممدود حطیہ نے کہا ہے [1] (الواخر)

(۳۱) آنَیْتُ الْعَشَاءَ اِلٰی سُهَیْلٍ
اَوِ الشعریٰ فطال بِیَ الْاَنَاءُ

میں نے سہیل یا شعریٰ ستارہ کے طلوع ہونے تک کھانے کو مؤخر کردیا اور میرا انتظار طویل ہوگیا۔ آنَیْـتُ الشيءَ اِیْـنَـاءً۔ کسی کام کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرنا۔ [2] تَاَنَّیتُ: میں نے دیر کی اَلْاَنَاةُ: حلم، وقار، طمانیت، تَانّٰی فُـلَانٌ تَاَنِّیًا وَاَنِی یَاْنٰی اَنْیًا (س) تحمل اور حلم سے کام لینا۔ اِسْتَـاْنَیْتُ الشيءَ میں نے اس کے وقت کا انتظار کیا نیز اس کے معنی دیر کرنا بھی آتے ہیں جیسے استأنیتُ الطعام میں نے کھانے کو اس کے وقت سے مؤخر کردیا۔

اَلْاِنَـاءُ: برتن۔ جمع آنِیَةٌ۔ جیسے کِسَـاءٌ وَاَکْسِیَةٌ اس کی جمع الجمع الاَوانِی ہے۔

ا ه ل

اَهْـلُ الرَّجُلِ: ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ہم نسب یا ہم دین ہوں اور یا کسی صنعت یا مکان میں شریک ہوں یا ایک شہر میں رہتے ہوں اصل میں اهـــل الـــرجل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں پھر مجازاً آدمی کے قریبی رشتہ داروں پر اہل بیت

---

[1] قـاله حطیئة فی قصیدة ٤٣ بیتاً یهجوفیها الزبرقان بن بدر مطلعها : الابلغ بنی عوف بن کعب فهل قوم علی خلق سواء القصیدة فی دیـوانـه (۹۸۔۱۰۹) (نشر نعمان قاهره ۱۳۷۸ ھ والبیـت فـی اضـدا دالاصمعی ۲۷ وابن السـکیـت ۱۸۲ واضداد ابن الانباری ۸۲ و اضـدادابـی الـطیـب ٦۱۰ والـلسـان (انی) والطبری ۲۲ : ۳٤ والاشباه النحویة ٤ : ٤۹ وابن ولاد ۸۱،۷ والعمدة (۲ : ۱۷۰) وذیل مـجـالس ثعلب ۱ : ۲۷٦ وفی روایة ابی عبید ة واکریت بدل وانیت (اللسان= کرا) واصلاح ابی یعقوب ۲٤۳ وفی روایة الاصمعی انّیـت وروا ه فی المختارات ۱۳۰ فی قصیدة ٤۳ مطلعها : الاقالـت امامة هل تعزی ۔ فقلت امیم قد غلب العزاء.

[2] وفی الحدیث قال صلی الله علیه وسلم لقه آنیت وآزیت فی رجل جاء یوم الجمعة یتخطی رقاب الناس.

الرجل کا لفظ بولا جانے لگا ہے اور عرف میں اہل البیت کا لفظ خاص کر آنحضرتؐ کے خاندان پر بولا جانے لگا ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (۳۳:۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کی میل کچیل) دور کردے۔

اور کبھی اہل الرجل سے بیوی مراد ہوتی ہے۔ [1] اور اَهلُ الاسلام کے معنی مسلمان قوم کے ہیں۔ شریعت (اسلامیہ) نے اکثر احکام میں کافر اور مسلمان کے مابین چونکہ نسبی تعلق کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے (نوح علیہ السلام) کے لڑکے کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ (۱۱:۴۶) یعنی یہ تیرے خاندان سے نہیں ہے، اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اور فرمایا: ﴿وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ﴾ (۱۱:۴۰) اپنے اہل کو کشتی میں سوار کرلو۔ ہاں جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے اس کو سوار نہ کرنا۔

اَهَلَ الرَّجُلُ (ن ض) يَأْهُلُ اَهُولاً اس نے شادی کرلی۔

مَكَانٌ مَاهُولٌ: آباد جگہ جہاں لوگ بستے ہوں۔ اُهِلَ بِهٖ وہ جگہ آباد ہوگئی۔ دَابَّةٌ اَهِلٌ وَاَهْلِيٌّ وہ چوپایہ جو کسی جگہ سے مانوس ہو (پالتو) تَاَهَّلَ الرَّجُلُ اس نے شادی کرلی اس سے (بطورِ دعا) کہا جاتا ہے: اَهَّلَكَ اللّٰهُ فِي الْجَنَّةِ یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں جنت میں بیوی اور اہل بخشے کہ تم ان کے ساتھ رہو۔

فُلَانٌ اَهْلٌ لِكَذَا ۔ فلاں اس کا مستحق اور سزاوار ہے اور مہمان کی آمد پر اسے خوش آمدید کے طور پر مَرْحَبًا وَاَهْلًا کہا جاتا ہے یعنی ہمارے پاس تمہارے لیے فراخی ہے اور ہم تمہارے اہل بیت کی طرح تمہارے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔ اَهْلٌ کی جمع اَهْلُوْنَ وَاَهَالٍ وَاَهْلَاتٌ آتی ہے۔ [2]

اوب

اَلْاَوْبُ: گو اس کے معنی رجوع ہونا کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے، مگر اَوْبٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ اٰبَ اَوْبًا وَاِيَابًا وَمَاٰبًا وہ لوٹ آیا قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ ﴾ (۸۸:۲۵) بیشک ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ ﴿ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴾ (۷۸:۲۹) پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنائے۔

اَلْمَاٰبُ یہ مصدر (میمی) ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ (۳:۱۴) اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

اَلْاَوَّابُ یہ تَوَّابٌ کا (صیغہ مبالغہ) ہے یعنی وہ شخص جو معاصی کے ترک اور فعل طاعت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴾ یعنی ہر رجوع لانے اور حفاظت کرنے

---

[1] وفی القران : وسار باهله(۲۸۔۲۹).

[2] ایضاً اهل کتاب الذین عندهم الکتاب سماوی وفی جمیع القران المراد بهم الیهود والنصاری .

والے کے لیے (۳۲:۵۰) ﴿ اِنَّہٗ اَوَّابٌ ﴾ (۳۸:۱۷) بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔

اسی سے اَوْبَۃٌ بمعنی توبہ بولا جاتا ہے...... اَلتَّاْدِیْب۔ دن کوسفر کرنا اور شاعر کے قول ع

(۳۲) آبَتْ یَدُ الرَّامِیْ اِلَی السَّھْمِ

تیرانداز کا ہاتھ تیر کی طرف لوٹ آیا۔

میں اَوَبٌ (لوٹنا) کی نسبت ید کی طرف کی گئی ہے جو درحقیقت تیرانداز کا فعل ہے۔ اس سے ہمارے سابق بیان پر اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ اَوْبٌ ارادہ اور اختیار کے ساتھ لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ ❶

اسی طرح نَاقَۃٌ اَوُوْبٌ سبک رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ہاتھ پھرتی سے لوٹتے ہیں۔

اود

اَلْاَوْدُ (ن) آدَ یَؤُدُ اَوْدًا وَاِیَادًا کے معنی بوجھل اور گرانبار کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلَا یَؤُدُہٗ حِفْظُھُمَا ﴾ (۲:۲۵۵) اور آسمان وزمین کی حفاظت باری تعالیٰ کو بوجھل نہیں کرتی اور یہ بروزن قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا ہے اس سے واحد متکلم کا صیغہ اُدْتُ بروزن قُلْتُ ہوگا اصل میں آدَہٗ کے معنی ہیں: اس نے اپنے بوجھ اور گرانباری کی وجہ اس کی گذرگاہ سے ٹیڑھا کردیا۔

اول

اَلْاٰلُ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُھَیْلٌ آتی ہے مگر اس کی اضافت ناطقین انسان میں سے ہمیشہ عَلَم کی طرف ہوتی ہے کسی اسم نکرہ یا زمانہ یا مکان کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں ہے اس لیے آل فلان (علم) تو کہہ سکتے ہیں مگر آل رجل، آل زمان کذا و آل مکان کذا بولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیشہ صاحب شرف اور افضل ہستی کی طرف مضاف ہوگا اس لیے آل الخیاط بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ آل اللہ یا آل السلطان کہا جائے گا۔ مگر اھل کا لفظ مذکورہ بالا میں سے ہر ایک کی طرف مضاف ہوکر آجاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اہل زمن کذا و بلد کذا بولا جاتا ہے اسی طرح اہل اللہ و اہل الخیاط بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ ''آل'' دراصل بمعنی شخص ہے۔ اس کی تصغیر اُوَیل آتی ہے اور یہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوگا جس کو دوسرے کے ساتھ ذاتی تعلق ہو مگر قریبی رشتہ داری یا تعلق والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَآلَ اِبْرَاھِیْمَ وَآلَ عِمْرَانَ ﴾ (۳:۳۳) خاندان ابراہیم اور خاندان عمران۔ ﴿ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابَ ﴾ (۴۰:۴۶) فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کردو۔ آلُ النَّبِی۔ بعض نے کہا کہ آل النبی سے آنحضرت ﷺ کے رشتہ دار مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنھیں علم ومعرفت کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل دین دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو علم وعمل کے اعتبار سے راسخ اور محکم ہوتے ہیں ان کو آل النبی اور اُمَّتُہٗ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا سراسر ذہن تقلیدی ہوتا ہے ان کو اُمت محمد ﷺ تو کہہ سکتے ہیں مگر آل محمدؐ نہیں کہہ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ امت اور آل میں عموم و

---

❶ وفی القران: یَاجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ (۲۴۔۲۵) وفی الحدیث شغلونا عن الصلوۃ الوسطیٰ حتیٰ آبت الشمس راجع للتاج (اوب).

خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر آل نبی اس کی امت میں داخل ہے مگر ہر امتی آلِ نبی نہیں ہوسکتا۔

امام جعفر صادق ؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگ تمام مسلمانوں کو آلِ نبی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو انھوں نے فرمایا: یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ سائل نے عرض کی یہ کیسے؟ فرمانے لگے: غلط تو اس لیے کہ تمام امت آل نبی میں داخل نہیں ہے اور صحیح اس لیے کہ وہ شریعت کے کما حقہ پابند ہو جائیں تو انھیں آل النبی کہا جاسکتا ہے۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ ﴾ (۴۰:۲۸) اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مؤمن شخص ...... کہنے...... میں اس مرد مومن کے آل فرعون ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ (بظاہر) تو اس کے خصوصی اہل کاروں اور فرعونی شریعت کے ماننے والوں سے تھا اور مسکن ونسب کے اعتبار سے انہیں میں سے شمار ہوتا تھا نہ اس لیے کہ وہ لوگ بھی اسے اپنی شریعت کا پابند خیال کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل میں اِیل اسماء حسنٰی سے ہے مگر قواعد عربیہ کی رو سے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اسماء مرکب اضافی ہوتے تو لفظ اہل کو مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہونا چاہیے تھا۔

آلُ الشَّيءِ کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں اور جو دور سے مضطرب نظر آ رہا ہو۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۳۳) وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا آلُ خَيْمٍ مُنَضَّدِ

کہ مرتب خیموں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا۔

اور آل اس حالت کو بھی کہتے ہیں جس کی طرف انسان کا معاملہ آخر کار لوٹ کر آئے، شاعر نے کہا ہے ❸

سَأَحْمِلُ نَفْسِيْ عَلَىٰ آلَةٍ
فَإِمَّا عَلَيْهَا وَإِمَّا لَهَا

آخر الامر میں اپنی جان کو ایسے امر پر مجبور کرونگا وہ یا تو اس کے لیے نقصان دہ ہوگی یا فائدہ مند۔

اور آل بمعنی سراب بھی آتا ہے یعنی وہ جو ہوا کے تموج سے یا ویسے بے حقیقت چیز (دوپہر کے وقت) دکھائی دیتی ہے، لہٰذا یہ اصل میں آل یؤل سے ہے جس کے معنی لوٹنا کے ہیں۔ آل اللَّبَنُ دودھ گاڑھا ہوگیا گویا اس میں نقصان کی طرف رجوع ہونے کے معنی ملحوظ ہیں جیسا کہ ناقص چیز کو رَاجِعٌ کہا جاتا ہے۔

اَلتَّاوِيْلُ: یہ بھی اوّل سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی چیز کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں اور جس مقام کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اُسے مَوْئِلٌ (جائے بازگشت) کہا جاتا ہے۔ پس تَاوِيْلٌ کسی چیز کو اس غایت کی طرف لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظ علم یا عمل کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ غایت علمی یا عملی کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ

---

❶ وفي الحديث آل محمد كل تقي (طس والرسالة القشيريه ص ٥٦ عن انس) انظر المجالس للشيخ الجيلاني والشفاء للقاضي عياض مع شرح نسيم الرياض وايضاً الرمضة (شرح المهذب للنووى).

❷ قاله زهير يمدح هرم بن سنان وصدره : اربت بها الارواح كل عشية ـ...... وفي رواية فلم بدل ولم والبيت في ديوانه ١٨٠ (بشرحه للشنمترى طبع ليدن ١٣٠٦ ھ والعقد الثمين ٧٩ ومختار الشعر الجاهلى (١ : ٢٠٨) والبحر (١ : ٤٥٥)وفيه آل نوى بدل آل خيم وفي اللسان انظر صدرالبيت وعجزه : وسفع على آس ونوى مثعاب ونسبه الى النابغة ويروى عجزه وثم على عرش الخيام غسيل وقال ورواه ابو عبيدة للنابغة وثعلب للزهير .

❸ قاله خنساء في رثاء ابى عمرو والبيت في اللسان والمحكم (علا، فوق) وايام العرب ٢٩ يوم حوذة الثانى (٨)والكامل للمبرد (١٢١٦) في ستة ابيات.

غایت علمی کے متعلق فرمایا:﴿ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ﴾ (۶:۳) حالانکہ اس کی مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور غایت عملی کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۳۵) وَلِلنَّویٰ قَبْلَ یَوْمِ الْبَیْنِ تَاوِیْلٌ

اور جدائی کے دن سے پہلے ہی جدائی کا انجام کار اور اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن میں ہے:﴿ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ ﴾ (۷:۵۳) اب صرف وہ اس کی تاویل یعنی وعدہ عذاب کے انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں جس دن اس وعدہ عذاب کے نتائج سامنے آجائیں گے۔

یعنی اس دن سے جو غایت مقصود ہے وہ عملی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

اور آیت کریمہ:﴿ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾ (۴:۵۹) میں بعض نے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے احسن تاویلا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے آخرت میں بلحاظ ثواب کے احسن ہونا مراد لیا ہے۔

اَلْاَوْلُ: (ن) کے معنی ہیں مآل اور نتیجہ پر رکھتے ہوئے سیاست اور انتظام کرنا۔اسی سے کہا جاتا ہے:قَدْ اُلْنَا وَاِیلَ عَلَیْنَا ہم نے حکومت کی اور ہم پر حکومت کی گئی۔

اَلْاَوَّلُ: خلیل کے نزدیک اس کی اصل (اول) ہے اس لیے فَعَّلَ کے وزن پر ہوگا بعض کا خیال ہے کہ اس کا مادہ (ووال) ہے اس لیے اَوَّل بروزن اَفْعَل ہوگا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ فا اور عین کلمہ میں دو حرف یک جنس نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ بہت صورت میں یہ اَوْلٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی اصل کی طرف رجوع ہونا کے ہیں اور اَوَّلَ اصل میں اٰوَلُ ہوگا کثرت استعمال کے باعث الف ثانی کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہے۔

اَوَّلْ: اصل میں صیغہ صفت ہے کیونکہ اس کی تانیث اُولیٰ بروزن اُخْریٰ آتی ہے ❷ بس اَوَّل وہ ہے جس پر اس کا غیر مرتب ہو اور بچند وجوہ استعمال ہوتا ہے۔

(۱) جو دوسرے پر باعتبار زمانہ متقدم ہو جیسے عبدالملک اور ثم منصور کہ پہلے عبدالملک اور پھر منصور۔

(۲) اور مرتبہ اور ریاست کے اعتبار سے دوسرے پر متقدم ہو اور دوسرا اس کی اقتدا کرے جیسے الامیر اولاثم الوزیر۔ کہ پہلے امیر اور اس کے بعد وزیر۔

(۳) وضع اور نسبت کے اعتبار سے پہلے ہو جیسے ایک شخص عراق سے روانہ ہو تو اسے کہا جائے گا القادسیة اولا ثم فَیْد۔ کہ پہلے قادسیہ آئے گا اور پھر فید۔اور مکہ سے روانہ ہونے والے کو کہا جائے گا کہ پہلے فید اور پھر قادسیہ آئے گا۔

(۴) جو نظام صناعی کے اعتبار سے متقدم ہو جیسے الاس اولا ثم البناء۔ کہ پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

---

❶ قاله عبدة بن الطيب وصدره وللاحبة ايام مذكرها والبيت فى المفضليات (١: ١٣٤) وتفسير الطبرى (٤: ٤٣) وتاريخ الطبرى (٤: ٤٣) والقصيدة فى منتهى الطلب (١: ١٨٩۔١٩٢).

❷ وفى القرآن: وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (٩٢۔١٣) راجع ايضاً (الدخان: ٧٣٥۔٥٦) النجم: ٢٥۔٥٠۔٥٦ (الواقعة: ٦٢) (النازعات ٢٥) (الاعلىٰ: ١٨) (الضحىٰ: ٤).

اور جب صفت باری تعالیٰ میں ھو الاول کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو اور جن علماء نے اوّل کے معنی غیر محتاج یا مستغنی بنفسہٖ کیے ہیں ان کا اشارہ بھی اسی معنی کی طرف ہے۔

اور آیت ﴿ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (۱۶۳:۶) اور آیت ﴿ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۱۴۳:۷) میں اَوَّلُ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام و ایمان میں ہی سب سے پہلے دوسروں کے لیے اسوہ اور مقتدا بنتا ہوں اسی طرح آیت: ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ﴾ (۴۱:۲) کے معنی یہ ہیں کہ کفر میں پہل کر کے دوسروں کے لیے اسوہ اور پیشوا نہ بنو کہ لوگ تمہاری اقتداء کریں۔

کبھی اوّل کا لفظ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے، جیسے جِئْتُهٗ اَوَّلُ۔ اور کبھی اوّل بمعنی قدیم بھی آ جاتا ہے، جیسے جِئْتُكَ اَوَّلاً وَآخِرًا ای قدیمًا و حدیثًا یعنی پہلے بھی آیا تھا اور اب بھی۔

اور آیت کریمہ: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ (۳۵:۷۵) میں اولیٰ کلمہ تہدید اور تخویف ہے اور جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تنبیہ کرنے کے لیے آتا ہے، پھر جو شخص بڑی ذلت کے بعد ہلاکت سے بچ جائے اسے دوبارہ روکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے عموماً یہ کلمہ مکرر آتا ہے گویا اسے تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ انجام پر غور کر کے اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ [1]

اون

اَلْآن: ہر وہ لمحہ جو ماضی اور مستقبل کے مابین فرض کیا جائے اسے اَلْآنَ کہا جاتا ہے۔ جیسے اَلْآنَ افعل کذا (میں اب کرتا ہوں) اور اَلْآنَ کا لفظ ہمیشہ الف لام تعریف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے [2] اور اَفْعَلْ كَذَا آوِنَةً کا محاورہ بھی اَلْآنَ سے ماخوذ ہے۔ هٰذا اوان ذالك (یہ اس کا صحیح زمانہ یا وقت ہے) سیبویہ نے کہا ہے کہ اَلْآنَ آنُكَ کے معنی ہیں هذا الْوَقت وَقْتُكَ اسی سے فعل آن یؤون اَوْنًا استعمال ہوتا ہے۔

ابوالعباس لکھتے ہیں [3] کہ یہ " اَلْآنَ " سے نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور علیحدہ فعل ہے۔

اوہ

اَلْاَوَّاہُ: وہ شخص جو بہت زیادہ تاوّہ کرتا ہو اور تَاَوّہ کے معنی ہیں حزن وغم ظاہر کرنے کے لیے اَوّہ زبان پر لانا اور ہر وہ کلمہ جس سے تاسف اور حزن کا اظہار ہوتا ہو اسے تَاَوَّہْ سے تعبیر کر لیتے ہیں لہٰذا اَوَّاہُ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو خشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنے والا ہو۔

---

[1] قال فی اللسان الاصل فی "الآن" ان یکون لزمان الحال ثم توسعوا فیه للوصف واللام فیه للتعریف واصل "الآن" اوان حذف الهمزة ثم غیرت واوها الی الف کمافی الراح والریاح.

[2] بنصب الآن ورفع آنك قال ابن جنی وکذا قرأناه فی الکتاب لسیبویه راجع اللسان (این) والکتاب.

[3] ابوالعباس محمد بن یزید (۲۱۰ ھ ۲۸۶) الثمالی المعروف بالمبرد امام العربیة واحد ائمة الادب والاخبار ومن کتبه المطبوعة "الکامل" وشرح لامیة العرب المطبوع مع شرح الزمخشری وله کتب اخری معروفة قال الزبیدی فی شرح خطبته القاموس المبرد بفتح الراء المشددة وبعضهم یکسر راجع لاحواله النزهة ۲۸۵ والبغیه ۱۱۶ والفهرست ۵۹ وطبقات للزبیدی رقم ۴۰ والانساب ۱۱۶ (الثمالی) والحصری ۲۱۶/۲ و ۲۳۷) والادباء: ۱۳۷/۷ والوجیات: ۴۹۵/۱ ولسان المیزان ۵: ۴۳۰ ومعانی العسکری: ۱۷۸/۱.

اور آیت کریمہ: ﴿ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴾ (۱۱:۷۵) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) مؤمن اور بہت زیادہ دعا کرنے والے تھے مآل کے اعتبار سے یہ معنی بھی ماتقدم کی طرف راجع ہے۔

ابو العباس فرماتے ہیں کہ کام کے روکنے کے لیے کلمہ "اِيْهًا" اور ترغیب دینے کے لیے وَيْهًا کہا جاتا ہے اور اظہار تعجب کے لیے وَاهًا کہتے ہیں۔

اوی

اَلْمَاْوٰى: یہ اَوٰى (ض) اُوِيًّا ومَاْوًى کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے یا پناہ حاصل کرنا کے ہیں) اور اَوٰى اِلٰى كَذَا کے معنی ہیں کسی کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا اور آواہ (افعال) اِيْوَاءً کے معنی ہیں کسی کو جگہ دینا قرآن میں ہے: ﴿ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ ﴾ (۱۸:۱۰) جب وہ اس غار میں جا رہے۔ ﴿ قَالَ سَاٰوِيْ اِلٰى جَبَلٍ ﴾ (۱۱:۴۳) اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جالگوں گا۔ ﴿ وَتُـؤْوِيْ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ﴾ (۳۳:۵۱) جسے چاہو اپنے پاس ٹھکانا دو۔ ﴿ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْوِيْهِ ﴾ (۷۰:۱۳) اور اپنا خاندان جس میں رہتا تھا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ عِنْدَهٗ جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴾ (۵۳:۱۵) میں لفظ جَنَّة کی اضافت ماویٰ (مصدر) کی طرف ہے، جیسا کہ ﴿ دَارُ الْخُلْدِ ﴾ (۴۱:۲۸) میں لفظ دار کی اضافت اَلْخُلْد مصدر کی طرف ہے [1] اور آیت ﴿ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ (۱۷:۹۷) میں مَاْوٰى کے معنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔

اَوَيْتُ لَهٗ اَوْيًا وَاِيَّةً وَمَاْوِيَةً وَمَاْوَاةً کے معنی ہیں: میں نے اس پر رحم کھایا۔ اصل میں اس کے معنی رَجَعْتُ اِلَيْهِ بِقَلْبِيْ کے ہیں یعنی میں دل سے اس کی طرف مائل ہوا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ ﴾ (۱۲:۶۹) کے معنی یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حاتم طائی کے شعر [2] (الطویل)

(۳۶) اَمَاوِيَّ اِنَّ الْمَالَ غَادٍ وَرَائِحٌ.

اے ماویہ! بے شک مال صبح شام آنے جانے والی چیز ہے۔ میں اَلْمَاوِيَّة عورت (بیوی) کا نام ہے چنانچہ بعض نے اسے بھی اسی باب (اوی) سے مانا ہے اور کہا ہے کہ گویا قبول صورت (ماوی الصورة) ہونے کی وجہ سے اسے الماویہ کہا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ مَاءٌ کی طرف نسبت ہے۔ اور اصل میں مَائية ہے ہمزہ کو واو کے ساتھ بدل لیا گیا ہے۔ [3]

---

[1] فی النسخ المطبوعة کلها دار الخلود تصحيف وجاء فی التنزيل يوم الخلود (۵۰-۳۴) فی آية فقط واما کلمة خُلد فقد جاء فی آيات (۱۰-۵۲) (۲۰-۱۲۰) (۲۱-۳۴) (۲۵-۱۵) (۳۲-۱٤).

[2] قال فی شواهد الکشاف ۶۰ان ماوية اسم ام حاتم وهی بنت عفير وكانت تلومه فی جودة بالمال واصله نسبة الى الماء لانه تشبيه فی اللين والرقة وعجز البيت .... ويبقى من المال الاحاديث والذكر انظر ديوانه ۵۰فی ۲۰ بيتاً وراجع للبيت ايضًا الخزانة ٤:۱۵۸/۳:۱۹۳ وذيل الامالی ۳۰ فی اربعة ابيات والعقد ۱:۲۳۶ فی ۱۵ بيتًا وقيل انه افضل ماقيل فی الجود ورايت فی تقدمة ديوان (بيروت ۱۳۸۳ھ) ان ماويه زوجة وذكر فيه قصة زواجه معه.

[3] راجع شرح شواهد الکشاف ـ۶.

ا ی ی

اَیٌّ: جب استفہام کے لیے ہو تو جنس یا نوع کی تعیین اور تحقیق کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اور یہ خبر اور جزا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے [1]، چنانچہ فرمایا: ﴿اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾ (۱۷:۱۱۰) جس نام سے اسے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔ ﴿اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ﴾ (۲۸:۱۸) کہ میں جونسی مدت (چاہوں) پوری کردوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

اَلْآیَةُ: اس کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل ''آیۃ'' ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہٖ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کرلیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کرلیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے، چنانچہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہوجائے گا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہوجاتا ہے۔

آیۃ کا لفظ یا تو اَیٌّ سے مشتق ہے کیونکہ یہ بھی ایک چیز کو دوسری سے تمیز دیتی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تَاَیِّیْ (مصدر تفعل) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز پر ٹھہرنے اور تثبت حاصل کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تَاَیَّ (امر) یعنی ٹھہر و اور رفق سے کام لو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَوِیَ اِلَیْهِ سے مشتق ہو۔

(۱) آیۃٌ کا لفظ بلند عمارت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ آیَةً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶:۱۲۸) کہ تم ہر فضا مقام پر بے کار نشان تعمیر کرتے ہو۔

(۲) اور قرآن پاک کے ہر اس حصہ کو جو کسی حکم پر دال ہو آیۃ کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ایک سورۃ ہو یا اس کی ایک فصل یا کئی فصلیں ہوں۔

(۳) اور کبھی ہر اس کلام کو جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو آیۃ کہہ دیا جاتا ہے اسی اعتبار سے سُور کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ سورۃ شمار کی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۲۹:۴۴) میں آیات سے فکری دلائل مراد ہیں کہ لوگ اپنے مراتب علمیہ کے اعتبار سے ان کی معرفت میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیَاتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ (۲۹:۴۹) بلکہ یہ اہل علم کے نزدیک واضح دلائل ہیں اور ہمارے ان دلائل سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ ﴿وَكَاَیِّنْ مِّنْ آیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۲:۱۰۵) اور آسمان و زمین میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔

پھر قرآن مجید میں کسی خاص معنی کا لحاظ کرتے، بعض مواضع میں آیۃ مفرد اور دوسرے مقامات پر آیات بصیغۂ

[1] ای یکون شرطا وقد یاتی موصولا نحو لننزعن من کل شیعۃ ایھم اشد (۱۹۔۶۹) وفی اعراب الآیۃ اعتراك بین العلماء ویاتی و الاعلی معنی الکمال فیقع صفتہ للنکرۃ نحو زید رجل ای رجل وان یکون وصلۃ الی نداء مافیہ ال نحو یاایھا الناس فھذہ خمسۃ وجوہ۔

جمع لایا گیا ہے جس کی تفصیل اور توضیح اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً ﴾ (۲۳:۵۰) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کو آیَتَیْنِ (دو آیتیں) کہنے کی بجائے آیَةً (ایک آیت) قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر (بحثیت مجموعی) ایک آیت بنتے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴾ (۱۷:۵۹) میں بعض نے کہا ہے کہ آیات سے جراد، قمل، ضفادع وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جو امم سابقہ پر (بطورِ عذاب) بھیجی گئی تھیں۔ اور "تخویفا" کے لفظ سے متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کریں گے ان پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی آیات کو طلب کرنا مکلّفین کے خسیس ترین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ انسان فعل خیر یا تو کسی رغبت اور خوف کی وجہ سے کرتا ہے یہ سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے اور یا اچھی شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ مگر اشرف اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ فضیلت کو فضیلت سمجھ کر حاصل کیا جائے اور امت محمدیہ چونکہ اشرف امت ہے جیسا کہ آیت: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (۳۔۱۱۰) میں مذکور ہے اس لیے انھیں اللہ تعالیٰ نے اس (خسیس) مرتبہ سے بلند قرار دیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ گو ان میں سے جہلاء یہ کہہ کر۔ اَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اَوِئْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ان پر عمومی عذاب نہیں آئے گا۔
بعض نے کہا ہے کہ آیات سے مراد دلائل ہیں اور تنبیہ کی ہے کہ ان کے سامنے صرف دلائل بیان ہوں گے اور انھیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا۔ ﴿ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ (۲۲:۴۷) جس کے متعلق یہ جلدی کر رہے ہیں۔
لفظ آیَة کے وزن میں تین اقوال ہیں۔(۱) یہ فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے ایسے کلمات (جن کے عین اور لام کلمہ میں حرف علت ہو) میں حق تو یہ ہے کہ ان کے لام کلمہ میں تعلیل کی جائے نہ کہ عین کلمہ میں جیسے حَیَاۃٌ اور نَوَاۃَ (وغیرہ نظائر موجود ہیں) لیکن عین کلمہ میں حرف یا آنے کی وجہ سے لام کلمہ میں تعلیل نہیں ہوئی، جیسے رَایَةٌ وغیرہ۔
(۲) بعض نے کہا ہے یہ فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے وہ حرف علت جمع ہونے کی وجہ سے پہلی یاء کو الف سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسے طَائِیٌ اور طَیِّءٌ۔
(۳) بعض نے کہا ہے کہ آیَةٌ دراصل اٰیِیَةٌ بروزن فَاعِلَةٌ ہے بغرض تخفیف یاء اول کو حذف کر کے آیَةٌ بنالیا گیا ہے مگر یہ آخری قول ضعیف ہے کیونکہ آیَةٌ کی تصغیر اُیَیَّةٌ ہے اگر یہ اصل میں فَاعِلَةٌ کے وزن پر ہوتا تو اس کی تصغیر اُوَیَّةٌ آنا چاہیے تھی۔

اَیَّانَ

اَیَّانَ: (کب) کسی شے کا وقت دریافت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ قریب قریب "متیٰ" کے ہم معنی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَيَّانَ مُرْسَاهَا ﴾ (۷۹:۴۲) کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا۔ ﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ (۱۶:۲۱) ان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ﴿ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾ (۵۱:۱۲) کہ جزا کا دن کب ہوگا۔لفظ اَیَّانَ دراصل اَمیٌّ سے

مشتق ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل اَیٌّ اَوَانٍ ہے جس کے معنی ہیں "کون ساوقت" الف کو حذف کر کے واو کو یاء اور پھر اسے یاء میں ادغام کر کے اَیَّانَ بنالیا گیا ہے۔

اِیَّا

یہ کلمہ ضمیر منصوب منفصل کے تلفظ کے لیے وضع کیا گیا ہے جب ضمیر (منصوب) (اپنے عامل پر) مقدم ہو یا اس پر کسی کلمہ کا عطف ڈالا جائے اور یا الا کے بعد آئے تو اس (اِیَّا) کے ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے (تقدیم کی صورت میں فرمایا) اِیَّاكَ نَعْبُدُ (۱:۴) اور عطف کی صورت میں) فرمایا: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ﴾ (۱۷:۳۱) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ ﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ﴾ (۱۷:۲۳) اور تیرے پروردگار نے قطعی طور ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اِیْ

اِیْ: حرف ایجاب سے کلام متقدم کی تحقیق اور توثیق کے لیے وضع کیا گیا ہے [1] جیسے فرمایا: ﴿قُلْ اِیْ وَرَبِّیْ اِنَّهُ الْحَقُّ﴾ (۱۰:۵۳) کہہ دو ہاں خدا کی قسم یہ سچ ہے۔

اَیْ

اَیْ: یہ حرف ندا ہے جیسے اَیْ زَیْدٌ اور کبھی (حرف تفسیر ہوتی ہے اور) اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی آ جاتا ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کی شرح اور تفسیر ہے۔ [2]

اَیَا

حرف ندا ہوتا ہے جیسے اَیَا زَیْدٌ

اَ

یہ بھی منجملہ حروف ندا ہے، جیسے: أَزَیْدُ

ا ی د

اَلْاَیْدُ: (اسم) سخت قوت اس سے اَیَّدَ (تفعیل) ہے جس کے معنی تقویت دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَیَّدْتُكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (۵:۱۱۰) ہم نے تمہیں روح قدس سے تقویت دی۔ ﴿وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۳:۱۳) یعنی جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے بہت زیادہ تقویت بخشتا ہے۔ اِدْتُهٗ (ض) اَئِیْدُهٗ اَیْدًا جیسے بِعْتُهٗ اَبِیْعُهٗ بَیْعًا (تقویت دینا) اور اس سے اَیَّدْتُهٗ (تفعیل) تکثیر کے لیے آتا ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ﴾ (۵۱:۴۷) اور ہم نے آسمان کو بڑی قوت سے بنایا اور اَیْدٌ میں ایک لغت آدٌ بھی ہے اور اسی سے امر عظیم کو مُؤَیَّدٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز دوسری کو سہارا دے اور بچائے اسے اِیَادُ الشَّيْ کہا جاتا ہے ایک قرأت میں آیَدْتُكَ ہے جو اَفْعَلْتُ (افعال) سے ہے اور اِیَادُ الشَّيْ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فَاعَلْتُ (مفاعلہ) مثل عَاوَنْتُ سے بھی ہوسکتا ہے۔

ا ی ک

اَلْاَیْكَ: درختوں کا جھنڈ (ذوایکۃ) اور آیت: ﴿اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ﴾ (۱۵:۷۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے [3] کہ اَلْاَیْكَةُ ان کے شہر اور آبادی کا نام ہے۔

---

[1] ای سواء کان قبلها خبر او استفهام وعلى كل حال يكون بعدها القسم.

[2] وحينئذ يكون ما بعدها عطف بيان على ماقبلها اوبدل لاعطف نسق ابن المغنى ۱/۸۰.

[3] راجع آیت: (۲۶-۱۷۶) (۳۸-۱۳) (۵۰-۱۴).

ا ی م

اَلْاَیَامٰی: (۳۲:۲۴) یہ اَلْاَیِّم کی جمع ہے اور آمَ الرَّجُلُ وَتَاَیَّمَ کے معنی ہیں مرد رنڈوا ہوگیا۔ اور عورت کے بیوہ ہونے کے لیے آمَتِ الْمَرْءَۃ وَتَأَیَّمَتْ کہا جاتا ہے۔

اِمْرَئۃٌ اَیِّمَۃٌ: بیوہ عورت رَجُلٌ اَیِّمٌ: رنڈوا مرد اَلْحَرْب مَأیَمَۃٌ: جنگ مرد کو عورت سے الگ کر دیتی ہے اَلْاَیِّمُ: سانپ۔

أین (ظرف)

یہ کلمہ کسی جگہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے، جیسا کہ لفظ ''متیٰ'' زمانہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ [1]

ا ی ن

اَلْاَیْنُ: (ض) کے معنی تھک کے چلنے سے عاجز ہوجانا کے ہیں۔ نیز آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا اور اَنیٰ یَأْنِی اَنیًا کے معنی کسی چیز کا موسم یا وقت آجانا کے ہیں اور محاورہ میں بَلَغَ اَنَاہُ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ اَنیٰ (ناقص) سے مقلوب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابوالعباسؒ نے کہا ہے کہ آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا کا ہمزہ دراصل حاء سے مقلوب (بدلا ہوا) ہے اور اصل میں حَانَ یَحِیْنَ حَیْنًا ہے اور اصل کلمہ اَلْحِیْن ہے۔

❀❀❀

[1] وفی القرآن: فاین تَذْهَبُون (۸۱-۲٦).

کِتَابُ الْبَاءِ

ب

الباء: (حرف جار) یہ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر کے متعلق ہوکر استعمال ہوتی ہے پھر متعلق بفعل ظاہر دو قسم پر ہے۔

(۱) ہمزہ افعال کی طرح تعدیہ فعل کیلئے آتی ہے جیسے ذھبت به واذھبتہٗ۔ قرآن پاک میں ہے ❶ ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (۲۶:۷۲) جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) آلہ کے لیے ہوتی ہے ❷ جیسے قطعتہٗ بالسکین (میں نے اسے چھری سے کاٹا) اور متعلق بمضمر کبھی موضع حال میں ہوتی ہے۔ جیسے خرج بسلاحہ (یعنی وہ نکلا دراں حالیکہ اس پر یا اس کے ساتھ اسلحہ بھی تھا۔ اور کبھی زائدہ ہوتی ہے جیسے فرمایا: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (۱۲:۱۷) اور اب ہماری بات کو باور نہیں کریں گے۔

اس جگہ میں اور مَآ اَنْتَ مُؤْمِنًا میں فرق ہے۔ کیونکہ منصوب ہونے کی صورت میں متکلم کے ذہن میں ایک ہی ذات کا تصور ہے جیسا کہ زَيْدٌ خَارِجٌ میں ہے مگر مجرور ہونے کی صورت میں جیسے مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ہے وہ ذات کا تصور ہے جیسا کہ لَقِيْتُ بِزَيْدٍ رَجُلًا فَاضِلًا میں ہے ❸ کہ یہاں فَاضِلًا سے زید ہی مراد ہے مگر اسے ایسی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ایک شخص (فَاضِلًا) متصور ہوتا ہے گویا تقدیر کلام یہ ہے رَأَيْتُ بِرُؤْيَتِي لَكَ آخر وهو رجل فاضل اسی طرح رأيت بِكَ حَاتِمًا فِي السخاء کا محاورہ ہے، چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۲۶:۱۱۴) اور میں مومنوں کو راندنے والا بھی نہیں ہوں۔ ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (۳۹:۳۶) کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے، مگر شیخ فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے ❹ اور آیت کریمہ: ﴿تُنْبِتُ بِالدُّهْنِ﴾ (۲۳:۲۰) میں بعض نے کہا ہے یہ تنبت الدہن کے معنی میں ہے ❺ مگر اس آیت سے یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تُنْبِتُ النباتَ ومعه الدهن کے ہم معنی ہے ❻ یعنی اس میں بالقوہ روغن موجود ہوتا ہے اور بِالدُّهن کا لفظ لاکر اللہ تعالیٰ کے انعام پر تنبیہ کی ہے نیز اس کے نکالنے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

بعض نے کہا ہے اس میں باء حال کے معنی میں ہے یعنی درآنحالیکہ اس میں روغن موجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہمزہ اور باء دونوں برائے تعدیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی کلمہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

---

❶ الباء في الآية للالصاق المجازي لا للتعدية وهما نوعان راجع ابن هشام: ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷ اوباء التعدية تسمىٰ باء النقل والاولىٰ للمثل ذهب الله بنورهم (۲: ۱۷).

❷ وتسمى باء الاستعانة.

❸ الاولىٰ ان تكون الباء فيها للسببية اى بسبب لقائي اباه واصحاب المعاني يسمون مثل هذاالباء.

❹ اى الشيخ عبدالقادر الجرجاني.

❺ اى الباء زائدة.

❻ فعلى هذا يكون الظرف حالا من المفعول اى تنبيه التسجر مصاحبا للدهن.

اورآیت کریمہ:﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ (۴۸:۲۸) میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے [1] اور یہ اصل میں وَكَفَى اللّٰهُ شَهِيْدًا ہے جیسا کہ آیت:﴿ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ﴾ (۳۳:۲۵) میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے تو لازم آتا ہے آیت مقیس علیہ میں بھی ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ﴾ کہنا صحیح ہو حالانکہ درست نہیں ہے کیونکہ باؤ زائدہ اسی مقام پر آتی ہے جہاں اس کے بعد منصوب موضع حال میں مذکور ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہاں کفٰی کا لفظ اِکْتَفِ (امر) کی جگہ لایا گیا ہے [2] جیسا کہ اَحْسِنْ بزید میں لفظ احسن مااحسن کی جگہ لایا گیا ہے [3] اور آیت کے معنی یہ ہیں اِکْتَفِ بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور اسی معنی میں فرمایا:﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ (۲۵:۳۱)﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ﴾ (۴:۴۵) اور خدا ہی کارساز کافی ہے۔﴿ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴾ (۴۱:۵۳) کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے اور حُبَّ اِلَیَّ بِفُلَانٍ کا محاورہ بھی اسی توجیہ پر محمول ہوگا۔ ای اَحْبِبْ اِلَیَّ بِہٖ۔

اورآیت کریمہ:﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (۲:۱۹۵) میں بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے [4] اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَيْدِيَكُمْ ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی باؤ آلہ کی ہے اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ہے مگر مفعول کو عدم ضرورت اور معنوی عموم کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اور آیات:﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ (۸۳:۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس سے (خدا کے) مقرب بندے پئیں گے۔﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ (۷۶:۶) یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا کے بندے پئیں گے...... میں بعض نے کہا ہے کہ باء بمعنی مِنْ ہے [5] اَیْ يَشْرَبُ مِنْهَا اور بعض نے زائدہ کہا ہے: اَیْ يَشْرَبُهَا، لیکن صحیح یہ ہے کہ باء کو اس کے معنی پر رہنے دیا جائے اور کہا جائے کہ عَيْنًا سے پانی مراد نہیں ہے، بلکہ چشمہ کا گڑھا ہے، لہٰذا یہ مکانًا يَشْرَبُ بِهٖ کی طرح ہوگا۔ [6]

اور آیت:﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ﴾ (۳:۱۸۸) میں بھی بِمَفَازَةٍ کے معنی بِمَوْضِعِ الْفَوْزِ کے ہیں یعنی ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ کسی نجات کی جگہ کے ذریعہ عذاب سے دستگار ہو جائیں گے۔

ب ء ر

اَلْبِئْرُ: (کنویں) اصل میں مہموز (العین) ہے۔ بَأَرْتُ بِئْرًا وَبَأَرْتُ بُؤْرَةً کے معنی گڑھا کھودنے کے ہیں۔ [7]

---

[1] قال الفراء زيدت الباء للمبالغة في المدح كماقالوا: ظرف بعبدالله واقبل بزيد وحسبك بصديقنا (اللسان).

[2] قاله الزجاج وصرح ابن هشام بان هذا التوجيه بعيدراجع الاتقان ج۱ ص ۱۵۹ والمغنى.

[3] اى غير الخبر الى معنى الطلب.

[4] ذكره ابن هشام فى المغنى وقال الثانى: مماتزادفيه الباء على المفعول كمافى الآية.

[5] قاله الفارسى والاصمعى والقبتى وابن مالك (ابن هشام: ص ۱۱).

[6] اى الباء للاستعانة كماقاله الزمخشرى فالمعنىٰ يشرب بهاالخمر.

[7] ومنه ابتئر بمعنى ادخروفى الحديث: فلم يبتئر شيئاً اى فلم يدخر (اللسان)

قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴾ (۲۲:۲۵) اور بہت سے کنویں بیکار اور محل ویران پڑے ہیں۔

اسی سے اَلْمِئْبَرُ کا لفظ مشتق ہے جو اصل میں اس گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر پڑے ایسے گڑھے کو مِغواۃٌ بھی کہا جاتا ہے اور کنایۃً مِئْبَرٌ ایسی سخن چینی کو کہتے ہیں جو انسان کو بلا میں ڈالنے والی ہو اس کی جمع اَلْمَآبِرُ آتی ہے۔

ب ء س

اَلْبُؤْس وَالْبَأْس وَالْبَاْسَاءُ: تینوں میں سختی اور ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں مگر بؤس کا لفظ زیادہ تر فقر وفاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور اَلْبَأْسُ وَالْبَاْسَاءُ بمعنی نکایہ (یعنی جسمانی زخم اور نقصان کے لیے آتا ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴾ (۴:۸۴) اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت سخت ہے اور سزا کے لحاظ سے بھی بہت سخت ہے۔ ﴿ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ ﴾ (۶:۴۲) پھر (ان کی نافرمانیوں کے سبب) ہم انھیں سختیوں اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے۔ ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ﴾ (۲:۱۷۷) اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ ﴿ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ﴾ (۵۹:۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

بَؤُسَ يَبْئُوسُ (بَاْسًا) بہادر اور مضبوط ہونا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ ﴾ (۷:۱۶۵) میں بَئِيْسٌ بروزن فعیل ہے اور یہ بَأْس یا بُؤس سے مشتق ہے یعنی بڑے سخت عذاب میں اور آیت کریمہ: ﴿ فَلَا تَبْتَئِسْ ﴾ (۱۱:۳۶) کے معنی یہ ہیں کہ غمگین اور رنجیدہ رہنے کے عادی نہ بن جاؤ۔ حدیث میں ہے: [1] ﴿ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتباؤس والتَّبَؤُّسَ ﴾ کہ آنحضرت ﷺ کو یہ بات بری لگتی تھی کہ فقراء دوسروں کے سامنے عجز و انکساری کریں یا کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل کرے (اور عزت نفسی کا خیال نہ رکھے) بِئْسَ: فعل ذم ہے اور ہر قسم کی مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ نِعْمَ ہر قسم کی مدح کے لیے استعمال ہوتا ہے ان کا اسم اگر معرف باللام ہو یا معرف باللام کی طرف مضاف ہو تو اسے رفع دیتے ہیں جیسے بِئْسَ الرجل زيدٌ وبئس غلام الرَّجُل زيدٌ اور اسم نکرہ کو نصب دیتے ہیں جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿ بِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (۵:۷۹) ﴿اى بِئْسَ شَيْئًا يَفْعَلُوْنَهٗ ﴾ یعنی بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔ ﴿ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ (۱۴:۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾

---

[1] وفي اللسان (باس) اويجوز التبؤس اى بالقصر والتشديد وكذا جاء في حديث الصلوة: ان تقنع يديك وتبأس فانه كلمه من بئس بمعنىٰ افتقر والحديث اخرجه ابو نعيم في تاريخ اصبهان وحمزه السلمي في تاريخ جرجان عن ابي هريرةؓ ان الله اذاانعم على عبد نعمة ويكره البوس والتبوس ورواه ابو يعلىٰ والبيهقي في الشعب ويبغض البؤس والتبؤس انظر ص ۲۳ رقم ۱۸۹ ص ۴۳ رقم ۳۶۰ عن ابى هريرةؓ مرفوعاً وفيه عن ابى سعيد وهنا .... عن يحيى بن عبيدة مرسلاً...... ويبغض بدل يكره والحديث مذكور مع حديث ان الله جميل يحب الجمال راجع تخريج الكشاف وكنزالعمال ۶: ۵۹۲،۲۵۸۶ لايحب بدل يكره (طب، هق وايضاً عن زهير بن ابى علقمة ۲۶۰۲۱, ۲۶۱۱, ۲۶۱۲) ابن ميصرى في اماليه ـ عن ابى هريرةؓ).

(۷۲:۳۹) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔ ﴿بِئْسَ لِلظَّالِمِیْنَ بَدَلًا﴾ (۵۰:۱۸) ظالموں کے لیے برا بدل ہے۔ ﴿لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ﴾ (۶۳:۵) بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں۔ بِئْسَ اصل میں بَئِسَ (س) اور بُؤْسٌ سے مشتق ہے۔

ب ت ر

اَلْبَتْرُ: یہ قریباً بَتْكٌ کے ہم معنی ہے مگر خاص کر دُم کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پھر مجازاً قطع نسل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اَبْتَر اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی موت کے بعد اس کا خلف نہ ہو اور اَبْتَر یا اَباتِر وہ ہے جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے، نیز ﴿رَجُلٌ اَبَاتِرُ﴾ قاطع رحم اور جس خُطبہ کے شروع میں حمد وثنا نہ ہو اسے بھی مجازاً خُطْبَةٌ بَتْرَاء کہا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے [1] ﴿کُلُّ اَمْرٍ لَا یُبْدَءُ فِیْهِ بِذِکْرِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ﴾ (۱۷) ہر وہ کام جس کے شروع میں اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ اَبْتَر ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (۳:۱۰۸) میں اَبْتَر کے معنی یہ ہیں کہ تیرے مخالف کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا۔ جب کفار نے طعنہ دیا کہ محمد ﷺ کی موت کے ساتھ ہی اس کا نام ونشان منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی نسل (اولاد) نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ تمہارا بداندیش ہی مقطوع النسل رہے گا، آپؐ کو تو اللہ تعالیٰ نے ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۴:۹۴) کا مقام بخشا ہے، کیونکہ جملہ مؤمنین آپ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے اور آپ کے دین کے محافظ مقرر کردیا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے [2]۔ (۲۰) اَلْعُلَمَاءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِیَ الدَّهْرُ، اَعْیَانُهُمْ مَفْقُوْدَةٌ وَآثَارُهُمْ فِی الْقُلُوْبِ مَوْجُوْدَةٌ۔ علماء تا قیامت باقی رہیں گے ان کے اجسام مفقود ہوتے جاتے ہیں، مگر ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر ثبت رہتے ہیں۔ جب علماء کو یہ فضیلت حاصل ہے جو آنحضرت ﷺ کے متبعین سے ہیں تو آنحضرت ﷺ کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو "رفع ذکر" کا شرف بخشا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے۔ صلی اللّٰه علیه وعلیهم افضل الصلاۃ والسلام۔

ب ت ک

اَلْبَتْكُ: (ض) یہ قریب قریب بَتٌّ (کاٹنا) کے ہم معنی ہے مگر بَتْكٌ کا لفظ اعضاء یا بال کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، جیسے بتک شَعْرَهٗ وَاُذُنَهٗ اس نے فلاں کے بال یا کان کاٹ ڈالے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَیُبَتِّکُنَّ آذَانَ الْاَنْعَامِ﴾ (۴:۱۱۹) کہ وہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں۔

---

[1] والحدیث اوردهٗ العلماء بالفاظٍ مختلفةٍ رواه ابوعوانة فی صحیحه واصحاب السنن .... عن ابی هریرةؓ بلفظٍ لَایُبْدَأُ فِیْهِ بِحَمْدِ لِلّٰهِ اَقْطَعُ احمد فی مسنده من هذا الوجه "لایفتتح بذکر الله فهو ابتر واقطع" وللخطیب فی الجامع عن الزهری "لا یبدأ فیه ببسم الله الرحمن الرحیم فهو اَقْطَعُ ومارواه المؤلف فلم ارفی المراجع بهذا اللفظ راجع تخریج الکشاف ص ۲ رقم ۳.

[2] انظر لقول علی هذا ادب الدنیا والذین نشروا اویس وفا ۶۱ ولفظه : وبقی خزان العلم اعیانهم مفقودة واشخاصهم فی القلوب موجودة ۱۲.

اسی سے سَیْفٌ بَـاتِكٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی قاطع تلوار کے ہیں۔ اور جب کسی جانور کے بال یا پر پکڑ کر اس طرح کھینچے جائیں کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں تو اس معنی میں بَتَّکْتُ الشَّعْرَ بولتے ہیں اور اس طرح اکھڑے ہوئے بالوں کے قطعہ کو بِتْـــكَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع بِتَكٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1]

(۳۷) طَارَتْ وَفِیْ یَدِهَا مِن رِیشِهَا بِتَكٌ

وہ (قطاۃ) اڑ گئی اور اس کے ہاتھ میں کچھ پر باقی رہ گئے اور بَـــتٌّ کا لفظ رسی یا تعلق کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، محاورہ ہے: طَلَّقْتُ الْمَرْءَ ةَ بَتَّةً وَبتلَةً ۔ میں نے عورت کو قطعی طلاق دیدی۔ بَـتُّ الْحُکْمَ بَیْنَهُمَا ۔ میں نے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیا۔ ایک روایت میں ہے [2]

(۲۱) لَا صِیَامَ لِمَنْ لَّمْ یَبُتَّ الصِّیَامَ مِنَ اللَّیْلِ

جو شخص رات کو روزہ کی قطعی نیت نہ کرے، اس کا روزہ نہیں ہے۔

اور بَشْكٌ بھی اس کے ہم معنی ہے مگر یہ لفظ کپڑے کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے تیز رو اونٹنی کو نَـاقَةٌ بَشْكَی کہا جاتا ہے کیونکہ سرعت رفتار میں اونٹنی کے ہاتھ کو بافندہ عورت کے ہاتھ مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [3]

(۳۸) فِعْلَ السَّرِیْعَةِ بَادَرَتْ جُدَادُهَا
قَبْلَ الْمَسَاءِ تَهِمُّ بِالْاِسْرَاعِ

جیسا کہ بافندہ عورت کپڑا بنتی ہوئی اس کے دامن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ غروبِ آفتاب سے قبل اسے ختم کرنے کے لیے جلدی کرتی ہے۔

ب ت ل

آیت کریمہ: ﴿ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ﴾ (۸:۷۳) کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص نیت اور عبادت میں سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ ﴾ (۹۱:۶) کہہ دو کہ (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دو۔ لہٰذا اس آیت یعنی ﴿ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ﴾ اور حدیث [4] (۲۲) لَا رَهْبَانِیَّةَ وَلَا تَبَتُّلَ فِی الْاِسْلَامِ کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس تبتل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح سے کنارہ کشی انقطاع ہے اور اسی معنی میں مریم علیہا السلام کو اَلْعَذْرَاءُ الْبَتُوْل کہا جاتا ہے کیونکہ مریم علیہ السلام عمر بھر ازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہیں اور ترک نکاح شرعاً ممنوع ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ ﴾ (۳۲:۲۴) کہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو

---

[1] قالہ زہیر وصدرہٗ : حتیٰ اذاما کف الغلام لھا........ والمونث یرجع الی القطاۃ والبیت فی دیوانہ والبحر ۵۔۳/۴۳۳:۳۴۸ و مختار الشعر الجاھلی (۱/۱۷۷) وذیل ابدال الی الطیب ۲:۵۵ والعقد الثمین ۸۷من قصیدۃ فی ۳۳ بیتاً قالھا حین اغارَ بنو اسد علی بابلہ واستاقتھا۔

[2] الحدیث رواہ اصحاب السنن واصلہ فی الصحیحین ۔

[3] قالہ المسبب بن علی والبیت من کلمۃ مفضیلیۃ (۲:۶۰) وایضاً وامالیٔ المرتضیٰ (۱:۵۶۰) وفی المطبوع حدادھا (بالحاء) مصحف والجداد معناہ ھدب الثوب یعنی ان ھذالنساجہ قد قاربت الفراغ من الثواب وبلغت الی ھدبہٖ فھی تبادر للفراغ منہ قبل المساء والقصیدۃ فی ذیل الامالی ۱۳۰۔۱۳۲فی ۲۶بیتاً وذکر ان ابا جعفر المنصور استحسنھا۔

[4] حدیث النھی عن التبتل رواہ الترمذی وابن ماجۃ عن سمرۃ رضی اللہ عنہ تعالیٰ وایضاً راجع الفائق۱/۲۶۹ وابو عبیدۃ فی غریبہ۔

اور حدیث میں ہے ❶ (۲۳) تَنَاکَحُوْا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یَوْمَ الْقیامۃ کہ نکاح کرو تا کہ تمہاری کثرت ہو قیامت کے دن دوسروں کے مقابلہ میں مجھے تمہاری کثرت تعداد سے فخر ہوگا۔

نَخْلَۃٌ مُبْتِلٌ ۔ کھجور جس کے ساتھ کا چھوٹا پودا اس سے الگ ہو گیا ہو۔

ب ث ث

اَلْبَثُّ (ن ض) اصل میں بَثٌّ کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں جیسے بثَّ الرِّیْحُ التُّرَابَ ۔ ہوا نے خاک اڑائی، اور نفس کے سخت ترین غم یا بھید کو بَثُّ النفس کہا جاتا ہے۔ بَثَثْتُہٗ فَانْبَثَّ میں نے اسے منتشر کیا، چنانچہ وہ منتشر ہو گیا اور اسی سے ﴿ فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا ﴾ (۶:۵۶) ہے یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں اور آیت کریمہ:﴿ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ﴾ (۲:۱۶۴) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور ان کو ظہور بخشا اور آیت:﴿ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴾ (۱۰۱:۴) میں المبثوث سے مراد وہ پروانے ہیں جو مخفی اور پرسکون جگہوں میں بیٹھے ہوں اور ان کو پریشان کر دیا گیا ہو۔ اور آیت: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (۱۲:۸۶) میں بَثَّ کے معنی سخت ترین اور یہ پوشیدہ غم کے ہیں جو وہ ظاہر کر رہے ہیں اس صورت میں مصدر بمعنی مفعول ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو یعنی وہ غم جس نے میری فکر کو منتشر کر رکھا ہے، جیسا کہ تو زَعَنِی الْفِکْرُ کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان کر دیا۔

ب ج س

بَجَسَ الْمَاءُ وَانْبَجَسَ: پانی پھوٹ کر بہہ نکلا یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر انْبِجَاسٌ عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہہ نکلا ہو اور اِنْفِجَارٌ کا لفظ عام ہے یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی بہہ نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع جگہ سے بھی۔

یہی وجہ ہے قرآن پاک میں ایک مقام پر ﴿فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ﴾ (۷:۱۶۰) آیا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۲:۶۰) یعنی تنگ مقام (پتھر) سے پانی بہہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مگر جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں) جیسے ﴿ وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ﴾ (۱۸:۳۳) کہ دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کر دی۔﴿ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا ﴾ (۵۴:۱۲) کہ ہم نے زمین پر چشمے جاری کر دیئے۔...... وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ استعمال ہوا بَجَسْنَا نہیں فرمایا۔

ب ح ث

اَلْبَحْثُ: (ف) کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں بَحَثْتُ عَنِ الْاَمْرِ وَبَحَثْتُ كَذَا میں نے فلاں معاملہ کے متعلق کرید کی یا فلاں چیز کو تلاش کیا قرآن پاک میں ہے:﴿ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي

❶ الحدیث بالفاظہ مرفوعاً فی الاحیاء مسند الفردوسی للدیلمی وابن مردویہ فی تفسیرہ موقوفاً علی ابن عمرو اسنادہ ضعیف والبیھقی فی المعرفۃ عن الشافعی انہ بلغہ راجع الاحیاء بتخریج العراقی ۲ / ۲۲ والنیل ۶ / ۱۰۷۔

﴿ الْاَرْضِ ﴾ (۵:۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔ اور جب اونٹنی چلتے وقت زمین پر سخت پاؤں رکھنے پر بَحَثَتِ النَّاقَةُ فِی السَّیر کہا جاتا ہے۔

ب ح ر

اَلْبَحْرُ: (سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بَحَرْتُ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کر دینا کے ہیں اسی سے بَحَرْتُ الْبَعِیْرَ ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیر ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چرے ہوئے اونٹ کو اَلْبَحِیْرَۃَ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ ﴾ (۵:۱۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادتے۔

اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہو جائے اسے بحر کہا جاتا ہے، چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا [1] (۴۴) وَجَدْتُهٗ بَحْرًا کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تَبَحَّرَ فِی کَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کرلی اور اَلتَّبَحُّرُ فِی الْعِلْمِ علم میں وسعت حاصل کرنا۔

اور کبھی سمندر کی ملوحت اور نمکینی کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بُحْرَانِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔ اَبْحَرَ الْمَاءُ، پانی کڑوا ہو گیا۔ شاعر نے کہا ہے [2]

(۳۹) قد عاد ماء الارض بحراً فزادنی۔
الی مرض ان اَبْحَرَ المشربُ العذبُ

زمین کا پانی کڑوا ہو گیا تو شیریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ بَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ﴾ (۲۵:۵۳) دو دریا، ایک کا پانی شیریں پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے، چھاتی جلانے والا میں عَذْبٌ کو بحر کہنا مِلْحٌ کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قَمَرَان کہا جاتا ہے اور بَنَاتُ بَحْرٍ کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾ (۳۰:۴۱) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے، بلکہ بَرّ سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔

لَقِیْتُهٗ صَحْرَۃً بَحْرَۃً میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی۔ [3]

---

[1] من حديث انس بن مالك رواه البخاري في مواضع من صحيحه باب الركوب على الدابة الصعبة راجع الفتح ومسلم باختلاف الالفاظ واللسان (بحر) قاله في فرس لابي طلحة يقال له مندوبٌ.

[2] قاله نصيب والبيت في اللسان والمحكم (بحر) والصحاح وفي روايته فردني بدل فزادني والاشباه النحوية ٣/٤٤ والبحر (٩٥:١) والبلدان (اسم يحار) وفي رواية عذب الماء بدل ماء الارض وعلى ظمائي بدل الى مرض.

[3] اى ليس بيني وبينه حاجزا انظر للكلمته الميداني ١٩٥/٢ والصحاح (البحر) وفي هوامش الصحاح : كل من صحرة وبحرة غير منصرف وفي القاموس وينونان .

ب خ س

اَلْبَخْسُ: (س) کے معنی کوئی چیز ظلم سے کم کرنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴾ (۱۱:۱۵) اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ ﴿ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ ﴾ (۷:۸۵) اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔ اَلْبَخْسُ وَالْبَاخِسُ۔ حقیر اور ناقص چیز۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ ﴾ (۱۲:۲۰) میں بعض نے کہا ہے کہ بَخْسٍ کے معنی حقیر اور ناقص کے ہیں اور بعض نے مَبْخُوس یعنی منقوص کا ترجمہ کیا ہے۔

محاورہ ہے: تَبَاخَسُوْا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی حق تلفی کی۔

ب خ ع

اَلْبَخْعُ: (ف) کے معنی غم سے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا کے ہیں [1] اور آیت کریمہ: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ﴾ (۱۸:۶) شاید تم غم وغصہ سے خود کو ہلاک کر ڈالو...... میں رنج وغم کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ آیت: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ﴾ (۳۵:۸) میں ہے کہ ان پر حسرتوں کے باعث تمہاری جان نہ نکل جائے۔ شاعر نے کہا ہے [2] (طویل)

(۴۰) أَلَا أَيُّهَا الْبَاخِعُ الْوَجْدِ نَفْسَهُ

اے غم کی وجہ سے خود کو ہلاک کرنے والے۔ بخع فلانٌ بالطاعة فلان نے طاعت میں مبالغہ کیا۔ بخع فلانٌ بما عليه من الحق فلاں نے سخت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر دوسرے کے حق کا اقرار کیا گویا یہاں سخت کراہت اور بیزاری کو خود کو ہلاک کرنے والے کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔

ب خ ل

اَلْبُخْلُ: (س) اپنے جمع کردہ ذخائر کو ان جگہوں سے روک لینا، جہاں پر خرچ کرنے سے اسے روکنا نہیں چاہیے۔ اس کے بالمقابل الجود ہے بَخِلَ: اس نے بخل کیا بَاخِلٌ: بخل کرنے والا۔

اَلْبَخِيْلُ: (صیغہ مبالغہ) جو بہت زیادہ بخل سے کام لیتا ہو، جیسا کہ الراحم (مہربان) سے اَلرَّحِيْم مبالغہ کے لیے آتا ہے۔

اَلْبُخْلُ: دو قسم پر ہے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو خرچ کرنے سے روک لے اور دوم یہ کہ دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرے، یہ پہلی قسم سے بدتر ہے، جیسے فرمایا: ﴿ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾ (۴:۳۷) یعنی جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔

ب د ی

بَدَأْتُ بِكذا وَأَبْدَأْتُ وَابْتَدَأْتُ: میں نے

---

[1] اصله في الذبيحة يقال بخع الذبيحة اذا بالغ في الذبح حتىٰ يقطع عظم رقبتها والبخاع العرق في الصلب ثم كثر استعماله للمبالغة في شيئي (الفائق: ٣٧)

[2] قاله ذو الرمة وتمامه .... بشيئي تحته عن يديه المقادر۔ راجع ديوانه ٢٥١ (ط كيمبرج ١٩١٩م) ومجاز القرآن لابی عبيدة (١: ٣٩٣/٢: ٣٨) وغريب القران للقتبي ٢٦٣ والسيوطي ٢٢٧ والبحر (٦: ٩٢) وعزاه الى الفرزوق والصحاح والتاج والاساس و اللسان (بخع) والبيت من شواهد الطبري في تفسيره: ١٥،١٩٤/٩،٥٨) وفي رواية عن يديك وفي البيت ايضاً شاهد على وصف اى في النداء باسم الاشارة موصوف بألْ والبيت ايضاً في الفتح: ٣٠٨/٨).

اسے مقدم کیا۔ اس کے ساتھ ابتدا کی۔

اَلْبَدْءُ وَالْاِبْتِدَاءُ: ایک چیز کو دوسری پر کسی طور مقدم کرنا، قرآن پاک میں ہے:﴿ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴾ (۳۲:۷) اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔﴿ كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ﴾ (۲۹:۲۰) اس نے کیسے مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔﴿ اَللّٰهُ يَبْدَءُ الْخَلْقَ ﴾ (۳۰:۱۱) خدا ہی نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔﴿ كَمَا بَدَءَ كُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴾ (۷:۲۹) اس نے جس طرح تم کو ابتداء میں پیدا کیا تھا، اس طرح تم پھر پیدا ہو جاؤ گے۔

مَبْدَءُ الشَّيْءِ: جس سے کوئی چیز مرکب ہو یا اس سے بنے۔ مثلاً حروف تہجی کو مبدء کلام کہا جاتا ہے اور لکڑی دروازے یا تخت کا مبدء ہے، اسی طرح نَوَاةٌ: (گٹھلی) کھجور کا مبدء کہلاتی ہے۔ بَدْءٌ (پہلا سردار) یعنی سرداروں کا شمار کیا جائے تو اس سے ابتدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِيْدُ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہا کا سبب اصلی ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ رَجَعَ عَوْدَهٗ علی بَدءِهٖ۔ یعنی جس راستہ پر آیا اسی پر واپس لوٹا۔ فعل ذالك عائداً وبَادِئًا اَوْ مُبْدِأً وَمُعِيْدًا ۔ اسے سب سے پہلے کیا اَبْدَأتُ مِنْ اَرْضِ كَذَا ۔ یعنی میں نے فلاں سرزمین سے سفر شروع کیا اور آیت کریمہ:﴿ بَادِیَ الرَّأْيِ ﴾ (۱۱:۲۷) رائے فطری یعنی وہ رائے جو ابتداء سے قائم کر لی جائے۔

ایک قرأت میں بَادِیَ الرَّأْيِ بدوں ہمزہ کے ہے اس صورت میں اس کے معنی ظاہری رائے کے ہوں گے جس میں غور وفکر سے کام نہ لیا گیا ہو۔

شَيْءٌ بَدِيْءٌ: انوکھی چیز جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے جیسا کہ اَلْبَدِيْعُ جو پہلے معمول نہ ہو۔

اَلْبَدْأَةُ: وہ حصہ جس سے تقسیم کی ابتداء کی جائے، اسی سے گوشت کے بڑے ٹکڑے کو بَدْأٌ کہا جاتا ہے۔

ب د ر

بَدَرْتُ الیه وَبَادرتُ: کسی کام کے لیے جلدی کرنا، قرآن پاک میں ہے:﴿ وَلَا تَأْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا ﴾ (۴:۶) جلدی میں نہ اڑا دینا۔ یعنی اسراف اور عجلت سے یتیم کا مال مت کھاؤ اور جو لغزش جلد بازی میں انسان سے سرزد ہو اسے بَادِرَۃ کہا جاتا ہے۔ بَوَادِرُ كَانَتْ مِنْ فُلَانَ بَوَادِرُ كَانتْ مِنْ فُلَانَ بَوَادِرُ فِي هٰذَا الامْرِ فلاں سے اس معاملہ میں جلد بازی سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

اَلْبَدْرُ: (ماہ کامل) بعض نے کہا ہے کہ پورے چاند کو بَدْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور بعض نے بِدْرَةُ (روپے سے بھری ہوئی تھیلی) سے اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ پورا چاند بھی بِدْرَةٌ کی طرح بھرپور ہوتا ہے اس لیے اسے بَدْرٌ کہا جاتا ہے اس توجیہ کی بنا پر یہ مصدر بمعنی فاعل ہوگا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ بَدْرٌ کو اس باب میں اصل قرار دیا جائے۔ اور دوسرے معانی کو بَدْرٌ کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے اس پر متفرع کیا جائے، مثلاً بَدَر كذا کے معنی ہوں گے وہ بدر کی طرح طلوع اور ظاہر ہوا اور معنی اِمْتِلاء کے لحاظ سے دراہم سے بھری تھیلی کو بِدْرَةٌ کہہ دیتے ہیں اس طرح کھلیان کو اَلْبَيْدَرُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی غلہ سے پُر ہو جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ﴾ (۳:۱۲۳) اور خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی

تھی اور اس وقت بھی تم بے سروسامان تھے۔میں بَدْرٌ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ❶

ب د ع

اَلْاِبْدَاعُ: کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا۔اسی سے نئے کھودے ہوئے کنویں کو دَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ کہا جاتا ہے۔جب اِبْدَاعٌ کا لفظ اللہ عزوجل کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان ومکان کے کسی شئے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔اور اَلْبَدِیْعُ بمعنی مُبْدِعٌ بھی آیا ہے، جیسے فرمایا:﴿ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔(۲:۱۱۷)

اور بمعنی مُبْدَع (اسم مفعول) بھی آجاتا ہے، جیسے رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ (نیا کھودا ہوا کنواں)

اسی طرح بِدْعًا کا لفظ بھی اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:﴿ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں ہوں۔(۴۶:۹) میں بِدْعًا بمعنی مُبْدَع بھی ہوسکتا ہے یعنی پیغمبر ایسا کہ مجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہ آیا ہو اور بمعنی مُبْدِع کے بھی یعنی میں کوئی نئی بات نہیں کہتا۔

اَلْبِدْعَۃُ: مذہب میں نئی بات داخل کرنا ہوگا جس کا قائل یا فاعل صاحب شریعت کی اقتدا نہ کرے اور نہ ہی سلف صالحین اور اصول شریعت سے اس کا ثبوت ملتا ہو، ایک روایت میں ہے۔ ❷

کُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ کہ ہر نئی رسم بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔اَلْاِبْدَاعُ بِالرَّجُلِ: سواری کے ماندہ اور دبلا ہونے کی وجہ سے رفقاء سے منقطع ہوجانا۔ ❸

ب د ل

اَلْاِبْدَالُ وَالتَّبْدِیْلُ وَالتَّبَدُّلُ وَالْاِسْتِبْدَالُ کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ ﴾ (۲:۵۹) تو جو ظالم تھے انھوں نے اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا۔ ﴿وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ﴾ (۲۴:۵۵) اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔اور آیت:﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ (۲۵:۷۰) کے معنی بعض نے یہ کیے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹادیں اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور ان کے نیک عملوں کا انھیں ثواب عطا کرے گا۔﴿ فَمَنْ بَدَّلَہٗ بَعْدَ مَا سَمِعَہٗ ﴾ (۲:۱۸۱) تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔﴿ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ﴾

---

❶ راجع لتحقیقه البلدان (ومعجم البا کری) .

❷ کلمة من خطبته صلی اللہ علیه وسلم انظر (حم،م،ن،ھ) عن جابرؓ وابن حبان فی زوائده رقم ۱۰۲۔

❸ والفعل منه فی هذاالمعنی یستعمل الامجهولا ۱۲۔

(۱۶:۱۰۱) جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔﴿ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ﴾ (۳۴:۱۶) ﴿ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ﴾ (۹۵:۷) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور آیت کریمہ:﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ (۴۸:۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کردی جائے گی۔﴿ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ ﴾(۲۶:۴۰) کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔﴿ وَمَنْ يُّبَدِّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۰۸:۲) اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر اختیار کیا ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ (۳۸:۴۷) اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

اور آیت کریمہ:﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ (۲۹:۵۰) ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہوگی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوگی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔

بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔اور فرمانِ باری تعالیٰ:﴿ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ﴾ (۳۴:۶) قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔نیز:﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ فطرت الٰہی میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔(۳۰:۳۰) بھی ہر دو معانی پر محمول ہوسکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے۔

اَلْاَبْدَالُ: وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرمادیتے ہیں۔[1] درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنھوں نے صفات ذمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کرلیا ہو۔اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف آیت:﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ ﴾(۷۰:۲۵) میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْبَادِلَةُ: گردن اور ہنسلی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بَآدِلُ ہے[2] ع (طویل)

(۴۱) وَلَا رَهْلٌ لَبَّاتُهٗ وَبَآدِلُهٗ

اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلا نہیں تھا۔

ب د ن

اَلْبَدَنُ: یہ جَسَدٌ کے ہم معنی ہے لیکن بدن باعتبار عظمت جثہ کے بولا جاتا ہے اور جَسَدًا باعتبار رنگ کے، اسی سے رنگین کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے اور جسیم عورت کو اِمْرَءَۃٌ بَادِنٌ وَبَدِيْنٌ کہتے ہیں اسی سے قربانی کے جانوروں کو اس کے فربہ ہونے کی وجہ سے بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے اور بَدَنَ وَبَدَّنَ کے معنی موٹا ہونے

---

[1] قال علیؓ الابدال بالشام والنجباء بمصر والعصائب بالعراق (الفائق ۱/ ۴۰) والحدیث الابدال راجع مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۲۔۶۳ من علی موقوفا وعن عبادة بن الصامت وانس وابن مسعودؓ مرفوعاً ولا یخلو ای حدیث عن مقال.

[2] وصدره : فتی قدَّ قدَّ السیف متضائل .... وفی اللسان وابدال ابی الطیب متأزف بدل متضائل وفی الاصول ولا رهن بدل رهل وقد وقع فی نسبة هذا البیت تخلیط وارتباك ففی المرزوقی (۱۰۴۶۔۱۰۴۹) والحماسة مع التبریزی ۳ : ۴۶۔لزینب بنت الطثریه فی رثاء اخیه وکان اخوه شاعرًا مفلقاً کذافی الحماسة للبحتری ۲۷۵ والبیان (۱ : ۲۱۶) والاغانی (۷ : ۱۴۶) وامالی القالی (۲ : ۸۵۔۸۶) لکن فی الحماسة نفسه (۲ : ۱۹۳) ذکر هذا البیت مع ابیات بغیر السلولی (عجز بن عبدالله) وفی الصناعتین ۳۵۲ بغیر عزوفی روایته صدره طویل نجادالسیف لامتضامل وفی السمط ۶۰۸ انّه لثور بن الطثریه فی رثاء اخیه یزید وقیل لام یزید ترثی ابنها راجع السمط وفی محاضرات المؤلف (۳ : ۲۶۶) وبعضهم نسبه الی الامیر والریاحی (الاغانی : ۱۲/ ۱۱۶۔۱۱۷)

کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بَدَّنَ کے معنی عمر رسیدہ ہوجانا کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے [1] (رجز)

(۴۲) وَكُنْتُ خِلْتُ الشَّيْبَ وَالتَّبْدِيْنَا میں بڑھاپے اور عمر رسیدہ ہونے کو خیال کرتا تھا، اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۲۶) لَا تُبَادِرُوْنِیْ بِالرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَاِنِّیْ قَدْ بَدَّنْتُ ۔ کہ میں بوڑھا اور سن رسیدہ ہوگیا ہوں اس لیے رکوع و سجود میں مجھ سے سبقت نہ کیا کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ ﴾ (۱۰:۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے) نکال لیں گے۔ میں بَدَنٌ بمعنی جَسَدٌ ہے اور بعض نے اس سے زرہ مراد لی ہے کیونکہ زرہ کو بھی جسم پر ہونے کی وجہ بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قمیص کے بازو کو یَدٌ اور اس کی اگلی اور پچھلی طرف کو ظہر او بطن کہہ دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ﴾ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر خدا مقرر کیا ہے۔ (۲۲:۳۶) میں بُدْنَ بَدَنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہدی یعنی قربانی کے ہیں جو حرم میں لے جا کر ذبح کی جائے۔

ب د و

بَدَا (ن) الشَّيْءُ بُدُوًّا وَبَدَاءٌ کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَدَالَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَالَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ (۳۹:۴۷) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہوجائے گا، جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔

﴿ وَبَدَالَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ (۳۹:۴۷) اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہوجائیں گی۔ ﴿ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ (۲۰:۱۲۱) تو ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں۔

اَلْبَدْوِیَه: حَضَرٌ کی ضد ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَجَآءَ كُمْ مِّنَ الْبَدْوِ ﴾ (۱۲:۱۰۰) آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ میں بَدْوٌ بمعنی بَادِيَة (صحراء) ہے اور ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بَدْوٌ (بَادِيَةٌ) کہا جاتا ہے اور اَلْبَادِیْ کے معنی صحراء نشین کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ (۲:۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔ ﴿ لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ ﴾ (۳۳:۲۰) کہ کاش گنواروں میں جارہیں۔ [3]

ب ذ ر

اَلتَّبْذِیْرُ: (تفعیل) کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیر

---

[1] قاله حميد الارقط وتمامه: وانهم ممايذهل القرينا۔ وفي اللسان (بدن ء كون) واضداد ابي الطيب ۲۲۸ بغير عزو والبيت في الاقتضاب ۳۷٤ واصطلاح المنطق ۳۳۰ وغريب ابی عبيد ۱/۵۲ وفيه لكيميت.

[2] الحديث باختلاف الفاظه رواه احمد وابوداؤد وابن ماجة عن معاوية (ه) عن ابی موسى وللبيهقی عن معاوية وابن سعد والبغوی عن ابی سعدة صاحب الجيوش انظر كنز العمال: ج ۷ رقم ۲۷۸، ۲۷۸۳، ۲۸۱۳، ۳۸۱۹ وغريب ابی عبيد ۱: ۵۲.

[3] الابداء (افعال ظاهر كرنا (۲٤۔۳۱) (۲۔۳۳) (۲۔۷۱).

دینے کے ہیں، اصل میں "تَبْذِیْر" کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر میں بظاہر ضائع کرنا ہوتا ہے، اس لیے تَبْذِیْر کا لفظ بطور استعارہ مال ضائع کردینے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنِ﴾ (۱۷:۲۷) فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔ ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا﴾ (۱۷:۲۶) اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔

ب ر ر

اَلْبَرُّ: یہ بَحْرٌ کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی کی وسعت کے اعتبار سے اس سے اَلْبِرُّ کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، جیسے ﴿اِنَّہٗ ھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ﴾ (۵۲:۲۸) بے شک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔ اور کبھی بندہ کی طرف جیسے: بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّہٗ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے اَلْبِرُّ: (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ: ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ﴾ (۲:۱۷۷) دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب آنحضرت ﷺ سے بِرّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آن جناب ﷺ نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل پائی جاتی ہے۔ [1]

بِرُّ الْوَالِدَیْنِ کے معنی ہیں ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عَقُوْقٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ﴾ (۶۰:۸) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی ..... کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔

اور بِرٌّ کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: بَرَّ فِیْ یَمِیْنِہٖ۔ اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور شاعر کے قول [2]

(۴۳) اَکُوْنُ مَکَانَ الْبِرِّ مِنْہُ

میں بعض نے کہا ہے کہ بِرّ بمعنی فؤاد یعنی دل ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بِرٌّ بمعنی نیکی ہے، یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔

بَرَّ اَبَاہُ فَھُوَ بَارٌّ وَبَرٌّ صیغہ صفت جو کہ صَائِفٌ

[1] کذا فی الطبری ۲/۹۴ وفی ابن کثیر ۱:۲۰۷ عن ابی ذر انہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالایمان ؟ فتلا علیہ لکنہ منقطع لان مجاھداً لم یحدابا ذر و راجع ایضاً البصائر والتاج (بر).

[2] لخداش بن زھیر کما فی التاج (بر) وفی اللسان غیر منسوب لکن البیت فی روایۃ التاج : یکون مکان البرمنی ودونہ ۔ اجعل الی دونہ واوامرہ.

وَصِیْفٌ وَطَائِفٌ وَطَیْفٌ کی مثل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَیْهِ ﴾ (۱۴:۹) اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ﴾ (۱۹:۳۲) اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا)۔

بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ فَهُوَ بَارٌّ وَاَبْرَرْتُهٗ قسم پوری کرنا۔ بَرَّتْ یَمِیْنِیْ میری قسم پوری ہوگئی۔ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ حج جس میں رفث وفسق اور جدال نہ ہو۔

اَلْبَارُّ کی جمع اَبْرَارٌ وبَرَرَةٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴾ (۸۲:۱۳) بیشک نیکوکار نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے۔ ﴿ کَلَّا اِنَّ کِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ﴾ (۸۳:۱۸) اور یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین میں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ کِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾ (۸۰:۱۶) جو سردار اور نیکوکار ہیں۔

میں خاص کر فرشتوں کو بَرَرَةٌ کہا ہے کیونکہ اَبْرَارٌ (جمع) سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس لیے کہ بَرَرَة، بَرٌّ کی جمع ہے اور اَبْرَارٌ بَارٌّ کی تو جیسے عَادِلٌ کی بنسبت عَدْلٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

اَلْبَرِیْرُ: خاص کر پیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں، عام محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا یَعْرِفُ الْبِرَّ مِنَ الْهِرِّ. (وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کرسکتا) بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں [1] مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بدخواہ میں امتیاز نہیں کرسکتا۔

اَلْبَرْبَرَةُ: بڑبڑ کرنا، یہ بھی حکایت صورت کے قبیل سے ہے۔

ب ر ء

اَلْبُرْءُ وَالْبَرَاءُ وَالتَّبَرِّیْ کے اصل معنی کسی مکروہ امر سے نجات حاصل کرنا کے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے۔ بَرَءْتُ مِنَ الْمَرَضِ میں تندرست ہوا۔ بَرِءْتُ مِنْ فُلَانٍ وَتَبَرَّءْتُ میں فلاں سے بیزار ہوں۔ اَبْرَرْتُهٗ مِنْ کَذَا وَبَرَّءْتُهٗ میں نے اس کو تہمت یا مرض سے بری کردیا۔ رَجُلٌ بَرِیْءٌ پاک اور بے گناہ آدمی۔ بُرَآءُ بَرِیْئُوْنَ: قرآن پاک میں ہے:﴿ بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۹:۱) اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (۹:۳) کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار) ہے۔ ﴿ اَنْتُمْ بَرِیْئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۰:۴۱) تم میرے عملوں کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں کا جواب دہ نہیں ہوں۔ ﴿ اِنَّا بُرَآءُ مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۶۰:۴) کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں۔ ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴾ (۴۳:۲۶) اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ ﴿ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ﴾ (۳۳:۶۹) تو خدا نے

---

[1] کما ورد فی التاج وعن ابن الاعرابی البرسوق الغنم والهردعاؤها قاله القتبی راجع ایضاً کتاب الحیوان (۶: ۴۷۸) والمثل فی اللسان (بر) وادب الکاتب ۳۸ وکتب الامثال.

ان کو بے عیب ثابت کیا۔

﴿ اِذْ تَبَرَّءَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ﴾ (۱۶۶:۲) اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیرووں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اَلْبَارِیُٔ: (پیدا کرنے والا) یہ اسماءِ حسنٰی سے ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَلْبَارِیُٔ الْمُصَوِّرُ ﴾ (۲۴:۵۹) ایجاد واختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

﴿ فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ ﴾ (۵۴:۲) تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

اَلْبَرِیَّۃُ کے معنی مخلوق کے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے، لیکن ہمزہ کو ترک (یا ادغام) کردیا گیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ بَرَیْتَ الْقَوْسَ سے مشتق ہے اور مخلوق کو بَرِیَّۃٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اَلْبَرٰی یعنی مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (۱۱:۳۵) سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ اُولٰٓئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ﴾ (۷:۹۸) یہ لوگ سب مخلوق سے بہتر ہیں۔

ب ر ج

اَلْبُرُوْجُ یہ بُرْجٌ کی جمع ہے، جس کے معنی قصر کے ہیں اسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص منازل کو بروج کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴾ (۱:۸۵) آسمان کی قسم جس میں برج ہیں۔ ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا ﴾ (۶۱:۲۵) جس نے آسمان میں برج بنائے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ﴾ (۷۸:۴) خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ میں بروج سے مضبوط قلعے اور محلات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ستاروں کی برجیں مراد ہوں اس صورت میں بروج کے ساتھ فقط مُشَیَّدَۃ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۴۴) وَمَنْ هَابَ اَسْبَابَ الْمَنَایَا یَنَلْنَهٗ
وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمٖ

جو شخص اسباب موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں گے۔ اگرچہ سیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ چلا جائے۔

اگر زمین کی برجیں مراد ہوں تو یہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہوگا جسے دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔ [2] (بسیط)

(۴۵) وَلَوْ کُنْتُ فِیْ غِمْدَانَ یَحْرُسُ بَابَهٗ
اَرَاجِیْلُ اُحْبُوْشٍ وَاَسْوَدُ اٰلِفُ

(۴۶) اِذًا لَاَتَتْنِیْ حَیْثُ کُنْتُ مَنِیَّتِیْ
یَحُثُّ بِهَا هَادٍ لِاَثْرِیَ قَائِفُ

اور اگر غمدان کے قلعہ میں چلا جاؤں جس کے دروازہ پر

[1] انظر دیوانہ ۳۰ وشرح العقائد العشر ۱۲۰ وابن الانباری ۲۸۳ وفی روایتہ اختلاف واللسان (سبب) والمشکل للقتبی ۷۲۔ ۳۵۷ والبحر(۵:۲۶/۱:۴۵۶/۳:۲۹۹) والطبری (۸:۷۵) والعمدۃ ۱:۳۳۳ والحعدۃ ۱۱۰.

[2] من قول ثعلبۃ بن عمرو العبدی وهما من کلمۃ مفضلیہ (رقم: ۷۴) فی ۱۶ بیتاً وراجع الحماسۃ للبحتری: ۹۷ والنقائض ۵۶۴ وفی الاغانی (۱۱۔۴۱۔۱۷۔۱۲۹) هما بشیئ من الاختلاف فی الروایۃ منسوبتان لابی الطحان القینی ولعلہ تمثل بھا وباختلاف طفیف فی دیوان اوس بن حجر (۱:۷۴) راجع شرح شواهد علی النفس معجم البکری (یمان).

حبشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے، جیسے ایک قائف ہدی خواں میرے نقش قدم پر چلا جارہا ہوگا۔ ثَوْبٌ مُبَرَّجٌ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں پھر اس میں معنی حسن کا اعتبار کرکے تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَ ۃُ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی عورت نے مزین کپڑے کی طرح آرائش کا اظہار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَ ۃ کے معنی ہیں عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی جیسا کہ ان دونوں آیتوں: ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى ﴾ (۳۳:۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے زمانہ میں اظہار تجمل کرکے اپنے محلات سے نکلا کرتی تھیں، اسی طرح اب مت نکلو زینت نہ دکھاؤ۔ ﴿ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ ﴾ (۲۴:۶۰) بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور پھر حسن وسعت میں تشبیہ دے کر وسعت چشم اور حسن نظر کے لیے اَلْبُرْج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ب ر ح

اَلْبَرَاحُ: اس وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں عمارت درخت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ لہٰذا کبھی اس میں معنی ظہور کا اعتبار لیتے ہیں، جیسے فَعَلَ كَذَا بَرَاحًا یعنی اس نے کھلے بندوں یہ کام کیا۔ بَرِحَ الْخَفَاءُ راز فاش ہوگیا، گویا وہ کھلے میدان میں ہے، اسی سے بُرَاحُ الدَّارِ ہے، جس کے معنی گھر کے کھلے صحن کے ہیں۔

بَرِحَ: کھلے میدان میں چلا جانا۔ اسی سے اَلْبَارِحُ ہے، جس کے معنی سخت ہوا کے ہیں۔

اَلْبَارِحُ مِنَ الظِّبَاءِ وَالطَّيْرِ: خاص کر اس ہرن یا پرند کو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے سے ایسے رخ پر گزرے کہ اس کا نشانہ ممکن نہ ہو، ایسے شکار کو منحوس سمجھا جاتا ہے، اس کی جمع بَوَارِحُ آتی ہے اس کے بالمقابل سَانِحٌ اس شکار کو کہتے ہیں جو ایسے رخ سے آئے کہ اس کا شکار کرنا آسان ہو ایسے شکار کو میمون (مبارک) خیال کیا جاتا ہے۔

اَلْبَارِحَةُ: شب گزشتہ بَرِحَ کھلی جگہ جم کر ٹھہرے رہنا اسی سے فرمانِ الٰہی لَا اَبْرَحُ ہے، یہ لَا اَزَالُ کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ بَرِحَ اور زَالَ میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور "لَا" بھی نفی کے لیے ہوتا ہے اور نفی پر نفی آنے سے اثبات حاصل ہو جاتا ہے، اسی بنا پر فرمایا: ﴿ لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ ﴾ کہ ہم تو اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے (۲۰:۹۱) ﴿ لَا اَبْرَحُ حَتّٰى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ ﴾ (۱۸:۶۰) کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگھم پر نہ پہنچ جاؤں ہٹنے کا نہیں۔ اور اَلْبَارِحُ سے معنی نحوست کا اعتبار کرکے تَبْرِيْحٌ اور تَبَارِيْحٌ کا لفظ تکلیف اور شدائد کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، جیسے بَرَّحَ بِيَ الْاَمْرُ: مجھے فلاں معاملہ سے تکلیف پہنچی، بَرَّحَ بِيْ فُلَانٌ فِي التَّقَاضِيْ۔ فلاں نے سخت تقاضا کیا۔

ضَرَبَهٗ ضَرْبًا مُبَرِّحًا اسے سخت مارا۔ جَاءَ فُلَانٌ بِالْبَرْحِ۔ فلاں نے حیرت انگیز کام کیا۔ اَبْرَحْتُ رَبًّا میں اپنے رب کی تعظیم بجالایا۔ اَبْرَحْتُ جَارًا میں نے ہمسائے کی عزت کی۔ بَرْحٰى (ارے) نشانہ خطا ہونے

پر یہ کلمہ ملامت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل لفظ "مَــرْحَــی" ہے جو نشانہ لگنے پر تحسین کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی: واہ، کیا خوب محاورہ ہے [1] لَقِيْتُ مِنْهُ الْبَرْحِيْنَ وَالْبُرَحَاءَ مجھے اس سے تکالیف پہنچیں بُرَحَاءُ الْحُمّٰی . بخار کی شدت۔

ب ر د

اَلْبَـرْدُ: (ٹھنڈا) اصل میں یہ حَــرٌّ کی ضد ہے۔ محاورہ میں کبھی اس کی ذات کا اعتبار کرکے کہا جاتا ہے۔ بَــرَدَ (ن ك) كذا: اس نے ٹھنڈ حاصل کی۔ بَــرَدَ (ن) اَلْمَاءُ كَذَا: پانی نے اسے ٹھنڈا کردیا۔ جیسے [2] (الطّویل)

(۴۷) سَتَبْرُدُ اَكْبَادًا وَتُبْكِيْ بَوَاكِيَا .

تو بہت سے کلیجوں کو ٹھنڈا کیا اور بہت سی رونے والیوں کو رلا ڈالے گی۔

اور بَرَّدَ (تفعیل) بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے، بعض کے نزدیک اَبْـرَدَ (افعال) بھی اس معنی میں آجاتا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

اسی سے اَلْبَـرَّادَةُ ہے جس کے معنی پانی ٹھنڈا کرنے والی چیز کے ہیں اور محاورہ میں بَـرَدَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے

اَلْبَـــرْد اولے کی طرح جامد اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں جس طرح حَــرٌّ کو حرکت لازم ہے، اسی طرح بَرْدٌ کے ساتھ کسی چیز کا ثبات مختص ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بَرَدَ عَلَيْهِ دَيْنٌ . اس پر قرض ٹھہر گیا۔

شاعر نے کہا ہے [3] (رجز)

(۴۸) اَلْيَوْمَ بَارِدٌ سُمُوْمُهٗ .

آج باد سموم جامد ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے [4] (خفیف)

(۴۹)......قَدبَرَدَ الموتُ علی مصطلاه

کہ اس کے ہاتھ اور چہرہ پر موت طاری ہوگئی۔ لَــمْ يَبْرُدْ بِيَــدِيْ شَيْءٌ میرے ہاتھ میں کوئی چیز قرار نہیں پکڑتی۔ بَرَدَ الْاِنْسَانُ مرجانا، فوت ہوجانا۔ بَرَّدَهٗ اسے قتل کرڈالا اسی سے سیوف کو بَوَارِدُ کہا جاتا ہے کیونکہ میت بھی فقدان روح سے سرد پڑجاتی ہے اور اسے سکون لاحق ہوتا ہے۔ یا ظاہری طور پر جلد میں خنکی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ (۳۹:۴۲) خدا لوگوں

---

[1] قال المرصفی : البرحین مثلث الباء مع فتح الراء وكسر الحاء استعملوه كاوضيق وقد اماتموا واحده لما ارادوا وصف الدواهی بالكثرة ذيل الكامل ٦٩٥ وانظر للكلمته ايضاً تهذيب الالفاظ ٤٣ ومحالس ثعلب : ٥٢٠-٥٢١ وفی الفائق : هو فی الاصل جمع برح جمع السلامة للمبالغة مثل بلغ وبلغين يحوز فی اعرابه ان يحرى علی النون وان يحری علی ماقبلها (٦٥١١) .

[2] قاله مالك بن ريب المازنی فی رثاء نفسه وكان فی حند سعيد بن عثمان بطريق فارس وصدره : وعطل قلوصی فی الركاب فانها......... والبيت فی البحر ٦ : ٣١٩ من قصيدة جمهرية فی ٥٢ بيتاً ٢٦٩- ٢٧٢ وذيل الامالی : ١٣٧-١٣٨ وفيه وغيّر بدل وعطل وتمامها فی نواد اليزيدی والاختيارين رقم : ١٠٠ وفی المعجم للمرزبانی ٢٩١ مثله لجعفر بن علبة الحارثی يرثی نفسه لما هموا بقتله باختلاف ظفيف وقود قلوصی بينهن فانها بمتحضك مسروراً وتبكی بوكيا۔ وايام العرب ٥٨ وفيه وقوّد بدل عطل .

[3] قاله الراجز وتمامه : من عجزااليوم فلاالومه والشطر فی الجمهرة ١ : ٢٤٠ والتبريزی ١ : ١٩٥ وفی اللسان (برد) من حزع بدل من عجز كمافی السمط ٢٥٤ والفائق (١ : ٤٧).

[4] قاله ابوزبيد الطائی فی رثاء الحلاج يصف الموت وتكملته البيت بارزٌ ناجزاه قد بردالموت علی مصطلاه ای بردوالبيت من قصيدة جمهرية ٢٦٩-٢٧٢ فی ٥٨ بيتا والبيت فی اللسان (برد) والمعانی ٨٥٩- ٢٠٥ والاختيارين ١٢٦ وجمهرة الاشعار ٢٧٢ وامالی ليزيدی.

کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کرلیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کرلیتا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴾ (۷۸:۲۴) میں بھی بَـرْد: بمعنی نیند ہے یعنی وہاں کسی قسم کی راحت اور زندگی کی خوشگواری نصیب نہیں ہوگی اور اس اعتبار سے کہ گرمی میں سردی سے راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے، خوشگوار زندگی کے لیے عَيْشٌ بَارِدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْاَبْرَدَان: صبح وشام۔ کیونکہ یہ دونوں وقت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرَدُ کے معنی ''اولے'' کے ہیں اور بَـرِدَ السَّحَابُ کے معنی ہیں بادل نے ژالہ باری کی۔ سَحَابٌ اَبْرَدُ وَبَرِدٌ اور اولے برسانے والے بادل۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ ﴾ (۲۴:۴۳) اور آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اَلْبَرْدِيُّ نرکل کی قسم کا ایک پودا۔ یہ بَرْد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ بھی پانی میں پیدا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ ❶ اَصْلُ كُلِّ دَاءٍ: اَلْبَرْدَةُ کہ بدہضمی ام الامراض ہے، بدہضمی کو بَـرْدَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس برودت طبعی کی وجہ سے عارض ہوتی ہے اس سے قوت ہضم ناقابل ہوجاتی ہے۔

اَلْبَـرُوْدُ: ٹھنڈ پہنچانے والی چیز کو کہتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ فَعُوْلٌ کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ جیسے: مَاءٌ بَرُوْدٌ (ٹھنڈا پانی) ثَغْرٌ بَرُوْدٌ (خنک دانت) جیسا کہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والے سرمہ کو بَـرُوْدٌ کہا جاتا ہے ❷ بَـرَدْتُ الْحَدِيْدَ میں نے لوہے کی ریتی سے رگڑا۔ یہ بَرَدْتُهُ بمعنی قَتَلْتُهُ سے مشتق ہے اور لوہ وچون کو بُرَادَةٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْمِبْرَدُ: (آلہ) ریتی جس سے لوہے کو ریتتے ہیں۔ اَلْبُرْد یہ اَلْبَـرِيْد کی جمع ہے اور محکمہ مواصلات کی اصطلاح میں بُرُدٌ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی جگہ پر پیغام رسانی کے لیے متعین رہتے ہیں۔ وہ ہرکارے چونکہ سرعت سے پیغام رسانی کا کام کرتے تھے، اس لیے ہر تیز رو کے لیے هُوَ يَبْرِدُ کا محاورہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور پرند کے پروں کو بَـرِيْدَان کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی اسے برید کا کام دیتے ہیں تو یہ بناء الفرع عَلَى الفرع کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ''علم الاشتقاق'' میں بیان کیا جاتا ہے۔

ب ر ز

اَلْبَرَازُ: کے معنی فضاء یعنی کھلی جگہ کے ہیں۔ اور بَرَزَ (ن) کے معنی ہیں کھلی جگہ میں چلے جانا اور بُرُوْزٌ (ظہور) کئی طرح پر ہوتا ہے۔ (۱) از خود کسی چیز کا ظاہر ہوجانا، جیسے فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ﴾ (۱۸:۴۷) اور تم زمین کو صاف میدان دیکھو گے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ زمین پر سے عمارات اور ان کے ساکنین سب ختم ہوجائیں گے، اسی سے مُبَارَزَةٌ ہے، جس کے معنی صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں

❶ رواه الدارقطني في العلل: عن إنس وابن السني وابو نعيم في الطب عن علي وعن ابي سعيد وعن الزهري مرسلاً قال في النهاية ١: ٨٦ واللسان (برد) البردة هي التخمة وثقل الطعام على العمدة وايضاً فارن غريب ابي عبيدة.

❷ وفي اللسان (برد) كان رسول الله صلى الله عليه وسلم بالبرود.

ہے:﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ (۳:۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (۲:۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے بالمقابل میں آئے۔

(۲) دوم بُرُوْزٌ کے معنی فضیلت ظاہر ہونے کے ہیں، جو کسی محمود کام میں سبقت لے جانے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳) کسی مستور چیز کا منکشف ہو کر سامنے آ جانا، جیسے فرمایا:﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۱۴:۴۸) اور سب لوگ خدائے یگانہ زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (۱۴:۲۱) اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے۔﴿يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ﴾ (۴۰:۱۶) جس روز وہ نکل پڑیں گے۔

اور آیت کریمہ:﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ﴾ (۲۶:۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انھیں دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔محاورہ ہے:تَبَرَّزَ فُلَانٌ کنایۃً از قضائے حاجت اور پاکدامن عورت کو اِمْرَءَةٌ بَرْزَةٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کی رفعت پاک دامنی اور عفت میں مضمر ہوتی ہے نہ یہ کہ بَرْزَةٌ کا لفظ اس معنی کا مقتضی ہے۔

ب ر ز خ

اَلْبَرْزَخُ: کے معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل اور روک کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ دراصل یہ بُرْزَة (پردہ) سے معرب ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ (۵۵:۲۰) دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ [1]

اور بَرْزَخٌ اس رکاوٹ کو بھی کہا گیا ہے جو آخرت میں انسان اور اس کے منازل رفیعہ تک پہنچنے کے درمیان حائل ہوگی جسے قرآن پاک نے آیت:﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۹۰:۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔میں عَقَبَةٌ کہا ہے، چنانچہ فرمایا:﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (۲۳:۱۰۰) اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہیں گے) لہٰذا عَقَبَة سے مراد وہ موانع ہیں جو بلند درجات تک پہنچنے سے روک لیتے ہیں جن تک کہ نیک لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہاں برزخ سے موت اور حشر کے مابین کی مدت مراد ہے۔

ب ر ص

اَلْبَرَصُ: پھلبہری۔مشہور مرض کا نام ہے [2] اور چاند کو اس سیاہ دھبہ کی وجہ سے جو اس میں نظر آتا ہے، اَبْرَصُ کہا گیا ہے۔اور سَامُّ اَبْرَصُ کے معنی چھپکلی کے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر بھی بَرَص جیسے دھبے ہوتے ہیں۔

اَلْبَرِيْصُ: وہ ہے جو ابرص کی طرح چمکدار ہو، یہی معنی تقریباً بصیص کے ہیں جو بَصَّ يَبِصُّ بمعنی برق سے

---

[1] وایضاً : وجعل بينهما برزخاً وحجراً محجوراً: ۲۵/ ۵۳.

[2] وفي القران ﴿وابرء الاكمه والابرص﴾ (۳-۴۸) ﴿وتبرئ الاكمه والابرص﴾ ۵-۱۱۰.

مشتق ہے۔

ب ر ق

اَلْبَـرْق: کے معنی بادل کی چمک کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿ فِیْہِ ظُـلُـمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ﴾ (۱۹:۲) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہواور بجلی کوندرہی ہو۔

اس سے فعل بَرَقَ وَاَبْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرَقَ ہر چمک دار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے، جیسے: سَیْفٌ بَارِقٌ: چمکدار تلوار۔

بَـرِقَ وَبَـرَقَ کے معنی خوف کی وجہ سے آنکھ خیرہ ہوجانا ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿ فَـاِذَا بَـرِقَ الْبَصَـرُ ﴾ (۷:۷۵) جب آنکھیں چندھیا جائیں۔ایک قرأت میں بَرَقَ ہے۔

پھر کبھی بَـــرَقَ سے اختلاف رنگ کے معنی لے کر مختلف الوان کی پتھریلی زمین کو بَـرْقَۃٌ کہا جاتا ہے۔اَلْاَبْـرَقُ کے معنی سیاہ سفید پہاڑ کے ہیں اسی لیے آنکھ کو بَـرْقَاءُ کہا جاتا ہے۔

نَـــاقَۃٌ بَـــرُوْقٌ ۔اونٹنی جودم اٹھا کر حمل کو ظاہر کرے۔

اَلْبَرُوْقَۃُ: ایک قسم کی گھاس جو ابر کو دیکھ کر ہی سرسبز ہوجاتی ہے،اسی سے مثل مشہور ہے۔اَشْکَـرُ مِنْ بَـرُوْقَۃٍ وہ بروق سے بھی یادہ شکر گزار ہے۔بَرَقَ طَعَامَہٗ بِزَیْتٍ ۔ روٹی کو زیتون سے چپڑنا۔اَلْبَارِقَۃُ وَالْاَبِیْرَقُ ۔چمکدار تلوار۔اَلْبُرَاقُ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس دابۃ کا نام ہے۔ جس پر آنحضرت ﷺ شب معراج کو سوار ہوئے تھے، اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔اَلْاِبْرِیْقُ: لوٹا یا صراحی (ج)اَبَارِیْق [1] اور بَرَقَ سے کبھی خوف کے معنی لے کر بَرَقَ فُلَانٌ وَاَبْرَقَ وارعد کے معنی دھمکی دینا بھی آجاتے ہیں۔

ب ر ک

اَلْبَـرك: اصل میں البَـرك کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں (جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے) گو یہ دوسروں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے سینہ کو بِـــرْکَۃ کہا جاتا ہے۔

بَـرَكَ البَعِیْرُ کے معنی ہیں: اونٹ اپنے گھٹنے رکھ کر بیٹھ گیا پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کر کے اِبْتَــرَکُوْا فِـی الْحَرْبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے،جس کے معنی میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور جم کر لڑنے کے ہیں۔

بُـرَاکَـاءُ الْحَرْبِ وَبَرُوْکَاءُ ھَا: سخت کارزار جہاں بہادر ہی ثابت قدم رہ سکتے ہوں۔

اِبْتَـــرَکَـت الدَّابَۃُ: چوپائے کا جم کر کھڑا ہوجانا بِـرْکَۃٌ: حوض، پانی جمع کرنے کی جگہ۔

اَلْبَرَکَۃُ کے معنی کسی شے میں خیر الٰہی ثابت ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ لَفَتَحْنَا عَلَیْہِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۷:۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے۔

یہاں برکات سے مراد بارش کا پانی ہے اور چونکہ بارش کے پانی میں اس طرح خیر ثابت ہوتی ہے جس طرح کہ حوض میں پانی ٹھہر جاتا ہے اس لیے بارش کو بَرَکَاتٌ سے تعبیر کیا ہے۔

[1] وفی الواقعة ٥٦۔١٨ باکواب واباریق ویتصل بذالك لفظ استبرق (الحریر) راجع الآیات (١٨۔٣١) (٤٤۔٥٣) (٥٥۔٥٤).

اَلْمُبَارَكُ: ہر وہ چیز جس میں خیر و برکت پائی جائے اور آیت کریمہ:﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنَاهُ ﴾ (۲۱:۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ میں ذکر کو مبارک کہہ کر ان خیرات الٰہیہ پر تنبیہ کی ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ نیز فرمایا:﴿ كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ ﴾ (۳۸:۲۹) (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے مبارک ہے۔ اور آیت کریمہ:﴿ وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا ﴾ (۱۹:۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے خیر و برکت کا محل بنایا ہے۔

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ﴾ (۴۴:۳) کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

﴿ رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبَارَكًا ﴾ (۲۳:۲۹) یعنی اے پروردگار! ہمیں اس جگہ پر اتاریو جہاں خیر و برکت پائی جاتی ہو۔ اور آیت:﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبَارَكًا ﴾ (۵۰:۹) اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا۔ میں بارش کے پانی کو بابرکت قرار دیا ہے چنانچہ اس کی برکت کو دوسرے مقام پر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ (۳۹:۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا، پھر اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔ ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنَّاهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲۳:۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔

اور خیر الٰہی چونکہ غیر محسوس طریقہ پر صادر ہوتی ہے اور بیشمار طریقوں پر پائی جاتی ہے، اس لیے ہر اس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی محسوس ہو اسے مبارک (بابرکت) کہہ دیتے ہیں۔ اور حدیث میں جو مروی ہے۔ [1]

(۲۷) لَا يَنْقُصُ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ تو اس سے بھی اسی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ورنہ نقصان حسی کی نفی نہیں ہے، جیسا کہ بعض بدنصیب لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ نقصان نہیں ہوتا تو ترازو سے تول کر دیکھ لو اور آیت کریمہ:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا ﴾ (۲۵:۶۱) اور (خدا) برکت والا ہے، جس نے آسمانوں میں برج بنائے، میں ان نعمتوں پر تنبیہ کی ہے جو ان برجوں اور نیّـــرات کے ذریعہ ہم پر نازل ہوتی ہیں اور آیات کریمہ:﴿ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ﴾ (۲۳:۱۴) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے، بڑا بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ ﴾ (۲۵:۱) وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ ﴾ (۲۵:۱۰) وہ (خدا) بہت بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تمہارے لیے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے۔

﴿ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (۴۰:۶۴) پس خدائے پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ

[1] راجع كنز العمال ٦: رقم ١٨٨) وفي رواية ـ انقصت الحديث في رحم ،م، ت وروضة العقلاء (للبستي ٤٥ عن ابي هريرة وراجع لمعناه مشكل الحديث لابن قتيبة: ١٢.

﴿ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْكُ ﴾ (۶۷:۱) وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ وہ تمام خیرات جن کو لفظ تبارک کے تحت ذکر کیا ہے، ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہیں۔

ب ر م

اَلْاِبْــرَامُ: کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَمْ اَبْــرَمُوا اَمْـرًا فَـاِنَّـا مُبْرِمُوْنَ ﴾ (۴۳:۷۹) کیا انھوں نے کوئی بات ٹھہرا رکھی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں۔ یہ اصل میں اِبْــرَامُ الْـحَبْلِ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی رسی کو مضبوط بٹنے کے ہیں، شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۵۰) عَـلٰی کُلِّ حَالٍ مِّنْ سَحِیْلٍ وَّمُبْرَمٍ یعنی ہر حالت میں (تم قابل ستائش ہو)

اَلْبَـرِیْمُ: بمعنی مُبْـرَم ہے یعنی مضبوط بٹی ہوئی رسی محاورہ ہے: اَبْـرَمْتُہٗ فَبَرِمَ فَھُوَ بَرِیْمٌ۔ اسی بنا پر کنجوس آدمی کو جو جوانہ کھیلتا ہو بَرَمٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ بخیل کو مغلول الید کہتے ہیں۔اور مُبْرِمُ الْجَبَلِ کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس آدمی کو جو کسی معاملہ میں مصر اور بضد ہو اسے اَلْــمُبْـرِمُ کہا جاتا ہے یعنی معنی اَلْبَرَم کے ہیں اور جو آدمی دو دو کھجوریں ملا کر کھاتا ہو اسے بھی بَــرَمٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں سختی کے ساتھ کھانا کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور رسی بھی دو رنگ پر ہوتی ہے، اس لیے ہر سیاہ سفید پر مشتمل لشکر اور بکریوں کے ملے جلے ریوڑ کو بَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْبُـرْمَۃُ اصل میں پتھر کی ہنڈیا کو کہتے ہیں۔ج: بِـرَامٌ۔ جیسے حُضرۃ کی جمع حِضار اور یہ ضُحکَۃٌ وَھُزْءَۃٍ کی طرح مفعول کے اوزان سے ہے۔

ب ر ہ

اَلْبُـرْھَـانُ: کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْـحَانٌ وَثُنْیَان کی طرح فُعْلان کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَـرِہَ یَبْرَہُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں۔صفت اَبْرَہُ مونث بَـرْھَـاءَ ج: بُـرْہٌ اور نوجوان سپید رنگ حسینہ کو بَـرْھَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْبَرھَۃُ: وقت کا کچھ حصہ لیکن بُـرْھَان دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زور دار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو اس لیے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جو ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو۔ (۲) وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو۔ (۳) وہ جو اقرب الی الصدق ہو۔ (۴) جو کذب کے زیادہ قریب ہو۔ (۵) وہ جو اقتضاء صدق و کذب میں مساوی ہو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ قُـلْ ھَـاتُـوْا بُـرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ﴾ (۲:۱۱۱) اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ ﴿ قُـلْ ھَـاتُـوْا بُرْھَانَکُمْ ھٰذَا ذِکْرُ مَنْ مَّعِیَ ﴾ (۲۱:۲۴) کہہ دو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو، یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے۔ ﴿ قَدْ جَـآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ﴾ (۴:۱۷۴) تمہارے پاس دلیل (روشن) آچکی ہے۔

---

[1] قالہ زھیر فی معلقتہ واولہ : یمیناً لنعم السیدان وجدتما۔راجع للبیت شرح المعلقات لابن الانباری ۲۶۰ والعشر للتبریزی ۱۰۸ والسمط ۱ : ۱۲) واللسان (سھل) وشواھد الکشاف والاشباہ النحویۃ (٤ : ۲۰۵) والمعانی للقتبی ۸۸۰ ومختار الشعرا الجاھلی بشرح السقاء (۱ : ۱۵۳) والجمھرۃ ۱۰۷ والعقد الثمین ۹۵ وایام العرب ۲۷۳ .

ب ز غ

بَزَغَ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج کا طلوع ہونا. جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً ﴾ (۶:۷۸) پھر جب سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔

﴿ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا ﴾ (۶:۷۷) پھر جب چاند کو چمکے ہوئے دیکھا۔

تشبیہ کے طور پر بَزَغَ النَّابُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی اونٹ کی نیش نکل آنا کے ہیں۔اصل میں یہ بَزَغَ الْبَيْطَارُ الدَّآبَّةَ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی جانور کے نشتر لگا کر خون بہانا کے ہیں۔

ب س س

آیت کریمہ: ﴿ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴾ (۵۶:۵) میں بُسَّتْ کے معنی پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانا کے ہیں اور یہ بَسَسْتُ الْحِنْطَةَ وَالسَّوِيْقَ بِالْمَاءِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی پانی میں گندم یا جو کے ستو ڈال کر نشاستہ نکالنے کے ہیں اور نشاستہ کو بَسِيْسَة کہا جاتا ہے بعض نے اس کے معنی تیز ہنکانا کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ اِنْبَسَّتِ الْحَيَّةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سانپ کے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بل کی طرف دوڑنا کے ہیں اور اسی معنی کو دوسری جگہ ﴿ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ ﴾ (۱۸:۴۷) اور ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ (۲۷:۸۸) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔

بَسَسْتُ الْاِبِلَ: اونٹوں کو ہنکاتے وقت ڈانٹنا اَبْسَسْتُ بِهَا عِنْدَ الْحَلْبِ کو جو بغیر چمکارنے کے دودھ نہ دے بَسُوْسٌ کہا جاتا ہے۔حدیث پاک میں ہے [1]

(۲۸) جَاءَ اَهْلُ الْيَمَنِ يَبُسُّوْنَ عِيَالَهُمْ کہ اہل یمن اپنے اہل وعیال کو نرمی سے چلاتے ہوئے آپہنچے ہیں۔

ب س ر

اَلْبَسْرُ: کے معنی کسی چیز کو قبل از وقت جلدی لے لینا کے ہیں جیسے بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَةَ (اس نے قبل از وقت اپنی ضرورت کو طلب کیا) بَسَرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ (مادہ کی خواہش کے بغیر اونٹ نے اس سے جفتی کی) مَاءٌ بُسْرٌ بارش کا تازہ پانی جو زمین پر گرنے سے پہلے ہی لے لیا جائے بُسِرَ الْقَرْحُ پھوڑے کو پکنے سے پہلے پھوڑ دینا اسی سے گدری کھجور کو بُسْرٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴾ (۷۴:۲۲) پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔میں بَسَرَ کے معنی قبل از وقت منہ بگاڑنے کے ہیں اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر بَسَرَ کے یہی معنی ہیں تو آیت: ﴿ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴾ (۷۵:۲۴) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہوں گے۔ میں بَاسِرَة کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ وہاں تو قبل از وقت منہ بگاڑنا نہیں ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ ان کی حالت آگ میں داخل ہونے سے قبل ہوگی، اس لیے بَاسِرَة کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ گویا آگ میں پہنچنے سے قبل ان کا منہ بگاڑنا محض تکلف اور قبل از وقت ہوگا، جیسا کہ بعد کی آیت: ﴿ وَتَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴾ (۷۵:۲۵) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت واقع ہونے

[1] الحدیث بتفصیله فی (خ) مدنیه و(ط) راجع لشرح الحدیث غریب لابی عبید (لبس) ۳: ۸۹.

والی ہے۔سے معلوم ہوتا ہے۔

ب س ط

بَسَطَ الشَّیَّ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور توسیع کرنے کے ہیں۔ پھر استعمال میں کبھی دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بَسَطَ الثَّوْبَ (اس نے کپڑا پھیلایا) اسی سے اَلْبِسَاط ہے جو ہر پھیلائی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے۔قرآن میں ہے: ﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴾ (۷۱:۱۹) اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔اور بساط کے معنی وسیع زمین کے ہیں اور بَسِیْطُ الْاَرْضِ کے معنی ہیں کھلی اور کشادہ زمین۔ ایک گروہ کے نزدیک بَسِیْط کا لفظ بطور استعارہ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں ترکیب وتالیف اور نظم متصور نہ ہوسکے۔ اور بسط کبھی بمقابلہ قبض آتا ہے۔جیسے ﴿ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ﴾ (۲:۲۴۵) خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور کبھی بمقابلہ قدر (یعنی تنگ کردینا کے جیسے ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ ﴾ (۴۲:۲۷) اور اگر خدا اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی کردیتا۔

﴿ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ (۲:۲۴۷) اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن وتوش بھی (بڑا) عطا کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کا بسیطۃ فی العلم یہ تھا کہ انھوں نے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور یہ ان کا بَسْطَةً یعنی جودوسخا تھا۔

بَسْطُ الْيَدِ کے معنی ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ﴾ (۱۸:۱۸) ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اور بَسْطُ الْكَفِّ (ہتھیلی پھیلانا) یہ لفظ کبھی طلب وسوال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿ كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ ﴾ (۱۳:۱۴) اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلادے۔اور کبھی اَخْذٌ یعنی پکڑنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے: ﴿ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ﴾ (۶:۹۳) اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لیے) ہاتھ بڑھارہے ہوں۔اور کبھی حملہ کرنے والے اور مارنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ ﴾ (۶۰:۲) اور ایذا کے لیے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی) اور کبھی اس سے بخشش کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ﴾ (۵:۶۴) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

اَلْبَسْطُ: وہ اونٹنی جس کے ساتھ اس کے بچے کو چھوڑ دیا گیا ہو اور یہ بمعنی مَبْسُوْطَةٌ ہے، جیسے نِكْثٌ بمعنی منکوث ونقض بمعنی منقوض آجاتا ہے۔اَبْسَطَ نَاقَتَهٗ اونٹنی کو اس کے بچے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

ب س ق

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴾ (۵۰:۱۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔اَلْبَاسِقُ کے معنی ہیں بلندی میں لمبا چلا جانے والا۔ چنانچہ اسی سے

بَسَقَ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِہٖ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھیوں پر فضیلت میں بازی لے جانا۔
بَسَقَ وَبَصَقَ جس کے معنی تھوکنا ہیں اصل میں بَزَقَ ہے، بَسَقَتِ النَّاقَۃُ: اونٹنی کے تھنوں میں بغیر جفتی نر کے تھوک کی طرح معمولی سا دودھ اتر آیا۔

ب س ل

اَلْبَسْلُ: کے معنی کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور روکنا کے ہیں۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارۃً ترشروئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ترشرو کو باسل ومبسل الوجہ کہا جاتا ہے۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:
﴿ وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ (۶:۷۰) یعنی اس (قرآن پاک) کے ذریعے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی نفس اپنے اعمال کے ثواب سے محروم نہ رہ جائے ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔
بسل اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ❶ ہے اور بَسَلٌ کا لفظ صرف جبراً کسی چیز سے محروم کردینے پر بولا جاتا ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ﴾ (۶:۷۰) یعنی یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے سبب ثواب سے محروم کردیے گئے۔ بعض نے آیت کریمہ: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ (۷۴:۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے، کے پیش نظر اس کی تفسیر اِرْتِھَانٌ سے بھی کی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے اعمال کے بدلے گرو ہوں گے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۵۱) وَاِبْسَالِیْ بَنِیَّ بِغَیْرِ جُرْمٍ (وافر)

اور میرا اپنے بیٹوں کو ناحق (بنی قشیر کے پاس) گرو کرنا اور دوسرے نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۵۲) فَاِنْ تُقْوِیَا مِنْھُمْ فَاِنَّھُمْ بُسُلٌ ۔

اگر تم انھیں چھوڑ کر چلے جاؤ تو وہ بہادر ہیں۔
یہاں تُقْوِیَا، اقوی الْمَکَانُ سے ہے، جس کے معنی جگہ خالی ہونے کے ہیں اور بسالۃ بمعنی شجاعت ہے اور بُسُلٌ بَاسِلٌ کی جمع ہے اور بہادر کو باسِلٌ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ترش رو رہتا ہے اور یا اس لیے کہ اس کے ہمسروں پر اس کی جان حرام ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ دشمنوں کو اپنے مال سے محروم کردیتا ہے۔

---

❶ لعوف بن الاحوص الباهلي يتحسر على تسليم انباءه لبني قشير رهناً في دم رحل منهم اسمه ابوالصحيفة وتمامه بعوناه ولابدم مراق وبعونا من بعا يبعوبعواً بمعنى الجناية والجرم والبيت في نوادر ابي زيد ۱۵ اوالطبرى ۲۳۳ والقرطبى ۷:۱۶ وشواهد الكشاف ۸۳ ومعاني الكبير ۱۱۴ اومجازالقران ۱:۱۹۴ رقم ۲۲۱ والبحر ۴:۱۴۴ تهذيب الالفاظ ۴۳۳ واللسان والتاج والمحكم (بسل بعو) وفيه قال ابن البرى انه لعبدالرحمن بن الاحوص وانظر لترجمة الشاعر العجم للمرزباني ۲۷۵ والسمط ۲۷۷ والمعانى ۱۱۴.
❷ قاله زهير بن ابى سلمىٰ وصدره : بلاوبهانا ومتهم والفتهم هكذا الرواية في ديوانه ۹۵ بشرح الاعلم وبها انشدابوعلى فى المعالية ليكن في كليهما فانهما بدل فانهم وهكذا الرواية في نوادر ابي زيد ۳ ورواية ابى سعيد حسب رواية المولف اى فانهم بضمير الجمع لكن فيه فان اوحشت بدل فان تقويا وهى موافقة لرواية ابى الطيب عن قطرب (الاضداد اولابى الطيب ۱۳) وصلة البيت تربص فان تقوالمرعة منهم ۔ وداراتهاالاتقومنهم اذا نخل فان تقويامنهم فان محجراً ۔ وجزع الحسامنهم اذا قلما يخلو...... بَلادٌ...... فان اوحشت...... وهى الرواية صحيحة ان شاء الله والبيت فى الاصل ملفق فاختلطت روايته على الرواية ومعنىٰ البيت على رواية المولف فانهم حرام اى حيث كانوا لايقربهم احد ولايغيرعليهم وعلى الثانية فضمير الثنيته يرجع الى الموضعين اى بعد ذهابهم حرام على زيادتهما والبيت فى المختارات والنوادر۳ والامالى ۲:۸۰ وفى اللالى مع السمط ۹۲۲-۹۳۳.

اَبْسَلْتُ الْمَکَانَ کسی جگہ کی حفاظت کرنا اور اس شخص کو جو اسے چھیننا چاہتا ہے محروم کردینا۔ اَلْبُسْلَۃُ: دم جھاڑ کرنے والے کی اجرت یہ رقیہ پڑھنے والے کے قول اَبْسَلْتُ فُلَانًا سے ماخوذ، جس کے معنی کسی شیطان، سانپ اور زہریلے کیڑوں کی مدافعت پر دلیر کرنے کے ہیں یا کسی کو ان چیزوں پر حرام کردینے کے ہیں۔ بعض نے بَسَلْتُ الْحَنظَلَ کا محاورہ بھی نقل کیا ہے، جس کے معنی حنظل کو طیب بنانے کے ہیں اگر یہ حکایت صحیح ہو تو اس کے اصل معنی حنظل کی بسالت یعنی شدت یا اس کی تحریم یعنی کڑواپن دور کرنا ہوں گے جو بمنزلہ حرمت کے ہے۔
بَسَلْ ہاں۔ بس [1]

ب ش ر

اَلْبَشَرَۃُ کے معنی انسان کے جلد کی اوپر کی سطح اور اَدَمَۃٌ کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ عام ادباء کا یہی قول ہے مگر ابوزید [2] نے اس کے برعکس کہا ہے چنانچہ ابوالعباس وغیرہ نے ان کی تردید کی ہے۔ [3]
بَشَرۃ کی جمع بَشَرٌ وَاَبْشَارٌ آتی ہے اور اسی سے انسان کو بشر کہا جاتا ہے کہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔
لفظ بَشَرٌ واحد اور جمع دونوں کے لیے برابر طور پر استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ بَشَرَیْنِ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا ﴾ (۲۳:۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔
اور قرآن پاک میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا ہے تو ایسے موقع پر خاص کر اسے بَشَر کہا گیا ہے، جیسے فرمایا:
﴿ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا ﴾ (۲۵:۵۴)
اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔
﴿ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴾ (۳۸:۷۱) کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔
کفار، انبیاء علیہم السلام کی کسر شان کے لیے ان کو بَشَرٌ کہہ کر پکارتے تھے، جیسے:
﴿ اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾ (۷۴:۲۵) یہ (خدا) کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔
﴿ أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ﴾ (۵۴:۲۴) بھلا ہم ایک ہے آدمی کی جو ہم ہی میں سے ہے۔
﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۳۶:۱۵) کہ تم (اور کچھ) نہیں مگر ہماری طرح کے آدمی (ہو)
﴿ أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا ﴾ (۲۳:۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔
﴿ فَقَالُوْا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا ﴾ (۶:۶۴) تو یہ کہتے کہ کیا

---

[1] راجع للبحث عن ماده (ب س م) فی الاستدارك.

[2] ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری الخزرجی من تلامیذ ابی عمرو بن العلاء والمفضل الضبی وکان جده من الصحابة وجمع نجوماً من القرآن علی عهد الرسول صلی الله علیه وسلم شدید العنایة یجمع اللغات واللهجات توفی ۲۱٤ھ وقد قارب المأة انظر المعارف لابن قتیبه ۲۷۰ نزهته الاولیاء ۱۷۳۔۱۷۹ تاریخ بغداد للخطیب ۷۷/۹۔۸۰ الارشاد ٤۔۲۳۸۔۲٤۰ ابن فلکان رقم ۲٤۹ مرءة الجنان الیافعی ۱۸۵/۲ تهذیب لابن حجر ۳/٤۔٥ والبغیة للسیوطی ۲٥٤ وکتاب النوادر من اشهر تالیفه.

[3] قاله ان اضداد ابی الطیب ۷۳۔۷٦ وقال ابومالك من قول ابی زید انظر اللسان (بشر).

آدمی ہمارے ہادی بنتے ہیں۔
چنانچہ قرآن پاک نے:﴿ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۱۸:۱۱۰) کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ بلاشبہ بشری تقاضوں میں سب انسان برابر ہیں مگر معارف جلیلہ اور اعمال جمیلہ کے لحاظ سے ان میں تفاوت رتبی پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان معارف و اعمال کے ساتھ مخصوص فرما کر سرفراز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ یُوْحٰی اِلَیَّ میں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے صرف وحی الٰہی کے ساتھ ممتاز ہوں۔
﴿ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ﴾ (۱۹:۲۰) مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ میں خاص کر مس بشر کی نفی کی ہے اور آیت کریمہ:﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴾ (۱۹:۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا میں تَمَثَّلَ کا فاعل فرشتہ ہے اور اس میں تنبیہ کی ہے کہ فرشتہ خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور آیت کریمہ:﴿ مَا هٰذَا بَشَرًا ﴾ (۱۲:۳۱) یہ آدمی نہیں۔ میں بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہو۔
بَشَرْتُ الْاَدِيْمَ: میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا جیسا کہ اَنَفْتُ وَرَجَلْتُ کا محاورہ ہے اور اسی سے بَشَرَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ ہے جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر جانے کے ہیں۔
اَلْمُبَاشَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایۃً عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آجاتا ہے، جیسے فرمایا:﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ ﴾ (۲:۱۸۷) اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔﴿ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ (۲:۲۷) اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرلو۔ فُلَانٌ مُؤْدَمٌ مُبْشَرٌ فلاں ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اصل میں یہ محاورہ اَبْشَرَهُ اللّٰهُ وَاٰدَمَهٗ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی کھال کے ظاہر و باطن کو اچھا کرے، پھر ہر اس کامل شخص کو جو ظاہری و باطنی خوبیوں کا ملک ہو۔ اسے مُؤْدَمٌ وَمُبْشَرٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی کیے ہیں۔ اس کا اَدَمَة (باطن) نرم اور بشرہ (ظاہر) سخت ہے۔ اَبْشَرْتُ الرَّجُلَ وَبَشَّرْتُهٗ وَبَشَرْتُهٗ. خوشخبری پہنچانا۔ خوش کن خبر سنانا جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو کیونکہ انسان کو جب کوئی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کے جسم میں (وفور مسرت سے) خون اس طرح دورہ کرنے لگتا ہے جیسے درختوں میں پانی، اس لیے التبشیر کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے ٹمٹما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور بَشَرْتُهٗ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور اَبْشَرْتُهٗ اَحْمَدْتُهٗ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے، جیسے: بَشَرْتُهٗ فَاَبْشَرَ (یعنی وہ خوش ہوا) اور آیت کریمہ:﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ ﴾ (۳:۴۵) کہ خدا تم کو اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے، میں ایک قرأت يَبْشُرُكِ وَيُبْشِرُكِ ہے نیز فرمایا:﴿ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ. قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ

بِالْحَقِّ ﴾ (۵۵،۵۴:۱۵) مہمانوں نے کہا ڈریئے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دینے لگے، اب کاہے کی خوشخبری دیتے ہو، انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔ ﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴾ (۱۷:۳۹) تو میرے بندوں کو بشارت سنادو۔ ﴿ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ ﴾ (۱۱:۳۶) سو اس کو مغفرت کی بشارت سنادو۔

اِسْتَبْشَرَ کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ﴾ (۴۵:۳۹) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے، ان کی نسبت خوشیاں منارہے ہیں۔ ﴿ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ﴾ (۱۷۱:۳) اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہورہے ہیں۔ ﴿ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ (۶۷:۱۵) اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔ اور خوش کن خبر کو بشَارة اور بُشْریٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ﴾ (۶۴:۱۰) ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

﴿ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ (۲۲:۲۵) اس دن گنہگاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ ﴿ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ﴾ (۳۱:۲۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

﴿ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ﴾ (۱۹:۱۲) زہے قسمت یہ تو (حسین) لڑکا ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ ﴾ (۱۲۶:۳) اور اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لیے (ذریعۂ بشارت) بنایا۔

اَلْبَشِيْرُ: خوشخبری دینے والا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ﴾ (۹۶:۱۲) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا تو کرتہ یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور وہ بینا ہو گئے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ ﴾ (۴۶:۳۰) کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوش خبری دیتی ہیں [1] میں مُبَشِّرَات سے مراد بارش کی خوش خبری دینے والی ہوائیں ہیں۔

اور حدیث: [2]

(۲۹) اِنْقَطَعَ الْوَحْىُ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ (کہ وحی منقطع ہوگئی اور مبشرات باقی رہ گئیں) میں مُبَشِّرَاتِ سے مومن کی سچی خوابیں مراد ہیں جیسا کہ بعد میں وَهِىَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ الَّتِىْ يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰى لَهٗ سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور آیاتِ کریمہ: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۳۴:۹) ان کو عذاب الیم کی خوشخبری سنادو۔ ﴿ وَبَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ ﴾ (۱۳۸:۴) (اے پیغمبر) منافقوں (یعنی دوزخی لوگوں) کو بشارت دو کہ ان کے لیے ﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

---

[1] هكذا الاية فى النسخ المطبوعة لكن الصحيح بشراً۔ موضع مبشرات راجع سورة الاعراف (۷۔۵۷) ولعل المصنف ارادآية سورة الروم ان يرسل الرياح مبشرات ۳۰۔۴٦ فوقع الذلة من المصحح ۱۲۔

[2] الحديث باختلاف الفاظه فى الترمذى وابن ماجة والحاكم والبيهقى واحمد والبزار والكامل لابن عدى وقد اشبع الكلام على طرق الحديث ابن كثير (۲/۴۲۳۔۴۲۴) وابن جرير ۱۱/۱۳۴۔برواية ابن مسعود ۱۲۔

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۹:۳) اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنادو۔ میں تبشیر کے لفظ سے تنبیہ کی ہے کہ سب سے بہتر خوش کن خبر جو وہ سن سکتے ہیں، وہ عذاب الیم ہے جس میں وہ قیامت کے روز گرفتار ہوں گے۔ اور عذاب کے متعلق بَشِّـرْ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ❶ ع (وافر)

(۵۳) تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ.

(ان کا باہمی سلام دردناک ضرب لگانا ہے۔)

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ (۳۰:۱۴) کہہ دو کہ (چند روز) فائدے اٹھالو آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں لفظ تَمَتَّعُ بھی ایسے ہی مفہوم کے پیش نظر آیا ہے، نیز فرمایا: ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ﴾ (۱۷:۴۳) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انھوں نے خدا کے لیے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔

اَبْشَـرَ کے معنی ہیں اس نے بشارت کو پایا جیسے اَبْـقَـلَ وَاَمْـحَـلَ یعنی اس نے بقل اور محل یعنی خشک سالی کو پایا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَبْشِـرُوْا بِـالْـجَـنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (۳۰:۴۱) اور اس بہشت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اَبْشَـرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہوگئی اور خوش نظر آنے لگی۔ اسی سے حضرت ابن مسعود کا قول ہے ❸

(۳۰) مَنْ اَحَبَّ الْقُرْاٰنَ فَلْيَبْشِرْ کہ جسے قرآن سے محبت ہے اسے خوش ہونا چاہیے۔ فَرَّاء کا قول ہے ❹ کہ اگر شین مشدد (یعنی باب تفعیل سے) ہو تو بُشْـرٰی سے ہوگا اور اگر خفیفہ یعنی مجرد سے ہو تو بمعنی سرور ہوگا جیسے محاورہ ہے: بَشَـرْتُهٗ فَبَشِرَ مثل جَبَـرْتُهٗ فَجُبِرَ سیبویہ نے کہا ہے ❺ کہ بَشَـرْتُـهٗ کا مطاوع اَبْشَرَ بھی آجاتا ہے۔ مگر ابن قتیبہ کی رائے ہے کہ یہاں یعنی حدیث میں فَلْيَبْشِرْ کا لفظ بَشَرْتُ الْاَدِيْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھال کو چھیلنا کے ہیں۔ لہٰذا فَلْيَبْشِرْ کے معنی ہوئے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو کمزور اور دبلا کرے۔ ❻

---

❶ قالہ عمرو بن معدی کرب صاحب ريحانة اخت دريد بن الصمة واوله : وخيل قد دلفت لها بخيل والبيت من شواهد الطبرى (۱ : ۳۹۱) راجع للبيت الخزامة والاصمعيات وشواهد الكشاف ٦٨ والبحر (٦ : ٢/١٦٦ : ١١٨) والكتاب (١ : ٤٢٩، ٣٦٥) ولعمدة (٢ : ٢٩٢).

❷ آلايةمن باب التهكم لكن الاستشهاد بالبيت فيه خلطه وقع لكثير من الشراح الذين شرحوا كلام الزمخشرى لان البيت فيه صنعة التنويع والتنوييع قد يأتى للتهكم قد حققه ابن فارس فى الصاحبى وانظر ايضاً الطراز للخفاجى ٢٩، ٣٤.

❸ راجع الفائق ١/١ ٥ واللسان (بشر والنهاية).

❹ فراء ابو زكريا يحيىٰ بن زياد الفراء نسبة الى بيع الضروة .

❺ ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر المناطب سيبويه ومعناه بالفارسية (بوئے سيب) من اشهر تلاميذ الخليل ومصنف اول كتاب فى النحو الذى تلقاه من شيخه ومناظرته مع الكسائى فى مسئلة الزنبور (اعلان التو بيخ للسخاوى ٣٤) مشهورة حصل الكسائى بواء الفتح توفى ١٧٧ او ١٨٠ ھ راجع النزهة لابن الانبارى ٧٩، ٨١ وطبقات الزبيدى رقم ٢٢ و تاريخ بغداد للخطيب ١٢/ ١٩٥-١٩٩ والارشاد ٦ : ٨٠-٨٨ وفيات لابن خلكان رقم ٤٧٧ مرءة الجنان ١ : ٣٤٨-٤١٥ ابو الوفا ١ : ٥٤ بغيه ٣٦٦-٣٦٧ شذرات لابن العماد ١ : ٢٥٣-٢٥٥ نفخ الطيب للمقرى ٢/ ٤٧٨-٤٧٩ واصح طبقات الكتاب طبعة بولالق ٣١٦ مع تقريرات بالهامش وزيد من شرح السيرانى وفى مفسر شرح الشواهد للاعلم اشقرى

❻ اصله من البشارة بالثواب وتاويل ابن قتيبة زكره الزمخشرى بلفظه قيل بغير عزو.

جیسا کہ مروی ہے:

(۳۱) اِنَّ وَرَاءَ نَا عَقَبَةٌ لَا يَقْطَعُهَا اِلَّا الضُّمَّرُ مِنَ الرِّجَالِ. کہ ہمارے سامنے ایک گھاٹی ہے جسے دبلے آدمی ہی عبور کرسکیں گے اور شاعر کا قول ❶

(۵۴) فَاَعِنْهُمْ وَاَبْشِرْ بِمَا بُشِرُوْا بِهٖ
وَاِذَا هُمْ نَزَلُوْا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

(ان کی مدد کرو اور جو چیز انھیں خوش لگتی ہو اسی پر خوش رہو اور جب وہ کسی تنگ مقام پر نازل ہوں تو تم بھی وہاں اتر پڑو۔ پہلے معنی یعنی فراء کے قول پر محمول ہے۔

تَبَاشِيْرُ الْوَجْهِ وَبِشْرُهٗ چہرے پر خوشی کے آثار۔ خوش روئی۔ تَبَاشِيْرُ الصُّبْحِ: آغاز صبح تَبَاشِيْرُ النَّخْلِ: کھجور کا پہلا پختہ پھل۔ بُشْرٰی وبُشَارة وہ عطیہ (یا انعام) جو بشارت دینے والے کو دیا جائے۔

ب ص ر

اَلْبَصَرُ: کے معنی آنکھ کے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿كَلَمْحِ الْبَصَرِ﴾ (۵۴:۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ ﴿وَاِذَا زَاغَتِ الْاَبْصَارُ﴾ (۳۳:۱۰) اور جب آنکھیں پھر گئیں۔ نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بَصَرٌ اور بَصِيْرَةٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (۵۰:۲۲) اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ (۵۳:۱۷) ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی۔

بَصَرٌ کی جمع اَبْصَارٌ اور بَصِيْرَةٌ کی جمع بَصَائِر آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ﴾ (۴۶:۲۶) تو نہ ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آسکے اور نہ آنکھیں۔

اور آنکھ سے دیکھنے کے لیے بَصِيْرَة کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ بصر کے لیے اَبْصَرْتُ استعمال ہوتا ہے اور بَصِيْرَة کے لیے اَبْصَرت وبَصَرْتُ بِهٖ دونوں فعل استعمال ہوتے ہیں جب حاسۂ بصر کے ساتھ رویۂ قلبی شامل نہ ہو تو بَصُرْتُ کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابصار کے متعلق فرمایا:

﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ﴾ (۱۹:۴۲) آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں۔ ﴿رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا﴾ (۳۲:۱۲) اے ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا۔ ﴿وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۰:۴۳) اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔ ﴿وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ﴾ (۳۷:۱۷۹) اور دیکھتے رہو یہ بھی عنقریب (نتیجہ) دیکھ لیں گے۔ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ (۲۰:۹۶) میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔ ﴿اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾

❶ قاله عبدالقيس بن خفاف الرجمي ونسبه صاحب اللسان لابي عطية بن زيد الجاهلي والبيت من كلمة مفضلية رقم ١٦ في ١٨ بيتاً وفي رواية: واليسر بما به اى اسرع الى احابتهم والبيت في اللسان (بشر) وتفسير الطبرى ٣: ٢٥١) ومعاني القران للفراء والاصمعيات ٨٧ وشواهد المغني (٩٥: ٢/٢٠٣) وتهذيب اصلاح المنطق مع آخر قبله.

(۱۲:۱۰۸) یعنی میں پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تمھیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (اور یہی حال میرے پیروکار کا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ﴾ (۷۵:۱۴) میں عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر خود اس کے اعضاء میں سے گواہ اور شاہد موجود ہیں جو قیامت کے دن اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے، جیسے فرمایا:

﴿ یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ ﴾ (۲۴:۲۴) جس دن ان کی زبانیں، ہاتھ ...... ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور کبھی ضَرِیْر (اندھے) کو بھی بَصِیْر کہہ دیا جاتا ہے اور یہ اطلاق الاسم عَلٰی ضدِّہ کے قبیل سے ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اسے تَسْمِیة الشی باسم ضده کے باب سے نہ بنایا جائے، بلکہ کہا جائے کہ ضَرِیْرٌ کو بصیر کہنا اس کی بصیرۃ قلبی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مُبْصِرٌ وَبَاصِرٌ نہیں کہا جاتا۔ پس اگر یہ باسم ضدہ کے قبیل سے ہوتا تو یہ اطلاق بھی جائز ہونا چاہیے تھا اور آیت کریمہ:

﴿ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ (۶:۱۰۴) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ میں اکثر علماء نے اَبْصَارٌ کے معنی آنکھ کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ اوہام و افہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۳۲) اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَّا تَتَوَهَّمَهٗ. کہ (حقیقتاً) توحید تو یہ ہے جو انسان کے واہمہ میں بھی نہ آسکے اور فرمایا کہ جو کچھ انسان ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔

اَلْبَاصِرَۃُ کے معنی ظاہری آنکھ کے ہیں۔ محاورہ ہے: رَأَیْتُهٗ لَمْحًا بَاصِرًا میں نے اسے عیاں طور پر دیکھا۔ اَلْمُبْصِرَۃُ روشن اور واضح دلیل قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰیَاتُنَا مُبْصِرَۃً ﴾ (۲۷:۱۳) جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں۔ ﴿ وَجَعَلْنَا اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَۃً ﴾ (۱۷:۱۲) یعنی ہم نے دن کی نشانی کو نظروں کو روشنی دینے والی بنایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَۃً ﴾ (۱۷:۱۹) اور ہم نے ثمود کی اونٹنی (نبوت صالح) کی کھلی نشانی دی، میں مُبْصِرَۃً اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہاں مُبْصِرَۃً کے معنی ہیں کہ ایسی نشانی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ جیسا کہ رَجُلٌ مُخْبِثٌ وَمُضْعِفٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اہل اور قریبی رشتہ دار خبیث اور ضعیف ہوں اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی بَصَائِرَ لِلنَّاسِ ﴾ (۲۸:۴۳) میں بَصَائِرُ بَصِیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی عبرت کے ہیں یعنی ہم نے پہلی قوموں کی ہلاکت کو ان کے لیے تازیانہ عبرت بنادیا اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ ﴾ (۳۷:۱۷۹) کے معنی یہ ہیں کہ انتظار کرو حتی کہ تم سب اپنی آنکھوں سے نتائج ملاحظہ کرلو اور آیت کریمہ: ﴿ وَکَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴾ (۲۹:۳۸) حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے، میں مُسْتَبْصِرِیْنَ کے معنی طالب بصیرت کے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

بطور استعارہ اِسْتِبْصَار (استفعال) بمعنی اِبْصَار (افعال) ہو جیسا کہ اِسْتِجَابَۃٌ بمعنی اِجَابۃ کے آجاتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً ﴾ (۵۰:۷) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں میں تَبْصِرَۃ کے معنی ہیں دکھانے اور سمجھانے کو اور یہ (تفعلة کے وزن پر) باب تفعیل کا مصدر ہے، جیسے قَدَّمْتُہٗ تَقْدِيْمًا وَتَقْدِمَةً وَذَكَّرْتُهٗ تَذْكِيْرًا وَتَذْكِرَةً اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ﴾ (۷۰:۱۰،۱۱) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے، میں يُبَصَّرُوْنَهُمْ کے معنی یہ ہیں کہ انھیں ان کے احوال و آثار سے خوب طرح واقف کردیا جائے گا۔
بَصَّرَ الْجَرْوُ پلے نے آنکھیں کھولیں۔
اَلْبَصْرَۃُ: ملائم چمکدار پتھر گویا وہ بینا ہے اور یا اسے بَصْرَۃٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آجاتا ہے اور اسے بَصِر بھی کہا جاتا ہے۔ اَلْبَصِيْرَۃُ (ایضاً) خون کا دھبہ جو دور سے چمکتا ہوائی دکھائی دے، چمکدار، ڈھال، کپڑے یا مشکیزے کے دو ٹکروں کے درمیان کا شگاف جس سے آر پار نظر آتا ہو۔ اسی سے بَصَرْتُ الثَّوْبَ وَالْاَدِيْمَ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کپڑے یا چمڑے کا درمیانی شگاف سلائی کرنا کے ہیں۔

ب ص ل

اَلْبَصْلُ: پیاز قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ﴾ (۲:۶۱) اور مسور اور پیاز۔ اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بَصَلٌ کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] ع (وبل)

(۵۵) وَتَرْكَ كَالْبَصَلِ

اور پیاز جیسی خود۔

ب ض ع

اَلْبِضَاعَةُ: مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے الگ کرلیا گیا ہو۔ اَبْضَعَ وَابْتَضَعَ بِضَاعَةً. سرمایہ یا پونجی جمع کرنا۔ الگ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ﴾ (۱۲:۶۵) یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کردی گئی ہے۔ ﴿ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ ﴾ (۱۲:۸۸) اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔
اصل میں بِضَاعَةٍ بَضْعٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں گوشت کا بڑا ٹکڑا۔ بَضْعَتُهٗ وَبَضَّعْتُهٗ گوشت کے

---

[1] وتكملتهٗ : فحمة ذافرا(ترقي بالعرىٰ ـقردمانيا.......... والبيت من قصيدة لبيدفي رثاء اخيه مطلعها : ان تقوى ربنا خيرنقل وباذن الله ريثي وعجل (مفيد القافيه) في ديوانه ١٠١ـ١١٧ والبيت في وصف كتيبته سهكه من الحديد عليها ورد ع محكمة فحمة اى كتيبة عظيمة (ذفراء اوفراء) اىٰ منتة الريح من الحديد والقرومانى معرب (كروماند) اى عمل وبقى (راجع معجم استنجاس ١٠٢٢ وابن الانبارى (٤١٥ـ٤١٦) اى دروع غليظة والترك بيض الحديد والرتومعناه الشديد يقول انشاء الله ان هذه الكتيبة ملبوسة في دروع طويلة شدت اطرافها بالعرىٰ وسطها لئلا تنتشر و تشتمر عن لا بسهاوعلى رؤسهم بيض الحديدمثل البصل وقبله : فمتى ينفع صراح صادق يحلبوها ذات جرس ورحل والبيت في اللسان والصحاح (ترك رتو قردم ،ذفر) واللسان وحده (بصل) وتهذيب الالفاظ ٤٩٤ والمتوشح ٨٧ والاقتضاب ٢١٥ـ٤١٩ والصناعتين (١٩٦،٨، ١٠٧) رواه من روى التشبيه والاصلاح ٣٣٧ـ والمقاييس (١ : ٢٥٣ـ٣٤٥/٤ : ٢٩٥) والمعانى ٨٧٤، ٣٩، ١ـ٢٩، ١ واضداد لابن السكيت ١٩٦ واضدداد لابن الانباى ٨٩ وابى الطيب ٢٧٩ ونوادر ابى مسهل ٢٨٨ والمعلقات لابن الانبارى (٤١٥(وكان عمرؓ ياسر برواية هذاه القصيدة .

بڑے بڑے ٹکڑے بنانا۔ اِبْتَضَعَ وَبَتَضَّعَ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسے قَطَعْتُہٗ وَقَطَّعْتُہٗ فَانْقَطَعَ وَتَقَطَّعَ اَلْمِبْضَعُ: (آلہ) نشتر جیسے مِقْطَعٌ کنایہ کے طور بُضْعٌ کے معنی عورت کی شرمگاہ بھی آجاتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے۔ مَلَکْتَ بُضْعَھَا کیا تم نے اس عورت سے نکاح کرلیا ہے۔ بَاضَعَھَا بِضَاعًا عورت سے مجامعت کرنا۔ فُلَانٌ حَسن الْبَضع وَالْبَضِیع وَالْبَضْعَۃِ وَالْبَضَاعَۃِ. فلاں خوب موٹا تازہ ہے۔ اَلْبَضِیْعُ: ٹاپو۔ وہ جزیرہ جو خشکی سے بہت دور ہو۔ فُلَانٌ بَضْعَۃٌ مِّنِّیْ: فلاں میرے جسم کا ٹکڑا ہے یعنی نہایت قریبی رشتے دار ہے۔ اَلْبَاضِعَۃُ: زخم جو گوشت کو کاٹ ڈالے۔

اَلْبِضْعُ: (بکسر الباء) عدد جو دس سے الگ کیے گئے ہیں یہ لفظ تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانچ سے اوپر اور دس سے کم پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے [1]

﴿ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴾ (۴۲:۱۲) چند سال۔

ب ط ر

اَلْبَطَرُ: وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال، حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ ﴾ (۸:۴۷) جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے۔

﴿ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا ﴾ (۲۸:۵۸) اپنی معیشت میں اتراتے تھے۔ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِیْشَتُہٗ ہے فعل کی نسبت اس سے قطع کرکے بطور تمیز اسے منصوب کردیا گیا ہے۔ اور قریبًا طَرِبٌ بمعنی بَطَرٌ آتا ہے، مگر طَرَبٌ اس خفت کو کہتے ہیں جو فرط مسرت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی طَرَبٌ بمعنی غم بھی آجاتا ہے۔ اَلْبَیْطَرَۃُ: حیوانات کا علاج کرنا، ان کی چیر پھاڑ کرنا۔

ب ط ش

اَلْبَطْشُ: کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴾ (۲۶:۱۳۰)

اور جب (کسی کو) پکڑتے تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔

﴿ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَۃَ الْکُبْرٰی [2] ﴾ (۴۴:۱۶)

جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔

﴿ وَلَقَدْ اَنْذَرَھُمْ بَطْشَتَنَا ﴾ (۵۴:۳۶) اور لوطؑ نے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا۔

﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ ﴾ (۸۵:۱۲) بیشک تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔

یَدٌ بَاطِشَۃٌ. سخت گیر ہاتھ۔

ب ط ل

اَلْبَاطِلُ: یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قال علماء اللغة والتفسير البضع مابين الثلاث الى التسع راجع اللسان (بضع) ورواه الطبرانى وابن مردويه عن دينار بن مكرم والترمذى عن ابن عباس مرفوعاً۔

[2] اريد بالبطشة ابكرى يوم بدراوعذاب يوم القيمة (الطبرى ۲۵/۱۱۶۔۱۱۸).

﴿ ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ﴾ (۳۱:۳۰) یہ اس لیے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں۔

اور باطل کا لفظ قول وفعل دونوں پہ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ (۳:۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

بَطَلَ: (ن) بُطُوْلًا وَبُطْلًا وَبُطْلَانًا. کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا۔

اَبْطَلَهٗ. ضائع کردینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (۷:۱۱۸) اور جو کچھ فرعونی کرتے تھے باطل ہوگیا۔

اور ہر وہ آدمی جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے کوئی مفید کام نہ کرے اسے بَطَّال وذو بِطَالَةٍ کہا جاتا ہے۔

بَطُلَ (ك) دَمُهٗ: خون کا رائیگاں جانا۔

بَطَلٌ: بہادر جو موت سے نہ ڈرے، ایسے آدمی کے خون کو رائے گاں سمجھ کر یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے، شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۵۶) فَقُلْتُ لَهَا لَا تَنْكِحِيْهِ فَاِنَّهٗ
لَاَوَّلُ بَطَلٍ اَنْ يُّلَاقِيْ مَجْمَعًا

(میں نے اس سے کہا کہ اس سے نکاح مت کیجیے کیونکہ وہ لڑائی میں بہادر کے ہاتھ سے مارا جائے گا) تو اس معنی کے لحاظ سے بَطَلٌ بروزن فَعَلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے، یعنی وہ جس کا خون رائیگاں جانے والا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فَعَلٌ بمعنی فاعل ہو کیوں کہ وہ اپنے دشمن کے خون کو رائیگاں کردیتا ہے۔

بَطَلَ (ن) اَلرَّجُلُ بُطُوْلَةً: بہادر ہونا بَطَّال یعنی یہ بیکار یہ بَطَالَةٌ (بیکاری) کی طرف منسوب ہے۔ محاورہ ہے: ذَهَبَ دَمُهٗ بُطْلًا اس کا خون رائیگاں گیا۔ اَلْاِبْطَالُ کے معنی کسی چیز کو خراب اور نابود کرنے کے ہیں، خواہ وہ چیز حق ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ ﴾ (۸:۸) تا کہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کردے۔

کبھی اِبْطَالٌ کا لفظ بے حقیقت بات کہنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴾ (۳۰:۵۸) اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہہ دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ (۴۰:۷۸) اور اہل باطل نقصان میں پڑ گئے۔

میں مُبْطِلُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب ط ن

اَلْبَطْنُ: اصل میں بَطْنٌ کے معنی پیٹ کے ہیں، اس کی جمع بُطُوْنٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ (۵۳:۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

بَطَنْتُهٗ: میں نے اس کے پیٹ پر مارا۔

[1] قاله تابط شرا مادحاً نفسه عند ماخطب امرءة فمنعها الناس بانه سيقتل فتبقين ايماً والبيت فى الحماسة ۴۹۱ بشرحه المرزوقى ۱۱ بيتاً وقد احسن الشارح فى اعراب البيت وفى روايته: قالوا بدل فقلت ونصل بدل بطل والبيت فى البحر: ۵/۳۲۵.

اَلْبَطْن: ہر چیز میں یہ ظَھْرٌ کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت کو ظھرٌ کہا جاتا ہے اسی سے بطور تشبیہ کہا جاتا ہے۔ بَطْنُ الْاَمْرِ (کسی معاملہ کا اندرون) بَطْنُ الْوَادِیْ (وادی کا نشیبی حصہ) اور بطن بمعنی قبیلہ بھی آتا ہے اس اعتبار سے کہ تمام عرب کو بمنزلہ ایک شخص کے فرض کیا جائے اور ہر قبیلہ بمنزلہ بطن فخذ اور کاہل (کندھا) وغیرہ اعضاء کے تصور کیا جائے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے [1] (ع) (سریع)

(۵۷) اَلنَّاسُ جِسْمٌ وَاِمَامُ الْھُدٰی
رَأْسٌ وَاَنْتَ الْعَیْنُ فِی الرَّأْسِ

کہ لوگ بمنزلہ جسم اور امام ہدی بمنزلہ سر ہے، مگر تم سر میں آنکھ ہو۔

اور ہر پیچیدہ معاملہ کو بطن اور جلی اور عیاں کو ظھر کہا جاتا ہے۔ اسی سے بُطْنَانُ الْقِدْرِ وَظُھْرَانُھَا کا محاورہ ہے۔ یعنی دیگ کی اندرونی اور بیرونی جانب۔

ہر اس چیز کو جس کا خاصہ بصر سے ادراک ہو سکے اسے ظاہر اور جس کا خاصہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا جاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ ﴾ (۶:۱۲۰) اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کردو۔

﴿ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (۷:۳۲) ظاہری ہوں یا پوشیدہ۔

اَلْبَطِیْنُ: کلاں شکم، اَلْبَطِنُ: بسیار خور۔

اَلْمِبْطَان: جس کا بسیار خوری سے پیٹ بڑھ گیا ہو۔

اَلْبِطْنَةُ: بسیار خوری۔ مثل مشہور ہے۔

اَلْبِطْنَةُ تُذْھِبُ الْفِطْنَةَ [2] بسیار خوری ذہانت ختم کر دیتی ہے۔

بَطِنَ الرَّجُلُ بَطْنًا: شکم پروری اور بسیار خوری سے اترا جانا۔ بَطُنَ (ك) الرَّجُلُ: بڑے پیٹ والا ہونا۔

مُبَطَّنٌ پچکے ہوئے پیٹ والا۔

بُطِنَ الرَّجُلُ: مرض شکم میں مبتلا ہونا۔ اس سے صیغہ صفت مفعولی مَبْطُوْنٌ (مریض شکم) آتا ہے۔

اَلْبِطَانَةُ: کے معنی کپڑے کا استر یا اس کے اندرونی حصہ کے ہیں اور اس کی ضد ظِھَارَةٌ ہے۔ [3] جس کے معنی کپڑے کا اوپر کا حصہ یا ابرہ کے ہیں اور بَطَّنْتُ ثَوْبِیْ بِاٰخَرَ کے معنی ہیں: میں نے ایک کپڑے کو دوسرے کے نیچے لگایا۔

بَطَنَ فُلَانٌ بِفُلَان کسی شخص کے اندرونی معاملات سے واقف ہونا اور بطور استعارہ اَلْبِطَانَة کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو دوسرے کا راز دان ہو، چنانچہ قرآن

---

[1] قاله علی بن جبله الحکوك یمدح حمید بن عبدالحمید الطوسی والبیت فی الکامل ۸۷۵ والعمدة (۱: ۲۶٤) وفیه صنعة التولید وشرح الدرة للخفاجی ۵۷ والورقة لابن الجراح ۱۰۶ وذیل الامالی ۹۶ آخر والطبقات لابن المعتز ٤۳٤ وفی خاص الخاص للثعالبی قبله: دجلة تسقی یطیح من تسقی من الناس ونسبه المولف (فی محاضراته الی المنصور الضمری خلافاً لجمیع المراجع الاخری وراجع لترجمة العکوك الضریر الاغانی وطبقات لابن المعتز ۱۷۱-۱۸۵ والشعر والشعراء لابن قتیبة ومسالك الابصار وابن خلکان والفهرست وان شعرهٗ مأته وخمسین ورقة ۱۲.

[2] وفی الامثال للثعالبی تافن بدل تذهب یضرب لمن غیر استغناء ہ عقله وافسرہٗ راجع رقم ٥۳٤.

[3] بطانة والجمیع بطائن ومن قوله تعالیٰ: ﴿ بطائنها من استبرق ﴾ (۵۵-۵٤) قال الحسن اراد ظواهرها ولذا عده العلماء من الاضداد راجع اضداد لابی الطیب ٦۷.

پاک میں ہے:﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ (۱۱۸:۳) کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا اور بطانة الثوب سے استعارہ ہے، کیونکہ اسی معنی میں لَبِسْتُ فُلَانًا وَفُلَانٌ شِعَارِیْ وَدِثَارِیْ بھی کہا جاتا ہے ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:[1]
(۳۳) مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَّبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ بِطَانَتَان بِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهٗ عَلَيْهِ وبِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالشَّرِّ وَتَحُثُّهٗ عَلَيْهِ. کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا ہے مگر ہمیشہ اس کے دو رازدان رہے ہیں ایک رازدار اسے خیر کا مشورہ اور اس کی ترغیب دیتا رہا ہے اور دوسرا اسے شر کا مشورہ اور اسی پر اکساتا رہا ہے۔
اَلْبِطَانُ: تنگ جس سے جانور کا پالان کسا جاتا ہے۔ وَالجمع اَبْطِنَةٌ وَبُطُنٌ۔ اَلْاَبْطَنَان پیٹ کی دورگیں۔
اَلْبُطَيْنُ۔ ستارہ جو برج حمل کے لیے بمنزلہ شکم کے ہے وآں سہ ستارۂ خرد است کہ برصورت دیگ پایہا واقع شدہ)
اَلتَّبَطُّنُ: (تفعل) کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنا۔
﴿اَلظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۳:۵۷) صفات الٰہی سے ہیں۔ اور اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی طرح مزدوج یعنی ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اَلظَّاهِرُ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ اس معرفت کی طرف اشارہ ہے جو ہمیں بالبداہت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ انسان جس چیز کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھے اس کی فطرت کا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، جیسے فرمایا:﴿وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (۸۴:۴۳) اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور وہی زمین میں معبود ہے۔ اسی لیے بعض حکماء کا قول ہے کہ معرفت الٰہی کے طالب کی مثال اس شخص کی ہے جو اطراف عالم میں ایسی چیز کی تلاش میں سرگردان پھر رہا ہو۔ جو خود اس کے پاس موجود ہو۔ اور اَلْبَاطِنُ سے اس حقیقی معرفت کی طرف اشارہ ہے، جس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہے:
(۳۴) يَامَنْ غَايَةُ مَعْرِفَتِهٖ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ اے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے درماندگی ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات (دلائل قدرت) کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے۔ اور بعض نے کہا کہ الظاہر سے اس کا تمام اشیاء پر محیط ہونا مراد ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اَلْبَاطِنُ ہے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے:
﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۳:۶) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔
حضرت علیؓ سے ایک مقولہ مروی ہے جس سے ان دونوں لفظوں کی تفسیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں[2]
(۳۵) تَجَلّٰى لِعِبَادِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ رَأَوْهُ وَاَرَاهُمْ نَفْسَهٗ مِنْ غَيْرِ اَنْ تَجَلّٰى لَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] الحدیث فی رحم، خ، ن، عن ابی سعید وبمعناه (خد، ت عن ابی هریرة، ف، عن ابی ایوب وابی هریرة) راجع کنز العمال ٦/ رقم ۳۵۱-۳۵۳، ۳۵۰ وبمعناه زوائد ابن حبان رقم ۲۱۰۲ وفی الکنز تحضه بدل تحثه.
[2] هذا ذکر العلامة الما وروی فی تفسیر الآیة تسعة اقوال فتذکر ۱۲.

اپنے بندوں پر تجلی فرمائی بدوں اس کے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھایا بدوں اس کے کہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو، مگر اس قول کو سمجھنے کے لیے فہم روشن اور عقل وافر کی ضرورت ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ﴾ (۲۰:۳۱) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ "ظَاھِرَۃً" سے نبوت اور بَاطِنَۃً سے عقل مراد ہے اور بعض نے ظَاھِرَۃ سے محسوس نعمتیں مراد لی ہیں اور بَاطِنَۃً سے معقولات یعنی وہ نعمتیں مراد لی ہیں جن کا حس سے ادراک نہیں ہوسکتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ظَاھِرَۃً سے وہ غلبہ مراد ہے، جو دشمنوں پر انسانوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ اور باطنۃ سے وہ غلبہ مراد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ حاصل ہوا، لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

ب ط ء

اَلْبُطْؤُ: (ک) کے معنی چلنے میں دیر لگانے اور سستی کرنے کے ہیں اور یہ باب کرم و تفاعل و استفعال اور افعال سے استعمال ہوتا ہے، لیکن بَطُؤَ (ک) کے معنی اس وقت بولتے ہیں جب دیر لگانے کے عادی ہو جائے اور تَبَاطَأَ کے معنی میں بتکلف دیر کرنا اور استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اِبْطَاءٌ: (افعال) سست رفتاری کے ساتھ متصف ہونا۔ نیز بَطَّأَہٗ وَاَبْطَأَہٗ (متعدی) مؤخر کرنا اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ﴾ (۴:۷۲) اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو (عمداً) دیر لگاتے ہیں۔

میں لَیُبَطِّئَنَّ کے معنی دوسروں سے دیر لگوانا کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی بہت زیادہ سستی کرنا بھی لکھے ہیں حاصل یہ ہے کہ بعض تم میں سے خود بھی دیر لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی دیر لگواتے ہیں۔

ب ظ ر

ایک قرأت میں ہے:

﴿ وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ ﴾ (۱۶:۷۸) اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کی شرمگاہوں سے باہر نکالا۔

بُظُوْرِ بَظَارَۃ کی جمع ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں کے لٹکے ہوئے گوشت کے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کے اوپر ابھرے ہوئے گوشت کو بَظَارَۃَ کہا جاتا ہے۔ پھر مجازاً بَضْعٌ کی طرح شرمگاہ پر یہ لفظ بولا جاتا

ب ع ث

اَلْبَعْثُ: (ف) اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھیجنا کے ہیں اور اِنْبَعَثَ دراصل مطاوع ہے، بَعَثَ کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں، مثلاً بَعَثْتُ الْبَعِیْرَ کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینے کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کر کے محشر طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ ﴾ (۶:۳۶) اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔

﴿ یَوْمَ یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا ﴾ (۵۸:۶) جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ (۶۴:۷) جولوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ (۳۱:۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے۔ پس بَعْثٌ دو قسم پر ہے اوّل: بعث بَشَرِیْ یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے، جیسے بَعْثُ الْبَعِيْرِ (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) اور بَعْثُ الْاِنْسَانِ فِىْ حَاجَةٍ (کسی کو کسی کام کے لیے بھیجنا)

دوم: بعث الٰہی یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اعیان، اجناس اور انواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر اس نے کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔ دوم: مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرما دیتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم مثل دوسرے انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:

﴿ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ ﴾ (۳۰:۵۶) اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔ بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ: ﴿ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ ﴾ (۵:۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔ میں بَعَثَ بمعنی قَيَّضَ ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ﴾ (۱۶:۳۶) اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں؛ ﴿ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا ﴾ (۴۴:۳۳) فرمایا ہے اور آیت: ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴾ (۱۸:۱۲) پھر ان کو جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ میں بَعَثْنَا کے معنی صرف (نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

﴿ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ﴾ (۱۶:۸۹) اور اس دن کو یاد کرو، جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ ﴾ (۶:۶۵) کہہ دو کہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے .... عذاب بھیجے۔

﴿ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ﴾ (۲:۲۵۹) تو خدا نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ ﴾ (۶:۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے، پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔ میں نیند کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک

طرح کی موت ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلٰـكِـنْ كَرِهَ اللّٰـهُ انْبِعَـاثَهُمْ ﴾ (۴۶:۹) لیکن خدا نے ان کا اٹھنا (اور نکلنا) پسند نہ کیا۔ میں انبعـــاث کے معنی جانے کے ہیں۔

ب ع ث ر

آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴾ (۴:۸۲) میں بُعْثِرَتْ کے معنی قبروں کی مٹی کو الٹ پلٹ کرنے اور مردوں کو اٹھانے کے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک رباعی اور خماسی دو ثلاثی مادوں سے مل کر بنتے ہیں ان کے خیال میں "بُـعْثِـرَ" بُعِـثَ اور اُثِیْـرَ سے مل کر بنا ہے، جیسا کہ تَهَـلَّلَ وَبَسْمَلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور بِسْمِ اللّٰه سے بنے ہیں۔ اور اس میں کچھ بُعد نہیں ہے کیونکہ اَلْبَـعْثَـرَة میں ان دونوں فعلوں کے معنی موجود ہیں۔

ب ع د

اَلْبُعْد: کے معنی دوری کے ہیں یہ قُرْب کی ضد ہے اور ان کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ ایک ہی جگہ کے اعتبار سے ایک کو قریب اور دوسری کو بعید کہا جاتا ہے۔

محسوسات میں تو ان کا استعمال بکثرت ہوتا رہتا ہے مگر کبھی کبھی معانی کے لیے بھی آجاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ ضَلُّوْا ضَلَالًا بَعِيْدًا ﴾ (۳۶:۴) وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر دور جا پڑے۔

﴿ اُولٰـئِكَ يُـنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴾ (۴۴:۴۱) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

بَعُدَ (ک) فَهُوَ بَعِيْدٌ دور ہونا، جیسے فرمایا: ﴿ وَمَاهِيَ مِـنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ (۸۳:۱۱) اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں ہے۔

لیکن بَـعِدَ (س) کے معنی مرنا کے ہیں۔ اور عموماً اَلْبَـعَدُ ہلاک ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ كَمَا بَـعِـدَتْ ثَـمُـوْدُ ﴾ (۹۵:۱۱) جیسے ثمود تباہ ہو گئے۔ اور اَلْبُعْد وَالْبَعَدُ کبھی قرب کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے [1] بسیط

(۵۸) فِي الادنىٰ وَفِي الْبَعَدِ

یعنی ہر قریب و بعید پر اس کے احسانات موجود ہیں اور کبھی یہ دونوں (اَلْبَـعْـد وَالْبُـعْـد) ہلاکت کے معنی میں بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ انہی معنی میں فرمایا: ﴿ فَبُـعْـدًا لِّـلْـقَـوْمِ الـظّٰلِمِيْنَ ﴾ (۴۱:۲۳) پس ظالم لوگوں پر لعنت ہے۔

﴿ فَبُـعْـدًا لِّـقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (۴۴:۲۳) پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان پر لعنت۔

اور آیت کریمہ:

﴿ بَـلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالـضَّلٰلِ الْبَـعِـيْـدِ ﴾ (۸:۳۴) بات یہ ہے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ آفت اور پرلے درجے کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

---

[1] قاله النابغة يمدح النعمان وتكملته : فتلك تبلغي النعمان ان له فضلا على الناس .... والبيت في العقد الثمين ۷ وشرح العشر للتبريزى ۲۹۵ والخزانة (۱: ۵۲۲ طبعة بولاق) والسيوطى ۲۸ وديوانة ۲۹ واللسان والتاج (بعد) في رواية الصحاح والمحكم (بعد) في الادنين والبُعد وايضاً مثله بعيد بن الابرص وتكملته : اولاتوك بحميع لاكفاء له ـ قوم هم القوم راجع ديوان ابن الابرص مع شرح جالس طبعة لندن ۱۹۱۳ھ).

میں اَلضَّلَال البعید سے ویسی گمراہی مراد ہے جس کے بعد ہدایت کی طرف لوٹنا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص شاہراہ سے بہت دور چلا جائے جس کے بعد دوبارہ اس کے شاہراہ کی طرف لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴾ (۸۹:۱۱) اور لوط علیہ السلام کی قوم (تو) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی گمراہی میں ان جیسے ہو، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ ان کی طرح تم پر بھی عذاب آ جائے۔
بَعْدُ: یہ قَبْلُ کی ضد ہے، لہٰذا قبل کی بحث میں اس کی جمیع انواع بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ب ع ر

اَلْبَعِيْرُ: اونٹ (جنس) لفظ انسان کی طرح مذکر و مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے، اس کی جمع اَبْعِرَةٌ وَاَبَاعِرُ وَبُعْرَان آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ ﴾ (۷۲:۱۲) اور جو شخص اس کو لے آئے اس کے لیے بارِ شتر (انعام) اَلْبَعْرُ۔ اونٹ کی مینگنی۔ اَلْمُبْعَرُ (جائے بعر) اَلْمِبْعَارُ: بہت زیادہ مینگنی کرنے والا اونٹ۔

ب ع ض

بَعْضُ الشَّیْءِ: ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لیے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جیسے: بَعْضُهٗ وَكُلُّهٗ اس کی جمع اَبْعَاضٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:
﴿ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ (۳۶:۲) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا ﴾ (۱۲۹:۶) اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے، ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ﴿ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ (۲۵:۲۹) اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور بَعَّضْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو حصوں میں تقسیم کر دینا ہیں، جیسے جَزَّءْتُهٗ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ﴾ (۶۳:۴۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم کو سمجھا دوں۔
میں ابوعبیدہ نے کہا ہے [1] کہ یہاں بعض بمعنی کل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (کامل)

(۵۹) اَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا

---

[1] راجع مجازہا: ج ۱ ص ۹۴ فانه قال: وبعض یکون شیأ من الشیئی ویکون کل الشئی قال لبید.......... لکن تحت آیة ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم (۳-۵۰) ثم قال تحت الآیة (۴۳-۶۳) البحوثة: البعض ههنا الکل قال لبید.......... لان الموت لایعتلق بعض النفوس دون بعض وابو عبیدة معمر بن المثنی ۱۱۰- وتاریخ وفاتیه (۹۶/۴) مختلف فیه الاغلب ۲۱۰-۲۱۳ کان من معاصری تلامذة الخلیل لم یتأثر به تاثر مباشراً کان ابواه من یهود فارس وکان مولی لیتم قریش واخذ فی شبیبة عن ابی عمرو بن العلاء ویونس بن حبیب، اتصل بالخوارج (مقالات الاسلامیین الاشعری، ۱: ۲۰ اوالبیان للجاحظ ۱: ۳۲ کان ضعیفاً فی علم النحو (مقدمة تهذیب الازهری) صنف کتابافی مثالب العرب نقماً منهم عیب اعیب علیه نسبته العجم فکرهه الناس حتی لم یحضر جنازته احد من البصریین (راجع ضحی الاسلام لاحمدامین: ۳۰۴/۲ مع المراجع وبر کلن اومجازه، فی تفسیر القران مشهور وعلیه تعلیقات للاصمعی (الارشاد لیاقوت ۱۶۷/۷-۱۶۸)

[2] قاله لبید بن ربیعة وصدره تراك امکنه ازالم ارضها .... وفی روایة "او یعتلق" بدل اویرتبط والبیت فی معلقته فی شرح العشر ۱۵۵ والقرطبی ۴: ۹۶ وشواهد الکشاف ۲۹۷ والمحکم واللسان (بعض) ومجالس ثعلب ۳۶۸،۵۰ والبحر ۲: ۴۶۸ /۱۷: ۴۶۱ وذیل الجامع الکبیر ۲۷ والزوزنی ۹ والشطر ایضاً فی الصاحبی ۲۵۱.

یا نفوس کو ان کی موت پالے۔

لیکن یہ ابوعبیدہ کی کوتاہ بینی ہے ❶ کیونکہ مسائل شریعت کی چار قسمیں ہیں۔ایک قسم وہ ہے جس کا بیان کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے ایسی چیز کا بیان کرنا صاحب شریعت کے لیے جائز نہیں ہوتا۔ جیسے قیامت یا موت کا وقت کہ اس کے بتا دینے میں مفسدہ لازم آتا ہے۔

(۲) اور بعض چیزیں محض عقلی ہوتی ہیں جن کا ادراک نبی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت جو کہ آسمان و زمین کی خلق میں پائی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر فرض نہیں ہوتا، اسی لیے قرآن پاک نے ان چیزوں کی معرفت عقول کے سپرد کی ہے، جیسا کہ آیت: ﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۱۰:۱۰۱) (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ اور آیت: ﴿ اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا ﴾ (۳۰:۸) کیا انھوں نے غور نہیں کیا۔

(۳) بعض چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) بعض احکام فروعی ہوتے ہیں جو اصول شریعت سے مستنبط ہو سکتے ہیں، جس کا بیان کرنا نبی پر واجب نہیں تو صاحب شریعت کو اختیار ہے کہ حسب موقع اسے بیان فرما دے یا سکوت اختیار کرے زیر بحث آیت میں اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ بَعْض سے کل مختلف فیہا اشیا مراد نہیں ہیں۔

پھر جس شعر سے استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے ❷ یعنی مگر یہ کہ مجھے موت پالے۔ لیکن شاعر نے تصریح کی بجائے تعریض سے کام لیا ہے، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ موت سے دور بھاگتا ہے۔

خلیل نے کہا ہے کہ رَأَیْتُ غِربَانًا تَبْتَعِضُ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں اَلْبَعُوْض: (مچھر) یہ بھی لفظ بعض سے بنا ہے۔ مچھر چونکہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت صغیر الجسم ہوتا ہے اس لیے اسے بَعُوْضٌ کہا جاتا ہے۔

ب ع ل

اَلْبَعْلُ: کے معنی شوہر کے ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ﴾ (۱۱:۷۲) اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں۔

اس کی جمع بُعُوْلَۃٌ آتی ہے، جیسے فَحلٌ وَفَحُوْلَۃٌ فرمایا: ﴿ وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ ﴾ (۲:۲۲۸) اور ان کے خاوند......ان کو زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اور اس تصور کے پیش نظر کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ اسے عورت کا منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ﴾ (۴:۳۴) میں مذکور ہے بنابریں ہر وہ چیز جو دوسری اشیاء پر فوقیت رکھتی

---

❶ ورد علیہ ایضاً الطبری ۲۵/۵۰) والمبرد والنحاس فی معانیہ (۴۲آ) وابن سیدہ فی المحکم (بعض) والطبری اکثر مایرد علی ابی عبیدۃ تفسیرہ ولنا مقالۃ (ابو عبیدۃ والطبری فی تفسیر الغریب (الامام البخاری) وقد اشبعنا الکلام فی الرد علی من یلزم البخاری انہ قلدابا عبیدۃ فی تفسیر الغریب .

❷ راجع المبرد والقرطبی ۴: ۹۶ شایع اباعبیدۃ وجوزان یکون بعض بمعنیٰ کل .

ہو، اسے بَعْلٌ کہنے لگے ہیں چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے، بَعْلٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے بلند اور برتر سمجھتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ﴾ (۳۷:۱۲۵) کیا تم بعل کو پکارتے اور (پوجتے) ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو۔ محاورہ ہے: اَتَانَا بَعْلُ هٰذِهِ الدَّابَّةِ اس دابہ کا مالک ہمارے پاس آیا۔

اَلْبَعْلُ: (ایضاً) (۱) بلند زمین (۲) فحل نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا سردار ❶ (۳) ہر وہ بڑا درخت جو اپنی جڑوں کے ذریعہ از خود زمین سے پانی جذب کر لیتا ہو اور اسے آبیاری کی ضرورت نہ ہو۔ حدیث پاک میں ہے ❷ فِیْمَا سُقِیَ بَعْلًا الْعُشْرُ یعنی بَعل میں عشر (۱/۱۰) ہے اور جب عالی کی اپنی مستولی علیہ ماتحت پر گرفت بھاری اور گراں ہو تو کہا جاتا ہے۔ اَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلٰی اَهْلِهٖ یعنی فلاں اپنے علو کی وجہ اپنے اہل پر ثقیل ہے۔ ❸ اور لفظ اَلْبَعْلُ سے مُبَاعَلَةٌ وَبِعَالٌ (مصدر مفاعلہ) بنایا گیا ہے جس کے معنی (کنایۃً) مجامعت کے ہوتے ہیں ❹ محاورہ ہے: بَعَلَ الرَّجُلُ (ن) بَعُوْلَةً وَاسْتَبْعَلَ فَهُوَ بَعْلٌ وَمُسْتَبْعِلٌ: شوہر ہونا۔

اِسْتَبْعَلَ النَّخْلُ: کھجور کا تناور ہو جانا۔ اور بَعْلَ کھجور سے ایک جگہ پر قیام اور ثبات کے معنی کا تصور کر کے ہر اس آدمی کو جو اپنے معاملہ میں حیرت کی بنا پر ایک جگہ پر کھڑا رہے اس کے متعلق بَعِلَ فُلَانٌ بِاَمْرِهٖ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے معاملہ میں حیران ہے، جیسا کہ اس شخص کے متعلق جو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہے۔ مَا هُوَ اِلَّا شَجَرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

ب غ ت

اَلْبَغْتُ: (ف) کے معنی کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے ظاہر ہو جانا کے ہیں، جہاں سے اس کے ظہور کا گمان تک بھی نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ (۷:۱۸۷) اور ناگہاں تم پر آ جائے گی۔ ﴿اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ﴾ (۱۲:۱۰۷) یا ان پر ناگہاں قیامت آ جائے۔

بَغَتَ كَذَا فَهُوَ بَاغِتٌ. کسی چیز کا ناگہاں آ پہنچنا، شاعر نے کہا ہے ❺

(۶۰) اِذَا بَغَتَتْ اَشْيَاءُ قَدْ كَانَ مِثْلُهَا
قَدِيْمًا فَلَا تَعْتَدَّهَا بَغْتَاتٍ

ب غ ض

اَلْبُغْضُ: کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل کا تنفر اور

---

❶ وفی اللسان فحل النحل وکذافی اضداد ابی الطیب ۶۸۔۷۳۔
❷ نصب بعلاً علی الحال کذافی الفائق ۱: ۵۵ والحدیث رواہ ابن جریر عن معاذ ولفظہ: اوسقی بعلاً العشر (کنزالعمال: ۲۳۶۸/۶) وفی روایۃ النسائی وابی داؤد وابن ماجۃ من حدیث ابن عمرؓ اوکان بعلاً العشر وفی بعض الروایات عثریا بدل بعلاً راجع غریب ابی عبید ۱: ۶۶۔
❸ کذافی الفائق ۱: ۵۵۔
❹ ومنہ الحدیث ایام التشریق ایام اکل وشرب وبعال ای ملاعبۃ الرجل اھلہ سیأتی تخریجہ (عود)۔
❺ قالہ ابن الرومی یحث علی تصور المصائب والاستعداد لھا والبیت فی محاضرات المؤلف فی خمسۃ ابیات وقبلہ ولاعوفصت فی البلویٰ وقد رأت عظات من الایام بعد عظات راجع دیوانی ابن الرومی وفی المطبوع (فی جمیع الطبعات) بعث بالعین المھملۃ والثاء المثلثہ مصحف۔

بیزار ہونا کے ہیں۔ یہ حُبّ کی ضد ہے۔ جس کے معنی کسی پسندیدہ چیز کی طرف دل کا منجذب ہونا کے ہیں، کہا جاتا ہے۔ بَغِضَ (س) اَلشَّیْءُ بُغْضًا وَبَغَضْتُهٗ (ن) بَغْضَاءَ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ ﴾ (۶۴:۵) اور ہم نے ان کے باہم عداوت اور بغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔

﴿ إِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ ﴾ (۹۱:۵) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے۔ اور حدیث پاک میں ہے ❶ (۳۷) اِنَّ اللّٰهَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ وَالْمُتَفَحِّشَ. بیشک اللہ تعالیٰ بدکلام گالی دینے والے سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں بغض کا لفظ بول کر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ باری تعالیٰ اس سے اپنا فیضان اور توفیق احسان روک لیتا ہے۔ ❷

ب غ ل

اَلْبَغْلُ: (خچر) وہ جانور جو گدھے اور گھوڑی کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ (والجمع بغالة) قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ ﴾ (۸:۱۶) اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے۔

تَبَغَّلَ الْبَعِیْرُ: اونٹ کا خچر کی طرح تیز چلنا۔ کبھی خچر کی شرارت اور خباثت کے پیش نظر کمینے شخص کو بھی بَغْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

ب غ ی

اَلْبَغْیُ: کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے یا نہ۔ اور بَغْیٌ کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے، کہا جاتا ہے۔

بَغَیْتُ الشَّیْءَ وَابْتَغَیْتُهٗ کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ ﴾ (۴۸:۹) یہ پہلے بھی طالب فساد رہے ہیں۔

﴿ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ﴾ (۴۷:۹) تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے۔

بَغْیٌ: دو قسم پر ہے۔ محمود یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بجالانا۔

۲۔ مذموم۔ یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❸ (۳۸) اَلْحَقُّ بَیِّنٌ وَالْبَاطِلُ بَیِّنٌ وَبَیْنَ ذٰلِكَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰی اَوْشَكَ اَنْ

---

❶ الحدیث فی (حم الساعة) بدون الواو وفی روایة لایحب (حل عن جابر و (عن عائشة) وفی (مسلم عن عائشة) لایحب الفحش والتفحش وفی (حم عن الساعة ایضاً) کل فاحش متفحش (ای بدون اللام والواو والاحادیث فی ذم الفحش کثیرة راجع الکنز للمتقی (۳: ۳۳۹۔۳۴۰).

❷ سقط لفظ المنع من المطبوع.

❸ والمعروف فی الروایة الحلال بین والحرام بین راجع (ق ۴، طس ۔عن عمر۔ق ہ ك عن سلمان) الفتح الکبیر ۲: ۸۲۔۸۳).

یَقَعَ فِیْہِ. حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں اور جو جانور چراگاہ کے اردگرد کھائے گا، کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے اور چونکہ بغی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی، اس لیے آیت کریمہ: ﴿ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ﴾ (۴۲:۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ میں عقوبۃ کو بغی بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اَبْغَیْتُكَ کسی شے کی طلب میں مدد کرنا۔ بَغَی الْجُرْحُ زخم کا بہت زیادہ بگڑ جانا۔ بَغَتِ الْمَرْءَۃُ: عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور زنا کو بَغْیٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی حدود عفت سے تجاوز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ﴾ (۲۴:۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ بَغَتِ السَّمَآءُ: بادل کا ضرورت سے زیادہ برسنا اور بَغْیٌ کے معنی تکبر کرنا بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ ہر امر کے متعلق استعمال ہوتا ہے (گو لغت میں بَغْیٌ کا لفظ محمود اور مذموم دونوں قسم کے تجاوز پر بولا جاتا ہے مگر قرآن پاک میں اکثر جگہ معنی مذموم کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا:

﴿ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ﴾ (۱۰:۲۳) تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

﴿ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ ﴾ (۱۰:۲۳) تمہاری شرارت کا وبال تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔

﴿ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْہِ لَیَنْصُرَنَّہُ اللّٰہُ ﴾ (۲۲:۶۰) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔

﴿ اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْھِمْ ﴾ (۲۸:۷۶) قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا۔

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ ﴾ (۴۹:۹) اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ﴾ (۲:۱۷۳) (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد متعین سے آگے نہ بڑھے۔ امام حسنؒ [1] نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ نہ تو محض لذت کے لیے کھائے اور نہ ہی سدرمق (یعنی ضرورت سے) تجاوز کرے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے [2] کہ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے

---

[1] راجع بقول الحسن (الطبری ۲ : ۸۳) والحسن بن یسار البصری ابو سعید التابعی احدالعلماء الفقهاء فی البصرة وعلیه کتاب لاحسان عباس (الحسن البصری) ولقاءه لعلیؓ والباسه الخرقة غیر محقق انکره الشاه ولی الله والامیر القنوجی واثبته صاحب "فخر الحسن" وفی الجملہ ان الباس الخرقة بدعة حقیقته فی حواشی مآثر الکرام (فارسی، بلجرامی) فراجعه (راجع التراجم الحسن تهذیب ومیزان الاعتدال ۱ : ۲۵٤ وامالی المرتضیٰ ۱ : ۱۰٦.

[2] وقول مجاهد هذا ذکر الشوکانی فی الفتح ۱ : ۱۷۰ وفی اکل المضطر المیتة ومال الغیر اختلاف بین الفقهاء ولم ینصب من انکر اکل مال الغیر مطلقاً راجع القرطبی وایضاً ابن کثیر وامامجاهد فهو ابن جبر المکی (۲۱ـ۱۰٤) تلمیذ ابن عباس فی التفسیر قال الذهبی شیخ القراء والمفسرین وهو وان من الثقات لکن لایعتمد علی تفسیره لانه ینقل عن اهل الکتاب وراجع طبقات الفقهاء ۵ والارشاد ٦ : ۲٤۲ ومیزان الاعتدال ۳ / ۹ والمجمع بین رجال الصحیحین ۵۱۰ راجع الاعلام.

یہ معنی ہیں بشرطیکہ وہ نہ تو امام وقت سے باغی ہو اور نہ ہی معصیت کا ارتکاب کر کے راہِ حق سے تجاوز کرنے والا ہو۔
اَلْاِبْتِغَاءُ: یہ خاص کر کوشش کے ساتھ کسی چیز کو طلب کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محمود ہوگی (ورنہ مذموم) چنانچہ فرمایا:
﴿ اِبْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ (۱۷:۲۸) اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں۔
﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ﴾ (۹۲:۲۰) بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔ اور یَنْبَغِی (انفعال) بَغی کا مطاوع آتا ہے اور یَنْبَغِی اَنْ یَّکُوْنَ کَذا کا محاورہ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اس شے کے متعلق جو کسی فعل کے لیے مسخر ہو جیسے اَلنَّارُ یَنْبَغِی اَنْ تُحْرِقَ الثَّوْبَ یعنی کپڑے کو جلا ڈالنا آگ کا خاصہ ہے۔ (۲) یہ کہ وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے لیے ایسا کرنا مناسب اور زیبا ہے، جیسے: فُلَانٌ یَنْبَغِی اَنْ یُّعْطِیَ لِکَرَمِہٖ کہ فلاں کے لیے اپنے کرم کی وجہ سے بخشش کرنا زیبا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ ﴾ (۳۶:۶۹) اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھلائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے۔
پہلے معنی پر محمول ہے، یعنی نہ تو آنحضرت ﷺ فطرتاً شاعر ہیں۔ اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ آپؐ کی زبان پر شعر جاری نہ ہوتا تھا۔ اور آیت کریمہ:
﴿ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ﴾ (۳۸:۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ (دوسرے معنی پر محمول ہے۔ یعنی میرے بعد وہ سلطنت کسی کو میسر نہ ہو)

ب ق ر

اَلْبَقَرُ: (اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بَقَرَۃٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ﴾ (۲:۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ ﴿ بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ﴾ (۲:۶۸) کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ ﴿ بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ﴾ (۲:۶۹) کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہے۔
بَقَرَۃ کی جمع بَاقِرٌ وَبَقِیْرٌ (بروزن حکیم) آتی ہے جیسے حَامِلٌ وَحَمِیْلٌ اور بعض کے نزدیک اس کی جمع بَیْقُوْرٌ بھی آتی ہے اور بیل کو ثَوْرٌ کہا جاتا ہے، جیسے: نَاقَۃٌ وَجَمَلٌ وَرَجُلٌ وَامْرَءَۃٌ اور بیل چونکہ کھیتی باڑی کے کام آتا ہے اس لیے زمین کو پھاڑنے اور جوتنے کے لیے بَقَرَ الْاَرْضَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لیے ہر وسیع شگاف کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، چنانچہ محاورہ ہے۔ بَقَرْتُ بَطْنَہٗ میں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقر کا لقب دیا گیا ہے [1] کیونکہ ان کو دقائق و رموز علمیہ کے متعلق گہری تحقیق حاصل تھی۔ بَیْقَرَ الرَّجُلُ فِی الْمَالِ وَفِی

---

[1] محمد بن علی زین العابدین الحسین ابو جعفر الباقر (۵۷ھ ۱۴۴) خامس الأمة الاثنی عشر عند الامامیة وله فی العلم وتفسیر القرآن آراء راجع کتاب اخبار ابی جعفر الباقر للجلودی (۳۰۲ھ) وتذکرة الحفاظ ۱:۱۱۷ والذریعة ۱:۳۱۵ ونزهة الجلیس ۲:۲۳ ومنهاج السنة ۲:۱۱۴ و۱۲۳ والیعقوبی ۳:۶۰.

غَيْرِهٖ کسی کا بہت زیادہ مال دار ہونا۔ بَيْقَرَ فِيْ سَفَرِهٖ ملک در ملک پھرنا۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۶۱) الاهل اتاها والحوادث جُمَّةٌ
بان امرئ القيس يهلك بيقرا

کیا اسے یہ خبر ملی ہے کہ زمانہ کی بوقلمونیوں کی وجہ سے امرئ القیس بن تملک دربدر دھکے کھا رہا ہے۔ بَقَرَ الصِّبْيَانُ بچوں کا بُقَّيْرىٰ کھیل کھیلنا یہ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں ریت کا ڈھیر لگا کر اس کے آس پاس گڑھے کھود دیتے ہیں (فارسی میں اسے کوہا موئی کہا جاتا ہے)

اَلْبَيْقَرَان: ایک قسم کے گھاس کا نام ہے کیونکہ وہ جب اگتا ہے تو زمین میں شگاف ڈال دیتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔

ب ق ل

قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا﴾ (۲:۶۱) کہ ترکاری اور ککڑی بَقْل: ان سبزیوں کو کہتے ہیں، جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔

اس سے فعل مشتق کر کے بَقَلَ بمعنی نَبَتَ استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بَقَلَ وَجْهُ الصَّبِّي کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت ❷ کے نزدیک بَقَلَ نَابُ الْبَعِيْرِ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کیلے نکل آئے اَبْقَلَ الْمَكَانُ فَهُوَ مُبْقِلٌ: جگہ کا سرسبز ہونا۔ بَقَلْتُ الْبَقْلَ: میں نے سبزی کاٹی اَلْمَبْقَلَةُ: (ظرف) سبزیوں کی جگہ۔

ب ق ی

اَلْبَقَاءُ: کے معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں یہ فناء کی ضد ہے۔ یہ باب بَقِيَ (س) يَبْقَى بَقَاءً ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا باب بَقٰى (ض) بَقْيًا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے ❸

(۳۹) بَقَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ یعنی ہم آنحضرت ﷺ کے منتظر رہے اور کافی عرصہ تک آپ کی نگہبانی میں بیٹھے رہے۔ اَلْبَاقِيْ: (صفت) دو قسم پر ہے ایک الْبَاقِيْ بِنَفْسِهٖ جو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہے اور اس پر کبھی فنا طاری نہ ہو اس معنی میں یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوم: الباقي بغيرهٖ اس میں سب ماسوی اللہ داخل ہیں کہ ان پر فناء اور تغیر کا طاری ہونا صحیح ہے۔ اَلْبَاقِيْ بِاللّٰهِ بھی دو

---

❶ قاله امرء القيس راجع الطبري ۷: ۱۳۹ ومعاني القران للفراء والستة ۱۳۰ وديوانه ٤٦ (ضعة سندوبي والسمط ٤٠ والاقتضاب ٤٧٧ وتهذيب الالفاظ ٤٨٧ والبحر ۳: ۳۵۷ والبلدان (اسم وبيقر) وشرح السبع لابن الانباري ٤٥٩ واللسان (بيقر) والاغاني ٨: ٦١ والمعاني ٨٧٥ وفي بعض الرويات بن تملك بدل يهلك وهي بنت عمربن زبيدام امرئ القيس.

❷ هو ابو يوسف يعقوب بن اسحاق بن السكيت تأدب على الكسائي والفراء واخذ عن الاصمعي وابي عبيدة البصري واشتهر بمصنفاته وكان مؤدباً لابن المعتز توفي في رجب ٢٤٣-٢٤٤ھ صنف كتاب اصلاح المنطق والالفاظ وكتاب المقصود والممدود والقلب والابدال والاضداد وقد انشرت راجع لتراجمه معجم الادباء ٢٠/٥٢ والبغيه ٤١٨-٤١٩ شذرات ٢/١٠٦ وابن خلكان ٧٩٨ والارشاد ٧/٣٠٠-٣٠٢ واليافعي ٢/١٤٧-١٤٩.

❸ وتمامه: ذات ليلة في صلاة العشاء والحديث في الكشاف ٢: ٣٧ والفائق (١: ٥٧) وابي داؤد بين حديث معاذ بن جبل (تخريج الكشاف ٨٨رقم ١٩٩.

قسم پر ہے۔ایک وہ جو بِذَاتِہٖ جب تک اللہ کی مشیت ہو، باقی رہے جیسے اجرام سماویہ۔دوم: وہ جس کے افراد واجزاء تو تغیر پذیر ہوں مگر اس کی نوع یا جنس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو۔جیسے انسان وحیوان۔اسی طرح آخرت میں بھی بعض اشیاء بِشَخْصِہٖ باقی رہیں گی۔جیسے اہل جنت کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔جیسے فرمایا:

﴿ خَالِدِیْنَ ﴾ (۱۴:۴) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور بعض چیزیں صرف جنس ونوع کے اعتبار سے باقی رہیں گی۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ ❶

(۴۰)ان اثمار اهل الجنة يقطفها اهلها ويأكلونها ثـم تخلف مكانها مثلها. کہ ثمار جنت کو اہل جنت چن کر کھاتے رہیں گے اور ان کی جگہ نئے پھل پیدا ہوتے رہیں گے، چونکہ آخرت کی تمام اشیاء دائمی ہیں اس لیے فرمایا:﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ (۲۸:۶۰) اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ ﴾ (۱۸:۴۶) میں وہ تمام اذکار واعمال صالحہ داخل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہے گا۔بعض نے ان سے پانچ نمازیں مراد لی ہیں۔اور بعض نے اس سے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تسبیح وتحمید مراد لی ہے۔لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس سے رضائے الٰہی مقصود ہو یہی معنی آیت کریمہ:

﴿ بَقِيَّةُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (۱۱:۸۶) میں بَقِيَّةُ اللّٰهِ کے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ:

﴿ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ﴾ (۶۹:۸) بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔میں بَاقِيَةٌ کا موصوف جَمَاعة یافِعْلَةٌ محذوف ہے یعنی باقی رہنے والی جماعت یا ان کا کوئی فعل جو باقی رہا ہو۔اور بعض کے نزدیک بَاقِيَةٌ بمعنی بَقِيَّةٌ ہے،ان کا قول ہے کہ بعض مصادر فاعل کے وزن پر آتے ہیں اور بعض مفعول کے وزن پر لیکن پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ❸

ب ک ک

بَكَّةُ: مجاہدؒ سے منقول ہے کہ یہ اصل میں مَكَّةُ ہے اوراس میں باءمیم سے مبدل ہے،جیسا کہ: سَبَدَ رَاْسَهٗ وَسَمَدَهٗ وَضَرْبٌ لَازِبٌ .وَلَازِمٌ میں ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ﴾ (۳:۹۶) پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے، بابرکت۔

بعض کا قول ہے کہ مکہ سے اندروں مکۃ مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔اور بعض نے بیت اللہ کے اسماء سے شمار کیا ہے اور بعض نے مطاف (طواف گاہ) سے تفسیر کی ہے۔اور یا تو تَبَاكٌّ سے ماخوذ ہے، جس

---

❶ في الطبراني والبزار بمعناه عن ثوبان راجع مجمع الزوائد: ۱۰/ ۴۱۴).

❷ راجع لاقوالهم ابن كثير ۳: ۸۵ واختار العموم ابن جرير الطبرى وايضاً الكشاف ۲: ۲۷۵ واختلف ايضاً فى الآية (۲: ۲۴۸) راجع البغوى ۱: ۲۱۶) وفى الآية اولوبقية (۱۱: ۱۱۶) المراد بها اهل الفضل (بيضاوى ۳۳۸۱۱).

❸ اوله ابوعبيدة بالمصدر فرد عليه المؤلف واكثر مايرد عليه.

کے معنی ازدحام کے ہیں اور وہاں چونکہ طواف کے لیے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لیے اس کو بکہ کہا گیا ہے۔ [1] بعض کہتے ہیں کہ بَــكَّةَ بَكٌّ (ن) سے مشتق ہے، جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پھاڑ ڈالنے کے ہیں چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد وظلم پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے، اس لیے اسے اس نام سے پکارا گیا ہے۔

ب ک ر

اس باب میں اصل کلمہ بُكْرَةٌ ہے، جس کے معنی دن کے ابتدائی حصہ کے ہیں، پھر اس سے صیغہ فعل مشتق کر کے کہا جاتا ہے۔ بَكَرَ (ن) فُلَانٌ بُكُوْرًا کسی کام کو صبح سویرے نکلنا۔ اَلْبَكُوْرُ (صیغہ مبالغہ) بہت سویرے جانے والا۔

بَكَّرَ ...... فِيْ حَاجَةٍ وَابْتَكَرَ وَبَاكَرَ مُبَاكَرَةً. صبح سویرے کسی کام کے لیے جانا اور بُــكْــرَةٌ (دن کا پہلا حصہ) چونکہ دن کے باقی حصہ پر متقدم ہوتا ہے، اس لیے اس سے شتابی کے معنی لے کر ہر اس شخص کے متعلق بَــكِرَ (س) فعل استعمال ہوتا ہے، جو کسی معاملہ میں جلد بازی سے کام لے شاعر نے کہا ہے [2] ع (الکامل)

(۶۲) بَكِرَتْ تَلُوْمُكَ بَعْدَ وَهْنٍ فِي النَّدٰى
بُسْلٌ عَلَيْكَ مَلَامَتِيْ وَعِتَابِيْ

وہ کچھ عرصہ کے بعد جلدی سے سخاوت پر ملامت کرنے لگی میں نے کہا کہ تم پر مجھے ملامت اور عتاب کرنا حرام ہے۔

بِــكْــرٌ: پہلا بچہ اور جب ماں باپ کے پہلا بچہ پیدا ہو تو احتراما انہیں بِکْران کہا جاتا ہے جیسا کہ بیت اللہ بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ثواب الٰہی اور ان غیر فانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے تیار کی ہیں۔ [3] جس کی طرف آیت کریمہ:

﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ (۲۹:۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے۔ میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [4] ع (رجز)

(۶۳) يَا بِكْرَ بِكْرَيْنِ وَيَا خِلْبَ الْكَبِدِ

اے والدین کے اکلوتے بیٹے اور جگر گوشے۔

پس آیت کریمہ:

﴿ لَا فَــارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ﴾ (۲:۶۸) نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ میں بِــكْــرٌ سے نوجوان گائے مراد ہے جس نے

---

[1] لان الباء والميم من حروف الابدال راجع ابدال والى الطيب. قارن مجاز القران لابى عبيدة (۱ : ۷۹۷) وغريب القران للسجستانى ۳۵ واللسان (بكر) وثلاثون الاربعة والاشتقاق فى الفتح للشوكانى (۱ : ۳۶۲).

[2] البيت لضمرة بن ضمرة النهشلى انشده ابوزيد التوزى وابو حاتم فى ان البسل من الاضداد والبيت فى النوادر لابى زيد ۲ والسمط ۹۲۲ والامالى ۲ : ۲۷۹) والدرة مع شرح الخفاجى ۱۹۳ والاقتضاب ۴۲۸ وفيه ان لفظة بكرقديأتى مثلاللتعجيل كمافى هذاالبيت وفى رواية الكامل ۸۴۲ هبت بدل بكرت والبيت فى الفاضل ۷۹۱ والاضداد لابى حاتم رقم ۱۴۳ص ۱۰۳ ولباب الآداب وطبقات السيرانى ۵۷ والوحشيات رقم ۲۴فى خمسة ابيات والبيت اولها والمجالس۴۶۸ وابدال ابى الطيب (۲ : ۵۳۶) وفى روايته ام عمروبدل بعدهن وبعده : أأضرها وبنى عمرو ساغب فكفاك من ابته على وعاب راجع اضداد للجستانى وابن الانبارى ۶۲ واضداد ابى الطيب ۳۲واعراب ثلاثين لابن خالويه واللسان (بسل) والطبرى .

[3] ولعله اشارة الى تفسير الآية ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيا(۱۹ـ۱۱) وههنا سقط والله اعلم .

[4] قاله الراجز وبعده : اصبحت منى كذراع من عضد ـ والشطر فى اللسان (بكر) وفى الصحاح بغير عزو (بكر) والبحردا: ۲۴۸) واضداد لابن الانبارى ۲۳۴۶ واضدادابى الطيب ۹۱ وامالى القالى (۱ : ۲۴) .

ابھی تک کوئی بچہ نہ دیا ہو۔اور ثَیِّب کے اعتبار سے دوشیزہ کو بھی بِکْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے مجامعت کے لیے ثیب پر ترجیح دی جاتی ہے۔بِکْرٌ کی جمع اَبْکَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا ﴾ (۵۶:۳۵،۳۶) ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔

اَلْبَکَرَۃُ چھوٹی سی چرخی۔کیونکہ وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہے۔

ب ک م

اَلْاَبْکَمُ ، پیدائشی گونگا اور اخرس عام گونگے کو کہتے ہیں،لہٰذا اَبْکَمْ عام اور اخرس خاص ہے،قرآن میں ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُھُمَآ اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ ﴾ (۱۶:۷۶) اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گنگا اور (دوسرے کی ملک) ہے (بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور اَبْکَمَ کی جمع بُکْمٌ آتی ہے،چنانچہ فرمایا:

﴿ صُمٌّ بُکْمٌ ﴾ (۲:۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اور جو شخص ضعف عقلی کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بَکَمَ عَنِ الْکَلَامِ کہا جاتا ہے۔یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

ب ک ی

بَکٰی یَبْکِیْ کا مصدر بُکًی وَبُکَآءً یعنی ممدود اور مقصور دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی غم کے ساتھ آنسو بہانے اور رونے کے ہیں اگر آواز غالب ہو تو اسے بُکَآءٌ (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے رُغَاءٌ وَثُغَاءٌ اور اس نوع کے دیگر اوزان جو صوت کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور اگر غم غالب ہو تو اُسے بُکًی (بالقصر) کہا جاتا ہے۔

اَلْبَاکِیُ رونے والا۔غم اور اندوہ سے آنسو بہانے والا اس کی جمع بَاکُوْنَ وَبُکِیٌّ آتی ہے،قرآن میں ہے: ﴿ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُکِیًّا ﴾ (۱۹:۵۸) تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔

اصل میں بُکِیٌّ (بُکُوْیٌ بروزن فُعُوْلٌ ہے،جیسے سَاجِدٌ وَسُجُوْدٌ وَرَاکِعٌ وَرُکُوْعٌ وَقَاعِدٌ وَقُعُوْدٌ واؤ کو یاء سے تبدیل کر کے یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے،جیسے جَاثٍ وَجُثِیٌّ وَعَاتٍ عُتِیٌّ نیز:بُکًی کے اصل معنی تو غم کے ساتھ آنسو بہانا کے ہوتے ہیں،مگر کبھی صرف آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:﴿ فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا ﴾ (۹:۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں)...... بہت سارونا ہوگا۔

میں مطلق خوشی اور غم کے معنی مراد ہیں اور ضحک کے ساتھ قہقہہ اور بکاء کے ساتھ آنسو بہانا ضروری نہیں ہے۔یہی معنی آیت کریمہ:

﴿ فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾ (۴۴:۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا۔

میں مراد ہیں ہاں جو لوگ آسمان اور زمین کے لیے زندگی اور علم ثابت کرتے ہیں وہ اسے حقیقی معنی پر حمل کرتے ہیں اور جو زندگی کے قائل نہیں ہیں وہ نسبت مجازی قرار دیتے

ہیں یعنی ان سے آسمان اور زمین کے باشندے مراد ہیں [1]

بَلْ (حرف)

بَلْ: حرف استدراک ہے اور تدارک کی دو صورتیں ہیں۔(۱) جبکہ بل کا مابعد اس کے ماقبل کی نقیض ہو تو اس صورت میں کبھی تو اس کے مابعد حکم کی تصحیح سے ماقبل کی تردید مقصود ہوتی ہے۔اور کبھی اس کے برعکس ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کی غرض سے بل کو لایا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی صورت کے متعلق فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (۸۳:۱۴) جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں دیکھو یہ جو (اعمال بد) کر رہے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

توبَلْ کا معنی یہ ہیں کہ آیات الٰہی کو اَسَاطِيْر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ان کی جہالت ہے، پھر رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کہہ کر ان کی جہالت پر تنبیہ کی ہے۔اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:﴿ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ (۲۱:۶۱،۶۲) (جب ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام آئے تو) ان بت پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کیا ہے؟ (ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے) کہا (نہیں) بلکہ یہ ان کے اس بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔

اور دوسری صورت میں ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کے متعلق فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ ﴾ (۸۹:۱۵،۱۷) مگر انسان (عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔

یعنی رزق کی فراخی یا تنگی، اکرام یا اہانت کی دلیل نہیں ہے (بلکہ یہ پروردگار کی طرف سے آزمائش ہے) مگر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ یہ مال کو بیجا صرف کر رہے ہیں اور اسی طرح آیت ﴿ صٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ ﴾ (۳۸:۱،۲) قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے (کہ تم حق پر ہو) مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔ میں وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن تذکیر یعنی نصیحت حاصل کرنے کی کتاب ہے اور کفار کا اس کی طرف متوجہ نہ ہونا اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کا اعراض

---

[1] قال الحسن ای اهل السماء والارض كمافی قوله تعالىٰ حتى تضع الحرب اوزارها (٤٧-٤) ويمكن ان يكون المراد المبالغة فى وصف القوم بالصغر فى القدر او كناية عن عدم عملهم الصالح فى الارض يرفع الى السماء كماروى عن ابن عباسؓ وقال السدى لماقتل الحسين بن على بكت السماء عليه وبكاء ها حمرة اطرافها لكن الرواية غيرثابت والله اعلم.

محض غرور اور مخالفت کی وجہ سے ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْا ﴾ (۵۰:۱،۲) قرآنِ مجید کی قسم (کہ محمد ﷺ پیغمبر ہیں) لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا۔بھی اسی معنی پر محمول ہے،یعنی ان کا قرآن پاک پر ایمان نہ لانا قرآن کے بزرگ ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ محض ان کی جہالت ہے۔بَلْ عَجِبُوْا کہہ کر ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کیونکہ کسی چیز پر اسی وقت تعجب ہوتا ہے جب اُس کا سبب معلوم نہ ہو۔نیز فرمایا:
﴿ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ ﴾ (۸۲:۶،۹) تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا۔اور (تیری قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا جوڑ دیا۔مگر ہیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو۔
یعنی رب کریم کے بارے میں کوئی چیز سوائے اس کے دھوکے میں ڈالنے والی نہیں ہے کہ وہ دین کو جھٹلا رہے ہیں۔
(۲) تدارک کی دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری کلام کے ذریعہ پہلی کلام کی وضاحت اور اس پر اضافہ مقصود ہوتا ہے، جیسے فرمایا:
﴿ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ﴾ (۲۱:۵) بلکہ (ظالم) کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (میں دیکھ لی) ہیں (نہیں، بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے) جو اس شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔
یہاں متنبہ کیا ہے کہ اوّلاً انھوں نے قرآن کو خیالات پریشان کہا پھر اس پر اضافہ کر کے اسے افتراء بتلانے لگے پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق (نعوذ باللہ) کذاب ہونے کا ادعاء کرنے لگے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں شاعر فطرۃً کاذب کو کہا جاتا ہے اور آیت:
﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ ﴾ (۲۱:۳۹،۴۰)
اے کاش! کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں پر سے (دوزخ کی) آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا، بلکہ قیامت ان پر ناگہاں آ واقع ہوگی اور ان کے ہوش کھو دے گی)۔
بھی اس معنی پر محمول ہے کہ کاش وہ اس کے علاوہ دوسری بات کو جانتے ہوتے جو پہلی بات سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ قیامت ان پر ناگہاں آ واقع ہوگی۔قرآن پاک میں جتنی جگہ بھی بَلْ آیا ہے ان دونوں معنی میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے اگرچہ بعض مقامات ذرا وضاحت طلب ہیں ❶ اور ان کے پیچیدہ ہونے کی بنا پر بعض علما۔ئِ نحو نے غلطی سے کہہ دیا ہے کہ قرآن پاک میں بل صرف معنی

---

❶ قال فی المغنی : بل حرف اضراب فان تلاھا جملة کان معنی الاضراب اماالابطال ای الاول واماالانتقال من غرض الی آخروھی فی ذالك كلة حرف ابتداء لاعاطفة علی الصحیح وان تلاھا مفردفھی عاطفة ثم ان تقدمھا امراوایجاب فھی تجعل ماقبلھا کالمسکوت عنه واثبات الحکم لمابعدھاوان تقدمھا نفی اونھی فھی لتقریر ماقبلھا علی حالته وجعل ضده لمابعده (راجع ۱:۱۱۹۔۱۲۰).

ثانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ❶

ب ل د

اَلْبَلَدُ: (شہر) وہ مقام جس کی حد بندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔اس کی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے، اور آیت:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ (۹۰:۱) هٰذَا الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے، دوسری جگہ فرمایا: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ (۱۴:۳۵) کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لیے) امن کی جگہ بنادے۔ ﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ﴾ (۳۴:۱۵) پاکیزہ شہر ہے۔

﴿فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (۴۳:۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کردیا۔

﴿فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ﴾ (۳۵:۹) پھر ہم ان کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ (۲:۱۲۶) اے پروردگار! اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔

میں بھی مکہ مکرمہ مراد ہے لیکن ایک مقام پر اسے معرفہ اور دوسرے مقام پر نکرہ لانے میں جو لطافت اور نکتہ ملحوظ ہے، اسے ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے اور بَلَدٌ کے معنی بیابان اور قبرستان بھی آتے ہیں کیونکہ پہلا وحشی جانوروں دوسرا مردوں کا مسکن ہوتا ہے۔ اَلْبَلْدَةُ: منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے اور تشبیہ کے طور پر ابرو کے درمیان کی جگہ اور اونٹ کے سینہ کو بھی بَلْدَةٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہر کی طرح محدود ہوتے ہیں اور بطور استعارہ انسان کے سینہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اثر یعنی نشان کے معنی کے اعتبار سے بِجِلْدِهٖ بَلَدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اس کی کھال پر نشان ہے اس کی جمع اَبْلَادٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۶۴) وَفِي النُّحُوْرِ كُلُوْمٌ ذَاتُ اَبْلَادِ.

اور ان کے سینوں پر زخموں کے نشانات ہیں۔

اَبْلَدَ الرَّجُلُ: شہر میں چلا جانا جیسا کہ اَنْجَدَ وَاَتْهَمَ کے معنی نجد اور تہامہ میں چلے جانے کے ہیں۔ بَلَدَ الرَّجُلُ کے معنی شہر میں مقیم ہونے کے ہیں اور کسی مقام پر ہمیشہ رہنے والا اکثر اوقات دوسری جگہ میں جا کر متحیر ہوجاتا ہے اس لیے متحیر آدمی کے متعلق بَلَدَ فِي اَمْرِهٖ وَاَبْلَدَ وَتَبَلَّدَ وغیرہا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ ع

(۶۵) لَابُدَّ لِلْمَحْزُوْنِ اَنْ يَتَبَلَّدَا

کہ وہ اندوہ گیں لازماً متحیر رہے گا۔

اجڈ لوگ عام طور پر بلید یعنی کند ذہن ہوتے ہیں اس لیے ہر جسیم آدمی کو اَبْلَدُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ (۷:۵۸) (جو زمین

---

❶ كما قال ابن مالك في شرح الكافية (راجع ابن هشام (۱: ۱۲۰).

❷ قاله القطامي واوله: ليست تجرح فراراً ظهورهم .... والبيت في اللسان والتاج والصحاح (بلد) وتهذيب الالفاظ ۱۰۸ والاصلاح ۴۱۰ وفي النسخ المطبوعة النجوم بدل النحور مصحف والتصويب من المراجع.

❸ وفي مصارع العشاق (۷۵-۷۶) مثله لحبابة مع تغيير قالته حين مر يزيد بها ورأته متغيراً اورواية البيت: الالاتلمه اليوم ان يتبلدا۔ فقد منع المخزون ان يتجلدا۔ والبيت في اللسان (بلد) في اربعة منسوبة الى الاحوص.

پاکیزہ ہے) اس میں سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے اور جو خراب ہے۔ اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے) میں بلد کے طیب اور خبیث ہونے سے کنایۃً نفوس کا طیب اور خبیث ہونا مراد ہے۔

ب ل س

اَلْاِبْلَاسُ: (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ اَبْـلَـسَ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے اِبْلِیس مشتق ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّـاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ (۳۰:۱۲) اور جس دن قیامت برپا ہوگی، گنہگار مایوس و مغموم ہوجائیں گے۔

﴿ اَخَـذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ (۴۴:۶) تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

﴿ وَاِنْ كَـانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَـمُبْـلِسِیْـنَ ﴾ (۳۰:۴۹) اور بیشتر تو وہ مینہ کے اترنے سے پہلے ناامید ہو رہے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا اس لیے اَبْلَسَ فُلَانٌ کے معنی خاموش اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

بَـلَـسَـتِ الـنَّـاقَةُ فَهِیَ مِبْـلَاسٌ آواز نہ کردناقہ از غایت خواہش کش اور بَلَاسٌ بمعنی ٹاٹ فارسی (پلاس) سے معرب ہے۔

ب ل ع

بَلَعْتُ (ف) الشَّيْءَ وَابْتَلَعْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو نگل لینا کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ ﴾ (۱۱:۴۴) کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جا۔

اسی سے بَـلُّـوْعَةٌ ہے، جس کے معنی بدرو اور گندی نالی یا چوبچہ کے ہیں۔ سَـعْـدُ بَـلَـعَ ایک ستارے کا نام بَـلَّـعَ الشَّیْبُ فِی رَأْسِهٖ سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

ب ل غ

اَلْبُـلُـوْغُ وَالْبَـلَاغُ: (ن) کے معنی مقصد اور منتہیٰ کے آخری حد تک پہنچنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ مقصد کوئی مقام ہو یا زمانہ یا اندازہ کیے ہوئے امور میں سے کوئی امر ہو، مگر کبھی محض قریب تک پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے گو انتہا تک نہ بھی پہنچا ہو۔ چنانچہ انتہا تک پہنچنے کے معنی میں فرمایا: ﴿ حَتّٰـی اِذَا بَـلَـغَ اَشُـدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَـعِیْـنَ سَـنَةً ﴾ (۴۶:۱۵) یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَـلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ (۲:۲۳۲) اور ان کی عدت پوری ہوجائے تو ان کو...... مت روکو۔

﴿ وَمَـاهُـمْ بِـبَـالِغِیْهِ ﴾ (۴۰:۵۶) اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں۔

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ ﴾ (۳۷:۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

﴿ لَـعَـلِّـیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴾ (۴۰:۳۶) تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ اَمْ لَـكُـمْ اَیْـمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ ﴾ (۶۸:۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو چلی جائیں گی۔ یہاں

بَالِغَۃٌ سے انتہائی مؤکد قسمیں مراد ہیں۔

اَلْبَلَاغُ کے معنی تبلیغ یعنی پہنچا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿ هٰذَا بَـلَاغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (۱۴:۵۲) یہ (قرآن) لوگوں کے نام (خدا کا) پیغام ہے۔

﴿ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (۴۶:۳۵) (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک ہوں گے جو نافرمان تھے۔

﴿ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (۳۶:۱۷) اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ (۱۳:۴۰) تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔

اور بَلَاغٌ کے معنی کافی ہونا بھی آتے ہیں، جیسے: ﴿ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴾ (۲۱:۱۰۶) عبادت کرنے والے لوگوں کے لیے اس میں (خدا کے حکموں کی) پوری پوری تبلیغ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ (۵:۶۷) اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یہ یا کوئی دوسرا حکم جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے نہ پہنچایا تو گویا تم نے وحی الٰہی سے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہیں کی یہ اس لیے کہ جس طرح انبیاء کرام کے درجے بلند ہوتے ہیں اسی طرح ان پر احکام کی بھی سختیاں ہوتی ہیں اور وہ عام مومنوں کی طرح نہیں ہوتے جو اچھے اور برے ملے جلے عمل کرتے ہیں اور انہیں معاف کر دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ﴾ (۲:۶۵) پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کو پہنچ جائیں تو، یا تو ان کو (زوجیت میں) رہنے دو۔ میں بلوغ اجل سے عدتِ طلاق کا ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا مراد ہے۔ کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو خاوند کے لیے مراجعت اور روکنا جائز ہی نہیں ہے۔ بَلَّغْتُهُ الْخَبَرَ وَاَبْلَغْتُهٗ کے ایک ہی معنی ہیں مگر بَلَّغْتُ (تفعیل) زیادہ استعمال ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ ﴾ (۷:۶۲) تمھیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (۵:۶۷) اے پیغمبر! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ﴾ (۱۱:۵۷) اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمھیں پہنچا دیا ہے۔

اور قرآنِ پاک میں ایک مقام پر:

﴿ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ﴾ (۳:۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ آیا ہے یعنی بلوغ کی نسبت کِبَرٌ کی طرف کی گئی ہے۔ اور دوسرے مقام پر ﴿ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴾ (۱۹:۸) "اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔" ہے۔ یعنی بلوغ کی نسبت متکلم کی طرف ہے اور یہ اَدْرَکَنِی

اَلْجَھْدُ وَاَدْرَکْتُ الْجَھْدَ کے مثل دونوں طرح جائز ہے، مگر بَلَغَنِیَ الْمَکَانُ یا اَدْرَکَنِیْ کہنا غلط ہے۔
اَلْبَلَاغَۃُ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے، ایک یہ کہ وہ کلام بِذَاتِہٖ بلیغ ہو اور اس کے لیے اوصاف ثلاثہ کا جامع ہونا شرط ہے یعنی وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، معنی مقصود کے مطابق ہو اور فی الواقع سچی بھی ہو اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف میں بھی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہٗ یعنی متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے اور آیت کریمہ: ﴿ وَقُلْ لَّهُمْ فِيٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴾ (۶۳:۴) اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔
میں ''قول بلیغ'' ان ہر دو معنی پر محمول ہو سکتا ہے اور بعض نے اس کے جو یہ معنی کیے ہیں کہ: ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کیا تو قتل کر دیئے جاؤ گے یا یہ کہ انھیں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے ڈراؤ'' تو یہ اس کے عام مفہوم میں سے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْبُلْغَۃُ: اتنی مقدار جس سے گذر اوقات ہو سکے۔

ب ل و ی

بَلِیَ الثَّوْبُ۔ بِلًی وَبَلَاءً کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں۔ اسی سے بَلَاہُ السَّفَرُ ای اَبْلَاہُ کا محاورہ ہے۔ یعنی سفر نے اسے لاغر کر دیا ہے اور بَلَوْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے آزمایا۔ گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کر دیا اور آیت کریمہ:
﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ﴾ (۳۰:۱۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔
میں ایک قرأت نَبْلُوْا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہچان لیں گے اور اسی سے اَبْلَیْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بَلَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو گھلا کر لاغر کر دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴾ (۴۹:۲) اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔
﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ﴾ (۱۵۵:۲) اور ہم کسی قدر خوف...... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔
﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴾ (۱۰۶:۳۷) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔
اور تکلیف کو کئی وجوہ کی بناء پر بَلَاءٌ کہا گیا ہے۔ ایک اس لیے کہ تکالیف بدن پر شاق ہوتی ہیں اس لیے انہیں بَلَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تکلیف بھی ایک طرح سے آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ﴾ (۳۱:۴۷) اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو معلوم کریں۔
سوم اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو خوش حالی سے آزماتے ہیں کہ شکر گذار بنتے ہیں یا نہیں اور کبھی تنگی کے

ذریعہ امتحان فرماتے ہیں کہ ان کے صبر کو جانچیں۔ لہٰذا مصیبت اور نعمت دونوں آزمائش ہیں۔ محنت صبر کا تقاضا کرتی ہے اور مِنْحَة یعنی فضل وکرم شکر گزاری چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کماحقہٗ صبر کرنا کما حقہ شکر گذاری سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لیے نعمت میں بہ نسبت مشقت کے بڑی آزمائش ہے، اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (۳۴) بُلِينَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِينَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ کہ تکالیف پر تو صابر رہے لیکن فراخ حالی میں صبر نہ کرسکے اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں: (۳۵) مَنْ وُسِعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ فَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ مُكِرَ بِهٖ فَهُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِهٖ کہ جس پر دنیا فراخ کی گئی اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ آزمائش کی گرفت میں ہے تو فریب خوردہ اور عقل وفکر سے محروم ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ (۲۱:۳۵) اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

﴿ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ﴾ (۸:۱۷) اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴾ (۲:۴۹) اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ میں بَلَآءٌ کا لفظ نعمت ومشقت دونوں طرح کی آزمائش کو شامل ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ﴾ (۲:۴۹) (تمہارے بیٹوں کو) تو قتل کرڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ میں مشقت کا بیان ہے اور فرعون سے نجات میں نعمت کا تذکرہ ہے اسی طرح آیت:

﴿ وَاٰتَيْنَاهُمْ مِّنَ الْاٰيَاتِ مَا فِيْهِ بَلَآءٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۴۴:۳۳) اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جس میں صریح آزمائش تھی۔ میں دونوں قسم کی آزمائش مراد ہے۔ جیسا کہ کتاب اللہ کے متعلق فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَّالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ (۴۱:۴۴) اِبْتَلٰى فُلَانٌ وَاَبْلَاهُ (کسی کا امتحان کرنا) یہ دو امر کو متضمن ہوتا ہے (۱) تو اس شخص کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا مقصود ہوتا ہے، دوسرے (۲) اس کی اچھی یا بری حالت کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو یہ دونوں معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی اس شخص کی خوبی یا نقص کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ ذات باری کی شان عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے، اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں، لہٰذا آیت کریمہ: ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ (۲:۱۲۴) اور پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ دوسرے معنی پر محمول ہوگی۔ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا)۔

بَلٰی (حرف)

حرف ایجاب ہے، (پہلی بات میں ❶) نفی کی تردید کے لیے آتا ہے، جیسا کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کے بعد فرمایا: ﴿ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ﴾ (۲:۸۱) کیوں نہیں! جو برے کام کرے۔ اور یا اس استفہام کے جواب میں آتا ہے جو نفی پر واقع ہو، جیسے:

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ﴾ (۷:۱۷۲) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں! وہ کہنے لگے: کیوں نہیں۔ نَعَمْ اور بَلٰی میں فرق یہ ہے کہ نَعَمْ صرف استفہام (یعنی بدوں نفی) کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوْا نَعَمْ ﴾ (۷:۴۴) بھلا جو وعدہ تمہارے پروردگار نے تم سے کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟ وہ کہیں گے: ہاں!۔

یہاں پر بَلٰی کا استعمال صحیح نہیں ہے ❷ نیز جب کوئی شخص مَا عِنْدِی شَیْءٌ (کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں) کہے تو اس کے جواب میں اگر "بَلٰی" کہا جائے تو اس کی تردید ہوگی، یعنی غلط کہتے ہو اور اگر نَعَمْ سے جواب دیں تو آپ نے نفی کا اقرار کرلیا یعنی بیشک تمہارے پاس کچھ نہیں ہے ❸ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۶:۲۸) تو مطیع و منقاد ہوجاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے کیوں نہیں! جو کچھ تم کرتے تھے خدا اسے خوب جانتا ہے۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ (۳۴:۳) اور کافر کہتے ہیں کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ دو کیوں نہیں (آئیگی) میرے پروردگار کی قسم۔ ﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰى ﴾ (۳۹:۷۱) تو جہنم کے خازن ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں۔ ﴿ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰى ﴾ (۴۰:۵۰) وہ کہیں گے کہ تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے، کیوں نہیں۔

ب ن ن

اَلْبَنَانُ (واحد بَنَانة) کے معنی انگلیاں (یا ان کے اطراف) کے ہیں۔ یہ اَبَنَّ بِالْمَکَان کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پذیر ہونے کے

❶ حرف جواب تختص النفی وتفید ابطاله سواء کان مجرداً اومقروناً بالاستفهام، وسواء کان الاستفهام حقیقیاً اوتوبیخیاً او تقریریاً (راجع المغنی بحث بلی).

❷ هذا وان کان متفقاً علیه عند العلماء العربیة لکن وقع فی کتب الحدیث ما یقتضی انها یجاب بها الاستفهام المجرد ففی صحیح البخاری انه علیه السلام قال لاصحابه أترضون ان تکونوا ربع اهل الجنة ؟ قالوا بلیٰ ! وفی صحیح مسلم ...... أیسرك ان یکونوا لك فی البر سواءً ! قال : بلی ! وایضاً قال علیها السلام لرجل : انت الذی یفتنی بمکة فقال بلیٰ ـ لکنّه قلیل .

❸ وبذالك قال جماعة من الفقهاء لکن فی المسئلة خلاف راجع المغنی (۱ : ۱۲۱).

ہیں اور چونکہ کسی جگہ اقامت کے لیے ضروریاتِ زندگی کی اصلاح بھی انگلیوں سے ہوتی ہے، اس لیے ان کو بَنَان کہا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ﴾ (۷۵:۴) ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کردیں۔ میں انگلیوں کی درستگی پر اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے۔اسی طرح آیت:

﴿ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ (۸:۱۲) اور ان کا پور پور مار (کرتوڑ) دو۔

میں خاص کر ان کے پور پور کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت اور مقاتلہ کا واحد ذریعہ ہیں۔

اَلْبِنَّةُ: بو، اچھی یا بری۔ کیونکہ اس میں کسی چیز کے ساتھ لازم ہو۔ کی وجہ سے ٹھہرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

ب ن ی

بَنَيْتُ اَبْنِیْ بِنَاءً وَبِنْیَةً وَبُنْیًا کے معنی تعمیر کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴾ (۷۸:۱۲) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔﴿ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ ﴾ (۵۱:۴۷) اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

﴿ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا ﴾ (۹۱:۵) اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔

اَلْبُنْيَانُ: یہ واحد ہے جمع نہیں ہے، جیسا کہ آیات: ﴿ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِيْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (۹:۱۱۰) یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔﴿ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ (۶۱:۴) کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔﴿ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا ﴾ (۳۷:۹۷) وہ کہنے لگے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ۔ سے معلوم ہوتا ہے؛ بعض کے نزدیک یہ بُنْيَانَةٌ کی جمع ہے اور یہ: شَعِيْرٌ وَشَعِيْرَةٌ وَتَمْرٌ وَتَمْرَةٌ وَنَخْلٌ وَنَخْلَةٌ کی طرح ہے (یعنی جمع اور مفرد میں تا کے ساتھ فرق کرتے ہیں) اور جمع کی اس قسم میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔﴿ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ﴾ (۳۹:۲۰) ان کے لیے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔

بِنَاءٌ: (مصدر بمعنی مفعول) عمارت ج اَبْنِيَةٌ اَلْبَنِيَّةُ سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے[1]

اَلْاِبْنُ یہ اصل میں بَنَوٌ ہے[2] کیونکہ اس کی جمع اَبْنَاءٌ اور تصغیر بُنَیٌّ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ يٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلٰٓی اِخْوَتِكَ ﴾ (۱۲:۵) کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔

﴿ يٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ ﴾ (۳۷:۱۰۲) کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔

﴿ يٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ (۳۱:۱۳) کہ بیٹا خدا

---

[1] یقال: لاوحب هذه البنیة (کعنیة) وقد کثر قسمهم بها (راجع التاج: ب ن ی).

[2] هذا وان کان فی اصله خلاف لکن رجح فی التاج ان اصدبنی (محرکة بالیاء قال ذانماقضینا انه من الیاء لان بنی یبنی اکثر فی کلامهم من یبنو.

کے ساتھ شرک نہ کرنا۔

﴿ يَا بُنَيَّ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ﴾ بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے، اس لیے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسری کے سبب اس کی تربیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو اسے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو اسے بھی اس کا ابن کہہ دیا جاتا ہے، جیسے: فُلَانٌ ابْنُ حَرْبٍ ۔ فلاں جنگجو ہے۔ اِبْنُ السَّبِيلِ: مسافر۔ اِبْنُ اللَّيْلِ: چور۔ اِبْنُ الْعِلْمِ: پروردۂ علم۔

شاعر نے کہا ہے [1]

(۶۲) أُولَاكَ بَنُو خَيْرٍ وَشَرٍّ كَلَيْهِمَا

یہ لوگ خیر وشر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔

فُلَانٌ ابْنُ بَطْنِهِ: پیٹ پرست۔ فُلَانٌ ابْنُ فَرْجِهِ: شہوت پرست۔ اِبْنُ يَوْمِهِ: جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ﴾ (۹:۳۰) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔

﴿ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي ﴾ (۱۱:۴۵) میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔

﴿ إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ﴾ (۱۲:۸۱) کہ ابا! آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔

اِبْنٌ کی جمع اَبْنَاءٌ اور بَنُونَ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً ﴾ (۱۶:۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔

﴿ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ ﴾ (۱۲:۶۷) کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔

﴿ يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷:۳۱) اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو۔

﴿ يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ﴾ (۷:۲۷) اے بنی آدم! (دیکھنا کہیں) شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔"

اور اِبْنٌ کی مؤنث اِبْنَةٌ وَبِنْتٌ اور ان کی جمع بَنَاتٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ﴾ (۱۱:۷۸) یہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں، تمہارے لیے (جائز اور) پاک ہیں۔

﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ﴾ (۱۱:۷۹) کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں۔ بعض کہتے ہیں [2] کہ حضرت لوط علیہ السلام نے

---

[1] قال مسافع بن حذيفة العبسى (كمافى شرح التبريزى) وتمامه: جميعاً ومعروف الم ومنكر ۔ كذا فى الصاعتين ۳۱۲ مع آخر وفى ۴۸ والبيت فى الحماسة مع المرزوقى ۳۴۶ فى اربعة ابيات والاشباه ۳: ۱۲۳ مع اختلاف فى بعض الرواية وفى بعض النسخ وابناء معروف بدل جميعاً ومعروف وفى الحيوان (۲: ۸۹) قاله العتبى وفى رواية لكن بدل اولاك والعتبى هو محمد بن عبدالله من بنى عتبة بن ابى سفيان ومسافع بن حذيفة شاعر فارسى من شعراء الجاهلية (راجع الخزانة: ۲/ ۳۶۰).

[2] مروى عن قتاده (الطبرسى ۱۲: ۱۹۷).

اکابر قوم کو خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں پیش کی تھیں۔مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر کے سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے [1] کہ بَنَاتِی سے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بَنَاتِی اس لیے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اَبٌ کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ ﴾ (۱۶:۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

ب ہ ت

بَهِتَ (س) حیران وششدرہ جانا بَهَتَهٗ (ف) اسے مبہوت کردیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ﴾ (۲:۲۵۸) یہ سن کر کافر حیران رہ گیا۔اور آیت کریمہ:

﴿ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۲۴:۱۶) یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے۔میں بہتان کے معنی ایسے الزام کے ہیں جسے سن کر انسان ششدر و حیران رہ جائیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ (۶۰:۱۲) نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی۔

میں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ اس سے ہر وہ عمل شنیع مراد ہے، جسے ہاتھ اور پاؤں سے سرانجام دیا جائے۔مثلاً ہاتھ سے کسی ناروا چیز کو پکڑنا یا کسی عمل شنیع کا ارتکاب کرنے کے لیے اس کی طرف چل کر جانا۔جَاءَ بِالْبَهِيْتَةِ: اس نے جھوٹ بولا۔

ب ہ ج

اَلْبَهْجَةُ: خوش نمائی۔فرحت وسرور کا ظہور۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ﴾ (۲۷:۶۰) سرسبز باغ۔

بَهُجَ (ک) خوشنما اور تروتازہ ہونا۔اور خوشنما چیز کو بَهِيْج کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ ۢبَهِيْجٍ ﴾ (۵۰:۷) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔

اور بَهِجٌ بھی صیغہ صفت ہے۔شاعر نے کہا ہے [2]

(۶۷) ذَاتُ خَلْقٍ بَهِجٌ

اور اس سے بَهُوْجٌ بروزن فَعُوْلٌ استعمال نہیں ہوتا۔

اِبْتَهَجَ بِكَذَا کسی چیز پر اس قدر خوش اور مسرور ہونا کہ چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہوجائیں۔اَبْهَجَهٗ خوش کرنا۔

ب ہ ل

اَلْبَهْلُ: (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے اسی سے اَلْبَاهِلُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پائے بند یا نشان لگائے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے یا وہ اونٹنی جسے تھن باندھے بغیر چھوڑ دیا ہو، چنانچہ کسی عورت نے اپنے خاوند سے کہا: اَتَيْتُكَ بَاهِلًا غَيْرَ ذَاتِ صِرَارٍ کہ تمھیں پوری آزادی ہے جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو اور اَلْبَاهِلُ

---

[1] قاله مجاهد وسعيد بن جبير (الطبرسی ۱۲: ۱۹۷).

[2] کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

اونٹ کے ساتھ تشبیہ دے کر اَبْهَلْتُ فُلَانًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دینا کے ہیں۔

اَلْبَهْلُ وَالْاِبْتِهَالُ فِی الدُّعَاءِ . کھل کر عاجزی سے دعا کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ﴾ (۳:۶۱) پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا والتجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

جن لوگوں نے یہاں اِبْتِهَال کے معنی لعنت کیے ہیں وہ محض اس بنا پر کیے ہیں کہ یہاں دعا لعنت کے لیے ہے [1] شاعر نے کہا ہے [2] ع (رمل)

(۶۸) نَظَرَ الدَّهْرُ اِلَيْهِمْ فَابْتَهَلْ

یعنی زمانہ ان کی طرف تیزی سے چلا اور انھیں فنا کر دیا۔

ب ہ م

اَلْبُهْمَةُ: کے معنی ٹھوس چٹان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بُهْمَة کہا جاتا ہے نیز ہر وہ حسی یا عقلی چیز جس کا عقل وحواس سے ادراک نہ ہو سکے اسے مُبْهَمٌ کہا جاتا ہے۔

اَبْهَمْتُ كَذَا: مبہم کرنا اس کا مطاوع اِسْتَبْهَمَ ہے۔

اَبْهَمْتُ الْبَابَ دروازے کو اس طرح بند کرنا کہ کھل نہ سکے۔

اَلْبَهِيْمَةُ: چوپایہ، جانور کیونکہ اس کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ مگر عرف میں درند اور پرند کے علاوہ باقی جانوروں کو بہیمۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ﴾ (۵:۱) تمہارے لیے چارپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیے گئے ہیں۔

لَيْلٌ بَهِيْمٌ: سیاہ رات فَعِيْلٌ بمعنی مُفْعَلٌ ہے اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم ہوتا ہے اس لیے اسے بَهِيْمٌ کہا جاتا ہے یا فَعِيل بمعنی مُفْعِلٌ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ بَهِيْمٌ یک رنگ گھوڑا جس کی اچھی طرح پہچان نہ ہو سکے اسی سے ایک روایت میں ہے۔ [3]

(۴۱) يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بُهْمًا کہ قیامت کے دن لوگ ننگے بدن اٹھیں گے، بعض نے کہا ہے کہ دنیاوی زیب وزینت اور آرائش سے عاری ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

اَلْبَهْمُ: بھیڑ بکری کے بچے۔ واحد بَهْمَةٌ۔ اَلْبُهْمٰی: ایک قسم کی گھاس جس کے پیچدار ہونے کی وجہ سے اس کی جڑیں معلوم نہیں ہو سکتیں کہ کہاں ہیں اَبْهَمَتِ الْاَرْضُ: زمین میں بَهْمٰی گھاس کا بکثرت ہونا۔ جیسا کہ اَعْشَبَتْ وَاَبْقَلَتْ کے معنی گھاس اور سبزی کے بکثرت ہونے کے ہیں۔

ب و ب

اَلْبَابُ: ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

---

[1] قال ابو عبیدۃ فی مجازۃ (۱:۹۶) ثُمَّ نبتهل ای نلتعن یقال ماله بها الله ویقال علیه بهلة الله راجع ایضاً الکشاف والقرطبی ۴:۱۰۵.

[2] هذا عجز بیت للبید وصدره فی قوم سادة من قومه انظر دیوانه ص ۱۸۰ طبع لیدن ۱۸۹۱ء والبیت مما استشهد به الطبری فی تفسیره: ۳:۲۹۸) وامالی المرتضی (۱:۴۵) والبحر: ۲/۴۷۰).

[3] وتمام الحدیث حفاة ،عراة بهما راجع الفائق ۱: ۶۴ والنهایة واللسان (بهم) ومعنیٰ البهم صحیحة الاعضاء کما فی النهایة.

دراصل امـکـنــہ: جیسے شہر، مکان، گھر، وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔اس کی جمع اَبْـوَاب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ﴾ (۱۲:۲۵) اور دونوں دروازوں کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے (پکڑ کر جو کھینچا تو) پھاڑ ڈالا۔اور دونوں کو دروازوں کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

﴿ لَا تَـدْخُـلُـوْا مِـنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْـوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ﴾ (۱۲:۶۷) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔اور اسی سے (مجازاً) علم میں بَـابُ كذا کا محاورہ ہے۔نیز کہا جاتا ہے: هٰـذَا الْـعِـلْـمُ بَابٌ اِلٰى عِلْمٍ كَذَا کہ یعنی یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا: ❶

(۴۲) اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا ......یعنی میں علم کا شہر ہوں۔اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے ❷ (رجز)

(۶۹) اَتَيْتَ الْمَرُوْءَةَ مِنْ بَابِهَا

تم نے جوانمردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

﴿ فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (۶:۴۴) تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

﴿ لَـهٗ بَـابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ ﴾ (۵۷:۱۳) جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے، اس میں تو رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اَبْـوَاب جَنَّة اور ابواب جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ اُدْخُـلُـوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ ﴾ (۳۹:۷۲) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

﴿ حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَـزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ﴾ (۳۹:۷۳) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغے ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لیے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هٰـذَا مِـنْ بَـابَةِ كَـذَا ۔کہ یہ اس کے مناسب ہے۔اس کی جمع بَابَات ہے۔خلیل کا قول ہے کہ بَابَةٌ کالفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے۔ ❸

بَوَّبْتُ بَاباً۔میں نے دروازہ بنایا۔

اَبْـوَابٌ مُبَوَّبَةٌ: بنے ہوئے دروازے، قائم کیے ہوئے

---

❶ مروی عن علیؓ فی الترمذی وابن عباس مرفوعاً فی المستدرك وقال صحیح الاسناد وذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واوردہ السیوطی فی اللالئی واستوعب طرقه وذکرنقود العلماء علی هذاالحدیث راجع (۱: ۳۲۹۔۳۳۶) وفی تخریج الاحیاء للعراقی (۲: ۱۹۰) قال ابن حبان لااصل له وقال ابن ظاهر موضوع هذافی الفتح الکبیر (۱: ۲۷۶) عق، عد، طب، ك۔عن ابن عباس (عد، ك،) عن جابر وفی الترمذی عن علیؓ انا دار الحکمة وعلی بابها وقال غریب.

❷ قدمرفی (اتی)

❸ قال المتنبی: وبابة کل غلام حتیٰ

دروازے۔ اَلْبَوَّابُ: دربان۔ تَبَوَّبْتُ بَابًا: میں نے دروازہ بنایا۔

بَابٌ اصل میں بَوَبٌ ہے اوراس میں الف واؤ سے مبدل ہے۔

ب و ر

اَلْبَوَار: (ن) اصل میں بَارَ الشیئ یبور ، بَوْرًا وَبوَارًا کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ مندا پڑنے کے ہیں اور چونکہ کسی چیز کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ کَسَدَ حَتّٰی فَسَدَ۔ اس لیے بَوَار بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴾ (۲۹:۳۵) اس تجارت (کے فائدے) کے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

﴿ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ﴾ (۱۰:۳۵) اوران کا مکر نابود ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے [1] (۴۳) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ بَوَارِ الْاَيِّمِ : کہ ہم بیوہ کے مندا پن سے پناہ مانگتے ہیں یعنی یہ کہ اس کے لیے کہیں سے پیغام نکاح نہ آئے۔

﴿ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴾ (۲۸:۱۴) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

رَجُلٌ حَائِرٌ بَائِرٌ مرد سرگشتہ خود رائے۔

جمع کے لیے حُوْرٌ بُوْرٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ﴾ (۱۸:۲۵) یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

میں بُوْرٌ بَائِرٌ کی جمع ہے [2] بعض نے کہا ہے کہ بُور مصدر ہے اور واحد و جمع دونوں کی صفت واقع ہوتا ہے، جیسے: رَجُلٌ بُوْرٌ وَقَوْمٌ بُوْرٌ۔ شاعر نے کہا ہے [3] ع

(۷۰) يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ اِنَّ لِسَانِيْ
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ اِذَا اَنَا بُوْرٌ

اے اللہ کے رسول! جو گناہ میں نے کفر کی حالت میں کئے اب ان سے تائب ہوتا ہوں۔

بَارَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کے اصل معنی نر شتر کا مادہ کو یہ معلوم کرنے کے لیے سونگھنا کہ آیا حاملہ ہے یا نہیں اور استعارۃ کسی چیز کا امتحان کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بُرْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کو آزما دیکھا۔

ب و ء

اَلْبَوَاءُ کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی

---

[1] انظر للحديث، للسان (بور) والنهاية ۱:۹۸ و غريب القرآن للقتبى ۳۱۱ والصغير للطبرانى ۲۱۸ وفيه تفرد وفى كنزالعمال ۲: رقم ۲۲۳۸ عن ابن عباس (ز،ن) و۲۱۸۳ عن مجاهد مرفوعا.

[2] وقال تعالىٰ: وكنتم قوماً بوراً (الفتح ۱۲) اى هلكى عن ابن عباس ومجاهد وغير واحد وقيل قوماً فاسدين عن قتادة (الطبرى : ۵۹/۲٦) وابن كثير (٤ : ۱۸۹).

[3] قاله عبدالله بن الزبعرىٰ السهمى القرشى وفى اللسان (بور) اَلْالٰهِ بدل المليك والبيت من كلمة قالها حين قدم على النبى صلى الله عليه وسلم مسلماو كان هاربا من فى النجران قال السهيلى (فتقت) اى فى الدين فكل اثم فتق و كل توبة رتق۔ اوانابو ريريداذا انا كافر ها لك ۱ھ راجع الروض ۲ : ۲۷۹) والموتلف ۱۳۲ والسمط ۳۸۸۔ ۳۹۰، ۸۳۳ واصلاح المنطق ۱۲۵ والسيرة (جوتنجن ۸۲۷) والطبرى (۱۳ : ۱۳۰/ ۳۰ : ۲٦٦) وتاريخ الطبرى (۲ : ۳۳۹) فى اربعة ابيات وفى (۳ : ۱۲۲) والجمهرة (۱ : ۲۵۸) والقرطبى (۱۳۔۱۱) والطبرسى (۲٦ : ۵۸) واللسان والتاج والمقاييس (بور) ومجاز القرآن لابى عبيدة (۱ : ۳٤۰ رقم ۳۹۰) والاتباع لابى الطيب ۲۳ والمخصص (۳ : ٤۸) والاغانى (۱ : ۳۳/۱۷ : ۳۰) والامالى (۲ : ۲۱۰) والاقتضاب ۱۱ وانشريسى (۲ : ۳۱۸) وابن خالويه ۲۳ وغريب القرآن للقبتى ۳۱۱ وشرح السبع لابن الانبارى ۳۸۹ ، ۵۹٤، واسد الغابة (۳ : ۱٦۰) فى ستة ابيات .

(اور سازگار موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نَبْـوَةٌ کی ضد ہے جس کے معنی اجزاء کی ناہمواری (ناسازگاری) کے ہیں۔ لہٰذا مَکَانٌ بَوَاءٌ اس مقام کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔

بَوَّأْتُ لَهٗ مَكَانًا: میں نے اس کے لیے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تَبَوَّأْتُ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا ﴾ (۸۷:۱۰) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ۔ ﴿ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ ﴾ (۹۳:۱۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کے رہنے کو عمدہ جگہ دی۔ ﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ﴾ (۱۲۰:۳) ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔

﴿ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ﴾ (۵۶:۱۲) وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے، رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے [1] (۴۵) اِنَّهٗ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَبَوَّأُ لِبَوْلِهٖ كَمَا يَتَبَوَّأُ لِمَنْزِلِهٖ ۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کرنے کے لیے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے، جیسے کوئی شخص اقامت کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔

بَوَّأْتُ الرُّمْحَ: میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔ ایک حدیث میں ہے: [2]

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ۔ جو عمداً مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے۔ [3]

(۷۱) لَهَا اَمْرُهَا حَتّٰى اِذَا مَا تَبَوَّأَتْ
بِاَخْفَافِهَا مَاْوًى تَبَوَّأَ مَضْجَعًا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لیے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سوجاتا ہے۔

اور تَبَوَّأَ فُلَانٌ (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بَنٰى بِاَهْلِهٖ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بَوَاءٌ کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ بَوَاءٌ لِفُلَانٍ۔ وہ فلاں کا ہمسر ہے یعنی رشتۂ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (۱۶:۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بِغَضَبٍ موضع حال میں ہے، جیسے خَرَجَ بِسَيْفِهٖ میں ہے اور مُرَّ بِزَيْدٍ کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بِغَضَبٍ پر باء لاکر

---

[1] رواه فی (طس ـعن ابی هريرة) راجع كنزالعمال (۱۷رقم ۱۹۶).

[2] مـن حـديث ابی هريرة رواه احمد ۲:۱۰۵ رقم ۱۵۲۰ وابن ماجة ۱:۱۰ والحديث باختلاف الفاظه فی مسلم ۱:۵ والحاكم ۱:۱۰۲ـ۱۰۳ اورمسـنـد احمدرقم ۸۲۴۹و۸۷۶۱و ۹۳۰۵، ۹۳۳۹، ۱۰۰۵۷ و ۲۰۷۳۹ / ۳۲۱، ۳۶۵، ۴۱۰، ۴۱۲، ۴۶۹، ۵۱۹ والشافعی فی الرسالة ۱۰۹۱ راجع لتخريجه ايضاً كنزالعمال ۳:۳۵۵ـ ۳۵۷ رقم ۳۱۰۵، ۳۱۱۰ ولاتحد فی غيره .

[3] قـالـه الـراعـی واسـمه عبيدبن حصين بن معاوية من بنی غير يكنی اباجندل شاعر اسلامی وقبله : خذااهل ان يتبع الريح مرة يدعها ويـخف الـصـوت حتىٰ تـرفـعها راجع للبيت اللالئی ۵۰ السمط ۷۶۵ والامالی ۲:۱۳۷) وفی رواية لاخفافها مرعیً بدل باخفافها ماوی وامـالـی المرتضیٰ (۱:۳۲۲) والفائق ۱:۲۲۴) فيه قصة الشبعی مع السائل حين سئل عن رجل لطم عين رجل فشرقت بالام فقال البيت فضربه مثلاً للعينٰ المضروبة ای لادية فيها حتیٰ يذهب ضوئها.

تنبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں ہونے کے باوجود وہ غضب الٰہی میں گرفتار ہے تو ناموافق جگہ میں بالاَولیٰ اس پر غضب ہوگا۔لہٰذا یہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ کی مثل ہے اور آیت کریمہ:﴿ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ ﴾ (۲۹:۵) میں تبوءَ باِثْمِی کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۶۲) اَنْكَرْتُ بَاطِلَها وَبُؤْتُ بِحَقِّهَا

میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار کیا۔

جن لوگوں نے اس کے معنی اقررتَ بحقها (یعنی اس کے حق کا اقرار کیا) کیے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی لفظ کے مطابق نہیں ہے۔اَلْبَاءَۃُ کنایہ از جماع خلف الاحمر سے منقول ہے کہ حَيَّاكَ اللّٰهُ وَبَيَّاكَ اللّٰهُ میں بَيَّاكَ اصل میں بَوَّءَكَ منزلاً ہے،جیسا کہ اٰتَيْتُهٗ الغَدَايَا وَالعشايا میں ہے۔یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

ب ی ت

اَلْبَيْتُ: اصل میں ''بیت'' کے معنی انسان کے رات کے ٹھکانہ کے ہیں۔کیونکہ بَاتَ کا لفظ رات کو کسی جگہ اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے ظَلَّ کے معنی دن گزارنے کے ہیں۔لیکن اس کے بعد یہ لفظ مطلق مسکن اور مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے،عام اس سے کہ وہ مٹی یا پتھر سے بنایا گیا ہو یا اون اور بالوں کا بنا ہوا ہے اس کی جمع بُيُوت اور ابيَات آتی ہے مگر پہلی جمع مسکن کے لیے مختص ہے اور دوسری بیت بمعنی شعر کے ساتھ۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةٌۢ بِمَا ظَلَمُوْا ﴾ (۵۲:۲۷)

یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں۔

﴿ وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً ﴾ (۸۷:۱۰) اور اپنے گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ۔

﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ ﴾ (۲۷:۲۴) دوسرے لوگوں کے گھر میں...... داخل نہ ہوا کرو۔اور تشبیہ کے طور پر ایک شعر کو بیت کہہ دیتے ہیں۔اور ہر چیز کے مکان کو (مجازا) اس کا بیت کہا جاتا ہے۔

اور اَهْلُ الْبَيْتِ کا لفظ آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں متعارف ہو چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۴۱) سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ (سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے) فرما کر متنبہ کر دیا ہے [2] کہ غلام کی نسبت اس کے آقا کی طرف ہوتی ہے،جیسا کہ حدیث میں ہے [3] (۴۶) مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُهٗ مِنْ اَنْفُسِهِمْ. کہ کسی قوم کا غلام انہی میں سے ہے اور اس کا لڑکا بھی ان ہی سے ہے۔

بَيْتُ اللّٰهِ وَالْبَيْتُ الْعَتِيْقِ: کعبہ۔قرآن میں ہے:﴿ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (۲۹:۲۲) اور

---

[1] قاله لبيد وعجزه: عندی ولم بفخرعلی كرامها۔ والبيت فی اللسان والتاج والصحاح (بوء).

[2] الحديث رواه الطبرانی فی الكبير والحاكم فی المستدرك عن عمروبن عوف الفتح الكبير ۲: ۱۵۹.

[3] وفی روايته من انفسهم راجع له (حم، د، ن، حب، ك، ت) عن ابی رافع دخ۔عن انس واحمد من حديث عتبة بن غزوان وابی موسیٰ والطبرانی من حديث ابی سعيد فتح الباری ۵: ۴۳۱ وطب۔عن مولیٰ رسول الله صلی الله عليه وسلم وطب والبيهقی۔عن ابن عباس والبغوی والباوردی وابن عساكر عن طهمان مولیٰ رسول الله صلی الله عليه وسلم كنزالعمال ۶: ۱۹۲۸، ۱۹۳۵، ۱۹۳۷، ۱۹۴۲، ۱۹۵۱ واماالفظه وابنه من انفسهم فلم احدها فی شيئی من المراجع.

خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ ﴾ (۹۶:۳) پہلا بیت جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

﴿ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ ﴾ (۱۲۷:۲) اور جب ابراہیم علیہ السلام ...... بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ﴾ (۱۸۹:۲) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام) کی حالت میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔

ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو احرام کے بعد اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے اور اسے احرام کے منافی سمجھتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کی رسوم بِرّ کے منافی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ ...... ﴾ (۲۴،۲۳:۱۳) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔

میں "مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ" سے ہر قسم کی مسرتیں مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ﴾ (۳۶:۲۴) ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کیے جائیں۔

میں بقول بعض اس سے بیوت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔جیسا کہ آیت:

﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ (۵۳:۳۳) پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو، مگر اس صورت میں کہ تم کو اجازت دی جائے۔میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ فِیْ بُیُوْتٍ سے آپؐ کے اہل بیت اور قوم مراد ہے۔اور بعض کے نزدیک قلب یعنی دل کی طرف اشارہ ہے۔بعض حکماء نے حدیث [1] (۴۷) لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَیْتًا فِیْهِ كَلْبٌ وَّلَا صُوْرَةٌ کے تحت لکھا ہے کہ یہاں بیت سے مراد دل اور کلب سے مراد حرص ہے۔کیوں کہ كَلِبَ فُلَانٌ کے معنی بہت زیادہ حرص کرنے کے ہیں اور کتا حرص میں ضرب المثل ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ اَحْرَصُ مِنَ الْكَلْبِ (فلاں کتے سے زیادہ حریص ہے) اور آیت: ﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ ﴾ (۲۶:۲۲) جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو مقرر کیا۔

میں مَكَانَ الْبَیْتِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ ﴾ (۱۱:۶۶) اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔میں جنت میں گھر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں داخل ہونا میرے لیے آسان کردے۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً ﴾ (۸۷:۱۰) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی

[1] متفق علیه من حدیث ابی طلحة زیدبن سهل الانصاری وابن ماجة من حدیث علیؓ ایضاً فی سنن ابی داؤد والنسائی وزوائد ابن حبان رقم: ٤٨٤ لكن بزیادة لفظ "ولاجنب" وهذه الزیادة وردت بطرق ضعاف عون المعبود ١: ٩٠.

کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہراؤ۔ میں گھروں کو قبلہ ٹھہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر مسجد اقصیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (۳۶:۵۱) اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

میں ایک گھر سے ایک خاندان مراد ہے جو ایک گھر میں سکونت پذیر تھے۔ جیسا کہ قریہ بول کر اہل قریہ مراد لیے جاتے ہیں۔

اَلْبَيَاتُ وَالتَّبْيِيْتُ کے معنی رات میں دشمن پر حملہ کرنے یعنی شبخون مارنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَائِمُوْنَ﴾ (۷:۹۷) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو واقع ہو اور وہ (بے خبر) سو رہے ہوں۔ ﴿ بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴾ (۷:۴) (رات کو) آتا تھا جب کہ وہ سوتے تھے یا (دن کو) جب وہ قیلولہ (یعنی دن کو آرام) کرتے تھے۔

اَلْبَيُّوْتُ: وہ معاملہ جس پر رات بھر غور و خوض کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ ﴾ (۴:۸۱) ان میں بعض لوگ رات کو مشورے کرتے ہیں۔

اور بَيَّتَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کام کی تدبیر کرنا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (۴:۱۰۸) حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے [1] (۴۸) لَا صِيَامَ لِمَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ. کہ جو شخص رات سے روزہ کی پختہ نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور بَاتَ فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی رات بھر کوئی کام کرنا کے ہیں جیسا کہ ظَلَّ کے معنی دن بھر کام کرنا آتے ہیں اور یہ دونوں افعال عادات سے ہیں۔ [2]

ب ی د

بَادَ (ض) الشَّیْءُ يَبِيْدُ بَيَادًا کے اصل معنی بَيْدَاءَ یعنی بیابان میں کسی چیز کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے ہیں اور اسی اعتبار سے کامل تباہی اور بربادی کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (۱۸:۳۵) کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو۔

اَلْبَيْدَاءُ کے معنی لق و دق صحراء کے ہیں اس کی جمع بِيْدٌ ہے اور مادۂ خروشی کو اَتَانٌ بَيْدَانَةٌ کہا جاتا ہے۔

ب ی ض

اَلْبَيَاضُ: سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ کہا

---

[1] والحديث بلفظه في النسائي عن حفصة راجع تخريج الكشاف ٢١ والفائق ١: ٣٣ رفع روايته لمن لم يبيت واصحاب السنن من حديث حفصة بلفظ "لمن لم يجمع" وباختلاف الفاظه في (ن ـعن حفصة) قطء هق عن عائشة وبمعناه في (هـ ، حم ، ٣، عن حفصة .

[2] في المطبوع ههنا اعوجاج والتسديد من المراجع.

جاتا ہے: اِبْيَضَّ، اِبْيِضَاضًا وَبِيَاضًا فَهُوَ مُبْيَضٌّ . قرآن پاک میں ہے:

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ (۳:۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ۔

﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ ﴾ (۳:۱۰۷) اور جن کے منہ سفید ہوں گے۔

اور اَبْيَض کے ایک رگ کا نام بھی ہے جو سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ابیض کہلاتی ہے۔

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں میں بہتر خیال کیا جاتا تھا، جیسے کہا گیا ہے: اَلْبَيَاضُ اَفْضَلُ وَالسَّوَادُ اَهْوَلُ وَالْحُمْرَةُ اَجْمَلُ وَالصَّفْرَةُ اَشْكَلُ اس لیے بیاض بول کر فضل و کرم مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص ہر قسم کے عیب سے پاک ہو اسے اَبْيَضُ الْوَجْهِ کہا جاتا ہے، اس بنا پر آیت مذکورہ میں اِبْيِضَاضُ الْوُجُوْهِ سے مسرت اور اِسْوِدَادُ الوجوہ سے غم مراد ہوگا، جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا ﴾ (۱۶:۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔

اور جیسے اِبْيِضَاضُ الْوُجُوْه خوشی سے کنایہ ہوتا ہے، اسی طرح آیت:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴾ (۷۵:۲۲) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔ اور آیت: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴾ (۸۰:۳۸) اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے اور خوش اور مسرور نظر آئیں گے۔ میں بھی نَضْرَۃ اور اِسْفَار سے مراد مسرت ہی ہوگی۔ شاعر نے کہا ہے [1] (منسرح)

(۷۲) اُمُّكَ بَيْضَاءُ مِنْ قُضَاعَةَ

یعنی تم عفیف اور سخی سردار ہو۔

اسی معنی میں فرمایا:

﴿ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِيْنَ ﴾ (۳۷:۴۶) جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہوگی۔

اَلْبَيْضُ: یہ بَيْضَةٌ کی جمع ہے اور انڈے کے سفید ہونے کی وجہ سے اسے بَيْضَة کہا جاتا ہے۔ انڈا سفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے، اس لیے تشبیہ کے طور بَيْضَةٌ بول کر خوبصورت عورت مراد لی جاتی ہے۔ بَيْضَةُ الْبَلَدِ [2] یہ لفظ تعریف اور مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب کلمہ تعریفی ہو تو اس سے رئیس شہر مراد ہوتا ہے۔

اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے: [3] (کامل)

(۷۳) كَانَتْ قُرَيْشٌ بَيْضَةً فَتَفَلَّقَتْ

---

[1] قاله ابن قيس المرقيات وتمامه ......في الـ ......بيت الذى يستظل فى طبنه ۔ راجع اللسان (بيض) وشرح ديوان زهير ٥٢ وديوانه ٨٣ واضداد ابى الطيب ١٣ بغير عزو وذكربعضهم تكملته .... قد تمت لها الوالدات والنضد ۔ راجع معانى الكبير للقتبى ٥٤٣ والمرزوقى ١٥٠ وفيه يستكن بدل يستظل وفى ص ٤١٩ عزاه فى حواشى المرزوقى لابن قيس الرقيات والشاهدايضاً.

[2] مثل عند الجرجانى ١٠٩ والعسكرى ٦٢ : ١٦٤ والميدانى ١ : ٦٤، ٨٤، ٨٧ والكلام عليه مستوفى فى الاضداد لابن الانبارى ٦٤ والسجتانى ١١٧ وذكره فى السمط كلاالمعنيين ٥٤٩ .

[3] البيت فى اللسان والتاج والصحاح (مح) والسيرة (١ : ٩٤) وابن ابى الحديد (٣ : ٤٥٣) والعينى (٤ : ١٤٠) منسوب الى ابن الزبعرى وفى اكثر الروايات فالخ (بالمهملة) وفى رواية اللسان وحدها "خالصها" راجع الامالى المرتضىٰ ٢ : ٨ و٢٦٨ ونسبه الى مطر وبن كعب الخزاعى وفى ٥٤٩ وذكرقصة وتاريخ الطبرى ٢ : ١٤) فى ترجمة ابن عبدمناف واضداد ابن الانبارى ٧٨ وابى الطيب ٥٥ والتنبيه للبكرى ٧٥ ومثله لحسان بن ثابت (ديوانه ١١٤ طبعه دارصادر) لكن فيه عبدالداربدل عبدمناف ١٢.

فَالْمُخُّ خَالِصُهٗ لِعَبْدِ مُنَافٍ

قریش ایک انڈے کی مثل تھے۔ جو ٹوٹا تو عبد مناف کے حصہ میں خالص مخ آئی۔

اور جب مذمت کے لیے استعمال ہو تو اس سے ذلیل آدمی مراد لیا جاتا ہے، جیسے جنگل میں پڑے ہوئے انڈے کی طرح ہر ایک توڑ سکتا ہے اور شکل و رنگ میں مشابہت کی وجہ سے خصیتین کو بَیضَتَا الرَّجُل کہا جاتا ہے۔ بَاضَتِ الدَّجَاجَۃِ: مرغی کا انڈے دینا۔ بَاضَ کَذَا: کسی جگہ پر متمکن ہونا۔ شاعر نے کہا ہے ❶

(۷۴) بَدَا مِنْ ذَوَاتِ الضِّغْنِ یَأْوِیْ
صُدُوْرُھُمْ فَعَشَّ ثُمَّ بَاضَ

بَاضَ الْحَرُّ: گرمی سخت ہونا۔

بَاضَتْ یَدُ الْمَرْءَۃِ: عورت کے ہاتھ پر انڈے کی طرح ورم ہونا۔ دَجَاجَۃٌ بَیُوْضٌ وَدَجَاجٌ بُیُوْضٌ انڈے دینے والی مرغی ج بُیُّضٌ ۔

ب ی ع

اَلْبَیْعُ کے معنی بیچنے اور شِرَاءٌ کے معنی خریدنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قیمت اور مبیع کے لحاظ سے ہوتا ہے، اسی معنی میں فرمایا: ﴿ وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاھِمَ ﴾ (۲۰:۱۲) اور اس کو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا ❷ (۴۶)

لَا یَبِیْعَنَّ اَحَدُکُمْ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ کہ کوئی اپنے بھائی کی خرید پر خرید نہ کرے۔

اَبَعْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو بیع کے لیے پیش کرنا۔ شاعر نے کہا ہے ❸ (کامل)

(۷۵) فَرَسًا فَلَیْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعٍ

یعنی ہم عمدہ گھوڑی فروخت کے لیے پیش نہیں کریں گے۔

اَلْمُبَایَعَۃُ وَالْمُشَارَۃُ: خرید و فروخت کرنا۔

﴿ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ (۲۷۵:۲) حالانکہ سودے کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

﴿ وَذَرُوا الْبَیْعَ ﴾ (۹:۶۲) اور (خرید و فروخت ترک کردو)۔ ﴿ لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلَالٌ ﴾ (۳۱:۱۴) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا نہ دوستی (کام آئے گی)

بَایَعَ السُّلْطَانَ (بادشاہ کی بیعت کرنا) اس قلیل مال کے عوض جو بادشاہ عطا کرتا ہے اس کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ اس اقرار کو بَیْعَۃٌ یا مُبَایَعَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ﴾ (۱۱۱:۹) تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ میں بیعت رضوان کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ ﴾ (۱۸:۴۸) (اے پیغمبر) جب

❶ لم اجدہ فی المراجع.

❷ رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ ط، خ، ف، ہ، عن ابن عمرو عنہ ایضاً حم، ق، د، ت .

❸ واولہ فرضیت آلاء الکمیت فمن یبع ۔ والبیت فی اللسان (بیع) والاقتضاب ۴۰۵ واصلاح یعقوب ۲۳۵ وحواشی المقاییس ۱: ۲۷) قالہ اجدع بن مالک الھمدانی وفی روایۃ اذلاء الکمیت بدل آلاء لکمیت وراجع لترجمۃ الشاعر الاشتقاق (۲: ۴۲۵ و المؤتلف ۶۱.

مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔اور آیت کریمہ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ ﴾ (۹:۱۱۱) میں پایا جاتا ہے۔

اَلْبَاعُ: (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار جو تقریباً ۶ فٹ ہوتی ہے) یہ مادہ واوی سے ہے کیونکہ بَـاعَ فِی السَّیْـرِ یَبُوْعُ کہا جاتا ہے۔جس کے معنی گھوڑے کے لمبے لمبے قدم رکھنا کے ہیں۔ ❶

ب ی ل

اَلْبَالُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَا بَـالَیْتُ بِکَذَا بَالَةً کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ کَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴾ (۴۷:۲) ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت سنوار دی۔﴿ فَمَـا بَـالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴾ (۲۰:۵۱) تو پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے ❷ اور انسان کے دل اور دل میں گذرنے والے خیال کو بھی بَـالٌ کہا جاتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے:

خَطَرَ کَذَا بِبَالِیْ . میرے دل میں یہ بات کھٹکی۔

ب ی ن

اَلْبَیْـــنُ کے معنی دو چیزوں کا درمیان اور وسط کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجَـعَـلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا ﴾ (۱۸:۳۲) اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔

محاورہ ہے بَـانَ کَذَا کسی چیز کا الگ ہو جانا اور جو کچھ اس کے تحت پوشیدہ ہو، اس کا ظاہر ہو جانا۔چونکہ اس میں ظہور اور انفصال کے معنی ملحوظ ہیں اس لیے یہ کبھی ظہور اور کبھی انفصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور گہرے کنویں کو بَیُوْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ پانی نیچے اتر جانے کے سبب اس سے پانی نکالتے وقت رسی کو ہاتھ سے جدا کرنا پڑتا ہے، تو اس میں انفصال کا معنی ملحوظ ہے۔

بَـانَ الصُّبْحُ: صبح نمودار ہوگئی اور آیت کریمہ: ﴿ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَکُمْ ﴾ (۶:۹۵) آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے۔

میں بَیْـــنَ کے معنی رشتہ اور تعلق کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ تمہارے اموال، قبیلہ اور اعمال جن پر تم اعتماد کرتے تھے۔سب ضائع ہو گئے جس کی طرف کہ آیت: ﴿ یَـــوْمَ لَا یَـنْـفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ (۲۶:۸۸) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔میں اشارہ پایا جاتا ہے اور یہی معنی آیت:

﴿ وَلَـقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی ﴾ (۶:۹۴) ایسے ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے۔کے ہیں۔واضح رہے کہ لفظ بَیْـــنَ کبھی اسم بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی ظرف۔چنانچہ آیت مذکورہ میں دو قراءتیں ہیں جو اسے اسم قرار دیتے ہیں وہ بَیْنُکُمْ (بضمہ نون) پڑھتے ہیں اور جن کے نزدیک ظرف ہے وہ بَیْنَکُمْ (بفتح نون) پڑھتے ہیں اور ظرف غیر متمکن ہونے کی بنا پر اسے مفتوح رہنے دیتے ہیں ❸ چنانچہ آیات:

---

❶ وایضاً البیعة معبد النصاری ۔لَهُدِّمَتْ صوامعُ وَبِیَعٌ(۲۲ : ۴۰) .

❷ وایضاً فَمَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (۱۲ : ۵۰) .

❸ قرأة الرفع منسوب الی حمزة الکوفی احد القراء السبعة والفتح قراء ة نافع والکسائی وحفص (راجع اضداد ابی الطیب (۸۳ وبحر المحیط لابی حیان ۴ : ۱۸۲).

﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۴۹:۱) (کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ ﴿ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰكُمْ صَدَقَةً ﴾ (۵۸:۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸:۲۲) تو آپ ہم میں انصاف کا فیصلہ کر دیجیے۔ ﴿ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ ﴾ (۴:۹۷) اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو۔ میں بَيْنَ ظرف واقع ہوا ہے اور آیت:

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا ﴾ (۱۸:۶۱) جب ان کے ملنے کے مقام پر پہنچے۔

میں بَيْنَ کا لفظ اسم ظرف بھی ہوسکتا ہے اور بمعنی مصدر بھی یعنی جب وہ ان کے الگ ہونے کے مقام پر پہنچے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ بَيْنَ کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے بَيْنَ الْبَلَدَيْنِ (دو شہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود ہوں۔ جیسے: بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ بَيْنَ الْقَوْمِ اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بَيْنَ کو مکرر لانا ضروری ہوتا ہے۔ [1] جیسے فرمایا:

﴿ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ (۴۱:۵) اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

﴿ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا ﴾ (۲۰:۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو۔ اور کہا جاتا ہے: هٰذَا الشَّيْءُ بَيْنَ يَدَيْكَ: یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ ﴾ (۷:۱۷) پھر ان کے آگے..... (غرض ہر طرف سے) آؤنگا۔ ﴿ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا ﴾ (۱۹:۶۴) جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے...... سب اسی کا ہے۔ ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا ﴾ (۳۶:۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی۔ اور ان کے پیچھے بھی۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰاةِ ﴾ (۵:۴۶) جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔ ﴿ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ﴾ (۳۸:۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے اور آیت کریمہ:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (۳۴:۳۱) اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان (کتابوں) کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔ میں بَيْنَ يَدَيْهِ سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ (۸:۱) خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بَيْنَ کے بعد مَا یا الف کا اضافہ کرکے حین کے معنی

[1] اماآية لانفرق بين احد من رسله ففيها لفظة احد بمعنى الجميع فلااعتراض (نووى ۱ : ۷).

میں استعمال کر لیتے ہیں [1] جیسے بَیْنَمَا زَیْدٌ یَفْعَلُ کَذَا وَبَیْنَا نَفْعَل تو یعنی درآنحالیکہ زید یہ کام کر رہا تھا۔ شاعر نے کہا ہے [2] ع (کامل)

(۷۲) بَیْنَا تَعَنُّقِهِ الْکُمَاةَ وَرَوْعَةٌ
یَوْمًا أُتِیحَ لَهُ جَرِیٌّ سَلْفَعٌ

اس حال میں کہ وہ ایک روز بہادروں سے مقابلہ اور مرادغہ کر رہا تھا کہ اس کے لیے ایک دلیر بہادر مقصد ہو گیا۔

بَانَ وَاسْتَبَانَ وَتَبَیَّنَ کے معنی ظاہر اور واضح ہو جانے کے ہیں اور بَیَّنْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دینے کے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتَبَیَّنَ لَکُمْ کَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ ﴾ (۴۵:۱۴) اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح (کا معاملہ) کیا تھا۔

﴿ وَقَدْ تَبَیَّنَ لَکُمْ مِنْ مَسَاکِنِهِمْ ﴾ (۳۸:۲۹) چنانچہ ان کے (ویران) گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ﴿ وَلِتَسْتَبِینَ سَبِیلُ الْمُجْرِمِینَ ﴾ (۵۵:۶) اور اس لیے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے۔

﴿ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ﴾ (۲۵۶:۲) ہدایت صاف طور پر ظاہر (اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

﴿ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیَاتِ ﴾ (۱۱۸:۳) ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دیں۔

﴿ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ﴾ (۶۳:۴۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں۔

﴿ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۴۴:۱۶) ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔

﴿ لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ﴾ (۳۹:۱۶) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔

﴿ فِیْهِ اٰیَاتٌ بَیِّنَاتٌ ﴾ (۹۷:۳) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ ﴾ (۱۸۵:۲) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے۔

اور بیان کرنے والے کے اعتبار سے آیت کو مُبَیِّنَةٌ بھی کہا جاتا ہے، جیسے اٰیَةٌ مُبَیِّنَةٌ وَمُبَیِّنَاتٌ وَمُبَیَّنَاتٌ اَلْبَیِّنَةُ کے معنی واضح دلیل کے ہیں۔ خواہ وہ دلالت عقلیہ ہو یا محسوسہ اور شَاهِدَان (دو گواہ) کو بھی بَیِّنَة کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے [3] (۴۷) اَلْبَیِّنَةُ عَلَی

---

[1] ویسمیٰ هذه الف الکافة وقال بعضٌ مالکافة وقیل اشباع وبین مضافة الی الحملة (المغنی لابن هشام ۱: ۴۱۱)

[2] قاله ابوذؤیب المخضرمی فی رثاء بنیه والشُطرالاول فی المطبوع مصحف والتسدید من المراجع والبیت فی اللسان والتاج (بین) والمعنیٰ لابن هشام: رقم ۶۹۸ والسیوطی ۹۲۔۲۶۷ وفی روایتهم جمیعاً تعانقه والبیت فی الخزانة ۳: ۱۸۳ والتبریزی شرح الحماسة (۴: ۲۹۴ والمرزوقی ۱۷۸۴ واستشهد به الاصمعی وکثیر من النحاة بان لفظة بینا وبینما یاتیان للمفاجاة ولایلزم ان تقع بعدهما اذ او اذا بخلاف ماذهب الیه سیبویه راجع للبحث الکتاب لسیبویه والبیت ایضاً فی الاشباه النحویه ۱: ۱۶۶) والجمهرة ۲۴۷ فی ۶۲ بیتاً ودیوان الهذلیین (۱: ۱۸) وشرح الدرة للخفاجی ۹۷۔

[3] رواه الترمذی عن ابن عمرو لکن لفظة والیمین علی المدعیٰ علیه وفی البیهقی وابن عساکر عن ابن عمر ۔علی من انکر (راجع الفتح الکبیر ۲: ۲۰)۔

الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ۔ کہ مدعی پر گواہ لانا ہے اور مدعا علیہ پر حلف۔قرآن میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ﴾ (۱۱:۱۷) بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل (روشن) رکھتے ہیں۔

﴿ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ ۢبَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ ۢبَیِّنَةٍ ﴾ (۴۲:۸) تاکہ جو مرے بصیرت پر (یعنی یقین جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر (یعنی حق پہچان کر) جیتا رہے۔

﴿ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ﴾ (۷:۱۰۱) ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے۔

اَلْبَیَانُ کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔اسے بھی بَیَانٌ کہہ دیتے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ "بَیَانٌ" دو قسم پر ہے۔ ایک بیان بِالتَّخْبِیْز یعنی وہ اشیاء جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں۔دوسرے بیان بالاختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ (۴۳:۶۲) اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہارا اعلانیہ دشمن ہے۔یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔اور بیان بالاختیار کے متعلق فرمایا:﴿ فَاسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ﴾ (۱۶:۴۳،۴۴) اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

﴿ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۶:۴۴) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کردو۔

اور کلام کو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿ هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (۳:۱۳۸) یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بیان صریح ہے۔اور مجمل و مبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے۔جیسے:﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴾ (۷۵:۱۹) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بَیَّنْتُهٗ وَاَبَنْتُهٗ کسی چیز کی شرح کرنا۔جیسے فرمایا:﴿ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۶:۴۴) تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کردو۔

﴿ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴾ (۲۶:۱۱۵) کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴾ (۳۷:۱۰۶) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

﴿ وَلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴾ (۴۳:۵۲) اور صاف گفتگو بھی نہیں کرسکتا۔

﴿ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ ﴾ (۴۳:۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کرسکے۔

❀❀❀

کتاب التاء

ت (حرف جار)

شروع کلمہ میں قسم کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ (۲۱۔۵۷) اور اللہ کی قسم...... میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

(۲) فعل مستقبل کے شروع میں مخاطب پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ ﴾ (۱۰۔۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو۔ نیز صیغہ تانیث ہونا ظاہر کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (۴۱۔۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے۔

(۳) اور آخر کلمہ میں یا تو زائدہ علامت تانیث کے طور پر آتا ہے۔ اور یہ کبھی تو حالت وقف میں ھا بن جاتا ہے۔ جیسے "قَائِمة" اور کبھی وقف اور وصل دونوں حالتوں میں ثابت رہتا ہے۔ جیسے اُخْتٌ وَبِنْتٌ اور (۲) یا جمع مؤنث سالم کے آخر میں الف کے بعد آتی ہے، جیسے مُسْلِمَاتٌ وَمُؤْمِنَاتٌ.

(۴) فعل ماضی کے آخر میں جب مضموم ہو تو ضمیر متکلم کہلاتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴾ (۷۴۔۱۲) اور جس کو ہم نے مال کثیر دیا۔

اور مفتوح ہونے کی صورت میں ضمیر مذکر مخاطب ہوتی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ (۱۔۶) جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا۔

اور مکسور ہو تو واحد مؤنث حاضر کی ضمیر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے ﴿ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴾ (۱۹۔۲۷) یہ تو تم نے برا کام کیا۔

ت ب ب

اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ (ض) کے معنی مسلسل خسارہ میں رہنے کے ہیں، کہا جاتا ہے تَبًّا لَّهٗ (اللہ اسے خائب و خاسر کرے) تَبَّ لَهٗ وَتَبَّبْتُهٗ کسی سے "تَبًّا لَّكَ" کہنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ ﴾ (۱۱۱۔۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں یعنی وہ ہمیشہ خسارے میں رہے۔ یہی مفہوم ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (۲۲۔۱۱) میں پایا جاتا ہے۔ ﴿ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴾ (۱۱۔۱۰۱) نقصان میں ڈالنے (یعنی تباہ کرنے) کے سوا ان کے حق میں اور کچھ نہ کر سکے۔

﴿ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴾ (۴۰۔۳۷) اور فرعون کی تدبیر تو بیکار تھی۔

ت ب ت[1]

اَلتَّابُوْتُ کے معنی صندوق کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ ﴾ (۲۔۲۴۸) کہ

[1] والانسب ذكره فى (ت، دب) لانه وزنه فعلوت لان فاعولا قليل وغير معروف فهو اذافعلوت من التوب وهو الرجوع (ملخصامن الكشاف ۱ : ۲۹۳ ج ۱) لكن صاحب اللسان حج كونه (ت، ب ،ت) كماذكره المؤلف وقال الصواب ان وزنه فاعولا لان تاء ه اصليه ۱۲.

تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ وہ صندوق لکڑی کا تھا، جس میں حکمت کی کتابیں تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تابوت سے مراد دل ہے اور اس میں سکینت سے مراد علم ہے، اسی لیے دل کو سَفَطُ الْعِلْمِ وَبَیْتُ الْحِکْمَةِ وَتَابُوْتُ الْعِلْمِ وَصندوقُهٗ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:
اِجْعَلْ سِرَّكَ فِیْ وِعَاءٍ غَیْرَ سَرَبٍ. کہ اپنے بھید کو ایسے برتن میں رکھو جو ٹپکتا نہ ہو اور دل کا نام تَابُوْتَ ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق فرمایا❶ (۴۷) هُوَ کُنَیْفٌ مُلِئَ عِلْمًا وہ ایک ایسا برتن ہے جو علم سے پر ہے۔

ت ب ع

تَبِعَهٗ وَاتَّبَعَهٗ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲۔۳۸) تو جنھوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غمناک ہوں گے۔ ﴿ قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ . اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْأَلُكُمْ اَجْرًا ﴾ (۳۶۔۲۰،۲۱) کہنے لگا کہ اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کہ جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔ ﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ ﴾ (۲۰۔۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ ﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۷۔۳) (لوگو!) جو (کتاب) تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے، اس کی پیروی کرو۔ ﴿ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ (۲۶۔۱۱۱) اور تمہارے پیرو تو ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ ﴿ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآئِیْ ﴾ (۱۲۔۳۸) اور اپنے باپ دادا ...... کے مذہب پر چلتا ہوں، ﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (۴۵۔۱۸) پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے رستے پر (قائم) کردیا ہے تو اسی (رستے) پر چلے چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔
﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو......شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
﴿ فَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ﴾ (۲۔۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔
﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔
﴿ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِ ﴾ (۱۸۔۶۶) اگر آپ اس میں سے مجھے سکھائیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ﴾ (۳۱۔۱۵) اور جو شخص میری طرف رجوع لائے، اس کے راستے پر چلنا۔ اَتْبَعَهٗ کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴾

❶ قارن مجازا القران لابی عبیدۃ (۲ : ۲۰۹) وزادوموضع تبع الجاهلية موضع الخليفة فى الاسلام وهم ملوك العرب الاعاظم (ايضاً فتح الباری ۸ : ۴۳۹).

(۲۶۔۶۰) تو انھوں نے سورج نکلتے ہی جالیا۔

﴿ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴾ (۱۸۔۸۹) پھر اس نے دوسرا راستہ پایا۔ ﴿ وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ﴾ (۲۸۔۴۲) اور اس دنیا میں ہم نے ان کے ساتھ لعنت لگادی۔ ﴿ فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطَانُ ﴾ (۷۔۱۷۵) اس نے اسے پالیا۔ ﴿ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا ﴾ (۲۳۔۴۴) تو ہم بھی بعض کو بعض کے پیچھے لگاتے (یعنی ہلاک کرتے) رہے۔ اَتْبَعْتُ عَلَیْهِ (قرض) دوسرے کے حوالہ کرنا۔ دوسرے پر اتارنا۔ احاطہ کرنا۔ اُتْبِعَ فُلَانٌ بِمَالٍ مال اس پر حوالہ کیا گیا۔

اَلتَّبِیْـــعُ: بچھڑا جو ابھی تک گائے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔

اَلتَّبَـــعُ: چارپائے کی ٹانگ۔ گویا دوڑتے وقت اس کی ٹانگیں اُن لوگوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو طلب انتقام میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوتے ہیں۔ اَلْـمُتْبِعُ وہ چوپایہ جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ تُبَّعٌ رؤساء (یمن) کا قلب تھا کیونکہ وہ سیاست و ریاست میں ایک دوسرے کی اتباع کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ تُبَّعٌ ایک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی رعیت اس کی مطیع اور فرمانبردار تھی، اس کی جمع تَبَاعَةٌ ہے [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ﴾ (۴۴۔۳۷) بھلا یہ اچھے ہیں یا تبع کی قوم۔ اَلتُّبَّـــعُ: (ایضاً) سایہ کیونکہ وہ دھوپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

ت ب ر

اَلتَّبْرُ: (ض) کے معنی توڑ دینے اور ہلاک کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ تَبَرَهٗ وَتَبَّرَهٗ اس نے ہلاک کر ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ هٰـؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ ﴾ (۷۔۱۳۹) یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے۔ ﴿ وَكُـلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ﴾ (۱۷۔۱۷) اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔

﴿ وَلَا تَـزِدِ الـظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴾ (۷۱۔۲۸) اور ظالم لوگوں کے لیے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

ت ت ر

تَتْرٰی یہ مُـوَاتَرَةٌ سے فَـعْلٰی کے وزن پر ہے، جس کے معنی کسی چیز کے یکے بعد دیگرے آنے کے ہیں۔ اصل میں یہ وَتْرٰی واؤ کے ساتھ ہے۔ [2] تُرَاث اور تبحاۃ کی طرح اس کی واؤ تا سے تبدیل ہوگئی ہے [3] کے نزدیک یہ منصرف ہے وہ الف زائدہ بناتے ہیں [4] اور جن کے نزدیک غیر منصرف ہے۔ ان کے نزدیک الف تانیث ہے۔ [5]

قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثُـمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ﴾ (۲۳۔۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

---

[1] ولذا ذکرہ المولف ایضاً فی (وتر).

[2] ای علی خلاف القیاس ومثلها فی احد وآناۃ والسماء.

[3] ان کانت للالحاق کمافی اوطیٰ بنون نکرۃ لامعرفۃ وان کانت اصلیۃ بنون دائما.

[4] وفی شرح الکتاب للسیرانی (۲ : ۹) وجعل بعضهم الفها للتانیث فَیَقْرَءُ بغیر تنوین وهی قرأۃ الجمهور وقرء ابن کثیر وابو عمرو بالتنوین فوزنه فعل وللفتح بدل من التنوین وخط المصحف یؤید الانصراف والتنوین.

[5] والفراء.

فراء کہتے ہیں کہ رفعی اور جری حالت میں تَتْــرًی اور نصبی حالت میں تَتْرًا ہے اور الف تنوین کے عوض میں آیا ہے۔ ثعلب کے نزدیک یہ تَفْعَلُ کے وزن پر ہے۔ ابوعلی الفسور کہتے ہیں ❶ کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ صفت کا کوئی صیغہ تَفْعَلُ کے وزن پر نہیں آتا۔

ت ج ر

تَـجَـرَ (ن) تَجْرًا وَتَجَارَۃً کے معنی نفع کمانے کے لیے راس المال کا کاروبار میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تَـاجِرٌ وَتَجْرٌ جیسے صَـاحِبٌ وَصَحْبٌ یاد رہے کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس میں تاء (اصلی) کے بعد جیم ہو۔ رہاتِـــجَـاہٌ تو اصل میں وِجَاہٌ ہے اور تَجُوْبُ وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۶۱۔۱۰) میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں عذاب الیم سے نجات دے۔

میں لفظ تــجـارۃ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت: تُـؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ، میں بیان فرمادی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ اِشْتَـرَوُا الـضَّلٰلَةَ بِـالْـهُدٰى فَمَـا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ﴾ (۲۔۱۶) ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا۔

﴿ اِلَّآ اَنْ تَـكُـوْنَ تِـجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ (۴۔۲۹) ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہوجائے تو وہ جائز ہے۔)

﴿ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ ﴾ (۲۔۲۸۲) سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ فُلَانٌ تَاجِرٌ بِكَذَا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

ت ح ت

تَـحْـتُ: (اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لَاَ كَـلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ (۵۔۶۶) تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (۲۔۲۵) (نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

﴿ فَـنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا ﴾ (۹۔۲۴) اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے: اَلْمَالُ تَحْتَهٗ (مال اس کے نیچے ہے) اَسْفَلُهٗ اَغْلَظُ مِنْ اَعْلَاهُ (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے۔)

حدیث پاک میں ہے ❷ (۴۸) لَا تَـقُـوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَـظْهَـرَ التُّحُوْتُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔ بعض نے کہا ہے کہ

---

❶ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

❷ كلمة من حديث طويل ذكره ابن حبان في زوائده في امارات الساعة أثناء حديث ابي هريرة رقم ۱۸۸۶ والحافظ في الفتح ۱۶ : ۱۲۱) من الطبراني في الاوسط وايضاً من طريق ابي علقمة عن ابي هريرة وعبدالله بن مسعود راجع الزمخشري في الفائق ۱ : ۶۹ (تحت) قال وذكره مثلاً للاء (ذ).

حدیث میں آیت کریمہ:
﴿ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴾ (۸۴۔۴) اور جب یہ زمین ہموار کردی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے، اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

ت خ ذ

تَخِذَ: (س) بمعنی اَخَذَ یعنی پکڑنے کے آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے ❶ ع (طویل)

(۷۷) وَقَدْ تَخِذَتْ رِجْلِيْ اِلٰى جنب غَرزَهَا
نَسِيْفًا كَأُفحوصِ القَطَاة الْمُطَوَّق

اس کے رکاب کے پہلو میں انڈا دینے والی قطا کے گڑھے جیسے نشان کو میرے پاؤں چھوڑ رہے تھے۔

اسی سے اِتَّخَذَ (افتعال) ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ ﴾ (۱۸۔۵۰) کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔
﴿ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا ﴾ (۲۔۸۰) ان سے پوچھو کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے۔
﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ﴾ (۲۔۱۲۵) جس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، اس کو نماز کی جگہ بنالو۔
﴿ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ (۶۰۔۱) تم میرے اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔
﴿ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴾ (۱۸۔۷۷) اگر آپ چاہتے تو ان سے (اس کا) معاوضہ لیتے (تاکہ کھانے کا کام چلتا)

ت ر ب

اَلتُّرَابُ کے معنی مٹی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (۳۰۔۲۰) کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔
﴿ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴾ (۷۸۔۴۰) کہ اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔

تَرِبَ کے معنی فقیر ہونے کے ہیں کیونکہ فقر بھی انسان کو خاک آلودہ کردیتا ہے۔فرمایا:﴿ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴾ (۹۰۔۱۶) یا فقیر خاکسار کو۔ یعنی جو بوجہ فقر و فاقہ کے خاک آلود رہتا ہے۔اَتْرَبَ (افعال) کے معنی مال دار ہونے کے ہیں۔گویا اس کے پاس مٹی کی طرح مال ہے۔
نیز تُرَاب کے معنی زمین کے بھی آتے ہیں اور اس میں اَلتَّيْرَابُ (ج) تَيَارِبُ اور اَلتَّوْرَابُ وَالتَّوْرَبُ وَالتَوْرَابُ وغیرہ دس لغات ہیں۔ ❷
رِيْحٌ تَرِبَةٌ: خاک اڑانے والی ہوا۔اسی سے آنحضرت

---

❶ وغریب ابی عبید۳: ۱۲۵ قاله الممرق العبدی واسمه شاس بن نهار والبیت فی اللسان (ط ر ق) وفی روایته لقد بدل وقد راجع ایضاً التاج واللسان (تخذ، فحص، طرق، نسف،) والصحاح (طرق) والمحکم (فحص) والاصمعیات ۴۷ والجمهرة ۲: ۶، ۱۶۳، ۳/۳۷۲: ۳۹) والعینی (۴: ۵۹۰) ومجاز القران لابی عبیدة (۱: ۴۱۱) والطبری ۱۵: ۲۹۱) وشواهد الکشاف والسیوطی ۲۳۳ والاشباه النحویه ۱: ۱۰۹، ۳: ۴۱) والشاعر جاهلی قدیم ترجم له فی الشعراء ۲۳۶ والمؤتلف ۱۸۵ والمرزبانی ۴۹۵ والاشتقاق ۱۹۹ والبیت ایضاً فی الحیوان ۵: ۵۸۱) والقطاه المطرق التی حان خروج بیضها والنسیف اثر رکض الرجل بجنبی البعیر اذا فحص عنه الوبر وفی المطبوع المطوق بالواو بدل الراء مصحف والبیت ایستشهد به علی ان تحذیاتی بمعنیٰ اتخذ.

❷ راجع المعاجم.

ﷺ کا فرمان ہے (1) (۵۰) عَلَيْكَ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ کہ شادی کے لیے دیندار عورت تلاش کرو۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس میں تنبیہ ہے کہ دیندار عورت تیرے ہاتھ سے نہ جانے پائے، ورنہ تمہارا مقصد حاصل نہیں ہوگا اور تم غیر شعوری طور پر فقیر ہو جاؤ گے۔ (2)

بَارِحٌ تَرِبٌ خاک اڑانے والی ہوا۔

تَرَائِبُ سینہ کی پسلیاں (مفرد تَرِيبَةٌ) قرآن پاک میں ہے: ﴿يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۶۔۳۷) کنواریاں اور شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔ ﴿وَكَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾ (۷۸۔۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔ ﴿وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ﴾ (۳۸۔۵۲) اور ان کے پاس نیچی نگاہ رکھنے والی (اور) ہم عمر (عورتیں) ہوں گی۔ میں اتراب کے معنی ہیں ہم عمر جنہوں اکٹھی تربیت پائی ہوگی گویا وہ عورتیں اپنے خاوندوں کے اس طرح مساوی اور مماثل یعنی ہم مزاج ہوں گی جیسے سینوں کی ہڈیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور یا اس لیے کہ گویا زمین پر بیک وقت واقع ہوئی ہیں اور بعض نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ اکٹھی مٹی میں ایک ساتھ کھیلتی رہی ہیں۔

ت ر ث

تُرَاثٌ: (ورثہ) یہ اصل میں وِرَاثٌ مثال واوی ہے۔ (جیسا کہ ورث میں بیان ہوگا۔) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

ت ر ف

اَلتُّرْفَةُ: عیش وعشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اُتْرِفَ فُلَانٌ فَهُوَ مُتْرَفٌ وہ آسودہ حال اور کثرت دولت کی وجہ سے بدمست ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲۳۔۳۳) اور دنیا کی زندگی میں ہم نے اس کو آسودگی دی رکھی تھی۔ ﴿وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ﴾ (۱۱۔۱۱۶) اور جو ظالم تھے وہ ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش وآرام تھا ﴿وَارْجِعُوْا اِلٰى مَا اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ﴾ (۲۱:۱۳) اور جن (نعمتوں) میں تم عیش وآسائش کرتے تھے ان کی طرف لوٹ جاؤ۔ ﴿اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ﴾ (۲۳۔۶۴) ہم نے ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو پکڑ لیا۔ ﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا﴾ (۱۷۔۱۶) تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔ اور یہی وہ مترفین ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَاَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ﴾ (۸۹۔۱۵) مگر انسان

---

(1) راجع للحديث النهايه (ترب) واللسان (ترب) واضداد ابى الطيب ۱۱۶ واختلف فى تاويله انظر اعراب ابن خالويه ۹۳ واصل الحديث متفق من حديث ابى هريرة راجع تخريج العراقى الاحياء (۱: ۳۷ والنيل للشوكانى ۶: ۱۱۲۔۱۱۳، شرح الترمذى للشيخ المباركبورى وادب الدنيا والدين علماء روى ۲۷۴ وفى رواية ابى سعيد الخدرى تربت يمينك كمافى زوائد ابن حبان رقم ۱۲۳۱.

(2) تالى القالى فى الذيل وحمله اكثر العماء على التنبيه والاغراء وان كان لفظه الدعاء عليه (راجع اضداد ابى الطيب ۱۱۶۔۱۱۸ والذيل ۵) ومن حمله على الدعاء عليه قال معناه: ان اخترت غير ذات الدين وخالفت الوصية ـ وههنا محمل آخر للحديث وهوان اترب من الاضداد ياتى بمعنى الفقر وبمعنى الغنى فمعناه الدعاء له بالغنااذا اقبل وصيته.

(عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔

ت ر ق

اَلتَّرْقُوَةُ کے معنی ہنسلی کی ہڈی کے ہیں ❶ (ج)

اَلتَّرَاقِیُ: قرآن پاک میں ہے:

﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ﴾ (۷۵۔۲۶) دیکھو جب جان گلے تک پہنچ جائے۔

ت ر ک

تَرْكُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں ❶ خواہ وہ چھوڑنا ارادہ و اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادۃً اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا: ﴿ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ ﴾ (۱۸۔۹۹) اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ (روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔ ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ (۴۴۔۲۴) اور دریا سے (کہ) خشک (ہو رہا ہوگا) پار ہو جاؤ۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ ﴾ (۴۴۔۲۵) وہ لوگ بہت سے باغ چھوڑ گئے۔

اسی سے جب کوئی شخص اپنی موت کے بعد مال چھوڑ جاتا ہے تو اس کو تَرِكَةٌ کہا جاتا ہے اور کبھی ہر عمل کے متعلق جو کسی حالت پر منتہی ہو۔ تَرَكْتُهٗ كَذَا یا اس کے ہم معنی جَعَلْتُهٗ کا محاورہ استعمال کر لیتے ہیں، جیسے: تَرَكْتُ فُلَانًا وَحِيْدًا کہ میں نے اسے اس حال میں چھوڑا کہ وہ اکیلا تھا۔

اَلتَّرِيْكَةُ کے اصل معنی جنگل میں پڑے ہوئے انڈا کے ہیں اور (مجازاً) لوہے کے خود کو بھی تَرِيْكَة کہا جاتا ہے، جیسے کہ اس پر بَيْضَة کا لفظ بولا جاتا ہے۔

ت س ع

تِسْعَةٌ: (نو) اور تِسْعُوْنَ (نوے) اسماء عدد سے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ تِسْعَةُ رَهْطٍ ﴾ (۲۷۔۴۸) نو شخص۔ ﴿ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً ﴾ (۳۸۔۲۳) ننانوے دنبیاں۔ ﴿ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴾ (۷۴۔۳۰) اس پر انیس داروغے ہیں۔ ﴿ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴾ (۱۸۔۲۵) نو اوپر تین سو سال۔

اَلتِّسْعُ: (ایضاً) نو دن کے پیاسے اونٹ۔ اَلتُّسْعُ ہر ماہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ (ان تین دنوں) کو تُسْعٌ کہا جاتا ہے۔ تَسَعْتُ الْقَوْمَ قوم کے مال سے نواں حصہ وصول کرنا میں ان میں نواں تھا۔

ت ع س

اَلتَّعْسُ: اصل میں تَعْس کے معنی ہیں لغزش کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا، پستی میں گر کر کسی چیز کا ٹوٹ جانا، اور یہ تَعِسَ (س) تَعْسًا وَتَعْسَةً کا مصدر ہے۔ ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتَعْسًا لَّهُمْ ﴾ (۴۷۔۸) ان کے لیے ہلاکت ہے ❸

---

❶ ذکرہ بعض اصحاب اللغتہ فی (ر ق ی) والصحیح انہ من (ت ر ق) کماھھنا قال فی اللسان (ت ر ق) علی وزن فعلوۃ.

❷ قد یأتی فی معنی ابقی کمافی الآیۃ: وترکنا علیہ فی الآخرین (۳۷۔۷۸) ای ابقینا الثناء علیہ ۱۲.

❸ تعس۔ والفعل منہ تعس مثل وضع کمافی القاموس. وتعسًا لہ منصوب علی المصدربفعل یجب اضمارہ (راجع الکشاف) وقال الخفاجی فی الدرۃ ۱۲۷ یقال فی الدعاء علی العاثر والفعل منہ بکسر العین ۱۲.

ت ف ث

اَلتَّفْثُ کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل کچیل کے ہیں، جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں۔
یہاں لِيَقْضُوْا قَضَى الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو قطع اور زائل کرنے کے ہیں ایک اعرابی کا قول ہے۔ مَا اَتْفَثَكَ وَمَا اَدْرَنَكَ تو کس قدر میلا کچیلا ہے۔

ت ق و

اَلتَّقْوٰى: تقویٰ کی تاء واؤ سے مبدل ہے، اس پر اس کے باب (وق ی) میں بحث آئے گی۔

ت ک ء

اَلْمُتَّكَأُ: (اسم مکان)) سہارہ لگانے کی جگہ۔ تکیہ جس پر ٹیک لگائی جائے اور آیت کریمہ: ﴿ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً ﴾ (۱۲۔۳۱) اور ان کے لیے ایک محفل مرتب کی۔ میں مُتَّكَأً کے معنی ترنج کے ہیں [1] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد کھانا اور یہ اِتَّكَأَ عَلٰى كَذَا فَاَكَلَهُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰۔۱۸) یہ میری لاٹھی ہے، جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔
﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ﴾ (۵۲۔۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔
﴿ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِئُوْنَ ﴾ (۳۶۔۵۶) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔
﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِيْنَ ﴾ (۵۶۔۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

ت ل ل

اَلتَّلُّ: اصل میں تَلٌّ کے معنی بلند جگہ یعنی ٹیلہ کے ہیں اور تَلِيْلٌ گردن کو کہتے ہیں اور ﴿ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ (۳۷۔۱۰۳) کے معنی ٹیلے پر لٹادینے کے ہیں۔ جیسے: تَرَّبَهٗ (کسی کو زمین پر گرانا) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی تَلِيْل یعنی گردن اور رخسار کے بل لٹادینا ہیں جیسا کہ جبین (پٹ پڑی) کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے۔
مِتَلٌّ: نیزہ وغیرہ جسے مار کر کسی کو پچھاڑا جاتا ہے، (سیدھا اور سخت نیزہ)

ت ل و

تَلَاهُ: (ن) کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے۔ اس معنی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ اور تَلِوٌ آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قرأت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے غور وفکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے، اس معنی کے لیے اس کا مصدر تِلَاوَۃٌ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلَاهَا ﴾ (۹۱۔۲) اور چاند کی قسم! جب وہ سورج کا اتباع کرتا ہے۔ میں سورج کا اتباع بلحاظ اقتداء اور مرتبہ مراد ہے، اور یہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور وہ سورج کے لیے بمنزلہ خلیفہ کے ہے۔ چنانچہ بعض

---

[1] قال القبتي المتكأ الطعام قال ابو عبيدة في مجازة (۱: ۳۰۹) وزعم قوم انه لاترج وهذاابطل باطل في الارض لكن ردعليه ابوعبيدة في غريبه وقال الفقهاء اعلم بالتاويل منه قال الطبري لكن الصحيح ماقال ابوعبيدة واخذه البخاري راجع فتح الباري (۸: ۲۷۰)۱۲۔

نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا ﴾ (۱۰۔۵) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ضِيَاءٌ بنسبت نُوْر کے معنی زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور لفظ ضِیَــــاء کے اندر نور کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر نُوْرٌ کے اندر ضِیَاء کا مفہوم نہیں آتا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ ﴾ (۱۱۔۱۷) اور ان کے ساتھ ایک (آسمانی) گواہ بھی اس کی جانب سے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا شاہد جو اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ﴿ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ ﴾ (۳۔۱۳) وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

اَلتِّلَاوَــــةُ: بالخصوص خداتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو تِلَاوَــــةٌ کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ اتباع ان کی قرأت (پڑھنے) کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی ان کے اوامر ونواھی (احکام) ترغیب وترہیب، اور جو کچھ ان سے سمجھا جاسکتا ہے، ان کی اتباع کی صورت میں، مگر یہ لفظ قرأت (پڑھنے) سے خاص ہے، یعنی تِلَاوَةُ کے اندر قِرَاءَة کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر تِلَاوَة کا مفہوم قِرَاءَة کے اندر نہیں آتا، چنانچہ کسی کا خط پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ نہیں بولتے بلکہ یہ لفظ صرف قرآن پاک سے کچھ پڑھنے پر بولا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پڑھنے سے اس پر عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ ﴾ (۱۰۔۳۰) وہاں ہر شخص اپنے (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا۔ میں ایک قرأت تَتْلُوْا بھی ہے یعنی وہاں ہر شخص اپنے عمل نامے کو پڑھ کر اس کے پیچھے چلے گا۔

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا ﴾ (۴۵۔۲۵) اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔

﴿ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ﴾ (۲۹۔۵۱) کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ ﴾ (۱۰۔۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا (تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر نہ سناتا۔

﴿ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ (۸۔۲) اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تِلَاوَــــة بمعنی قرأت کے ہے اور یہی معنی آیات ذیل میں ہیں۔

﴿ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ﴾ (۱۸۔۲۷) اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو تمہارے پاس بھیجی جاتی ہے، پڑھتے رہا کرو۔

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ﴾ (۵۔۲۷) اور (اے محمدؐ) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل قابیل) کے حالات (جو بالکل سچے ہیں) پڑھ کر سنادو۔ ﴿ وَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا ﴾ (۳۷۔۳) پھر ذکر (یعنی قرآن) پڑھنے والوں کی۔

اور آیت کریمہ: ﴿ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ (۲۔۱۲۱) وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ

مِنَ الْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴾ (۳۔۵۸) یہ ہم تم کو (خدا کی) آیتیں اور حکمت بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ میں نَتْلُوْهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں۔ کیونکہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنا ہی ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو...... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہنا ان کے اس ادعا کی بنا پر ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے وہ کتب الٰہیہ کا حصہ ہے۔

اَلتِّلَاوَةُ وَالتَّلِيَّةُ (قرض وغیرہ کا) باقی ماندہ حصہ جسے وصول کرنے کے لیے پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ اَتْلَيْتُهُ کے معنی کسی کے پیچھے لگانے کے ہیں۔ جیسے اَتْلَيْتُ فُلَانًا عَلٰى فُلَانٍ بِحَقٍّ یعنی میں نے اس کا قرضہ فلاں کے حوالہ کر دیا۔ فَلَا يَتْلُوا عَلٰى فُلَانٍ وَيَقُوْلُ عَلَيْهِ یعنی وہ فلاں پر جھوٹ بولتا اور اس پر غلط بیانی کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ﴾ (۳۔۷۸) اور خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: لَآ اَدْرِیْ وَلَا اَتْلِيْ اَوْلَا تَلَيْتَ وَلَا دَرَيْتَ تو یہاں پر تَلَيْتَ اصل میں تَلَوْتَ ہے، قانون مزاوجت کی وجہ سے تَلَيْتَ کہہ دیا جاتا ہے ❶ جیسا کہ مَوْزُوْرَاتٍ ...... ہے۔ یعنی وہ بغیر اجر کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹیں۔ ❷

ت م م

تَمَامُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے اس حد تک پہنچ جانے کے ہیں، جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج باقی نہ رہے اس کی ضد ناقص ہے، یعنی وہ جو اپنی ذات کی تکمیل کے لیے ہنوز خارج شے کی محتاج ہو اور تمام کا لفظ معدودات کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور مقدار وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً عَدَدٌ تَامٌّ وَكَيْلٌ تَامٌّ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ ﴾ (۷۔۱۳۷) (۶۔۱۵)، (۱۱۔۱۱۹) اور تمہارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ ﴾ (۶۱۔۸) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔

﴿ وَاَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖ ﴾ (۷۔۱۴۲) اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا تو اس کے پروردگار کی ...... میعاد پوری ہوگئی۔ ❸

ت و ب

اَلتَّوْبُ: (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ

---

❶ كمـا فى الاتباع لابى الطيب (۳۰) وفى الفائق (۱۔۷۲) وفى حديث المنكر فيقول لادريت ولاتليت ومعناه لاقرأت ولادرست قال فى النهاية (تلا) والمحدثون يرون كذالك والصواب لا اتليت والكلمة افتعال من الوت.

❷ وذكروا من امثلـه الازدواج ايضاً حديث غير خزايا ولاندمىٰ (راجع فتح البارى ۱ : ۱٤۰) والغدايا والعشايا والاقتضاب ۲۷۸) والبحث فى ابن جنى على تصريف المازنى ٦١٦۔٦١٧) وشرح الدرة: للخفاجى ۷۹ وفى الشريشى ۲ : ۳۳۲) ان التشديد فى ياء۔ الشجى للمزاوجة مع الخلى والكلام على الازواج ۔ابن الطيب على الاقتراح ۱۲۵۲.

❸ ايضاً تماماً (٦ : ١٥٤) والنذر ۱۱ : ٤٠) ۲۳۔۲۷).

ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کردے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْہُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے، الغرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے مگر شرعاً اسے توبہ جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

تَابَ اِلَى اللّٰهِ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ (۲۴۔۳۱) سب خدا کے آگے توبہ کرو۔

﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (۵۔۷۴) تو یہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے۔

تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ: اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ اسی سے فرمایا:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ ﴾ (۹۔۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین پر۔ ﴿ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ﴾ (۹۔۱۱۸) پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ (۲۔۱۸۷) سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمائی۔

اَلتَّائِبُ: (اسم فاعل) توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، اس لیے تَائِبٌ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلتَّوَّابُ: یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صورت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہوں کو ترک کردے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۲۔۳۷) بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ (۲۵۔۷۱) کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ (۱۳۔۳۰) میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ت و ر

اَلتَّوْرَاةُ: آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی یہ وَرْیٌ سے مشتق ہے اور تاء واؤ سے مبدل ہے۔ علمائے کوفہ کے نزدیک یہ وَوْرَاۃٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے اور بعض کے نزدیک تَفْعَلُ کے وزن پر ہے، جیسے: تَتْفَلُ لیکن کلام عرب میں تَفْعَلُ کے وزن پر اسم کا صیغہ نہیں آتا۔

علماء بصرہ کے نزدیک یہ وَوْرَی بروزن فَوْعَلَ ہے جیسے حَوْقَلَ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ﴾ (۵۔۴۴) بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی، جس میں ہدایت اور

روشنی ہے۔

﴿ذَالِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ﴾ (۴۸۔۲۹) ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔

ت ا ر ة

تارۃ کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾(۲۰۔۵۵)ہم دوسری مرتبہ نکالیں گے۔

بقول بعض یہ تَارَ الْجَرْحُ سے مشتق ہے،جس کے معنی زخم کا بھر جانا اور مندمل ہوجانا کے ہیں۔

ت ی ن

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ (۹۵۔۱) انجیر کی قسم اور زیتون کی۔ بعض کے نزدیک تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کھانے کی دو چیزیں ہیں، ان کے مقام ورود اور اختصاص کی تحقیق اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ت ی ہ

تَاهَ: (ض) کے معنی متحیر ہونے کے ہیں اور یہ باب تَاہ یَتُوْہُ (واوی) بھی آتا ہے،قصہ بنی اسرائیل میں فرمایا:﴿اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَّتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس تک ......اور (جنگل کی) زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے۔ تَوَّهَهُ وَتَيَّهَهُ حیران کرنا اور پھینک دینا۔ وَقَعَ فِي التِّيْهِ وَالتَّوْهِ ورطہ حیرت میں پھنس گیا۔ مَفَازَةٌ تَيْهَاءُ وہ جنگل جس میں مسافر بھٹک جائیں۔

❀❀❀

کتاب الثاء

ث ب ت

اَلثَّبَاتُ: یہ زوال کی ضد ہے اور ثَبَتَ (ن) ثَبَاتًا کے معنی ایک حالت پر جمے رہنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ﴾ (۸۔۴۵) مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔
رَجُلٌ ثَبْتٌ وَثَبِیْتٌ فِی الْحَرْبِ لڑائی میں ثابت قدم رہنے والا مرد۔اَثْبَتَ السَّهْمَ فِیْهِ اس میں تیر آر پار کر دیا۔اور ثَابِتٌ کا لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہو اور اس پر بھی جو کسی دلیل سمعی کی رو سے صحیح ہو، مثلاً: فُلَانٌ ثَابِتٌ عِنْدِیْ فلاں حکم میرے نزدیک دلیل کی رو سے صحیح ہے۔نُبُوَّةُ النَّبِیِّ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) ثَابِتَةٌ: آنحضرت کی نبوت ثابت ہے، یعنی از روئے دلائل صحیح ہے۔
اَلْاِثْبَاتُ وَالتَّثْبِیْتُ: (افعال وتفعیل) کے معنی کبھی تو کسی چیز کو فی الواقع موجود کرنے کے ہوتے ہیں، مثلاً: اَثْبَتَ اللّٰهُ کَذَا (اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو موجود کر دیا) اور کبھی ثبوت حکمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے اَثْبَتَ الْحَاکِمُ عَلٰی کَذَا: (قاضی نے فلاں پر یہ حکم لگایا) اور کبھی اثبات باعتبار قول مراد ہوتا ہے۔خواہ وہ بات نفس الامر میں حق ہو یا باطل جیسے:
اَثْبَتَ التَّوْحِیْدَ وَصِدْقَ النُّبُوَّةِ اس نے توحید اور صدق نبوت کو دلائل سے ثابت کیا۔فُلَانٌ اَثْبَتَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: فلاں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ثابت کیا اور آیت کریمہ: ﴿ لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ ﴾ (۸۔۳۰) تاکہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں۔
میں لِیُثْبِتُوْا کے معنی قید کرنے یا ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ﴾ (۱۴۔۲۷) خدا مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور پکی) بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے۔
میں ''قول ثابت'' سے دلائل تو یہ مراد ہیں اور آیت: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا ﴾ (۴۔۶۶) اور اگر یہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔
میں اَشَدَّ تَثْبِیْتًا کے معنی علم وایمان کے لحاظ سے مضبوطی بھی مراد ہو سکتی ہے [1] اور اعمال کی پائیداری اور ان کا ثمرہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی تثبیت مراد ہو سکتی ہے۔یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جن کے اعمال کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے، قرآن پاک نے کہا ہے:
﴿ وَقَدِمْنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ (۲۵۔۲۳) اور جو انھوں نے عمل کیے ہوں گے

[1] کماقال السدی راجع ابن کثیر (۱: ۵۲۲).

ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔ محاورہ ہے: ثَبَّتُہٗ: میں نے اسے استحکام بخشا، ثابت قدم رکھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ﴾ (۱۷۔۷۴) اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے۔

﴿فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۸۔۱۲) تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

﴿وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۔۲۶۵) اور خلوص نیت سے۔ ❶ ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ (۳۔۱۴۷) اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔

ث ب ر

اَلثُّبُوْرُ: (مصدرن) کے معنی ہلاک ہونے یا (زخم کے) خراب ہونے کے ہیں اور اَلْمُثَابِرُ کسی کام کو مسلسل کرنے والا) ثَابَرْتُ عَلَی الْاَمْرِ سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔ جس کے معنی کسی کام کو مسلسل کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِیْرًا﴾ (۲۵۔۱۳،۱۴) تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے، آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۲) اے فرعون! میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ میں ابن عباسؓ نے مَثْبُوْرًا کے معنی ناقص العقل کیے ہیں کیونکہ نقصانِ عقل سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ ثَبِیْرٌ مکہ کی ایک پہاڑی کا نام۔

ث ب ط

ثَبَّطَهُ الْمَرَضُ وَاَثْبَطَهٗ: اسے مرض نے روک دیا اور اسے لازم ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے: فَثَبَّطَهُمْ (۹۔۴۶) تو ان کو ہلنے جلنے نہ دیا۔

ث ب ی (و)

ثُبَةٌ کے معنی الگ جماعت کے ہیں اس کی جمع ثُبَاتٌ وَثُبِیْنَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا﴾ (۴۔۷۱) پھر یا تو جماعت جماعت ہو کر نکلا کرو یا سب اکٹھے کوچ کیا کرو۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۷۸) وَقَدْ اَغْدُوْا عَلٰی ثُبَةٍ كِرَامٍ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں اور اسی سے ثَبَّیْتُ عَلٰی فُلَانٍ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کسی کے متفرق محاسن بیان کرنے کے ہیں۔ ثُبَةٌ کی تصغیر ثُبَیَّةٌ ہے، لہٰذا اس میں یاء محذوف ہے ❸ لیکن ثُبَةُ الْحَوْضِ جس کے معنی وسطِ حوض ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے یہ اجوف سے ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔ ❹

---

❶ ای مقرین بانها ممایثیب الله علیها (الزجاج).

❷ زهیر وتمامه: نشاوی واجدین لمانشاء راجع دیوانه مع شرح الاعلم الشنتمری ۵۸ (طبعة لیدن والعقد الثمین ۷۷ والطبری ۵: ۱۶۴ واللسان (نشو، مجاز القران رقم ۱۵۶ مختار الشعر الجاهلی ۲۵ (حلبیة) وابن الانباری ۴۰۰ ومجموعة المعانی ۱۹۸ ومعاهد التنصیص ۲: ۵۳ فی روایة علی شرب بدل ثبة فلاشاهد.

❸ والمختار عندالمحققین انه ثبته من الواو واصلها ثبوته وبه قال ابن جنی والمؤلف انه من الیاء.

❹ ذهب الجوهری وبعض علماء اللغة انهامن ثبة الحوض والذاهبة الواو من وسطه وبه قال ابواسحاق بدلیل ثویبة لکن الاکثر علی النقص ۱۲.

ث ج ج

ثَجَّ (ن) ثُجُوْجًا اَلْمَاءُ: پانی کا زور سے بہنا یا برسنا محاورہ ہے: اَتَی الْوَادِیْ بِثَجِیْجِهٖ: زبردست سیلاب آنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔

حدیث میں ہے [1] (۵۰)

اَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ یعنی افضل حج وہ ہے، جس میں زور زور سے لبیک پکارا جائے اور کثرت سے قربانی کا خون بہایا جائے۔

ث خ ن

ثَخُنَ (ك) الشَّيْءُ: کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا، اس طرح کہ بہنے سے رک جائے، اسی سے بطورِ استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَثْخَنْتُهٗ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا: میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا، قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ ﴾ (۸۔۶۷) پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہادے۔

﴿ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ (۴۷۔۴) جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔

ث ر ب

اَلتَّثْرِیْبُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش اور زجر و توبیخ کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ﴾ (۱۲۔۹۲) (یوسفؑ نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے [2] (۵۱)

اِذَا زَنَتْ اَمَةُ اَحَدِکُمْ فَلْیَجْلِدْهَا وَلَا یُثَرِّبْهَا۔ کہ جب کوئی لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے اور صرف ملامت پر اکتفا نہ کرے۔

اور عربی زبان میں اس سے صرف ثَرْبٌ کا لفظ معروف ہے، جس کے معنی باریک اور پتلی سی چربی کے ہیں [3] (جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ ﴾ (۳۳۔۱۳) اے اہل مدینہ! میں ہو سکتا ہے کہ یَثْرِبَ اسی مادہ سے ہو اور اس میں یاء زائدہ ہو۔ [4]

ث ع ب

ثَعَبَ (ف) ثَعْبًا۔ اَلْمَاءَ کے معنی ہیں اس نے پانی بہایا فَانْثَعَبَ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی ہیں، چنانچہ وہ بہ نکلا۔ اسی سے ثَعْبُ الْمَطَرِ ہے (جس کے معنی بارش کا بہتا ہوا پانی یا برساتی نالہ کے ہیں) اور ہو سکتا

---

[1] الترمذی والنسائی من حدیث عمرو ابن ماجة من حدیث محمد بن المنکدر عن جابر کر ،هق عن ابی بکر ع۔عن ابن ابن مسعود راجع کنزالعمال ٥ رقم اوراجع لشرحہ غریب ابی عبید ۳ : ۱٤۰ .

[2] اصل الحدیث متفق علیه رواه احمد وابوداؤد ومن حدیث ابی هریرة ولفظ الحدیث کمافی المراجع اذازنت امة احد فتبین زناها فلیجدها الحد ولا یثرب علیها وفی روایة النسائی ولایعنفها.

[3] وفی الحدیث ان المنافق یوخر العصر حتیٰ اذاصارت الشمس کثرب البقرة صلاها.

[4] ام قدیم للمدینة باسم اول من سکنها من ولد سام بن نوح وقد نهی النبی , ان یقال لها یثرب وسماهاطیبة وطابة لان فی مادة ثرب معنیٰ الفساد۱۲ .

ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۲۶۔۳۲) تو وہ اسی وقت صریح اژدہا بن گئی۔

میں ثُعْبَان (اژدہا) بھی ثَعَبْتُ الْمَاءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہو سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا ہے۔ جیسے پانی بہ رہا ہوتا ہے، اس لیے اسے ثُعْبَان کہا گیا ہو۔ ثُعْبَةٌ: خبیث قسم کا گرگٹ ج ثُعَبٌ یہ بھی چونکہ شکل و صورت میں سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے ثُعْبَةٌ کہا جاتا ہے اور جسم میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لفظ میں اختصار کرلیا گیا ہے۔

ث ق ب

اَلثَّاقِبُ: انتا روشن کہ جس چیز پر اس کی کرنیں پڑیں اس میں چھید کرتی پار گزر جائیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ (۳۷۔۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔

﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ ﴾ (۸۶۔۱۔۳) آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔ اَلثَّاقِبُ: اصل میں ثُقْبَة سے ہے، جس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اَلْمِثْقَب: پہاڑ میں سخت اور دشوار گزار راستہ گویا وہ سوراخ کی مثل ہے۔ ابوعمرو کا قول ہے کہ صحیح لغت مَثْقَبٌ (بفتح المیم) ہے [1] محاورہ ہے: ثَقَبْتُ النَّارَ: میں نے آگ بھڑکائی۔

ث ق ف

اَلثَّقْفُ: (س ك) کے معنی ہیں کسی چیز کے پالینے یا کسی کام کے کرنے میں حذاقت اور مہارت سے کام لینا۔ اسی سے اَلْمُثَاقَفَةُ کا لفظ مستعار ہے۔ (جس کے معنی ہتھیاروں کے ساتھ باہم کھیلنے کے ہیں اور سیدھے نیزے کو رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَلثِّقَافُ اس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔

ثَقِفْتُ كَذَا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کا نگاہ سے ادراک کرلینا کے ہیں۔ پھر مجازاً محض کسی چیز کے پالینے پر بولا جاتا ہے، خواہ اس کے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ (۲۔۱۹۱) اور ان کو جہاں پاؤ قتل کردو۔

﴿ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴾ (۳۳۔۶۱) پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے گئے پکڑے گئے۔ اور جان سے مار ڈالے گئے۔

ث ق ل

اَلثِّقَلُ: یہ خِفَّةٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونا کے ہیں اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ اصل (وضع) کے اعتبار سے تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے، لیکن (مجازا) معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے:

اَثْقَلَهُ الْغُرْمُ وَالْوِزْرُ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبالیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَمْ تَسْاَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴾ (۵۲۔۴۰) (اے پیغمبر!) کیا تم ان سے صلہ مانگتے ہو کہ

---

[1] راجع التاج (ثقب) لٰكن معناه الطريق ۱۲.

ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

اور عرف میں انسان کے متعلق ثَقِيل کا لفظ عام طور تو بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مدح بھی آ جاتا ہے [1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (الوافر)

(۷۹) تَخِفُّ الْاَرْضُ اِذْ مَا زِلْتَ عَنْهَا
وَتَبْقٰى مَا بَقِيْتَ بِهَا ثَقِيْلَا

(۸۰) حَلَلْتَ بِمُسْتَقَرِّ الْعِزِّ مِنْهَا
فَتَمْنَعُ جَانِبَيْهَا اَنْ تَمِيْلَا

کہ جس سرزمین سے تم چلے جاؤ وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ اسی وقت تک بھاری رہتی ہے جب تک تم اس پر رہو۔تم زمین میں عزت کے مقام پر فروکش ہو اور تمہاری وجہ سے اس میں توازن قائم ہے، کہا جاتا ہے۔

فِيْ اُذُنِہٖ ثِقْلٌ یعنی اس کی قوتِ سماعت کمزور ہے۔(ضد فِيْ اُذُنِہٖ خِفَّةٌ) گویا جو بات اس سے کی جاتی ہے اس کو سمجھنے میں گرانی محسوس کرتا ہے اور کسی بات کا سننا ناگوار محسوس ہو تو کہا جاتا ہے۔ثَقُلَ الْقَوْلُ...... چنانچہ اسی معنی میں قیامت کے متعلق فرمایا:﴿ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۷۔۱۸۷) وہ آسمان اور زمین میں ایک بھاری بات ہوگی۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ (۹۹۔۲) اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی۔میں بعض نے کہا ہے کہ زمین کے دفینے مراد ہیں اور بعض نے حشر کے روز قبروں سے زندہ ہو کر نکلنا مراد لیا ہے اور آیت کریمہ:﴿ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ ﴾ (۱۶۔۷) اور...... وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔میں اثقال سے بھاری بوجھ مراد ہیں اور آیت:﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ (۲۹۔۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی۔میں گناہوں کے بوجھ مراد ہیں جو انہیں ثواب سے روک دیں گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴾ (۱۶۔۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ (۹۔۴۱) تم سبکسار ہو یا گرانبار گھروں سے نکل آؤ۔

میں بعض نے خفاف اور ثقال سے جوان اور بوڑھے مراد لیے ہیں اور بعض [3] نے خفاف سے نادار اور ثقال سے غنی لوگ مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے غریب الوطن اور مقیم لوگ مراد ہیں۔اور بعض نے خفاف سے چست اور ثقال سے سست مراد لیے ہیں۔لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان جملہ معانی کو شامل ہے کیونکہ

---

[1] ومنه قوله تعالىٰ : ايها الثقلان (٥٥۔٣١) للجن والانس لماخصابه من العقل والتميز من سائر الحيوان (راجع اللسان مثقل).

[2] قاله زهير بن ابى سلمىٰ والشطر الثانى فى الثانى من اجازة ابنه كعب وفيه قصة راجع امانى المرتضىٰ (١ : ٩٧) وفيه الاول : تزان الارض اذامامت خفا وتحىٰ ماحييت بها ثقيلاً وفيه نزلت بدل حللت ديوانه والعقد الثمين ١٧٣ محاضرات المولف وفى روايته اختلاف يسير.

[3] قال العماد (٢ : ٣٥٩) والامالى حمله علىٰ العموم ١٢۔

قرآن پاک کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے کہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی ہر حال میں تمھیں جہاد کے لیے چل کھڑے ہونا چاہیے۔

اَلْمِثْقَالُ: ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، چنانچہ ہر بات کو مثقال کہہ سکتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○﴾ (۹۹۔۷،۸) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ (۱۰۱۔۸) اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے۔

میں وزن کے ہلکا نکلنے سے اعمال حسنہ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ثقیل اور خفیف کے الفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں ایک بطور مقابلہ کے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے اعتبار سے ثقیل یا خفیف کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چیزیں (طبعًا) نیچے کی طرف مائل ہوتی ہیں، انھیں ثقیل کہا جاتا ہے، جیسے حجر مدر وغیرہ اور جو چیزیں (طبعًا) اوپر کو چڑھتی ہیں، جیسے آگ اور دھواں انھیں خفیف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ (۹۔۳۸) تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔ میں زمین پر گرنا دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔

ث ل ل

اَلثَّـلَّةُ: (بفتح الثا) کے اصل معنی اون کے ڈھیر کے ہیں اس لیے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی ثَلَّۃ کہا جاتا ہے [1] اور معنی اجتماع کے اعتبار سے آدمیوں کی جماعت کو ثُـلَّةٌ.

قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ (۵۶۔۳۹،۴۰) (یہ) بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہیں اور بہت سے پچھلوں میں سے۔

ثَـلَـلْـتُ كَذَا: میں نے اس سے کافی مقدار لی۔ ثَـلَّ عَـرْشَـهٗ اس کی حکومت برباد کر دی۔ اس کی عزت ضائع کر دی۔ اَلثَّـلَلُ: دانتوں کا گرنا۔ اسی سے اَثَـلَّ فَمُـهٗ کا محاورہ ہے، جس کے معنی دانت گرنے کے ہیں۔ تَثَلَّلَتِ الرَّكِيَّةُ کنواں منہدم ہو کر پٹ گیا۔

ث ل ث

اَلثَّلَاثَةُ، تین (مؤنث) ثَلَاثُوْنَ تیس (مذکر و مؤنث) ثَـلَاثَةُ الْاٰلَافِ: تین ہزار (مذکر و مؤنث) اَلثُّلُثُ: تہائی (تثنیہ ثُلُثَان اور جمع اَثْلَاثٌ) قرآن میں ہے: ﴿ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ﴾ (۴۔۱۱) تو ایک تہائی مال کا حصہ۔ ﴿ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً ﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴾ (۵۸۔۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع) سرگوشی نہیں کرتا مگر وہ ان میں چوتھا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ﴾ (۵۸۔۲۴) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے)

---

[1] فی المطبوع: للمقیم مصحف والصحیح للغنم کما فی التاج (تلل).

ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تین اوقات ستر کے ہیں۔
﴿ وَلَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ ﴾ (۱۸۔۲۵) اور اصحاب کہف اپنے غار میں (نواوپر) تین سو سال رہے۔
﴿ بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُنْزَلِیْنَ ﴾ (۳۔۱۲۴) تین ہزار فرشتے نازل کرکے تمہیں مدد دے۔ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ ﴾ (۷۳۔۲۰) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم...... (کبھی) دو تہائی کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات قیام کرتے ہو۔
﴿ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ (۴۔۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔
ثَلَّثْتُ الشَّیْءَ: تین حصوں میں تقسیم کردیا۔
ثَلَثْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کے مال سے ایک تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُھُمْ: دو میں شامل ہوکر تین بنادیا۔ مال سے تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُ الدَّرَاھِمَ: تین درھم کردیئے (یعنی دو سے تین کردیئے)
اَثْلَثَ الْقَوْمُ: وہ تین ہوگئے۔ حَبْلٌ مَثْلُوْثٌ تین بٹوں سے بٹی ہوئی رسی۔ رَجُلٌ مَثْلُوْثٌ جس کے مال سے تہائی لے لی گئی ہو۔ ثَلَّثَ الْفَرَسَ وَرَبَّعَ (دوڑ میں) گھوڑے کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آنا، محاورہ ہے:
أَثَلَاثَۃٌ وَّثَلَاثُوْنَ عِنْدَكَ اَوْ ثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ: یعنی کیا تمہارے پاس ۳۳ مرد ہیں یا عورتیں؟ جَاؤُا ثُلٰثَ وَ مَثْلَثَ وہ تین تین آئے۔ نَاقَۃٌ ثَلُوْثٌ: جس کے تین تھنوں سے دودھ دوہیا جائے۔ اَلثَّلَاثَاءُ: منگلوار (اسی طرح) اَلْاَرْبِعَاءُ: بدھوار۔ ان میں الف ھا کے عوض ہے (جیسے: حَسَنَۃٌ وَحَسْنَاءُ) اور یہ ایام کے ساتھ مخصوص ہیں۔
ثَلَّثَ الْبُسْرُ: گدر کھجوریں دو تہائیں پک گئیں۔
اسی طرح ثَلَّثَ الْعِنَبُ کا محاورہ ہے، یعنی انگور دو تہائی پختہ ہوگئے۔ ثَوْبٌ ثُلَاثِیٌّ تین گز کپڑا۔

ث م م

ثُمَّ [1] یہ حرف عطف ہے اور پہلی چیز سے دوسری کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے، خواہ یہ تاخیر بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ اور یا باعتبار وضع کے ہو، جیسا کہ قَبْلُ اور اول کی بحث میں بیان ہوچکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: [2]
﴿ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَقَدْ کُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ (۱۰۔۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہوگا، تب اس پر ایمان لاؤ گے (اس وقت کہا جائے گا کہ) اب (ایمان لائے) اس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔
﴿ ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ﴾ (۱۰۔۵۲) پھر ظالم لوگوں سے کہا جائے گا۔
﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ (۲۔۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کردیا۔
ثُمَامَۃٌ: ایک قسم کی گھاس جو نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور ثَمَّتِ الشَّاۃُ کے اصل معنی بکری کے ثُمَامَہ گھاس چرنا کے ہیں جیسے درخت چرنے کے لیے شَجَّرَتْ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، پھر ہر قسم کی گھاس چرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ثَمَمْتُ الشَّیْءَ اس چیز کو اکٹھا اور درست

---

[1] حرف عطف یقتضی ثلاثۃ امور التشریك فی الحکم والترتیب والمهلة وفی کل منها خلاف راجع المغنی ۱: ۱۲٤).

[2] قال الطبری: معناه أهنالك ولیست ثم التی تأتی للعطف قال ابن هشام وهذا وهم منه.

کیا۔اسی سے محاورہ ہے: کُنَّا اَھْلَ ثُمِّهٖ وَرُمِّهٖ ہم اس کی اصلاح ومرمت کے اہل تھے۔

اَلثُّمَّةُ خشک گھاس کا مٹھا۔

ثَمَّ (وہاں): اسم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور اس کے بالمقابل ھُنَالِكَ اسم اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ دونوں لفظ دراصل اسم ظرف ہیں [1] اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا ﴾ (۷۶۔۲۰) اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے، کثرت سے نعمت...... دیکھو گے۔ میں ثَمَّ مفعول واقع ہوا ہے۔ [2]

ث م د

ثَمُوْدُ: (حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام) بعض اسے معرب بتاتے ہیں اور قوم کا علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے اور بعض کے نزدیک عربی ہے اور ثَمَدٌ سے مشتق ہے (بروزن فَعُوْلٌ) اور ثَمَدٌ (بارش کے) تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو جاری نہ ہو۔

اسی سے رَجُلٌ مَثْمُوْدٌ کا محاورہ ہے، یعنی وہ آدمی جس میں عورتوں سے کثرت جماع کے سبب مادہ منویہ باقی نہ رہے۔ نیز مَثْمُوْد اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسے سوال کرنے والوں نے مفلس کر دیا ہو۔

ث م ر

اَلثَّمْرُ: اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جاسکے، اس کا واحد ثَمَرَةٌ اور جمع ثِمَارٌ وَثَمَرَات آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ﴾ (۲۔۳۲) اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع واقسام کے میوے پیدا کیے۔

﴿ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

﴿ اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ﴾ (۶۔۹۹) ان کے پھلنے اور پکنے پر غور کرو۔ [3]

﴿ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ﴾ (۱۳۔۳،۱۶،۱۱) اور ہر طرح کے میوے۔

ثَمَرَ اور ثِمَار کے ایک ہی معنی ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ثِمَارٌ، ثَمَرٌ کی جمع ہے، پھر بطور کنایہ ثمر کا لفظ ہر قسم کے کمائے ہوئے مال پر بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ﴾ (۱۸۔۳۴) (اس طرح) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ثمر کے یہی معنی کیے ہیں۔

محاورہ ہے: ثَمَّرَ اللّٰهُ مَالَهٗ اللہ تعالیٰ اس کا مال بڑھائے اور مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ثَمَرَةُ الْعِلْمِ العمل الصالح کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہیں۔ وَثَمَرُ العمل الصالح الجَنَّةُ. اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔

اور صوری مشابہت اور نیچے کی طرف لٹکنے کے اعتبار سے چابک کے سر کی گرہ کو بھی ثَمَرَةُ السَّوْطِ کہا جاتا ہے۔

---

[1] ای ظرف لایتصرف ۱۲۔
[2] قال ابن هشام وغلط من اعرابه مفعولاً لرأیت فی هذالایة ۱۲۔
[3] وفی النسخ المطبوعة القدیمة والکراتشی "کلوا من ثمرہ" مصحف ۱۲ ۱۲۔

کیونکہ وہ بھی اسی طرح چابک سے نیچے لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے، جیسے درخت سے پھل کا گچھا لٹک پڑتا ہے۔

اَلثَّمِيْرَةُ: مکھن کے بلبلے جو دودھ کو بلونے سے اس پر نظر آتے ہیں۔صوری تشابہ کی وجہ سے ان کو ثَمِيْرَةُ اللَّبَنِ کہا جاتا ہے اور پھر وہ دودھ سے حاصل بھی ہوتا ہے، جیسے پھل درخت سے۔

ث م ن

اَلثَّمَنُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے، خواہ وہ زرِنقد ہو یا سامان۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔اور وہ کچھ جو کسی چیز کے عوض میں حاصل ہو وہ اس کا ثمن کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً ﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ (۱۶۔۹۵) اور خدا سے جو تم نے عہد کیا تھا (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ (۵۔۴۴) اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔

محاورہ میں: اَثْمَنْتُ الرَّجُلَ بِمَتَاعِهٖ وَاَثْمَنْتُ لَهٗ کے معنی کسی چیز کی زیادہ قیمت دینے کے ہیں۔اور قیمتی چیز کو شَيْءٌ ثَمِيْنٌ کہا جاتا ہے۔

ثَمَانِيَةٌ: آٹھ (مذکر) ثَمَانُوْنَ۔اسی (مذکر و مؤنث)

اَلثُّمْنُ آٹھواں حصہ۔

ثَمَنْتُهٗ آٹھواں ہونا۔کسی شخص کے مال سے آٹھواں حصہ لینا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ (۶۔۱۴۳) (یہ بڑے چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے ہیں۔﴿ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ﴾ (۱۸۔۲۲) وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

﴿ عَلٰى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمَانِيَ حِجَجٍ ﴾ (۲۸۔۲۷) اس (عہد) پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔اَلثَّمِيْنُ: بمعنی ثُمُن یعنی آٹھواں حصہ۔شاعر نے کہا ہے ❶ طویل

(۸۱) فَمَا صَارَلِيْ فِي الْقَسْمِ اِلَّا ثَمِيْنُهَا

اس مقاسمہ میں میرا آٹھواں حصہ تھا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ﴾ (۴۔۱۲) تو جو مال تم (مرد) چھوڑ مرو تو اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔

ث ن ی

اَلثِّنْيُ وَالْاِثْنَانُ: یہ دونوں ان تمام کلمات کی اصل ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں یہ کبھی معنی عدد کے اعتبار سے

---

❶ قاله يزيد بن الطثريه (والطثريه امه وهو احد الشعراء الذين اشتهر وا با مهاتهم واسم ابيها الصمة) واوله : والقيت سهمي وسطهم حين اوخشوا والبيت في اللسان (ثمن والاقتضاب ٤٦٥) في خمسة ابيات وتهذيب الالفاظ ٥٨٩ والدرة مع الخفاجي ٨٩ وادب الكاتب ٤٥٧ وقبله ۔ ارى سبعة يسعون للوصل كلهم ۔له عند ليلىٰ دينة يستد ينها ۔ ومعنى اوخشوا ردوا اسهام المبسرفى خريطتها والقسم بمعنىٰ المقاسمة ١٢.

استعمال ہوتے ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جوان کے اصل مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد و تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثَانِیَ اثْنَیْنِ ﴾ (۹۔۴۰) دو میں دوسرا۔﴿ اِثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ﴾ (۲۔۶۰) بارہ چشمے۔مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۴۔۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔کہا جاتا ہے: ثَنَّیْتُہٗ تَثْنِیَةً: میں دوسرا تھا، میں نے اس کا نصف مال لے لیا۔ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا کر دینا۔

اَلثِّنٰی: جس کا دو مرتبہ اعادہ ہو حدیث میں ہے: ❶

لَا ثِنٰی فِی الصَّدَقَةِ ...... یعنی صدقہ سال میں دو مرتبہ نہ لیا جائے۔شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۸۲) لَقَدْ کَانَتْ مَلَامَتُھَا ثِنٰی "بے شک اس نے بار بار ملامت کی۔"اِمْرَءَةٌ ثِنْیٌ: جس عورت نے دو بچے جنے ہوں اس دوسرے بچہ کو ثِنْیٌ کہا جاتا ہے۔

حَلَفَ یَمِیْنًا فِیْھَا ثِنْیٌ وَثَنْوٰی وَثَنِیَّةٌ وَمَثْنَوِیَّةٌ اس نے استثناء کے ساتھ قسم اٹھائی۔ثَنَا (ض) ثَنْیًا۔اَلشَّیْءَ کسی چیز کو موڑنا، دوہرا کرنا لپیٹنا قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ ﴾ (۱۱۔۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی قرأت یَثْنَوْنٰی صُدُوْرَھُمْ ہے۔جو اِثْنَوْنَیْتُ کا مضارع ہے۔ ❸

اور آیت کریمہ: ﴿ ثَانِیَ عِطْفِهٖ ﴾ (۲۲۔۹) (اور تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے۔

میں گردن موڑنے سے مراد تکبر اور اعراض کرنا ہے جیسا کہ لَوٰی شِدْقَهٗ وَنَاٰی بِجَانِبِهٖ کا محاورہ ہے۔اَلثِّنْیُ (ایضاً بکری) جو دوسرے سال میں داخل ہو (اونٹ) جس کے ثنیہ دانت گر گئے ہوں اور اس معنی میں فعل اَثْنٰی ہے۔

ثَنَیْتُ الشَّیْءَ اَثْنِیْهِ. کسی کو ثنایین رسی کے ساتھ باندھنا۔یہ غیر مہموز ہے بعض نے اس کے غیر مہموز ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کلمہ تثنیہ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا واحد ثناءٌ نہیں بولا جاتا۔ ❹

اَلْمُثَنَّاةُ: دوسری رسی۔

اَلثُّنْیَان: سادات کے شمار کے وقت دوسرے درجہ کا سردار۔ثِنْیَةٌ فرمایہ محاورہ ہے۔فُلَانٌ ثِنْیَةُ اَھْلِ بَیْتِهٖ فلاں اپنے اہل میں ثنیہ یعنی سب سے کم مرتبہ ہے۔

ثَنِیَّةٌ: وہ پہاڑ جسے عبور کرتے وقت اوپر چڑھنا اور نیچے

---

❶ والحدیث فی الصحاح (ثنیٰ والفائق ۱ : ۸۳ والدیلمی والنھایة واموال ابی عبید عن علیؓ راجع کنزالعمال ٦ رقم ۱۹۹۵ و ۱۳۲۲) او غریب ابی عبیدا/۹۸.

❷ قاله کعب بن زهیر فی امرء ته حین لامته فی بکر وتکملة البیت أفی جنب بکر قطعتنی ملامة ...... لعمری ...... والبیت فی اللسان (ثنیٰ) ودیوانه ۱۲۸ والبحر (۷ : ٤۳۵) ونسبه الصاحی ۱۳٤ الی اوس بن حجر وجمعه الدکتور محمد یوسف نجم فی مختلط شعره راجع دیوانه ۱٤۱ وفی روایته خزایة بدل ملامة وضبطه الجامع بالرفع والصواب النصب علی التمیز وفاعل قطعتنی امرء ته وقبله وهو مطلع القصیدة : الا بکرت عرسی توائم من لحی ۔ واقرب باحلام النساء من الرویٰ.

❸ راجع ابن کثیر ٤۳٦/۲ من اثنونیٰ (افعوعل) کمااحلولیٰ من الحلاوة ۔

❹ ذکره الجوهری فی الصحاح وکذا فی النهایة فی شرح حدیث عمرو بن دینار رأیت ابن عمر ینحر بدنته وهی بارکة مثینة بثنایین .... وبعده : قال الاصمعی وان مده ماد لکان صواباً فحوزا الاصمعی ثناآن کماتقول کساآن لکن النحاة اتفقوا علی ترک الهمزة فی الثنایین وقد روی الزهری بالبسط فی تهذیبه علی من همزه فتدبر۱۲.

اترنا پڑے گویا دوہرا سفر کرنا پڑ رہا ہے، شکل وصورت اور صلابت کے لحاظ سے پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دے کر سامنے کے چار دانت (دواز فوق دواز تحت) میں سے ہر ایک کو ثَنِيَّة کہا جاتا ہے، (جمع ثنایا)

اَلثُّنْيَا: (من الجزور) ذبح کیے گئے اونٹ کا سر اور صلب جو قصاب اپنے لیے مستثنیٰ کر لیتا ہے۔ ❶

اوران کو ثُنْوىٰ بھی کہا جاتا ہے۔

اَلثَّنَاءُ: کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان کرنے کے ہیں اور اَثْنٰى عَلَيْهِ کے معنی کسی کی ثنا کرنے کے ہیں۔

تَثَنّٰى (تفعل) فِىْ مِشْيَتِهٖ: تکبر سے لڑکھڑا کر چلنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِىْ ﴾ (۱۵۔۸۷) اور ہم نے آپ کو سات مثانی (سورتیں) عطا کیں۔ میں قرآن کی سورتوں کو مثانی کہا ہے۔ ❷ کیونکہ مرور ایام کے ساتھ بار باران کا ذکر اور اعادہ ہوتا رہے گا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر آئے گا اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ زوال پذیر ہیں۔ اسی بنا پر فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دوہرائی جاتی ہیں۔

اور قرآن پاک کو مثانی کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ بار باراعادہ سے اس کے عجائب وغرائب منقطع نہیں ہوتے اور ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے وصف میں ایک روایت مروی ہے۔ ❸ (۵۳) لَا يَعْوَجُّ فَيَقُوَّمُ وَلَا يَزِيْغُ فَيُسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِىْ عَجَائِبُهٗ. کہ اس میں کجی نہیں آئے گی کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے اور نہ اس میں زیغ پیدا ہوگا کہ اس کا ازالہ کرنا پڑے اور اس کے عجائب وغرائب کبھی منقطع نہیں ہونگے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَثَانِىْ ثناء سے مشتق ہو تو اس سے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ قرآنِ پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے جو اس کی، اس کو پڑھنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعریف کا موجب ہوں گے اور اسی معنی میں قرآن پاک کو آیت: ﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴾ (۵۶۔۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ میں کرم کے ساتھ متصف کیا ہے اور آیت:

﴿ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴾ (۸۵۔۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ اس کے وصف میں مجید کا لفظ ذکر کیا ہے۔

اَلْاِسْتِثْنَاء کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے کے ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا اس عام حکم کے کلیۃ مرتفع ہونے کا فائدہ دے، چنانچہ عموم حکم سے بعض افراد کی تخصیص کے متعلق فرمایا: ﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِىْ

---

❶ ومافى المعاجم من الراس والقوائم وذكره بعضهم معهمالفظ الصلب ۱۲.

❷ راجع للبحث على المثانى التاج (ثنى) وغريب ابى عبيد ۳: ۱۴۵۔۱۴۷.

❸ كلمة من حديث طويل فى فضل القران راجع المصاحف لابن النبارى لك، ھ، ب عن ابن مسعود، ش، ومحمد بن نصر) كنزالعمال ۱: رقم ۲۳۵۶.

﴿مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً﴾ (۶۔۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اور پہلے کلام کی کلیۃً نفی جیسے:

وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ كَذَا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ : میں یہ کام ضرور کروں گا ان شاء اللہ۔

اِمْرَءَ تُهٗ طَالِقٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ: اس کی عورت کو طلاق ہے، ان شاء اللہ۔

عَبْدُهٗ عَتِیْقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰه . اس کا غلام آزاد ہے، ان شاء اللہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِ مُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ o وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ﴾ (۶۸۔۱۷،۱۸) جب انھوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور ان شاء اللہ نہ کہا۔ میں وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ سے بھی یہی مراد ہیں۔

ث و ب

ثَوْبٌ کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں یا غور وفکر سے جو حالت مقدر اور مقصود ہوتی ہے، اس تک پہنچ جانا کے ہیں۔ چنانچہ حکماء کے اس قول اَوَّلُ الْفِكْرَةِ اٰخِرُ الْعَمَلِ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی آغاز فکر ہی انجام عمل بنتا ہے۔ چنانچہ اوّل معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

ثَابَ فُلَانٌ اِلٰی دَارِهٖ: فلاں اپنے گھر کو لوٹ آیا۔

ثَابَتْ اِلَیَّ نَفْسِیْ: میری سانس میری طرف لوٹی اور کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے، اسے مَثَابَةٌ کہا جاتا ہے اور غور وفکر سے حالت مقدرہ مقصود تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثَوْبٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ سوت کاتنے سے غرض کپڑا بننا ہوتا ہے، لہٰذا کپڑا بن جانے پر گویا سوت اپنی حالت مقصودہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہی معنی ثواب العمل کا ہے۔ اور ثَوْبٌ کی جمع اَثْوَابٌ وَثِیَبٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ (۷۴۔۴) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ میں بعض نے ثِیَابَ سے اس کے حقیقی معنی یعنی کپڑے پاک رکھنا مراد لیا ہے ❶ اور بعض نے کہا ہے کہ ثِیَاب سے (کنایۃ) نفس مراد ہے ❷ (یعنی نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❸ (طویل)

(۸۳) ثِیَابُ بَنِیْ عَوْفٍ طَهَارٰی نَقِیَّةٌ

کہ بنی عوف کے نفوس پاک وصاف ہیں۔

---

❶ نسبه ابن كثير ٤ : ٤٤٤) الیٰ محمد بن سيرين و رجحه ابن جرير.

❷ نقل عن ابن عباس واكثر التابعين ويؤيده كلام العرب .

❸ قاله امرء القيس فی مدح بنی عوف وتمامه : واوجههم بيض المسافر غران (مفيد القافيه من كلمة ١٦ بيتاً ولاتوجد تامة عند غير ابن الانباری ٤٣٦ وفی رواية والسمط ٩١) يوم الكريهه بدل بيض المسافر والبيت فی اللسان والصحاح (ثوب ، غرر) وديوانه ١١٥ والعقد الثمين ١٦١ وايام العرب ٥٠ وشرح السبع لابن الانباری ٤٦ وفيه عند المشاهد بدل بيض المسافر والمعانی للقبتی ٤٨٥۔٨١ والسيوطی ١٣٩ والصناعتين ٣٥٣ ومختار الشعر ٣٣ والعمدة ١ : ١٤٨فی اربعة ابيات والشطر فی حواشی تهذيب الالفاظ ٤٨٣ والبحر (٢ : ٤١٦) والشطر الثانی فی البحر (٣ : ٢٢/٨۔٣٧١).

اسی طہارت نفسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾ (۳۳۔۳۳) (اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے اور تمہیں بالکل پاک صاف کردے۔

اَلثَّوَابُ: انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے۔اس تصور پر کہ وہ جزا گویا عین عمل ہی ہے،حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ﴾ (۹۹۔۷) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ میں جزا کو نفس عمل ہی قرار دیا ہے اس لیے یہاں یَرَ جَزَآءَہٗ نہیں کہا حالانکہ مراد یہی ہے۔

گو لغوی اعتبار سے ثَوَابٌ کا لفظ خیر وشر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے،لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے،چنانچہ فرمایا:

﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (۳۔۱۹۵) (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ (۳۔۱۴۸) تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دے گا)۔ اسی طرح لفظ مَثُوْبَةٌ بھی زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ﴾ (۵۔۱۶۰) کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں۔ میں جزائے بد کے لیے مَثُوْبَةٌ کا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جزائے خیر کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ﴾ (۲۔۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

اَلْاِثَابَةُ: (افعال) کے معنی بھی جزا دینے کے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (۵۔۸۵) تو خدا نے ان کو ان کے کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے،جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ (۲۔۱۵۲) تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا۔ میں بری جزا کو ثواب قرار دینا بطور استعارہ ہے،جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَلتَّثْوِیْبُ: (تفعیل) قرآن پاک میں: لفظ صرف بری جزا کے لیے استعمال ہوا ہے،جیسے فرمایا: ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ﴾ (۸۳۔۲۶) تو کافروں کو پورا پورا بدلہ مل گیا۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ (۲۔۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے کی جگہ مقرر کیا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَثَابَة کے معنی جائے ثواب کے ہیں اور خانہ کعبہ کو مَثَابَةٌ اس لیے کہا ہے کہ وہاں ثواب اعمال لکھا جاتا ہے۔ اَلثَّیِّبُ: بیوہ یا مطلقہ عورت کو کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ بھی خاوند سے جدا ہوکر (گویا پہلی حالت کی طرف) لوٹ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾ (۶۶۔۵) بن شوہر اور

کنواریاں۔ اَلتَّثْوِیْبُ کے معنی بار بار منادی کرنے کے ہیں، اسی سے تَثْوِیْبُ فِی الْاَذَانِ ہے (یعنی فجر کی اذان میں حَیَّعَلَتَیْنِ کے بعد اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا)

ثَوْبَاءُ: (غشی) کیونکہ وہ بھی دورہ کے ساتھ بار بار طاری ہوتی ہے۔

اَلثُّبَۃُ: جماعت کیونکہ اس کے افراد بھی بظاہر ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں، قرآن میں ہے: ﴿ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴾ (۴۔۷۱) شاعر نے کہا ہے [1]

وَقَدْ اغد وعلی ثبة کرام۔

ثبة الحوض: حوض کا وسط جس کی طرف پانی لوٹ کر آتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

ث و ر

ثَارَ (ن) ثَوْرًا وَثَوَرَانًا۔ الغبارُ والسحابُ کے معنی غبار یا بادل کے اوپر اٹھنے اور پھیلنے کے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتُثِیْرُ سَحَابًا ﴾ (۳۰۔۴۸) تو وہ بادل کو اوپر اٹھاتی ہیں۔

﴿ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا ﴾ (۳۰۔۵) انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو...... آباد کیا۔

اور غبار کے منتشر ہونے کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَارَتِ الْحَصْبَۃ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی کنکر کے پھیل جانے کے ہیں اور اسی طرح (یعنی مجازاً) ثَوَّرَ شَرًّا (شر کی آگ بھڑکانا) کہا جاتا ہے۔

ثَارَ ثَائِرُہٗ (کنایہ) یعنی وہ غضب ناک ہوگیا۔ ثَاوَرَہٗ اس پر حملہ کر دیا۔

اَلثَّوْرُ: بیل کیونکہ اس سے زمین جوتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے، جیسا کہ ضَیْفٌ وَطَیْفٌ بمعنی ضائِف وَطَائِفٌ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:

سَقَطَ ثَوْرُ الشَّفَقِ: یعنی شفق کی سرخی غروب ہوگئی۔

اَلثَّارُ کے معنی ''خون کا بدلہ'' کے ہیں، یہ اصل میں مہموز العین ہے اور اس مادہ سے نہیں ہے۔

ث و ی

اَلثَّوَاءُ: (ص) کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے: ثَوٰی یَثْوِیْ ثَوَاءً وہ اقامت پذیر ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ﴾ (۲۸۔۴۵)

اور نہ تم مدین والوں میں رہ رہے تھے۔

﴿ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ ﴾ (۳۹۔۶۰) کیا غرور والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔

﴿ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ ﴾ (۴۷۔۱۲) اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ﴿ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْهَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ ﴾ (۴۰۔۷۶) (اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰکُمْ ﴾ (۶۔۱۲۸) خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

مَنْ اُمُّ مَثْوَاكَ (کنایہ) تمہارا میزبان کون ہے۔

اَلثَّوِیَّۃُ: بھیڑ بکریوں کے باڑہ کو کہتے ہیں۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

---

[1] قد مر تخریج فی (ث، ب، و).

کتاب الجیم

ج ء ر

اَلْجُؤار: (ف) کے اصل معنی وحشیات جیسے ہرن وغیرہ کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں، پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاِلَیْهِ تَجْئَرُوْنَ ﴾ (۱۶۔۵۳) تو تم اسی کے سامنے آہ وگریہ کرتے رہو۔﴿ اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ ﴾ (۲۳۔۶۴) تو اس وقت چلائیں گے۔﴿ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ ﴾ (۲۳۔۶۵) آج مت چلاؤ۔

ج ب ب

اَلْجُبُّ: کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ﴾ (۱۲۔۱۰) کسی گہرے گڑھے میں ڈال دو۔

اور اس کنوئیں کو جُبٌّ یا تو اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ جَبُوْب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اسلئے کہ وہ گہرا گڑھا سا تھا۔ ❶ اصل میں اَلْجَبُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں، جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گھابھا دینا اور زَمَنَ الصِّرَام کی طرح زَمَنَ الْجَبَاب کا محاورہ بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گھابھنے کا موسم کے ہیں۔ بَعِیْرٌ اَجَبُّ شتر کوہان برید اور نَاقَة جباء جیسا کہ مرد مقطوع الید کو رَجُلٌ اَقْطَع کہا جاتا ہے اور ایسی عورت کو قَطْعَاءُ کہتے ہیں۔

مَجْبُوْبٌ: وہ مرد جس کا آلۂ تناسل جڑ سے قطع کردیا گیا ہو۔ اسی سے جُبَّةٌ (نوعے از پیراہن) ہے اور تشبیہ کے طور پر نیزہ کے اس پور کو بھی جُبَّة کہا جاتا ہے جس میں بھالا پیوست ہوتا ہے۔اَلْجُبَابُ کفک شیر شتر کہ بمسکہ ماند جَبَّتِ الْمَرْءَةُ النِّسَاءَ حُسْنًا: حسن میں برتر ہونا غالب رہنا یہ بھی جُبّ بمعنی قطع سے مستعار ہے، جیسا کہ منازعت (بحث ومباحثہ) میں غالب ہونے کے لیے قَطَعْتُه کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن جَبْجَبَةٌ جس کے معنی طبل یا چرمیں زنبیل کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ محض اس صوت کی وجہ سے اسے جَبْجَبَة کہا جاتا ہے جو اس سے مسموع ہوتی ہے۔

ج ب ت

اَلْجِبْتُ جِبْتٌ اور جِبْسٌ اس دھوون کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل جِبْس کے سین کو تاء سے تبدیل کرلیا گیا ہے۔تاکہ معنی مبالغہ پر دلالت کرے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (رجز)

---

❶ علی اثنی عشر میلامن طبریه او بین سنجل ونابلس (التاج).

❷ انشد فی الامالی (۲ : ۶۷) ثلاثة اشطار عن القراء : یاقبح الله نبی السعلات ـ عمروبن یربوع شرار النات لیسوا اعضاء ولا اکیات راجع للشطر النوادر لابی زید ۲۰۴ وفیه الاقاتل الله بدل یا فتح الله والجمهرة لابن درید ۳ : ۳۳) قال الاستاذ المیمنی فی طرته علی اللالئی والاشعار فی القلب ایضاً وراجع ابدال ابی الطیب ۱ : ۱۱۷) واللسان تا، س) والخصائص لابن جنی ۴۵ وسرالصناعة ۱۱۹ والمخصص لابن سیدة ۳ : ۳۶) ومبادی اللغة للاسکانی وتفسیر الطبری ۸ : ۲۲۲) والصباحی ۱۰۹) وفیه عمربن مسعود والمفصل ۳۶۸ والشطر منسوب لعلباء بن ارقم الیشکری کمافی اللالئی واللسان (تا) وهو شاعر جاهلی قدیم .

(۸۴) عمرو بن یربوع شرار النَّاتِ
یعنی عمرو بن یربوع تمام لوگوں سے ناکام ہے۔
نیز ہروہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے وہ جِبْتٌ کہلاتی ہے اور ساحر کاہن کو بھی جِبْت کہا جاتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ﴾ (۴۔۵۱) کہ بے اصل باتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

ج ب ر

اَلْجَبْرُ: اصل میں جبر کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔کہا جاتا ہے جَبَرْتُهٗ (ن) فَانْجَبَرَ وَاجْتَبَرَ: بعض نے جَبَرْتُهٗ فَجَبَرَ بھی نقل کیا ہے، یعنی جَبَرَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (رجز)
(۸۵) قَدْ جَبَرَ الدِّیْنَ الْاِلٰهُ فَجَبَرَ
یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کیا تو وہ درست ہوگیا۔
یہی قول اکثر ائمہ لغت کا ہے، لیکن بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں فَجَبَرْ (انفعال) یعنی لازم نہیں ہے بلکہ متعدی ہے اور تکرار سے اصلاح اور اس کی تکمیل پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے دین کی اصلاح کی ابتداء کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچادیا کیونکہ فَعَلَ کا صیغہ جس طرح کسی کام کو شروع کرنے کا معنی دیتا ہے اسی طرح اس کے معنی کسی کام کو سرانجام دے کر اس سے فارغ ہوجانا بھی آتے ہیں اور اس سے مبالغہ کے معنی یا تکلف کو ظاہر کرنے کے لیے تَجَبَّرَ (تفعل) کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)
(۸۵) تَجَبَّرَ بَعْدَ الْاَكْلِ فَهُوَ غَيِّضٌ
گھاس چرانے کے بعد دوبارہ ہری ہوگئی ہے۔
پھر جبر کا لفظ کبھی صرف اصلاح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔(۵۴) یَا جَابِرَ كُلِّ كَسِيْرٍ وَمُسَهِّلَ كُلِّ عَسِيْرٍ اے ہر شکستہ کی اصلاح کرنے والے اور ہر مشکل آسان کرنے والے اور اسی معنی میں روٹی کو جَابِر بن حَبَّةَ کہا جاتا ہے۔اور یہ لفظ کبھی محض استبداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے۔❸ (۵۵) لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ کلی طور پر مختار۔
علم ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی چیز کی

---

❶ نصف مطلع من ارجوزة العجاج فی نحومأتی اشطار وهی موقوفة مقیدة یمدح بهماعمربن عبدالله بن معمر وكان عبدالمالك وجهه لقتال ابی فدیك الخارجی فاوقع به و باصحابه فذالك ذكرالجبارالدین وبعدهٗ: وعور الرحمن من ولی العور وقد جمع الشاعربین اللازم والواقع راجع له الخزانة ۱: ۱۰۳ والطبری ۶: ۱۷۴) العمدة ۱: ۸۹) واصلاح یعقوب ۲۸۸) واللسان (جبر) والاقتضاب ۴۰۷.
❷ قاله امرء القیس فی قصیدة ۲۵ بیتا مطلعها : أمن ذكر سلمیٰ اذتأتك تنوص۔فتقصر عنها خطوة وتبوص وصدرالبیت : ویاكلن من قولعاماً وربة وفی روایة الدیوان نمیص بدل غیض (كمافی بعض الطباعة) وهو مصحف والتصویب من المراجع وهی موافقه لهافی اللسان (جبر، نمص) قال السند بی ونمیص ذاهب الشعروفی اللسان : النمیص : النبات حین طلع ورقه راجع للبیت اللسان (جبر) والعقدالثمین ۱۳۷ ودیوانه ۷۸ (صنعة السند وبی) والجمهرة لابن درید ۳: ۸۹) وابدال ابی الطیب ۲: ۳۸۸) وغریب ابی عبید ۱: ۱۶۶)
❸ وردعن علی موقوفاً فی خطبة طویله انظر (حل) كنزالعمال رقم ۱۵۶۸ رواه الشافعی .

اصلاح کے لیے اس کے ساتھ کچھ الحاق کر دینا اور اَلْجبرُ بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۸۷) وَانْعِم صَبَاحًا اَیُّهَا الْجَبَر

کہ اے بادشاہ سلامت! تم خوش رہو۔

بادشاہ کو جبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق لوگوں کو مجبور کر لیتا ہے یا اس لیے کہ وہ ان کے امور کی اصلاح کرتا ہے۔

اَلْاِجْبَارُ: (افعال) اس کے اصل معنی کسی کو مجبور کرنا کہ وہ دوسرے کی اصلاح کرے۔ لیکن عرف میں محض اکراہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَجْبَرْتُهٗ عَلٰی کَذَا (کسی کام پر مجبور کرنا) اور جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو گناہ پر مجبور کرتا ہے، انھیں متکلمین کی اصلاح میں مُجَبِّرَۃ کہا جاتا ہے اور متقدمین انہیں جَبْرِیَه یا جَبَرِیَّه کہتے ہیں۔ ❷

اَلْجَبَّارُ: انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ناجائز تَعَلّی سے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرنا۔ بدیں معنی اس کا استعمال بطورِ مذمت ہی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴾ (۱۴۔۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد رہ گیا۔

﴿ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ (۱۹۔۳۲) اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

﴿ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ﴾ (۵۔۲۲) وہاں تو بڑے زبردست لوگ (رہتے) ہیں۔

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ (۴۰۔۳۵) ...... اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یعنی جو شخص قبول حق اور اس پر ایمان لانے سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کبھی کبھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو جَبَّار کہا جاتا ہے، اسی معنی میں فرمایا:

﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ (۵۰۔۴۵) اور تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

اور ہمسروں پر تَعَلّی کے معنی کے لحاظ سے بلند کھجور یا اونٹنی کو جَبَّارَۃ کہا جاتا ہے اور جو حدیث میں آیا ہے ❸ ضِرَاسُ الْكَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَّ كَثَافَةُ جِلْدِهٖ اَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ کہ دوزخ میں کافر کی ڈاڑھ کا حجم مثل اُحد کے ہوگا اور اس کی کھال کی کثافت

---

❶ قاله ابن احمر واوله: واسلم براووق حيث به قال ابن جنى ولم يسمع بالجبر الملك الافى شعر ابن احمر والبيت فى اللسان (جبر) والمعانى للقبتى ٤٥٥ قال والجبر الرجل اصله سريانى.

❷ خلاف القدريه قال الحافظ فى التبصير وهو طريق متعلمى الشافعيه وفى البصائر وهذا قول المقتدمين واما فى عرف المتكلمين فيقال لهم المجبيرة (كذا فى التاج) ابوعبيد هو كلام مولد وهم فرقة اهل اهواء منسوبون الى شيخهم الحسين بن محمد النجار البصرى (فى التاج) قلت هو ابو عبدالله الحسين بن محمد بن عبدالله النجار وكان جملة المجبرة ومتكلميهم وله مع النظام مجالس ومناظرات وله كتب فى القضاء والقدر وراجع الفهرست لابن النديم ٢٥٤ والجواهر لمضيئه ١٦٤ وايضاً التبصير ص ٦١.

❸ فى رواية الترمذى عن ابى هريرة اثنان واربعون ذراعاً وليس فيه ذكر ذراع الجبار وفى مسند احمد من حديث ابى عمر سبعون ذراعاً واما لفظه ضرس الكافر مثل احد فرواه مسلم وفيه غلظ جلده مسيرة ثلاث راجع تخريج الاحياء للعراقى ٤: ٥٣٣) وذكر ذراع الجبار ورد فى الفائق ١: ٨٦ وفيه وكان هذا الملك من ملوك العجم تام الذراع وكذا قال القبتى (راجع التاج).

جبار کے چالیس ذراع کے برابر ہوگی......تو اس حدیث کی تفسیر میں ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں جَبَّـار سے مراد بادشاہ ہے اور اس ذراع کو ذِرَاعُ الشَّاۃ کہا جاتا تھا۔ ❶

اور جب الجبار باری تعالیٰ کی صفت ہو، جیسے فرمایا: ﴿ اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ﴾ (۵۹۔۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔ تو اس کے اشتقاق میں اہل لغت سے دو قول منقول ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَـرْتُ الْـفَقِیْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی فقیر کی حالت کو درست کرنے اور اسے بے نیاز کردینا کے ہیں اور باری تعالیٰ بھی چونکہ اپنے فیضان نعمت سے لوگوں کی حالتیں درست کرتا اور ان کے نقصانات پورے فرماتا ہے، اس لیے اسے اَلْجَبَّار کہا جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے سامنے مقہور کرلیتا ہے، اس لیے اسے الـجبَّـار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لیکن بعض ارباب لغت نے بحیثیت لفظ اور صیغہ کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے کہ اَفْـعَـلْـتُ سے صیغہ فَـعَّـال (مبالغہ) قیاساً نہیں آتا۔ لہٰذا اَلْـجَبَّار کا صیغہ اِجْبَـار (افعال) سے نہیں بن سکتا۔ ❷ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جَبْر سے بنا ہے نہ کہ اِجْبَارٌ سے اور جَبْر کے معنی بھی مجبور کرنا آجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے ❸ لاَجَبْـرَ وَلاَ تَـفْـوِیْضَ. (کہ نہ مجبور کرنا ہے اور نہ سونپ دینا)

اور معتزلہ کی ایک جماعت نے معنوی لحاظ سے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ بندوں کو مجبور کرے، حالانکہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (تکوینی طور پر) بندوں کو بہت سی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے جن سے رہائی پانا ان کے اختیار سے باہر ہے اور جبر کے یہ معنی مقتضائے حکمت الٰہیہ کے عین مطابق ہیں نہ کہ اس کے خلاف جیسا کہ جاہل اور گمراہ لوگوں کا خیال ہے، مثلاً مرض، موت بعث بعد از موت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص صنعت اور اعمال و اخلاق میں کوئی طریقہ اختیار کرنے پر مسخر کر رکھا ہے اور اسے مجبور بصورت مختار بنایا ہے کہ ہر انسان جس دھن میں لگا ہے اس میں مگن ہے یا اس سے بیزار ہے لیکن بادل نخواستہ اسے کیا چلا جارہا ہے کہ گویا اس کے بدلہ میں کوئی اور کام اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

﴿ فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ ۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ (۲۳۔۵۳) تو پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کرکے جدا جدا کردیا جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہورہا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴾ (۴۳۔۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو

---

❶ وکذا فی التاج (جبر).

❷ قاله القبتی کمافی التاج وجوزه الفراء وقال : لم اسمع فعّال الامن افعل الافی حرفین وهو جبار من اجبرت ودرّاك من ادركت وايضاً وافقه الازهری.

❸ قد مر الآن تخريجه وايضاً الشاهد فی ارجوزة العجاج وسياتی من قول علیؓ.

دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا۔

اس معنی میں الجبار اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر وہ کسی پر جبر کرتا ہے تو اقتضائے حکمت کے مطابق کرتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے [1]

(۵۶) یَا بَارِیَٔ الْمَسْمُوْکَاتِ وَجَبَّارَ الْقُلُوْبِ عَلٰی فِطْرَتِهَا شَقِیِّهَا وَسَعِیْدِهَا . کہ اے روحوں کو پیدا کرنے والے اور دلوں کو ان کی اچھی یا بری فطرت پر جوڑنے والے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلوں کو علم وعرفان کے لحاظ سے ان کی اصلی فطرت پر جوڑ دیا ہے اور یہ ماتقدم کے عموم میں داخل ہے۔

اَلْجَبَرُوْتُ: (قدرت) طاقت، عظمت۔ یہ تجبر (تفعل) سے فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے۔

اِسْتَجْبَرْتُ حَالَهٗ، میں نے اس کی حالت درست کرنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کی۔

اَصَابَتْهُ مُصِیْبَةٌ لَا یَجْتَبِرُ: اسے اتنی بڑی مصیبت پہنچی کہ وہ اس کے جبر کا قصد نہیں کرسکتا۔ اور جَبْرُ الْعَظْمِ (ہڈی کو جوڑنا) اَلْجَبِیْرَةُ سے مشتق ہے، جس کے معنی اس پٹی کے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اور اَلْجِبَارَة اس لکڑی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے۔ اَلْجَبِیْرَة کی جمع اَلْجَبَائِر آتی ہے۔ نیز تشبیہ کے طور پر کنگن اور بازو بند کو بھی جِبَارَة کہا جاتا ہے اور اَلْجِبَار جس کی دیت ساقط ہو۔ [2]

ج ب ل

اَلْجَبَلُ: پہاڑ۔ ج اَجْبَال وَجِبَالٌ

قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ○ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴾ (۷۸۔۶،۷) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں (نہیں) ٹھہرایا؟

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴾ (۷۹۔۳۲) اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔

﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا ﴾ (۳۵۔۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔

﴿ وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا ﴾ (۲۰۔۱۰۵) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

﴿ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴾ (۲۶۔۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

اور پہاڑ کی مختلف صفات کے اعتبار سے استعارۃً ہر صفت کے مطابق اشتقاق کرلیتے ہیں، مثلاً معنی ثبات کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ جَبَلٌ لَا یَتَزَحْزَحُ . کہ فلاں نہ ہلنے والا پہاڑ ہے۔ جَبَلَهُ اللّٰهُ عَلٰی كَذَا . اس کی فطرت ہی ایسی ہے، یعنی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ فُلَانٌ ذُوْ جَبِلَّةٍ . فلاں بھدے جسم کا ہے۔ ثَوْبٌ جَیِّدُ الْجِبَلَّةِ

---

[1] وفی الفائق ۱ : ۱۹۳ عن سلامة الکندی کان علیؓ یعلمنا الصلوة علی النبیﷺ ونقله بتمامها قریباً فی سبعة اسطر.

[2] ومنه فی الحدیث المعدن جبار والبئر جبار والعجماء جبار ۔ای الجرح والدم فی هذه الثلاثة هدرٌ لاارش فیها هذا وفی المطبوع من الارض مکان من الارش مصحف والتصدید من المراجع ۱۲.

عمدہ اور مضبوط بنا ہوا کپڑا۔

اور بڑائی وعظمت کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے بڑی جماعت کو جِبِلٌّ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا﴾ (۳۶۔۶۲)

اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

ایک قرأت میں جُبُلًا تشدید کے ساتھ ہے۔تَوَّزِیْ نے کہا ہے کہ جُبْلاً وَجَبْلاً وَجُبُلاً وَجِبِلا کے ایک ہی معنی ہیں۔ ❶

اور دوسرے علماء نے کہا ہے جِبِلاً جِبِلَّةً کی جمع ہے اور اسی سے آیت:﴿ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ (۲۶۔۱۸۴) میں جبلۃ سے مراد ان کے وہ احوال ہیں جن پر ان کو پیدا کیا تھا اور وہ راستے جن پر چلنے کے وہ فطرۃً پابند تھے۔جس کی طرف آیت کریمہ: ﴿ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ﴾ (۱۷۔۸۴) کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جَبُلَ فُلَانٌ فلاں پہاڑ کی طرح غلیظ الجسم ہے۔

ج ب ن

اَلْجَبِيْنُ: پیشانی کا کنارہ۔اور پیشانی کے دونوں طرف کے کناروں کو جَبِيْنَان کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ (۳۷۔۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹالیا۔

اَلْجُبْنُ: (بزدلی) دل کا ایسے موقع پر کمزوری کا اظہار کرنا جہاں اسے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔جَبَانٌ: بزدل (مذکر و مونث) اَجْبَنْتُهٗ بزدل پانا کسی پر بزدلی کا حکم لگانا۔اَلْجُبْنُ (ایضاً) پنیر تَجَبَّنَ اللَّبَنُ: دودھ پنیر بن گیا یا پنیر کی طرح جم گیا۔

ج ب ہ

اَلْجَبْهَةُ: (ماتھا، پیشانی) سر کا وہ حصہ جو سجدہ کی حالت میں زمین پر لگتا ہے، اس کی جمع جِبَاهٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ ﴾ (۹۔۳۵)

پھر ان سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

اور جَبْهَةٌ کے معنی ثریا ستارہ کے بھی آتے ہیں۔گویا وہ بھی برج اسد کے لیے بمنزلہ پیشانی کے ہے۔ جَبْهَةُ الْقَوْمِ: سرداران قوم جیسا کہ انھیں وُجُوْهُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے اور جَبْهَة کے معنی گھوڑے بھی آتا ہے، جیسا کہ مروی ہے ❷ (۵۷) اَنَّهٗ لَيْسَ فِى الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ. یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

ج ب ی

جَبٰى: (ض) جِبَايَةً ، اَلْمَاءَ فِى الْحَوْضِ: حوض میں پانی جمع کیا اور بڑے حوض کو جابِيَة کہا جاتا ہے اس کی جمع جَوَابٍ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

---

❶ ففیہ اربع قراءت جبلاً نسبہ الضبری الی روح وزید وقال ھو قراءۃ الحسن والاعرج والزھری راجع الطبرسی۲۳ : ۳۴ التفسیر للدانی ۸۴ اوتوزی ھو ابو محمد عبداللہ بن محمد التوزی من علماء البصرۃ ۔ ۲۳۰) راجع البغیہ ۲۹۰ والانباہ ۲ : ۱۲۶.

❷ وفی الفائق ۱ : ۸۶ وسمیت بذالك لانھاخیاالبھائم والحدیث باختلاف الفاظہ فی (البیھقی عن ابی ھریرۃ والحاکم فی امکنی عن الحسن عن عبدالرحمن بن سمرۃ وفی مراسلہ والبیھقی ایضاًعن الحسن مرسلا وابو عبیدفی غریبہ راجع لتخریجہ (خیل).

﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ ﴾ (۳۴۔۱۳) اور لگن جیسے بڑے بڑے حوض۔ اور اسی سے بطور استعارہ جَبَيْتُ الْخَرَاجَ جِبَايَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی مال خراج جمع کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ يُجْبَى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (۲۸۔۵۷) جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔
اَلْاِجْتِبَاءُ: (افتعال) کے معنی انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ﴾ (۷۔۲۰۳) اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف) سے کیوں نہیں بنالی۔ میں لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خود ہی ان کو تالیف کیوں نہیں کر لیتے، دراصل کفار یہ جملہ طنزاً کہتے تھے کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بلکہ تم خود ہی اپنے طور بنا لیتے ہو۔
اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اسے اپنے فیض کے لیے برگزیدہ کر لیتا ہے، جسے گوناگوں نعمتیں جدوجہد کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں، یہ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے اور صدیقوں اور شہیدوں کے لیے جوان کے قریب درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ ﴾ (۱۲۔۶) اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا۔
﴿ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (۶۸۔۵۰) پھر پروردگار نے ان کو برگزیدہ کر کے نیکوکاروں میں کر لیا۔
﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (۶۔۸۷) ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔
﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴾ (۲۰۔۱۲۲) پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔
﴿ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ (۴۲۔۱۳) جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے، اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔
اس اجتباء کو دوسرے مقام پر اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔
﴿ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ (۳۸۔۴۶) ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

ج ث ث

جَثَّهٗ (ن) جَثًّا کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں اور اِنْجَثَّ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسا کہ جَسَّ کا مطاوع اِجْتَسَّ آتا ہے قرآن پاک میں ہے [1]
﴿ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ ﴾ (۱۴۔۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔
اَلْمِجَثَّةُ: ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا کھودا جائے۔
جُثَّةُ الشَّيْءِ کے معنی کسی کے ابھرے ہوئے شخص کے ہیں اور اَلْجُثُّ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو زمین سے بلند ہو جائے، جیسے ٹیلہ وغیرہ۔

[1] وفي الحديث قال رجل لنبي صلى الله عليه وسلم ماهذه الكمأة الاشجرة التي اجتثت من فوق الارض فقال لابل (من المن (التاج) ۱۲.

اَلْجَثِيْثَةُ: کھجور کا پودا جو اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔ ❶

اَلْجُثْجَاثُ: ایک قسم کا گھاس۔ ایک کڑوا خوشبودار زرد درخت جس میں بابونہ کی طرح پھول ہوتے ہیں۔

ج ث م

جَثَمَ (ض ن) جَثْمًا وَجُثُوْمًا: الطائر پرندکا زمین پر سینہ کے بل بیٹھنا اور اس کے ساتھ چمٹ جانا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر فرمایا: ﴿ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ﴾ (۷۔۹۱) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

اَلْجُثْمَانُ: بیٹھے ہوئے انسان کا شخص۔ رَجُلٌ جُثْمَةٌ وَجَثَّامَةٌ بہت سونے والا سست آدمی۔

ج ث و

جَثَا (ن) جُثُوًّا وَجِثِیًّا۔ الرَّجُلُ: گھٹنوں کے بل بیٹھنا یہ عَتَا (ن) عَتُوًّا وَعِتِیًّا کی طرح (باب نصر سے آتا ہے) جَاثٍ (صیغہ صفت) ج جُثِیٌّ جیسے بَاكٍ وَبُكِیٌّ. اور آیت کریمہ:

﴿ وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ﴾ (۱۹۔۷۲) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میں جِثِیًّا، جَاثٍ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مصدر بمعنی اسم فاعل بھی اور آیت کریمہ: ﴿ وَتَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً ﴾ (۴۵۔۲۸) اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوگا۔ میں "جَاثِیَةً" جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے: جَمَاعَةٌ قَائِمَةٌ اَوْ قَاعِدَةٌ

ج ح د

جَحَدَ (ف) جَحْدًا وَجُحُوْدًا: (جان بوجھ کر انکار کر دینا) کے معنی دل میں جس چیز کا اقرار ہو، اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اقرار کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ﴾ (۲۷۔۱۴) اور ان سے انکار (کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔ ﴿ بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ﴾ (۷۔۵۱) اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے:

رَجُلٌ جَحْدٌ یعنی کنجوس اور قلیل الخیر آدمی جو فقر کو ظاہر کرے۔

اَرْضٌ جَحْدَةٌ: خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو۔ محاورہ ہے: جَحْدًا لَّهٗ وَنَكِدًا . (اسے خیر حاصل نہ ہو)

اَجْحَدَ. (افعال) انکار کرنا۔ منکر ہونا۔

ج ح م

اَلْجَحْمَةُ: آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے اَلْجَحِیْمُ (فعیل) ہے، جس کے معنی دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں۔

اور جَحْمَةَ النَّارِ سے بطور استعارہ جَحِمَ (س) وَجْهُهٗ مِنْ شِدَّةِ الْغَضَبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں، کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے، کہا جاتا ہے:

جَحَمَ (ف) الْاَسَدُ بِعَیْنَیْهِ شیر کی آنکھیں بھی آگ

---

❶ فی الطبوع "بعد طحنه" مصحف والصحیح بعد قلعه کمافی المعاجم.

کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

ج د د

اَلْجَدُّ: (مصدر ض) کے اصل معنی ہموار زمین پر چلنے کے ہیں۔ اسی سے جَدَّ فِی سَیْرِہٖ ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے معاملہ میں محنت اور جانفشانی سے کام کرے تو کہا جاتا ہے: جَدَّ فِیْ اَمْرِہٖ اور اَجَدَّ (افعال) کے معنی صاحب جد ہونے کے ہیں اور جَدَدْتُ الْاَرْضَ سے کسی چیز کو کاٹنے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جَدَدْتُہٗ (میں نے درست کرنے کے لیے اسے کاٹا) اور ثَوْبٌ جَدِیْدٌ کے اصل معنی قطع کیے ہوئے کپڑا کے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے، اس لیے ہر نئی چیز کو جَدِیْدٌ کہا جانے لگا ہے اس بنا پر آیت: ﴿بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ (۵۰۔۱۵) میں خلق جدید سے نشاۃ ثانیہ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونا مراد ہے، کیونکہ کفار اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے:

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہوں گے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے۔ اور جدید (نیا) خلق یعنی پرانا کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، اس اعتبار سے رات دن کو جَدِیْدَان اور اَجَدَّان کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ﴾ (۳۵۔۲۷) اور پہاڑوں پر سفید رنگ کے قطعات ہیں۔

میں جُدَدٌ کا واحد جُدَّۃٌ ہے، جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں اور یہ طَرِیْقٌ مَجْدُوْدٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے، اسی سے جَادَّۃُ الطَّرِیْقِ ہے، (جس کے معنی شاہراہ یا ہموار اور راستہ کے درمیانی حصہ کے ہیں، جس پر عام طور پر آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔)

اَلْجَدُوْدُ وَالْجَدَّاءُ: خشک تھنوں والی بھیڑ بکری اور سب وشتم کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جُدَّ ثَدْیُ اُمِّہٖ اس کی ماں کے پستان خشک ہو جائیں اور جَدٌّ کا لفظ فیض الٰہی پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاَنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا﴾ (۷۲۔۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔

میں جَدٌّ بمعنی فیض الٰہی ہی کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں [1] لیکن اس کا مرجع بھی معنی اول کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اختصاص ملک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالیٰ انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَدٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے، جس کے معنی بخت و نصیب کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: جُدِدْتُ وَحُظِظْتُ خوش قسمت اور صاحب نصیب ہو گیا اور حدیث (۵۸) وَلَا یَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ. کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی مال وجاہ سے آخرت میں ثواب حاصل نہیں ہو سکے گا، بلکہ اُخروی ثواب کے حصول کا ذریعہ صرف طاعت الٰہی ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَہٗ فِیْھَا مَا

---

[1] راجع غریب القران للقبتی ۱۹. اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱ : ۹۰ من حدیث ابی سعید الخدری (ابن عباس (باب الدعاء بعدالرکوع) والنسائی عن معاویۃ : مایقول اذاانصرف من الصلوۃ کنزالعمال ۲ : رقم ۲۰۸۹) ۱۲.

﴿نَشَآءُ﴾ کے بعد فرمایا:
﴿وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۹) اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوششیں کرے۔ جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔
نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنٌ﴾ (؟.....؟) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔
اَلْجَدُّ (ایضاً) دادا۔ نانا۔
بعض نے کہا ہے کہ لَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ کے معنی یہ ہیں کہ اسے آبائی نسب فائدہ نہیں دے گا اور جس طرح کہ آیت: ﴿لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنٌ﴾ میں اولاد کے فائدہ بخش ہونے کی نفی کی ہے، اسی طرح حدیث میں آباؤاجداد کے نفع بخش ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

ج د ث

جَدَثٌ: قبر۔ ج: اَجْدَاثٌ۔ قرآن میں ہے:
﴿یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ (۷۰۔۴۳) اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔
اور سورۂ یٰسین میں ہے: ﴿فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ﴾ (۳۶۔۵۱) یہ قبروں سے (نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف دوڑیں گے۔ اور قبر کو جَدَفٌ بھی کہا جاتا ہے۔ [1]

ج د ر

اَلْجِدَارُ کے معنی حَائِط (دیوار) ہی کے ہیں، لیکن اس اعتبار سے کہ وہ زمین سے اونچی اور بلند ہوتی ہے، اسے جِدَار کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسے حَائِط کہا جاتا ہے۔ جِدَارٌ کی جمع جُدُرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ﴾ (۱۸۔۸۲) اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں کی تھی۔
﴿جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ﴾ (۱۸۔۷۷) ایک دیوار (دیکھی) جو (جھک کر) گرا چاہتی تھی۔ خضرؑ نے اس کو سیدھا کر دیا۔
﴿اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ (۵۹۔۱۴) یا دیواروں کی اوٹ میں۔ اور حدیث پاک میں ہے [2] (۵۹) حَتّٰی یَبْلُغَ الْمَاءُ الْجُدُرَ. (جب تک کہ پانی دیواروں تک نہ پہنچ جائے۔)
جَدَرْتُ الْجِدَارَ: دیوار کو اونچا کر دیا۔
اور اس میں معنی ارتفاع کے اعتبار سے جَدَرَ الشَّجَرُ کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں، چنے کے دانے کی طرح درخت کے کونپل نکل آئے اسی طرح وہ روئیدگی جو زمین پر ظاہر ہو۔ اسے جَدْرٌ کہا جاتا ہے، اس کا واحد جَدْرَةٌ ہے اور اَجْدَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین

---

[1] راجع کتاب الابدال لابی الطیب ۱: ۱۹۲۔
[2] قال صلی اللہ علیہ وسلم فی شراج الحرۃ حین اختصم الیہ الزبیر بن العوام وحاطب بن ابی بلتعہ فقال یا زبیر اسق ثم ارسل الماء الی جارك فغضب الانصاری وقال: ان کان ابن عمتك فقال صلی اللہ علیہ وسلم اسق یا زبیر ثم احبس الماء حتیٰ یرجع الی الجدر الحدیث والکشاف ۱: ۲۷۸) وابن ابی الحاتم عن سعید بن المسیب وفی الصحیحین من طریق الزہری عن عروۃ (راجع تخریج الکشاف ۴۵ رقم ۷۲ وغریب ابی عبید ۴: ۲۰۱ والفائق ۱: ۶۵۲۔

سبزہ زار ہوگئی۔

جدر (ن) الصَّبِیُّ وَجُدِرَ (بچے کو چیچک نکل آئی) یہ محاورہ درخت کے کونپل کے ساتھ تشبیہاً بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْجِدْرِیُّ وَالْجِدْرَۃ کے معنی غدود یا آبلہ کے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتا ہے، اس کی جمع اَجْدَارٌ ہے۔ شَاۃٌ جِدَارٌ گوسپند آبلہ زدہ۔

اَلْجَیْدَرُ کوتاہ قد۔ یہ بھی جدار سے مشتق ہے، لیکن بطور تحکم اس میں یا زائدہ کردی گئی ہے۔ حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے اس میں یا بڑھادی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی کتاب ''اصول الاشتقاق'' میں بیان کرچکے ہیں۔

اَلْجَدِیْرُ: (سزاوار) اس کے معنی منتھیٰ کے ہیں۔ کیونکہ اس تک کسی امر کی انتہا ہوتی ہے۔ جیسا کہ دیوار تک پہنچ کر کوئی چیز رک جاتی ہے اور جَدُرَ (ك) بِكَذَا کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت جَدِیْرٌ آتا ہے۔

مَا اَجْدَرَہٗ وَاَجْدِرْ بِہٖ: (صیغہ تعجب) وہ اس کے لیے کس قدر زیبا ہے۔

ج د ل

اَلْجِدَالُ: (مفاعلۃ) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے ہیں، جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، اصل میں یہ جَدَلْتُ الْحَبْلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بٹنا، اسی سے بٹی ہوئی رسی کو اَلْجَدِیْلُ کہا جاتا ہے۔ جَدَلْتُ الْبِنَاءَ: مضبوط عمارت بنانا۔ دِرْعٌ مَجْدُوْلَۃٌ مضبوط زرہ۔

اَلْاَجْدَلُ شکرا۔ کیونکہ اس کا بدن بھی گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْمِجْدَلُ: مضبوط محل۔

اسی سے اَلْجِدَالُ (جھگڑنا) ہے، کیونکہ جھگڑنے والے بھی ایک دوسرے کو اس کی رائے سے اس طرح پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسی کو پیچ دیا جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اصل میں جِدال کے معنی صِرَاع یعنی ایک دوسرے کو جِدَالَۃ یعنی سخت زمین پر پچھاڑ دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ (۱۶۔۱۲۵) اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ ﴿الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ﴾ (۴۰۔۳۵) جو لوگ...... خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

﴿وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ﴾ (۲۲۔۶۸) اور اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ...... اللہ ان سے خوب واقف ہے۔

﴿قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا﴾ (۱۱۔۳۲) تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا۔ ایک قرأت میں جَدَلْنَا بھی ہے۔

﴿مَا ضَرَبُوْہُ لَكَ اِلَّا جَدَلاً﴾ (۴۳۔۵۸) انھوں نے (عیسیٰ کی) جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلاً﴾ (۱۸۔۵۴) لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

﴿وَھُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰہِ﴾ (۱۳۔۱۳) اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

﴿یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ (۱۱۔۷۴) وہ قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے۔

﴿ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ ﴾ (۴۰۔۵) اور بیہودہ (شبہات سے) جھگڑتے رہے۔

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ ﴾ (۲۲۔۳) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کی شان میں ...... جھگڑتے ...... ہیں۔

﴿ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ (۲۔۱۹۷) تو حج (کے دنوں) میں ...... نہ کسی سے جھگڑے۔

ج ذ ذ

اَلْجَذُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور پتھر یا سونے کے ریزوں کو جُذَاذ کہا جاتا ہے۔اسی معنی میں فرمایا:

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ﴾ (۲۱۔۵۸) پھر ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔

﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ (۱۱:۱۰۸) یہ (خدا کی) بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔

محاورہ ہے: مَا عَلَيْهِ جُذَّةٌ. یعنی اس کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں ہے۔

ج ذ ع

اَلْجِذْعُ: درخت کا تنا۔ج: جُذُوْعٌ. قرآن پاک میں ہے: ﴿ فِي جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ (۲۰۔۷۱) جَذَعَهٗ (ف) شاخ یا تنے کی طرح کاٹ ڈالنا۔اَلْجَذَعُ (من الابل) شتر بسال پنجم (من الشاۃ) گوسپند بسال دوم اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر زمانہ کو بھی جَذَعٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ زمانہ بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔)

ج ذ و

اَلْجَذْوَةُ وَالْجُذْوَةُ: (انگارہ) جلنے اور شعلہ ختم ہو جانے کے بعد جو ایندھن باقی رہ جاتا ہے، اسے جَذْوَۃ کہا جاتا ہے۔ج جِذًى و جُذًى. قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ (۲۸۔۲۹) یا آگ کا انگارہ۔خلیلؒ نے کہا ہے کہ جَذَا اور جَثَا ہم معنی ہیں یعنی چمٹ جانا، مگر جَذَا میں شدت لزوم کے معنی پائے جاتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے:

جَذَا الْقُرَادُ فِيْ جَنْبِ الْبَعِيْرِ. کہ چچڑی اونٹ کے پہلو میں سختی کے ساتھ چمٹ گئی۔

اَجْذَتِ (افعال) الشَّجَرَةُ درخت کا جڑ پکڑ لینا۔ حدیث میں ہے۔[1]

(۲۰) کَمَثَلِ الْاَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ. اس کی مثال مضبوط جڑ والے صنوبر کے درخت کی ہے، (یعنی جو ہوا کے جھکولوں سے ادھر ادھر نہیں جھکتا)

رَجُلٌ جَاذٍ: مرد کوتاہ دست و کوتاہ ارش۔مؤنث جَاذِيَةٌ: کوتاہ ہونے میں اس کے دونوں ہاتھ گویا پارۂ آتش ہیں۔

ج ر ح

جَرَحَهٗ (ف) جَرْحًا زخمی کرنا صفت مفعولی جَرِيْحٌ وَمَجْرُوْحٌ (زخمی) جُرْح (اسم) ج: جُرُوْحٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ﴾ (۵۔۴۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔

---

[1] راجع الفائق ۱: ۱۸۶ ولفظة الحديث متفق عليه من حديث كعب بن مالك في اثناء حديث : مثل المؤمن الحديث راجع مسلما مع النووی ۲: ۳۷۵ طبقه الهند وضبط النووی المجذبة بالباء من اجذب والبخاری مرضیٰ۔توحید و"دی" افاق (حم) ۲: ۴۲۳۔۵: ۱۴۲ وغريب ابی عبيد ج ۱ص ۱۱۶۔۱۱۷.

اور زخم کے ساتھ تشبیہ دے کر گواہ پر بحث کرنے کو بھی جَــرْح کہا جاتا ہے اور کتے، چیتے اور پرندے شکاری جانور کو جَـارِحَة کہا جاتا ہے۔اس کی جمع جَوَارِحُ ہے اور شکاری جانوروں کو جَـوَارِح یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتے ہیں اور یا اس لیے کہ وہ کما کر لاتے ہیں ان ہر دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر اعضاء کاسبہ یعنی ہاتھ پاؤں کو جَـــوَارِحُ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ ﴾ (۵۔۴) (اور وہ شکار بھی حلال ہے) جوتمہارے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو۔جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔اَلْاِجْتِــرَاحُ (جرائم کا ارتکاب کرنا) اصل میں جَـرَاحَة سے ہے جیسا کہ اِقْتِرَاف کا لفظ قَـرْفُ الْقَرْحَةَ سے مشتق ہے،جس کے معنی زخم کے چھیلنے کے ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ ﴾ (۴۵۔۲۱) جولوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ خیال کرتے ہیں۔

ج ر د

اَلْجَرَادُ: ٹڈی۔اس کا واحد جَرَادَة ہے۔قرآن میں ہے:

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ ﴾ (۷۔۱۳۳) ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں...... بھیجیں۔

﴿ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴾ (۵۴۔۷) الغرض جَرَادٌ کے معنی ٹڈی کے ہیں۔اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اصل ہو اور اس سے جَـرَدَ الْاَرْضَ مشتق ہو۔جس کے معنی ہیں ٹڈی زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جراد خود جَرَدَ سے مشتق ہو،جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ ٹڈی زمین کی روئیدگی کو کھا کر اسے ننگا اور صاف کر دیتی ہے،اس لیے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے اور اَرْضٌ مَجْرُوْدَةٌ اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کی نباتات کو ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

فَرَسٌ اَجْرَدُ بے بال یا چھوٹے بالوں والا گھوڑا۔ثَوْبٌ جَــرْدٌ. پرانا کپڑا۔کیونکہ اس کی روئیں جھڑ جاتی ہیں اور کمزور ہو جاتا ہے۔تَـجَـرَّدَ عَـنِ الثَّـوْبِ ننگا ہونا۔ کپڑے اتار دینا۔

جَرَّدَهٗ (عن الثِّيَاب) ننگا کرنا۔

اِمْرَءَةٌ حَسَنَةُ الْمُتَجَرِّدِ یعنی خوب صورت بدن است وقت برہنگی ایک روایت میں ہے۔ [1]

(۶۱) جَرِّدُوا الْقُرْاٰنَ: قرآن کو علیحدہ رکھو یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ کرو۔

اِنْجَرَدَ بِنَا السَّيْرُ دراز گردید سفر۔

جَرِدِ الْاِنْسَانُ: خراج برآرد پوست انسان از خوردن ملخ یعنی ملخ کے کاٹنے سے جسم پر پتی اچھلنا۔

ج ر ز

جُـــرُزٌ: وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو،نیز فرمایا:﴿ صَـعِيْدًا جُرُزًا ﴾ (۱۸۔۸) بنجر میدان......

---

[1] موقوفا علی ابن مسعود وتمامه ليربو فيه صغير كم ولاينأى عنه كبيركم فان الشيطان يخرج من بيت تقرء فيه سورة البقرة الفائق ۱ : ۹۶ وفي تاويله قولان : ارادرضي الله عنه تجريده عن النقط والعشور لئلا تنشانشوء فيرى انها من القران وقيل هو حث على ان لا يتعلم غير مالي حصوه بالتعلم غريب ابي عبيد ٤ : ٤٦۔٤٩).

یعنی جس پر گھاس درخت وغیرہ کوئی چیز نہ ہو۔
اَرْضٌ مَجْرُوْزَۃٌ: زمین جس سے گھاس چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔
اَلْجَرُوْزُ: جو دستر خوان کو صاف کر ڈالے۔ مثل مشہور ہے: لَاتَرْضٰی شَانِئِہٖ اِلَّا بِجِرْزِہٖ. یعنی اس کے دشمن اس کا استیصال کیے بغیر خوش نہیں ہوں گے۔
اَلْجَارِزُ: سخت کھانسی (اس میں معنی جرز کا تصور پایا جاتا ہے)
اَلْجُرَازُ: تلوار سے کاٹنا۔ سَیْفٌ جُرَازٌ شمشیر بڑان۔

ج ر ع

جَرَعَ (ف) جَرْعًا۔ اَلْمَاءُ گھونٹ گھونٹ کرکے پانی پینا۔ اور بقول بعض جرع (س) آتا ہے۔
تَجَرَّعَہٗ (تفعل) تکلف سے گھونٹ گھونٹ کرکے پی گیا۔ گویا اس کا پینا طبیعت پر ناگوار گذر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:
﴿یَتَجَرَّعُہٗ وَ لَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ﴾ (۱۴۔۱۷) وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔ جَرْعَۃٌ ایک مرتبہ گھونٹ سے نگلنا۔ مثل مشہور ہے [1] اَفْلَتَ بُجُرَیْعَۃِ الذَّقَنِ. وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بچ نکلا۔
نُوْقٌ مَجَارِیْعُ: وہ اونٹنیاں جن کا دودھ تقریباً خشک ہوگیا ہو۔

اَلْجَرْعُ وَالْجَرْعَاءُ: ریگستان جس میں کچھ نہ اُگے۔ گویا وہ بیج کو نگل لیتا ہے۔

ج ر ف

قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ﴾ (۹۔۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر۔
اَلْجُرُفُ: دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔ محاورہ ہے: جَرَفَ الدَّھْرُ مَالَہٗ. حوادث زمانہ نے اس کے مال کو تباہ کر دیا۔
رَجُلٌ جُرَافٌ: مرد بسیار جماع شادماں۔ گویا وہ اس شغل میں بہہ رہا ہے۔

ج ر م

اَلْجَرْمُ: (ض) اس کے اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے ہیں یہ صیغہ صفت جَارِمٌ ج جِرَامٌ۔
تَمْرٌ جَرِیْمٌ: خشک کھجور۔ جُرَامَۃٌ ردی کھجوریں جو کاٹتے وقت نیچے گر جائیں۔ یہ نُفَایَۃٌ کے وزن پر ہے (جو کہ ہر چیز کے ردی حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)
اَجْرَمَ: (افعال) جرم والا ہونا۔ جیسے اَثْمَرَ وَاَتْمَرَ وَاَلْبَنَ اور استعارہ کے طور پر اس کا استعمال اکتساب مکروہ پر ہوتا ہے۔ اور پسندیدہ کسب پر بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا مصدر جَرْمٌ ہے، شاعر نے عقاب کے متعلق کہا ہے [2]۔
(۸۸) جَرِیْمَۃُ نَاہِصٍ فِیْ رَاْسِ نِیْقٍ

---

[1] افلت یکون لازماومتعدیا والباء بمعنیٰ مع و جریعۃ تصغیر جرعۃ والمرا ومنہ النفس ای خلص مع جریعۃ الذقن ای فیہ بقیۃ ارواحہٖ بقدر جرعۃ فی الفم راجع لتفصیلہ المیدانی ۶۹۔۷۰ وابدال ابی الطیب ۳: ۲۷۳۔۲۷۴ واللسان (جرع)۔

[2] قالہ ابو خراش المھری یصف عقابا شبہ فرسہ بھاترزق فرخھاوتمامہ: تری لعظام ماجمعت صلیبًا وفی اللسان (جرم) صلب) والاساس (جرع)ناھض بدل نامص والبیت فی الاقتضاب ۳۱۷ والمعانی للقبتی ۲۸۔۴۱۵ وغریب القران للقبتی ۱۳۹ واصلاح یعقوب وادب الکاتب ۶۶ والد ولبحر ۵: ۲۱۳ والحیون ۶: ۳۳۷ واشعار الھذلیین ۲: ۵۷)۔

جیسا کہ (عقاب) بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنے بچوں کے لیے روزی کما کر ان کو کھلاتا ہے۔

یہاں شاعر کا ''شاہین کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کا جرم کہنا'' یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ پرندوں کو شکار کر کے لاتا ہے اور یا اس کو ایسا شخص فرض کیا ہے جو اپنی اولاد کی خاطر گناہ کرتا ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ ہر صاحب اولاد خواہ بہائم ہی کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کے لیے ضرور ہی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اِجْرَام (افعال) اور جَرْم (ض) دونوں فعل استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ اجرام کے متعلق فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ﴾ (۸۳۔۲۹) جو گنہگار (یعنی کفار) ہیں وہ (دنیا میں) مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

﴿ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴾ (۷۷۔۴۶) (اے جھٹلانے والو!) تم کسی قدر کھالو اور فائدے اٹھالو تم بیشک گنہگار ہو۔

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴾ (۵۴۔۴۷) بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ (۴۳۔۷۴)

اور جَرَمَ (ض) کے متعلق فرمایا:

﴿ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ ﴾ (۱۱۔۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے کہ...... تم پر واقع ہو۔

یہاں اگر یَجْرِمَنَّكُمْ فتحہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو بَغَیْتُهٗ مَالاً کی طرح ہوگا اور اگر ضمہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو اَبْغَیْتُهٗ مَالاً (یعنی میں نے مال سے اس کی مدد کی) کے مطابق ہوگا۔

﴿ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ﴾ (۵۔۸) اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ اور آیت کریمہ:

﴿ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ ﴾ (۱۱۔۳۵) تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر۔ میں ہوسکتا ہے کہ اِجْـــرام (بکسر الہمزہ) باب افعال سے مصدر ہو اور اگر اَجْـــرَام (بفتح الہمزہ) پڑھا جائے تو جَرْمٌ کی جمع ہوگی۔ ❶

اور جرم بمعنی قطع سے بطورِ استعارہ کہا جاتا ہے: جَرَمْتُ صُوْفَ الشَّاةِ: میں نے بھیڑ کی اُون کاٹی۔ تَجَرَّمَ اللَّیْلُ. رات ختم ہوگئی۔

اَلْجِرْمُ: (جسم) اصل میں یہ بمعنی مَجْرُوْم ہے یعنی قطع کیا ہوا۔ جیسے: نِفْضٌ وَنِقْضٌ بمعنی منفوض و منقوض کے آتا ہے۔

پھر یہ جسم پر بولا جاتا ہے اور فَلَانٌ حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی ہیں کہ خوبصورت ہے، جیسا کہ حَسَنُ السَّخَا کا محاورہ ہے اور حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی حسن صوت بھی آتے ہیں اور اس میں درحقیقت جرم سے محل صوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے نہ کہ نفس صوت کی طرف لیکن اس سے آواز کی خوبصورتی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس کے معنی حسن صوت کردیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اسی

---

❶ قال الزمخشری وینصر الجمع ان فسرۂ الاولون بآثای (الکشاف ۳۹۲ ج ۲)۔

معنی میں طَیِّبُ الْحَلْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ حلق سے موت مراد لی جاتی ہے نہ کہ بذاتِ خود حلق مراد ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ لَا جَرَمَ ﴾ (۱۶۔۱۰۹) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے لَا اَصل میں محذوف پر داخل ہوا ہے، جیسا کہ لَآ اُقْسِمُ میں لاآتا ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] ع (متقارب)

(۸۹) لَا وَاَبِیْكِ ابْنَةُ الْعَامِرِیِّ

اور جَرَمَ فعل ماضی ہے، جس کے معنی اَکْسَبَ و جَنٰی کے ہیں اس کے بعد اَنَّ لَهُمُ النَّارُ (جملہ) موضع مفعول میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے لیے (دوزخ کی) آگ حاصل کی۔

بعض نے کہا ہے کہ جَرَمَ اور جُرْمٌ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن لَا کے ساتھ جَــرَمَ آتا ہے، جیسا کہ قسم کے ساتھ عَمرو کا لفظ مختص ہے اگرچہ عَمْرٌ و عُمْرٌ کے معنی ایک ہی ہیں اور معنی یہ ہے کہ ان کے لیے آگ کا ہونا کسی کا جُرم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کے عملوں کی سزا ہوگی اور انھوں نے خود ہی اسے اپنے لیے حاصل کیا ہوگا، جیسا کہ آیت: ﴿ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ﴾ (۴۱۔۴۶) اور جو برے کام کرے گا۔تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر میں اور بھی بہت سے اقوال منقول ہیں۔ [2] لیکن ان میں سے اکثر تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ﴾ (۱۶۔۲۲،۲۳) تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔ ﴿ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ (۱۶۔۱۰۹) کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

ج ر ی

جَرٰی (ض) جِرْیَةً وَجَرْیًا وَجِرَیَانًا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ [2]

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ﴾ (۴۳۔۵۱) اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہہ رہی ہیں کیا میری نہیں ہیں؟

---

[1] قاله امرؤ القیس یخاطب ابنه عمه فاطمه وللبیت من مطلع قصیدة عدتها ۴۲ بیتاً وتمامه .... لا یدعی القوم انی افر. والبیت فی الحماسة مع الزروقی ۔ راجع الخزانة ۱ : ۳۳۷۔۴ : ۴۸۹ والعین ۱ : ۹۶ وشرح المفضلیات والعلقات لابن الانباری ۴۴ والعقد الثمین ۱۲۶ والسیوطی ۲۱۷ والطبری ۲۷۔۱۳۱) والفخر ۳۰۔۲۱۴) والبیت ایضاً من شواهد الکشاف ۴۵ قال المحب وقیل البیت لربیعة بن جشم الیمنی وایضاً المغنی ۱ : ۲۷۶ ودیوانه ۹۴.

[2] وقیل "ان فی موضع رفع وجرم بمعنی وجب ان لهم النار وانهم مفرطون بحث الفالی فی نوادره فی لاجرم" ومنه اخذ ابن الانباری وغیرهم معظم هذاالباب ولم یخرج المؤلف مماهنالك و ذکروا فیه وجوه ذهب الفراء تبعاً للکسائی ان جرم اسم لا وذهب سیبویه فی الکتاب بانه فعل ماضی راجع للبحث النوادر ۲۱۲۔۲۱۳ الخزانة ۴ : ۳۱۱ والصحاح والتاج (جرم) وامالی المرتضیٰ ۱ : ۱۱۰) والفاخر لابی طالب ۱۹۹ واعراب القران المنسوب الی الزجاج ۱۱۷۔۱۱۸ وفی ابن کثیر ۴ : ۸۰) قال السدی وابن جریر "لاجرم" معناه حقاً وقال الضحاك لاکذب وثال علی بن طلحة عن ابن عباس لاجرم معناه بلیٰ ...... وفی التاج ومایجری بجریه وفی المطبوع .... ومایجری بجریه ۱۲.

﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (۲۔۲۵) باغ، میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔
﴿ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ ﴾ (۳۰۔۴۶) اور تا کہ...... کشتیاں چلیں۔ ﴿ فِیْهَا عَیْنٌ جَارِیَةٌ ﴾ (۸۸۔۱۲) اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے۔ اور آیت کریمہ:
﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ ﴾ (۶۹۔۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کرلیا۔
میں جَارِیَةٌ سے مراد کشتی ہے، اس کی جمع جَوارِ آتی ہے جیسے فرمایا: ﴿ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتِ ﴾ (۵۵۔۲۴) اور جہاز جو...... اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔
﴿ وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴾ (۴۲۔۳۲) اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز، میں (جو) گویا پہاڑ ہیں۔
اور پرند کے سنگدانہ کو جَــرِیَّةٌ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لیے کہ وہ طعام کا مجریٰ بنتا ہے۔ اَلْاِجْرِیَّا: عادت جس پر انسان چلتا ہے۔
اَلْجَرِیُّ: وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخص ہے۔ اور جَرَّیْتُ جَرِیًّا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں۔ اور حدیث میں ہے [1] (۶۲)
لَا یَسْتَجْرِیَنَّكُمُ الشَّیْطَانُ یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہوسکتا ہے، یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہہ جانے پر تمہیں برانگیختہ نہ کرے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جَرِیٌّ بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست مت بنو گویا یہ آیت کریمہ:
﴿ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ﴾ (۴۔۷۶) شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا:
﴿ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ﴾ (۳۔۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

ج ز ء

جُــزْءُ الشَّــيْءِ: چیز کا ٹکڑا جس سے وہ چیز مل کر بنے۔ جیسے اَجْزَاءُ السَّفِیْنَةِ اَجْزَاءُ الْبَیْتِ اور حساب میں اَجْزَاءُ الْجُمْلَةِ (یعنی کل مجموعہ کے اجزاء) وغیرہ محاورات بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ﴾ (۲۔۲۶۰) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو۔
﴿ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴾ (۱۵۔۴۴) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں ایک حصہ تقسیم کردیا گیا ہے۔
﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ﴾ (۴۳۔۱۵) اور انھوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لیے اولاد مقرر کی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ جُزْءًا سے مراد اِنَاثٌ ہیں، میں انھوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا اور یہ اَجْزَأَتِ الْمَرْءَةُ کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی مادینہ اولاد کو جنم دینا کے ہیں۔
جَزَءَ الْاِبِلُ مَجْزَءً وَجَزْأً: اونٹ تر گھاس کھانے کی

[1] الحدیث فی النهایة وقبله قولوا بقولکم .... وذالك انهم مدحوه فکره لهم المبالغة فی المدح ای لاتتکلفوا فی المدح فیتخذکم الشیطان جریا ای وکیلا: ۱/۲۶٤.

وجہ سے پانی سے بے نیاز ہوگئے ۔ محاورہ ہے: اَللَّحْمُ السَّمِیْنُ اَجْزَءُ مِنَ الْمَھْزُوْلِ: موٹا گوشت دبلے گوشت سے زیادہ کفایت کرنے والا ہوتا ہے۔

جُزْءَۃُ السِّکِّیْنِ . چھری کا دستہ کیونکہ وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

ج ز ع

اَلْجَزَعُ: بے صبری ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۱۴۔۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے حق میں برابر ہے۔ یہ حزن سے خاص ہے کیونکہ جَزَعٌ خاص کر اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے اور اس سے تعلق قطع کر دے۔

اصل میں جَزْعٌ (ف) کے معنی رسی کو نصف سے کاٹ دینے کے ہیں اور اِنْجَزَعَ (انفعال) اس کا مطاوع آتا ہے، جیسے جَزَعْتُہٗ فَانْجَزَعَ میں نے اسے کاٹا چنانچہ کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو جَزْعُ الْوَادِیْ کہا جاتا ہے اور تغیر سے بھی چونکہ اصل رنگ کٹ جاتا ہے، اس لیے متلون خرمہرے کو جَزْعٌ کہتے ہیں اسی سے لَحْمٌ مُجَزَّعٌ کا محاورہ مستعار ہے، جس کے معنی دو رنگ کے گوشت کے ہیں اور نیم پختہ کھجور کو مُجَزَّعٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْجَازِعُ: شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے چھوٹے شہتیر آ آ کر اس پر مل جاتے ہیں تو اسے جَازِع یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ بوجھ اٹھانے کی وجہ سے گویا وہ بے صبر ہو رہا ہے اور یا اس لیے کہ کمرے کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے گویا وہ اسے دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے۔

ج ز ی

اَلْجَزَاءُ: (ض) کافی ہونا ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا ﴾ (۲:۴۸) کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

لَا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا . کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ اَلْجَزَاءُ: (اسم) کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو، جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جَزَیْتُہٗ کَذَا بِکَذَا میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَکّٰی ﴾ (۲۰۔۷۶) اور یہ اس شخص کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔

﴿ فَلَہٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی ﴾ (۱۸۔۸۸) اس کے لیے بہت اچھا بدلہ ہے۔

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

﴿ وَجَزٰھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرًا ﴾ (۷۶۔۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور ریشم (کے) ملبوسات عطا کرے گا۔

﴿ جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴾ (۱۷۔۶۳) اور وہ پوری پوری جزا ہے۔

﴿ اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (۲۵۔۷۵) ان (صفات) کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔

﴿ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۳۷۔۳۹)

اور تم کو بدلا ویسا ہی ملے گا، جیسے تم کام کرتے تھے۔

اَلْجِزْیَۃُ: وہ ٹیکس جو ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔اور اسے جِزْیَہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلہ میں ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

محاورہ ہے: جَازِیْكَ فُلَانٌ یعنی فلاں تجھے کافی ہے۔

جَزَیْتُہٗ بِکَذَا وَ جَازَیْتُہٗ: میں نے اسے بدلہ دیا۔قرآن پاک نے جَـــزٰی (ض) کا لفظ استعمال کیا ہے اور جَازٰی (مفاعلہ) استعمال نہیں کیا۔کیونکہ مجازاۃ کے معنی مکافات کے ہوتے ہیں یعنی کسی کے احسان (نعمت) کے بدلے میں اسی قسم کا احسان کرنا۔ یہ چیز دو آدمیوں کے درمیان تو باہم مشترک ہوسکتی ہے۔لیکن نعمت الٰہی کی کوئی شخص مکافات نہیں کرسکتا۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مکافات کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے، (جس کی دلیل کی ضرورت نہیں۔)

ج س س

اَلْجَسُّ: کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور نبض دیکھ کر معلوم کرنا کہ بیمار ہے یا تندرست۔ یہ حَــــسٌّ سے خاص ہے۔کیونکہ حَسٌّ کے معنی قوۃ احساس سے کسی چیز کا ادراک کرنا کے ہیں۔لیکن جَسٌّ کسی اندرونی حالت کے معلوم کرنے کو کہتے ہیں اور لفظ جَسٌّ سے جَاسُوْسٌ کا لفظ مشتق ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَا تَـجَسَّسُوْا ﴾ (۴۹۔۱۲) اور ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا تجسس نہ کیا کرو۔

ج س د

اَلْـجَسَدُ: (اسم) جسم ہی کو کہتے ہیں مگر یہ جسم سے اخص ہے، خلیلؒ فرماتے ہیں کہ جسد کا لفظ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق پر نہیں بولا جاتا۔ نیز جَسَد رنگدار جسم کو کہتے ہیں مگر جسم کا لفظ بے لون اشیاء مثلاً پانی، ہوا وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا جَـعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ ﴾ (۲۱۔۸) کہ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں ...... سے خلیل کے قول کی تائید ہوتی ہے۔نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿ عِجْلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ ﴾ (۲۰۔۸۸) ایک بچھڑا یعنی قالب، جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

﴿ وَاَلْـقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴾ (۳۸۔۳۴) اور ان کے تخت پر ہم نے ایک دھڑ ڈال دیا، چنانچہ انھوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ اور لون کے اعتبار سے زعفران کو جساد کہا جاتا ہے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کو ثَـوْبٌ مُـجَسَّدٌ کہتے ہیں۔

اَلْـمِـجْسَـد۔ کپڑا جو بدن سے متصل ہو۔اَلْـجَسَـد وَالْجَاسِدُ وَالْجَسِد خشک خون۔

ج س م

اَلْـجِسْـمُ: وہ ہے جس میں طول، عرض اور عمق پایا جائے اور اجزاء جسم خواہ کتنے ہی لطیف کیوں نہ ہوں اجسام ہی کہلاتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ (۲۔۲۴۷) اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی

(بڑا عطا کیا ہے۔)

اور آیت کریمہ:

﴿ وَاِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُھُمْ ﴾ (۶۳۔۴)

اور جب تم ان (کے تناسب اعضا) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمھیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بظاہر ان کی شکل و صورت اگرچہ جاذب نظر آتی ہے، لیکن ان کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔

اَلْجِسْمَانُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کے شخص کے ہیں لیکن کسی شخص کے اجزاء ضروری نہیں کہ تقطیع اور تجزیہ کے بعد بھی ان کو شخص ہی کہا جائے مگر جسم کے اجزاء کو خواہ کتنا ہی باریک کیوں نہ کر دیا جائے وہ جسمیت سے خارج نہیں ہوتے۔

ج ع ل

جَـعَـلَ: (ف) یہ لفظ ہر کام کرنے کے لیے بولا جاسکتا ہے اور فَـعَلَ وَصَنَعَ وغیرہ افعال کی بنسبت عام ہے۔ اور یہ پانچ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) بمعنی صَارَ وَطَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا جیسے جَـعَـلَ زَیْدٌ یَقُوْلُ کَذَا (یعنی زید یوں کہنے لگا)

شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۹۶) فَقَدْ جَعَلَتْ قُلُوْصُ بَنِی سُھَیْلٍ
مِنَ الْاَکْوَارِ مَرْتَعُھَا قَرِیْبٌ

اب بنی سہیل کی اونٹنی اکوار (جمع کور) کے قریب چرنے لگی ہے۔

(۲) بمعنی اَوْجَـدَ (یعنی ایجاد اور پیدا کرنا) اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَجَـعَـلَ الظُّـلُـمَاتِ وَالنُّوْرَ ﴾ (۶۔۱) اور اندھیرے اور روشنی بنائی۔

﴿ وَّجَـعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَۃَ ﴾ (۱۶۔۷۸) اور اس نے تم کو کان، آنکھیں اور دل (اور اس کے علاوہ اور اعضاء) بخشے۔

(۳) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے فرمایا: ﴿ جَـعَـلَ لَـکُـمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا ﴾ (۴۲۔۱۱) اسی نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔

﴿ وَّجَـعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا ﴾ (۱۶۔۸۱) اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں۔

﴿ وَّجَـعَلَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا ﴾ (۴۳۔۱۰) اور اس میں تمہارے لیے رستے بنائے۔

(۴) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کر دینا۔ جیسے فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ (۲۔۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا ...... بنایا۔

﴿ وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا ﴾ (۱۶۔۸۱) اور اللہ ہی نے تمہارے (آرام کے) لیے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے۔

---

[1] قالہ رجل من یحتر بن عتود والبیت فی الحماسۃ رقم ۹۹ مع المرزوقی فی ثلاثۃ بغیر عزو والبیت من شواھد الخزانۃ ٤: ۹۲) وفی روایۃ "ابنی زیاد" ولم اراحد من الشرح نسبھاالی قائلھا و وجدت نسبتھا عندالصاغانی فی العباب (الخیل) والبیت فی اللسان (جعل) والعینی والخزانۃ ۲: ۳۳٦)١٢.

﴿ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا ﴾ (۷۱۔۱۶) اور چاند کوان میں (زمین کا) نور بنایا۔
﴿ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ (۴۳۔۳) کہ ہم نے اس کوقرآن عربی بنایا ہے۔
(۵) کسی چیز پر کسی چیز کے ساتھ حکم لگانا عام اس سے کہ وہ حکم حق ہو یا باطل، حق کی مثال جیسے:
﴿ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (۲۸۔۷) ہم ان کوتمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنادیں گے۔
اور باطل کی مثال جیسے:
﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا ﴾ (۶۔۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔
﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ ﴾ (۱۶۔۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔
﴿ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴾ (۱۵۔۹۱) یعنی قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔
اَلْجَعَالَةُ: چولہے سے دیگ اتارنے کا چیتھڑا۔ ہنڈیا اتارنے کا رومال۔
اَلْجُعْلُ وَالْجَعَالَةُ وَالْجَعِيْلَةُ: جو چیز کسی شخص کے لیے کسی کام کے عوض مقرر کیا جائے۔ یہ اجرت اور ثواب سے اعم ہے۔
كَلْبٌ يُجْعِلُ (کنایہ) کتے کا جفتی کی خواہش کرنا۔ [1]
اَلْجُعَلُ: گبریلا۔ سیاہ بھونرا۔ ج جِعْلَانٌ.

ج ف ن

اَلْجَفْنَةُ: پیالہ۔ خاص کر کھانے کے برتن کو کہتے ہیں۔ ج جِفَانٌ۔ قرآن میں ہے:
﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ ﴾ (۳۴۔۱۳) اور لگن جیسے بڑے حوض۔ حدیث میں ہے: [2]
(۶۳) وَاَنْتِ الْجَفْنَةُ الْغَرَّاءُ تم سخی سردار ہو۔ اور لگن کے ساتھ تشبیہ دے کر چھوٹے کنوئیں کو بھی جَفْنَةٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْجَفْنُ: اس کے معنی خاص کر تلوار کی نیام یا آنکھ کے پوٹے کے آتے ہیں۔ ج: اَجْفَانٌ اور انگور کی بیل کو بھی جَفْن کہا جاتا ہے گویا وہ انگور کے لیے بمنزلہ برتن کے ہے۔

ج ف و

اَلْجُفَاءُ: وہ کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتا ہے یا ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر اُدھر گر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ زَبَدَهَا ہنڈیا نے اپنا ابال پھینک دیا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ﴾ (۱۳۔۱۷) سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے۔

---

[1] راجع التاج والمعروف مجعل والفعل اجعل(افعال) والبحث فی الحیوان للجاحظ ۵ : ۳۵۰) .

[2] النهاية افانت الجفنة الغراء وفی الکامل للمبرد: قول رسول الله صلى الله عليه انا الجفنة الغراء وفی النهاية واللسان انه قيل له انت كذا وانت الجفنة الغراء وفی الفائق ۱ : ۲۰۱) من قول عبدالله بن الشخير حين قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا فی التاج وراجع النهاية واللسان (جفن) قال فی حاشية الكامل ولم ارهذا الحديث ۷۷۹ وفی المطبوع وانت الجفنة الغراء ای الطعام مصحف والتسديد من المراجع والجملة من تحية الجاهلية لملوكهم .

اور بے فائدہ اور بے کار چیز کو جَفَاء کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: اَجْفَأَتِ الْاَرْضُ زمین جفا یعنی جھاگ کی طرح ناکارہ اور بے خیر ہوگئی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناقص واوی ہے۔ لہٰذا جَفَتِ الْقِدْرُ وَاَجْفَتْ کہا جائے گا۔ اور اسی سے اَلْجَفَاءُ بمعنی ظلم ہے۔ اور جَفَاهُ (ن) جَفْوَةٌ وَجَفَاءً کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا اور اسی سے محاورہ ہے۔ جَفَا السَّرْجَ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ (گھوڑے کی پشت سے زین کو اٹھا دیا۔)

ج ل ل

اَلْجَلَالَةُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ۃ) کے بغیر اَلْجَلَالِ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لیے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذُوا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (۵۵۔۲۷) صاحب جلال و عظمت۔

اَلْجَلِيْلُ: اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اَلْجَلِيْلُ ❶ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑی بڑی عظیم الشان چیزوں کو پیدا کیا ہے جن سے اس کی ذات بابرکت پر استدلال ہوسکتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْجَلِيل اس لیے ہے کہ وہ احاطہ سے بلند ہے اور یا اس ❷ لیے کہ اس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔

اصل وضع کے اعتبار سے جَلِیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو جسامت کے اعتبار سے بڑی بھی ہو اور غلیظ یعنی موٹی اور سخت بھی پھر معنی غلظت کے اعتبار سے یہ دقیق کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگا ہے اور عظیم کا لفظ صغیر کے مقابلہ میں، چنانچہ کہا جاتا ہے جَلِيل و دقیق وعظیم و صغیر اور باہم مقابلہ کے اعتبار سے اونٹ کو جلیل اور بھیڑ بکری کو حقیر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: ❸ ماله جَلِيْلٍ وَلا دقیق (کہ اس کے پاس نہ اونٹ ہے اور نہ بھیڑ بکری) مَا اَجَلَّنِيْ وَلاَ اَدَقَّنِي (اس نے مجھے نہ اونٹ دیئے اور نہ بھیڑ بکری)...... یہ اس کے اصل معنی ہیں...... پھر یہ لفظ ہر بڑی اور چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے۔

اَلْجَلَالَةُ: خاص کر کلاں جسم اونٹنی کو کہتے ہیں اور اَلْجِلَّة کلاں سال کو۔ اَلْجَلَل ہر بڑی چیز۔ کار بزرگ۔ جَلَلت كذا: میں نے اس کا بڑا حصہ لے لیا۔ تجللت البعير❹ میں نے کلاں جسم اونٹ یا ان کی بڑی مقدار لی۔ اَلْجَلل ❺ (ایضاً)

---

❶ وفی القران: تتجافی جنوبھم عن المضاجع (۳۲۔۱۶).

❷ الزیادۃ " " من التاج قدسقط فی المطبوع.

❸ وفی التاج ماله جلیلة ولادقیقة ولا اجلنی ولااحشانی.

❹ فی المطبوعه تحللت البقر خلاف جمیع الاصل وفی الاصول وفی التاج قال الراغب تجللت البعیراه وعلیه اعتمدنا.

❺ وفی المطبوع الحلل المتناول من البقروفی التاج قال الراغب .... من البعر ونتصحف والاسف ان المفردات للراغب لم یطبع الی الآن طبعاً محققاً مقابلاً.......... بالاصول وانا اکلت جوادی فی تسدیده وساخرومه والحمد لله علی ذلك.

جو بینگنی اٹھائی جائے۔اسی سے کنایۃ ہر حقیر چیز کو جلل کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۹۱) کل مصیبة بعدهٗ جَلَل

کہ ہر مصیبت اس کے بعد حقیر ہے۔

اَلْــجُــلُّ کے معنی مصحف کے غلاف کے ہیں پھر اس سے مصحف کو مَجَلَّۃ کہا جانے لگا ہے۔ [2] اَلْـجُلْجُلَة جس کے معنی حکایت صوت کے ہیں وہ اس مادہ سے نہیں ہے اور اسی سے سَحَابٌ مُجَلْجِلٌ کا محاورہ ہے، جس کے معنی گرجنے والے بادل کے ہیں۔ہاں سَــحَــابٌ مُـجَـلِّـلٌ کا محاورہ اس مادہ سے ہے، جس کے معنی عام بارش برسانے والے بادل کے ہیں۔گویا وہ پانی اور نباتات سے زمین کو چھپا دیتا ہے۔

ج ل ب

اَلْـجَـلْـبُ: (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ [3]

(۹۲) وَقَدْ يَجْلِبُ الشَّيْءَ الْبَعِيْدَ الْجَوَابُ

کبھی جواب دور کی چیز کو کھینچ کرلے آتا ہے۔

اَجْلَبَ (افعال) عَلَيْهِ: کسی پر چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھانا کے ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ ﴾ (۱۷۔۶۴) اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھا کر لاتا رہ۔

اور حدیث [4] (۶۸) لَا جَلَبَ (یعنی جلب جائز نہیں ہے) کے دو معنی بیان کیے جاتے ہیں۔ایک یہ کہ مصدق یعنی زکوٰۃ جمع کرنے والا چراگاہ سے کہیں دور بیٹھ جائے اور وہاں جانوروں کو حاضر کرنے کا حکم دے اور گھڑ دوڑ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوڑ میں اپنے گھوڑے پر چیخنے کے لیے ایک آدمی کو مقرر کرے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے۔

اَلْجُلْبَةُ: پوست جراحی کہ خشک شدہ باشد۔

اَلْجُلْبُ: پتلا سا بادل جو زخم کے پردہ کی طرح ہوتا ہے۔

اَلْجَلَابِيْبُ: اس کا واحد جِلْبَابٌ ہے جس کے معنی چادر یا قمیص کے ہیں۔

ج ل ت

جَــالُوْت: یہ اسم عجمی ہے، عربی میں اس کی اصل نہیں ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ﴾ (۲۔۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے۔

ج ل د

اَلْـجِلْدُ: کے معنی بدن کی کھال کے ہیں اس کی جمع جُلُوْدٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

---

[1] لم اجده ومثله يوجد فی شعرامرء القيس : الاكل شیء سواه جلل وفی المزروقی ٤ : ١٠٢٠) قال زويهر بن الحرث .... فكل الذی لاقيت من بعد جلل وايضاً انشدابن دريد : فعظيم كل مصيبة جلل.

[2] وفی التاج قال الراغب الجل مكان الحلل والمصحف مكان الصحف وعليه اعتمدنا لان الجلل بالفك لم يرد فی الاصول بهذا المعنی .

[3] لم اجده ويرجیٰ.

[4] الحديث فی الفائق ١ : ١٠٤ والنسائی والضياء عن ابن عمرو (حم ق، ن وابن حبان فی زوائده رقم ١١٧٠عن عمران بن حصين والطبرانی عن انس وش عن عطاء ومرسلاً وش عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده راجع كنزالعمال ٦ : ١٣٢٦و١٣٢٨و ١٣٣٧ و ١٣٣٩. فی غريب القران للقبتی ٣٨٩ ولجذار ای السدی والفراء وغيرهما١٢.

﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا ﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے اس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہوکر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہوجاتے ہیں۔

میں جُلُوْد سے مراد ابدان اور قلوب سے مراد نفوس ہیں اور آیت کریمہ:

﴿ حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ...... ﴾ (۴۱۔۲۰،۲۱) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے (یعنی دوسرے اعضا) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ اپنے چمڑوں (یعنی اعضا) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ جُلُوْدٌ سے فروج یعنی شرمگاہیں مراد ہیں۔

جَلَدَهٗ: (ض) کسی کے چمڑے پر مارنا۔ جیسے: بَطَنَهٗ وَظَهَرَهٗ اور اس کے دوسرے معنی دُرّے لگانا بھی آتے ہے، جیسے: عَصَاهُ (یعنی لاٹھی کے ساتھ مارنا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً ﴾ (۲۴۔۴) تو ان کو اَسّی (۸۰) درے مارو۔

اَلْجَلَدُ وَالْجِلْدُ۔ اونٹنی کے بچہ کی بھس بھری ہوئی کھال۔

جَلُدَ (ك) جَلَدًا کے معنی قوی ہونے کے ہیں۔ صیغہ صفت جَلْدٌ وَجَلِيْدٌ ہے اور اس کے اصل معنی اِكْتِسَابُ الْجِلْدِ قُوَّةً یعنی بدن میں قوت حاصل کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے: مَالَهٗ مَعْقُوْلٌ وَلاَ مَجْلُوْدٌ: اس میں نہ عقل ہے نہ قوت۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَرْضٌ جَلْدَةٌ کہا جاتا ہے اس طرح قوی اونٹنی کو نَاقَةٌ جَلْدَةٌ کہتے ہیں۔

جَلَّدْتُ كَذَا میں نے اس کی جلد باندھی۔

فَرَسٌ مُّجَلَّد: مار سے نہ ڈرنے والا گھوڑا یہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ مُجَلَّد اس شخص کو کہتے ہیں جسے مارنے سے درد نہ ہو۔ اَلْجَلِيْدُ: پالا، یخ گویا صلابت میں چمڑے کے متشابہ۔

ج ل س

اَلْجَلْسُ: اس کے اصل معنی سخت زمین کے ہیں۔ اسی لحاظ سے نَجْدٌ یعنی بلند زمین کو جَلْسٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے [1] (۶۳) اَعْطَاهُمُ الْمُعَادِنَ الْقَبَلِيَّةَ غَوْرِيَّهَا وَجَلْسَهَا...... کہ آنحضرت نے

[1] وفي الفائق ۱: ۲۰۴ اعطى بلال بن الحارث معاون القبيلة جلسيها وغوريها والحديث في (دق، كرعن ابن عباس (دق كثير بن عبدالله المزني عن ابيه عن جده (طب ك ، عن بلال بن الحارث راجع كنزالعمال ۳: ۳۹۸۷.

انھیں (ہلال بن حارث) قَبلیة کا نشیبی اور بلند سب کی سب (بطور جاگیر) عطا کردیں۔

اصل میں جَلَسَ کے معنی انسان کے اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھنے کے ہیں۔ پھر محض بیٹھنے کو جُلُوْس اور بیٹھنے کی جگہ کو مَجْلِسٌ کہا جاتا ہے اور مَجْلِسٌ کی جمع مَجَالِسُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (۵۸۔۱۱) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

ج ل و

اَلْجَلْوُ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَجْلَيْتُ الْقَوْمَ عَنْ مَنَازِلِهِمْ فَجَلَوْا عَنْهَا (یعنی) میں نے انھیں جلاوطن کیا تو وہ چلے گئے اور جَلاہُ (متعدی) بھی استعمال ہوتا ہے۔ [1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] ع

(۹۲) فَلَمَّا جَلاهَا بِالْأُيَامِ تَحَيَّرَتْ
ثُبَاتٍ عَلَيْهَا ذُلُّهَا وَاكْتِئَابُهَا

جب انگبین گیرندہ نے شہد کی مکھیوں کو دھواں کے ذریعہ سے دور ہٹایا تو وہ ٹکڑیاں ہو کر غم واندوہ کے ساتھ ایک طرف سکڑ گئیں۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ﴾ (۵۹۔۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلاوطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دے دیتا۔

اسی سے جَلَالِيَ خَبَرٌ (کسی خبر کا ظاہر ہونا) وخَبَرٌ جَلِيٌّ (واضح خبر) وقِيَاسٌ جَلِيٌّ (اور واضح قیاس) کے محاورات ہیں اور صیغہ صفت (فاعل) جَالٍ مسموع نہیں ہے۔

جَلَوْتُ الْعَرُوْسَ جُلْوَةً (وَجِلَاءً) دلہن کو بنا و سنگھار کرکے پیش کرنا۔

جَلَوْتُ السَّيْفَ جِلَاءً تلوار کو صیقل کیا۔ اَلسَّمَاءُ جَلْوَاءُ: آسمان بے ابر اور صاف ہے۔ رَجُلٌ اَجْلٰی وہ شخص جس کے سر کے بال اڑ گئے ہوں۔ اَلتَّجَلِّيْ کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور ہویدا ہونا اور جلوہ بار ہونا اور یہ (تجلی) کبھی بالذات ہوتی ہے، جیسے: ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ (۹۲۔۲) اور دن کی جب نمایاں طور پر روشنی ہوجائے۔

اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے۔ [3] جیسے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ ﴾ (۷۔۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ افروز ہوا۔ کہا جاتا ہے: فُلَانٌ ابْنُ جَلَا ...... یعنی فلاں مشہور و معروف ہے [4]

[1] وفي التاج : واجلى يتعدىٰ ولايتعدى كلاهما ومن الثلاثي المتعدى حديث الحوض فيجلون عنه اى ينفون ويطردون .

[2] قاله ابوذؤيب الهذلي يصف مشتاراً وفي رواية تحيرت بالراء المهملة والبيت في اللسان (جلا، ايم) والاقتضاب ٤٠٣ والبحر ٤٠٣ والبحر ٣ : ٢٩٠ والمعاني ٦١٩ وفي رواية الديوان ايضاً تحيرت قال في التاج ويروى : فلما اجتلاها مكان جلاها.

[3] وقال الزجاج ان ظهر وبان وهذا مذهب اهل السنة والمؤلف مال الى التاويل فزاغ.

[4] قال سحيم بن وثيل الرياحي انا ابن جلا وطلاع الثنايا حتىٰ اضع العمامة تعرفوني وقد تمثل الحجاج بقوله .

اَجْلَوْا عَنْ قَتِیْلٍ: وہ مقتول سے الگ ہوگئے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ج م م

اَلْجَمُّ: کے معنی ہر چیز کی کثرت اور زیادتی کے ہیں یہ جُمَّۃُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے اور جُمَّۃُ الْمَاء اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع ہو جاتا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (۸۹۔۲۰) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اصل میں اَلْجَمَام سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں راحت کے لیے کسی جگہ پر ٹھہر جانا اور محنت و مشقت چھوڑ دینا۔

جُمَامُ الْمَکُّوْكِ دَقِیْقًا: آٹے سے لبالب بھرا ہوا مکوک جس میں مزید گنجائش نہ ہو۔ اور معنی کثرت کے لحاظ سے جُمَّۃٌ کا لفظ لوگوں کی اس بڑی جماعت پر بولا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جمع ہوں۔ نیز جُمَّۃٌ کے معنی ہیں، پیشانی کے مجتمع بال۔

جُمَّۃُ الْبِئْرِ: پانی سے بھرا ہوا کنواں گویا کئی دنوں سے اس میں پانی جمع ہو رہا ہے اور متواتر اور سخت دوڑنے والے گھوڑے کو جَمُوْمُ الشَّدِّ کہا جاتا ہے۔

اَلْجَمَّاءُ الْغَفِیْرُ وَالْجَمُّ الْغَفِیْرُ ہجوم۔ لوگوں کی بڑی جماعت۔ شَاۃٌ جَمَّاءُ: بے سینگ کے بکری یہ جُمَّۃُ النَّاصِیَۃِ سے ہے۔

ج م ح

جَمَحَ (ف) جَمْحًا وَجِمَاحًا وَجُمُوْحًا: گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اور سوار کے قابو میں نہ رہنا یہ نشاط اور مَرَحٌ سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر کسی آدمی کے سرکشی کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهُمْ یَجْمَحُوْنَ ﴾ (۹۔۵۷) رسیاں تڑاتے ہوئے۔ اَلْجُمَّاحُ: بے پھل کا تیر جس سے بچے کھیلتے ہیں اس کے سرے پر غلیلہ سا لگا ہوتا ہے۔

ج م ع

اَلْجَمْعُ: (ف) کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا۔ محاورہ ہے: جَمَعْتُہٗ فَاجْتَمَعَ: میں نے اسے اکٹھا کیا، چنانچہ وہ اکٹھا ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (۷۵۔۹) اور سورج اور چاند جمع کردیے جائیں گے۔ ﴿ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ﴾ (۷۰۔۱۸) اور (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

﴿ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ﴾ (۱۰۴۔۲) مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ ﴿ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۶۔۲۶) ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ ﴿ لَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴾ (۳۔۱۵۷) تو جو (مال و متاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے۔

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ ﴾ (۱۷۔۸۸) کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں۔ ﴿ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا ﴾ (۱۸۔۹۹) تو ہم سب کو جمع کرلیں گے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ ﴾

(۴۔۱۴۰) کچھ شک نہیں کہ اللہ منافقوں ......کو جمع کرنے والا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ (۲۴۔۶۲) اور جب کبھی ایسے کام کے لیے جو جمع ہو کر کرنے کا ہو، پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں۔ میں امر جامع کے معنی اہم معاملہ کے ہیں جس کے لیے لوگ جمع ہوں تو گویا اس معاملے نے ان کو جمع کرلیا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ ﴾ (۱۱۔۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے۔ جیسے فرمایا:

﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ (۴۲۔۷) قیامت کے دن کا۔

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ﴾ (۶۴۔۹) جس دن وہ تم کو اکٹھا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکٹھا کرے گا۔

اور مَجْمُوْعٌ، جَمْعٌ، جَمِيْعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ (۳۔۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

﴿ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ (۳۶۔۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کیے جائیں گے۔

اَلْجُمَّاعُ: مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہوں۔ شاعر نے کہا ہے [1] (سریع)

(۹۳) بِجَمْعٍ غَيْرِ جُمَّاعٍ

ایسا مجمع جو مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل نہ تھا۔اور اَجْمَعْتُ كَذَا عام طور پر اس عزم وارادہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے، جس تک غور وفکر سے پہنچا جائے۔ جیسے فرمایا:

﴿ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ﴾ (۱۰۔۷۱) تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے میں کرنا چاہو) مقرر کرلو۔اور شاعر نے کہا ہے [2] (رجز)

(۹۴) هَلْ اَغْزُوَنْ يَوْمًا وَاَمْرِىْ مُجْمَعٌ

کیا میں کسی روز جنگ کروں گا اور میرا سامان حرب فراہم ہوگا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ﴾ (۲۰۔۶۴) تو تم (جادو کا) سامان اکٹھا کرو۔

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى كَذَا: کسی معاملہ پر امت مسلمہ کا متفق ہوجانا۔نَهْبٌ مُّجْمَعٌ: لوٹ جو نہایت فکر و تدبر سے حاصل کی جائے۔اور آیت کریمہ:

﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ ﴾ (۳۔۱۷۳) کے بعض نے یہ بھی معنی کیے ہیں کہ انھوں نے تمہارے خلاف تدبیر پر اتفاق کرلیا ہے۔اور بعض نے لشکر کثیر جمع کرنا مراد

---

[1] قاله ابو القيس بن اسلم اسلمي يصف الحرب واوله : حتیٰ انتهينا ولناغاية .... وفي الرواية اللسان (عم) من بين جمع بدل بجمع وثم تجلت بدل انتهينا والبيت من كلمة مفضلية ۲ : ۸۵ في ۲۴ بيتاً وراجع للبيت ايضاً المرزوقي ۱۰۸۶ والاقتضاب ۳۵۸ وتهذيب الالفاظ ۳۷ و المحكم (جمع والجمهرة ۲۳۵ وفيه حتى التقينا وفي الفائق ۱ : ۱۱۰) من بين وغير جماع.

[2] قاله الراجز واوله "ياليت شعری والمنیٰ لاتنفع في اللسان "(جمع وفيه اغدؤن بدل اغزون راجع الطبری ۱۶ : ۱۱/۱۸۳ : ۱۴۱) والسيوطی ۲۷۴ وشرح السبع لابن الانباری ۴۵۲ وشواهد الكشاف (۷۰) وفي اصلاح يعقوب ۲۶۳) غير منسوب وامالی المرتضیٰ ۱ : ۵۵۹) والبحر ۵ : ۱۷۹).

لیا ہے۔

جَمِیْعٌ وَاَجْمَعُ وَاَجْمَعُوْنَ: یہ تینوں الفاظ کسی امر پر اجتماع کی توکید کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اَجْمَعُوْنَ کا لفظ ہمیشہ اسم معرفہ کی صفت بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھی حال بن کر منصوب نہیں ہوتا، جیسے فرمایا: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ (۳۸۔۷۳) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ﴿وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ﴾ (۱۲۔۹۳) اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جَمِیْعٌ کا لفظ کبھی منصوب علی الحال ہو کر توکید کا فائدہ دیتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ (۲۔۳۸) تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ ﴿فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا﴾ (۱۱۔۵۵) تم سب مل کر میرے بارے میں (جو) تدبیر (کرنی چاہو) کرلو۔

اور جمعہ کے دن کو یَوْمُ الْجُمُعَةِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۶۲۔۹) جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لیے جلدی کرو۔

اور مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع ہے۔ لہٰذا یہاں جامع مسجد کی صفت نہیں ہے۔ جَمَّعُوْا کے معنی نمازِ جمعہ ادا کرنے یا جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔ اَتَانٌ جَامِعٌ: حاملہ گدھی۔ قِدْرٌ جَامِعٌ: بڑی دیگ۔ اِسْتَجْمَعَ الْفَرَسُ جَرْیًا کے معنی ہیں گھوڑا سرپٹ دوڑا، پوری قوت سے بھاگا۔ اس میں جمع کے معنی ظاہر ہیں۔ مَاتَتِ الْمَرْءَةُ بِجُمْعٍ [1] حمل کی حالت میں مرگئی۔ یہ محاورہ بھی عورت اور اس کے حمل میں اجتماع کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔ هِیَ مِنْهُ بِجُمْعٍ [2] (وہ اپنے خاوند سے) ابھی حالت دوشیزگی میں ہے۔ میں یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے خاوند نے مجامعت کرکے اس کے پردہ بکارت کو زائل نہ کیا ہو۔

ضَرَبَهُ بِجُمْعِ كَفِّهِ اس نے اسے مکا مارا۔

اَعْطَاهُ مِنَ الدَّرَاهِمِ جُمْعَ الْكَفِّ: اسے مٹھی بھر درہم دیئے، اَلْجَوَامِعُ: زنجیر، طوق، کیونکہ اس سے ہاتھ پاؤں باندھے جاتے ہیں۔

(ج م ل)

اَلْجَمَالُ کے معنی حسن کثیر کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔

(۱) خوبی جو خاص طور پر بدن، نفس یا عمل میں پائی جاتی ہے۔

(۲) وہ خوبی جو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اسی معنی میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [3]

---

[1] وفی الحدیث ای امرءة ماتت بجمع اولم تطمث دخلت الجنة راجع النهایة ۱: ۲۰۶) والفائق ۱: ۲۱۱ واللسان (جمع) وغریب ابی عبید ۱: ۱۲۵ والحدیث فی (د) جنائز (ت) جنائز (حم) ۵: ۳۰۵).

[2] وفی اضداد ابی الطیب ۱۷۸: ومنه قول الدهناء بنت مسهل: ۱فی منه جمع.

[3] الفائق ۱: ۱۰۵ والحدیث باختلاف الفاظه البیهقی وابو یعلیٰ عن ابی سعید ومسلم والترمذی من روایة عبدالله ابن مسعود والطبرانی عن ابی امامة: و (ك) عن ابن عمر راجع للتفصیل الفتح الکبیر نبهانی ۱: ۳۳۱ وتخریج الکشاف ص ۴۳ رقم ۳۶۰ و کنز العمال.

(٦٦) اِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے خیرات کثیرہ کا فیضان ہوتا ہے لہٰذا جو اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا۔ وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا۔ اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ﴾ (١٦۔١٦) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو...... تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔

اور جَمِيلٌ وَ جَمَالٌ وَ جُمَّالٌ: مبالغہ کے صیغے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ (١٢۔١٨) اچھا صبر (کہ وہی خوب ہے) ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا﴾ (٧٠۔٥) تو تم (کافروں کی باتوں کو) حسن صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہو۔ جَامَلْتُ فُلَانًا ۔کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا تواضع انکساری سے پیش آنا۔ اَجْمَلْتُ فِي كَذَا: کسی کام کو عمدگی سے سرانجام دینا۔ اعتدال اختیار کرنا جَمَالَكَ: یعنی اعتدال سے کام لو۔ پھر اس سے کثرت کے معنی کا اعتبار کر کے ہر مجموعہ اشیاء کو جملہ کہتے ہیں اسی سے مجموعی حساب کو بھی جس کی تفصیل نہ کی گئی ہو جملہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کلام کی تفصیل بیان نہ کی گئی ہو اسے مُجْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اَجْمَلْتُ الْحِسَابَ وَاَجْمَلْتُ فِي الْكَلَامِ کے معنی حساب یا کلام کو اجمال سے بیان کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (٢٥۔٣٢) اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

اور فقہا نے مجمل کی تعریف میں جو یہ کہا ہے کہ اَلْمُجْمَلُ مَا يَحْتَاجُ اِلَى الْبَيَانِ کہ مجمل وہ ہوتا ہے جو بیان کا محتاج ہو تو یہ مُجْمَلٌ کی تحدید یا تفسیر نہیں ہے، بلکہ صرف اس کی ایک حالت کا ذکر ہے جو بعض لوگوں کو پیش آتی ہے اور شے کی تحدید میں اس کے کسی کو پیش آتی ہے، اور شے کی تحدید میں اس کے کسی ایسے ذاتی وصف کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے، جس سے وہ ممتاز ہوجائے اور مجمل درحقیقت وہ ہے جو بہت سی اشیاء کے ایسے مجموعہ پر مشتمل ہو جن کی تلخیص نہ کی گئی ہو۔

الْجَمَلُ: جوان اونٹ، جو کم از کم پانچ سال کا ہو۔ اس کی جمع جِمَال وَاَجْمَالُ وَجِمَالَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (٧۔٤٠) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت کریمہ ہے: ﴿كَاَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (٧٧۔٣٣) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ میں جِمٰلَتٌ جِمَالَةٌ کی جمع ہے اور جِمَالَةٌ جَمَلٌ کی اور ایک قرأت میں جُمَالَاتٌ بضمہ جیم ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی جوان اونٹنیوں کے ہیں

اَلْجَامِلُ: اونٹوں کا گلہ جن کے ساتھ ان کا چرواہا بھی ہو یہ بَاقِرٌ کی طرح ہے اور اِتَّخَذَ اللَّيْلَ جَمَلًا (کہ اس نے رات کو اونٹ بنالیا) محاورہ مجاز پر محمول ہے جس کے معنی ہیں: اس نے ساری رات سفر کیا۔ جیسا کہ رَكِبَ اللَّيْلَ کا محاورہ ہے اور اونٹ کو جَمَلٌ کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عرب لوگ اونٹ کو اپنے لیے باعث زینت اور فخر سمجھتے تھے جیسا کہ آیت: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ﴾

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ جَمَلْتُ الشَّحْمَ: چربی پگھلانا اور پگھلائی ہوئی چربی کو اَلْجَمِیْلُ کہا جاتا ہے اور اِجْتِمَالٌ کے معنی چربی کو بطور تیل ملنے کے ہیں، ایک عورت نے اپنی لڑکی سے کہا:

تَجَمَّلِیْ وَتَعَفَّفِیْ: یعنی چربی پگھلا کر کھایا کرو۔ اور عفافہ یعنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ پیا کرو۔

(ج ن ن)

اَلْجَنَّ۔(ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں، چنانچہ محاورہ ہے: جَنَّهُ اللَّيْلُ وَاَجَنَّهُ اسے رات نے چھپالیا۔ جُنَّ عَلَيْهِ: اسے جنون ہوگیا۔ پس جَنَّهُ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں، اور اَجَنَّهُ کے معنی چھپانے کے لئے کوئی چیز دینے کے ہیں، جیسے: قَبَرْتُهُ وَاَقْبَرْتُهُ وَسَقَيْتُهُ وَاَسْقَيْتُهُ جَنَّ عَلَيْهِ كَذَا۔ کسی چیز نے اسے چھپالیا۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رٰاٰى كَوْكَبًا﴾ (۶-۷۷) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) چھپا دیا تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔

اَلْجَنَانُ: دل کیونکہ وہ حواس سے مستور ہوتا ہے۔

اَلْمِجَنُّ وَالْمِجَنَّةُ: ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو بچاتا اور چھپاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ (۶۳-۲) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔

اور حدیث میں ہے ❶ (۶۵) اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ: کہ روزہ ڈھال ہے۔

اَلْجَنَّةُ: ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کیوجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ﴾ (۳۴-۱۵) (اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بود وباش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور (ایک) بائیں طرف۔

﴿وَلَوْلَاۤ اِذْدَخَلْتَ جَنَّتَكَ﴾ (۱۸-۳۹) اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو.......... کیوں نہ۔

بعض نے کہا ہے کہ ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❷ (بسیط)

(۹۵) مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِیْ جَنَّةً سَحِقًا

اور نخلستان کو سیراب کرنے والی سدھائی ہوئی اونٹنی پر رکھے ہوتے ہیں۔

اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں بون بعید ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ (۳۲-۱۷) کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے

---

❶ ای یقی صاحبه من الشهوات انظر للحدیث النهایة ۱: ۲۱۴ واللسان (جنن) وزوائد ابن حبان ـعن کعب بن عجرة انظر رقم ۲۵۵۳ و ۲۶۱ و ۱۵۶۹.

❷ قاله زهیر بن ابی سلمٰی واوله ـكان عینی فی غربی مقتله والبیت فی دیوانه مع شرح الاعلام الشنتمری ۱۱۷ طبعة لیدن ۱۳۰۶ والعقد الثمین ۸۴ واللسان (قتل) شواهدالكشاف ۸۲ ومختار الشعر الجاهلی ۱: ۱۷۱ والبحر ۳۴/۷/۳۱۳۰۵.

کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جَنَّاتٍ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔ [1]

(۱) جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ

(۲) جَنَّةُ عَدْنٍ

(۳) جَنَّةُ النَّعِيْمِ

(٤) دَارُ الْخُلْدِ

(٥) جَنَّةُ الْمَاوٰى

(٦) دَارُ السَّلَامِ

(۷) عِلِّيِّيْنَ

اَلْـجَـنِيْـنُ: بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہے اسے جَنِيْنٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ قران میں ہے۔ ﴿وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۵۳۔۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

اور یہ یعنی جـنـیـن فعیل بمعنی مفعول سے ہے یعنی چھپا ہوا۔ اَلْجَنِيْنُ: قبر کو بھی کہتے ہیں۔ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ یعنی چھپانے والی۔

اَلْـجِـنُّ: جن (اس کی جمع جِـنَّةٌ آتی ہے اور) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو جن کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام فرشتے جن ہیں لیکن تمام جن فرشتے نہیں ہیں، اسی بنا پر ابو صالح نے کہا ہے کہ سب فرشتے جن ہیں۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ نہیں۔ بلکہ جِــنٌّ روحانیوں کی ایک قسم ہیں کیونکہ روحانیات تین قسم ہیں۔

(۱) اَخْيَار (نیک) اور یہ فرشتے ہیں۔

(۲) اَشْرَار (بد) اور یہ شیاطین ہیں۔

(۳) اَوْسَاط جن میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اور یہ جن ہیں۔ چنانچہ سورت جن کی ابتدائی آیات: ﴿قُلْ اُوْحِىَ اِلَىَّ .... وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ﴾ (۷۲۔۱،۱۴) اور یہ کہ ہم بعض فرمانبردار ہیں اور بعض (نافرمان) گنہگار ہیں۔ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اَلْجِنَّةُ: جنوں کی جماعت قرآن میں ہے: ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۶) (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔ ﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ (۳۷۔۱۵۸) اور انہوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔

اَلْـجِـنَّةُ: (ایضا) جنون۔ دیوانگی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ﴾ (۷۔۱۸۴) کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو (کسی طرح کا بھی) جنون نہیں ہے۔

اور دیوانگی کو جنون اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ جُـنَّ فُلَانٌ۔ اسے جن لگ گیا۔

امراض کے معانی میں دوسرے افعال کی طرح یہ بھی فعل

---

[1] وفی الفتح ٤ : ۲۸ : ملح المولف (البخاری) ھھنا باسماء الجنة وھما عشرة وتزید سبعة المذكورة (۸) دارالمقامة و(۹) المقام الامین و(۱۰) مقعد صدق و(۱۱) الحسنىٰ وكلها فی القران وزادبعضهم دارالحیوان اخذًا من الایة وفیه نظر۔

مجہول ہی استعمال ہوتا ہے۔جیسے زُکِمَ (اسے زکام ہوگیا) لُقِیَ (اسے لقوہ ہوگیا) حُمَّ (اسے بخار ہوگیا) وغیرہ بعض نے کہا ہے کہ جُنَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں: اس کے قلب کو عارضہ ہوگیا۔اور بعض نے کہا کہ دیوانگی نے اس کی عقل کو چھپالیا اور آیت کریمہ:﴿مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴾ (۴۴۔۱۴) کے معنی ہیں کہ اسے وہ جن چمٹا ہوا ہے جو اسے تعلیم دیتا ہے اور یہی معنی آیت:﴿اَئِنَّا لَتَارِکُوْا اٰلِھَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ﴾ (۳۶:۳۷) کہ بھلا ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔میں شاعر مجنون کے ہیں۔

جُنَّ التِّلَاعُ وَالْاٰفَاقُ: یعنی ٹیلوں اور ان کے گردونواح کو گھاس نے چھپالیا، اور آیت کریمہ ہے:﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (۱۵۔۲۷) اور جان کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

میں جَآنَّ سے بھی جنوں کی ایک قسم مراد ہے۔[1] لیکن آیت کریمہ:﴿کَاَنَّھَا جَآنٌّ﴾ (۲۷۔۱۰) میں جان سے ایک قسم کا سانپ مراد ہے۔

(ج ن ب)

اَلْجَنْبُ: اصل میں اس کے معنی پہلو کے ہیں، اس کی جمع جُنُوْبٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔﴿قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾ (۳۔۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے۔

﴿فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ﴾ (۹۔۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو...... داغے جائیں گے۔

﴿تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (۳۲۔۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ پہلو کی سمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسا کہ یمین، وشمال اور دیگر اعضا میں عرب لوگ استعارات سے کام لیتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے [2] ع (الکامل)

(۹۶) مِنْ عَنْ یَّمِیْنِیْ مَرَّۃً وَّاَمَامِیْ

کبھی دائیں جانب سے اور کبھی سامنے سے اسی سے جَنْبُ الْحَائِطِ وَجَانِبُہٗ کا محاورہ ہے۔یعنی دیوار کی جانب۔

اور﴿اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ (۴۔۳۶) کے معنی قریبی دوست کے ہیں، اور آیت کریمہ:﴿یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ﴾ (۳۹۔۵۶) کہ (ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

میں جَنْبِ اللّٰہِ سے خدا تعالیٰ کے اوامر اور حدود مراد ہیں جو اس نے ہمارے لئے مقرر فرمادیئے ہیں۔

سَارَ جَنِیْبَہٗ وَجَنِیْبَتَہٗ وَجَنَابَیْہِ وَجَنَابَتَیْہِ اس کے پہلو پر چلا وَجَنَبْتُہٗ میں اس کے پہلو پر مارا جیسے کَبَدْتُہٗ

---

[1] الجان ابو الجن عن ابن عباس وابلیسی عن قتادة وعندبعض ابو الشیطان ابلیس راجع عثمان ٤ : ٥٣.

[2] البیت لقطری بن فجاة المانی احد زعماء الخوارج فی زمان مصعب بن الزبیر٦٦ھ وسنة ٧٦ واسمه جعرز بن مازن وصدره : فلقارانی للاماح وریثة ...... والبیت فی الحماسة مع المزروقی رقم ٢٠ والشجری ٢ : ٢٥٤و ٢٢٩) والقالی (٢ : ١٨٦) والخزانه ٤ : ٢٥٨ وابن عقیل ١ : ٢٣٤ وابن هشام رقم ٢٦٥ واستشهد به النحاة علی ان لفظه "عن قد تکون اسماً بمعنیٰ جانب قال ابن هشام وذالك یتعین فی ثلا ثة مواضع احدها ان یدخل علیها من وهو کثیر کقول الشاعر.

میں نے اس کے کلیجے پر مارا اَفَأدْتُّهُ: میں نے اس کے فؤاد یعنی دل پر مارا۔ جُنِبَ الرَّجُلُ...... پہلو کے درد میں مبتلا ہونا جیسے کُبِدَ وَفُئِدَ اور جَنْبٌ سے فعل دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک، کسی کی سمت مخالف کو جانا یا اس سے دور ہونا۔ دوم سمت موافق کو آنا یا اس کے قریب ہونا۔ اول معنی کی مثال جیسے جَنَبْتُهٗ وَاَجْنَبْتُهٗ میں نے اسے جانب مخالف یعنی دور کر دیا۔ اسی سے۔ ﴿اَلْجَارِ الْجُنُبِ﴾ (۴۔۳۶) ہے جس کے معنی اجنبی یعنی دور کے ہمسایہ کے ہیں، شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۹۷) فَلاَ تَحْرِمَنِّی نَائِلاً عَنْ جَنَابَةٍ

تو مجھ جیسے غریب الوطن کو دوری سے عطا سے محروم نہ کر

رَجُلٌ جَنِبٌ وَجَانِبٌ اجنبی آدمی۔

اَلْاِجْتِنَابُ: (افتعال) بچنا، یکسو رہنا، پہلو تہی کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (۴۔۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔ اجتناب رکھو گے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ﴾ (۵۳۔۳۲) جو...... بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

﴿وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (۲۲۔۳۰) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، اور آیت کریمہ: ﴿وَاجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (۳۹۔۱۷) میں بتوں سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے طاغوت کی عبادت یکسر ترک کر دی اس طرح وہ طاغوت سے دور رہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۔۹۰) سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ اور یہ یعنی اِجْتَنِبُوا بنسبت اُتْرُكُوا کے زیادہ بلیغ ہے۔

جَنَّبَ بَنُوا فُلَانَ بے شیر شدن قوم۔

جَنَبَ فُلَانٌ خَيْراً۔ فلاں خیر سے محروم ہو گیا۔

جَنَبَ شَرّاً۔ وہ شر سے دور رہا۔ چنانچہ قرآن پاک میں نار جہنم کے متعلق ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِیْ يُؤْتِیْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى﴾ (۹۲۔۱۷،۱۸) اور جو بڑا پرہیز گار ہے وہ اس (نار) سے بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے، تاکہ پاک ہو، لیکن اگر مطلق یعنی بغیر کسی متعلق کے جَنَبٌ فُلَانٌ کہا جائے تو اس کے معنی خیر سے محروم ہونا ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعائے خیر کے لئے بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (۱۴۔۳۵) اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں، بچائے رکھ۔

میں اُجْنُبْنِیْ، جَنَبْتُهٗ عَنْ كَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز سے دور رکھنے اور بچانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَنَبْتُ الْفَرَسَ کے محاورہ سے ماخوذ

---

[1] قاله علقمة بن عبدة التميمي المعروف بعلقمة الفحل صاحب امرء القيس يخاطب به الحارث بن جبلة يمدحه وكان قد اسراخاه شاسا في تسعين رجلا من بني تميم وتمامه .... فاني امرء وسط انقباب غريب والبيت في ديوانه من الستة ۱۰۷ والمفضليات ۲: ۱۹٤) والكامل ۷۲۳ والزجاج ۱: ۷۱ مخطوطة) والشنتمرى ۲: ٤۲۳) والقرطبی ٥: ۱۸۳/ ۱۳: ۲٥۷) واللسان والتاج (جنب) ابو عبيدة ۲: ۹۸/ ۱: ۱۲٦) وشواهد الشافيه ٤۹٤ ومختار الشعر الجاهلی ۱: ۳۲۳) والبحر ۳: ۲۳۰) وامالی الثجريه ۱: ۱٤) والعمدة ۱: ٥۷) والعقد الثمين ۱۰۷۔ وايام العرب ٥۸.

ہے جس کے معنی کوتل ہانکنا کے ہیں ۔ اور گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اپنے لطف وکرم اور اسباب مخفیہ کے ذریعہ سے شرک کی جانب سے کھینچ لائے اور اسی طرح اس سے دور رکھے۔

اَلْجَنَبُ: (ایضاً) پیدائشی طور پر پاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہونا اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (۵۔۶) کے معنی یہ ہیں کہ جب تم حالت جنابت میں ہوا کرو تو غسل کرلو۔ ❶ اور شرعاً جَنَابة کا لگنا یا تو انزال یعنی خروج منی سے ثابت ہوتا ہے، اور یا دوختنوں کے التقاء یعنی مرد کے عضو تناسل کے عورت کی شرم گاہ میں داخل ہونے ❷ سے اور جنبی ہونے کے معنی میں جَنَبَ (ك، ن، س) وَتَجَنَّبَ وَاجْتَنَبَ تینوں باب استعمال ہوتے ہیں، اور جَنَابَة کو جنابت اس لئے کہا گیا ہے، کہ یہ شرعاً نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہے۔

اَلْجَنُوبُ: (جنوبی ہوا) اس میں کعبہ کی جانب سے آنے اور اس کی جانب جانے دونوں معنی کا اعتبار ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، جَنُوبٌ سے جَنَبَتِ الرِّيحُ کا محاورہ لیا گیا ہے، جس کے معنی جنوبی ہوا چلنے کے ہیں۔

اَجْنَبْنَا: ہم جنوب میں داخل ہوئے۔ جُنِبْنَا ہمیں جنوبی ہوا لگی۔ سَحابَةٌ مَجْنُوبَةٌ وہ بادل جسے جنوبی ہوا چلا کر لائی ہو۔

(ج ن ح)

اَلْجَناح: پرند کا بازو۔ اسی سے جَنَحَ الطَّائِرَ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی اس کا بازو توڑ دینا کے ہیں، قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا طَائِرٍ يَّطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶۔۳۸) یا دو پرندوں سے اڑنے والا جانور ہے۔

پھر کسی چیز کے دونوں جانب کو بھی جَنَاحَيْنِ کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً جَنَاحَا السَّفِينَةِ (سفینہ کے دونوں جانب) جَنَاحَا الْعَسْكَرِ (لشکر کے دونوں جانب) اسی طرح جَنَاحَا الْوَادي وادی کے دونوں جانب اور انسان کے دونوں پہلوؤں کو جَنَاحَا الْاِنْسَان کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ (۲۰۔۲۲) اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگالو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸۔۳۲) اور خوف دور ہونے (کی وجہ) سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑلو۔ میں جَنَاحَ بمعنیٰ يَدٌ کے ہے۔ کیونکہ پرند کا بازو اس کے لیے بمنزلہ ہاتھ کے ہوتا ہے، اسی لئے جَنَاحَا الطَّيْرِ کو يَدَا الطَّيْرِ بھی کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (۱۷۔۲۴) اور عجز و نیاز سے انکے آگے جھکے رہو۔ میں ذُلٌّ کے لئے جَنَاحٌ بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ذُلٌّ یعنی ذلت وانکساری دو قسم پر ہے، ایک ذلت وہ ہے جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے اور دوسری وہ ہے جو انسان کے مرتبہ کو بلند کردیتی ہے، اور یہاں چونکہ ذلت کی دوسری قسم مراد ہے، جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرانے کی بجائے بلند کردیتی ہے، اس لئے

❶ وايضاً جنب بمعنى بعيد كمافى قوله تعالىٰ فبصرت به عن جنب ۲۸۔۱۱ اى عن بعد۱۲۔

❷ وفى الحديث عن عائشة: اذا مس الختان فقد وجب الغسل وفى رواية جاوزو هذا يوضح المراد راجع العون (۱:۱۲).

جناح کا لفظ بطور استعارہ (یعنی معنیٰ رفعت کی طرف اشارہ کے لئے) استعمال کیا گیا ہے، گویا کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ رحمت الٰہی حاصل کرنے کے لئے اس کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے رہو، اور یا یہ معنی ہیں کہ ان پر رحمت کرنے کے لئے ذلت کا اظہار کرو۔

جَنَحَتِ الْعِیْرُ فِی سَیْرِھَا: قافلہ تیزی سے چلا۔گویا وہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑ رہا ہے۔جَنَحَ اللَّیْلُ: رات کی تاریکی چھاگئی، اَلْجُنْحُ: رات کا سیاہ حصہ۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (۸۔۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔

میں جَنَحُوْا کے معنی مائل ہونے کے ہیں یہ جَنَحَتِ السَّفِیْنَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشتی کے ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں۔اسی لئے ہر وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کردے اسے جُنَاحٌ کہا جاتا ہے، پھر عام گناہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، قرآن پاک میں متعدد مواضع پر لاَ جُنَاحَ عَلَیْكُمْ آیا ہے۔

جَوَانِحُ الصُّدُوْرُ (دو پسلیاں جن کے سرے سینے کے وسط میں باہم متصل ہوتے ہیں۔اس کا واحد جَانِحَةٌ ہے اور اِن پسلیوں کو جوانح اسی لئے کہا جاتا ہے، کہ ان میں میلان یعنی خم ہوتا ہے۔

(ج ن د)

اَلْجُنْدُ کے اصل معنی سنگستان کے ہیں بمعنی غلظت اور شدت کے اعتبار سے لشکر کو جُنْدٌ کہا جانے لگا ہے۔ اور مجازاً ہر گروہ اور جماعت پر جُنْدٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔جیسے (حدیث میں ہے [1]) اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ: کہ ارواح کے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

﴿اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ﴾ (۴۴۔۲۴) (تمہارے بعد) ان کا تمام لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

اور جُند کی جمع اَجْنَادٌ وَجُنُوْدٌ آتی ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَ جُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ﴾ (۲۶۔۹۵) اور شیطان کے لشکر سب کے سب داخل جہنم ہوں گے۔

﴿وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوْ﴾ (۷۴۔۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اور آیت کریمہ: ﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ (۳۳۔۹) خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔میں پہلے جُنُوْد سے مراد کفار کی فوجیں ہیں اور

---

[1] وتمامه: فماتعارف منهما ائتلف وماتناكرمنهما اختلف محاضرات للمؤلف ۳: ۵۳) والحديث اخرجه مسلم من حديث ابی هريرة والبخاری تعليقاً من حديث عائشة والطبرانی من حديث ابن مسعود وبمعناه اخرجه الطبرانی فی الاوسط من حديث علی وفيه قصة امرء تين المكية والمدينه اخرجه الحسن بن سفيان فی مسنده بسند حسن والديلمی والحزائطی فی ائتلاف القلوب عن علی ومسدد عن عمرو بمعناه السلفی فی انتخاب حديث الفراء راجع تخريج الاحياء للعراقی ۲: ۱۶۱۔۱۶۲ وادب الدنيا والدين للماوردی ۲۹۱ بشرح خان زاده وكنزالعمال ۹رقم ۱۰۳،۳۳، ۱۰۴ و۹۲۱ ۔۹۲۳.

دوسرے سے فرشتوں کے لشکر مراد ہیں، جو انہیں نظر نہیں آتے تھے۔

(ج ن ف)

اَلْجَنَفُ: اس کے اصل معنی فیصلہ میں ایک طرف مائل ہونے (یعنی جانبداری یا ظلم کرنے) کے ہیں ۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفاً﴾ (۲۔۱۸۲) اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری کا اندیشہ ہو۔ میں صریح طور ر جانب داری مراد ہے، اسی طرح فرمایا: ﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ﴾ (۵۔۳) (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

(ج ن ی)

جَنَيْتُ (ض) جَنْياً ۔ اَلثَّمْرَةَ وَاجْتَنَيْتُهَا میں نے درخت سے پھل توڑا۔

اَلْجَنِيُّ وَالْجَنىٰ چنے ہوئے پھل، چھتہ سے نکالا ہوا شہد لیکن عام طور پر جَنِيٌّ تازہ پھل کو کہتے ہیں جو حال ہی میں توڑا گیا ہو، قرآن پاک میں ہے: ﴿تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيّاً﴾ (۱۹۔۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

﴿وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾ (۵۵۔۵۴) اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔

اَجْنَى الشَّجَرُ درخت کے پھل پک گئے توڑنے کے قابل ہو گئے۔ اَجْنَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین زیادہ پھلوں والی ہو گئی ۔ اسی سے یعنی پھل توڑنے کے معنی سے بطور استعارہ جَنىٰ فُلَانٌ جِنَايَةً گناہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اِجْتَرَمَ کا محاورہ بطور استعارہ اس معنی میں آتا ہے۔

(ج ھ د)

اَلْجَهْدُ وَالْجُهْد کے معنی وسعت و طاقت اور تکلیف ومشقت کے ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ اَلْجَهْد بفتح جیم کے معنی مشقت کے ہیں اور اَلْجُهْد (بضم جیم) طاقت اور وسعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ الجھد کا لفظ صرف انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ لاَ يَجِدُونَ اِلاَّ جُهْدَهُمْ﴾ (۹۔۷۹) اور جنہیں اپنی محنت ومشقت (کی کمائی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَاَيْمَانِهِمْ﴾ (۱۶۔۳۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑی زور زور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ اس میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے۔

اَلْاِجْتِهَادُ: (افتعال) کے معنی کسی کام پر پوری طاقت صرف کرنے اور اس میں انتہائی مشقت اٹھانے پر طبیعت کو مجبور کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: جَهَدْتُ رَاْيِىْ وَاَجْهَدْتُهٗ میں نے غور وفکر سے اپنی رائے کو مشقت اور تعب میں ڈالا۔

اَلْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ: دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت اور وسعت خرچ کرنا۔ اور جہاد تین قسم پر ہے (۱) ظاہری دشمن یعنی کفار سے جہاد کرنا۔ (۲) شیطان اور (۳) نفس سے مجاہدہ کرنا۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ (۲۲۔۷۸) کہ اللہ کی راہ میں پوری طرح جہاد کرو............ تینوں قسم

کے جہاد پر مشتمل ہے۔نیز فرمایا:﴿وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۴۱) کہ خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔ ﴿اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۲۰) جولوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرتے رہے۔اور حدیث میں ہے۔❶ (۶۶)

جَاهِدُوْا اَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَآءَ كُمْ کہ جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کیا کرو۔

اور مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❷ (۶۷) جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ کہ کفار سے ہاتھ اور زبان دونوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

(ج ھ ر)

اَلْجَهْرُ: (ف) اس کے اصل کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رَأَيْتُهُ جِهَارًا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۲۔۵۵) کہ جب تک ہم خدا کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۴۔۱۵۳) ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھا دو۔

اور اسی معنی سے جَهَرَ الْبِئْرَ وَاجْتَهَرَهَا ہے، جس کے معنی ہیں اس نے کنواں (کو صاف کر کے) اس کا پانی ظاہر کر دیا۔محاورہ ہے مَا فِي الْقَوْمِ اَحَدٌ يَجْهَرُهٗ عَيْنِيْ۔ قوم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو میری نظر میں بڑا معلوم ہوتا ہو۔

اَلْجَوْهَرُ: یہ بھی اسی مادہ سے فَوْعَلٌ کے وزن پر ہے اور جوہر اسے کہتے ہیں جس کے بطلان سے اس کے جملہ محمولات کا بطلان لازم آتا ہو،اور اسے جوہر اس لئے کہا جاتا ہے۔کہ وہ حاسۂ بصر یعنی نظر کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

اور حاسہ کے سامنے ظاہر ہونے کے متعلق فرمایا:﴿سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ﴾ (۱۳۔۱۰) کہ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا باآواز بلند پکار کر (اس کے نزدیک) دونوں برابر ہیں،﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) تم پکار کر بات کہو وہ تو چھپے ہوئے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ﴾ (۶۷۔۱۳) اور تم پوشیدہ بات کرو یا ظاہر۔

﴿وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ (۴۹۔۲) اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بات کرتے ہو (اسی طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔

---

❶ حوالہ نہیں ہے۔

❷ الحدیث باختلاف لفظه فی الدارمی عن أنس وایضاً ابن حبان والنسائی وصححه ورجال اسناده رجال الصحیح ۱۲.

كَلَامٌ جَهُوْرِيٌّ: بلند گفتگو اور بلند آواز شخص کو جَهِيْرٌ کہا جاتا ہے، نیز جَهِيْرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے حسن وجمال سے نظر کو خیرہ کردے۔

(ج ھ ز)

اَلْجَهَازُ: سازوسامان جو تیار کر کے رکھا جائے۔قرآن پاک میں ہے، ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ﴾ (۱۲۔۵۹) جب ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا۔

اَلتَّجْهِيْزُ: (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لادنا یا بھیجنا ضَرَبَ الْبَعِيْرُ بِجَهَازِهٖ: ❶ اونٹ نے اپنا سامان (پالان اور بوجھ) نیچے پھینک دیا اور بدک کر بھاگ گیا۔

جَهِيْزَةٌ: ایک احمق عورت ❷ نیز مادہ گرگ جو دوسرے کے بچے کو دودھ پلاتی ہو، اسے بھی جَهِيْزَةٌ کہا جاتا ہے۔ ❸

(ج ھ ل)

اَلْجَهْلُ: (جہالت، نادانی) جہالت تین قسم پر ہے۔

(۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔

(۲) کسی چیز کے خلاف واقع یقین واعتماد قائم کر لینا۔

(۳) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیے اس کے خلاف سرانجام دینا اس سے کہ اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ دانستہ نماز ترک کردے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت: ﴿أَتَتَّخِذُنَا هُزُواً قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۲۔۶۷) میں هُزُواً کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔﴿فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْماً بِجَهَالَةٍ﴾ (۴۹۔۶) تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔

اور جاھل کا لفظ عموماً بطور مذمت بولا جاتا ہے۔مگر کبھی بطور مذمت نہیں بھی آتا۔چنانچہ آیت: ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۔۲۷۳) کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔

میں الجاھل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی حالت سے ناواقف ہیں لہٰذا یہاں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں ہے۔ ❹

اَلْمَجْهَلُ: (سبب جہالت) ہر وہ معاملہ یا عادت یا زمین جو کسی چیز کے متعلق واقع کے خلاف اعتقاد قائم کر لینے کا سبب بنے اسے مَجْهَلٌ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَجْهَلَتِ الرِّيْحُ الْغُصْنَ۔ ہوا نے شاخ کو اس طرح زور سے ہلایا گویا وہ اسے جہالت پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ کس قدر عمدہ استعارہ ہے۔

---

❶ مثل يضرب عنداظهار النفورعن شيء راجع الميداني رقم ۲۲۰ وفيه جهازه وفي من صلة المعنىٰ اى صارعا ثراً في جهازه .

❷ وفي المثل قطعت جهيرة قول كل خطيب انُظر المثل والقصة الميداني رقم ۳۸۳۰.

❸ وفي الحيوان ۲ : ۷۹ يقال واحمق من جهيزه لانها تترك ولدها وترضع ولد الضبع راجع للمثل المعاني للقتبي ۲۱۲ واللسان (جهيز) وجهيزة الامثال ۱ : ۳۶٤.

❹ وايضاً الاية : الجاهلية الاولى (۳۳۔۳۳) فيقال على العادات التي كانت فيهم قبل الاسلام وفي الاية ۲۵۔۶۳) جاء لفظة الجاهلون في مقابلة عبادالرحمن ۱۲.

(ج ھ ن م)

جَهَنَّمَ: دوزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں فارسی لفظ جہنام سے معرب ہے۔ واللہ اعلم۔

(ج و و)

اَلْجَوُّ: کے معنیٰ فضا کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ﴾ (۱۶۔۷۹) کہ فضا میں .... ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے اور یمامہ کو جو بھی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(ج و ب)

اَلْجَوْبُ: (ض) اس کے اصل معنیٰ جَوْبَۃ قطع کرنے کے ہیں اور یہ پست زمین کی طرح (زمین میں گڑھا سا) ہوتا ہے۔ پھر ہر طرح زمین کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹۔۹) اور ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قُریٰ) میں پتھر تراشتے (اور مکانات بناتے تھے۔

(اَلْجَائِبَۃُ: پھیلنے والی) محارہ ہے: ھَلْ عِنْدَکَ مِنْ جَائِبَۃِ خَبَرٍ؟ کیا تمہارے پاس کوئی نشر ہونے والی خبر ہے۔

جَوَابُ الْکَلَامِ۔ اور کسی کلام کے جواب کو بھی جواب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قائل کے منہ سے نکل کر فضا کو قطع کرتا ہوا سامع کے کان تک پہنچتا ہے مگر عرف میں ابتداءً کلام کرنے کو جواب نہیں کہتے ہیں بلکہ کلام کے لوٹانے پر جواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قران میں ہے: ﴿فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا﴾ (۲۷۔۵۶) تو ان کی قوم کے لوگ (بولے تو) یہ بولے اور اس کے سوا ان کا جواب نہ تھا۔

پھر جواب کا لفظ سوال کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سوال دو قسم پر ہے۔

(۱) گفتگو کا طلب کرنا۔ اس کا جواب گفتگو ہی ہوتی ہے۔

(۲) طلب عطا یعنی خیرات طلب کرنا اس کا جواب یہ ہے کہ اسے خیرات دے دی جائے چنانچہ اسی معنیٰ کے اعتبار سے فرمایا: ﴿اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ﴾ (۴۶۔۳۱) خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو۔ ﴿وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰہِ﴾ (۲۶۔۳۲) اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے۔

اور دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے فرمایا: ﴿قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا﴾ (۱۰۔۸۹) کہ تمہاری دعا قبول کرلی گئی تو تم ثابت قدم رہنا اَلْاِسْتَجَابَۃُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنیٰ اِجَابَۃٌ (افعال) کے ہے اصل میں اس کے معنیٰ جواب کے لئے تحری کرنے اور اس کے لئے تیار ہونے کے ہیں لیکن اسے اِجَابَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِسْتَجِیْبُوا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ﴾ (۸۔۲۴) کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو۔

﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (۴۰۔۶۰) کہ تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ ﴿فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ﴾ (۳۔۱۹۵) تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کرلی۔ ﴿وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (۴۲۔۲۶) اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی دعا قبول فرماتا۔ ﴿وَالَّذِیْنَ

اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ (۸۲۔۳۸) اور جو اپنے رب کا فرمان قبول کرتے ہیں۔﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ (۲۔۱۸۶) اور اے پیغمبر! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں۔﴿اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳۔۱۷۲) جنھوں نے باوجود زخم کھانے کے خدا اور رسول کے حکم کو قبول کیا۔

(ج و د)

اَلْجُوْدِيُّ: اس پہاڑی کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان واقع ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ﴾ (۱۱۔۴۴) اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری۔ یہ دراصل اَلْجَوْد کی طرف منسوب ہے اور اَلْجُوْدُ کے معنی مقتنیات (ذخائر) کو صرف اور خرچ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ ذخیرہ علم ہو یا ذخیرہ مال کا ہو۔

رَجُلٌ جَوَادٌ: سخی آدمی۔فَرَسٌ جَوَادٌ (تیز رفتار عمدہ گھوڑا) جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت صرف کردے اس کی جمع اَلْجِيَادُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ﴾ (۳۸۔۳۱) (جب ان کے سامنے) شام کو خاصے کے گھوڑے (پیش کئے گئے۔)

جَوْدٌ: زیادہ بارش۔اور گھوڑے میں جو تیز رفتاری کی صفت ہوتی ہے اسے جُوْدَةٌ کہتے ہیں اور سخاوت مال کو جُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

جَادَ(ن) الشَّيْءُ جَوْدَةً: کسی چیز کا عمدہ اور جید ہونا اس سے صیغہ صفت جَيِّدٌ آتا ہے اشیاء میں جو عمدگی (جودة) پائی جاتی ہے۔اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) کہ اس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

(ج و ر)

اَلْجَارُ: (پڑوسی۔ہمسایہ) ہر وہ شخص جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قرب میں ہو وہ اس کا جَارٌ کہلاتا ہے۔یہ "اسماء متضایفه" یعنی ان الفاظ سے ہے جو ایک دوسرے کے تقابل سے اپنے معنی دیتے ہیں جیسا کہ اَخٌ اور صَدِيْقٌ کے الفاظ ہیں (کہ اخوت اور صداقت دونوں جانب سے ہوتی ہے) کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہوسکتا ہے کہ جب دوسرا بھی اس کا پڑوسی ہو۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو یا وہ کسی دوسرے کے حق کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا "جَارٌ" کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے۔﴿اَلْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ (۴۔۳۶) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایوں۔

اِسْتَجَرْتُهٗ فَأَجَارَنِيْ: میں نے اس سے پناہ طلب کی چنانچہ اس نے مجھے پناہ دے دی[1] چنانچہ آیت کریمہ

[1] وفی التنزیل وان احد من المشرکین استجارك فاجره (۹: ۶) قل لن یجیرنی من اللہ احد (۷۲۔۲۲) فمن یجیر الکافرین ۶۷۔۲۸)

ہے:﴿وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ﴾ (۸۔۴۸) اور میں تمہارا حامی اور مددگار رہوں۔ میں جَارٌ اسی معنی پر محمول ہے نیز فرمایا:﴿وَھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ﴾ (۲۳۔۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے بالمقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور جَارٌ میں معنیٰ قرب کے تصور کی بنا پر جَارَهٗ وَجَاوَرَهٗ وَتَجَاوَرَ (افعال) استعمال ہونے لگے ہیں، یعنی کسی کے قرب وجوار میں رہنا قرآن پاک میں ہے:﴿لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَآ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۶۰) وہ اس (شہر) میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکیں گے۔﴿وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ﴾ (۱۳۔۴) اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعات ہیں۔

اور معنیٰ قرب کے اعتبار سے جَارَ عَنِ الطَّرِیْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ (صلہ عن کی وجہ سے راستہ سے ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں پھر مطلقاً حق سے عدول کرنے کے لئے اس کو اصل قرار دے کر اس سے اَلْجَوْرُ بمعنیٰ ظلم بنایا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:﴿وَمِنْهَا جَآئِرٌ﴾ (۱۶۔۹) اور بعض راستے سیدھی راہ سے ایک جانب مائل ہورہے ہیں (جو باری تعالیٰ تک نہیں پہنچتے) بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَائِرُ (جَور سے صیغہ فاعل) انسانوں میں سے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کے التزام سے رک جائے (اور اسی کا نام ظلم ہے)

(ج و ز)

جَوْزُ الطَّرِیْقِ کے معنیٰ راستہ کے وسط کے ہیں اسی سے جَازَ الشَّیْءُ ہے جو کسی چیز کے جائز یا خوشگوار ہونے کی تعبیر ہے گویا۔ اس نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔

جَوْزُ السَّمَاءِ: وسط آسمان۔ اَلْجَوْزَاءُ: آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسط آسمان میں ہے۔

شَاۃٌ جَوْزَاءُ: سیاہ بھیڑ جس کے وسط میں سفیدی ہو۔

(جَاوَزَهٗ) کسی چیز کے وسط سے آگے گزر جانا) قرآن میں ہے:﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ﴾ (۲۔۲۴۹) پھر جب وہ (حضرت طالوت علیہ السلام) اس دریا کے وسط سے آگے گزر گئے یعنی پار ہوگئے،﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ﴾ (۱۰۔۹۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کردیا۔

جُزْتُ الْمَكَانَ: کسی جگہ میں گزرنا۔ اَجَزْتُهٗ میں نے اسے نافذ کردیا اس کو پیچھے چھوڑ دیا[1] اِسْتَجَزْتُ فُلَانًا فَجَازَنِیْ: میں نے اس سے (جانوروں یا کھیتی کے لئے) پانی طلب کیا چنانچہ اس نے مجھے دے دیا۔ یہ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ کا حقیقی معنی وہ ہوتا ہے جو اپنے وضعی معنیٰ میں استعمال ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے[2] اور نہ اسے مجاز کہتے ہیں۔

(ج و س)

آیت کریمہ:﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ﴾ (۱۷۔۵) میں جَاسُوا کے معنیٰ ہیں کہ وہ تمہارے دیار کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے (غارت گری اور قتل سے کنایہ ہے) اور واسُو کے معنیٰ بھی اسی (جَاسُوا) کے قریب قریب ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَوس کے معنیٰ کسی چیز کو استقصار کے ساتھ طلب کرنا کے ہوتے

---

[1] وفی الحدیث الصراط فاکون انا وامتی اول من یجیز علیه.

[2] ھھنا التواء فتفکر۔۱۲.

ہیں۔

اَلْمَجُوسُ: ایک معروف فرقے کا نام ہے۔

(ج و ع)

اَلْجُوعُ: وہ تکلیف جو کسی حیوان کو معدہ کے طعام سے خالی ہونے کی وجہ پہنچتی ہے۔

الْمَجَاعَة: خشک سالی کا زمانہ۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَائِعٌ: بھوکا آدمی اور جب بہت زیادہ بھوکا ہو تو اسے جوعَانٌ کہا جاتا ہے۔

(ج و ل)

جَالُوت: ایک سرکش بادشاہ کا نام ہے جسے حضرت داوٗد علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ چنانچہ آیت: ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ (۲۔۲۵۱) میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ج ی ء)

جَاءَ (ض) جِیْئَۃً وَمَجِیْئًا: یہ اَلْاِتْیَان کے ہم معنیٰ ہے جس کے معنیٰ آنا کے ہیں، لیکن مَجِیْء کا لفظ اِتیَان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اِتْیَان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بسہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اِتْیان کے معنیٰ کسی کام کا مقصد اور ارادہ کرنا، بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔

لیکن مَجِیْءٌ کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جَآءَ کے معنیٰ مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں، خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان واعراض دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ، کام یا وقت کا قصد کرے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی﴾ (۳۶۔۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ ﴿وَلَقَدْ جَاءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنَاتِ﴾ (۴۰۔۳۴) اور پہلے یوسف علیہ السلام بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ ﴿وَلَمَّا جَائَتْ رُسُلُنَا لُوطاً سِیْءَ بِھِمْ﴾ (۱۱۔۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمناک ہوگئے۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ﴾ (۳۳۔۱۹) پھر جب خوف کا وقت آئے۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ﴾ (۳۵۔۴۵) جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ ﴿بَلٰی قَدْ جَاءَتْکَ اٰیَاتِیْ﴾ (۳۹۔۵۹) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں۔

اور آیت: ﴿فَقَدْ جَاؤُوْا ظُلْماً وَّزُوْرًا﴾ (۲۵۔۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے یہ بات کہہ کر ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا ہے اور حد سے تجاوز کیا ہے، تو یہاں پر ظلم اور زور کے متعلق مَجِیْء کا لفظ استعمال کرنا ایسے ہی ہے جیسا ان کے متعلق اَلْقَصْد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

﴿اِذْ جَآءُوْکُمْ مِنْ فَوْقِکُمْ وَمِن اَسْفَلَ مِنْکُمْ﴾ (۳۳۔۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفاً صَفاً﴾ (۸۹۔۱۲) میں پروردگار کے آنے سے اس کے حکم کا آجانا مراد ہے۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے اور یہی معنیٰ آیت ﴿فَلَمَّا جَآءَھُمْ الْحَقُّ﴾ (۱۰۔۷۶) میں الحق کے آنے کے ہیں۔

جَآئَهٗ بِکَذَا وَاَجَآئَهٗ (متعدی بحرف جار وہمزہ) وہ اسے لے آیا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَجَآءَ هَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (۱۹۔۲۳) تو دردِزہ ان کو کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔بعض نے یہاں اَجَـــآءَ کے معنیٰ اِلْجَاءَ یعنی مجبور اور لاچار کرنا بھی کئے ہیں مگر یہ جَاءَ سے (ہمزہ تعدیہ) متعدی بنایا گیا ہے۔چنانچہ اسی سے مثل مشہور ہے۔❶ شَــرٌّ مَا اَجَائَکَ اِلٰی مُخَّةِ عُرقُوبٍ یعنی انتہائی فقر ہی تمہیں عرقوب سے مخ جوسنے کے لئے لے آیا ہے شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۹۸) اَجَـاءَتْــهُ الْـمَخَافَةُ وَالرَّجَاءُ

اسے امید وبیم تمہارے پاس لے آئی ہے

جَـآءَ بِـکَذَا اس نے لا حاضر کیا قرآن پاک میں ہے: ﴿لَـوْلَا جَآؤُا عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ (۲۴۔۱۳) یہ افتراز پرداز اپنی بات کی تصدیق کے لئے چار گواہ کیوں نہیں لائے۔

﴿وَجِـئْتُكَ مِـنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ﴾ (۲۷۔۲۲) اور میں تمہارے پاس شہر سبا سے ایک سچی خبر لے کر آیا ہوں۔ اور جو چیز لائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے جَـاءَ بِـکَذَا کے معنیٰ بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

(ج ی ب)

اَلْـجَیْبُ: کے معنیٰ گریبان کے ہیں، (مجازاً سینہ) اس کی جمع اَلْجُیُوبُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) ان کو چاہئے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں۔

❀❀❀

❶ راجع لـلـمثـل الميداني رقم ۱۹,۷ وفيه يجيئك بدل اجاءك واللسان (عرقب ويضرب لـلمضطر وذالك لان الـعرقوب لامخ له والعرقوب ايضاً اسم رجل ومواعيد عرقوب مثل فی خلف الوعد.

❷ قـالـه زهير بن ابی سلمیٰ واوله : وجاءٍ سار معتمداً اليكم۔ قال الفراء اصله من جئت وقد جعلته بمعنیٰ الجأ راجع اللسان والتاج والبيت من شواهد الطبری ۱۶۔۶٤) ومختار الشعر الجاهلی (۱ : ۱۹٦) والبحر ٦ : ۱۸۲) والعقد الثمين ۷۷ ومحاضرات للمؤلف (۱ : ۲٦۸) ومجاز القران ۲ : ٤ وديوانه ۷۷ والقرطبی ۱۱۔۹۲)۱۲.

كِتَابُ الْحَاءِ

(ح ب ب)

اَلْحَبُّ وَالْحَبَّةُ: (فتحہ حاء) گندم، جو وغیرہ مطعومات کے دانہ کو کہتے ہیں اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو حِبٌّ وَحِبَّةٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ، فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲-۲۶۱) (ان کے مالوں) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں۔

﴿وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ﴾ (۶-۵۹) اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾ (۶-۹۵) بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (ان سے درخت اگاتا ہے۔) اور آیت کریمہ ہے: ﴿فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدُ﴾ (۵۰-۹) اور اس باغ سے دبستان اگائے اور اناج۔ میں حَبَّ الْحَصِيْدُ سے گندم وغیرہ مراد ہے جو کاٹا جاتا ہے، اور حدیث میں ہے [1] (۶۹) كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ۔ جیسے گھاس پات کے بیج جو سیلاب کے بہاؤ میں اُگ آتے ہیں۔

اَلْحِبُّ: (محبوب، عاشق) جس کی محبت حد سے بڑھ جائے دانوں کے ساتھ تشبیہ دے کر حَبَبُ الْاِنْسَانِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ دانتوں کی ہمواری اور موزونیت کے ہیں۔ اسی طرح شکل وصورت میں حبوب کے ساتھ تشبیہ دے کر پانی کے بلبلہ کو حَبَابُ الْمَآءِ کہا جاتا ہے۔ حَبَّةُ الْقَلْبِ: سویدائے قلب۔ یہ بھی ہیئت میں تشبیہ کے اعتبار سے ہے۔

حَبَبْتُ فُلَانًا اصل معنیٰ تو یہ ہیں کہ میں نے اس کے حَبَّةُ الْقَلْبِ پر مارا جیسا کہ كَبَدْتُهٗ فَأَدْتُهٗ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اَحْبَبْتُ فُلَانًا اصل معنیٰ تو یہ ہیں کہ میں نے اپنا دل اس کی محبت کے لئے پیش کیا مگر عرف میں مَحَبٌّ کی جگہ پر محبوب بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَحَبَّةُ کے معنیٰ کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں، اور محبت تین قسم پر ہے۔ (۱) محض لذت اندوزی کے لئے جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا﴾ (۷۶-۸) میں اسی نوع کی محبت کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) محبت نفع اندوزی کی خاطر جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ (۶۱-۱۳) اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں

---

[1] قطعه من حديث طويل ورد في اهل النار بعد مايخرجون منها ويلقون في نهر الحياة راجع البخاري مع الفتح ١٤: ٢٥٥ وفي رواية مسم لقتادة بدل الحبة وحمئة السيل بدل حميل السيل والحديث في الفائق ٢: ٢٦ وغريب ابي عبيدة وهناك تخريجه ١٢.

خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔

(۳) کبھی یہ محبت محض فضل وشرف کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسا کہ اہل علم وفضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں۔اور بعض نے مثل آیت: ﴿فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾ (۹۔۱۰۸) میں محبت کی تفسیر ارادہ سے بھی کی ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ لفظ محبت میں بنسبت ارادہ کے معنوی طور پر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے، کیونکہ ہر محبت میں ارادہ تو پایا ہی جاتا ہے مگر ہر ارادے کو محبت نہیں کہہ سکتے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ﴾ (۹۔۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں اور پسند کریں۔اصل میں اِسْتِحْبَابٌ کے معنی کسی چیز میں ایسا معنیٰ تلاش کرنے کے ہیں جس کی بنا پر اس سے محبت کی جائے مگر یہاں علی (صلہ) کی وجہ سے اس میں ایثار اور ترجیح کے معنیٰ پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (۴۱۔۱۱) کے معنی بھی یہ ہیں کہ انہوں نے اندھا پن کو ہدایت پہ ترجیح دی۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ (۵۔۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور جسے وہ دوست رکھیں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے سے مراد ان پر انعام کرنا ہے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنیٰ ہیں ''بندہ تقرب الٰہی حاصل کرنیکی طلب میں لگا رہے'' اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّي اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ﴾ (۳۸۔۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ میں نے گھوڑوں سے اس طرح محبت کی جس طرح کہ مجھے خیر سے محبت ہے۔ (اس طرح میں اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ کے توابین اور متطہرین سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دے گا اور ان پر فضل وکرم فرمائے گا اور آیت کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) اور آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (۱۸۔۲۱) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب سے انسان اس قدر سرکش ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے کا نام نہیں لیتا اور جب توبہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ان معنوں سے محبت نہیں کرتا جن معنوں میں کہ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے، یعنی انعام وافضال کرنا اور ثواب سے نوازنا۔

حَبَّبَ اللّٰهُ اِلَيَّ كَذَا: فلاں چیز اللہ نے مجھے عزیز کر دی قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ﴾ (۴۹۔۷) لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔

اَحَبَّ الْبَعِيْرُ: اونٹ کا ماندہ اور بیمار ہو کر ایک جگہ پڑے رہنا۔گویا اسے اس جگہ سے محبت ہے۔

حَبَابُكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا یعنی تیری انتہائی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم ایسا کرو۔

(ح ب ر)

اَلْحِبْرُ: وہ نشان جو عمدہ اور خوبصورت معلوم ہو

حدیث میں ہے ❶ (٦٥) يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ رَجُلٌ قَدْ ذَهَبَ حِبْرُهُ وَسِبْرُهُ کہ آگ سے ایک آدمی نکلے گا جس کا حسن وجمال اور چہرے کی رونق ختم ہو چکی ہوگی اسی سے روشنائی کو حِبْرٌ کہا جاتا ہے۔ ❷ شَاعِرٌ مُحَبِّرٌ: عمدہ گو شاعر ❸ شِعرٌ مُحَبَّرٌ: عمدہ شعر۔ ثَوبٌ حَبِيرٌ: ملائم اور نیا کپڑا۔ اَرْضٌ مِحْبَارٌ: جلد سرسبز ہونے والی زمین (والجمع محابیر) اَلْحَبِيرُ (من السحاب) خوبصورت بادل۔

حُبِرَ فُلان: اس کے جسم پر زخم کا نشان باقی ہے۔

اَلْحَبْرُ: عالم کو کہتے ہیں اس لئے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کے علم کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور افعال حسنہ میں لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ❹ (٦٦) کہ علماء تا قیامت باقی رہیں گے، اگر چہ ان کی شخصیتیں اس دنیا سے فنا ہو جاتی ہیں، لیکن ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر باقی رہتے ہیں۔

حَبْرٌ کی جمع اَحْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (٩۔٣١) انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ ...... کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ (٣٠۔١٥) کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جنت میں اس قدر خوش ہوں گے کہ وہاں کی نعمتوں کی تروتازگی کا اثر ان کے چہروں پر ہویدا ہوگا۔

(ح ب س)

اَلْحَبْسُ: (ض) کے معنیٰ کسی کو اٹھنے سے روک دینا کے ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ﴾ (٥۔١٠٦) تو ان کو (عصر کی) نماز کے بعد روک لو۔

نیز حَبْسٌ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جو پانی روکنے کے لیے بنائی گئی ہو۔ اس کی جمع اَحْبَاسٌ ہے۔

اَلتَّحْبِيْسُ: ہمیشہ کے لئے وقف کرنا۔ کہا جاتا ہے: هٰذَا حَبِيسٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ اللہ کی راہ میں وقف ہے۔

(ح ب ط)

اَلْحَبْطُ: (س) کے معنیٰ کسی کام کا اکارت اور ضائع ہو جانا کے ہیں) قرآن پاک میں ہے: ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ (٣۔٨٨) جن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ ﴿وَاَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ (٦۔٨٨) اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ ﴿لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ (٣٩۔٦٥) تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔

اَلْاِحْبَاطُ: (افعال) اکارت کر دینا) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (٤٧۔٣٢) اور خدا ان کا سب کیا کرایا اکارت کر دے گا۔

---

❶ قال في الفائق ١: ١١٦) الحبر والسبر بالكسر وقد روى فيهما الفتح ايضاً راجع غريب ابى عبيد ١: ٨٥۔٨٧) وايضاً اصلاح يعقوب ١.

❷ ومنه سمى كعب الاحبار لانه كان صاحب كتب وهو كعب بن ماتع الحميدى ابواسحاق تابعى مخضرم توفى ٣٢ھ فى خلافة عثمان وقدجاوز المأة فى القاموس كعب الحبر ولاتقل الاحبار لكن روه العلماء راجع مشارق عياض وتهذيب النووى .

❸ قال الاصمعى وكان يقال لطفيل الغنوى فى الجاهلية المحبر لانه كان يحسن الشعر غريب ابى عبيد ١: ٨٦.

❹ راجع لقول علىؓ العقد ٢: ٢١٢) وفيه امثالهم بدل واشخاصهم كذافى ابن الحديد ١٢.

﴿فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۸) تو اس نے بھی ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔

حَبطِ عمل کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ اعمال دینوی ہوں اس لئے قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئیں گے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۳) اور جوانہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔

(۲) اعمال تو اخروی ہوں لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے نہ کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے ❶ (٦٩) اَنَّهُ يُؤْتٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِرَجُلٍ فَيُقَالُ لَهُ بِمَا كَانَ اشْتِغَالُكَ قَالَ بِقِرَآءَةِ الْقُرْآنِ فَيُقَالُ لَهُ قَدْ كُنْتَ تَقْرَءُ لِيُقَالَ هُوَ قَارِیءٌ وَقَدْ قِيْلَ ذَالِكَ فَيُؤْمَرُ بِهِ اِلَى النَّارِ کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قسم کے عمل کرتا رہا وہ جواب دے گا کہ میں قرآن پاک پڑھتا رہا تو اس سے کہا جائے گا کہ تو نے قران اس لئے پڑھا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے سو لوگ تجھے قاری کہتے رہے حکم ہوگا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال صالحہ کئے ہوں گے لیکن ان کے بالمقابل گناہ کا بار اسقدر ہوگا کہ اعمال صالحہ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور گناہوں کا پلہ بھاری رہے گا اسی کی طرف خفة المیزان سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ❷

اصل میں حَبْط کا لفظ حَبَطَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ جانور اتنا زیادہ کھا جائے کہ اس کا پیٹ اپھر جائے۔ حدیث میں ہے: ❸ (٧٠) اِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ حَبَطاً اَوْ يُلِمُّ: بعض اوقات موسم ربیع کی گھاس یا پیٹ میں اپھار کی وجہ سے قتل کر دیتی ہے اور یا بیمار کر دیتی ہے۔ ایک شخص حارث کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ نفخ بطن سے مرگیا تھا تو اس کا نام الحارث الحَبط پڑ گیا اور اس کی اولاد کو حَبِطات کہا جاتا ہے۔ ❹

(ح ب ک)

(اَلْحِبْكَةُ وَالْحِبَاكُ کے معنیٰ راستہ کے ہیں اَلْحُبُكَ) آیت کریمہ:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ﴾ (۵۱۔۷) اور آسمان کی قسم جس میں رستے ہیں۔

میں بعض نے الحبك سے ستاروں اور کہکشاں کے محسوس راستے مراد لئے ہیں اور بعض نے عقلی راستے مراد لئے ہیں۔ جن کا تعلق بصیرت سے ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا﴾ (۳۔۱۹۱) میں بھی اسی معنیٰ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

---

❶ الحديث باختلاف الفاظه في مسلم ٢ : ١٤٠ ـ من حديث ابي هريرة .

❷ اى في الآية ١٠١ : ٩٧٨) وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُمُّهُ هَاوِيَة .

❸ راجع للحديث كنزالعمال ٣ رقم ١١٠٤، ٥٥ بجميع فحارجه وفيه مثل للمفرط من جمع الدنيا ومنعها من حقها الميداني ٣ : وفى رواية مايقتل خبطاً غريب ابى عبيد بخارى جهاد ورقاق مسلم (قاق ، الغائق ١ : ٥٥٦) .

❹ وهم خمسة عامر ، سعد ، انمار ، عمرو (التاج) ١٢ .

اصل میں یہ بَعِیرٌ مَحْبُوكُ الْقُوَیٰ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی وہ اونٹ جس کے جوڑ بند نہایت مضبوط ہوں۔
اَلِاحْتِبَاكُ: (افتعال) کس کر اور مضبوطی سے باندھنا۔

(ح ب ل)

اَلْحَبْلُ۔ کے معنی رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے :﴿فِیْ جِیْدِهَا حَبلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ (۱۱۱۔۵) اس کے گلے میں کھجور کی رسی ہوگی۔
پھر چونکہ رگ بھی شکل وصورت میں رسی سے ملتی جلتی ہے اس لئے شہ رگ کو حَبْلُ الْوَرِیْدِ (۵۰۔۱۶) اور حَبلُ الْعَاتِقِ کہتے ہیں اور ریت کے لمبے ٹیلے کو حَبْلُ الرَّمْلِ کہا جاتا ہے۔استعارتاً حَبلٌ کے معنی ملا دینا بھی آتے ہیں، اور ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچ جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے اس لئے آیت کریمہ:﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعاً﴾ (۳۔۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا، میں حَبْلُ اللّٰهِ سے مراد قرآن پاک اور عقل سلیم وغیرہما اشیاء ہیں جن کے ساتھ تمسک کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور عہد و پیمان کو بھی حَبْلُ کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ (۳۔۱۱۲) یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کے عہد (معاہدہ میں آجائیں میں متنبہ کیا گیا ہے کہ کافر کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لیے دو قسم کے عہد و پیمان کی ضرورت ہے ایک عہد الٰہی اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص اہل کتاب سے ہو اور کسی سماوی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ ورنہ تو اسے اس کے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور نہ ہی اسے ذمہ اور امان مل سکتا ہے دوسرا عہد وہ ہے جو لوگوں کی جانب سے اسے حاصل ہو۔
اَلْحِبَالَةُ: خاص کر صیاد کے پھندے کو کہا جاتا ہے اسکی جمع حَبَائِل ہے۔ایک حدیث میں ہے ❶:(۷۱) اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں۔
اَلْمُحْتَبِلُ وَالْحَابِلُ پھندا لگانے والا۔ ضرب المثل ہے ❷ وَقَعَ حَابِلُهُم عَلیٰ نَابِلِهِم یعنی انہوں نے آپس میں شر وفساد پیدا کر دیا یا ان کا اول آخر پر گھوم آیا۔ اَلْحُبْلَةُ جو چیز ہار میں ڈالی جائے۔

(ح ت م)

اَلْحَتْمُ کے معنی قضاء مقدر کے ہیں ❸ اَلْحَاتِمُ کالا کوّا جو اہل عرب کے خیال کے مطابق کائیں کائیں کر کے جدائی ڈال دیتا ہے۔

حَتّٰی (حرف)

کبھی تو ''الیٰ'' کی طرح یہ حرف جر کے طور پر استعمال

---

❶ قاله ابن مسعود راجع المیدانی ۲: ۳۴۰) وفی الاحیاء ۳: ۹۶ مرفوعاً وتمامه: ولولا هذه الشهوة لما كان للنساء سلطنة علی الرجال قال العراقی فی تخریجه الاصفهانی فی الترغیب والترهیب من حدیث خالد بن زید الجهنی باسناد فیه جهالة.

❷ راجع للمثل اللسان والصحاح (حبل).

❸ وفی التنزیل: وكان علی ربك حتما مقضیا (۱۹۔۱۷).

ہوتا ہے لیکن اس کے مابعد غایت ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے اور کبھی عاطفہ ہوتا ہے اور کبھی استیناف کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسے اَکَلْتُ السَّمْکَةَ حَتّٰی رَأْسَهَا (عاطفہ) رَأْسِهَا (جارہ) رَأْسُهَا (متانفہ) قرآن پاک میں ہے: ﴿لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِيْنٍ﴾ (۱۲۔۵۳) کچھ عرصہ کے لئے انہیں قید ہی کر دیں۔

﴿حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۹۷۔۵) طلوع صبح تک...... جب یہ فعل مضارع پر داخل ہوتے ہیں اور ان میں ہر ایک کی دو وجہ ہوسکتی ہیں نصب کی صورت میں حَتّٰی بمعنٰی (۱) اِلٰی اَنْ یا (۲) کَیْ ہوتا ہے اور مضارع کے مرفوع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حتی سے پہلے فعل ماضی آجائے جیسے:

مَشَيْتُ حَتّٰی اَدْخُلَ الْبَصَرَةَ (یعنی میں چلا حتی کہ میں داخل ہوا) دوسری صورت یہ ہے کہ حتیٰ کا مابعد حال واقع ہو جیسے مَرِضَ حَتّٰی لَا يَرْجُوْنَ (وہ بیمار ہوا اس حال میں کہ سب اس سے ناامید ہوگئے) اور آیت کریمہ: ﴿حَتّٰی يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ﴾ (۲۔۲۱۴) یہاں تک کہ پیغمبر...... پکار اٹھے۔ میں يَقُوْلُ پر رفع اور نصب دونوں منقول ہیں اور ان ہر دو قرأت میں دونوں معنیٰ بیان کئے گئے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ حتیٰ کا مابعد اس کے ماقبل کے خلاف ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِيْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا﴾ (۴۔۴۳) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کرو۔ وہاں اگر بحالتِ سفر رستے چلے جارہے ہو (اور غسل نہ کرسکو تو تیمم سے نماز پڑھ لو۔

مگر کبھی اس طرح نہیں بھی ہوتا جیسے مروی ہے [1] (۷۲) اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا يَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا: پس اس حدیث کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ تمہارے تھک جانے کے بعد ذات باری تعالیٰ بھی تھک جاتی ہے۔ بلکہ معنیٰ یہ ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کو کبھی ملال لاحق نہیں ہوتا۔

(ح ج ج)

اَلْحَجُّ: (ن) کے اصل معنیٰ کسی کی زیارت کا قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ [2] (طویل)

(۹۹) يَحُجُّوْنَ بَيْتَ الزِّبْرِقَانِ الْمُعَصْفَرَا

وہ زبرقان کے زرد رنگ کے عمامہ کی زیارت کرتے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں اقامت نسک کے ارادہ سے بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام حج ہے۔ اَلْحَجُّ: (بفتح الحا) مصدر ہے اور اَلْحِجُّ (بکسر الحا) اسم ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ (۹۔۳) میں حج اکبر سے مراد یوم نحر یا یوم عرفہ ہے۔ ایک روایت میں ہے [3]

---

[1] قطعة من حديث طويل لعائشة متفق عيله وفي المؤطا بلاغاً راجع لشرحه الزرقاني ۱: ۲۴۳۔۲۴۴.

[2] قاله المخبل السعدى كمافى المعانى الكبير للقبتى ۱: ۴۷۸ واصلاح يعقوب ۳۷۲ وصدره واشهد من عوف حلولا كثيرة وفى اللسان (سب) والطبرى ۲: ۱۹۴) المزعفر بدل المعصفر قال فى ذيله هكذا وردالبيت فى الاصول المطبوعة والمخطوطة لئكن استدرك مصحح اللسان على قول "بيت" وقال الصواب "سب" بسين مهملة مسكورة وباء موحدة ومعناه العمامة وهو المناسب لقوله المزعفر اوالمعصفر وقال قطرب معناه الاست لانه كان مقرئ ونسبه الى الابنة راجع الجمهرة ۱: ۳۱) والخزانة ۳: ۴۲۸) وفيه خلاف انظر السهيلى ۲: ۳۳۵) وتهذيب الالفاظ ۶۳ ھ والبيت فى الغريب اللقتبى ۳۲ والصاحى ۸۱ بغير عزو والبيان ۳: ۵۱) والسمط ۹ والصحاح والاساس والمحكم (حج) والتاج واللسان (سب).

[3] رواه الشافعى فى الام (راجع الشوكانى).

(۷۳) اَلْعُمْرَۃُ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ: عمرہ حج اصغر ہے۔

اَلْحُجَّۃُ: اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے اور نقیضین میں سے ایک کی صحت کی مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (۶۔۱۴۹) کہہ دو کہ خدا ہی کی حجت غالب ہے۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ (۲۔۱۵۰) (یہ تاکید) اس لئے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ لگا سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں۔ اس آیت میں ظالموں کے احتجاج کو حجۃ سے مستثنیٰ کیا ہے گو اصولاً وہ حجت میں داخل نہیں ہے۔ پس یہ استشہاد ایسا ہی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❹ (طویل)

(۱۰۰) وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ
بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

ان میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ لشکروں کے ساتھ لڑنے سے ان کی تلواروں پر دندانے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اس احتجاج کو حجت قرار دینا ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۴۲۔۱۶) اور جو لوگ خدا کے بارے میں بعد اس کے کہ اسے مومنوں نے مان لیا ہو، جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ میں ان کے باطل جھگڑے کو حجت قرار دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۴۲۔۱۵) اور ہم میں اور تم میں کچھ بحث وتکرار نہیں ہے۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ ظہور بیان کی وجہ سے بحث وتکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْمُحَاجَّۃُ: اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ﴾ (۶۔۸۰) اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا بحث کرتے ہو۔

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (۳۔۶۱) پھر اگر یہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

﴿لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۳۔۶۵) تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

﴿هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾

---

❹ قاله النابغة في مدح ملوك غسان وهذاالبيت مشهورته اورده العلماء في تصانيفهم وقد اوردالعلماء البديع شاهداً لتاكيد المدح بمايشبه الذم انظر لكلمة الفصل على البيت الخزانة ۳ : ۲۲۹) واللسان (فلل) وشواهد الكشاف ۱۰ والكامل للمبرد ۴۸۔۳۰۰) والعمدة ۲ : ۴۱۱) وذيله ۱ : ۳۱۶) وديوانه ۶ والصناعتين ۴۰۸ ومختار الشعرا الجاهلى ۱ : ۸۷) والبحر ۵ : ۶/۷۲ : ۳/۲۰۲ : ۵۱۶ والكتاب ۱ : ۳۶۷) ومحاضرات المؤلف ۳ : ۱۵۶) والحيوان ۴ : ۲۷۴) والعقد الثمين ۳ والصاحبي ۲۶۷ والمعاني الكبير ۳۶۰ والسيوطي ۲۱ (شواهد بيدا) ۱۲.

(۳۔٦٦) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

﴿وَاِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ﴾ (۴۰۔۴۷) اور جب وہ دوزخ میں جھگڑیں گے۔

اور حَجٌّ کے معنیٰ زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

یَحُجُّ مَأْمُوْمَۃً فِیْ مَعْرِھَا لَجَفٌ

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قطر نہایت وسیع ہے۔

(ح ج ب)

اَلْحَجَبُ وَالْحِجَابُ:(ن) کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہو جانا اور وہ پردہ جو دل اور پیٹ کے درمیان حائل ہے اسے "حجاب الجوف" کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ہے:﴿وَبَیْنَھُمَا حِجَابٌ﴾ (۵۔۴٦) اور ان دونوں (بہشت اور دوزخ) کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ میں حجاب سے وہ پردہ مراد نہیں ہے جو ظاہری نظر کو روک لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع ہوگی اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک پہنچنے سے روک دے گی۔ جیسے فرمایا:

﴿فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ﴾ (۵۷۔۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی اس کے باطن میں رحمت ہوگی اور بظاہر اس طرف عذاب ہوگا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیاً اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (۴۲۔۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے۔ میں پردے کے پیچھے سے کلام کرتے ہیں، وہ ذات الٰہی کو دیکھ نہیں سکتا اور آیت کریمہ:﴿حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (۳۸۔۳۲) کے معنیٰ ہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔

اَلْحَاجِبُ: دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔

اور حَاجِبَانِ (تثنیہ) بھویں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں۔

حَاجِبُ الشَّمْسِ: سورج کا کنارہ اس لئے کہ وہ بھی بادشاہ کے دربان کی طرح پہلے پہل نمودار ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (۸۳۔۱۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الٰہی کو ان سے روک لیا جائے گا (اس طرح وہ دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے) جس کے متعلق آیت کریمہ:﴿فَضُرِبَ

---

[1] قاله غداءة بن درة الطائی وتمامه : فاست الطبیب قذاها کالمغارید ـانظر التاج واللسان والمحکم (حج) والکامل للمبرد ۹۸، ۴۲۲ والمعجم للیاقوت (۱۵ : ۷۳ـ۷۴) حیث الکلام طویل علی البیت والحیوان (۳ : ۴۲۵) والمحفص ۱۳ : ۱۸۲ ولمعنیٰ بالعجزان الطبیب بجزع من هولها فالقذی یتساقط من استه کالمغارید وهو جمع مغرود ومعناه کماصغار قال القبتی فی المعانی ۹۷۷ یحج ای یصلح ولحف ان یذهب فی احد النّاحیتین فالطبیب ممایری من هولها تقذی استه کالمغادیر وهذا آخرماقیل فی شرح البیت ۱۲.

بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(ح ج ر)

اَلْحَجَرُ: سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع اَحْجَارٌ وَحِجَارَۃٌ آتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ﴾ (۲۔۲۴) جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ میں بعض نے یہی مراد لئے ہیں اور اس سے آگ کی ہولنا کی پر تنبیہ کی ہے کہ وہ پتھروں اور انسانوں سے بھڑکائی جائے گی بخلاف دنیا کی آگ کے کہ یہ جلنے کے بعد پتھروں پر تھوڑا بہت اثر کرتی ہے۔ لیکن انہیں جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہیں جیسے پتھر چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً﴾ (۲۔۷۴) گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

اَلْحَجْرُ وَالتَّحْجِیْرُ کے معنیٰ کسی جگہ پر پتھروں سے احاطہ کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَجَرْتُہٗ حَجْراً فَھُوَ مَحْجُوْرٌ وَحَجَّرْتُہٗ تَحْجِیْراً فَھُوَ مُحَجَّرٌ اور جس جگہ کے اِردگرد پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو۔ اسے حِجْرٌ کہا جاتا ہے اس لئے حطیم کعبہ اور دیار ثمود کو حِجْرٌ کہا گیا ہے [1] قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَقَدْ کَذَّبَ اَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (۱۵۔۸۰) اور (وادی) حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔ اور حِجْرٌ (پتھروں سے احاطہ کرنا) سے حفاظت اور روکنے کے معنیٰ لے کر عقل انسانی کو بھی حِجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی انسان کو نفسانی بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ھَلْ فِیْ ذَالِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ﴾ (۸۹۔۵) (اور) بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں۔

مبرد (لغوی) نے کہا ہے کہ گھوڑی کو بھی حِجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیٹ کے اندر حمل روکے رکھتی ہے۔ اور حِجْرٌ حرام چیز کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا تناول ممنوع ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالُوا ھٰذِہٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ﴾ (۶۔۱۳۸) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جو چوپائے اور کھیتی حرام ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۲) میں حِجْرًا مَحْجُوْرًا ایک محاورہ ہے جاہلیت کا دستور تھا کہ جس کسی کے سامنے کوئی ایسا شخص آ جاتا جس کی اذیت کا خوف ہوتا تو حِجْرًا مَحْجُوْرًا کہ دیتا (یعنی ہم تمہاری پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن اسے کچھ نہ کہتا) تو قرآن پاک نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے [2] اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَجَعَلَ بَیْنَھُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۵۳) اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔

---

[1] ناحیۃ الشام عند وادی القریٰ وھم قوم صالح النبی صلی اللہ علیہ وسلم اماحجر (بفتحہ جیم معروف) فقصبتہ الیمامۃ.

[2] وبھذا فسر اللیث وابن جریج وردہ الازھری وقال ان علماء التفسیر الذی یعتمدون، علی خلاف ذالک وقالوا ان ذالک کلہ من قول الملائکۃ راجع الطبری (۱۹۔۳) والتاج واللسان (حجر).

میں "حِجْراً مَّحْجُوراً" سے مراد ایسی مضبوط رکاوٹ ہے جو دور نہ ہو سکے۔
فُلَانٌ فِیْ حِجْرِ فُلَانٍ: وہ فلاں کے زیر نگرانی ہے۔ یعنی اس کی طرف سے اس کے مال اور دیگر اختیارات پر پابندی ہے اس کی جمع حُجُورٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَرَبَآئِبُکُمُ اللّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور وہ لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو۔
حَجْرُ الْقَمِیْصِ: یعنی قمیص کا اگلا حصہ جس میں کوئی چیز رکھ لی جاتی ہے اور حجر سے احاطہ کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے۔
حُجِرَتْ عَیْنُ الْفَرَسِ یعنی گھوڑی کی آنکھ کے گرد داغ دیا گیا۔ حُجِّرَ الْقَمَرُ: چاند کے گرد ہالہ ہونا۔
اَلْحُجُورَةُ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل جو وہ خط مستدیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔ اسی سے مَحْجَرُ الْعَیْنِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ خانہ چشم کے ہیں تَحَجَّرَ کَذَا کسی چیز کا پتھر کی طرح سخت ہو جانا اَلْاَحْجَارُ: بنی تمیم کے چند بطون (جو اس نام سے مشہور ہوئے) اَحْجَارٌ: کیونکہ ان کے بزرگوں کے نام جندل حجر اور صخر وغیرہ تھے۔ [1]

(ح ج ز)

اَلْحَجْزُ: (ن ض) کے معنیٰ دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:: ﴿حَجَزَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا﴾ (۲۷۔۶۱) اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنا دی۔
اور حِجَاز کو بھی حجاز اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شام اور بادیہ کے درمیان حائل ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَمَا مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِیْنَ﴾ (۶۹۔۴۷) پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہے۔ میں حَاجِزِیْنَ، اَحَدٍ کی صفت ہے کیونکہ احد کا لفظ معنیٰ جمع ہے نیز حجاز اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کلائی میں ڈال کر اسے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں (تاکہ ہل نہ سکے) پھر حجز میں معنیٰ منع کے پیش نظر اِحْتَجَزَ فُلَانٌ عَنْ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کے رک جانے کے ہیں اِحْتَجَزَ بِاِزَارِہٖ تہبند باندھنا۔ اسی سے حُجْزَۃُ السَّرَاوِیْلِ ہے جس کے معنیٰ ازار بند کے نیفہ کے ہیں [2] مشہور محاورہ ہے۔ اِنْ اَرَدْتُّمُ الْمُحَاجَزَۃَ فَقَبْلَ الْمُنَاجَزَۃِ یعنی ایک دوسرے کو روکنے اور صلح کرنے کا موقع لڑائی سے قبل ہوتا ہے۔ [3]
حَجَازَیْكَ یعنی ان کے درمیان حائل ہو جایئے۔

(ح د د)

اَلْحَدُّ: دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو ان کو باہم ملنے سے روک دے۔ حَدَدْتُ کَذَا میں نے فلاں چیز کے لئے حد ممیز مقرر کر دی۔ حَدُّ الدَّارِ مکان کی حد،

---

[1] کذافی اللسان والتاج (حجر) قال واباهم عنی الشاعر بقوله وکل انثی حملت احجاراً.
[2] ومنه الحدیث وانا آخذ بحجزکم.
[3] کذافی التاج (حجز) وفی المیدانی المثل یروی عن اکثم بن صیفی قال ابو عبید معناه: رنج بنفسك قبل لقاء من لاتقاومه (المیدانی رقم (۱۴۹) ۱۲.

جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے ممیز ہوتا ہے حَدُّ الشَّیءِ: کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں سے اسے ممتاز کردے اور زنا وشراب کی سزا کو بھی حد اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَاللّٰهِ﴾ (۶۵۔۱).....اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدود سے تجاوز کرے گا۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (۲۔۲۲۹) یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز مت کرو۔ اور آیت کریمہ:﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَاَجْدَرُ اَنْ لَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل نہیں کہ جو احکام (شریعت) خدانے نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی) ہوں۔

میں بعض نے حدود کے معنیٰ احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حقائق ومعانی مراد ہیں۔

جملہ حدود الٰہی چار قسم پر ہیں۔

(۱) ایسے حکم جن میں نقص وزیادہ دونوں ناجائز ہوتے ہیں جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کردی ہیں ان میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو لیکن کمی جائز نہ ہو۔

(۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہیں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔

(۴) اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۸۔۲۰) جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

میں يُحَآدُّوْنَ کے معنیٰ اللہ رسول کی مخالفت کے ہیں اور اس مخالفت کو يُحَآدُّوْنَ کہنا یا تو روکنے کے اعتبار سے ہے اور یا الحدید کے استعمال یعنی جنگ کی وجہ سے۔ حَدِیْدٌ: لوہا۔قرآن میں ہے:﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (۵۷۔۲۵) اور لوہا پیدا کیا اس میں اسلحہ جنگ کے لحاظ سے پُر خطر بھی شدید ہے۔

حَدَدْتُ السِّكِّيْنَ: میں نے چھری کی دھار تیز کی۔اور اَحْدَدْتُهٗ اس کے لئے حد مقرر کردی پھر ہر وہ چیز جو بلحاظ خلقت یا بلحاظ معنی کے ایک ہو۔جیسے نگاہ اور بَصِيْرَة اس کی صفت میں الحدید کا لفظ بولا جاتا ہے۔جیسے۔هُوَ حَدِيْدُ النَّظَرِ (وہ تیز نظر ہے) هُوَ حَدِيْدُ الفَهْمِ (وہ تیز فہم ہے) قرآن میں ہے:﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (۵۰۔۲۲) تو آج تیزی نگاہ تیز ہے۔اور جب زبان بلحاظ تیزی کے لوہے کی سی تاثیر رکھتی ہو تو صَارِمٌ وَمَاضٍ کی طرح اس کی صفت حدید بھی آجاتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ﴾ (۳۳۔۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں تیز زبانی کریں۔اور روکنے کے معنیٰ کے پیش نظر دربان کو حِدادٌ کہا جاتا ہے اور بدنصیب اور محروم آدمی کو رَجُلٌ مَحْدُوْدٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح د ب)

حَدِبَ(س) حَدَباً ۔الرَّجُلُ وَاَحْدَبَ واحْدَوْدَبَ کبڑا ہونا۔ہوسکتا ہے کہ حَدَبُ الظَّهْرُ کا لفظ اس مادہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہو جس کے معنیٰ کبڑی پیٹھ کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر لاغر اونٹنی کو جس

کے سرینوں کی ہڈیاں نمایاں ہوں، نَاقَة حَدْبَاءُ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے (مجازا) بلند اور سخت زمین کو حَدَبٌ کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۶) اور وہ (یا جوج ماجوج) بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

(ح د ث)

اَلْحُدُوثُ: (ن) کے معنیٰ ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو۔ عام اس سے کہ وہ جوہر ہو یا عرض اور اِحْدَاث صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مُحْدَثٌ (صیغہ صفت مفعولی) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا اِحداث کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے: اَحْدَثْتُ مِلْكًا میں نے نیا ملک حاصل کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ﴾ (۲۱۔۲) ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی (میں اسی دوسرے معنیٰ کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے) اور ہر قول وفعل جو نیا نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی مُحْدَث کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾ (۱۸۔۷۰) جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ (۶۵۔۱) شاید اللہ اس کے بعد کوئی (رجعت) کی سبیل پیدا کر دے۔

ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ (۶۶۔۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ (۸۸۔۱۰) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت) کا حال معلوم ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ (۱۲۔۱۰۱) اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا میں احادیث سے رُؤیا مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ﴾ (۵۲۔۳۴) تو ایسا کلام بنا لائیں۔

﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ﴾ (۵۳۔۵۹) (اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو،

﴿فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟۔

﴿حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ﴾ (۶۔۵۹) یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۴۵۔۶) تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ اور خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

اور حدیث میں ہے [1] (۷۴) اِنْ يَّكُنْ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ مُحَدَّثٌ فَهُوَ عُمَرُ ۔ کہ اگر اس امت میں کوئی

---

[1] اخرجه البخاری من حدیث ابی هریرة ولفظه لقد کان فیماقبلکم من الامم محدثون فان یك فی امتی احد فانه عمرؓ رواه مسلم من حدیث عائشة الفتح ۶ : ۴۰۰) وایضا فی مناقب عمروهناك الكلام علیه وتخریج الاحیاء ۳ : ۲۴ وبمعناه المستدرك للحاكم ۳ : ۸۶)عن عائشة والفائق ۱ : ۲۳).

محدث ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے اور محدث سے آپ کی مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں ملأ اعلٰی کی طرف سے القاء ہوتا ہو۔اور آیت کریمہ ہے: ﴿فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِیْثَ﴾ (۳۴۔۱۹) تو ہم نے (انہیں نابود کرکے) ان کے افسانے بنادیئے کے معنٰی یہ ہیں کہ ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔جو بطور مثال کے ذکر کی جاتی ہیں۔

اَلْحَدِیْثُ: (ایضاً) تازہ پھل رَجُلٌ حَدُوْثٌ یعنی خوش گفتار آدمی۔هُوَحِدْثُ النِّسَاءِ وہ عورتوں سے باتیں کرنے کا عادی ہے۔حَادَثْتُهٗ وَتَحَدَّثْتُهٗ وَتَحَادَثُوْا: باہم بات چیت کرنا۔صَارَ اُحْدُوْثَةً وہ افسانہ بن چکا ہے۔

رَجُلٌ حَدَثٌ وَحَدِیْثُ السِّنِّ نوعمر آدمی۔

حادِثَةٌ: مصیبت۔اس کی جمع حَوادِث آتی ہے۔

(ح د ق)

اَلْحَدِیْقَةُ: (مرغزار) وہ قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہو اور ہیئت وصورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے اسے حَدَقَةُ الْعَیْنِ (آنکھ کی پتلی) کے ساتھ تشبیہ دے کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔اس کی جمع حَدَائِقَ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ﴾ (۲۷۔۶۰) سرسبز باغ۔اور حَدَقَةٌ کی جمع حِدَاقٌ وَاَحْدَاقٌ آتی ہے حَدَّقَ النَّظْرُ: گھور کر دیکھنا نظر جما کر دیکھنا۔حَدَقُوا بِهٖ وَاَحْدَقُوا۔انہوں نے اس کے گرد احاطہ کرلیا یہ معنٰی بھی حَدَقَةُ الْعَیْنِ کے گھمانے سے لئے گئے ہیں۔

(ح ذ ر)

اَلْحَذَرُ: (س) خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا۔کہا جاتا ہے: حَذَرَ حَذَرًا وَحَذِرْتُهٗ: میں اس سے دور رہا۔قرآن میں ہے:

﴿یَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ﴾ (۳۹۔۹) آخرت سے ڈرتا ہے۔

﴿اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۶) اور ہم سب باساز وسامان ہیں۔

ایک قرأت میں حَذِرُوْنَ ہے۔

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ﴾ (۶۳۔۴) یہ (تمہارے دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا۔

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (۶۵۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

حَذَّرَ: کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔قرآن میں ہے:

﴿وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (۳۔۲۸) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اَلْحِذْرُ: بچاؤ اور آیت کریمہ: ﴿خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ (۴۔۷۱) (جہاد کے لئے) ہتھیار لے لیا کرو۔میں حِذْر سے مراد اسلحۂ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔حِذَارِ (اسم فعل بمعنٰی امر) بچو جیسے مَنَاعِ بمعنٰی اِمنَعْ۔

(ح ر ر)

اَلْحَرَارَةُ: یہ بَرُوْدَة کی ضد ہے اور حرارت دو قسم پر ہے۔

(۱) وہ حرارت جو گرم اجسام سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہے جیسے سورج اور آگ کی گرمی

(۲) وہ حرارت جو عوارض طبعیہ سے بدن میں پیدا ہوجاتی ہے۔جیسے محموم (بخار زدہ) کے بدن کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

حَرَّ (س) حَرَارَةً الیومُ او الریحُ: دن یا ہوا گرم ہو گئی ۔ ایسے دن کو مَحْرُوْرٌ کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح حَرَّ الرَّجُلُ کا محاورہ ہے قرآن میں ہے: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ (۹۔۸۱) کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے ۔

اَلْحَرُوْرُ: گرم ہوا، لو ۔ ارشاد ہے ۔: ﴿وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ﴾ (۳۵۔۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ کی تپش ۔

اسْتَحَرَّ الْقَيْظُ: گرمی سخت ہوگئی ۔

اَلْحَرَرُ: یبوست جو شدت پیاس کی وجہ سے جگر میں پیدا ہوجاتی ہے ۔ اَلْحِرَّةُ: (اسم مرۃ از حَرَّ) کہا جاتا ہے ۔ [1]

(مثل) حَرَّةٌ تَحْتَ قِرَّةٍ: یعنی سخت پیاس سردی کے ساتھ (بد دعا) اَلْحَرَّةُ: (ایضا) پتھر جو گرمی کی شدت سے سیاہ ہوجائے ۔ اسی سے اِسْتَحَرَّ الْقَتْلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنیٰ کشت وخون کا معرکہ گرم ہونے کے ہیں ۔

حَرُّ الْعَمَلِ: کام کی شدت، صعوبت عمل ۔

مشہور ہے (مثل) اِنَّمَا يَتَوَلَّى حَارَّهَا مَنْ تَوَلَّى قَارَّهَا...... جس نے اس کی ٹھنڈک سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ وہی اس کی گرمی برداشت کرے ۔

اَلْحُرُّ: عبدٌ کی ضد ۔ کہا جاتا ہے ۔ حُرٌّ بَيِّنُ الْحُرُوْرِيَّةِ اَوِ الْحُرُوْرَةِ: وہ آدمی جس کی شرافت نمایاں ہو ۔

حُرِّيَّةٌ: (آزادی) یعنی آزادی دو قسم پر ہے ۔

(۱) جو کسی کا غلام نہ ہو جیسے فرمایا: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ (۲۔۱۷۸) کہ آزاد کے بدلے آزاد ۔

(۲) جسے صفات ذمیمہ یعنی حرص، لالچ دنیوی مال ومتاع کا غلام نہ بنادیں ۔

ضد عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [2] (۷۲) تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ: (درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو ۔ شاعر نے کہا ہے ۔ [3] ع

(۱۰۲) وَرِقُّ ذَوِي الْاَطْمَاعِ رِقٌّ مُخَلَّدٌ

حریص اور لالچی لوگ ہمیشہ غلام رہتے ہیں ۔

مثل مشہور ہے ۔ (مثل)

عَبْدُ الشَّهْوَةِ اَذَلُّ مِنْ عَبْدِ الرِّقِّ ۔ کہ شہوت کا بندہ غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے ۔

اَلتَّحْرِيْرُ کے معنیٰ کسی انسان کو آزاد کرنا کے ہیں ۔ چنانچہ تحریت کے اول معنیٰ کے پیش نظر فرمایا: ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ تو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہیے اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے فرمایا: ﴿نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ (۳۔۳۵) جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں ۔ چنانچہ بعض نے اس کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے سے کسی قسم کا دنیوی فائدہ حاصل نہیں کرے گی ۔ جس کی طرف آیت: ﴿بَنِيْنَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶۔۷۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے ۔ بلکہ یہ خالص عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے گا ۔

---

[1] انظر فی (ق، ر، ر) .

[2] مَرَّ تخریجه فی (عبد).

[3] لم اجده فی المراجع ۱۲.

اسی بنا پر شعبی نے مُحَرَّرًا کے معنی مخلصاً کئے ہیں اور مجاہد نے مُحَرَّراً کے معنی خادم مَعبد کئے ہیں۔امام جعفر نے کہا ہے۔کہ امور دنیوی سے آزاد ہوگا۔لیکن مآل کے لحاظ سے سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔حَرَّرْتُ الْقَوْمَ: میں نے انہیں قید خانہ سے رہا کر دیا۔صَرُّ الْوَجْهِ: وہ شخص جو احتیاج کے پنجہ میں گرفتار نہ ہوا ہو۔
حُرُّ الدَّارِ گھر کا درمیان۔
اَحْرَارُ الْبَقْلِ: وہ ترکاریاں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔
اور شاعر کا قول ❶ ع (الکامل)

(۱۰۳) جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بِكْرٍ حُرَّةٍ

موسم بہار کی پہلی موسلا دھار بارش نے اس پر سخاوت کی ہے۔
بَاتَتِ الْمَرْءَةُ بِلَيْلَةٍ حُرَّة ❷ (شب زفاف کہ شوہر درآں بکارت نتواں زائل کرد۔) یہ سب استعارات ہیں۔
اَلْحَرِيْرُ: (ریشمی کپڑا) ہر ایک باریک کپڑے کو حریر کہا جاتا ہے۔فرمایا:
﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾ (۲۲۔۲۳) وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

(ح ر ب)

اَلْحَرْبُ: جنگ کارزار۔اور فتحہ را کے ساتھ معنی لڑائی میں کسی کا مال چھیننے کے ہیں پھر ہر قسم کے سلب کو حَرَبٌ کہا جاتا ہے اور حَرَبَ معنوی لحاظ سے حَرْب سے مشتق ہے کہا جاتا ہے: حُرِبَ الرَّجُلُ: اس کا سامان چھین لیا گیا۔فَهُوَ حَرِيْبٌ یعنی لٹا ہوا۔
اَلتَّحْرِيْبُ: لڑائی کا بھڑکانا۔رَجُلٌ مِحْرَبٌ جنگجو گویا وہ لڑائی بھڑکانے کا آلہ ہے۔اَلْحَرْبَةُ: برچھا۔
اصل میں یہ حَرْبٌ یا حِرَابٌ سے فَعْلَة کے وزن پر ہے اور مسجد کے محراب کو محراب یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان اور خواہشات نفسانی سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اور یا اس لئے کہ اس جگہ میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے والے پر حق یہ ہے کہ دنیوی کاروبار اور پریشان خیالیوں سے یکسو ہو جائے۔
بعض کہتے ہیں کہ اصل میں "محراب البیت" صدر مجلس کو کہتے ہیں اسی بنا پر جب مسجد میں امام کی جگہ بنائی گئی تو اسے بھی محراب کہ دیا گیا۔
اور بعض نے اس کے برعکس محراب المسجد کو اصل اور محراب البیت کو اس کی فرع مانا ہے۔اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ﴾ (۳۴۔۱۳) وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی محراب اور مجسمے۔
اَلْحِرْبَاءُ: گرگٹ۔کیونکہ وہ سورج کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اس سے جنگ کرنا چاہتی ہے نیز زرہ کے

---

❶ قاله عنترة وتمامه : فتكون كل قرارة كالدرهم ۔وفي رواية الامالي (۲ : ۲۹۷) عين قرّة بدل بكرحرة وحديقة بدل قرارة وكذا في معلقته (العشر للتبريزي ۲۶۸) وفي شرح التبريزي ۱۸۰) كماههناوالسمط ۹٤٥) والصحاح واللسان (حر) والمحكم (حدق) والكامل ٦ والصناعتين ۲۸۲) والمختار الشعرالجاهلي (۱ : ۱۸۲) ونقد ٦۸ والبحر ٥ : ٥٤۲ / ۱ : ۱٦۰ / ۷ : ۱۷۲) والحيوان ۲ : ۳۱۲) والعقد الثمين ٤٥ وطراز المجالس ۱٦ وفي البيت بحث يتعلق بلفظ كل والبيت في ديوانه ٤٥ وابن هشام ۱ : ۲۱۷) بحث كل والجمهرة ۱٦۳ وابن الانباري ۳۱۲.

❷ انظر للمثل المعاني للقبتي ٥۰۸ والمعداني ۱۰٥.

حلقہ یا میخ کو بھی صوری مشابہت کی بنا پر حِــرْبَــاء کہا جاتا ہے جیسا کہ ضَبٌّ اور کَـلْبٌ کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے بعض حصوں کو ضَبَّۃٌ اور کَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح ر ث)

اَلْـحَرْثُ: (ن) کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حَــــرْث کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿اَنِ اغْـدُوْا عَـلٰـی حَـرْثِـكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۲) کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوتی ہے اس لئے حرث بمعنیٰ آبادی آ جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَـنْ كَـانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنیا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ﴾ (۴۲۔۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اور ہم اپنی کتاب مـکـارم الشـریعہ میں دنیا کے کھیتی اور لوگوں کے کسان ہونے اور اس میں بیج بونے کی کیفیت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ایک روایت میں ہے ❶ (۷۲) اَصْدَقُ الْاَسْمَاءِ الحارث کہ سب سے سچا نام حارث ہے کیونکہ اس میں کسب کے معنیٰ پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے ❷ (۷۵) اُحْرُثْ فِی دُنْیَاكَ لِاٰخِرَتِكَ کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کر لو۔

حَــرْثُ الْاَرْضِ: (زمین کاشت کرنا) سے تھییج بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حَـرَّثْـتُ النَّارَ کہا جاتا ہے میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے محرث کہا جاتا ہے کسی کا قول ہے۔❸

اُحْـرُثِ الْقُرانَ: یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام لو۔

حَرَثَ نَاقَتَهٗ: اونٹنی کو کام اور محنت سے دبلا کر دیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے؟ تو انہوں نے جواب دیا ❹ حَرَثْنَا هَا یَوْمَ بَدْرٍ کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دبلا کر دیا۔اور آیت کریمہ:

﴿نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔

میں استعارہ عورتوں کو حَـرْث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی کی بقا کا مدار ہے۔اس طرح نــوعِ انســان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿یُهْـلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور کھیتی کو

---

❶ النهاية (حرث).

❷ الحديث ورد بالفاظ مختلفه راجع النهاية ۱ : ۳۵۹.

❸ عن حديث عبدالله بن مسعود رضى الله عنه النهاية ۱ : ۳۹.

❹ راجع النهاية ۱ : ۳۰.

(برباد) اور انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے۔ دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

(ح ر ج)

اَلْحَرَجُ وَالْحَرَاجُ: (اسم) کے اصل معنی اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اس لئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَجُ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا﴾ (۴۔۶۵) اور...... اپنے دل میں تنگ نہ ہوں۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۲۲۔۷۸) اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔

حَرِجَ (س) حَرَجاً۔ صَدْرُہٗ۔ سینہ تنگ ہو جانا قرآن پاک میں ہے: ﴿یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقاً حَرَجًا﴾ (۶۔۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ ایک قرأت میں حَرِجاً ہے ❶ یعنی کفر کی وجہ سے اس کا سینہ گھٹا رہتا ہے اس لئے کہ عقیدۂ کفر کی بنیاد ظن پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو کبھی سکون نفس حاصل نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۲۔۷) سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلاَ یَکُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِنْہُ﴾ (۷۔۲) اس سے تم کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔

میں لاَ یَکُنْ فعل نہی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور...... جملہ دعائیہ بھی۔ بعض نے اسے جملہ خبریہ کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۴۔۱) سے مفہوم ہوتا ہے۔

اَلْمُنْحَرِجُ: (صفت فاعلی) گناہ اور تنگی سے دور رہنے والا جیسے مُنْحَوِبٌ، حُوْبٌ (یعنی گناہ) سے بچنے والا۔

(ح ر د)

اَلْحَرْدُ: (ض) تیزی اور غصہ کے ساتھ کسی چیز کو روکنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۵) اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔

یعنی وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔

نَزَلَ فُلاَنٌ حَرِیْدًا: یعنی فلاں قوم سے الگ تھلگ اترا۔ ھُوَ حَرِیْدُ الْمَحَلِّ: یعنی الگ تھلگ رہنے والا۔

حَارَدَتِ السَّنَةُ: یعنی امسال بارش نہیں ہوئی۔

حَارَدَتِ النَّاقَةُ اونٹنی نے دودھ روک لیا۔ (یعنی اس کا دودھ کم یا خشک ہو گیا) حَرِدَ: (س) غضبناک ہونا۔

حَرَّدَہٗ کَذَا۔ فلاں چیز نے اسے غضب ناک کر دیا۔

بَعِیْرٌ اَحْرَدُ: اونٹ جس کی اگلی ٹانگ کا پٹھا ڈھیلا ہو۔

اَلْحُرْدِیَّةُ: سرکنڈے کا باڑہ۔

(ح ر س)

اَلْحَرَسُ وَالْحُرَّاسُ: (جمع) پاسبان۔ اس کا واحد حَارِسٌ ہے ❷ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ قراءۃ ابن عباس وعمرؓ۔

❷ قال فی التاج: والحرسی لاتقل حارس لانه قد صار اسم جنس الاٰن یذهب به الی معنی الحرامة ۱۲۔

﴿فَوَجَدْنَا هَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِيْداً﴾ (۷۲۔۸) تو اس کومضبوط چوکیداروں .... سے بھرا ہوا پایا۔

اَلْحَرْسُ: (ض) اور اَلْحِرْزُ کے جس طرح الفاظ ملتے جلتے ہیں ایسے ہی ان کے معنیٰ بھی قریب قریب ایک ہی ہیں ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ حِرْزٌ کا استعمال زیادہ تر نقدی اور سامان کی حفاظت کے لئے آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۱۰۴) فَبَقِيْتُ حَرْساً قَبْلَ مَجْرَى دَاحِسٍ
لَوكَانَ لِلنَّفْسِ اللَّجُوْجِ خُلُوْدُ

میں داحس کی دوڑ سے پہلے اس کی حفاظت کرتا رہا کاش سرکش نفس کے لئے ہمیشہ رہنا ہوتا۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں حَرْساً کے معنیٰ دَهْراً کے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ اگر صرف اس شعر کی بنا پر حرس کے معنیٰ زمانہ کئے گئے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شعر مذکور میں ہوسکتا ہے کہ حرس مصدر بمعنیٰ فاعل موضع حال میں ہو ای بقیت حارِساً: اب رہا اس کا زمانہ یا مدت کے معنیٰ پر دلالت کرنا تو یہ لفظ حرس کے اصل معنیٰ نہیں ہیں بلکہ مقتضائے کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

اَحْــــرَسَ: صاحب حراست ہونا۔(اس میں صاحب ماٰخذ ہونے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں جیسا کہ باب افعال کا خاصہ ہے۔

حَرِيْسَةُ الْجَبَلِ: وہ مال جورات کے وقت پہاڑ میں حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے[2]۔ابوعبیدہ کا قول ہے کہ الحريسة بمعنیٰ مَحْرُوسة ہے نیز اَلْحَرِيسية بمعنیٰ مســروقة بھی آجاتا ہے یعنیٰ چوری کیا ہوا مال اور اس معنیٰ میں باب حَرس (ض) يَحْرِس حَرْساً آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اَلْحَرِيسة سے بنا ہے کیونکہ اہل عرب سے الحريسية کے بمعنیٰ سَرْقه یعنی چوری بھی منقول ہے۔

(ح ر ص)

اَلْــحِــرْصُ: شدتِ آز (حرص) یا فرط ارادہ۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدَاهُمْ﴾ (۱۶۔۳۷) یعنی ان کی ہدایت کے لئے تمہارے دل میں شدید آرزو اور خواہش ہو۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيَاةٍ﴾ (۲۔۹۶) بلکہ ان کو تم اورلوگوں سے زندگی پر کہیں زیادہ حریص دیکھوگے۔

﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوحَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۳) اور بہت سے آدمی گوتم (کتنی ہی) خواہش کرو۔ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اصل میں یہ حَرَصَ الْقَصَّارُ الثَّوبَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں دھوبی نے کپڑے کو پتھر پر مار مار کر پھاڑ دیا۔

---

[1] قاله لبيد كمافى اللسان والتاج (جرى) والعمرين ٦٣ وفى رواية وغنيت سبتاً بدل بقيت حرساً وفى مجاز القران ١: ٢٨٩ رقم ٣٢٢ والمحكم والمرزوقى ٧١٤ : وعمرت حرسا والبيت فى ديوانه (١ : ٢٥) واصلاح يعقوب ١٠ وتهذيب الاصلاح (١: ١٦) مع آخر قبله والبحر (١ : ٢٤٠) .

[2] ومنه فى الحديث فى حريسة الجبل (التاج) لانه ليس فى حرز.

اَلْحَارِضَةُ: وہ زخم جو جلد کو پھاڑ ڈالے۔

اَلْحَارِضَةُ وَالْحَرِيصَةُ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین کی بالائی سطح کو کھرچ ڈالے۔

(ح ر ض)

اَلْحَرِضُ: اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے اور درخور اعتناء نہ رہے اس لئے جو چیز قریب بہ ہلاکت ہو جائے اس کے متعلق حَرِضَ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا﴾ (۱۲۔۸۵) یا تو قریب بہ ہلاکت ہو جاؤ گے۔اور اَحْرَضَه کے معنیٰ گھلا دینے اور قریب بہ ہلاکت کر دینے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۱۰۵) اِنِّی امْرُءٌ نَابَنِیْ هَمٌّ فَاَحْرَضَنِی:

میں وہ آدمی ہوں جسے تمہارے غم نے گھلا دیا ہے۔

اَلْحُرْضَةُ: گھٹیا قسم کا آدمی جو خود ایک دام بھی خرچ نہ کرے بلکہ جوئے بازی کا گوشت مفت کھانے کا عادی ہو۔

اَلتَّحْرِيضُ: کے معنیٰ ازالہ حرض کے معنی میں ہیں یعنی کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا جیسے مَرَّضْتُهُ اور قَذَّيْتُهُ کے معنی مرض اور تنکے کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ تَحْرِيضٌ کے معنی کسی کو مزین کر کے اور اسے آسان صورت میں پیش کر کے اس پر برانگیختہ کرنے کے ہیں۔[2]

اَحْرَضْتُهُ: (افعال) کسی چیز میں خرابی پیدا کر دینا۔جیسے اَقْذَيْتُهُ: کسی چیز کو قذا آلود کرنا ہوتے ہیں۔

(ح ر ف)

حَرْفُ الشَّیْءِ کے معنیٰ کسی چیز کے کنارہ کے ہیں حَرْفٌ کی جمع اَحْرُفٌ وَحُرُوفٌ آتی ہے اور پہاڑ کشتی اور تلوار کے کنارہ کو حَرْفٌ کہا جاتا ہے اور حُرُوفُ الْهِجَاءِ کے معنیٰ اطراف کلمہ کے ہیں اور اصطلاحِ نحاۃ میں اَلْحُرُوفُ الْعَوَامِلُ ان حروف کو کہا جاتا ہے جو کلموں کے اطراف میں واقع ہوتے ہیں اور ان کو باہم مرتبط کرتے ہیں اور حَرْفُ الجبل: یعنی پہاڑ کے کنارے اور باریکی میں حرف کے ساتھ تشبیہ دے کر لاغر اونٹنی کو حرف کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (۲۲۔۱۱) اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں...... میں عَلٰى حَرْفٍ کے معنیٰ خود قرآن پاک نے ہی بعد میں فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرٌ الاٰيَة سے بیان کر دیئے ہیں یعنی جب تک اطاعت وعبادت میں کچھ دنیاوی فائدہ نظر آتا ہے تو اس کو کرتا رہتا ہے اور جب کوئی تکلیف نظر آتی ہے تو چھوڑ بیٹھتا ہے۔اور یہی معنیٰ آیت:

﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ (۴۔۱۴۳) کے ہیں۔

اِنْحَرَفَ عَنْ كَذَا وَتَحَرَّفَ: کسی چیز سے کنارہ کرنا

---

[1] قاله العرجي عبدالله بن عمر بن عبدالله وتمامه : حتىٰ بليت وحتىٰ شفى السقم ـ والبيت في اللسان والصحاح والتاج (حرض) ومجاز القران ۱ : ۳۱۷ رقم ۳٦٦ والطبري ۱۳ : ٤٢) وفي رواية لج بي حب بدل نابني هم والقرطبي ۹ : ۲۵۰) والشطر في فتح الباري ۸ : ۲۷۳) وراجع الترجمة الشاعر الاغاني ۱ : ۳۸۳) والاشتقاق ٤٨ والسمط ٤٢٢) والبحر ٥ : ۳۲۷) .

[2] وفي التنزيل حرض المؤمنين على القتال ٤ : ٨٤).

ایک جانب مائل ہونا۔ اَلاِحْتِرَافُ: کوئی پیشہ اختیار کرنا۔
اَلْحِرْفَةُ: (فعلة) پیشہ، پیشے کی حالت جیسے قِعْدَةٌ وَ جِلْسَةٌ۔
اَلْمُحَارَفُ: وہ شخص جو خیر سے محروم اور اس کے کنارہ پر ہو (کم نصیب)
اَلتَّحْرِيْفُ: (الشیء) کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا۔ جیسے تَحْرِيْفُ الْقَلَمِ قلم کو ٹیڑھا قط لگانا۔
اور تَحْرِيْفُ الْكَلَامِ کے معنیٰ ہیں کلام کو اس کے موقع ومحل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (۵۔۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ (۵۔۴۱) یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔
﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ (۲۔۷۵) (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے رہے ہیں۔
اَلْحَرِفُ: وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو۔ گویا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طَعَامٌ حِرِيْفٌ: چرچراہٹ والا کھانا۔ ایک روایت میں ہے۔ ❶ (۷۶)
نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔
اس کی تحقیق ہمارے رسالہ المنبهة على فوائد القرآن میں ملے گی۔

(ح ر ق)

اَحْرَقَ كَذَا: (کسی چیز کو جلانا) اِحْتَرَقَ: (جلنا)
اَلْحَرِيْقُ: (آگ) قرآن میں ہے:
﴿ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (۳۔۱۸۱) کہ عذاب (آتش) سوزاں کے مزے چکھتے رہو۔
﴿فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾ (۲۔۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔
﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ﴾ (۲۱۔۶۸) تب وہ کہنے لگے ...... تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔
﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ﴾ (۲۰۔۹۷) ہم اسے جلا دیں گے۔ ایک قرأت میں لَنَحْرُقَنَّهٗ ہے ❷ پس حَرْقُ الشَّیْءِ کے معنیٰ کسی چیز میں بغیر اشتعال کے جلن پیدا کرنے کے ہیں جیسے دھوبی کے پٹخنے سے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔
حَرَقَ (ن) الشَّیْءَ ریتی سے رگڑنا اسی سے حَرَق

---

❶ كذافي غريب ابي عبيد ۳: ۱۵۹۔۱۶۲ وتمامه كلها شاف كاف۔ وبعضهم يرويه فاقرؤا كماعلمتم راجع الفائق ۱: ۳۴) والصحيح انزل بدل نزل والحديث باختلاف الفاظه في (حم ق) عن عباس والسجزى في الابانة عن زيد بن ثابت و(هب) عن عمرو ابن العاص د(دن) عن ابى بن كعب (حم طب) عن عبادة بن الصامت (حم م ك) عن ابى بكر و عمر (حم) عن ابى جهيم (حم ف) عن ابى حم عن حذيفة وطب عن معاذ وعن ابن مسعود وابن الضريس عن ابن عباس وابن جريرعن ابن مسعود وابن عمر (حم وابن جرير طب) وابو نصر السخرى في الابانة راجع كنزالعمال ج ۲: ۱۸۶۔۲۲۵) وفي بعضها ثلا ثة احرف وفي بعضها اربعة احرف لكن حديث سبعة اكثر واصح فلها الاعتبار.

❷ وهى قرأة على رضى الله عنه.

النَّاب کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ دانت پیسنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ یَحْرُقُ عَلَیَّ الْاُرَّم: یعنی وہ مجھ پر دانت پیستا ہے۔ حَرِقَ الشِّعْرُ اس کے اشعار مشہور ہوگئے۔ مَاءٌ حُرَاقٌ: بہت کھاری پانی جو کھاری پن سے جلا ڈالے اَلْاِحْرَاقُ: کسی چیز کو جلانا اسی سے استعارۃً جب کہ بہت زیادہ ملامت کر کے اذیت پہنچائے تو کہا جاتا ہے۔ اَحْرَقَنِی بَلَوْمِہٖ یعنی اس نے مجھے ملامت سے جلا ڈالا۔

(ح ر ک)

اَلْحَرَکَۃُ: یہ سکون کی ضد ہے اور جسم کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو حرکت کہا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز میں تغیر ہونے یا اس کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہونے پر بھی تحرک کذا کہہ لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ﴾ (۷۵۔۱۶) اور (اے محمد ﷺ) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو۔

(ح ر م)

اَلْحَرَامُ: وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو خواہ یہ ممانعت تسخیری یا جبری، یا عقل کی رو سے ہو اور یا پھر شرع کی جانب سے ہو اور یا اس شخص کی جانب سے ہو جو حکم شرع کو بجالاتا ہے۔ پس آیت کریمہ ہے۔

﴿وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ﴾ (۲۸۔۱۲) اور ہم نے پہلے ہی سے اس پر (دائیوں کے) دودھ حرام کر دیئے تھے۔ میں حرمت تسخیری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ (۲۱۔۹۵) اور جس بستی والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ وہ دنیا کی طرف رجوع کریں۔

کو بھی اسی معنیٰ پر محمول کیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک آیت: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (۵۔۲۶) کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔

میں بھی تحریم تسخیری مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منع جبری پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ (۵۔۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔

میں بھی حرمت جبری مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۷۔۵۰) کہ خدا نے بہشت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔

میں تحریم بواسطہ منع جبری ہے اور حرمت شرعی جیسے (۷۷) آنحضرت ﷺ نے طعام کی طعام کے ساتھ بیع میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے [1] اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ (۲۔۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔

میں بھی تحریم شرعی مراد ہے کیونکہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ نیز تحریم شرعی کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا

---

[1] متفق علیه من حدیث عمربن الخطاب ورواه النسائی وابن ماجة وابوداؤد من حدیث عبادة بن الصامت راجع النیل ۵: ۲۰۴).

عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ﴾ (۶۔۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھاتا ہو حرام نہیں پاتا۔

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ﴾ (۶۔۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے۔

سَوْطٌ مُحَرَّمٌ: بے دباغت چمڑے کا کوڑا۔ گویا دباغت سے وہ حلال نہیں ہوا جو کہ حدیث ❶ كُلُّ اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ کا مقتضی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مُحَرَّمٌ اس کوڑے کو کہتے ہیں جو نرم نہ کیا گیا ہو۔

اَلْحَرَمُ کو حرام اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی ہیں جو دوسری جگہ حرام نہیں ہیں اور یہی معنیٰ الشہر الحرام کے ہیں۔ رَجُلٌ حَرَامٌ وَمُحَرَّمٌ: یعنی وہ شخص جو حالت احرام میں ہو اس کے بالمقابل رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحِلٌّ ہے اور آیت کریمہ: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (۶۶۔۱) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کی تحریم کا حکم کیوں لگاتے ہو جو اللہ نے حرام نہیں کی کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کی ہو وہ کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ آیت: ﴿وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا الْاٰيَةَ﴾ (۶۔۱۳۸) اور بعض چارپائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ میں مذکور ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۷) بلکہ ہم (برگشتہ نصیب) بے نصیب ہیں ان کے محروم ہونے سے بدنصیبی مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (۵۱۔۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) میں محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خوشحالی اور وسعت رزق سے محروم ہو اور بعض نے کہا ہے کہ المحروم سے کتا مراد ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ محروم کتے کو کہتے ہیں جیسا ان کی تردید کرنے والوں نے سمجھا ہے بلکہ انہوں نے کتے کو بطور مثال ذکر کیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر کتے کو لوگ دور ہٹاتے ہیں اور اسے کچھ نہیں دیتے۔

اَلْمَحْرُمَةُ وَالْمَحْرَمَةُ کے معنیٰ حرمت کے ہیں۔

اِسْتَحْرَمَتِ الْمَاعِزُ: بکری نے نر کی خواہش کی (یہ حِرْمَة) سے ہے جس کے معنیٰ بکری کی جنسی خواہش کے ہیں)

(ح ر ی)

حَرَی (ض) الشَّیءَ وَتَحَرَّاہُ کے معنیٰ کسی چیز کے حَرًی یعنی جانب کا قصد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾ (۷۲۔۱۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ کا قصد کیا۔ اور حَرَی الشَّیءُ حَرْیاً کے معنیٰ کسی چیز کے کم ہونے کے ہیں گویا وہ ایک جانب پڑی رہی اور پھولی پھلی نہیں شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

---

❶ اخرجه هذا اللفظ الطبرانی عن ابن عباس والمعروف من لفظ الحديث ايما بدل كل راجع (حم ت ن ه) والمسلم عن ابن عباس وكذا فی مسند احمد ورواه الشافعی وابن حبان والدارقطنی ورواه الخطیب فی تلخیص المتشابه من حدیث جابر وفی روایة الدارقطنی عن عائشة مرفوعاً طهور كل اديم دباغها راجع النيل ۱ : ۷۵) وكنزالعمال ۹ رقم ۲۱۴۴, ۲۱۲۹ بالفاظ وطرق.

❷ لسلمة بن عویه بن ربیعة الضبی من قصیدة طویلة وصدره حتیٰ كانی خاتل قنصا ونسبه المرتضیٰ ۱ : ۲۴۴ عن الجاحظ لذی الاصبع ونسبه القالی ۲ : ۱۶۶) ۱۲ بیتاً لسلمی بن غزیه قال الاستاذ المیمنی وهو غویة بن سلمی انظر السمط ۳۲۲ ومجالس ثعلب ۱ : ۲۴۵ واللالئی ۷۹ وقد ذکره المرزبانی فی معجمه فی حرف العین المهملة وقال لاہقال غویه بالمعجمة (فی البحتری ۲۹۶) لغزیه بن سلمیٰ.

(۱۰٦)وَالْمَرْءُ بَعْدَ تَمَامِهٖ یَحْرِیْ
انسان کامل ہونے کے بعد ڈھلنا شروع ہوجاتا ہے۔
رَمَاہُ اللّٰہِ بِاَفْعٰی حَارِیَۃٍ ❶ (مثل)
اللہ تعالیٰ اس پر بوڑھا اژدھا مسلط کرے۔

(ح ز ب)

اَلْحِزْبُ: وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا﴾ (۱۸۔۱۲) دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔
﴿اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ﴾ (۵۸۔۱۹) یہ (جماعت) شیطان کا لشکر ہے۔اور آیت کریمہ:﴿وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ (۳۳۔۲۲) اور جب مومنوں نے کافروں کے لشکر کو دیکھا۔ میں احزاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو (مختلف قبائل سے) آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے جمع ہوگئے تھے۔اور آیت کریمہ:
﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۵۔۵٦) اور خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔ میں حزب اللہ سے انصار اللہ یعنی دین الٰہی کی مدد کرنے والے لوگ مراد ہیں۔
﴿یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ﴾ (۳۳۔۲۰) (خوف کے سبب) خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں اور اگر لشکر آجائیں تو تمنا کریں کہ (کاش!) گنواروں میں جارہیں۔

اس کے بعد تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:
﴿وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ (۳۳۔۲۲)

(ح ز ن)

اَلْحُزْنُ وَالْحَزَنُ کے معنیٰ زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بے قراری سی طبیعت کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اسے بھی حَزَنٌ یا حُزْنٌ کہا جاتا ہے اس کی ضد فَرَحٌ ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنیٰ معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خَشَنَتْ بِصَدْرِهٖ بھی کہا جاتا ہے۔حَزِنَ (س) غمزدہ ہونا۔حَزَنَهٗ (ن) وَاَحْزَنَهٗ: غمگین کرنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی فَاتَکُمْ﴾ (۳۔۱۵۳) تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے......... اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔
﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ (۳۵۔۳۴) کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔
﴿تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ (۹۔۹۲) تو وہ لوٹ گئے اور......ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
﴿اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ (۱۲۔۸٦) کہ میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (۳۰۔۱۳۹) اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔
اور ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ (۹۔۴۰) کہ غم نہ کر۔

---

❶ انظر السمط ۴۹۰ والقالی ۲: ۱۷۲، ۱۷۰ وذیل الامالی ۵۵ فی مبحث "وعاء العرب" قال والجاریۃ التی رجع سمها فیها قاحرقها فهوا شد لضربتها والمیدانی ۱: ۲۷۱، ۲۰۸، ۲۸۲ والحیوان ۴: ۲۴۴ والمثل فی حل المعاجم.

میں اندوہگین ہونے سے منع نہیں کیا اس لئے کہ مغموم ہونا کسی انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔ جس سے منع کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہاں دراصل ان کاموں کے کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو غم واندوہ کا باعث بنتے ہیں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے [1] ع

(۱۰۸) مَنْ سَرَّهٗ اَنْ لَّا یَرٰی مَا یَسُوْءُهٗ
فَلَا یَتَّخِذْ شَیْئًا یُبَالِیْ لَهٗ فَقْدًا

(جسے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی چیز اسے غمگین نہ کرے تو وہ ایسی چیز حاصل نہ کرے جس کے گم ہونے کا اندیشہ ہو) نیز انسان کو دنیا کے نظام پر غور کرنا چاہیے (کہ یہاں کس طرح سلسلۂ اضداد قائم ہے) تاکہ جب اس پر اچانک کوئی مصیبت آپڑے تو اس سے زیادہ پریشان نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ انسان معمولی مصیبتیں برداشت کرنے کا عادی بن جائے تاکہ بڑے مصائب کو بھی برداشت کرسکے۔

(ح س س)

اَلْحَاسَّةُ: اس قوۃ کو کہتے ہیں جس سے عوارض حِسِّیَہ کا ادراک ہوتا ہے اس کی جمع حَوَاسٌّ ہے جس کا اطلاق مشاعر خمسہ (یعنی سمع، بصر، شم، ذوق، اور لمس) پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ:

حَسَسْتُ(ن) وَحَسِیْتُ وَأَحْسَسْتُ: محسوس کرنا اور اَحْسَسْتُ (افعال) دوطرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا (محسوس کرنا) جیسے عِنْتُهٗ وَرُعْتُهٗ۔

(۲) کسی کے حاسہ پر مارنا۔ جیسے کَبَدْتُهٗ وَفَأَدْتُهٗ اور حاسہ پر مارنے سے کبھی انسان قتل ہو جاتا ہے۔ اس لئے حَسَسْتُهٗ بمعنیٰ قَتَلْتُهٗ آجاتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ (۳۔۱۵۲) جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔

اور حَسِیْس بمعنیٰ قتیل بھی آتا ہے اور اسی سے پکی ہوئی جراد کو جَرَادٌ مَحْسُوْس کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں حَسَّ الْبَرْدُ النَّبَاتَ: پالے نے نبات کو جلا ڈالا۔ اِنْحَسَّتْ اَسْنَانُهٗ: اس کے دانت گر گئے۔ اور حَسِسْتُ (س) فَهِمتُ وَعَلِمْتُ کے ہم معنیٰ ہے مگر یہ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جو بذریعہ حواس کے معلوم ہو۔ اور حَسَیْتُ میں ایک سین کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اَحْسَسْتُهٗ کے اصل معنیٰ بھی کسی چیز کو محسوس کرنے کے ہیں اور اَحَسْتُ بھی اَحْسَسْتُ ہی ہے مگر اس میں ایک سین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ ظَلْتُ (میں ایک لام محذوف ہے) اور آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ (۳۔۵۲) جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے نافرمانی اور نیت قتل دیکھی۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس قدر برملا طور پر کفر کیا کہ عقل وفہم کی بجائے وہ ہر ایک کو محسوس ہو رہا تھا اور یہی معنیٰ آیت:

---

[1] قاله عبدالله بن طاهر وغده الثعالبی فی خاص الخاص ۱۰۶ من ظریف شعره وقبله الم تران الدهر یهدم مابنی - ویأخذ مااعطی ویفسد مااسدی.

﴿فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۲) جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے۔

میں مراد ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ (۲۰۔۹۸) کے معنٰی یہ ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی ان میں سے محسوس کر سکتے ہو۔

اَلْحَسِيْسُ وَالْحِسُّ: حرکت، آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا﴾ (۲۱۔۱۰۲) (یہاں تک کہ) اس کی آہٹ بھی تو نہیں سنیں گے۔

اَلْحَسَّاسُ: سوءِ خلق یہ زُکام وسُعال کی طرح (فعال) کے وزن پر ہے (جو بیماری یا عیب کے معنٰی کے ساتھ خاص ہے)۔

(ح س ب)

اَلْحِسَابُ کے معنٰی گننے اور شمار کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَسَبْتُ (ض) اَحْسِبُ حِسَاباً وَحُسْبَاناً قرآن پاک میں ہے:

﴿لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (۱۷۔۱۲) اور برسوں کا شمار اور حساب جان لو۔

﴿وَجَاعِلُ الَّيْلِ سَكَناً وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَاناً﴾ [1] (۶۔۹۶) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔

بعض نے کہا کہ ان کے حُسْبَان ہونے کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَاناً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۱۸۔۴۰) اور وہ تمہارے باغ پر آسمان سے آفت بھیج دے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حُسْبَاناً کے معنٰی آگ اور عذاب کے ہیں اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ حدیث [2] میں ہے (۷۷) آنحضرت ﷺ نے آندھی کے متعلق فرمایا: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهَا عَذَاباً وَّ حُسْبَاناً کہ الٰہی اسے عذاب یا حُسبان نہ بنا اور آیت کریمہ:

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَاباً شَدِيْداً﴾ (۶۵۔۸) تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا۔ میں حدیث [3] (۷۸) مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ (کہ جس سے حساب میں سختی کی گئی اسے ضرور عذاب ہوگا۔) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱۔۱) لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آپہنچا (اپنے مضمون میں) وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ کی طرح ہے اور آیت

---

[1] هی قرأة الاكثر وفی قرأة الكوفة جعل (فعل ماضی) وكلاهما قرئتان مستفيضتان (الطبری ۷: ۲۸۳ والدانی ۱۰۵ وحسبانا جمع حساب مثل شهاب وشهبان قاله الاخفش والفتح للشوكانی وايضاً ابو عبيده فی مجازه ۱: ۲۰۱ وقيل هو مصدر (الطبرسی ۷: ۱۳۸).

[2] راجع غريب ابی عبيد ۱: ۲۰۱ وابو داؤد (جنائز) والترمذی فی التفسير والمستدرك ۶: ۴۸.

[3] من حديث عائشة وفی المطبوع معذب والتصحيح من الاصول راجع للحديث ومحاورة عائشة رضی الله عنها مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فی الفتح للحافظ ۱۴: ۱۹۱۔۱۹۳ والحديث فی الفائق ۲: ۲۸۸ والنهاية واصله فی الصحيحين ۱۲.

کریمہ: ﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَه﴾ (۶۹۔۲۶) اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ﴾ (۶۹۔۲۰) مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (وکتاب) ضرور ملے گا۔ میں ''ہ'' وقف کی ہے جیسا کہ مَالِيَهْ وسُلْطَانِيَهْ میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (۱۵۔۵۱) بے شک خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿جَزَاءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا﴾ (۷۸۔۳۶) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حِسَاباً کے معنیٰ كَافِيًا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ (۵۳۔۳۹) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۲۔۲۱۲) اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔ میں بغیر حساب کی متعدد توجیہات ہوسکتی ہیں۔

(۱) استحقاق سے زیادہ عطا فرماتا ہے۔

(۲) جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور پھر اس سے واپس نہیں لیتا۔

(۳) اس قدر عطا فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اس کا احصاء ممکن نہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۰۹) عَطَايَاهُ يُحْصٰى قَبْلَ اِحْصَائِهَا الْقَطْرُ

کہ بارش کے قطروں سے بھی اس کے عطایا زیادہ ہوجاتے ہیں۔

(۴) بغیر کسی تنگی کے دیتا ہے۔ اور یہ حَاسَبْتُهٗ سے ہے جس کے معنیٰ ضَايَقْتُهٗ یعنی تنگی کرنا آتے ہیں۔

(۵) لوگوں کے عام اندازہ سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

(۶) اپنی مصلحت کے مطابق عطا فرماتا ہے کہ لوگوں کے حساب کے مطابق جیسا کہ آیت:

﴿وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ﴾ (۴۳۔۳۳) اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی ...... جماعت ہوجائیں گے تو جو لوگ خدا سے انکار کرتے ہیں۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔

(۷) مومن کو جو کچھ دیتا ہے اس پر محاسبہ نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا میں بقدر کفایت حاصل کرتا ہے اور وہ بھی جائز طریقہ سے اور حسب ضرورت اور اسی طریق سے خرچ کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے آپ پر محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے اس طرح حساب نہیں لے گا جس سے کہ اسے نقصان پہنچے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ (۷۹) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِی الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس پر محاسبہ کرتا رہے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے حساب نہیں لے گا۔ (یعنی جس سے کہ اسے نقصان پہنچے)۔

(۸) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ بدلہ عطا فرمائے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرًا﴾ (۲۔۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اسکو کئی حصے زیادہ دے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (۴۰۔۴۰) تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸۔ ۳۹) یہ ہماری بخشش ہے (چاہو) تو احسان کرویا (چاہو) تو رکھ چھوڑ دو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔

میں بغیر حساب کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ اس میں اس شخص کی طرح تصرف کرو جسے محاسبہ کا خوف نہ ہو۔ یعنیٰ (مومن کی طرح) واجب طریق سے بوقت ضرورت اور بقدر کفایت لیا کرو اور پھر اسی طریق سے خرچ کرتے رہو۔ اَلْحَسِیْبُ وَالْمُحَاسِبُ کے اصل معنیٰ حساب لینے والا یا حساب کرنے والا کے ہیں۔ پھر حساب کے مطابق بدلہ دینے والے کو بھی حَسِیْب کہا جاتا ہے۔ (اور یہی معنیٰ اللہ تعالیٰ کے حسیب ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا﴾ (۴۔۶) تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ میں حسیب بمعنیٰ رقیب ہے یعنیٰ اللہ تعالیٰ ان کی نگہبانی کے لئے کافی ہے جو ان سے محاسبہ کرے گا۔

حَسْبُ: (اسم فعل) بمعنیٰ کافی جیسے فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ (۹۔۵۹) ہمیں اللہ کافی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (۵۸۔۸) ان کو دوزخ (ہی کی سزا کافی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (۶۔۵۲) ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت:

﴿عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾ (۵۔۱۰۵) اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور آیت: ﴿وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ﴾ (۲۶:۱۱۲۔۱۱۳) مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمہ ہے۔ کے مفہوم کے مطابق ہے بعض نے آیت مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ ان کو کافی ہونا تمہارا کام نہیں ہے۔ بلکہ تیرے اور ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿عَطَآءً حِسَابًا﴾ (۷۸۔۳۶) میں حساب بمعنیٰ کافی ہے اور یہ حَسْبِیْ كَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ سے ان کے اعمال مراد ہیں یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے تجھ پر گرفت نہیں ہوگی اور اعمال کو بلحاظ مال کے حساب کہا گیا ہے۔

اِحْتَسَبَ ابْنًا لَّهٗ: یعنی اس نے اپنے بیٹے کی موت پر یہ سمجھ کر صبر کیا کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس کے عمل کو حِسْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

اور آیات:

﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ﴾ (۲۹۔۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (۲۹۔۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

(۱۴۔۴۲) اور (مومنو) مت خیال کرو کہ یہ ظالم جو عمل کر رہے ہیں خدا ان سے بے خبر ہے۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ (۱۴۔۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کرے گا۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (۲۔۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

میں سب کا مصدر اَلْحِسْبَانُ ہے اور اَلْحِسبان کے معنی یہ ہیں کہ نقیضین میں سے کسی ایک کے بارے میں اس طرح حکم لگایا جائے کہ دوسری کا دل میں خیال تک بھی نہ آنے پائے اسی کو گنتی میں لائے اور اس پر ہی انگلی کو گرہ لگائے مگر اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہو اور یہی معنی تقریباً ظن کے ہیں مگر ظن کی صورت اور پھر ایک کو دوسری پر غلبہ دے کر حکم لگایا جاتا ہے۔

(ح س د)

اَلْحَسَدُ: (ن) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔ بسا اوقات اس میں اسی مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ایک روایت میں ہے ❶ (۸۰) اَلْمُؤْمِنُ یَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۔۱۰۹) اپنے دل کی جلن سے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ (۱۱۳۔۵) اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

(ح س ر)

اَلْحَسْرُ: (ن ض) کے معنی کسی چیز کو ننگا کرنے اور اس سے پردہ اٹھانے کے ہیں کہا جاتا ہے حَسَرْتُ عَنِ الذِّرَاعِ: میں نے آستین چڑھائی اَلْحَاسِرُ: بغیر زرہ یا بغیر خود کے۔

اَلْمِحْسَرَةُ

فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَحْسِرِ: کنایہ یعنی ناقۃ حَسِیْرٌ تھکی ہوئی اور کمزور اونٹنی جس کا گوشت اور قوت زائل ہو گئی ہو اس کی جمع حَسْرٰی ہے۔

اَلْحَاسِرُ: تھکا ہوا۔ کیونکہ اس کے قویٰ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ عاجز اور درماندہ کو حَاسِرٌ بھی کہتے ہیں اور مَحْسُوْرٌ بھی۔ حَاسِرٌ تو اس تصور کے پیش نظر کہ اس نے خود اپنے قویٰ کو ننگا کر دیا اور مَحْسُوْرٌ اس تصور پر کہ درماندگی نے اس کے قویٰ کو ننگا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ﴾ (۶۷۔۴) تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

میں حَسِیْرٌ بمعنی حَاسِرٌ بھی ہو سکتا ہے اور مَحْسُوْرٌ بھی ﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (۱۷۔۳۹) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اَلْحَسْرَةُ: غم جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمان اور نادم ہونا گویا وہ جہالت اور غفلت جو اس کے ارتکاب کی باعث تھی وہ اس

---

❶ کذا ذکر الغزالی فی الاحیاء مرفوعاً قال العراقی فی تخریجه ۳: ۱۸۹ لم اجد له اصلاً مرفوعاً وانما هو من قول الفضیل بن عیاض کذا رواه ابن ابی الدنیا فی ذم الحسد راجع لمعنیٰ الحسد والغبطة النهایة تحت حدیث لاحسد فی اثنتین الخ (۱: ۳۸۳) ۱۲.

سے دور ہوگئی یا فرطِ غم سے اس کے قویٰ ننگے ہو گئے یا اس کوتاہی کے تدارک سے اسے درماندگی نے پالیا قرآن میں ہے:

﴿لِيَجْعَلَ ذَالِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (۳-۱۵٦) نیز یہ کافروں کے لئے (موجب) حسرت ہے۔

﴿يَاحَسْرَتىٰ عَلىٰ مَافَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللّٰهِ﴾ (۳۹-۵٦) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿كَذَالِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ (۲-۱٦۷) اسی طرح خدا ان کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا۔

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ﴾ (۳٦-۳۰) بندوں پر افسوس ہے۔اور فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿لاَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلاَ يَسْتَحْسِرُوْنَ﴾ (۲۱-۱۹) وہ اس کی عبادت سے نہ کنیاتے ہیں اور نہ درماندہ ہوتے ہیں۔اس میں لَا يَحْسِرُونَ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ح س م)

اَلْحَسْمُ: (ض) کے معنی کسی چیز کے نشان کو زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔قَطَعَهٗ فَحَسَمَهٗ یعنی اسے قطع کیا اور پھر اس کا نشان تک مٹا دیا۔پھر اس اعتبار سے تلوار کو حُسام کہا جاتا ہے۔

حَسْمُ الدَّاءِ: زخم کو مسلسل داغ دے کر اس کے نشان کو مٹا دینا اور جب نحوست انسان کے نشان کو مٹا ڈالے تو کہا جاتا ہے نَالَهٗ حَسُوْمٌ اور آیت کریمہ:

﴿ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا﴾ (٦۹-۷) آٹھ دن لگا تار۔میں بعض نے کہا ہے کہ ان کے گھروں کے نشانات مٹا دینے والی ریح مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نام ونشان مٹا دینے والی مراد ہے اور بعض نے ان کی عمروں کو قطع کر دینے والی مراد لی ہے اور یہ سب معانی حَسُوْمٌ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(ح س ن)

اَلْحَسَنُ: ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو حَسَنٌ کہا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وہ چیز جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔

(۲) وہ جو خواہش نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔

(۳) صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔

اَلْحَسَنَةُ: ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا اس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اس کے لئے مسرت کا سبب بنے حَسَنَةٌ کہلاتی ہے اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے اور یہ دونوں الفاظ مشترکہ کے قبیل سے ہیں اور لفظ ''حیوان'' کی طرح مختلف انواع کو شامل ہیں چنانچہ آیت کریمہ:﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ﴾ (۴-۷۸) اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے۔

میں حَسَنَة سے مراد فراخ ولی، وسعت اور کامیابی ہے اور سَيِّئَة سے قحط سالی، تنگی اور ناکامی مراد ہے اور یہی معنی آیت:

﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ﴾ (۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں، میں مراد ہیں اور آیت:﴿مَآ اَصَابَكَ

مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (۴۔۷۹) (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔
میں حَسَنَة سے ثواب اور سَيِّئَة سے عتاب مراد ہے۔

اَلْحَسَنُ وَالْحَسَنَةُ: اور اَلْحُسْنٰى: (یہ تین لفظ ہیں اوران) میں فرق یہ ہے کہ حَسَنٌ اعیان واعراض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح حَسَنَہ جب بطور صفت استعمال ہوتو دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسم ہو کر استعمال ہوتو زیادہ تر اَحْداث (احوال) میں استعمال ہوتا ہے اور حُسنٰی کا لفظ صرف احداث کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اَعْیَان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اَلْحَسَنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ حَسَنٌ حَسَّانٌ وامْرأة حَسَنَةٌ وَحَسَّانَة۔ لیکن قرآن پاک میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل وبصیرت کے رو سے اچھی ہو اور آیت کریمہ:
﴿اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ (۳۹۔۱۸) جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں، میں اَحْسَنَ سے وہ بات مراد ہے جو شک وشبہ سے دور (اور بالا) ہو، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ❶ (۸۱) اذَا شَكَكْتَ فِیْ شَيْءٍ فَدَعْ کہ جس چیز میں تجھے شبہ ہو اسے ترک دے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْناً﴾ (۲۔۸۳) اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ میں حُسن سے اچھی بات مراد ہے اسی طرح فرمایا:
﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً﴾ (۲۹۔۸)
﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ (۹۔۵۲) کہدو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (۵۔۵۰) اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟
میں اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہر حال اچھا ہے خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے تو پھر "لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" کی تخصیص کیوں کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ظہور حسن کا قصد اور اس پر مطلع ہونا مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حکم الٰہی کا حسن اسی شخص کے سامنے ظاہر ہوگا۔ جو پاکیزہ نفس ہو اور حکمت الٰہی پر اس کی نظر ہو ورنہ جہال پر تو یہ راز منکشف نہیں ہوسکتا۔

اَلْاِحْسَانُ: (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا، کہا جاتا ہے: اَحْسَنَ اِلٰى فُلان اس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی معنٰی میں امیر المؤمنین نے فرمایا ❷ (۸۲)

---

❶ ولم اجده بهذا اللفظ وحديث دع ما يريبك معروف وسياتى فى (ريب) واورده الغزالى فى الاحياء ۹۵ وقد عقده الشافعى مع ثلاثة: احراتق الشبهات وازهد ودع ماليس يعنيك واعملن بالنية (العاهر ۲: ۸).

❷ انظر فى ادب الدنيا والدين للماوردى قال الشارح معناه اى ابناه ما ينسبون اليه من العلوم والصنائع فيقال مثلاً فلان العالم وفلان المجاهد وفى معناه قول عائشة راجع المحاضرات للمؤلف ۳: ۳۱.

اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَا یُحْسِنُوْنَ: یعنی لوگ اپنے علم وفضل اور اعمال حسنہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (۳۲۔۷) جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا۔

اِحسان انعام سے اعم ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ﴾ (۱۷۔۷) اگر تم نیکوکاری کرو گے تو اپنی جان کے لئے کرو گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (۱۶۔۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل وانصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے اسی بنا پر فرمایا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔

اور فرمایا:

﴿وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے (قرار داد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبہا) کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۲۹۔۶۹) اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۲۔۱۹۵) بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

﴿مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ﴾ (۹۔۹۱) نیکوکاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ﴾ (۳۹۔۱۰) جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

(ح ش ر)

اَلْحَشْرُ: (ن) کے معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانہ سے مجبور کر کے نکال کر لڑائی وغیرہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔[1] (۸۳) اَلنِّسَآءُ لَا یُحْشَرْنَ کہ عورتوں کو جنگ کے لئے نہ نکالا جائے اور یہ انسان اور غیر انسان سب کے لئے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ حَشَرَتِ السَّنَةُ مَالَ بَنِیْ فُلَانٍ: یعنی قحط سالی نے مال کو ان سے زائل کر دیا اور حَشْرٌ کا لفظ صرف جماعت کے متعلق بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۳۶) اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔

﴿وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً﴾ (۳۸۔۲۹) اور پرندوں کو بھی کہ جمع رہتے تھے۔

﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ (۸۱۔۱۹) اور جب وحشی جانور اکٹھے ہوجائیں گے۔

---

[1] راجع للحدیث النهایة ۱: ۳۸۹ وفیه: لایعشرن ولایحشرن ۱۲.

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوا لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ (۵۹۔۲) حشر اول کے وقت تمہارے خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ نکل جائیں گے۔

﴿وَحُشِرَ لِسُلَیْمَانَ جُنُوْدُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے اور قسم وار کئے جاتے تھے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً﴾ (۴۶۔۱۶) اور جب لوگ جمع کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔

﴿فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا﴾ (۴۔۱۷۲) تو خدا سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

﴿وَحَشَرْنٰھُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْھُمْ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۴۷) اور ان لوگوں کو ہم جمع کرلیں گے۔ تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور قیامت کے دن کو یَوْمَ الْحَشْرِ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے یَوْمَ الْبَعْثِ اور یَوْمَ النُّشُوْر کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔

رَجُلٌ حَشْرُ الْاُذُنَیْنِ لطیف اور باریک کانوں والا۔

(ح ص ص)

﴿حَصْحَصَ الْحَقُّ﴾ (۱۲۔۵۱) کے معنیٰ حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی اب اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ واضح ہو کر سامنے آگئی اور حَصَّ وَحَصْحَصَ (ثلاثی ورباعی) دونوں طرح آتا ہے۔ جیسے کَفَّ وَکَفْکَفَ وکَبَّ وَکَبْکَبَ۔ حَصَّہٗ (ن) کسی چیز سے ایک حصہ کاٹ لینا۔ یہ کاٹنا خواہ حقیقی طور پر ہو یا حکمی طور پر حقیقی کی مثال جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] ع (سریع)

(۱۱۹) قَدْ حَصَّتِ الْبَیْضَۃُ رَأْسِیْ

یعنی مسلسل خود پہنے رہنے کی وجہ سے میرے سر کے بال جھڑ گئے۔

اسی سے رَجُلٌ اَحَصُّ کا محاورہ ہے (یعنی مرد موئے رفتہ ازسر) مؤنث حَصَّاءُ رَجُلٌ اَحَصُّ: منحوس مرد، جو اپنی نحوست کی وجہ سے لوگوں سے خیرات کو قطع کردے۔

اَلْحَصَّۃُ کے معنیٰ کل میں سے ایک ٹکڑہ کے ہیں اور بمعنیٰ بہرہ یعنی نصیب کے استعمال ہوتا ہے۔

(ح ص د)

اَلْحَصَدُ وَالْحَصَادُ کے معنیٰ کھیتی کاٹنے کے ہیں یہ زَمَنَ الْحَصَادِ وَالْحِصَادِ یہ (زَمَنَ الْجَدَادِ وَالْجِدَاد کی طرح (بکسرہ حاوفتحہا) دونوں طرح آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ (۶-۱۴۱) اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔

میں وہ کھیتی مراد ہے جو اس کے صحیح وقت میں کاٹی

---

[1] قالہ اخو الاوس ابو القیس بن الاسلت وتمامہ ....فما ...... اطعم نوماً غیر تھجاع وفی روایۃ الضبی غمضاً بدل نوماً والبیت من کلمۃ مفضلیۃ ۲ : ۸٤ بیتاً جمھریۃ ۲۳٤ ـ ۲۳٦ بتقدم وتاخر والبیت فی اللسان والصحاح والتاج والمحکم (حصص والموشح ۲٤٦ والکامل ۱۵۵ وابن اثیر ۱ : ۲۸٤ والاغانی والخزانہ ۲ : ٤۸ـ۵۳٤ والتنبیہ للبکری والکنز اللغوی ۱۷۷ والمرزوقی ۱ : ۱۰٦ والجمحی ۸۸ والحماسۃ للبحتری ۳٤ وشواھد الکشاف ۷٦ ومحاضرات المولف ۳ : ۱٦٦ ، ۳۳۵ والحیوان للجاحظ ٦ : ٤۱۹ وایام العرب ۸۲ .

گئی ہو۔ ❶ مگر آیت۔

﴿حَتّٰی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَآ اَتٰهَا اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ﴾ (۱۰۔۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ میں حَصِیْد سے مراد وہ کھیتی ہے جو بیوقت افساد اور تباہی کی غرض سے کاٹی گئی ہو۔ اور اسی سے حَصَدَ هُمُ السَّیْفُ کا استعارہ ہے یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِیْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض کا تہس نہس ہوگیا۔

میں حَصِیْد سے تباہ و برباد کی ہوئی بستیاں مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور حَبَّ الْحَصِیْد سے مراد اناج ہے اور حدیث میں ہے ❷ (۸٤) وَهَلْ یَكُبُّ النَّاسَ عَلٰی مَنَاخِرِهِمْ فِی النَّارِ اِلَّا حَصَآئِدُ اَلْسِنَتِهِمْ: لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ صرف وہی گرائے گا جو ان کی زبانوں نے کاٹا ہوگا۔

یہاں زبان کے ساتھ حصائد کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حَبْلٌ مَّحْصُوْدٌ (رسن محکم تافتہ)

وَدِرْعٌ حَصْدَاءُ: (زرہ تنگ حلقہ و محکم تافتہ) وَ شَجَرَةٌ حَصْدَاءُ: (درخت بسیار برگ) کے محاورات ہیں۔

تَحَصَّدَ الْقَوْمُ: لوگوں کا جمع ہو کر ایک دوسرے سے قوت حاصل کرنا۔

(ح ص ر)

اَلْحَصْرُ: (ن) کے معنیٰ تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاحْصُرُوْهُمْ﴾ (۹۔۵) اور گھیر لو یعنی انہیں تنگ کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا﴾ (۱۷۔۸) اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے۔ میں حَصِیْرٌ کے معنیٰ مہاد یعنی بچھونے کے ہیں گویا ان کے نزدیک اس سے حصیر مرمول یعنی چٹائی مراد ہے اور چٹائی کو حصیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں، اور لبید کے شعر ❸ ع (الکامل)

(۱۱۰) وَمَعَالِمِ غُلْبِ الرِّقَابِ كَاَنَّهُمْ
جِنٌّ لَدٰی بَابِ الْحَصِیْرِ قِیَامٌ

---

❶ وفی المطبوع المحمود مصحف والصواب المحصود ۱۲۔

❷ اخرجه الترمذی وصححه وابن ماجة والمحکم من حدیث معاذ بن جبل وقال صحیح علی شرط الشیخین راجع تخریج الاحیاء العلوم للغزالی ۳: ۱۰۹۔

❸ وفی روایة قماقم بدل ومقامة وهی جمع قماقم بضمة القاف ومعناه الرئیس الجواد والبیت فی الطبری ۱۵: ٤٥ والسمط ۹۵۵ فی ثلاثة ابیات والامالی ۲: ۳۰۸ والقرطبی ۱۰: ۲۲٤ والصحاح واللسان والتاج حصر ومجاز القران ۱: ۳۷۱ رقم ٤۳۳ والبحر ٦: ۱۱، ٦۰ وفی روایة الدیوان ۲: ۳۹ طرف الحصیر بدل باب الحصیر قال فی الصحاح وهذه روایة غیر ابی عبیدة وفی المطبوع (مصر وکراتشی) ومعالم وهذا تصحیف فی قماقم ۱۲۔

اور بہت سے موٹی گردنوں والے بہادر ہیں جو بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے جنات معلوم ہوتے ہیں ۔ میں حصیر کے معنیٰ بادشاہ کے ہیں اور بادشاہ کو حصیر یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ محصور رہتا ہے جیسا کہ اسے مُحَجَّبٌ کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ جسے چاہے اسے اپنے پاس آنے سے روک سکتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (۲۔۳۹) اور سردار ہوں گے ۔ اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے ۔ میں حصورًا کے معنیٰ عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو خواہ عفت اور ازالۂ شہوت میں مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر ۔ مگر یہاں دوسرے معنیٰ زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (یحییٰ علیہ السلام) کے لئے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے ۔

اَلْحَصْرُ وَالْاِحْصَارُ: دونوں کے معنیٰ حج سے روک دینے کے ہیں ۔ مگر احصار (ظاہری اور باطنی) دونوں قسم کی رکاوٹ کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے دشمن کا آڑے آ کر روک دینا یا مرض وغیرہ کی وجہ سے رک جانا مگر جب وہ رکاوٹ باطنی اسباب جیسے مرض وغیرہ کی بنا پر ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی بولا جاتا ہے ۔ پس آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۲) اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو کر (کردو) میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں اسی طرح آیت: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۷۳) ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رک کے بیٹھے ہیں ۔ میں بھی احصار کے عام معنیٰ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ﴾ (۴۔۹۰) یا اس حال میں کہ ان کے دل .... رک گئے ہوں تمہارے پاس آ جائیں ۔

میں بخل بزدلی وغیرہ کی وجہ سے سینوں کا تنگ ہونا مراد ہے اور ان کو حصر کے ساتھ تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ ان معانی کو ضیق الصدر کے لفظ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور ان کے اضداد (جود و شجاعت وغیرہ پر) اَلْبِرُّ اور اَلسَّعَةُ کا لفظ بولا جاتا ہے ۔

(ح ص ن)

اَلْحِصْنُ: (قلعہ) اس کی جمع حُصُوْنٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۵۹۔۲) کہ ان کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب) سے بچالیں گے ۔

اور آیت کریمہ: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ﴾ (۵۹۔۱۴) یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے (بالمواجھہ) نہیں لڑ سکیں گے ۔ مگر بستیوں کے قلعوں میں ۔

میں مُحَصَّنَة سے مراد وہ بستیاں ہیں جو قلعوں کی طرح محفوظ اور محکم بنائی گئی ہوں ۔

تَحَصَّنَ کے اصل معنیٰ تو قلعہ کو مسکن بنا لینے کے ہیں مگر مجازاً ہر قسم کا بچاؤ حاصل کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ اسی سے دِرْعٌ حَصِيْنَةٌ (زرہ محکم) اور فَرَسٌ حِصَانٌ (اسپ نرونجیب) کا محاورہ ہے ۔ کیونکہ زرہ بدن کے لئے

اور گھوڑا اپنے سوار کے لئے ایک طرح سے بمنزلہ قلعہ کے ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ ع (الکامل)

(۱۱۱) اِنَّ الْحُصُوْنَ الْخَيْلُ لَا مُدْنَ الْقُرىٰ

کہ حقیقی قلعے تو نجیب گھوڑے ہیں نہ کہ شہر اور قصبے اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۸) صرف وہی تھوڑا (سارہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔ میں تُحْصِنُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ قلعے جیسی محفوظ جگہوں میں حفاظت سے رکھ چھوڑو۔ کہا جاتا ہے۔

اِمْرَءَةٌ حَصَانٌ وَحَاصِنٌ: (عفیفہ عورت) حَصَانٌ کی جمع حُصُنٌ اور حَاصِنٌ کی جمع حَوَاصِنٌ آتی ہے اور حَصَانٌ کے معنیٰ پاکدامن یا معزز عورت کے ہوتے ہیں ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَةَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (۱۲:۲۶) اور (دوسری) عمران کی بیٹی مریم کی جنہوں نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

اَحْصَنَتْ وَحَصَّنَتْ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔

﴿فَاِذَا اُحْصِنَّ﴾ (۴۔۱۲۵) یعنی جب نکاح کر لیں اور اُحْصِنَّ (مجہول) ہو تو نکاح کر دی جائیں۔

اَلْحِصَان کے معنیٰ مُحصنَة عورت کے ہیں خواہ وہ اِحْصَان پاک دامنی کی وجہ سے ہو یا کسی کے ساتھ نکاح کر لینے کی وجہ سے اور یا اپنے شرف اور حریت کی وجہ سے محفوظ ہو اور عورت کو مُحْصِنٌ (بصیغہ فاعل) بھی کہا جاتا ہے اور مُحْصَن (بصیغہ مفعول) بھی اول یعنی صیغہ فاعل اس تصور کی بنا پر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہے اور اسم مفعول دوسرے کی جانب سے حفاظت کی وجہ سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ .... فَاِذَا اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۴۔۲۵۔) اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کردو۔ بشرطیکہ عفیفہ ہوں نہ ایسی کھلم کھلا بدکاری کریں .... پھر اگر نکاح میں آ کر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) کے لئے ہے اس کی آدھی ان کو دی جائے۔

میں اول مُحْصَنات سے شوہر والی عورتیں مراد ہیں گویا خاوند ان کی حفاظت کرتے ہیں اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی مُحصنات کا لفظ آیا ہے وہاں فتحہ اور کسرہ دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے لیکن جہاں حُرِّمَت کے بعد آیا ہے وہاں صرف فتحہ صاد کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا کیونکہ شوہر دار عورتوں کے ساتھ ہی نکاح حرام ہے نہ کہ عفیفہ کے ساتھ۔

---

❶ العجز للاشعر بن حمران الجعفی قاله بعد مااخذ ثار ابیه واتخذ الخیل یذکر فضلها واوله : ولقد علمت علی توقی الردی ...... وفی روایة الاصمعی علی تجنب الردیٰ راجع اللسان (حصن) والبیت من شواهد الکشاف ۴۷ وفی المطبوع مون القری والتسدید من المراجع والبیت من کلمة اصمعیة فی الوحشیات رقم ۵۸ فی ۳۵ بیتاً والطبری ۱۲ : ۲۴ والمحاضرات للمولف ۴ : ۴۳۶) والحیوان للجاحظ ۱ : ۳۴۶ وکتاب الخیل لمعمر بن المثنیٰ فی ثمانیة ابیات وکتاب العرب للقتبی ۳۴۹ ضمن رسائل البلغاء (صنعة کردعلی).

❷ وقال حسان فی عائشة رضی الله عنها حصان رزان تزن بریبة وتصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل ۱۲.

(ح ص ل)

اَلتَّحْصِیل: (تفعیل) کے معنیٰ چھلکے سے گودہ اور مغز نکالنے کے ہیں۔مثلاً معدن کے پتھروں سے سونا نکالنا یا بھوسے اور گندم کے دانوں کو الگ الگ کرنا پس آیت کریمہ: ﴿وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُورِ﴾ (۱۰۰۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو بھید سینوں میں ہیں وہ اس طرح نکال کر جمع کر دیئے جائیں گے جس طرح کہ چھلکے سے مغز الگ کرلیا جاتا ہے۔یا جیسے حساب کا حاصل ظاہر کیا جاتا ہے اور حُثَالَةٌ (یعنی چھان وغیرہ) کو حصیل کہا جاتا ہے۔

حَصلَ الْفَرَسُ گھوڑے کا حُثالہ وغیرہ کھانے کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہونا اور پرند کے پوٹے یا سنگدانے کو حَوْصَلَةُ الطَّیر کہا جاتا ہے۔

(ح ص ی)

اَلْاِحْصَاءُ: (افعال) کے معنیٰ عدد کو حاصل کرنا، کہا جاتا ہے اَحْصَیتُ کَذَا: میں نے اسے شمار کیا۔ اصل میں یہ لفظ حَصَی (کنکریوں) سے مشتق ہے اور اس سے گننے کا معنیٰ اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب لوگ گنتی میں کنکریوں پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم انگلیوں پر کرتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا﴾ (۷۲۔۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گن کر رکھا ہے۔اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ایک حدیث میں ہے[1] (۸۵) مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ جو شخص ان (اسمائے حسنیٰ) کا احصاء کرلے گا (یعنی یاد کرلے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا[2]: (۸۶) نَفْسٌ تُنْجِیْهَا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ اِمَارَةٍ لَّا تُحْصِیْهَا کہ ایک جان کو ہلاکت سے بچالینا اس امارت سے بہتر ہے جسے تم نباہ نہ سکو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ (۷۳۔۲۰) اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ ایک اور روایت میں ہے[3] (۸۷) اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ سیدھے رہو اور تم پوری طرح استقامت حاصل نہیں کرسکو گے۔

استقامت کے احصاء اور تحصیل کے متعذر اور مشکل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق صرف ایک ہے اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بلکہ حق کی مثال بنسبت باطل کے دائرہ کے اجزاء ہیں ایک نقطہ کی ہے یا کسی ہدف میں نشانہ لگانے کی جگہ کی ہے۔اس لئے اسے حاصل کرنا نہایت کٹھن کام ہے اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ

---

[1] الحدیث متفق علیه والترمذی عن ابی هریرة وابن عساکر عن عمر وایضاً ابن مردویه وابو الشیخ معاً فی التفسیر وابو نعیم فی الاسماء الحسنیٰ راجع کنزالعمال رقم ۱۹۳٤۔۱۹٤۰.

[2] ذکره الغزالی فی الاحیاء فی محادثة عبدالرحمن بن عمرو مع ابی جعفر المنصور فقال قد سال جدك العباس النبی صلی الله علیه وسلم امارة مکه والطائف فقال النبی صلی الله علیه وسلم یاعباس یاعم النبی .... اخرجه ابن ابی الدنیا هکذا معضلا بغیر اسناد رواه البیهقی من حدیث جابر متصلاً من روایة المنکدر مرسلاً وقال هذا هوالمحفوظ مرسلاً راجع تخریج العراقی ۲ : ۳۵۰ وادب الدنیا للماوردی بشرح خان زاده ۳۸۲ وفی العقد ۱ : ۲٤ تحییها وولایة بدل امارة ٤ : ۱۳۰ فی خطبة لعبدالله بن مسعود .

[3] الحدیث فی ابن ماجة والحاکم والدارمی والطبری فی الصغیر ۲۱۰ والبزار عن ثوبان وفی بعض طرقه انقطاع الکافی ۹۵ والنهایة ۱ : ۲۳٤۔۲۳۵ واللسان (قوم) والفتح الکبیر ۱ : ۱۸۱ وابن قتیبه فی غریبه ۳۸۹ وفی کنزالعمال باستیعابه ۳ : ۳٤٦ وایضاً تخریج الکشاف للحافظ ۲۵۹.

نے فرمایا[1]: (۸۸) مجھے سورہ ہود اور اس کی مثل دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا تو صحابہ نے عرض کی کہ ان میں کونسی آیت ہے جس نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) ہے۔یعنی جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق پوری استقامت سے رہو۔

اہل لغت نے یہاں لَنْ تُحْصُوْا کے معنیٰ لاَ تُحْصُوْا ثَوَابَهٗ کئے ہیں۔یعنی تم اس ثواب کو شمار میں نہیں لاسکو گے۔

(ح ض ض)

اَلْحَضُّ: (ن) کے معنیٰ حَثٌّ کی طرح کسی کام پر ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے ہیں۔مگر حَثٌّ کا لفظ سواری وغیرہ کو تیز چلانے کے لئے آتا ہے۔اور حَضٌّ کا لفظ سواری ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اصل میں حَضٌّ کے معنیٰ جانور کو الحضیض یعنی نشیب زمین کی طرف ہانکنے کے ہیں (پھر ابھارنے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلاَ يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (۶۹۔۳۴) (۱۰۷۔۳)[2] اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

(ح ض ب)

اَلْحَضْبُ: کے معنیٰ ایندھن کے ہیں اور آگ کریدنے کی لکڑی کو مِحْضَبٌ کہا جاتا ہے اور ﴿حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۱۔۹۸) میں ایک قرأت حَضَبُ جَهَنَّمَ (دوزخ کا ایندھن) بھی ہے۔

(ح ض ر)

اَلْحَضَرُ: یہ البدو کی ضد ہے اور اَلْحِضَارَةُ حاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ بَدَاوة وبِداوة اس کے اصل شہر میں اقامت کے ہیں۔ پھر کسی جگہ پر یا انسان وغیرہ کے پاس موجود ہونے پر حَضَارَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲۔۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾ (۴۔۸) اور جب تم میراث کی تقسیم کے وقت...... آموجود ہوں۔

﴿وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبائع میں بخل ودیعت کر دیا گیا ہے۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ﴾ (۸۱۔۱۴) تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُونِ﴾ (۲۳۔۹۸) میں کنایہ ہے کہ اے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں کہ جن و شیاطین میرے پاس آحاضر ہوں۔

---

[1] الحديث باختلاف الفاظه في الترمذي والدارقطني والدلائل للبيهقي وابن سعد في الطبقات وابن عدي في الكامل راجع ايضاً في ۵۴۷)۱۲.

[2] وفي التنزيل: ولاتحاضون على طعام المسكين (۸۹۔۱۸)

اور بطور کنایہ مجنون اور قریب المرگ شخص کو مُحْتَضَرٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ آیت:﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور آیت کریمہ:﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ﴾ میں اس معنیٰ پر متنبہ کیا گیا ہے اور آیت کریمہ:﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا﴾ (۳۔۳۰) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان جو نیکی بھی کرے گا۔

قیامت کے دن اس کا اس طرح مشاہدہ اور معاینہ کرلے گا جیسا کہ کوئی شخص سامنے آموجود ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾ (۷۔۱۶۳) اور ان سے اس گاؤں کا حال پوچھو جو لب دریا پر واقع تھا۔میں حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کے معنیٰ دریا کے قریب (یعنی ساحل کے ہیں) اور آیت کریمہ:﴿تِجَارَةً حَاضِرَةً﴾ (۲۔۲۸۲) میں حَاضِرَةً کے معنیٰ نقد کے ہیں نیز فرمایا:﴿وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ (۳۶۔۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔

﴿فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۶) وہ عذاب میں ڈالے جائیں گے۔اور آیت کریمہ:﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ (۵۴۔۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔میں پانی کی باری کے محتضر ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ باری والے اس گھاٹ پر موجود ہوں۔

اَلْحُضْرُ: خاص کر گھوڑے کی تیز دوڑ کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے:اَحْضَرَ الْفَرَسُ: گھوڑا تیز دوڑا۔اِسْتَحْضَرْتُ الْفَرَسَ: میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔حَاضَرْتُهٗ مُحَاضَرَةً وَحِضَارًا: باہم جھگڑنا،مباحثہ کرنا۔یہ یا تو حضُور سے ہے گویا ہر فریق اپنی دلیل حاضر کرتا ہے اور یا حُضر سے ہے جس کے معنیٰ تیز دوڑ کے ہوتے ہیں جیسا کہ......... جَارَيْتُهٗ کہا جاتا ہے۔

اَلْحَضِيْرَةُ: لوگوں کی جماعت جو جنگ میں حاضر کی جائے اور کبھی اس سے پانی پر حاضر ہونے والے لوگ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔اَلْمَحْضَرُ (اسم مکان) حاضر ہونے کی جگہ اور حَضَرْتُ (فعل) کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔

(ح ط ط)

اَلْحَطُّ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔کہا جاتا ہے:حَطَطْتُ الرَّحْلَ (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جَارِيَةٌ مَحْطُوطَةُ الْمَتْنِ (دختر پست شکم کہ پشت وی دراز وہموار باشد) اور آیت کریمہ:﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ (۲۔۵۸) اور حطۃ کہنا۔میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنیٰ ہیں "اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے" [1] بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنیٰ قُوْلُوْا صَوَابًا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

(ح ط ب)

اَلْحَطَبُ: (ایندھن) ہر وہ چیز جو آگ جلانے کے لئے تیار کی جائے۔حَطَبٌ کہلاتی ہے۔اور حَطَبَ (ض) حَطْبًا وَاحْتَطَبَ کے معنیٰ ایندھن جمع کرنا کے

---

[1] وهي مصدر من حطّ عنا ذنوبنا رفع حكاية (راجع الطبرى ۱: ۲۳۰) ومجاز ابى عبيدة ۱: ۴۱ وفتح البارى ۸: ۲۲۹)۱۲.

ہیں۔قرآن میں ہے: ﴿فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَباً﴾ (۷۲۔۱۵) تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔
اپنی گفتگو میں رطب ویابس ملانے والے کو حَاطِبُ لَيْلٍ کہا جاتا ہے کیونکہ رات کو لکڑی جمع کرنے والا بھی یہ نہیں دیکھتا ہے کہ رسی میں کیا باندھ رہا ہے۔
حطَبْتُ لِفُلَان حَطَباً: کسی کے لئے کام کرنا۔
مَكَانٌ حَطِيْبٌ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں۔ (صفت از حَطَبَ الْمَكَانُ)
نَاقَةٌ مُحَاطِبَةٌ (ناقہ کہ خار خشک خورد)
اور آیت کریمہ: ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (۱۱۱۔۴) جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔
میں سخن چینی سے استعارہ ہے اور حَطَبَ فُلَانٌ بِفُلَان کے معنیٰ کسی کی چغلی کھانا کے ہیں۔اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ يُوْقِدُ بِالْحَطَبِ الْجَزْلِ (مثل) فلاں بہت بڑا چغلی خور ہے۔

(ح ط م)

اَلْحَطْم: کے اصل معنیٰ کسی چیز کو توڑنے کے ہیں جیسا کہ اَلْهَشِيْم وغیرہ الفاظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔پھر کسی کو ریزہ ریزہ کردینے اور روندنے پر حَطْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهُ﴾ (۲۷۔۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان (علیہ السلام) اور اس کا لشکر تم کو کچل ڈالیں۔
کہا جاتا ہے کہ حَطَمْتُهُ فَانْحَطَمَ (میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ چیز ٹوٹ گئی)
سَائِقٌ حُطَمٌ: بے رحم چرواہا۔جو اونٹوں کو سخت ہنکا کر ان پر ظلم کرے ❶ اور دوزخ کو حُطَمَة کہا گیا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةِ﴾ (۱۰۴۔۴،۵) حطمہ میں............اور تم کیا سمجھے کہ حُطمه کیا ہے۔
اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ کھانے والے کو بھی حُطَمَةٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے پیٹ کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی ہے ❷ ع ( )
( ) كَأَنَّمَا فِيْ جَوْفِهِ تَنُّوْرٌ
گویا اس کے پیٹ میں تنور ہے۔
دِرْعٌ حُطَمِيَّةٌ: زرہ بننے والے یا استعمال کرنے والے کی طرف منسوب ہے اور حَطِيم وَزَمْزَم (حرم میں) دو جگہوں کے نام ہیں۔
اَلْحُطَام: جو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَاماً﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ زرد (ہوگئی ہے) پھر اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔

(ح ظ ظ)

اَلْحَظُّ کے معنیٰ معین حصہ کے ہیں کہا جاتا ہے کہ حَظِظَ وَاَحَظَّ فَهُوَ مَحْظُوْظٌ۔
حَظٌّ کی جمع اَحَاظٍ وَاَحُظٌّ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهِ﴾ (۵۔۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ

❶ ومنه الحديث شر الرعاء الحطمة وفي رواية بغيرهاء (النهاية.

❷ لم اجده.

فراموش کردیا۔

﴿لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ (۴۔۱۱) کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔

(ح ظ ر)

اَلْحَظْرُ: (ن) کے معنی کسی چیز کو حَظِیْرَۃ یعنی احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو مَحْظُور کہا جاتا ہے۔ اَلْمُحْتَظِر: باڑہ بنانے والا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿فَکَانُوا کَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۴۔۳۱) تو وہ ایسے ہوگئے جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْحَظِرِ الرَّطْب (مثل) یعنی اس نے بہت قبیح جھوٹ بولا۔

(ح ف ف)

اَلْحَفُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو حافتین یعنی دونوں جانب سے گھیرنے یا احاطہ کر لینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ﴾ (۱۸۔۳۲) اور ان کے گردا گرد کھجوروں کے درخت لگا دیئے تھے۔

﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِکَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ (۳۹۔۷۵) اور تم فرشتوں کو دیکھوگے کہ عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔یعنی اس کے دونوں جانب کو گھیرے ہوئے ہیں ایک حدیث میں ہے [1] (۸۹) تَحُفُّهُ الْمَلَآئِکَةُ بِاَجْنِحَتِهَا: اس کو فرشتے اس پر اپنے پروں کے ساتھ گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [2] ع (طویل)

(۱۱۳) لَهٗ لَحَظَاتٌ فِیْ حَفَا فِیْ سَرِیْرِهٖ

اس کی نظریں اس کے تخت کے دونوں جانب لگی رہتی ہیں۔

حَفَافٌ کی جمع اَحِفَّةٌ ہے۔کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ فِی حَفَفٍ مِّنَ الْعَیْشِ یعنی تنگ حال ہے [3] گویا وہ خوشحالی سے ایک جانب میں ہے۔اس کے برعکس خوشحالی کے لئے کہا جاتا ہے۔هُوَفِیْ وَّاسِطَةٍ مِّنَ الْعَیْشِ اسی سے محاورہ ہے [4] (مثل)

مَنْ حَفَّنَا اَوْرَفَّنَا فَلْیَقْتَصِدْ: یعنی جو شخص ہماری تعریف کرے اسے چاہیے کہ میانہ روی سے کام لے (نہایہ)

حَفِیْفُ الشَّجَرِ وَالْجَنَاحِ: درخت کے ہلنے پر پرند کے پروں کی سرسراہٹ۔یہ حکایت صوت ہے۔

اَلْمُحَفُّ: شاہنہ بافندہ وتیغ آں (کیونکہ اس سے حرکت

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظه فی فضیلة مجلس الذکر عن ابی هریرة وغیره رواه مسلم والغزالی فی الاحیاء العلوم راجع تخریج العراقی ۱ : ۳۰۲ ونهایة ابن الاثیر ۱ : ۴۰۸.

[2] قاله ابراهیم بن هرمة فی مدح المنصور واجازه به عشرة الاف کمافی ذیل الامالی (۴۰) وتمامه .... اذاکرها فیها عقاب ونائل ۔راجع للبیت الحیوان ۳ : ۱۳۴ والاغانی ۶ : ۱۰۹ وعیون الاخبار ۱ : ۲۹۴ وفی روایتهم جمیعاً عن حفافی وفی العقد ۴ : ۳۲۹ عن خفاء سریره وفی العمدة ۲ : ۱۰۹عن حفافی وفی الحصری ۲ : ۲۶۲ من بدل عن وفی العقد ۱ : ۳۷۰ عذاب بدل عقاب وبعده :فام الذی امنت آمنة الردیٰ .... وام الذی اوعدت بالثکل ثاکل وفی روایة حاولت والبیت فی البحر (۷ : ۴۲۷) من غیر عزو.

[3] ومنه الحدیث انه علیه السلام لم یشبع من الطعام الاعلی حفف ای ضیق وقلة (نهایة ۱ : ۴۰۸).

[4] مثل وفی روایة فلیترك راجع للمثل المیدانی ۲ : ۱۷۶، ۲۲۱، ۲۳۷ والعسکری ۱۸۴، ۲ : ۱۹۱ وشرح الدرة للخفاجی ۸۳.

کے وقت آواز آتی ہے۔)

(ح ف د)

اَلْحَافِد: ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو تبرعا تیزی کے ساتھ خدمت بجالائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ اسی کی جمع حَفَدَۃٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶۔۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

مفسرین کا قول ہے کہ یہاں حَفَدَۃٌ سے مراد اَسْبَاط یعنی پوتے، نواسے وغیرہم ہیں۔ کیونکہ ان کی خدمت زیادہ سچی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الکامل)

(۱۱۴) حَفَدَ الْوَلَائِدُ بَيْنَهُنَّ

فُلَانٌ مَحْفُوْدٌ فلاں مخدوم ہے۔

الغرض حَفَدَۃٌ کا اطلاق سسر اور اولاد دونوں طرف کے رشتہ داروں پر ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے [2] اِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ: ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔

سَيْفٌ مُحْتَفِدٌ: قاطع تلوار۔

اصمعی کہتے ہیں کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔

(ح ف ر)

اَلْحَفْرُ: وہ مٹی جو گڑھے سے نکالی جاتی ہے (یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔

اَلْحُفْرَۃُ وَالْحَفِيْرُ: گڑھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰۲) اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اَلْمَحْفَارُ وَالْمِحْفَرُ وَالْمِحْفَرَۃُ: بیلچہ وغیرہ جس سے گڑھا کھودا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کو حَافِرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوڑتے وقت اپنے سم سے مٹی اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَئِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ (۷۹۔۱۰) کیا ہم الٹے پاؤں پھر لوٹیں گے؟

میں مَرْدُوْدٌ فِی الْحَافِرَۃِ ۔ ایک مثل ہے اور یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو جدھر سے آئے اسی طرف لوٹا دیا جائے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَافِرَۃ سے مراد وہ زمین ہے جس میں ان کی قبریں بنائی گئی تھیں اور حَافِرَۃٌ یہاں موضع حال میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اس حال میں کہ قبروں میں ہوں گے۔ محاورہ ہے۔ رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ اَوْ رَجع الشَّيْخُ اِلٰى حَافِرَتِه: یعنی بوڑھا ہوگیا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۰۔۷۰)

---

[1] تکملۃ البیت .... واسلمت باکفھن ازمۃ الاجمال البیت من شواھد ابی عبیدۃ فی مجاز ہ ۱ : ۳۶۴ ونسبہ لجمیل بن عبداللہ العزری والبیت فی الطبری ۱۴ : ۱۴۴۔۱۴۶) واللسان والتاج (حفد) والانصاف ۹۷) والبحر المحیط ۵ : ۵۰) بغیر عزو و الجمھرۃ ۲ : ۱۲۳ والقرطبی ۱۰ : ۱۴۳ ونسبہ ابن دریدالی الفرزدق ومسائل نافع بن الازرق (ترتیب فوائد عبدالباقی) قال مرتبہ ولادری کیف اضبطہ و جمیل ھو جمیل بن عبداللہ الحارثی العذری من شعراء الدولۃ الامویۃ لہ ترجمۃ فی الشعراء والانمانی (۷ : ۷۲) والخزانۃ (۱ : ۹) وغریب ابی عبید۳ / ۳۷۴ ونسبہ الی الاخطل ولیس فی دیوانہ ۱۲۔ [2] کلمۃ من دعاء القنوت فی الوتر راجع غریب القران للقتبی ۲۴۷ واللسان (حفد) والطبری ج ۱۴ ومنعہ ولتخریجہ فی (قنت) وھناك الموعدان شاء اللہ .

آیا ہے۔

اور جو چیز نقد فروخت کی جائے اس کے متعلق عرب لوگ کہتے ہیں ❶ (مثل) اَلنَّقْدُ عِندالْحَافِرَة ۔ اور اصل میں یہ گھوڑے کی بیع کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے: لَا یَزُوْلُ حَافِرُہٗ اَوْیُنْقَدُ ثَمَنُہٗ کہ اس کا سم یہاں سے جدا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی قیمت نقد ادا نہ کی جائے۔

اَلْحَفَرُ تَأْکُلُ الْاَسْنَانَ دانتوں کی زردی ان کو کھا جاتی ہے۔

حُفِرَ فُوْہٗ حَفْراً: اس کے دانت خراب ہوگئے اَحْفَرَ الْمُھْرُ: بچھڑے کے ثنائی یا رباعی دانت گر گئے۔

(ح ف ظ)

اَلْحِفْظُ: کا لفظ کبھی تو نفس کی اس ہیئت (یعنی قوت حافظہ) پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ جو چیز سمجھ میں آئے وہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی دل میں یاد رکھنے کو حفظ کہا جاتا ہے اس کی ضد نسیان ہے، اور کبھی قوت حافظہ کے استعمال پر یہ لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

حَفِظْتُ کَذَا حِفْظاً: یعنی میں نے فلاں بات یاد کرلی۔

پھر ہر قسم کی جستجو، نگہداشت اور نگرانی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ (۱۵۔۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

﴿حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ﴾ (۲۔۲۳۸) سب نمازیں ...... پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ﴾ (۲۳۔۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾ (۳۳۔۳۵) اور اپنے ستر کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ میں حفظ فرج عفت اور پاک دامنی ...... سے کنایہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ﴾ (۴۔۳۴) اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال وآبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے عہد کی حفاظت کرتی ہیں اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے ❷ اور ایک قرأت میں حَفِظَ اللّٰہَ، اللہ پر نصب کے ساتھ ہے اس وقت معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ اللہ کے حق کی نگہبانی کے لئے حفاظت کرتی ہیں نہ کہ کسی قسم کی ریاکاری اور تصنع کے طور پر۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظاً﴾ (۴۔۸۰) تو اے پیغمبر! تمہیں ہم نے انکا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا میں حفیظ بمعنیٰ حافظ یعنی نگہبان کے ہیں جیسا کہ: ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ﴾ (۵۰۔۴۵) اور ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۶۔۱۰۸) میں فَعَّال اور فَعِیل بمعنیٰ فاعل ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظاً﴾ (۱۲۔۶۴) تو خدا ہی بہتر نگہبان ہے۔

---

❶ کذافی اللالی ۱: ۱۲۱ والقالی ۱: ۲۶-۲۷) وفی مجالس ثعلب یقال عند السبق ای عند اول قدم یضع الفرس رجلہ اذا سبق راجع المیدانی ۲: ۲۶۴ نقلاً عن ثعلب وقد اسھب اللسان فی شرحہ (حفد)۱۲.

❷ ای فی مھو رھن والزام ازواجھن النفقة علیھن قالہ الزجاج (الطبری ۵: ۹۵).

میں ایک قرأت حِفْظاً ہے یعنی اس کی حفاظت دوسروں سے بہتر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ﴾ (۵۰۔۴) اور ہمارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب ان کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے تو یہاں بھی حفیظ بمعنی حافظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اللّٰهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ﴾ (۶۔۱۰۸) میں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حفیظ بمعنی محفوظ ہو یعنی وہ کتاب ضائع نہیں ہوگی۔

جیسے فرمایا:

﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى......﴾ (۲۰۔۵۲)

اَلْمحافظة وَالحِفَاظُ: (مفاعلہ) ایک دوسرے کی حفاظت کرنا اور آیت کریمہ: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (۷۰۔۳۴) اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات اور اس کے ارکان کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنی وہ انہیں بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۲۹۔۴۵) کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

اَلتَّحَفُّظُ: (تفعل) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عقل کی کمی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی قوت حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تکلف سے کسی چیز کو یاد کرنے کے ہیں۔ اور قوت حافظہ چونکہ اسباب عقل سے ہے اس لئے اس کی تفسیر میں لوگوں نے وسعت سے کام لیا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اَلْحَفِيْظَةُ: کے اصل معنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے غصہ اور حمیت سے کام لینے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ محض غصہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے کہا جاتا ہے۔ اَحْفَظَنِي فُلَانٌ یعنی فلاں نے مجھے غصہ دلایا۔

(ح ف و)

اَلْاِحْفَاءُ: کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کسی کی حالت دریافت کرنے لئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اَحْفَيْتُ السُّؤَالَ وَاَحْفَيْتُ فُلَاناً فِي السُّؤَالِ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔

﴿إِنْ يَّسْأَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا﴾ (۴۷۔۳۷) اگر وہ تم سے مال طلب کرے اور تمہیں تنگ کرے تو تم بخل کرنے لگو۔

اصل میں یہ اَحْفَيْتُ الدَّآبَّةَ (اے سادہ گردانیدم پائے ستوررا) سے ہے جس کے معنی گھوڑے یا اونٹ کو زیادہ چلا کر اس کے سم یا پاؤں کو گھسا ہوا کر دینے کے ہیں اور حَفِيَ حَفاً وَحَفْوَةً کے معنی زیادہ چلنے سے پاؤں کے چھل جانے کے ہیں۔ اسی سے اَحْفَيْتُ الشَّارِبَ (نیک برید بردت را) ہے جس کے مونچھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کر دینے کے ہیں۔

اَلْحَفِيُّ: نیکوکار اور نہایت مہربان قران میں ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ بِيْ حَفِيًّا﴾ (۱۹۔۴۷) بے شک وہ مجھ پر نہایت

مہربان ہے۔
کہا جاتا ہے اَحْفَيْتُ بِفُلَانٍ وَتَحْفَّيْتُ بِهٖ: میں نے اس کے اعزاز واکرام کے بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔
اَلْحَفِیُّ: (ایضا) کسی چیز کا اچھی طرح جاننے والا۔ ❶

(ح ق ق)

اَلْحَقُّ: (حق) کے اصل معنیٰ مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔ اور لفظ ''حق'' کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنیٰ میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ (۶۔۶۲) پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خداتعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔ نیز فرمایا:
﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ﴾ (۱۰۔۳۲) یہی خدا تمہارا پروردگار برحق ہے اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(۲) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے قرآن پاک میں ہے۔
﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ...... مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ (۱۰۔۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں...... یہ (سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔
اور قیامت کے متعلق فرمایا:
﴿وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ (۱۰۔۵۳) اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ سچ ہے کہہ دو ہاں خدا کی قسم سچ ہے۔ ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ (۳۔۷۱) اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ نیز فرمایا: ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۳۔۶۰) (یہ بات) تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔
﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۲۔۱۴۹) بے شک وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔

(۳) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعث، ثواب وعقاب اور جنت ودوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ (۲۔۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

(۴) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی

❶ وفی التنزیل یسئلونك کانك حفی عنها ۷ : ۱۸۷) ای کانك عالم بها.

اعتبار سے کہا جاتا ہے۔کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾ (۱۰۔۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد............ثابت ہو کر رہا۔

﴿حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ﴾ (۳۲۔۱۳) میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو...... بھر دوں گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآئَهُمْ﴾ (۲۳۔۷۱) اور اگر (خدائے) برحق ان کی خواہشوں پر چلے۔

میں الحق سے مراد ذات باری تعالیٰ بھی ہوسکتی ہے۔ اور وہ حکم بھی ہوسکتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ کہا جاتا ہے۔

اَحْقَقْتُ كَذَا: میں نے اس کا حق ہونا ثابت کر دیا یا اس پر حق ہونے کا حکم لگایا۔ اور آیت کریمہ: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ﴾ (۸۔۸) تا کہ سچ کو سچ کر دے۔ میں احقاق حق دو طرح ہوسکتا ہے۔

(۱) ادلہ اور آیات کے اظہار سے جیسے فرمایا: ﴿وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا﴾ (۴۔۹۱) یعنی ہم نے تمہیں ان پر حجت قویہ عطا فرمائی۔

(۲) شریعت حقہ کی تکمیل اور لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کے ذریعہ جیسے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾ (۶۱۔۸) حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔ خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (۶۱۔۹) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے دیگر سب دینوں پر غالب کرے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ﴾ (۶۹۔۱۔۲) سچ مچ ہونے میں قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور قیامت کو حَآقَّةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔

کہا جاتا ہے: حَاقَقْتُهٗ فَحَقَقْتُهٗ: میں نے حق کے متعلق اس سے جھگڑا کیا اور اس پر غالب رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ [1] (۹۰)

"اِذِ النِّسَاءُ بَلَغْنَ نَصَّ الْحِقَاقِ فَالْعَصَبَةُ اَوْلٰى فِيْ ذَالِكَ" جب عورتیں بالغ ہو جائیں تو عصبہ زیادہ حق دار ہیں۔

فُلَانٌ نَزِقُ الْحِقَاقِ: فلاں معمولی باتوں میں جھگڑا کرتا ہے اور کبھی لفظ حق واجب، لازم اور لائق کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰۔۱۰۳) اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰۔۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم ہے۔

---

[1] کذا نسبه المؤلف ای عمرؓ والذی فی اللسان ومختار الصحاح للرازی ۲۹۸ وغریب ابی عبید ۳: ۴۵۷ والفائق ۲: ۲۷۷ والنهایة (حق) انه من قول علی وفی روایة نص الحقائق والمراد بنص الحقائق الادرك یعنی ما دامت الجاریة صغیرة فامها اولی بها فاذابلغت فالعصبة اولیٰ من امهاانظر ایضاً کنزالعمال ۱۱ رقم ۱۶۵.

﴿حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ......﴾ (۷۔۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حقیق بمعنیٰ جَدِيْرٌ (یعنی سزاوار) ہے اور بعض نے بمعنیٰ واجب لکھا ہے ایک قرأت میں حَقِيْقٌ عَلَيَّ بھی ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ (۲۔۲۲۸) اوران کے خاوند...... اس (مدت) میں ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اور اَلْحَقِيقَةُ کا لفظ کبھی اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جسے ثبات اور وجود حاصل ہو جیسے آنحضرت ﷺ نے حارثہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا ❶ تھا (۹۱) کہ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيْقَةٌ فَمَا حَقِيْقَةُ اِيمَانِكَ کہ ہر حق چیز کو کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی یہ کیسے معلوم ہوا کہ جس چیز کے تم مدعی ہو وہ حق ہے۔ فُلَانٌ يَحْمِيْ حَقِيْقَتَهٗ یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت اس پر واجب ہے۔ کبھی حَقِيقَةٌ کا لفظ اعتقاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور کبھی عمل اور قول کے متعلق جیسے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ لِفِعْلِهٖ حَقِيقَةٌ: فلاں کا فعل صحیح ہے یعنی وہ ریا کار نہیں ہے۔ وَلِقَوْلِهٖ حَقِيقَة: یعنی وہ نہ رخصت پر عمل کر رہا ہے اور نہ زیادتی سے کام لے رہا ہے۔ اس کے برعکس معنی میں متجوز، متوسع یا متفسح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، کہا گیا ہے۔ اَلدُّنْيَا بَاطِلٌ وَالْاٰخِرَةُ حَقِيْقَةٌ کہ دنیا فانی ہے اور بقا صرف آخرت کو ہے۔

فقہا اور متکلمین کے نزدیک حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ اصل لغت کے لحاظ سے اپنے معنیٰ موضوع لہ میں استعمال ہو۔

اَلْحَقُّ: وہ اونٹ جو بار برداری کے قابل ہو جائے مونث حِقَّةٌ ج حِقَاقٌ اور کہا جاتا ہے۔

أَتَتِ النَّاقَةُ عَلٰى حِقِّهَا: یعنی وہ وقت آ گیا ہے جس میں گزشتہ سال اس پر اونٹ بٹھایا گیا تھا۔

(ح ق ب)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا﴾ (۷۸۔۲۳) اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَاب کا واحد حُقُبٌ ہے جس کے معنیٰ زمانہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حِقْبَةٌ کا لفظ اسی سال کی مدت پر بولا جاتا ہے ❷ اس کی جمع حِقَبٌ آتی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مدت غیر معینہ پر بولا جاتا ہے۔

اَلْإِحْتِقَابُ: (افتعال) سوار کا اپنے پیچھے حقیبہ یعنی سامان سفر کا تھیلا باندھنا، چنانچہ کہا جاتا ہے۔ اِحْتَقَبَهٗ وَاسْتَحْقَبَهٗ: اس نے اسے پالان کے پیچھے باندھ لیا۔ حَقِبَ الْبَعِيْرُ: شتر کے غلاف نرہ میں اس کے تنگ کے داخل ہونے کی وجہ سے پیشاب کا رک جانا یا تکلیف سے آنا۔

اَلْاَحْقَبُ: سرخ رنگ کا گورخر بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَبُ ایسے گورخر کو کہتے ہیں جس کے دونوں پہلو

---

❶ وفی تاریخ الطبری قال شیخ من بنی عامر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل قول حقیقة فانبئنی بحقیقة قولك وبدء شانك ۱: ۵۷۵.

❷ روی ذلك عن ابن عمر وابی ھریرة وعن الحسن انه سبعون سنة وقال الفراء انه سنة بلغة قریش (راجع التاج).

باریک ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ سفید پہلوؤں والے گورخر کو کہا جاتا ہے اس کا مؤنث حَقْبَاءُ ہے۔

(ح ق ف)

اَلْحِقفُ: منحنی تودہ ریت۔ اس کی جمع اَحْقَافٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿اِذْ اَنْذَرَ قَومَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ (۴۶۔۲۱) کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی۔ ظَبْیٌ حَاقِفٌ: وہ ہرن جو ریت کے تودوں میں رہتا ہو۔ اِحْقَوْقَفَ: مائل ہو کر ریت کے تودہ کی طرح ہو جانا شاعر نے کہا ہے۔ ❶ ع (رجز)

(۱۱۵) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰی احْقَوقَفَا

چاند کو راتیں تدریجاً کم کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ کمان کی طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ح ک م)

حَکَمَ کے اصل معنیٰ کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو حَکَمَةُ الدَّابَةِ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے) کہا جاتا ہے۔ حَکَمْتُ الدَّابَةَ: میں نے اسے لگام دی۔ اسی طرح حَکَمْتُ السَّفِینَةَ وَاَحْکَمْتُهَا بھی کہا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۱۱۶) اَبَنِی حَنِیفَة اَحْکِمُوْا سُفَهَاءَ کُم

اے بنی حنیفہ! اپنے سفہاء کے منہ میں لگام دو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ﴾ (۲۲۔۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔

اَلْحُکْمُ: کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (۴۔۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

﴿یَحْکُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ﴾ (۵۔۹۵) جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں۔

شاعر نے کہا ❸ ع (البسیط)

(۱۱۷) فَاحْکُمْ کَحُکْمِ فَتَاةِ الْحَيِّ اِذْ نَظَرَتْ

---

❶ قالها العجاج راجع لتخریجه (زلف).

❷ قاله جریر وتمامه .... انی اخاف علیکم ان اغضبا راجع للبیت البحر المحیط ٥: ٢٠٠/٤ : ٣٣٧) ودیوانه ٧ والفائق ١: ١٤١ والمحکم (حکم).

❸ قاله نابغة وقال بعضهم انه لیس من الحکم فی شیئی بل معناه کن حکیما وانظر للبیت دیوانه ٣٣ بشرح البطلیوسی وادب الاکاتب ٢٢ والاقتضاب ٢٩٤ وشواهد الکشاف ٣٣ ومختار الشعر الجاهلی ١: ٧٨ والفخر ٢١: ١٩١ والجمحی ١٨٥ والکتاب ١: ٨٥ والعقد الثمین والعشر للتبریزی ٢٩٧ والمعانی للقبتی ٢٩٩ والعینی ٢: ٤٥٤ والسیوطی ٢٨ وذیل الامالی ١: ٢٢٩ وابن الشجری ٢: ٢٨٩ والصناعتین ١٤٧ فی خمسة ابیات وفی روایة شراع کمافی الحیوان ٣: ٢٢١) وهی روایة الاصمعی کمافی الخزانة ١: ٣٠٠ لکن روایته انسب۔

اِلـــیٰ حِـمَـــامٍ سِــرَاعٍ وَارِدِ الثَّـمَـدِ
اس نوجوان عورت کی طرح عدل وانصاف سے فیصلہ کرو جس نے پانی پروارد ہونے والی کبوتروں کی ٹکڑی کو دیکھ کر (ان کی صحیح تعداد بتادی تھی) اور بعض نے اس کے معنیٰ کن حَـکِیْـمًا کئے ہیں نیز فرمایا: ﴿اَفَـحُـکْـمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْـغُـوْنَ وَمَـنْ اَحْسَـنُ مِـنَ الـلّٰـهِ حُکْماً لِّقَومٍ یُّــوقِـنُـونَ﴾ (۵۔۵۰) کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہاں ہیں۔اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟

اور جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اسے حاکِمٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع حُـکَّـامٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتُـدْلُوْا بِهَا اِلَی الْحُکَّامِ﴾ (۲۔۱۸۸) اور نہ اس کو (رشوۃ) حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

اور حَکَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے اس لئے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اَفَغَیْـرَ الـلّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَماً﴾ (۶۔۱۱۴) (کہو) کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں۔اور آیت کریمہ: ﴿فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (۴۔۳۵) تو ایک منصف، مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف، عورت کے خاندان میں سے مقرر کردو۔ میں حاکِمًا کی بجائے حَکَمًا کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔کہ وہ منصف مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں تفصیلات کی طرف مراجعت کئے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں خواہ وہ فیصلہ فریقین کی مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور حَکَمٌ کا لفظ واحد جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔تَحَاکَمْنَا اِلَی الْحَاکِمِ: ہم حاکم کے پاس فیصلہ لے گئے قرآن پاک میں ہے:
﴿یُـرِیدُونَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ﴾ (۴۔۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جاکر فیصلہ کرائیں۔

حَـکَّـمْـتُ فُلاَنـاً: کسی کو منصف مان لینا قرآن میں ہے۔
﴿حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ﴾ (۴۔۶۵) جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔
جب یہ کہا جاتا ہے کہ حَکَمَ بِالبَاطِلِ تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا اَلْحِکْمَةُ کے معنیٰ علم وعقل کے ذریعہ حق بات دریافت کرلینے کے ہیں لہٰذا حکمت الٰہی کے معنیٰ اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنا ہے اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَـقَدْ اٰتَینَا لُقْمَانَ الْحِکْمَةَ﴾ (۳۱۔۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔
میں حکمت کے یہی معنیٰ مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنیٰ مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا:
﴿أَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ﴾ (۹۵۔۸) کیا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟۔
اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت

کی باتوں پر مشتمل ہے جیسے فرمایا: ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾ (۱۰۔۱) یہ بڑی دانائی کی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نیز فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ﴾ (۵۴۔۴،۵) اور ان کو ایسے حالات (سابقین) پہنچ چکے ہیں جن میں عبرت ہے اور کامل دانائی (کی کتاب بھی)۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنیٰ محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ﴾ (۱۱۔۱) جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔

اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات محکم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہٰذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے قران محکم ہے۔

حکم کا لفظ حکمۃ سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حکم کے معنیٰ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً کہ بعض اشعار مبنی برحکمت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید نے کہا ہے ❷ (رمل)

(۱۱۸) اِنَّ تَقْوٰى رَبِّنَا خَيْرُ نَفَلْ

کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین توشہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۱۲) اور ہم نے ان کو لڑکپن میں ہی دانائی عطا فرمائی تھی۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❸ (۹۳) اَلصَّمْتُ حِكْمَةٌ وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ کہ خاموشی بھی حکمت ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔ یہاں (آیت اور حدیث میں) حکم کے معنیٰ حکمت کے ہیں ❹ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۲۔۱۲۹) اور ان (لوگوں) کو کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (۳۳۔۳۴) اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی

---

❶ انظر لحديث (حم ق د ه ـعن الى رت عن ابن مسعود (طب عن عمرو بن عوف وعن ابى بكرة) (حل عن ابى هريرة) (خط عن عائشة عن حسان بن ثابت (ابن عساكر عن عمر) (ق عن ابن عباس) (عسكرى عن عائشة) (كرعن عائشة) وفى كلها حكمة بدون اللام ولها طرقا فيها حكماً وفى بعضها لحكماء انظر كنزالعمال لعلى المتقى ۳: ۳۲۱ ثم ذكر۳: ٤١٦ عن احمر بن بكر الاسدى وفيه لحكمة كمارواه الاكثر ۱۲.

❷ قاله لبيد بن ربيعة العامرى وتمامه: وباذن الله ريثى وعجل ـ البيت فى ديوانه ۳۹ وامالى المرتضىٰ ۱ـ۲۱ والعقد ۲: ۳۷۸ والمشكل للقبتى ۲۸ وغريبه ۷۷ وجمهرة الاشعار ۱۷۰ اوالكامل ۲: ۲٤٦ ونظام الغريب ۲۳۷ والبحر ٦: ٤٥٥ واللسان (نفل) وشواهد الكشاف ۲۲۹ والطبرى (۹: ۱۷۱) والقرطبى ۷: ۳٦۱ ومحازالقران رقم ۲۷۲ وفى كنزالعمال ۳: ٤٨٩ ان عمربن الخطاب كان يامر برواية هذاالقصيدة (وكيع).

❸ اخرجه ابو منصور الديلمى فى مسند الفردوس من حديث ابن عمر بسندضعيف والبيهقى فى الشعب والقضاعى من حديث انس ان لقمان قال الخ كما فى البيهقى وروضة العقلاء ۲۸ بسند صحيح عن انس راجع كنزالعمال ۳: ۲۰۰ـرقم ۷۵۲ اوتخريج الاحياء للعراقى ۳: ۱۱۸ وفى الاحياء الصمت حكمة غلط ،غلط فيه عثمان بن سعيد الراوى.

❹ راجع الطبرى ۱: ٤٧٦ وقول السدى هو المنقول عن قتادة راجع فتح القدير للشوكانى ۱۲.

ہیں ان کو یاد رکھو۔

میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے یعنی جس پر کہ قرآن نے آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَايُرِيْدُ......﴾ میں تنبیہ کی ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے حکمت بنا دیتا ہے تو اس میں ترغیب ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ میں حکمت سے ناسخ ،منسوخ ،محکم اور متشابہات کا علم مراد ہے۔اور ابن زید کہتے ہیں کہ آیات وحِکم کا علم مراد ہے سدّی نے کہا کہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے۔بعض نے کہا ہے کہ حقائق کا فہم مراد ہے کیونکہ بعض حقائق کا بیان اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے انبیاء ان کے تابع ہوتے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ (۵۔۴۴) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔میں يَحْكُمُ کے معنیٰ اس حکمت کے بیان کرنے کے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور یا یہ حکم ہی سے ماخوذ ہے یعنی فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (۳۔۷) جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور جو بعض متشابہ ہیں۔میں محکمات سے وہ آیتیں مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ پایا جاتا ہو۔اور متشابہ کی چند قسمیں ہیں جنہیں ان کے باب (ش ب ہ) میں بیان کیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

حدیث میں ہے [1] (۹۴) کہ جنت مُحَكِّمِيْن کے لئے ہے بعض نے کہا ہے کہ مُحَكِّمِيْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کہا جائے کہ یا تو مرتد ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے تو وہ قتل ہونا پسند کریں اور بعض نے کہا ہے کہ محکمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکمت کے ساتھ مختص ہیں۔

(ح ل ل)

اَلْحَلُّ: اصل میں حَلٌّ کے معنیٰ گرہ کشائی کے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

میں یہی معنیٰ مراد ہیں اور حَلَلْتُ کے معنیٰ کسی جگہ پر اترنا اور فروکش ہونا بھی آتے ہیں اصل میں یہ حَلُّ الْاَحْمَالِ عندالنزول سے ہے، جس کے معنیٰ کسی جگہ اترنے کے لئے سامان کی رسیوں کی گرہیں کھول دینا کے ہیں۔پھر محض اترنے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ لہٰذا حَلَّ (ن) حُلُوْلًا کے معنیٰ کسی جگہ پر اترنا ہیں اور اَحَلَّهٗ کے معنیٰ اتارنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ تَحُلُّ قَرِيباً مِّنْ دَارِهِمْ﴾ (۱۳۔۳۱) یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔

﴿وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ (۱۴۔۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

---

[1] والمحكمين على صيغة المفعول وبكسر الكاف معناه المنصف من نفسه راجع للحديث الفائق ۱: ۱۴۱ واللسان والنهاية (حكم).

حَلَّ الدَّیْنُ: قرض کی ادائیگی کا وقت قریب آ پہنچا۔
اَلْحِلَّةُ: نازل ہونے والی قوم (اسی سے کہا جاتا ہے)
حَیٌّ حَلَالٌ جبکہ لوگ ایک دوسرے کے جوار میں مقیم ہوں اَلْمَحِلَّةُ: (اترنے کی جگہ) اور حَلُّ الْعُقْدَةِ (گرہ کھولنا) سے بطور استعارہ حَلَّ (ض) الشَّیْءُ حِلًّا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کے حلال ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا﴾ (۵۔۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ۔
﴿ھٰذَا حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ﴾ (۱۶۔۱۱۶) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔
اور اَلْحُلُوْلُ سے اَحَلَّتِ الشَّاۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ بکری کے تھنوں سے دودھ اتر آنا کے ہیں۔ مگر اَحَلَّ اللّٰہُ کَذَا کے معنیٰ کسی چیز کو حلال کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ (۵۔۱) تمہارے لئے چوپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیْکَ وَبَنٰتِ عَمِّکَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِکَ﴾ (۳۳۔۵۰) اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں۔
میں ازواج مطہرات کی حلت تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کے عقد میں تھیں اور بنات العم وغیرہ کی حلت سے نکاح مراد ہے۔
بَلَغَ الْاَجَلُ مَحِلَّهٗ: ادائیگی قرض کا وقت قریب آ پہنچا قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّهٗ﴾ (۲۔۱۹۶) جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔
رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحِلٌّ جو احرام کھول دے یا وہ آدمی جو حدود حرم سے باہر چلا جائے قرآن میں ہے: ﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ (۵۔۲) اور جب احرام اتار دو تو پھر شکار کرو۔
﴿وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ﴾ (۹۰۔۲) اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔
اور آیت کریمہ:
﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِکُمْ﴾ (۶۶۔۲) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمہاری قسموں کی گرہ کشائی کا کفارہ بیان کر دیا ہے۔ حدیث میں ہے [1] (۹۵) لَا یَمُوْتُ لِلرَّجُلِ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْاَوْلَادِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ اِلَّا

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظه فی اللسان(حلل) والفائق ۱:۱٤۲ ولفظه لایموت لمؤمن وفی ابن کثیر لمسلم وفی روایة من مات له راجع للحدیث المسند عبدالرزاق وابو داؤد والطیالسی واصله فی الصحیحین من حدیث ابی ھریرة انظر ابن کثیر ۳:۱۳۳ وکنزالعمال ۳:۱٦۳۔۱٦٤ وایضاً الاستثناء الاتحلة القسم ورد للحارث فی سبیل اللہ فی مسند احمد والروایة فی الترمذی والنسائی وابن ماجة وتحلة القسم مثل فی القلیل المفرط فی القلة وقیل اشار الی قوله تعالی وان منکم الا واردھا والذی ذھب الیه المؤلف ھو اعتبار بالاصل یخاف المنقول فی تفسیرہ)۱۲.

تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجائیں (اور وہ صبر کرے) تو اسے دوزخ کی آگ صرف تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کی مقدار سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یعنی جتنی دیر میں کہ انشاء اللہ کہے۔ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔ [1] ع

(۱۱۹) وَقْعُهُنَّ الْاَرْضَ تَحْلِيلٌ

کہ ان کے قدم کا زمین پر پڑنا تحلۃ القسم کی مقدار ہے یعنی برائے نام ہے۔

اَلْحَلِيلُ: خاوند۔ مؤنث حَلِيْلَةٌ میاں بیوی کو حَلِيْلٌ وَحَلِيْلَةٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی چادر کھولتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسی لئے جو شخص کسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہو وہ اس کا حَلِيلٌ کہلاتا ہے۔ اور یا یہ حَلَالٌ سے ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔ اور حَلِيلَة کی جمع اَلْحَلَائِلُ ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی۔

اَلْحُلَّةُ: (کپڑوں کا جوڑا) اِزار اور رداء (اوپر اور نیچے کی چادریں)

اَلْاِحْلِيلُ: پیشاب نکلنے کا سوراخ، کیونکہ پیشاب کے وقت اس کی گرہ کھل جاتی ہے۔

(ح ل ف)

اَلْحِلْفُ: عہد و پیمان جو لوگوں کے درمیان ہو۔ اَلْمُحَالَفَةُ: (مفاعلہ) معاہدہ بمعنیٰ باہم عہد و پیمان کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر محالفت سے لزوم کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے فُلَانٌ حِلْفُ كَرَمٍ وَحِلْفُ كَرِمٍ یعنی وہ کرم سے جدا نہیں ہوتا۔ حَلِيفٌ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو اس کی جمع اَحْلَافٌ (وحُلَفَاءُ) آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے [2] (الطویل)

(۱۲۰) تَدَارَكْتُمَا الْاَحْلَافَ قَدْثُلَّ عَرْشُهَا

تم نے ان حلیفوں کا تدارک کر دیا جن کے پائے ثبات متزلزل ہو چکے تھے۔

اَلْحِلْفُ اصل میں اس قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیا جائے اسکے بعد عام قسم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾ (۶۸:۱۰) یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا۔

---

[1] قطعة من البيت لكعب بن زهير السلمي من قصيدة جمهرة (۲۸۲۔۲۸۷) فی ۸۵ بیتاً وصدره تخدی علی لسیرات وھی لاهته زوابل .... وفی روایة اللسان لاحقة بدل لاحقة باربع بدل ذوابل وفی روایة المحکم (حلل) نحالب بدل ذوابل والبیت فی النهایة (حلل) والعمدة ۲ : ۸۸) وجمهرة اشعارالعرب ۳۱۰ ودیوانه ۱۳ ؛مثله لعبدة بن الطبیب من قصیدة مفضلیة رقم ۲۶ فی ۸۱ بیتاً بذکرثورا وصدره یخفی التراب باظلاف ثمانیة فی اربع .... والبیت فی امالی المرتضیٰ والنوادر ۹ ودیوان المعانی ۲ : ۱۰۸ واللسان (حلل) لکن فیه مسهن بدل وقعهن ۱۲.

[2] قاله زهیر یمدح زهیر بن سنان والحارث بن عوف والاحلاف غطفان وقیس وتمامه : وذهیان قد زلت باقدا مها النعل راجع دیوانه ۱۰۹ وشواهد الکشاف ۱۰۰ والمعلقات العشر والمختارات ۶۲ ومختارالشعر الجاهلی (۱ : ۱۶۲) والاتباع لابی الطیب ۳۴ واضداد ابی الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطیب ۱ : ۱۳۷) واللسان (ثلل).

﴿وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ﴾ (۹۔۶۲) یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو خوش کر دیں۔
شَیْءٌ مُحْلِفٌ (مشکوک چیز) جس کے ثابت کرنے کے لئے قسم کی ضرورت ہو۔
کُمَيْتٌ مُحْلِفٌ: گھوڑا جس کے کمیت اور اشقر ہونے میں شک ہوا۔ ایک قسم کھائے کہ یہ کمیت ہے اور دوسرا حلف اٹھائے کہ یہ اشقر یعنی سرخ ہے اَلْمُحَالَفَةُ کے اصل معنیٰ تو ایک دوسرے کے سامنے قسم کھانا کے ہیں اس سے یہ لفظ محض لزوم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے اور جو کسی سے الگ نہ ہوتا ہوا سے اس کا حِلْفٌ یا حَلِيْفٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے ❶ (۹۶) لَاحِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ: اسلام میں زمانہ جاہلیت ایسے معاہدے نہیں ہیں۔
فُلَانٌ حَلِيْفُ اللِّسَانِ: فلاں چرب زبان ہے گویا اس نے بولنے سے عہد کر رکھا ہے اور اس سے ایک لحہ نہیں رکتا حَلِيفُ الْفَصَاحَةِ: وہ فصیح ہے۔

(ح ل ق)

اَلْحَلْقُ: حلق (وہ جگہ جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے) حَلَقَهٗ (ض) اس کے حلق کو قطع کر ڈالا۔
پھر یہ لفظ بال مونڈنے پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
حَلَقَ شَعْرَهٗ اس نے اپنے بال منڈوا ڈالے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُوْسَكُمْ﴾ (۲۔۱۹۶) اور...... سر نہ منڈواؤ۔
﴿مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ﴾ (۴۸۔۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر۔
رَأْسٌ حَلِيْقٌ مونڈا ہوا سر۔
لِحْيَةٌ حَلِيْقَةٌ: مونڈی ہوئی داڑھی۔
اور کسی انسان کے حق میں بددعا کے وقت عَقْرٰی حَلْقٰی کہا جاتا ہے یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچے جس پر عورتیں اپنے سر کے بال مونڈوا ڈالیں۔ بعض نے کہا ہے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے حلق کو قطع کر ڈالے۔ اَلْمَحَالِقُ: وہ کمبل جو کھردرا ہونے کی وجہ سے بدن کے بال کاٹ ڈالے۔
حَلْقَةٌ یا حَلَقَةٌ جماعت جو دائرہ کی شکل میں جمع ہو۔ کیونکہ وہ دائرہ ہیئت میں انسان کے حلق کے مشابہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَلَقَةٌ کا لفظ صرف اس جماعت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے سر منڈوا ڈالتے ہیں ❷
اِبِلٌ مُحَلَّقَةٌ: شتران کہ بشکل حلقہ داغ بر آنہا کردہ باشند اور حلقہ میں معنیٰ دوران کا اعتبار ہے۔ جس طرح حَلَقَةُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے نیز کہا جاتا ہے حَلَّقَ الطَّائِرُ جس کے معنیٰ پرند کا چکر لگا کر اڑنا کے ہیں ❸

---

❶ رواه الحاكم في المستدرك والمسلم وابوداؤد والنسائي عن جبير بن مطعم (راجع الفتح للنبهاني ۳: ۳۴۳) والحديث في النهاية (حلف) وغريب ابي عبيد ۲ ۱۔

❷ وعلىٰ هذا فهي جمع حالق (على الاول مفرد وجمعه حَلَقٌ واماالحلقة بسكون اللام فجمعه حلق وعند البعض حلق على غير قياس (النهايه)

❸ (۵۶-۸۳) میں حلقوم بمعنی حلق آیا ہے وفي التنزيل الحلقوم (۵۶-۵۳) بمعنى الحلق قال بعضهم الميم فيه اصلية وعند البعض الواو والميم زائد تان (النهايه).

(ح ل م)

اَلْحِلْمُ کے معنیٰ ہیں نفس وطبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ وغضب کے موقع پر بھڑک نہ اٹھے۔ اسکی جمع اَحْلَامٌ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ﴾ (۵۲۔۳۲) کیا ان کی عقلیں ان کو..... سکھاتی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَحْلَام سے عقلیں مراد ہیں اصل میں حلم کے معنیٰ متانت کے ہیں مگر چونکہ متانت بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے حلم کا لفظ بول کر عقل مراد لے لیتے ہیں جیسا کہ مسبب بول کر سبب مراد لے لیا جاتا ہے۔ حَلُمَ: بردبار ہونا۔ حَلَّمَهُ الْعَقْلُ وَتَحَلَّمَ عقل نے اسے بردبار بنادیا۔ اَحْلَمَتِ الْمَرْأَةُ: عورت کا حلیم بچے جننا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے تحمل والے، نرم دل والے اور رجوع کرنے والے تھے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ (۳۷۔۱۰۱) تو ہم نے ان کو ایک نرم دل لڑکے کی خوش خبری دی۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس غلام میں قوت برداشت...... تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾ (۲۴۔۵۹) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

میں حُلم کے معنیٰ سنِ بلوغت کے ہیں اور سنِ بلوغت کو حُلم اس لئے کہتے ہیں کہ اس عمر میں عام طور پر عقل وتمیز آجاتی ہے کہا جاتا ہے۔ حَلَمَ (ن) فِی نَوْمِهٖ خواب دیکھنا۔ مصدر حِلْمٌ اور حُلْمٌ اور حلم مثل رُبْعٌ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہی معنیٰ تَحَلَّمَ وَ احْتَلَمَ کے ہیں۔

حَلَمْتُ بِهٖ فِی نَوْمِی: میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ﴾ (۱۲۔۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

اَلْحَلَمَةُ: بڑی چیچڑی۔ کیونکہ وہ ایک جگہ پر جمے رہنے کی وجہ سے حلیم نظر آتی ہے اور سرپستان کو حَلَمَةُ الثَّدْيِ کہنا محض ہیئت میں چیچڑی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس مجاز کی دلیل یہ ہے کہ سرپستان کو قُراد بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:[1] ع (الطویل)

(۱۲۱) كَاَنَّ قُرَادَیْ زَوْرِهٖ طَبَعَتْهُمَا
بِطِيْنٍ مِنَ الْحَوْلَانِ كُتَّابُ اَعْجَمِیْ

(اس کے سینے پر پستانوں کے نشانات اس طرح خوشنما نظر آتے ہیں کہ گویا کہ کسی کاتب نے مٹی کی مہریں لگادی ہیں) حَلِمَ الْجِلْدُ چمڑے کو کیڑا لگ جانا۔ حَلَّمْتُ

---

[1] قاله عدی بن الرقاع فی قصیدة له یمدح فیها عمر بن هیرة وروی ایضاً للملحقه الحرمی کمافی اللسان (قرد، عجم) والمعرب للجوالیقی ۱۰۵ والحماسة ۲: ۳۵۱۔۳۵۲ والمرزوقی رقم ۷۸۱ من خمسة ابیات والاقتضاب ۹۷ والبیت بغیر عزوفی المخصص ۲: ۱۴۸ والطبرسی ۱: ۹۴ والحولان (بفتح الجیم حبل من نواحی دمشق وطینه مشهور للختم وروی صاحب الاقتضاب ان الحولان اسم للطین الذی یطبع به وفی المطبوع الحولان (بالمهملة) مصحف انشد الجوهری (قرد) لابن میادة یمدح بعض الخلفاء وفی روایة صدره بدل زوره وعدی بن الرقاع هوعدی بن زید بن مالك بن عدی بن الرقاع العاملی وکان شاعراً مقدماً عند بنی امیة خاصاً بالولید بن عبد الملك وعده ابن سلام فی الطبقة الثامنة من شعراء الاسلام راجع الاغانی ۸: ۷۲۔۱۷۷) وابن سلام ۲۰۹۔۲۱۳) والموتلف ۱۰۶ والمرزبانی ۲۵۳.

الْبَعِيْرَ: میں نے اونٹ سے چیچڑ نکالے۔ حَلَّمْتُ فُلَانًا: کسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ مدارات سے پیش آنا تاکہ وہ مطمئن رہے جیسا کہ اونٹ سے چیچڑ دور کرنے سے اسے سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے اور انسان اس پر پوری طرح قدرت پالیتا ہے۔

(ح ل ی)

اَلْحُلِیُّ: (زیورت) یہ حَلْیٌ کی جمع ہے جیسے ثَدْیٌ کی جمع ثُدِیٌّ آجاتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ﴾ (۷۔۱۴۸) اپنے زیور کا ایک بچھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔

حَلِیَ یَحْلٰی آراستہ ہونا اور (حَلّٰی آراستہ کرنا) قرآن پاک میں ہے: ﴿یُحَلَّوْنَ فِیهَا اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ (۱۸۔۳۱) ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

﴿حُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۶۔۲۱) اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

اور حِلْیَةٌ کے معنیٰ زیور کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ﴾ (۴۳۔۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

(ح م م)

اَلْحَمِیْمُ کے معنیٰ سخت گرم پانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ﴾ (۱۰۔۴) اور جو کافر ہیں ان کے پینے کو نہایت گرم پانی۔

﴿یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ﴾ (۲۲۔۱۹) اور ان کے سروں پر جلتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

﴿ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ﴾ (۲۲۔۱۹) پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔

﴿هٰذَا فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّغَسَّاقٌ﴾ (۳۸۔۵۷) یہ گرم کھولتا ہوا پانی اور پیپ (ہے) اب اس کے مزے چکھیں۔

اور گرم پانی کے چشمہ کو حَمَّةٌ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے [1] (۹۷)

اَلْعَالِمُ كَالْحَمَّةِ یَاْتِیْهَا الْبُعَدَاءُ وَیَزْهَدُ فِیْهَا الْقُرَبَاءُ: کہ عالم کی مثال گرم پانی کے چشمہ کی سی ہے۔ جس (میں نہانے) کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور شفایاب ہو کر لوٹتے ہیں۔ اور قرب و جوار کے لوگ اس سے بے رغبتی کرتے ہیں (اس لئے اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں)

اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حَمِیم کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں اور حَمَّام کو حَمَّام یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے

[1] الحدیث فی النهایة (حم) والفائق ۱: ۱۵۰ وفیه ویترکها القرباء وغریب ابی عبید ۳: ۲۰۱ والمعاجم (حم) قال الحافظ فی تخریج الکشاف لم اجده ۴: ۶۰)۔

کہ اس میں گرم پانی موجود رہتا ہے۔

اِسْتَحَمَّ فُلَانٌ ۔حمام میں داخل ہونا۔

پھر مجازاً قریبی رشتہ دار کو بھی حمیم کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کی حمایت میں بھڑک اٹھتا ہے اور کسی شخص کے اپنے خاص لوگوں کو حَامَّة کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اَلْحامَّةُ وَالعَامَّةُ: خاص وعام کا محاورہ ہے قرآن میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ (۲۶۔۱۰۰،۱۰۱) تو (آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔

نیز فرمایا:

﴿وَيَسْـأَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا﴾ (۷۰۔۱۰) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا۔

اور اس کی دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان کے قریبی مہربانوں کو حُزَانَتُه بھی کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ اس کے غم میں شریک رہتے ہیں کہا جاتا ہے۔

اِحْتَمَّ فُلَانٌ لِفُلَان: فلاں اس کے لئے غمگین ہوا یا اس کی حمایت کے لئے جوش میں آ گیا۔اس میں باعتبار معنیٰ اِهْتَمَّ سے زیادہ زور پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جوش اور گرمی کے معنیٰ بھی پائے جاتے ہیں۔

اَحَمَّ الشَّحْمُ: چربی کو پگھلایا۔یہاں تک کہ وہ گرم پانی کی طرح ہوگئی اور آیت کریمہ:

﴿وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ﴾ (۵۶۔۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔

میں يَحْمُوْم حمیم سے یفعول کے وزن پر ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ سخت سیاہ دھواں کے ہیں۔ اور اسے يَحْمُوْم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت حرارت پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ سے اس کی تفسیر کی ہے۔اور یا اس میں حَمَمَةٌ یعنی کوئلے کی سی سیاہی کا تصور موجود ہے۔

چنانچہ سیاہ کو يَحْمُوْم کہا جاتا ہے اور یہ حَمَمَةٌ (کوئلہ) کے لفظ سے مشتق ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ...﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے اور نیچے (ان) کے فرش ہوں گے۔

اور حِمَام بمعنیٰ موت بھی آ جاتا ہے جیسا کہ کسی امر کے مقدر ہونے پر حُمَّ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بخار کو اَلْحُمّٰی کہنا یا تو اس لئے ہے کہ اس میں حرارت تیز ہوجاتی ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا [1] (۹۸)

اَلْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّم ۔کہ بخار جہنم کی شدت سے ہے اور یا بخار کو حُمّٰی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں پسینہ

---

[1] متفق عليه من حديث بن عمر وعند البخارى عن عائشة موصولا وفى الموطا عن عروة مرسلا وعند الترمذى عن ثوبان وبمعناه رواه الحاكم والنسائى عن ابن عباس وفى رواية عن انس زائدالموت (ابن السنى وابو عظيم فى الطب، هنا وفى الزهد وابن ابى الدنيا فى المرض والكفارات عن الحسن مرسلاً وراجع لتخريجه كنزالعمال ۳: رقم ۱۶۱۶ ـ ۱۶۱۷ـ۱۶۳۴ وج ۱۰ رقم ۱۷۰ والفتح للنبهانى ۲: ۸۲ وايضاً الكنز ج ۱۰ رقم ۱۵۹ـ۱۶۵ـ ۱۶۶ .

اتر تا ہے اور یا اس لئے کہ یہ موت کی علامات میں سے ایک علامت ہے جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں اَلْحُمّٰی بَرِیْدُ الْمَوْتِ (کہ بخار موت کا پیغام بر ہے) اور بعض اسے باب الموت یعنی موت کا دروازہ بھی کہتے ہیں اور اونٹوں کے بخار کوحُمام کہا جاتا ہے یہ بھی حِمَام (موت) سے مشتق ہے کیونکہ اونٹ کو بخار ہو جائے تو وہ شاذ و نادر ہی شفایاب ہوتا ہے۔

حَمَّمَ الْفَرخُ: پرند کے بچے نے بال و پر نکال لئے کیونکہ اس سے اس کی جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔

حَمَّمَ وَجْهُهٗ: اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا۔

یہ دونوں محاورے حُمَمَۃٌ سے ماخوذ ہیں۔

اور حَمْحَمَتِ الفَرسُ: جس کے معنیٰ گھوڑے کے ہنہنانے کے ہیں۔یہ اس باب سے نہیں ہے۔

(ح م د)

اَلْحَمدُ لِلّٰہِ (تعالیٰ) کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثنا بیان کرنے کے ہیں ۔یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے ۔ کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے ۔ جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ جس طرح مال کے خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازئ قد و قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراریہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔لہٰذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے [1] اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ﴾ (۱۱-۷۳) وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔

میں حمید بمعنیٰ محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی۔

حُمَادَاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذا: یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ﴾ (۶۱-۶) اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ﷺ ہوگا۔ان کی بشارت سناتا ہوں۔

میں لفظ احمد سے آنحضرت ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے۔اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشرو جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (۴۸-۲۹) محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

میں لفظ محمد ﷺ گو من وجہ آنحضرت ﷺ کا نام ہے

---

[1] انظر الکشاف ج ۱ ص ۸-۱۰۔

لیکن اس میں آنجناب کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامِ ن اسْمُهٗ یَحْیٰی﴾ (۱۹۔۷)

میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنیٰ حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

(ح م ر)

اَلْحِمَارُ: (گدھا) اس کی جمع حُمُرٌ وَحَمِیْرٌ وَاَحْمِرَةٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ﴾ (۱۶۔۸) اور گھوڑے خچر اور گدھے۔

کبھی حمار کے لفظ سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (۶۲۔۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (۷۵۔۵۰) گویا وہ گدھے ہیں جو بدک جاتے ہیں۔

حِمَارُ قُبَّانَ: ایک قسم کا کیڑا (جسے فارسی میں خرک کہا جاتا ہے۔) اَلْحِمَارانِ: دو پتھر جن پر پنیر خشک کیا جاتا ہے۔ ہیئت میں حمار سے تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے اور گدھے کے ساتھ جلادت میں تشبیہ دے کر دوغلی نسل کے گھوڑے کو بھی اَلْمُحْمَرِ کہا جاتا ہے۔

اَلْحُمْرَةُ: سرخی اَلْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ: عرب وعجم (اس میں عمومی رنگت کا لحاظ کیا گیا ہے) اور کبھی حَمْرَاءُ العجان (کنایہ از عجم) بھی کہا جاتا ہے۔[1]

اَلْاَحْمَرَانِ: گوشت اور شراب[2] اَلْمَوْتُ الْاَحْمَرُ: سخت موت، وہ موت جو قتل سے واقع ہو سَنَةٌ حَمْرَاءُ: قحط سالی۔ کیونکہ اس میں فضا کا رنگ سرخ نظر آتا ہے اسی بنا پر سخت گرمی کو حَمْرَّةُ القَیظ کہا جاتا ہے۔ وَطْاَةٌ حَمْرَاءُ: قدم کا تازہ نشان اس کے بالمقابل مٹے ہوئے نشان کو وَطْاَةٌ دَهْمَاءُ بولتے ہیں۔

(ح م ل)

اَلْحَمْلُ: (ض) کے معنیٰ بوجھ اٹھانے یا لادنے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لئے صیغہ فعل یکساں رہتا ہے۔ مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حمل (بکسر الحا) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے اس پر حَمْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دیکر درخت کے پھل کو بھی حَمْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰی حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ﴾ (۳۵۔۱۸) اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ

---

[1] وفی حدیث علی عارضه رجل من الوالی فقال: اسکت یاابن حمراء العجان ای یاابن الامة والعجان مابین القبل والدبر وهی کلمة تقولها العرب فی السب والذم (النهایة ۱: ٤٤٠).

[2] وایضاالذهب والزعفران ویقال للماء واللبن الابیضان وللتمر والماء الاسوادان (النهایة).

بتانے کوکسی کو بلائے تو وہ اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا۔
اور حَمَلْتُ کا صیغہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے پر بولا جاتا ہے خواہ وہ بوجھ ظاہری ہو یا باطنی مثلاً کہا جاتا ہے حَمَلْتُ الثِّقْلَ حَمْلًا میں نے بوجھ اٹھایا۔ الرسالة پیغام اٹھایا۔ اَلْوِزْرَ: گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:
﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹-۱۳) یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور (لوگوں کے) بوجھ بھی۔
﴿وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (۲۹-۱۲) حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ اٹھانے والے نہیں۔
﴿وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ مَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ (۹-۹۲) اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم کو سوار کروں۔
﴿لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّومَ الْقِيَامَةِ﴾ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:
﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوراةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ (۶۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ جن لوگوں پر احکام تورات کی بجاآوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں کوتاہی کی۔ کہا جاتا ہے۔ حَمَلْتُهٗ وَحَمَلْتُ عَلَيهِ كَذَا: میں نے اس کے ذمہ فلاں کام لگایا۔ تَحَمَّلَ وَاحْتَمَلَ وَحَمَلَ اس کے مطاوع آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾ (۱۳-۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔
﴿حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ (۶۹-۱۱) تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کرلیا۔
﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ......﴾ (۲۴-۵۴) اگر منہ موڑو گے تو رسول پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو ان کے ذمے ہے اور تم پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو تمہارے ذمے ہے۔
﴿لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا﴾ (۲-۲۸۶) ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار! جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔
﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴-۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کرلیا۔
﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (۱۷-۱۴) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا بے شک

نوح (ہمارے) شکر گزار بندے تھے۔

﴿وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۶۹۔۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھالئے جائیں گے۔

حَمَلَتِ الْمَرْأَةُ: عورت کا حاملہ ہونا اسی طرح حَمَلَتِ الشَّجَرَةُ. کا محاورہ استعمال ہوتا ہے حَمْلٌ کی جمع اَحْمَالٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (۶۵۔۴) اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔

﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ (۴۱۔۴۷) اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔

﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ (۷۔۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَّحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (۴۶۔۱۵) اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی سال میں ہوتا ہے۔

اصل میں حَمْلٌ کے معنی پیٹھ پر بوجھ لادنا کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اونٹنی کے حاملہ ہونے کے لئے وَسَقَتِ النَّاقَةُ بولا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَمُوْلَةُ (بالفتح) اسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا گیا ہو۔ اور یہ قَتُوْبَة اور رَكُوْبَة کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا ہوا ہے اسے حُمُولة (بالضم) کہا جاتا ہے اور حَمَلٌ بمعنی محمول آتا ہے اور یہ خاص کر بھیڑ کے چھوٹے بچے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اسے چلنے سے عاجز یا نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور حَمْلٌ کی جمع اَحْمَال وَحِملان آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر بادل کو حامل کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا﴾ (۵۱۔۲) اور پانی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اَلْحَمِيلُ: بہت پانی والا بادل۔ نیز حمیل اس کوڑا کرکٹ کو بھی کہا جاسکتا ہے جو سیلاب بہا کر لے آتا ہے اور اجنبی مسافر اور ضامن پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ضامن بھی مقروض کے ساتھ اس کی ضمانت کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔ نیز اَلْحَمِيل اس بچے کو کہتے ہیں جس کا نسب ثابت نہ ہو۔ چنانچہ میراثُ الحمیل کا مسئلہ ہے یعنی اس شخص کی میراث جس کا سبب متحقق نہ ہو۔ ❶

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: کنایۃً چغل خور۔

فُلَانٌ يَحْمِلُ الْحَطَبَ الرَّطَب: یعنی فلاں چغلی کھاتا ہے۔

(ح م ی)

اَلْحُمٰى۔ وہ حرارت جو گرم جواہر جیسے آگ، سورج وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی جو بدن میں

---

❶ وفی حدیث انه کتب الی شریح الحمیل لایورث الاببینة (النهایة) وفی الترمذی .... کان ابی حمیلا فورثه مسروق.

❷ الاول قراءة ابن مسعود الحسن والثانی ابن عباس وعلیه المصحف وفی مجاز ابی عبیدة : فی عین حمئةٍ (۸۶) تقدیرها فعلة وهی مهموز ومجازها ذات حمأة ومن لم یهمز جعل مجازه مجازفعلة من الحرالحامی وموضعها حامیة .

قوت حارہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿فِیْ عَیْنٍ حَامِیَۃٍ﴾ (۱۸۔۸۶) گرم چشمے میں۔
ایک قرأت میں حَمِئَۃٍ ہے[2]
﴿یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ﴾ (۹۔۳۵) جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔
حَمِیَ النَّھَارُ: دن گرم ہو گیا۔ اُحْمِیَتِ الْحَدِیْدَۃُ: لوہا گرم کیا گیا۔
حُمَیَّا الْکَاسِ: شراب کی تیزی، اور انسان کی قوت غضبیہ جب جوش میں آجائے اور حد سے تجاوز کر جائے تو اسے بھی حَمِیَّۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے حَمِیْتُ عَلٰی فُلَانٍ: میں فلاں پر غصے ہوا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ﴾ (۴۸۔۲۶) اور ضد بھی جاہلیت کی۔
پھر استعارہ کے طور پر حَمَیْتُ الْمَکَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی جگہ کی حفاظت کرنا۔ ایک روایت میں ہے[1] (۹۹) لاَحِمٰی اِلاَّ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کہ چراگاہ کا محفوظ کرنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے۔
حَمَیْتُ اَنْفِیْ مَحْمِیَۃً: میں نے اپنی عزت کی حفاظت کی۔ حَمَیْتُ الْمَرِیضَ حَمْیًا: بیمار کو نقصان دہ چیزوں سے روک دیا۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلاَحَامٍ﴾ (۵۔۱۰۳) اور نہ حام۔
میں بعض کے نزدیک حَامٍ سے وہ نر اونٹ مراد ہے جس کی پشت سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں (اس کے متعلق) کہہ دیا جاتا تھا حُمِیَ ظَھْرُہٗ فَلاَ یُرْکَبُ اس کی پشت محفوظ لہٰذا اس پر کوئی سوار نہ ہو۔
اَحْمَاءُ الْمَرْءَۃِ: خاوند کی طرف سے عورت کے رشتہ دار کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اضافت کے وقت تینوں حالتوں میں حَمَاھَا وَحَمُوْھَا وَحَمِیْھَا کہا جاتا ہے۔ بعض حَمْءٌ (مہموز) بھی بولتے ہیں جیسا کہ کَمْءٌ ہے۔
اَلْحَمْأَۃُ وَالْحَمَأُ سیاہ بدبودار مٹی۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔ کہا جاتا ہے حَمَأْتُ الْبِئْرَ: کیچڑ میں نے کنوئیں کو صاف کیا۔ اَحْمَأْتُھَا: اسے کیچڑ سے بھر دیا۔
ایک قرأت میں ﴿عَیْنٍ حَمِئَۃٍ﴾ (۱۸۔۸۶) ہے یعنی سیاہ بدبودار کیچڑ والا چشمہ۔

(ح ن ن)

اَلْحَنِیْنُ: کسی چیز کی طرف مشفقانہ کھنچنا کہا جاتا ہے۔
حَنَّتِ الْمِرْءَۃُ وَالنَّاقَۃُ لِوَالِدِھَا عورت اور اونٹنی کا اپنے بچے کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی آواز بھی ہوتی ہے اس لئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں

---

[1] الحدیث فی النہایۃ (حمی) وباختلاف الفاظہ فی معجم الاصبہانی وابن النجار عن ابن عباس (حم خ د) عن الصعب بن جثامۃ راجع کنز العمال ۱۲۔

[2] وفی النہایۃ: انہ کان یصلی الی جذع فی مسجدہ فلما عمل لہ المنبر صعد علیہ فحن الجذع الیہ کذافی النہایۃ وفی روایۃ کان یخطب بدل یصلی ثم حدیث حنین الجزع معروف رواہ جماعۃ من الصحابۃ وفی بعض الروایات فخار کخوار الثور حتیٰ ارتج المسجد فلامعنیٰ لتاویل المؤلف وحملہ علی المجاز راجع للحدیث الدارمی رقم ۳۱۔۴۲۔

کہ جس میں اشتیاق اور شفقت پائی جائے یا اشتیاق کی صورت کا تصور کے بھی یہ لفظ بو لا جاتا ہے چنانچہ (حدیث) حَنِیْنُ الْجِذْعِ اس معنیٰ پر محمول ہے ❷

رِیْحٌ حَنُوْنٌ: سرسراہٹ سے چلنے والی ہوا۔

قَــوْسٌ حَنَّــانَةٌ: آواز نکالنے والی کمان۔محاورہ ہے (مثل) مَالَــهٗ حَانَّة وَّلَا آنَّة ۔یعنی اس کے پاس نہ اونٹنی ہے اور نہ کوئی موٹی بھیڑ اس میں اونٹنی اور بھیڑ کی یہ صفت ان کے صوت کی بنا پر ہے۔ اور حنین چونکہ معنیٰ شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ رحمت کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد رحمت لے لی جاتی ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَّ حَـنَـانـاً مِّنْ لَّدُنَّا﴾ (۱۹۔۱۳) اور اپنے پاس سے شفقت.........دی تھی۔

اسی سے اسمائے حسنیٰ اَلْـحَـنَّانُ وَالْمَنَّانُ ہے جس کے معنیٰ بہت زیادہ رحم کھانے کے ہیں۔حَنَانَيْكَ: تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہو۔یہ لَبَّيْكَ وَ سَـعْدَيْكَ کی طرح تثنیہ لایا جاتا ہے۔

حُـنَيْن: (مکہ اور طائف کے درمیان) ایک مشہور مقام کا نام ہے (جہاں ۸ھ کو جنگ حـنـیـن ہوئی تھی) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (۹۔۲۵) اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرّہ تھا۔

(ح ن ث)

اَلْحِنْثُ: گناہ، نافرمانی قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَـانُـوا يُـصِـرُّونَ عَـلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ﴾ (۵۶۔۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

اسی لئے يَـمِيْن غَمُوْص: (جھوٹی قسم) کو بھی حِنْث کہا جاتا ہے۔اور حَنِثَ فِیْ يَمِيْنِهٖ کے معنیٰ قسم توڑنے کے ہیں اور حِــنْــث کے معنیٰ سن بلوغت کے بھی آتے ہیں۔کیونکہ اس عمر میں انسان جو گناہ کرے گا اس پر اس کا مواخذہ ہوگا۔کہا جاتا ہے بَـلَـغَ فُلَانٌ الْحِنْثَ: فلاں بالغ ہوگیا۔اَلْمُتَحَنِّثُ وہ شخص جو اپنے آپ سے گناہ کو دور کرنے کے لئے عبادت کرے جیسے متحرج اور متاثم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

(ح ن ج ر)

اَلْـحَـنْـجَرَةُ: (نرخرہ) نائے گلو یعنی بیرونی جانب سے حلقوم کا سرا اس کی جمع حنَاجِر آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَـدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ﴾ (۴۰۔۱۸) غم سے بھر کر گلو تک آ رہے ہوں گے۔

﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۳۳۔۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔

(ح ن ذ)

اَلْحَنِيذُ: (بھونا ہوا) قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ﴾ (۱۱۔۶۹) کہ ایک بھونا ہوا بچھڑا لے آئے۔

یعنی وہ بچھڑا جو دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا گیا تھا اور یہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اس سے لزوجت بہہ کر نکل جائے۔یہ حَـنَذْتُ الْفَرَسَ سے ماخوذ ہے

جس کے معنیٰ پسینہ لانے کے لئے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینے کے ہیں ایسے گھوڑے کو مَحْنُوْذٌ اور حَنِیْذٌ کہا جاتا ہے۔

حَنَذَتْنَا الشَّمْسُ: ہمیں سورج نے جھلس دیا۔

اور پسینہ سے چونکہ معمولی سا پانی نکلتا ہے۔اس لئے جب کوئی شراب پلائے تو اس سے کہا جاتا ہے۔اَحْنِذْ یعنی اس میں تھوڑا سا پانی ملالو یعنی پسینہ کی مقدار میں یا اس رطوبت کی طرح جو حَنِیذ یعنی کباب کئے ہوئے گوشت سے نکلتی ہے۔

(ح ن ف)

اَلْحَنْفُ کے معنیٰ گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔اس کے بالمقابل جَنفٌ ہے جس کے معنیٰ ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔

اَلْحَنِیْفُ: (بروزن فعیل) جو باطل کو چھوڑ کر استقامت پر آجائے قرآن پاک میں ہے:

﴿قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا﴾ (۱۶۔۱۲۰) اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک کے ہو رہے تھے۔

﴿حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ (۳۔۶۷) سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے۔

حَنِیْفٌ کی جمع حُنَفَاء آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ﴾ (۲۲۔۳۰، ۳۱) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو صرف ایک خدا کے ہو کر۔

تَحَنَّفَ فُلَانٌ: راہ استقامت کی تلاش کرنا۔

ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا حج کرتا اور ختنہ کرواتا عرب کے لوگ اسے حَنِیْف کہہ کر پکارتے تھے۔یعنی وہ دینِ ابراہیم کا پابند ہے۔

اَلْاَحْنَفُ: جس کے پاؤں میں کجی ہو۔کبھی تفاعل کے طور پر کسی کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ صرف مائل ہونے کے معنیٰ میں بطور استعارہ آتا ہے۔

(ح ن ک)

اَلْحَنْكُ: کے معنی انسان یا چوپائے کے تالو کے ہیں اور کوّے کی چونچ کو حنک کہا جاتا ہے۔کیونکہ یہ اس کے لئے بمنزلہ انسان کے تالو کے ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَسْوَدُ مِثْلَ حَنَكِ الْغُرَابِ اَوْ حَلَكِ الْغُرَابِ (وہ کوّے کی چونچ یا اس کے پروں کی طرح سیاہ ہے) یہاں حنك کے معنیٰ منقار اور حلك کے معنیٰ پروں کی سیاہی کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (۱۷۔۶۲) تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا۔

میں یہ حَنَكْتُ الدَّابَّةَ سے بھی مشتق ہوسکتا ہے جس کے معنیٰ اس کے منہ میں لگادینے یا رسی باندھنے کے ہیں۔پس یہ لَاُلْجِمَنَّ فُلَانًا وَلَاُرْسِنَنَّهٗ کی طرح ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِحْتَنَكَ الْجَرادُ الْاَرْضَ سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفا چٹ کردینے کے ہیں پس آیت کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین پر

سے نبات صفاچٹ کر دیتی ہے۔

حَنَّكَهُ الدَّهْرُ: زمانہ نے اسے تجربہ کار بنادیا۔ جیسا کہ نَجَّرَهُ وَقَرَّعَ سِنَّهُ وَافْتَرَّهُ وغیرہ استعارات تجربہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ح و ب)

اَلْحَوْبُ: (ن) جرم کا ارتکاب کرنا۔ حُوْبٌ (اسم) گناہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا﴾ (۴۔۲) کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے [1]

(۱۰۰) طَلَاقُ أُمِّ أَيُّوْبَ حُوْبٌ کہ ام ایوب کو طلاق دینا گناہ عظیم ہے۔ اور طلاق کو حوب کہنا اس بنا پر ہے کہ وہ ممنوع عنہ ہے اور یہ حَابَ حُوْبًا وَحَوْبًا وَحِيَابَةً سے ہے جس کے معنیٰ ارتکاب جرم کے ہیں۔ اصل میں حَوَبٌ کا لفظ کلمہ زجر ہے جو اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ يَتَحَوَّبُ مِنْ كَذَا: فلاں گناہ سے بچتا ہے جیسے يَتَأَثَّمُ عرب لوگ کہتے ہیں (مثل) اَلْحَقَ اللّٰهُ بِهِ الْحَوْبَةَ: اللہ اسے مسکنت اور احتیاج میں مبتلا کرے اصل میں حَوْبَةَ اس حاجت کو کہتے ہیں جو انسان کو ارتکاب جرم پر آمادہ کرلے کہا جاتا ہے کہ بَاتَ فُلَانٌ بِحِيْبَةِ سُوْءٍ: فلاں نے بری حالت میں رات گزاری۔ الْحَوْبَاءُ فُلَانٌ: بقول بعض نفس کے معنیٰ میں آتا ہے۔ لیکن اصل میں حَوْبَاءُ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہ کا مرتکب ہو جسے قرآن پاک: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (۱۲۔۵۳) میں نفس امارہ سے تعبیر کیا ہے۔

(ح و ت)

اَلْحُوْتُ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَسِيَا حُوْتَهُمَا﴾ (۱۸۔۶۱) تو اپنی مچھلی بھول گئے۔

﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ﴾ (۳۷۔۱۴۲) پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

اس کی جمع حِيْتَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا﴾ (۷۔۱۶۳) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔

اور مچھلی چونکہ رخ بدلتی رہتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے حَاوَتَنِيْ فُلَانٌ اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکا دیا۔

(ح و ج)

الْحَاجَةُ: اس چیز کی ضرورت کو کہتے ہیں جس کی دل میں محبت ہو اس کی جمع حَاجَاتٌ و حَوَائِجُ آتی ہے اور حَاجَ (ن) يَحُوْجُ وَاحْتَاجَ کے معنیٰ ضرورت مند ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰهَا﴾ (۱۲۔۶۸) ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔

﴿حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا......﴾ (۵۹۔۹) اور جو کچھ ان کو

---

[1] اخرجه ابوداؤد وفی المرسل وابراهیم الحربی فی الغریب من روایة ابن سیرین ورواه یحیٰ الهمدانی فی مسنده والطبرانی فی الاوسط عن ابن سیرین عن ابن عباس وزاد: قال ابن سیرین الحوب الاثم وروی الحاکم عن انس لئکن فیه ان طلاق ام سلیم لحوب (راجع للتفصیل ذیل الکشاف ۱: ۴۶۶ وتخریج الکشاف ۳۸رقم ۳۱۶، وفی ذیل الامالی الزق والحوبة المسکنه ۱۲.

ملا اس سے کچھ خواہش۔

اَلْحَوجَاءُ کے معنیٰ حاجت ہی کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ حَاجٌ ایک قسم کے کانٹے کو کہتے ہیں۔

(ح و ذ)

اَلْحَوْذُ: (ن) کے معنیٰ ہیں ہانکنے والا، جو اونٹ کے پیچھے اس کے رانوں کے عین بیچ میں چل کر وہاں سے سختی کے ساتھ اسے ہانکے جائے۔ حَاذَ الْاِبِلَ: سختی کے ساتھ ہانکنا اور آیت:

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ﴾ (۵۸۔۱۹) شیطان نے ان کو قابو میں کرلیا ہے۔

میں استحوذ کے معنیٰ ان پر مسلط ہو کر ہانکنے کے ہیں۔ یہ اِسْتَحْوَذَ الْعِيْرُ عَلَى الْاَتَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی گدھے کا مادہ خر کی پشت پر چڑھ کر دونوں جانب سے قابو پالینا (جیسا کہ جفتی کی صورت میں ہوتا ہے) اس میں ایک قرأت اِسْتَحَاذَ بھی ہے جو قیاس کے مطابق ہے آیت میں شیطان کے بنی آدم پر غلبہ پانے کے لئے اِسْتَحْوَذَ کا استعمال بطور استعارہ کے ہے جیسا کہ اِقْتَعَدهُ الشَّيْطَانُ وَارْتَكَبَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شیطان نے اسے اپنی سواری بنالیا۔

اَلْاَحْوَذِيُّ: مردسبک فہم و نیک کارگزار، کسی چیز کا ماہر یہ حَوْذٌ بمعنیٰ سَوْقٌ (چلانا) سے مشتق ہے۔

(ح و ر)

اَلْحَوْرُ: (ن) کے اصل معنیٰ پلٹنے کے ہیں خواہ وہ پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر کے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ (۸۴۔۱۴) اور خیال کرتا تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہیں آئے گا۔

میں لَنْ يَّحُوْرَ سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ﴾ (۶۴۔۷) جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہدو کہ ہاں ہاں!! میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

حَارَ الْمَاءُ فِي الْغَدِيْرِ: پانی کا حوض میں گھومنا۔

حَارَ فِيْ اَمْرِهٖ: کسی معاملہ میں متحیر ہونا۔

اسی سے مِحْوَرٌ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس پر چرخی گھومتی ہے اور گھومنے کے معنیٰ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

سَيْرُ السَّوَانِيْ اَبَدًا لَّا يَنْقَطِعُ کہ پانی کھینچنے والے اونٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

مَحَارَةُ الْاُذُنِ کان کا گڑھا۔ یہ مَحَارَةُ الْمَاءِ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں آواز سے ہوا اس طرح چکر کاٹتی ہے۔ جیسے گڑھے میں پانی گھومتا ہے۔ اَلْقَوْمُ فِيْ حَوَارٍ یعنی زیادتی کے بعد نقصان کی طرف لوٹ رہے ہیں حدیث میں ہے [1]

(۱۰۱) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ: ہم زیادتی کے بعد کمی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یا کسی کام کا

---

[1] الحدیث فی اللسان(حور) کور، کون) ومجالس ثعلب ۳۵۱ ومجازات القران للشریف الرضی ۲۸۳ والمجازة النبویة واساس البلاغة والفائق ۲: ۳۱۱ وفیه بعدالکون وغریب ابی عبید۱: ۲۱۹ والترمذی فی الدعوات والنسائی فی الاستعاذة و(حم) ۵: ۸۲۔۸۳. المثل فی حل المعاجم

عزم کر لینے کے بعد اس میں تردد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے (مثل)

حَارَ بَعدَ مَا کَارَ: زیادہ ہونے کے بعد کم ہوگیا۔

اَلْمَحَاوِرَۃُ وَالحِوَارُ: ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹانا اسی سے تَحَاوُرٌ (تبادلہ گفتگو) ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَ کُمَا﴾ (۵۸۔۱) اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

کَلَّمْتُهٗ فَمَا رَجَعَ اِلٰی حَوَارٍ اَوْحَوِیْرٍ اَوْ مَحْوَرَۃٍ: میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَایَعِیْشُ بِاَحْوَرَ وہ عقل مندی سے زندگی بسر نہیں کر رہا ہے۔ اور آیات کریمہ:

﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرَاتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ (۵۵۔۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

﴿حُوْرٌ عِیْنٌ﴾ (۵۶۔۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

میں حُوْرٌ اَحْوَرُ اور حَوْرَاءُ کی جمع ہے اور حَوْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ بقول بعض آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔!

اِحْوَرَّتْ عینُهٗ: یعنی اس کی آنکھ بہت سیاہی اور سفیدی والی ہے۔ اور یہ آنکھ کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے۔ جو اس سے مقصود ہوسکتا ہے۔

حَوَّرْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو گھمانا۔ سفید کرنا (کپڑے کا) اسی سے اَلْخُبْزُ الْحَوَّار ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے انصار واصحاب کو حَوَّارِیِّیْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قصار یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ صیاد یعنی شکاری تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حواری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے جس پاکیزگی کی طرف کہ آیت:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا﴾ (۳۳۔۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصّارٌ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی پن کا کام نہیں کرتے تھے۔ اور اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے اسی طرح ان کو صیاد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا [1]: (۱۰۲) الزبیر ابن عمتی وحواریَّ کہ زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے نیز فرمایا: [2] (۱۰۳) لِکُلِّ نَبِیٍّ حَوَارِیٌّ وَحَوَارِیَّ

[1] اخرجه النسائی والترمذی والبخاری من حدیث جابر و(ت ك) عن علی راجع الفتح مناقب زبیر بن العوام وتخریج الکشاف لابن حجر ۱۲۔

[2] قاله نابغة واوله : ولاأری فاعلافی الناس یشبهه الشطرفی الاشباه النحویه (۲ : ۷) والبیت فی مختار الشعر الجاهلی ۱ : ۷۷ والعقد الثمین ۷ واللسان (حشی) ودیوانه ۴۲) والخزانة ۲ : ۴۴) والمغنی لابن هشام ۱ : ۱۳۰) والعینی (۱ : ۳۸) والسیوطی ۲۸۔۲۷) واسرار ابن الانباری ۲۰۸ وشرح العشر للتبریزی ۲۹۶ و اسمه ابوامامة زیادبن معاویه المتوفی (نحو ۱۸ق) واختلف العلماء فی حاشی هل هو فعل اوحرف جر واستدل المبرد بهذا البیت علی ان حاشیٰ قد تکون فعلاً انظر للتفصیل فی البغدادیه ۲ : ۴۴۔۴۵)۔

الزبیر کہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے ۔ اس روایت میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے ۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔

﴿مَنْ اَنْصَارِیٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ (۱۶۔۱۴) بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں ۔حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

(ح و ش)

حَاشا (کلمہ استثناء اور تنزیہہ ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ﴾ (۱۲۔۱۳) یعنی وہ شخص ہر نقص سے پاک اور دور ہے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تنزیہ اور استثناء کے لئے آتا ہے ۔ ابوعلی الفسوی کا قول ہے کہ حاش اسم نہیں ہے ۔ کیونکہ اس پر حرف جر داخل نہیں ہوتا ۔ اور نہ حرف ہے کیونکہ حرف میں جب تک تضعیف نہ ہو اس میں سے حذف نہیں ہوتا ۔ حالانکہ حاش وحاشی دونوں طرح بولتے ہیں ۔ پس بعض حاش کو مستقل کلمہ مان کر اسے حَوش بمعنیٰ وَحْشی سے مشتق مانتے ہیں ۔ اور اسی سے حُوْشِیُّ الْکَلَامِ (وحشی کلام) ہے اور بعض نے کہا ہے حَوش کے معنیٰ مذکر جن کے ہیں اور اسی کی طرف وَحشۃُ الصید منسوب ہے ۔ اور اَحْشَتْہُ کے معنیٰ میں کہ شکار کو ہر طرف سے گھیر کر پھندے کی طرف لایا۔

وَاسْتَوحَشُوہُ وَتَحوَّشُوہُ: انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اَلْحَوْشُ (ن) ایک کنارے سے کھانا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حشی سے مقلوب ہے اور اسی سے حَاشِیَۃ ہے جس کے معنیٰ کنارے کے ہیں ۔ شاعر نے کہا ہے (بسیط)

(۱۲۲) وَمَا اُحَاشِی مِنَ الْاَقْوَامِ مِن اَحَدٍ

اور لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا (گویا شاعر نے کہا) ہے کہ میں کسی کو ایک حشا میں نہیں رکھتا ۔ کہ تمہاری فضیلت بیان کرتے وقت اسے مستثنیٰ کرنا پڑے۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے (طویل)

(۱۲۳) وَلَا یَتَحَشَّی الفَحْلُ اِن اَعْرَضَتْ بِہٖ
وَلَا یَمْنَعُ الْمِربَاعَ مِنہ فصیلھا

(ح و ط)

اَلْحَائِطُ: دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور اِحَاطۃ (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اجسام کے متعلق جیسے ۔ اَحَطْتُ بِمَکَانِ کَذَا یہ کبھی ❶ بمعنیٰ حفاظت کے آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ﴾ (۴۲۔۵۴) سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ اور کبھی روکنے کے معنیٰ میں آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ یُّحَاطَ بِکُمْ﴾ (۱۲۔۶۶) مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ ۔ یعنی تمہیں روک لیا جائے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ﴾ (۲۔۸۱) اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں۔

میں بہت بلیغ استعارہ ہے کیونکہ انسان جب کسی صغیرہ گناہ

---

❶ قالہ رجل من بنی عکل والبیت فی المعانی للقتبی ۳۹۲ و ۱۲۳۷ اللسان (حشی) عن الباھلی فی المعانی ۱۲۳).

کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے بار بار کرتا ہے تو یہ اسے کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے۔اس طرح وہ برابر گناہوں کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔اور وہ گناہ کو چھوڑ نہیں سکتا (تو گویا گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا)۔

(۲) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:

﴿قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۵۔۱۲) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ (۳۔۱۲۰) یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيطٌ﴾ (۱۱۔۹۲) میرا پروردگار تو تمہارے سب اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور کسی چیز پر علم کے ذریعے احاطہ کر لینے کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت، اس کی غرض اور اس کو ماله و ماعلیه کو پوری طرح جان لے۔اور اس طرح کا احاطہ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن پاک نے مخلوق سے اس قسم کے احاطہ علمی کی نفی کی ہے۔جیسے فرمایا: ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ (۱۰۔۳۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پاسکتے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔اور خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا:

﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا﴾ (۱۸۔۶۸) اور جس بات کی تمہیں خبر ہی نہیں اس پر صبر کر بھی کیونکر سکتے ہو۔

اس میں تنبیہ ہے کہ جب تک کسی چیز پر پوری طرح احاطہ نہ ہو اس وقت تک کامل صبر بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی چیز کے بغیر ناممکن ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ﴾ (۱۰۔۲۲) اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو لہروں میں) گھر گئے۔

میں احاطہ بالقدرۃ مراد ہے اسی طرح فرمایا:

﴿وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا﴾ (۴۸۔۲۱) اور غنیمتیں دیں جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔

﴿اِنِّیْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ﴾ (۱۱۔۸۴) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا۔

اَلْاِحْتِيَاطُ: (افتعال) یعنی ایسے وسائل بروئے کار لانا جن کے ذریعہ کسی (مضر) سے بچاؤ ہوسکے۔

(ح و ل)

اَلْحَوْلُ: (ن) دراصل اس کے معنیٰ کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں۔ معنیٰ تغییر کے اعتبار سے حَالَ الشَّیْءُ يَحُوْلُ حُوُوْلًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کسی شے کے متغیر ہونے کے ہیں۔اور استحالَ کے معنیٰ تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنیٰ انفصال کے اعتبار سے حَالَ بَيْنِیْ وَبَيْنَكَ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہوگئی۔اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ (۸۔۲۴) اور جان رکھو! کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔

میں باری تعالیٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے

مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اسے اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ (۳۴۔۵۴) (ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کردیا گیا) بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔ بعض نے آیت ﴿يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مہلت دے رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ارذل عمر کی حد تک پہنچ جائے اور جاننے کے بعد کسی چیز کو بھی نہ جان سکے۔

حَوَّلْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا۔ اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ أَحَلْتُ عَلٰی فُلَانٍ بِالدَّيْنِ: میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کردیا۔ حَوَّلْتُ الْكِتَابَ: کتاب کو نقل کرنا۔ مثل مشہور ہے [1] لَوْ كَانَ ذَا حِيْلَةٍ لَتَحَوَّلَ: اگر صاحب تدبیر ہوتا تو پھر جاتا اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (۱۸۔۱۰۸) اور وہاں سے مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔ میں حِوَلًا کے معنیٰ تَحَوَّل یعنی پھرنے کے ہیں۔

اَلْحَوْلُ: سال کو کہتے ہیں اس لئے کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کرلیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (۲۔۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

﴿مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ (۲۔۲۴۰) کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

اسی سے حَالَتِ السَّنَةُ تَحُوْلُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں سال گزر گیا۔ حَالَتِ الدَّارُ گھر کی حالت متغیر ہوگئی۔

اَحَالَتْ وَاَحْوَلَتْ: اس پر ایک سال پورا ہوگیا۔ جیسا کہ اَعَامَتْ وَاَشْهَرَتْ کا محاورہ ہے۔

اَحَالَ فُلَانٌ بِمَكَانٍ كَذَا: وہ فلاں جگہ پورا ایک سال رہا۔

حَالَتِ النَّاقَةُ تَحُوْلُ حِيَالًا اونٹنی کا حاملہ نہ ہونا۔ گویا اسکی پہلی حالت متغیر ہوگئی۔

اَلْحَالُ: انسان وغیرہ کی وہ حالت جو نفس جسم اور مال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے اور حَوْل کالفظ مالی، بدنی، اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بولا جاتا ہے اسی سے کہا جاتا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ: اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں ہے۔

حَوْلُ الشَّیْءِ: کسی چیز کی وہ جانب جس کی طرف اسے پھیرنا ممکن ہو، حَول کہلاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ﴾ (۴۰۔۷) اور جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرداگرد (حلقہ باندھے ہوئے) ہیں۔

اَلْحِيْلَةُ وَالْحُوَيْلَةُ: اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی

---

[1] راجع للمثل الميدانی رقم ۳۲۳٤, ۲٦٤١, ۱۳٤.

چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جا سکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے وصف میں: ﴿وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳۔۱۳) آیا ہے یعنی باری تعالیٰ خفیہ سے اس کام کو سرانجام دیتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اور اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کو مکر و کید کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے۔ نہ کہ بطور مذمت کے اللہ تعالیٰ تو ہر قبح سے پاک اور بالا ہے اور حِيلَةٌ بھی حَول سے مشتق ہے۔ واؤ کا ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے اسے یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اسی سے رَجُلٌ حُوَلٌ کا محاورہ ہے یعنی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔

اَلْمَحَالُ کے معنیٰ ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کبھی قول میں ہوتا ہے جیسے کہا جائے ایک جسم دو جگہوں میں ایک ہی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ: کسی چیز کا محال ہونا اور اس چیز کو مُسْتَحِيلٌ کہا جاتا ہے یعنی محال ہونے لگی۔ اَلْحِوَلَاءُ: یعنی سبزی جھلی جو اونٹنی کے پیٹ سے بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔

مثل مشہور ہے ❶ وَلَا اَفْعَلُ كَذَا مَا اَرْزَمَتْ اُمُّ حَائِلٍ: جب تک کہ اونٹنی آواز نکالتی رہے، میں اس کام کو نہیں کروں گا اور ام حائل اس شتر بچہ مادینہ کو کہتے ہیں جو ابھی پیٹ سے باہر آیا ہو اور اس میں شبہ نہ رہا ہو کہ یہ مادہ ہے حالت اشتباہ کے دور ہونے کی وجہ سے اسے ام حائل کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں مذکر کو سقب کہا جاتا ہے۔ اَلْحَالُ: لغت میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز موصوف ہوتی ہے اور اہل منطق کی اصطلاح میں سریع الزوال کیفیت کو حالت کہا جاتا ہے۔ جیسے حرارت برودت، یبوست اور رطوبت جو کسی چیز کو عارض ہوتی ہے۔

(ح و ی)

اَلْحَوَايَا (انتڑیاں) یہ حَوِيَّةٌ کی جمع ہے جس کے معنیٰ آنت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوِ الْحَوَايَا اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ﴾ (۶۔۱۴۶) انتڑیوں میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔

اور حَوِيَّة اس کمبل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کے اردگرد لپٹا جاتا ہے۔ یہ اصل میں حَوَيْتُ (ض) حَيًّا وَحَوَايَة سے مشتق ہے جس کے معنیٰ جمع کرنے کے ہیں۔

اَلْاَحْوٰی: کالا سیاہ مائل بہ سبزی۔ یہ حَوَّةٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ سبزی مائل سیاہی ہیں اور اس کا باب احْوَوَیٰ يَحْوَوِیٰ اِحْوِوَاءٌ آتا ہے جیسے اِرْعَوٰی بعض نے کہا ہے کہ اس وزن پر یہ دو باب ہی آتے ہیں وَلَا ثَالِثَ لَهُمَا حَوِیَ حُوَّة سیاہ سبزی مائل ہونا اسی سے اَحْوٰی ہے جس کے معنیٰ سخت سیاہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی﴾ (۸۷۔۵) پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔

یہاں اَحْوٰی سے مراد ہے وہ گھاس جو پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ❷ ؏

---

❶ ای لاافعله ابداً راجع اللسان (حول) والامالی امر ۲۱.

❷ لم اجرها ويرجی ۱۲.

(۱۲۴) طَالَ حَبْسٌ بِالدَّرِينِ الاَسْوَد:
پرانی خشک اور سیاہ گھاس میں عرصہ سے محبوس ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کی ترتیب اصل یہ ہے ❶ وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۔ اَحْوٰی فَجَعَلَه غُثَاءً: یعنی اللہ تعالیٰ سبز چارہ اگاتا ہے پھر اس کو کوڑا بنا دیتا ہے۔

(ح ی ث)

حَیْثُ: (یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے) اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ﴾ (۲۔۱۴۴) اور تم جہاں ہوا کرو۔
﴿وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ﴾ (۲۔۱۴۹) اور تم جہاں سے نکلو۔

(ح ی د)

اَلْحَیْدُ: (ض) کے معنیٰ پہلوتہی کرنے اور دور بھاگنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ذٰلِكَ مَا کُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ﴾ (۵۰۔۱۹) (اے انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

(ح ی ر)

حار (ض) حَیْرَةً فَهُو حَائِرٌ وَحِیْرَان وتَحَیَّر وَاستَحارَ کے معنیٰ کسی کام سے بھٹکنے اور متردد ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿کَالَّذِیْ اسْتَهْوَتْهُ الشَّیطَانُ فِی الْاَرْضِ حَیْرانَ﴾ (۶۔۷۱) جیسے کسی کو جنات نے جنگل میں بھلا دیا ہو۔ (اور وہ) حیران ہو رہا ہو۔
اَلْحَائِرُ: جائے گرداب۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۱۲۵) وَاسْتَحَارَ شَبَابُهَا

اور اس کی جوانی بھرپور ہوگئی۔ اور استحار کے معنیٰ پانی سے پیٹ کے اس قدر پر ہو جانے کے ہیں کہ اسے حیرت لاحق ہو جائے۔
اَلْحِیْرَةُ: ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس مقام کا نام حیرہ پڑ گیا تھا۔

(ح ی ص)

حَاصَ (ض) عَنِ الحَقِّ کے معنیٰ حق سے بھاگ کر شدت ومکروہ کی طرف جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿هَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ﴾ (۵۰۔۳۶) کہ کہیں بھاگنے کی جگہ ہے۔
﴿مَالَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ﴾ (۱۴۔۲۱) کوئی جگہ گریز اور رہائی ہمارے لئے نہیں ہے۔
یہ اصل میں حَیْصٌ وَبَیْصٌ سے ہے جس کے معنیٰ شدت اور سختی کے ہیں۔ مگر اَلْحَوصُ (اجوف وادی) ہو تو اس کے معنیٰ چمڑا سلنا ہوتے ہیں اور اسی سے حُصْتُ عَینَ الصَّقْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ صقرہ کی آنکھیں سی دینے کے ہیں۔

---

❶ وعلیٰ هذا التقدیر یکون احویٰ حالاً کمافی الکشاف ٤ : ۷۳۸ وذکره ثعلب فی مجالسه ۳۷۰ فی امثلة القلب ۱۲.

❷ قاله ابو ذؤیب الهذلی وتکملته ثلاثة اعوام فلماتجرمت ۔تقتضی شبابی .... والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (حرم) والمحکم (حیر) وفی روایته احوال بدل اعوام الینا بهون بدل تقتضی بدل تقضیٰ شبابی ودیوان الهذلیین الستة (۱ : ۷۱) والسیوطی ۹ فی روایته علینا بهون وکذافی (س) ودیوان الهذلیین ۱۲.

(ح ی ض)

اَلْـحَیْـضُ: وہ خون جو مخصوص دنوں میں صفت خاص کے ساتھ عورت کے رحم سے جاری ہوتا ہے اسے حیض کہا جاتا ہے اور محیض کے معنیٰ حیض، وقت حیض اور مقام حیض کے ہیں۔ کیونکہ فعل سے اس قسم کے مصادر مَفعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے مَعَاشٌ وَمَعَادٌ اور شاعر کے قول ❶ ع (الکامل)

(۱۲۶) لَایَسْتَطِیْعُ بِهَا الْقُرَادُ مَقِیْلًا

(کہ چچڑی اس میں قیلولہ کی جگہ بھی نہیں پاتی)

میں مـقیلا ظرف ہے یعنی قیلولہ کرنے کی جگہ گو بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے اور کہا جاتا ہے مَـا فِـی بُـرِّكَ مَكِیلٌ وَمَكَالٌ کہ تیرے غلہ میں ماپ نہیں ہے۔

(ح ی ف)

اَلْـحَیْفُ: (ض) فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو جھک جانا انصاف نہ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ یَـخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَـلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (۲۴۔۵۰) یا ان کو خوف ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کریں گے۔ (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

تَحَیَّفْتُ الشَّیْءَ میں نے اسے کناروں سے پکڑا۔

(ح ی ق)

اَلْحَیُوْقُ وَالْحَیْقَانُ: (ض) کے معنیٰ کسی چیز کو گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ اور یہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا یَـحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (۳۵۔۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَحَـاقَ بِهِـمْ مَّاكَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ (۴۶۔۲۶) اور جس چیز سے استہزاء کیا کرتے تھے اس نے ان کو آگھیرا۔

(ح ی ن)

اَلْـحِیْـنُ: اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعیین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَاتَ حِیْـنَ مَـنَاصٍ﴾ (۳۸۔۳) اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

اور بعض نے حینٌ (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے پس حین کا استعمال چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) مدت اور اجل کے معنیٰ میں جیسے فرمایا:

﴿وَمَتَّـعْنَاهُمْ اِلٰی حِیْنٍ﴾ (۱۰۔۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دینوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

(۲) سال اور برس کے معنیٰ میں جیسے:

﴿تُـؤْتِیْ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ (۱۴۔۲۵) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو۔

---

❶ قاله الراعی النمیری عبید بن حصین بن جندل الراعی (ابو جندل هو من فحول الشعراء) وصدره: بنیت مرافقهن فوق مزلة ...... والبیت من كلمة جمهریة طویلة (۳۳۱۔۳۳۷) وراجع للبیت اللسان (زلل) وامالی المرتضیٰ ۱: ۳۲۳) والبحر ۲: ۱۶۷) والكتاب ۲: ۳۴۷) مع شرحه للشنتمری المخصص ۹: ۱۲/۱۶/۵۵ والمحكم (حیض) واللسان وفیه مایستطیع والحیوان (۵: ۴۳۷) وفی روایته نبتت بدل بنیت وفی بعض الروایات ثبتت ۱۲۔

(۳) ایک ساعت اور گھڑی کے معنی میں جیسے فرمایا:

﴿حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۷) تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو......

(۴) مطلق زمانہ اور وقت کے معنی میں جیسے فرمایا:

﴿هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (۷۶۔۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے۔

﴿وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ﴾ (۳۸۔۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ اور کسی ایک معنی کی تعیین موقع محل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عَامَلْتُهٗ مُحَایَنَةً: میں نے اس سے وقتاً فوقتاً معاملہ کیا۔

اَحْیَنْتُ بِالْمَکَانِ: میں وہاں ایک عرصہ ٹھہرا رہا۔

حَانَ حِیْنُ کَذَا: فلاں چیز کا موسم قریب آ پہنچا۔

حَیَّنْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کے لئے وقت مقرر کرنا۔ اور اَلْحَیْنَ (بفتح الحاء) کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں۔

(ح ی ی)

اَلْحَیَاةُ: (زندگی، جینا یہ اصل میں حَیِیَ (س) یَحْیٰی کا مصدر ہے) کا استعمال مختلف وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) قوت نامیہ جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے نبات کو حَیٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۵۷۔۱۷) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

﴿فَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا﴾ (۵۰۔۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ (۲۱۔۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(۲) دوم حیاۃ کے معنی قوت احساس کے آتے ہیں اور اسی قوت کی بنا پر حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتًا اَحْیَاءً وَّ اَمْوَاتًا﴾ (۷۷۔۲۵،۲۶) اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (۴۱۔۳۹) تو جس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

میں زمین کو زندہ کرنے سے اسے قوت نامیہ عطا کرنا مراد ہے اور مُحْیِ الْمَوْتٰی سے قوت احساس کے عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قوت عاقلہ عاملہ کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتاً فَاَحْیَیْنٰهُ﴾ (۶۔۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۲۷) لَقَدْ اَسْمَعْتَ لَوْنَادِیْتَ حَیًّا

---

[1] البیت فی التاج غیر منسوب والطبرسی ۱: ۹٦) والطبری ۵: ۷۸ والبحر ۱: ۳۷۲۔٤۸٦) وتنزیه القران اوفیه لقد بدل وقد وایضاً لطالف المعارف للبونی ۳۲۷ وفی المطبوع وقد نادیت لواسمعت حیامقلوب ثم رایت فی البلدان (رسم ابیه) ان قائله کثیر یرثی صدیقه خندفانی ۱۹ بیتاً ۱۲.

وَلٰـکِـنْ لَّا حَیَـاۃَ لِـمَـنْ تُـنَـادِیْ

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سُن لیتا۔لیکن جس کو تم پکارتے رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے)

(۴) غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔اس معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے ❶ (ضعیف)

(۱۲۸) لَیْسَ مَنْ مَّاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَیْتٍ
اِنَّـمَـا الْـمَیْـتُ مَیِّـتُ الْاَحْیَـاءِ

جو شخص مر کر راحت کی نیند سو گیا وہ درحقیقت مردہ نہیں ہے۔حقیقتاً مردے وہ ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردے بنے ہوئے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَـحْسَبَـنَّ الَّـذِیْـنَ قُتِـلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْـوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۳۔۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔ میں شہدا کو اسی معنیٰ میں اَحْیَـــاءٌ یعنی زندے کہا ہے۔کیونکہ وہ لذت وراحت میں ہیں۔جیسا کہ ارواح شہداء کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے۔جو کہ علم وعقل کی زندگی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِسْتَـجِیْبُـوْا لِـلّٰـهِ وَلِـلرَّسُولِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُـحْیِیْکُمْ﴾ (۸۔۲۴) خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔اسی طرح آیت کریمہ:

﴿یٰـلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ﴾ (۸۹۔۲۴) کاش میں نے اپنی زندگی (کی جاودانی کے لئے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔میں بھی اخروی دائمی زندگی مراد ہے۔

(۶) وہ حیات جس سے صرف ذات باری تعالیٰ متصف ہوتی ہے۔چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں حَـــیٌّ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات اقدس ہوتی ہے جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

پھر دنیا اور آخرت کے لحاظ سے بھی زندگی دو قسم پر ہے یعنی حیات دنیا اور حیات آخرت چنانچہ فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ○ وَاٰثَرَ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا﴾ (۷۹۔۳۷، ۳۸) تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم

---

❶ البیت مقطوعة لعدی بن الرعلاء العنانی جاهلی وهو الذی یقال له کوئی ابن الرعلا(التاج ـ کوت ـ کوث) والنحویون یستشهدون به راجع معالم الابتداء للزبیدی ص) والبیت فی الاصمعیات ٥: وتهذیب الالفاظ ٤٤٨ والمعجم والمرزبانی ٨٦ والسمط ٨: ٦،٣ والخزانة ٤: ١٨٧) وابن الشجری ٥١ والسیوطی ٣٨،٤: ٤٨٧ والاقتضاب ٨٩ ومجازالقران ١٤٩ رقم ١٧٩ والصناعتین ٣١٥ والبحر (١: ٢٠٩)وایام العرب ٥٣ والرسالة القشیریه ٣٤ والمحکم(شعث) فی امثلة بیت التشعیث واضداد ابی الطیب ١: ٣١٨ ونسبه البحتری فی الحماسة ٢١٤ ویاقوت فی الارشاد ٩: ١٢ والمعجم ٢٦٩الی صالح بن عبدالقدوس قال الاستاذ المیمنی فی ذیل السمط وهو به الیط وبمذهبه اوفق والاسف ان الاستاذ حسن کامل الصیرفی نقل تخریج المیمنی بغیر عزوفی تعلیقاته علی دیوان البحتری وذکرالجاحظ فی البیان (١: ١٣٢) ان الحسن البصری کان یتمثل بهذا البیت فی مجلسه ومواعظه راجع الحیوان ٦: ٥٠٧ وکنز العمال رقم ٢٥٥١ (الدیلمی عن انس او ابن عباس واضداد ابی الطیب ٣١٨ ولطائف المعارف للبونی ٣٢٧ وفی المیدانی ٢٨٩١مثل یضرب بمن یوعظ فلایقبل ولایفهم وفی المعجم للمرزبانی واللالئی ان الشاعر قالها فی وقعة عین اباغ بین الغساسنه بالشام والمناذرة بالعراق واولها: کم ترکنابالعین عین اباغ من ملوك وسوقة القاء وبعد الشاهد انما المیت من یعیش ذلیلا ـ کاسفاباله قلیل الرجاء وبهذایتضح المراد ١٢.

سمجھا۔

﴿اِشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ﴾ (۲۔۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ (۱۳۔۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت (کے بدلے) میں (بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔ یہاں متاع سے دنیاوی ساز وسامان مراد ہے۔

﴿وَرَضُوْا بِالْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا﴾ (۱۰۔۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی سے مطمئن ہو بیٹھے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ﴾ (۲۔۹۶) بلکہ تم ان کو اور لوگوں سے زندگی پر کہیں حریص دیکھو گے اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی.........﴾ (۲۔۲۶۰) اور جب ابراہیم نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اخروی زندگی کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ جو دنیوی آفات کے شوائب سے پاک ہوگی۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ (۲۔۱۷۹) اور اے اہل عقل! (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگی ہے۔ میں قصاص میں حیات ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ قصاص کے خوف سے لوگ قتل پر اقدام کرنے سے رکے رہیں گے۔ لہٰذا اس سے لوگوں کو زندگی حاصل ہوگی۔

﴿وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ (۵۔۳۲) اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔

یعنی انہیں ہلاکت سے نجات بخشی اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ﴾ (۲۔۲۵۸) میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی کرسکتا ہوں۔

میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں اس کافر کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک شخص کو معاف کرکے اسے زندگی بخشتا ہوں۔

اَلْحَیَوَان: یہ زندگی کا مقام اور مقر ہوتا ہے اور دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ جس میں قوت احساس ہو۔

(۲) وہ جسے دائمی بقا حاصل ہو اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْکَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹۔۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔

میں اسی دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے دار آخرت کو حیوان کہا گیا ہے۔ اور لَھِیَ الْحَیَوَان کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ حقیقی اور سرمدی زندگی تو وہ ہے جس کے بعد فنا نہ آئے نہ کہ وہ جو کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ حَیَوَان اور حیاۃ دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حَیَوَان وہ ہے جس میں حیاۃ یعنی زندگی ہو اس کے مقابل مَوَتان وہ ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ اور بارش کو حَیَا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ (۲۱۔۳۰)

میں اسی معنیٰ کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى﴾ (۱۹۔۷) میں انہیں یحییٰ کہنے سے صرف یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ وہ اس نام سے مشہور ہوں گے۔ کیونکہ اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ گناہوں سے ان کا دل مردہ نہیں ہوگا جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے اور آیت کریمہ:
﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ (۳۰۔۱۹) وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ نطفہ سے انسان پیدا کرتا ہے اور انڈے سے مرغی۔ اسی طرح زمین سے نباتات نکالتا ہے اور انسان سے نطفہ۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (۴۔۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دیا کرو یا انہی لفظوں سے دعا دو۔ نیز ﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۔۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو۔ (یہ خدا کی طرف سے...... تحفہ ہے۔
میں تَحِيَّة کے معنیٰ کسی کو حَيَّاكَ اللّٰهُ کہنے کے ہیں یعنی اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ اصل میں جملہ خبریہ ہے لیکن دعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے حَيَّا فُلَانٌ فُلَانًا تَحِيَّةً: فلاں نے اسے حَيَّاكَ اللّٰهُ کہا۔ اصل میں تَحِيَّة حیات سے مشتق ہے۔ پھر دعائے حیات کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جملہ اقسام تحیۃ حصول حیاۃ یا سبب حیاۃ سے خارج نہیں ہیں خواہ یہ دنیا میں حاصل ہو یا عقبیٰ میں۔ اسی سے اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ہے [1] اور آیت کریمہ:
﴿وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآئَكُمْ﴾ (۲۔۴۹) اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔
کے معنیٰ عورتوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ہیں۔
اَلْحَيَاءُ کے معنیٰ قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حَيِيَ فَهُوَ حَيٌّ وَاسْتَحْيَا فَهُوَ مُسْتَحْيٍ: اور بعض نے اِسْتَحٰى فَهُوَ مُسْتَحٍ (تخفیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲۔۲۶) خدا اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔
﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ﴾ (۳۳۔۵۳) لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔
ایک روایت میں ہے:
(۱۰۳) اِنَّ اللّٰهَ يَسْتَحْيِيْ مِنْ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ اَنْ يُّعَذِّبَهٗ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔
پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنیٰ

---

[1] ویسمیٰ التشهد فی الصلوة والفاظه وردت فی غیر حدیث والمعروف تشهد عبدالله بن مسعود اخرجه الائمة الستة ومنها تشهد ابن عباس واختاره الشافعی وذهب مالك واصحابه الی تشهد عمر راجع الزرقانی علی الموطا ۱: ۱۷۶۔ ۱۷۸)۔

انقباض نفس کے نہیں ہوتے ۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے ۔ [1]

(۱۰٤) اِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ کہ اللہ حَیٌّ ہے تو اس کے معنیٰ بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے ۔

❀❀❀

---

[1] ورد الحديث بالفاظ مختلفه وتمامه كريم يستحي من عبده اذارفع يديه ان يردهما ضغرا راجع ابوداؤد والترمذى وابن ماجة من حديث سلمان والحديث ايضاً فى المستدرك للحاكم عن انس وابى يعلىٰ عن جابر ابن عمر عن الطبرانىٰ وراجع عون المعبود ۱: ۵۵۳ والكافى لابن حجر رقم ۳٦ وكنزالعمال رقم ۲٤۳ و ۲٤٦ و ۳۵۳ و ۲۸٤ (عبدالرزاق عن انس) والحكيم الترمذى ايضاً عن انس ج ۲ وايضاً ۳۸٤ ـ ۳۸٦ .

کتَابُ الْخَاءِ

(خ ب ء)

اَلْخَبْءُ: (ف) کسی چیز کے پوشیدہ اور مخفی ذخیرہ کو خباءً کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اَلَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْأَ﴾ (۲۷۔۲۵) جو چھپے ہوئے خزانے نکالتا ہے۔
اسی سے جَارِیَۃٌ خُبَأَۃٌ (طُلَعَۃٌ) کا محاورہ ہے ❶ یعنی وہ لڑکی جو کبھی پردہ میں چلی جاتی ہو اور کبھی باہر نکل آتی ہو۔
اَلْخِبَاءُ۔ وہ نشان جو (اونٹنی کے) کسی خفیہ مقام پر لگایا جاتا ہے۔

(خ ب ت)

اَلْخَبْتُ: نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اور اَخْبَتَ الرَّجُلُ کے معنیٰ نشیبی اور نرم زمین کا قصد کرنے یا وہاں اترنے کے ہیں (جیسے اَسْھَلَ وَاَنْجَدَ) اس کے بعد لفظ اَلْاِخْبَاتُ (افعال) اور تواضع کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔
﴿وَاَخْبَتُوْا اِلٰی رَبِّھِمْ﴾ (۱۱۔۲۳) اور اپنے پروردگار کے آگے عاجزی کی۔
﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ﴾ (۲۲۔۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔
یعنی تواضع کرنے والوں کو جیسا کہ دوسری جگہ انہی لوگوں کے متعلق:
﴿لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ﴾ (۷۔۲۰۶) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۲۲۔۵۴) تو ان کے دل اللہ کے سامنے عاجزی کریں میں اخبات کے معنیٰ دلوں کے نرم ہونے اور عاجزی کرنے کے ہیں۔ اور یہاں اس کے معنیٰ قریباً وہی ہیں جو کہ آیت:
﴿وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ﴾ (۲۔۷۴) اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہبوط کے ہے۔

(خ ب ث)

اَلْمُخْبِثُ وَالْخَبِیْثُ: ہر وہ چیز جو ردی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقائد و خیالات) سے تعلق رکھتی ہو اصل میں خبیث ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے

(۱۰۹) سَبَکْنَاہُ وَنَحْسِبُہٗ لُجَیْناً
فَاَبْدَی الْکِیْرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِیْدِ

ہم نے اسے اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ اس اعتبار سے یہ اعتقاد باطل کذب اور فعل قبیح سب کو شامل

❶ والمعروف فی المثل خُبَأَۃٌ طُلَعَۃٌ فھھنا سقوط۔

ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (۷۔۱۵۷) اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔
یعنی محظورات جو طبیعت کے ناموافق ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (۲۱۔۷۴) اور اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے بچا نکالا۔
میں عمل خبائث میں لذت اندوزی کے لئے مردوں کی طرف مائل ہونے سے کنایہ ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۳۔۱۷۹) جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کردے گا۔میں اعمال خبیثہ کو اعمال صالحہ سے اور بد باطن لوگوں کو نفوس زکیہ سے تمیز دینا مراد ہے۔اور آیت:
﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۴۔۲) اور ان کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو اپنے ناقص اور برے مال سے نہ بدلو۔
میں خبیث اور طیّب سے حلال اور حرام مراد ہیں۔اور فرمایا:
﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ﴾ (۲۴۔۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے۔
یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، بدباطن اور آوارہ لوگ ہی کرتے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ﴾ (۵۔۱۰۰) کہہ دو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔
میں خبیث اور طیب سے کافر اور مومن اور اچھے اور برے اعمال مراد ہیں۔اور آیت:
﴿مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ﴾ (۱۴۔۲۶) اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔میں کفر، جھوٹ، چغلی ہر قسم کی قبیح باتیں داخل ہیں حدیث میں ہے:
اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهٖ کہ مؤمن اپنے عمل سے پاک اور کافر اپنے عمل سے ناپاک ہے۔
اور خبیث و مُخبِث خبث کے مرتکب کو بھی کہا جاتا ہے۔

(خ ب ر)

اَلْخَبْرُ: جو باتیں بذریعہ خبر کے معلوم ہوسکیں ان کے جاننے کا نام "خبر" ہے کہا جاتا ہے۔
خَبَرْتُهٗ خُبْرَةً وَاَخْبَرْتُ: جو خبر مجھے حاصل ہوئی تھی اس کی میں نے اطلاع دی۔بعض نے کہا ہے کہ خُبْرَةٌ کا لفظ کسی معاملہ کی باطنی حقیقت کو جاننے پر بولا جاتا ہے۔
اَلْخَبَارُ وَالْخَبْرَآءُ: نرم زمین۔اور کبھی درختوں والی زمین پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
اَلْمُخَابَرَةُ: بٹائی پر کاشت کرنا۔اسی سے کسان کو "خَبِيْرٌ" کہا جاتا ہے۔
اَلْخِبْرُ: چھوٹا توشہ دان۔تشبیہ کے طور پر زیادہ دودھ دینے والی اونٹنی کو بھی خِبْرٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت ہے:
﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۵۰۔۳) اور جو کچھ تم

کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی حقیقت کو جانتا ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تمہارے باطن امور سے واقف ہے۔اور بعض نے خَبِیرٌ بمعنی مُخْبِرٌ کہا ہے۔جیسا کہ آیت:
﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۶۲۔۸) پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتا دے گا سے مفہوم ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَنَبْلُوا اَخْبَارَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۱) اور تمہارے حالات جانچ لیں۔
﴿قَدْ نَبَّأَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہم کو تمہارے سب حالات اللہ نے بتا دیئے ہیں۔
یعنی تمہارے احوال سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔

(خ ب ز)

اَلْخَبزُ: روٹی۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَحْمِلُ فَوقَ رَأْسِي خُبْزاً﴾ (۱۲۔۳۶) کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔
اَلْخُبْزَةُ: نان کو ماج۔اَلْخَبْزُ۔ (مصدرض) روٹی بنانا۔
اخْتَبَزَ: (افتعال) روٹی بنانے کا حکم دینا۔
اَلْخِبَازَةُ: نانبائی کا پیشہ۔
استعارہ کے طور پر خُبزٌ کے معنی سخت ہنکانے کے بھی آ جاتے ہیں۔کیونکہ ہانکنے والا بھی اسی طرح ہاتھ مارتا ہے جیسے روٹی بنانے والا کرتا ہے۔

(خ ب ط)

اَلْخَبْطُ: (ض) کے معنی کسی چیز کو اندھا دھند بدون استواری کے مارنے کے ہیں۔جیسے اونٹ کا زمین پر اگلا پاؤں مارنا یا آدمی کا لاٹھی کے ساتھ درخت سے پتے جھاڑنا۔اور درخت سے جھاڑے ہوئے پتوں کو بھی خَبَطٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ مضروب پر ضَربٌ کا لفظ بول لیتے ہیں۔پھر استعارہ کے طور پر بادشاہ کے ظلم پر بھی خَبْطٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ ظالم بادشاہ کو خَبُوطٌ کہا جاتا ہے۔
اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا یہ محاورہ حَبْطُ الوَرْقِ (درخت سے پتے جھاڑنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔
اور آیت: ﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (۲۔۲۷۵) جیسے کسی کو جن نے لپیٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔
میں يَتَخَبَّطُ کے معنی خَبطُ الشَّجَرِ سے بھی لئے جاسکتے ہیں۔اور اختباط سے بھی۔جس کے معنی احسان کا مطالبہ کے ہیں۔ایک روایت میں ہے [1]
(۱۰۵) اَللّٰهُمَّ اَعُوذُ بِكَ اَنْ يَتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ: اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے لپٹ کر دیوانہ بنا دے۔

(خ ب ل)

اَلْخَبَالُ وَالْخَبَلُ وَالْخَبْلُ: اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔جیسے جنون یا وہ مرض جو عقل و فکر پر اثر انداز ہو۔کہا جاتا ہے۔خَبَلَهٗ وَخَبَّلَهٗ فَهُوَ خَابِلٌ وَالْجَمعُ خُبَّلٌ رَجُلٌ مُّخَبَّلٌ۔دیوانہ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ

---

[1] رواه النسائی ۲: ۳۲۰ من حديث ابی اليسر ۱۲.

دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (۳۔۱۱۸) مومنو! (کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا راز دان نہ بنانا۔ یہ لوگ تمہاری خرابی (اور فتنہ انگیزی کرنے) میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

﴿وَمَا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ (۹۔۴۷) تو تمہارے حق میں شرارت کرتے۔

اور حدیث میں ہے [1]

(۱۰۶) مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ ثَلَاثًا کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ اَنْ یَّسْقِیَهٗ مِنْ طِیْنَةِ الْخَبَالِ: جو شخص تین مرتبہ شراب پیے گا تو اللہ تعالیٰ اسے لازماً دوزخیوں کی پیپ پلائے گا۔

زہیر نے کہا [2] ع (طویل)

(۱۳۰) هُنَالِكَ اِنْ یُّسْتَخْبَلُوا الْمَالُ یَخْبِلُوا

یعنی ایسے موقعہ پر اگران سے مال مانگا جائے تو وہ مال دے دیتے ہیں۔

(خ ب و)

خَبَتِ (ن) النَّارُ: آگ کا شعلہ افسردہ ہو گیا اور اس پر راکھ کا خِبَاء یعنی پردہ سا آ گیا۔ اصل میں خِبَاءٌ اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ اسی بنا پر جو یا گیہوں کی بالی کے چھلکے کو بھی خِبَاء کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِیْرًا﴾ (۱۷۔۹۷) جب اس کی آگ بجھنے کو ہو گی تو ہم ان کو (عذاب دینے کے لئے) اور بھڑکا دیں گے۔

(خ ت ر)

اَلْخَتْرُ: اصل میں اس غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان کمزور پڑ جائے اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ﴾ (۳۱۔۳۲) جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔

(خ ت م)

اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ: کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنیٰ کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔

مجازاً کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتابوں یا

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظه فی النسائی عن ابن عمرو وحم ق ہ ن عن ابن عمرو (ہ عن ابی ہریرة) و(طب عن ابن عمرو) والترمذی عن ابن عمرو ورد(ۃ عن ابن عمرو) راجع الفتح الکبیر ج ۳: ۲۰۱۔۲۰۲).

[2] قاله زهیر بن ابی سلمیٰ المزنی وتمامه .... وان یسئلوا یعطوا وان یسیروا یغلوا والبیت فی اللسان (خیل، خول) وفی روایة الطبری ۲۳۔۱۹۹/۷:۲۷۸) وان یستخولوا بدل یستخبلوا ویخولوا بدل یخبلوا وکذا فی روایة ابی عبید فی غریبه والعسکری فی الصناعتین وعده من جید المدیح قال فی الامالی (۲: ۱۵۴) ومایبالی مدح بهذین البیتین الایمدح بغیرهما والبیت فی مختار الجاهلی بشرح المصطفیٰ السقا (۱: ۱۶۳) والمختارات ۶۲ والعمدة (۲: ۱۲۷) و نقدالشعر ۳۳ فی سبعة ابیات والبحر (۷: ۱۴۳) والعقد الثمین ۹۱ والمعانی الکبیر ۵۲۹ والسیوطی ۱۰۸ قال فی اللسان والاخبال اعطاء البعیر اوالناقة للرکوب واستخبل ای استعارمنه والاصمعی وابو عبیدة فی روایتهما عن ابی عمروانکر الاستخبال وغیر هما اثبته (والمعانی للقبتی ۵۴۰).

دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

﴿وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ﴾ (۴۵۔۲۳) اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔

اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کر لینے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر سے نقش ہو جاتا ہے اور اسی سے خَتَمْتُ الْقُرْآنَ کا محاورہ ہے یعنی قرآن پاک ختم کر لیا اور آیت کریمہ:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔اور آیت:

﴿قُلْ اَرَأَیْتُمْ اِنْ اَخَذَاللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ﴾ (۶۔۴۶) (ان کافروں سے) کہو بھلا دیکھو تو اگر تمہارے کان یا دو آنکھیں چھین لے اور اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے۔میں عادت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقادِ باطل یا محرمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئت نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خو بن جاتی ہے۔گویا اس طرح اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ (۱۶۔۸،۱۰۸) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر خدا نے مہر لگا رکھی ہے۔اسی طرح آیات کریمہ:

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے..........اس کا کہنا نہ ماننا۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ﴾ (۱۷۔۴۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِیَةً﴾ (۵۔۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں اِغْفَالٌ کِنٌّ اور قَسَاوَۃٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنیٰ مراد ہیں۔

جبائی کہتے ہیں [1] کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے انکے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔لیکن یہ بے معنیٰ سی بات ہے۔کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامت سے بے نیاز ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنیٰ ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۳۶۔۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ

[1] هو ابو علی محمد بن عبدالوهاب الجبائی المتوفی ۳۰۳ ھ والجباء مثل رمان کورة بخوزستان من نواحی الاهواز بین فارس وواسطه والنضرة منها (التاج).

کلام نہیں کرسکیں گے۔ اور آیت (۳۳۔۴۰) میں آنحضرت ﷺ کو خَاتَمَ النَّبِیّٖن فرمانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آنحضرت نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کو مکمل کر دیا ہے۔(اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔اور آیت کریمہ:

﴿وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ﴾ (۸۳۔۲۶) جس کی مہر مسک کی ہوگی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ خِتَامٌ کے معنیٰ مَا یُخْتَمُ بِہٖ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا آخری لطف اور برتن میں باقی ماندہ چھوٹ مسک کے طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔مگر یہ بے معنیٰ سی بات ہے۔کیونکہ شراب کو بذاتہٖ خود لذیذ ہونا چاہیے اگر وہ بذات خود لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہوسکتا،اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

(خ د د)

اَلْخَدُّ وَالْاُخْدُوْدُ کے معنیٰ ہیں زمین میں مستطیل اور گہرا گڑھا اَلْاُخْدُوْدُ کی جمع اَخَادِیْد ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ﴾ (۸۵۔۴) کہ خندقوں کے (کھودنے) والے ہلاک کردیئے گئے۔

اصل میں خَدُّ الْاِنْسَانِ کے معنیٰ انسان کے رخسار کے ہیں [1] اور استعارۃً زمین اور دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ لفظ وجہ (چہرہ) ہے تَخَدَّدَ

اَللَّحْمُ: جسم کا لاغر ہوکر جھری دار ہوجانا خَدَّوْتُهٗ کسی کو دبلا کرنا۔اس کا مطاوع تَخَدَّدَ آتا ہے۔

(خ د ع)

اَلْخِدَاعُ کے معنیٰ جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کرکے کسی کو اس چیز سے پھیر دینا جس کے وہ درپے ہو اور آیت کریمہ:

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (۲۔۹) یہ (اپنے پندار میں) خدا کو چکمہ دیتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔اس بنا پر فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (۴۸۔۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔

اور ان کے اس فعل کی شناخت اور آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خِداع سے تعبیر کیا ہے۔

اور اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں یُخَادِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ہے۔پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے

[1] وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱:۱۸) ای لاتعرض عنهم استكباراً.

کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اور دوسرے یہ بتانا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَ﴾ میں بیان ہو چکا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَھُوَ خَادِعُھُمْ﴾ (۴۔۱۴۲) اور وہ انہی کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ میں ہے۔خَدَعَ الضَّبُّ: گوہ کا اپنی بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھو تیار بیٹھا رہتا ہے۔جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس لیتا ہے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے اَلْعَقْرَبُ بَوَّابُ الضَّبِّ: کہ بچھو گوہ کا دربان ہے۔

چونکہ اہل عرب کے ہاں ضَبٌّ کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے ❶ (مثل) ھُوَ اَخْدَعُ مِنَ الضَّبِّ کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طَرِیْقٌ خَادِعٌ وَخَدِیْعٌ: گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کو دھوکہ دیتا ہے۔اَلْھِدْعُ: بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔خَدَعَ الرِّیْقُ: منہ سے تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔اَلْاَخْدَعَانِ: گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔کہا جاتا ہے خَدَعْتُہٗ: میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔حدیث میں ہے ❷

(۱۰۷) بَیْنَ یَدِیِ السَّاعَۃِ سِنُوْنَ خَدَّاعَۃٌ: کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے۔کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بدلتے رہیں گے۔

(خ د ن)

اَلْخِدْنُ: کے معنیٰ مصاحب اور رفیق کے ہیں۔مگر عام طور پر اس مصاحب پر بولا جاتا ہے جو جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کے ساتھ رہتا ہو اسی سے خِدْنُ الْمَرْئَۃِ وَخَدِیْنُھَا کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ عورت کے آشنا کے ہیں۔اَلْخِدْنُ کی جمع اَخْدَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ﴾ (۴۔۲۵) اور شاعر کے قول ❸ ع

(۱۳۱) "خَدِیْنُ الْعُلٰی"

وہ بلندیوں کا ساتھی ہے۔

میں بلندیوں کے لئے خَدِیْنٌ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ یَعْشَقُ الْعُلٰی: (وہ بلندیوں پر عاشق ہے) یُشَبِّبُ بِالنَّدٰی (وہ سخاوت کے ساتھ تشبیب کرتا

---

❶ راجع للمثل المیدانی رقم ۱۳۷۳ والحیوان ٦: ٤٣، ٤٥/٧۔١٠ واللسان (خدع).

❷ الحدیث باختلاف الفاظه فی النهایة (خدع) وغریب ابی عبید( ) وفی تاویله اختلاف وفی المحکم (خدع) ان قبل الساعة سنین خداعة واللالئی مع السمط ۱۲۷ وفیه ان قبل الدجال سنین خداعة ای قاطعة الزکوة اوقلیل المطر کذافی الفائق ۲: ۱۰۷ وفیه ایضاً بین یدی الساعة سنین خدارة ای یکثر فیها المطر ویقل النبات.

❸ لم اجده ویرجیٰ ۱۲.

ہے) یَنْسِبُ بِالْمَکَارِمِ: (اس کا نسب مکارم سے ملتا ہے) وغیرھا استعارات ہیں۔

(خ ذ ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا﴾ (۲۵۔۲۹)

اور شیطان انسان کو عین موقعہ پر دغا دینے والا ہے۔

اَلْخَذُوْلُ: (صیغہ مبالغہ) بہت زیادہ خُذْلان یعنی دغا دینے والا۔ اَلْخُذْلَانُ ایسے شخص کا عین موقعہ پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجانا جس کے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا اسی بنا پر کہا جاتا ہے: خَذَلَتِ الْوَحْشِیَّةُ وَلَدَھَا: وحشی گائے نے اپنے بچہ کو چھوڑ دیا۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَا فُلَانٍ اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں اسی سے اعشی نے کہا ہے [1] (الرمل)

(۱۳۲) بَیْنَ مَغْلُوْبٍ تَلِیْلٍ خَدُّہٗ
وَخَذُوْلِ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ کَسْحٍ

(بعض مغلوب ہو کر رخسارے کے بل گر پڑے ہیں اور بعض کی ٹانگیں بدوں بے حسی کے جواب دے چکی ہیں۔

رَجُلٌ خُذَلَۃٌ بے بس آدمی۔

(خ ر ر)

خَرَّ (ن ض) خَرِیْرًا کے معنٰی کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ﴾ (۳۴۔۱۴) جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا۔

﴿کَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۲۔۳۱) تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے۔ ﴿فَخَرَّ عَلَیْھِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِھِمْ﴾ (۱۶۔۲۶) اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی۔ اَلْخَرِیْرُ: پانی وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں جو اوپر سے گر رہا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿خَرُّوْا سُجَّدًا﴾ (۳۲۔۱۵) تو سجدے میں گر پڑتے ہیں خَرُّوا کا لفظ دو معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی (۱) گرنا اور (۲) ان سے تسبیح کی آواز کا آنا۔ اور اس کے بعد آیت وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ سے تنبیہ کی ہے کہ ان کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا نہ کہ کسی اور امر کے ساتھ۔

(خ ر ب)

خَرِبَ الْمَکَانُ خَرَابًا کسی جگہ کا اجاڑ ہونا۔ یہ عَمَارَۃٌ (آباد ہونا) کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا﴾ (۲۔۴) اور انکی ویرانی میں ساعی۔

اَخْرَبَہٗ وَخَرَّبَہٗ: ویران کردینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۵۹۔۲) کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔

وہ اپنے ہاتھوں سے اس لئے ویران کرتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے کام نہ آئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بربادی ان کی جلاوطنی کی وجہ سے

---

[1] قالہ الاعشیٰ فی قصیدۃ طویلۃ فی دیوانہ (۳۸۔۴۲) یمدح فیھا ایاس بن قبیصۃ الطائی وفی روایۃ اللسان والمحکم (کسح، خذل وصدرہ کل وضاح کریم جدہ ۔ وفی روایۃ ص و س صدرہ بین مغلوب بنیل جدہ کذا رواہ ابن بری واما روایۃ المؤلف فلم ارھا الافی بعض ھوامش دیوانہ ۱۶۳ ویروی: قلیل والبیت فی اللسان (خذل) ودیوانہ ۴۱ وغریب ابی عبید (۴: ۲۸۳) ۱۲۔

تھی۔

اَلْخَرْبَۃُ: کان میں وسیع چھید گویا اس سے کان میں خرابی پیدا ہوگئی اور اَقْطَعُ وَقَطْعَاءُ کی طرح اَخْرَبُ وَخَرْبَاءُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر مشکیزہ کے سوراخ کو بھی خِرْبَۃُ الْمَزَادَۃ کہا جاتا ہے جیسا کہ مَجَازًا اُذُنُ الْمَزَادَۃِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور خَارِبٌ کے معنیٰ خاص کر اونٹوں کے چور کے ہیں [1] الْخَرَبُ (نرسرخاب) شترمرغ کی قسم کا ایک پرند، اس کی جمع خِرْبَانٌ ہے کسی شاعر نے کہا ہے: [2] (رجز)

(۱۳۳) اَبْصَرَ خِرْبَانَ فِضَآءٍ فَانْکَدَرَ

کہ وہ فضا میں سرخابوں کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

(خ ر ج)

خَرَجَ: (ن) خُرُوْجًا کے معنیٰ کسی کے اپنی قرار گاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرار گاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ﴾ (۲۸۔۲۱) موسیٰ وہاں سے ڈرتے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

﴿فَمَايَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ﴾ (۷۔۱۳) فرمایا: تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں غرور کرے۔ پس نکل جا۔

﴿وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَةٍ مِنْ اَكْمَامِهَا﴾ (۴۱۔۴۷) اور نہ پھل گابھوں سے نکلتے ہیں۔

﴿فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ (۴۰۔۱۱) تو کیا نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔ ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَاهُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا﴾ (۵۔۳۷) (ہرچند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور اِخْرَاجُ کا لفظ زیادہ تر اعیان کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ﴾ (۲۳۔۳۵) تو تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے۔ ﴿كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ﴾ (۸۔۵) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم کو تدبیر کے ساتھ گھر سے نکالا۔

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا﴾ (۱۷۔۱۳) اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے۔

﴿اَخْرِجُوْآ اٰلَ لُوْطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ﴾ (۲۷۔۵۶) کہ لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔ اور کبھی اِخْرَاجُ بمعنیٰ تکوین الٰہی بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۱۶۔۱۷۸) "اور اللہ ہی نے تم کو ماؤں کے شکم سے پیدا کیا۔ ﴿فَأَخْرَجْنَا

---

[1] قاله الاصمعی والجمع خراب والجوهری ۔

[2] قاله العجاج فی مشطورته يمدح فيها عمربن عبيدالله بن معمر التميمی و كان قد وجهه عبدالملك الی ابی فديك الحروری حين خرج عليه وقبله : تقضی البازی اذاالبازی كسر ۔ وفی رواية آنس بدل ابصر والشطر فی الطبری (۹: ۶۹)(۳۰: ۶۵) واللسان (كذا) وديوانه ، (طبعة ليبك ۱۹۰۳ء) رقم البيت ۷۶ والبيت من شواهد ابی عبيده فی مجازه تحت قوله واذاالنجوم انكدرت (تكوير: ۷۲) والشطر الاول فی ابن الشجری (۱: ۳۸۹) والاقتضاب ۴۱۳ والامالی (۲: ۱۷۱) والشطر فی المسط ۷۹ والبحر ۸: ۴۳۰) وفيه فلاة بدل فضاء ۱۲.

بِـهٖ اَزْوَاجًـا مِّـنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی﴾ (۲۰-۵۳) پھر اس نے انواع واقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

﴿یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ﴾ (۳۹-۲۱) اس سے کھیتی اُگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

اَلتَّخْرِیْجُ: (تفعیل) یہ عام طور پر علوم وصناعات کی ایجاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور جو کچھ حیوان کے اوجھ سے نکلتا ہے۔ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو خَرْجٌ وَخُرَاجٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ تَسْـئَـلُـهُـمْ خَـرْجًـا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ﴾ (۲۳-۷۲) کیا تم ان سے (تبلیغ کے سلسلے میں) کچھ مال مانگتے ہو تو تمہارے پروردگار کا مال بہت اچھا ہے۔

یہاں خراج کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ نے اسے لازم وواجب کیا ہے۔ اور خَرْجٌ خَرَاجٌ سے عام ہے کیونکہ خَرْجٌ کا لفظ دَخْـلٌ (آمدنی) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَهَـلْ نَـجْـعَـلُ لَكَ خَرْجًا﴾ (۱۸-۹۴) بھلا ہم آپ کے لئے خرج (کا انتظام) کردیں۔

مگر خَـــرَاجٌ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے۔ اَلْعَبْدُ یُؤَدِّیْ خَرجَةَ غلام اپنی آمدنی سے مقرر حصہ ادا کرتا ہے۔ وَالـرَّعِیَّةُ تُؤَدِی اِلَی الْاَمِیْرِ الْخَرَاجُ رعیت حاکم کو لگان ادا کرتی ہے۔ اَلْخَرْجُ (ایضا) بادل کی ایک قسم ہے۔ اس کی جمع خُـرُوْجٌ آتی ہے ایک روایت میں ہے [1]

(۱۰۷) اَلْـخَرَاجُ بِالضَّمَانِ: یعنی مال بائع سے جو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ مبیع کی اس ضمانت کے عوض سمجھا جائے گا جو اس سے ساقط ہو چکی ہے۔

اَلْـخَـارَجِـیُّ: وہ شخص جو بذات خود اپنے ہمسروں کی صفات سے باہر نکل جائے اگر یہ خروج کسی اعلیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو بطور مدح بولا جاتا ہے اور اگر ادنیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو لفظ بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح کہ فُلَانٌ لَیْسَ بِاِنْسَانٍ: یعنی کسی سے انسانیت کی نفی کبھی بطور مدح ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (طویل)

(۱۳٤) فَـلَسْـتَ لِاِنْسِیٍّ وَلٰكِنْ كَمَلْأَكٍ
تَـنَـزَّلَ مِـنْ جَـوِّالسَّـمَـآءِ یَـصُـوْبُ

تم انسان نہیں ہو بلکہ فرشتہ کی مثل ہو جو آسمان کی بلندی سے زمین پر اتر آئے۔

اور کبھی مذمت کے لئے۔ جیسے فرمایا:

---

[1] الحدیث مروی مختصرًا مطولاً راجع ابوداؤد والترمذی ۲: ۲٦۰-۲٦۱ مع التحفة والنسائی وابن ماجة راجع لتخریجه الرسالة رقم ۱۲۳۲ مع التحقیق احمد شاکر وکنزالعمال ٤ رقم ٥۰٥ وابن حبان فی زوائده رقم ۱۱۲٥، ۱۱۲٦.

[2] اختلفوافی نسبة هذا البیت قال العینی(٤: ٥۲٤) قاله رجل من عبدالقیس یمدح النعمان وقیل هولابی وجزة یمدح عبدالله بن الزبیر ونسبه الاعلم فی هامش الکتاب ۲: ۳۷۹) الی علقمة والبیت من شواهد الطبری (۱: ۱٤۸، ۱۹۸) وراجع للبیت ایضاً الصحاح والتاج (الك، ملك، صوب) والقرطبی ۹: ۱۸۳،) وامالی ابن الشجری ۲: ۲۰, ۲۹۲) والاشتقاق ۱۷) والمجازلابی عبیدة (۱: ۳۳) ومختار الشعرالجاهلی وتهذیب الاصلاح ۱: ۱۲٦) والبحره: ۳,۳۰٤: ٤۰٤,۱: ۱۳۷) وابن خالویه ۸۳ وابن الانباری فی السبع ٥۲۲ والبیت من کلمة مفضلیة من زیادات المرزوقی ۲: ۱۹٤ وصدره ولست یحبتی ولکن ملائماً ۱۲.

﴿اِنْ هُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ﴾ (۲۵۔۴۴) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔

اَلْخَرَجُ: دورنگ سیاہ وسپید (درہم) اسی سے کہا جاتا ہے۔ ظَلِیْمٌ اَخْرَجُ وَنَعَامَةٌ خَرْجَاءُ: ابلق شتر مرغ۔ اَرْضٌ مُخْتَرِجَةٌ: زمین کے جائے ازاں باگیاہ وجائے بے گیاہ باشد۔ اور اَلْخَوَارِجُ کو خوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ امام کی اطاعت سے باغی ہو گئے تھے۔

(خ ر ص)

اَلْخَرْصُ: پھلوں کا اندازہ کرنا اور اندازہ کئے ہوئے پھلوں کو خَرِصٌ کہا جاتا ہے یہ بمعنی مخْرُوصٌ ہے۔ جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوضٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ خَرْصٌ بمعنی کذب آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۰) یہ تو صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یَخْرُصُوْنَ بمعنی یُکَذِّبُوْنَ ہے یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرَّاصُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۰) اٹکل کرنے والے ہلاک ہوں۔

کے معنی بقول بعض یہ ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، اصل میں ہر وہ بات جو ظن وتخمین سے کہی جائے اسے خَرْصٌ کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اندازہ غلط ہو یا صحیح۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبہ ظن سے بات کرتا ہے، اور نہ سماع کی بنا پر کہتا ہے۔ بلکہ اس کا اعتماد محض گمان پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تخمینہ کرنے والا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے اور اس قسم کی بات کہنے والے کو بھی جھوٹا کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ واقع کے مطابق ہی کیوں نہ بات کرے جیسا کہ منافقین کے بارے میں فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ﴾ (۶۳۔۱) اے محمد! ﷺ جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (از راہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے نہ اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

(خ ر ط)

اَلْخُرْطُوْمُ: اس کے اصل معنی ہاتھی کی سونڈ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ﴾ (۶۸۔۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

میں انسان کی ناک پر خرطوم کا اطلاق کیا ہے تو یہ محض مذمت کے لئے ہے۔ یعنی اُسے نہ مٹنے والی عار لاحق ہوگی۔ یہ جُدِعَتْ اَنْفُهٗ کی طرح کا محاورہ ہے۔

(خ ر ق)

اَلْخَرْقُ: (ض) کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بگاڑنے کے لئے پھاڑ ڈالنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا﴾ (۱۸۔۷۱) کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ مسافروں کو غرق کر دیں۔

خَرْقٌ خَلْقٌ کی ضد ہے جس کے معنی اندازہ کے

مطابق خوش اسلوبی سے کسی چیز کو بنانا کے ہیں ۔ اور خَرْق کے معنیٰ کسی چیز کو بے قاعدگی سے پھاڑ ڈالنے کے ہیں ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنَاتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۰) اور بے سمجھے (جھوٹ بہتان) اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا گھڑی ہیں۔
یعنی بے سوچے یہ بات کہتے ہیں۔ پھر معنیٰ قطع کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: خَرَقَ الثَّوْبُ وَخَرَّقَهٗ: کپڑے کو پھاڑ ڈالا خَرَقَ الْمَفَاوِزَ ریگستان طے کئے۔
اِخْتَرَقَ الرِّيْحُ: ہوا کا تیز چلنا۔
اَلْخَرْقُ وَالْخَرِيْقُ: خاص کر کشادہ بیابان کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ وسیع ریگستان کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔
اَلْخَرْقُ: (خاص کر) کپڑے میں سوراخ اور کان میں کشادہ سوراخ۔ صَبِيٌّ اَخْرَقُ وَامْرَأَةٌ خَرْقَاءُ: جس کے کان کشادہ چھید ہو۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ﴾ (۱۷۔۳۷) کی تفسیر میں دو قول ہیں (۱) یہ کہ تو زمین کو طے نہیں کر سکے گا۔ (۲) یا یہ کہ تو زمین کو اپنے پاؤں سے پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ یہ دوسرا معنیٰ خرق فی الاذن سے ماخوذ ہے اور بے سوچے سمجھے کام کرنے کے اعتبار سے احمق اور نادان شخص کو اَخْرَقُ وَخَرِقٌ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث خرقاء ہے۔ اور تند ہوا کو بھی خرقاء کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ [1]

(۱۰۸) مَادَخَلَ الْخَرَقُ فِي شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ: جس چیز میں نادانی کا عمل دخل ہو تو وہ عیب ناک ہو جاتی ہے اور خَرَقَ سے مَخْرَقَةٌ کا لفظ لیا گیا ہے [2] جس کے معنیٰ کسی کام میں حیلہ جوئی کے لئے بے وقوفی کا اظہار کرنے کے ہیں۔
اَلْمِخْرَاقُ: کپڑے کا کوڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں گویا اسے بھی کسی چیز کو واقع کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔
خَرِقَ الغِزَالُ: ہرن کا نادانی کی وجہ سے دوڑ نہ سکنا۔

(خ ز ن)

اَلْخَزْنُ: کے معنیٰ کسی چیز کو خزانے میں محفوظ کر دینے کے ہیں۔ پھر ہر چیز کی حفاظت کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے بھید وغیرہ کی حفاظت کرنا اور آیت:
﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ﴾ (۱۵۔۲۱)
اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں۔
﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۶۳۔۷)
حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے ہیں۔ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یا اس معنیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [3]

---

[1] الحديث في التاج والنهاية (خرق).
[2] قال الاصمعی مولد (الجوهری) ۱۲۱.
[3] راجع لحديث فرغ الله باختلاف الفاظه (والنهاية) وطس عن ابن مسعود والطبرانی عن ابی الدرداء وكنزالعمال ۱: ۹۴ والفتح للنبهانی ۲: ۲۶۶.

(۱۰۹) فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنْ خَلْقِ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ وَالْاَجَلِ کہ خداتعالیٰ مخلوق کی پیدائش کے رزق اور اجل سے فارغ ہو چکا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاَسْقَيْنَاكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخَازِنِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔

میں بعض نے خَازِنِيْنَ کے معنیٰ حَافِظِيْنَ کئے ہیں۔ یعنی شکر گزاری سے تم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے بعض نے کہا کہ یہ آیت کریمہ:

﴿اَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ أَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ﴾ (۵۶۔۶۸،۶۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْخَزَانَةُ: یہ خازن کی جمع ہے چنانچہ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا﴾ (۳۹۔۷۱) تو اس کے داروغے اس سے کہیں گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ﴾ (۶۔۵۰) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔ میں خَزَآئِنُ اللّٰهِ سے وہ مقدورات الہیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے روک رکھی ہیں۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع جود اور قدرت مراد ہے۔ اور بعض نے اس سے کلمہ کن مراد لیا ہے۔ خَزَنَ اللَّحْمَ کے اصل معنیٰ تو گوشت کی ذخیرہ اندوزی کے ہیں۔ لیکن کنایۃً گوشت کے بدبودار ہو جانے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور یہی خَنَزَ (بہ تقدیم نون) کے ہیں۔

(خ ز ی)

خَزِیَ (س) اَلرَّجُلُ رسوا ہونا۔ خواہ وہ رسوائی انسان کو خود اس کی ذات سے لاحق ہو یا غیر کی طرف سے پھر جو رسوائی اپنی جانب سے لاحق ہوتی ہے اسے حیائے مفرط کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر خَزَايَةٌ ہے۔ اس سے صیغہ صفت مذکر خَزْيَانُ اور مؤنث خَزْیٰ خَزَایَا۔ حدیث میں ہے [1]

(۱۱۰) اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَادِمِيْنَ: اے خدا! ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرم اور ندامت محسوس کرنے والے ہوں۔ اور جو رسوائی دوسروں کی طرف سے لاحق ہوتی ہے وہ ذلت کی ایک قسم ہے۔ اور اس کا مصدر خِزْیٌ ہے۔ اور رَجُلٌ خِزْیٌ کے معنیٰ ذلیل آدمی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا﴾ (۵۔۳۳) دنیا میں ان کی رسوائی ہے۔

﴿اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (۱۶۔۲۷) کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

﴿فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ (۳۹۔۲۶) پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔

﴿لِنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۱۔۱۶) تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائے۔

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی﴾ (۲۰۔۱۳۴) کہ

[1] فلینظر من اخرجه ۱۲.

ہمارے ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے۔

اخزیٰ (افعال) یہ خِزْیٌ اور خَزَایۃٌ دونوں سے آتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۶۶۔۸) اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا۔

کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں۔لیکن خِزْیٌ سے لینا انسب معلوم ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ﴾ (۳۔۱۹۲) اے پروردگار! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اسے رسوا کیا۔

میں اَخْزَیْتَہٗ ، خَزَایَۃٌ سے ہے مگر خِزْیٌ سے بھی ہوسکتا ہے یہی معنیٰ مندرجہ ذیل آیات میں مراد ہیں۔

﴿مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ﴾ (۳۹۔۴۰) کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا۔

﴿وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾ (۳۔۱۹۴) اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔

﴿وَلِیُخْزِیَ الْفَاسِقِیْنَ﴾ (۵۹۔۵) کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

﴿وَلَا تُخْزُوْنَ فِیْ ضَیْفِیْ﴾ (۱۱۔۸۷) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔جس طرح خَزِیَ دو قسم پر ہے یعنی رسوائی کبھی اپنی ذات کی طرف سے لاحق ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کی طرف سے اسی طرح ذَلَّ وَھَانَ بھی دو قسم پر ہے جو ذلت انسان کو خود اس کی ذات کی جانب سے لاحق ہو اسے ھَوْن وَذُلٌّ کہا جاتا ہے۔اور یہ صفات محمودہ سے ہے مگر جو دوسروں کی طرف سے پہنچے اسے ھُوْنٌ ، ھَوانٌ اور ذُلٌّ کہتے ہیں اور یہ مذموم سمجھی جاتی ہے۔

(خ س ء)

خَسَأْتُ الْکَلْبَ فَخَسَأَ: میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہوگیا۔اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اِخْسَأْ کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں کفار کے متعلق فرمایا:

﴿اِخْسَؤُا فِیْھَا وَلَا تُکَلِّمُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰۸) اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

﴿فَقُلْنَا لَھُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ﴾ (۲۔۶۵) تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خَسَأَ الْبَصَرُ: کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں نظر درماندہ ہوکر منقبض ہوگئی۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ﴾ (۶۷۔۴) کہ وہ نظر درماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(خ س ر)

اَلْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ: رأس المال میں کمی آجانا خسارہ کی نسبت کبھی انسان کی طرف ہوتی ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَ (س) فُلَانٌ فلاں نے نقصان اٹھایا۔اور کبھی فعل کی طرف ہوتی ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَتْ تِجَارَتُہٗ اس کی تجارت خسارہ میں ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ﴾ (۷۹۔۱۲) یہ لوٹنا تو (موجب) زیاں ہے۔

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مال وجاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت وسلامتی، عقل وایمان وثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ (۳۹۔۱۵) جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾ (۲۔۱۲۱) اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (۲۔۲۷) جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں ...... یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (۵۔۳۰) مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔

میں ہوسکتا ہے کہ ماپ تول میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے اور ظلم ترک کرنے کا حکم ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہو جو قیامت کے دن میزان عمل میں کمی کا موجب ہوں جس کی وجہ سے آدمی ان لوگوں سے ہو جائے جن کے متعلق قرآن پاک نے: ﴿فَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (۱۰۱۔۸) کہا ہے۔ یہ دونوں معنیٰ باہم لازم ملزوم ہیں۔ اور جہاں کہیں قرآن پاک میں خُسران کا لفظ آیا ہے وہ اسی دوسرے معنیٰ پر محمول ہے دنیوی کاروبار اور دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں ہے۔

(خ س ف)

اَلْخُسُوْفُ: کا لفظ چاند کے بے نور اور کُسُوف کا لفظ سورج کے بے نور ہونے پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خسوف قدرے بے نور ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اور کُسُوفٌ پوری طرح بے نور ہو جانے کو کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند کہا جاتا ہے۔ خَسَفَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا (متعدی) خَسَفَ هُوَ: (لازمی) زمین میں دھنس جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ (۲۸۔۸۰) پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

﴿لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا﴾ (۲۸۔۸۲) اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔

حدیث میں ہے [1]

(۱۱۱) اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ

[1] الحدیث فی الصحیحین وابی داؤد والنسائی عن عائشة (صلوة الکسوف) والطیالسی عن انس وایضاً البخاری والنسائی عن ابی بکرة راجع الفتح النبهانی ج ۱ ص ۳۰۵۔۳۰۶۔

لَا یَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِہٖ کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے۔ اور عَیْنٌ خَاسِفَۃٌ (اندر دھنسی ہوئی آنکھ) کا محاورہ خَسَفَ الْقَمَرُ سے منقول ہے بِئْرٌ مَّخْسُوْفَۃٌ: وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو اور چاند گہن لگنے سے چونکہ ماند پڑ جاتا ہے اس لئے بطور استعارہ خَسْفٌ بمعنیٰ ذلت و رسوائی بھی آ جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

تَحَمَّلَ فُلَانٌ خَسْفاً: فلاں شخص ذلیل ہو گیا۔

(خ ش ب)

اَلْخَشَبُ: (موٹی لکڑی ج خُشُبٌ) اور آیت کریمہ:

﴿کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ﴾ (۶۳۔۴) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔

میں انہیں نکما ہونے میں لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور خَشَبٌ کے لفظ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے خَشَبْتُ السَّیْفَ: تلوار کو صیقل کرنا اور صیقل کے آلہ کو مِخْشَب کہا جاتا ہے۔ سَیْفٌ خَشِیْبٌ: تلوار جو تازہ صیقل کی گئی ہو۔ جَمَلٌ خَشِیْبٌ: نیا اونٹ جو سدھایا نہ گیا ہو۔

تَخَشَّبَتِ الْاِبِلُ: لکڑی کھانا۔ سوکھی گھاس چرنا۔

جَبْھَۃٌ خَشْبَاءُ: لکڑی کی طرح سخت اور کھردری پیشانی (کنایہ) بے حیا۔ جیسا کہ شاعر نے صخر یعنی چٹان کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا ہے (۱۳۵)

وَالصَّخْرُ ھَشٌّ عِنْدَ وَجْھِکَ فِی الصَّلَابَۃِ

تیرے چہرے کے مقابلہ میں تو پتھر بھی ہشاش بشاش معلوم ہوتا ہے۔

اَلْمَخْشُوْبُ: وہ چیز جس میں لکڑی ملائی گئی ہو۔ اور یہ ردی چیز سے کنایہ ہوتا ہے۔

(خ ش ع)

اَلْخُشُوْعُ: (ن) کے معنی ضَرَاعَۃٌ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خُشُوْع کا لفظ جوارح اور ضَرَاعت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے [1]

(۱۱۲) اِذَا ضَرَعَتِ الْقَلْبُ خَشَعَتِ الْجَوَارِحُ جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعاً﴾ (۱۷۔۱۰۹) اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِی صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ (۲۳۔۲) جو نماز میں زیادہ عجز و نیاز کرتے ہیں۔

﴿وَکَانُوْا لَنَا خَاشِعِیْنَ﴾ (۲۱۔۹۰) اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ﴾ (۲۰۔۱۰۸) اور............ آوازیں پست ہو جائیں گی۔

﴿خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ﴾ (۶۸۔۴۳) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔

﴿اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ﴾ (۷۹۔۹) اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا:

---

[1] لم اجدہ ۱۲۔

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا﴾ (۵۶۔۴) جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے۔

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۹۹۔۱) جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔

﴿يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (۵۲۔۹،۱۰) جس دن آسمان لرزنے لگے کپکپا کر۔اور پہاڑ اڑنے لگیں (اون ہو کر)

(خ ش ی)

اَلْخَشْيَةُ: اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے۔یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔میں خشیت الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى﴾ (۸۰۔۸،۹) اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

﴿فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا﴾ (۱۸۔۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (بڑا ہو کر جو بدکردار ہوتا کہیں) ان کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ﴾ (۲۔۱۵۰) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔

﴿يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً﴾ (۴۔۷۷) لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۳۳۔۳۹) جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ﴾ (۴۔۹)......اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے۔

یعنی ان کو اپنے فقر کے خوف کا احساس ہونا چاہیے۔

﴿خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (۱۷۔۳۱) مفلسی کے خوف سے۔یعنی اس اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ مفلس ہو کر ذلیل ہو جائے گی۔اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

یعنی اس کے دل میں ایسا خوف ہو جو کہ معرفت الٰہی کا تقاضہ ہے۔

(خ ص ص)

اَلتَّخْصِيْصُ وَالْاِخْتِصَاصُ وَالْخُصُوْصِيَّةُ وَالتَّخَصُّصُ: کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کر کے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا یہ اَلْعُمُوْمُ وَالتَّعَمُّمُ وَالتَّعْمِيْمُ کی ضد ہے۔

خُصَّانُ الرَّجُلِ۔ جن پر خصوصی نوازش کرتا ہو۔

اَلْخَاصَّةُ: یہ عامۃ کی ضد ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (۸۔۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت

کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گناہ گار ہیں بلکہ سب پر واقع ہوگا۔

خَصَّهٗ بِكَذَا وَاخْتَصَّهٗ: کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَاءُ (۲۔۱۰۵) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے۔خَصَاصُ الْبَیْتِ: مکان میں شگاف کو کہتے ہیں۔اسی سے خَصَاصَةٌ اس فقر اور احتیاج کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔اس قسم کے فقر کو خَلَّةٌ بھی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۵۹۔۹) اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔لہٰذا آپ اسے خصاص سے ماخوذ قرار دے سکتے ہیں۔

اَلْخُصُّ: بانس یا لکڑی کا جھونپڑا اور اسے خُصٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جھرو کے نظر آتے ہیں۔

(خ ص ف)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَفِقَا یَخْصِفَانِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (۲۰۔۱۲۲) یعنی آدم اور حوا اپنے اوپر خَصَفَة یعنی درخت کے پتے چپکانے لگے اسی سے زنبیل کو جو کھجوریں ڈالنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا ہے اور گاڑھے کپڑے کو خَصَفَةٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع خَصَفٌ (وَخِصَافٌ) آتی ہے۔اور خَصَفَةٌ (بسکون صاد) چمڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا ٹکڑا رکھ کر جوتا بنایا جائے خَصَفْتُ النَّعْلَ بِالْمِخْصَفِ: ستالی کے ساتھ جوتا سینا۔

ایک روایت میں ہے:❶

(۱۱۳) كَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَخْصِفُ نَعْلَهٗ کہ رسول اللہ ﷺ اپنا جوتا خود ہی مرمت کرلیا کرتے تھے۔

خَصَفْتُ الْخَصْفَةَ ۔زنبیل بنا۔

اَلْاَخْصَفُ وَالْخَصِیفُ: دورنگ کا کھانا۔اصل میں اس دودھ وغیرہ کو کہتے ہیں جو چمڑے کے مشکیزے میں ڈالا جائے اور اس چمڑے کا رنگ اسی کے ساتھ مل جائے۔❷

(خ ص م)

اَلْخَصْمُ: یہ خَصِیمَةٌ کا مصدر ہے جس کے معنی جھگڑنے کے ہیں کہا جاتا ہے: خَصَمْتُهٗ وَخَاصَمْتُهٗ مُخَاصَمَةً وَخِصَامًا: کسی سے جھگڑا کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ (۲۔۲۰۴) اور وہ حالانکہ سخت جھگڑالو ہے۔

﴿وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ﴾ (۴۳۔۱۸) اور جھگڑنے کے وقت بات نہ کرسکے۔

اور مُخَاصِمٌ کو خَصِیمٌ کہا جاتا ہے اور خصم کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی تثنیہ بھی آجاتا ہے۔❸

---

❶ كلمة من حديث عائشة رواه الترمذى وفى كنزالعمال (المتفرقات) ۷ : رقم ۸۳٤ (حم ـعن عائشة) وفى تخريج العراقى على الاحياء ۲ : ۳٦۰ اخرجه احمد من حديث عائشة ورجاله رجال الصحيح ورواه ابو الشيخ ايضاً وابن حبان فى زوائده رقم ۲۱۳۳ـ ۲۱۳۵).

❷ قال الجوهرى الخصيف اللبن الحليب يصب عليه الرائب فان جعل عليه التمر والسمن فهوالعوثبانى .

❸ قال الجوهرى ومن العرب من يثنيه ويجمعه.

اصل میں خَصَمٌ کے معنیٰ کنارہ کے ہیں۔اور مخاصمت کے معنیٰ ایک دوسرے کو کنارہ سے پکڑنے کے ہیں۔اور بوری کو کونے سے پکڑ کر کھینچنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ایک حدیث میں ہے [1]

(۱۱٤) نَسِيتُهَا فِي خُصْمِ فِرَاشِيْ کہ میں اسے اپنے بستر ہ کے کونے میں بھول آیا ہوں۔خَصْمٌ کی جمع خُصُومٌ وَ اَخْصَامٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا﴾ (۲۲۔۹) دو فریق جھگڑتے ہیں۔میں خَصْمَانِ سے دو فریق مراد ہیں اسی لئے اخْتَصَمُوا آیا ہے۔

اَلْاِخْتِصَامُ: (افتعال) ایک دوسرے سے جھگڑنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ﴾ (۵۰۔۲۸) ہمارے حضور ردوکد نہ کرو۔

﴿وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُونَ﴾ (۲۶۔۹۶)......وہ آپس میں جھگڑیں گے۔

اَلْخَصِيمُ: جھگڑالو بہت زیادہ جھگڑنے والا جیسے فرمایا:

﴿فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۶۔۴) مگر وہ (اس بارے میں) علانیہ جھگڑنے لگا۔

اَلْخَصِمُ: سخت جھگڑالو جس کا شیوہ ہی جھگرنا ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾ (۴۳۔۵۸) حقیقت یہ ہے یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

(خ ض د)

خَضَدْتُهٗ فَانْخَضَدَ کے معنیٰ ہیں: میں نے درخت کے کانٹے توڑے چنانچہ وہ ٹوٹ گئے اور ایسے درخت کو جس کے کانٹے توڑدیئے گئے ہوں اسے مَخْضُوْدٌ اور خضید کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۸) یعنی بے خار کی بیریوں میں۔

اور خُضْدٌ بمعنیٰ مَخْضُوْدٌ آتا ہے جیسے نَقْضٌ بمعنیٰ مَنْقُوْضٌ اور اسی سے استعارۃً خَضَدَ عُنُقَ الْبَعِيْرِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔یعنی اس نے اونٹ کی گردن توڑ ڈالی۔

(خ ض ر)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾ (۲۲۔۶۳) تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

﴿ثِيَابًا خُضْرًا﴾ (۱۸۔۳۱) سبز رنگ کے کپڑے۔

خُضْرًا کا واحد اَخْضَرَ ہے اور اَلْخُضْرَةُ: ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے جو سفیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے مگر سیاہی غالب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اَسْوَدُ (سیاہ) اور اَخْضَرُ (سبز) کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)

---

[1] راجع اللسان (خصم) من حديث ام سلمة قالت يارسول الله اراك ساهم الوجه أمن علة قال لكنّه من السبعة الدنانيرانى اتينابها امس في خصم الفراش فبت ولم اقسمها.

[2] قاله ذوالرمة ويروى المجهول بدل المحهور ومعسفه بدل معسفة كمافى اللسان (هوم) والاقتصاب وفى رواية اغضف بدل اخضر هو المثنىٰ وادب الكاتب ۲۳ : ۱۹۱ والبيت فى ديوانه ٥٧٤ واضداد ابن الانبارى ۳٤۸ واللسان (خضر ، عسف) واضداد ابى الطيب ۲۳۰ والحيوان (٦ : ١٧٥) والسيوطى : ١٥٠ والمحكم (عسف) ومعنىٰ العسف ركوب المفازة وقصعها بغير قصد ولاهداية ولاتوخى صواب ولاطريق مسلوك ۱۲.

(۱۳۶) قَدْ اَعْسَفَ النَازِحَ الْمَجْهُوْدَ مَعْسَفَةً
فِی ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوْهَا مَهُ الْیَوْمُ

میں تاریک اور بھیانک راتوں میں دور دراز راستوں میں سفر کرتا ہوں جو بےنشان ہوتے ہیں۔اور سبزی اور شادابی کی وجہ سے عراق کے ایک حصہ کو سَوَادُ العَرَاق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿مُدْهَآمَّتَانِ﴾ (۵۵۔۶۴) کے معنیٰ سرسبز کے ہیں اور خُضْرَة کی جگہ دُهْمَة کالفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ سیاہی کے ہیں۔حدیث میں ہے [1]

(۱۱۴) اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ: تم کوڑی کی سرسبزی سے بچو۔اور خَضْرَاءَ الدِّمَنِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اَلْمَرأَةُ الحَسَنَةُ فِی مَنْبَتِ السُّوْءِ: یعنی خوبصورت عورت جو بدطینت ہو۔

اَلْمُخَاضَرَةُ: سبزیوں اور کچے پھلوں کی بیع کرنا۔

اَلْخَضِیْرَةُ: کھجور کا درخت جس کی سبز اور نیم پختہ کھجوریں جھڑ جائیں۔

(خ ض ع)

اَلْخُضُوعُ کے معنی خشوع یعنی جھکنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجُلٌ خُضَعَةٌ﴾ وہ شخص جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری ظاہر کرتا پھرے۔

خَضَعْتُ اللَّحْمَ: میں نے گوشت کاٹا۔

ظَلِیْمٌ اَخْضَعُ: شتر مرغ جس کی گردن میں پستی اور جھکاؤ ہو۔

(خ ط ط)

اَلْخَطُّ: (مثل مَدٌّ) جس میں طول ہو اہل ہندسہ کے نزدیک خطوط کئی قسم پر ہیں۔یعنی مسطوح، مستدیر مقوّس اور ممال وغیرھا اور ہر مستطیل علاقہ کو خَطٌّ کہہ دیتے ہیں جیسے خَطُّ الْیَمِنِ: جو یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں اور زمین کا وہ حصہ جو انسان اپنے لئے مخصوص کرے اور کھودے اسے خَطٌّ اور خِطَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَطِیطَةُ: وہ زمین جس کے اردگرد بارش ہوئی اور وہ درمیان میں خط منحرف کی طرح بے بارش کے رہ گئی۔اور اَلْخَطُّ کے معنیٰ لکھنا، کتابت کرنا بھی ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَاکُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ کِتَابٍ وَّلاَ تَخُطُّهُ بِیَمِیْنِكَ﴾ (۲۹۔۴۸) اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔

(خ ط ی)

اَلْخَطأُ وَالْخَطَأَةُ کے معنیٰ صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔یہ خطا تام ہے جس پر مواخذہ ہوگا۔اس معنیٰ میں فعل خَطِیءَ یَخْطَأُ خَطْأً وَخِطْأَةً بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ خِطْأً کَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔

---

[1] رواه الدارقطنی فی الافراد والرامهرمزی فی الامثال من حدیث الحذری قال الدارقطنی تفردبه الواقدی وهو ضعیف (تخریج احیاء للعراقی ۲: ۴۱) والحدیث مثل راجع المیدانی ۱: ۳۲ والفائق ۱: ۱۷۵ وغریب ابی عبید الحصری ۱: ۵۹.

﴿وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴾ (۱۲۔۹۱) اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔

(۲) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہوجائے۔ کہا جاتا ہے۔

اَخْطَاَ يُخْطِيءُ اِخْطَاءً فَهُوَ مُخْطِيءٌ: اس میں اس کا ارادہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶

(۱۱۵) رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھالئے گئے ہیں۔ نیز فرمایا: ❷

(۱۱۶) مَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ: جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾ (۴۔۹۲) اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو)......... غلام کو آزاد کردے۔

(۳) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہوجائے۔ اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے ❸

(۱۳۷) اَرَدْتُ مَسَاءَتِي فَاَجْرَتْ مَسَرَّتِيْ
وَقَدْ يَحْسُنُ الْاِنْسَانُ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرِيْ

(تو نے میری برائی کا ارادہ کیا لیکن مجھے خوشی حاصل ہوگئی کبھی انسان نادانستہ طور پر بھی اچھا کام کرلیتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے خلاف فعل صادر ہوجائے۔ تو اس کے متعلق "اخطأ" کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق وہ فعل صادر ہو تو اصاب کہتے ہیں۔ مگر کبھی اَخْطَأَ کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی نازیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہٰذا اَصَابَ الْخَطَأَ وَاَخْطَأَ الصَّوَابَ وَاَصَابَ الصَّوَابَ وَاَخْطَأَ الْخَطَأَ: ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک ہے جو بہت سے معانی کا محتمل ہوتا ہے اس لئے جو شخص حقائق کا متلاشی ہو اسے اس کے متعلق خوب غور سے کام لینا چاہیے۔

اَلْخَطِيْئَةُ: یہ قریب قریب سَيِّئَةٌ کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ﴾ (۲۔۸۱) اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔

لیکن زیادہ تر خَطِيْئَةٌ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدور کا سبب بن جائے مثلاً کسی نے شکار کو نشانہ لگایا مگر نشانہ خطا ہو کر کسی انسان کو جالگا یا کسی مسکر چیز کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا یہ سبب دو قسم پر ہے ایک سبب محظور جیسے مسکر چیز پینا اس حالت میں جو فعل سرزد ہوگا وہ قابل گرفت ہوگا۔ دوم سبب مباح جیسے شکار کو نشانہ بنایا اس حالت میں اگر کوئی خطا سرزد ہوگی اس پر گرفت نہیں ہوگی اس قسم کی غلطی کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ

---

❶ وفي رواية وضع وفي ابن عدى عن ابى بكرة مرفوعاً رفع الله عن هذه هذا الامة ثلاثاً الخ قال الحافظ في تخريجه ص ۱۳۲ رقم ۲۰۳ هذه من منكرات جعفر وفي رواية ابن ماجة والبيهقي وابن حبان عن ابن عباس ان الله تجاوز عن امتي (راجع المشكوة واللآلي للسيوطي. ❷ لم احده .

❸ لم احده ويرجى ۱۲ .

﴿مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۳۳۔۵) اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے)
اور آیت کریمہ:
﴿وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْئَةً اَوْ اِثْمًا﴾ (۴۔۲۲) اور جو کوئی قصور یا گناہ خود کرے۔
میں خَطِیْئَتُهٗ سے وہ فعل مراد ہے جو بلا قصد سرزد ہوا ہو اسی قسم کی خطأ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔
﴿وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓـئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ (۲۶۔۸۲) اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔
خَطِیْئَةٌ کی جمع خَطِیْئَات وخَطَایَا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تَزِدِالظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۔ مِمَّا خَطِیْٓـئٰتِهِمْ﴾ (۷۱۔۲۴، ۲۵) اور ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا (آخر) وہ اپنے گناہ کے سبب ہی۔
﴿اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَا﴾ (۲۶۔۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ بخش دے گا۔
﴿وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (۲۹۔۴) ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ﴾ (۲۔۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے۔
سے وہ مراد ہیں جو عمداً کئے ہوں۔
اَلْخَاطِیءُ بالا ارادہ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے فرمایا:
﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ۔ لَّا یَاْکُلُهٗٓ اِلَّا الْخٰطِئُوْنَ﴾ (۶۹۔۳۷) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔
مگر کبھی نفس گناہ پر بھی خَاطِئَةٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿وَالْمُؤْتَفِکٰتُ بِالْخَاطِئَةِ﴾ (۶۹۔۹) اور وہ جو الٹی بستیوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔
یعنی وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے تھے جیسا کہ (بطور مبالغہ) شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن جو گناہ بلا قصد سرزد ہوجائے اس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ وہ قابل گرفت نہیں ہے [1] مگر آیت کریمہ:
﴿نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ﴾ (۲۔۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے۔میں وہی معنی مراد ہیں جسے ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

(خ ط ب)

اَلْخَطْبُ وَالْمُخَاطَبَةُ وَالتَّخَاطُبُ: باہم گفتگو کرنا۔ایک دوسرے کی طرف بات لوٹانا اسی سے خُطْبَةٌ اور خِطْبَةٌ کا لفظ ہے لیکن خُطْبَةٌ وعظ ونصیحت کے معنی میں آتا ہے اور خِطْبَةٌ کے معنی ہیں نکاح کا پیغام قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ (۲:۲۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو......تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔
اصل میں خِطْبَةٌ اسی حالت کو کہتے ہیں جو بات کرتے وقت ہوتی ہے جیسا کہ جِلْسَةٌ اور قِعْدَةٌ پھر خُطْبَةٌ سے تو خَاطِبٌ اور خَطِیْبٌ (دونوں لفظ استعمال

---

[1] وقد مرالآن ۱۲.

ہوتے ہیں مگر خِطْبَۃٌ صرف خَاطِبٌ کا لفظ ہی بولا جاتا ہے۔اور خَطَبَ فعل دونوں معنی کے لیے آتا ہے۔

اَلْخَطْبُ: اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ﴾ (۲۰:۹۵)(پھر سامری سے کہنے لگے) کہ سامری تیرا کیا حال ہے۔

﴿فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۵۱:۳۱) کہ فرشتو تمہارا مدعا کیا ہے۔

﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (۳۸:۲۰) دوٹوک بات، فیصلہ کن بات جس سے نزاع ختم ہوجائے۔

(خ ط ف)

خَطِفَ يَخْطِفُ خَطْفًا وَاخْتَطَفَ اخْتِطَافًا کے معنیٰ کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔

یہ باب (س ض) دنوں سے آتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾ (۳۷۔۱۰) ہاں جو کوئی (فرشتوں کی) بات کو) چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے۔

طا پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملاءاعلیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔نیز فرمایا:

﴿تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ﴾ (۲۲۔۳۱) پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ﴾ (۲۔۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں (کی بصارت کو اچک لے جائے۔

﴿وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ (۲۹۔۶۷) اور لوگ ان کے گردونواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔یعنی ان کے گردونواح میں قتل وغارت کا سلسلہ جاری ہے۔

اَلْخَطَّافُ: (۱) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔(۲) آہن کج جس کے ذریعے کنویں سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے۔(۳) وہ لوہا جس پر کنویں کی چرخی گھومتی ہے۔ج خَطَاطِيْفُ بَازٍ مُخْطِفٌ: باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

اَلْخَطِيْفُ: تیز رفتاری۔اَخْطَفُ الحشَاوَ مُخْتَطِفُهٗ: مرد باریک شکم جس کے دبلا پن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

(خ ط و)

خَطَوْتُ اَخْطُوْ کے معنی چلنے کے لئے قدم اٹھانے کے ہیں۔خَطْوَۃٌ ایک بار قدم اٹھانا۔اَلْخُطْوَۃ: وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔

اَلْخُطْوَۃ: کی جمع خُطُوَاتٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ (۲۔۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

یعنی شیطان کی اتباع نہ کرو۔اور یہ آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرو۔

کی طرح ہے۔

(خ ف ف)

اَلْخَفِيْفُ: (ہلکا) یہ ثَقِیل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔اس کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) کبھی وزن میں مقابلہ کے طور پر یعنی دو چیزوں کے باہم مقابلہ میں ایک کو خفیف اور دوسری کو ثقیل کہہ دیا جاتا ہے۔جیسے دِرْهَمٌ خَفِيْفٌ وَدِرْهَمٌ ثَقِيْلٌ: یعنی وہ درہم ہلکا ہے۔اور یہ بھاری ہے۔

(۲) اور کبھی تقابل زمانی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک گھوڑا جو فی گھنٹہ دس میل کی مسافت طے کرتا ہو اور دوسرا پانچ میل فی گھنٹہ دوڑتا ہو تو پہلے کو خفیف (سبک رفتار) اور دوسرے کو ثقیل (سست رفتار) کہا جاتا ہے۔

(۳) جس چیز کو خوش آئند پایا جائے اسے خفیف اور جو طبیعت پر گراں ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے اس صورت میں خفیف کا لفظ بطور مدح اور ثقیل کا لفظ بطور مذمت استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ:

﴿اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ (۸۔۶۶) اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔

﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ (۲۔۸۶) سو نہ تو ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ اسی معنیٰ پر محمول ہیں بلکہ ہمارے نزدیک آیت۔

﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا﴾ (۷۔۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

(۴) جو شخص جلد طیش میں آ جائے اسے خفیف اور جو پر وقار ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے۔ اسی معنیٰ کے اعتبار سے خفیف صفت ذم ہوگی اور ثقیل صفت مدح۔

(۵) جو اجسام نیچے کی طرف جھکنے والے ہوں انہیں ثقیلہ اور جو اوپر کی جانب چڑھنے والے ہوں انہیں خفیفہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنیٰ کے لحاظ سے زمین پانی وغیرہا کو اجسام ثقیلہ اور ہوا، آگ وغیرہا اجسام خفیفہ میں داخل ہوں گے۔

خَفَّ (ض) خَفًّا وَخِفَّةً وَتَخَفَّفَ: ہلکا ہونا۔ خَفَّفَهٗ تَخْفِيفًا: ہلکا کرنا۔ اِسْتَخَفَّهٗ: ہلکا سمجھنا۔ خَفَّ الْمَتَاعُ سامان کا ہلکا ہونا اسی سے كَلَامٌ خَفِيفٌ عَلَى اللِّسَانِ کا محاورہ مستعار ہے یعنی وہ کلام جو زبان پر ہلکی ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ﴾ (۴۳۔۵۴) غرض اس نے اپنی قوم کی عقل ماردی اور انہوں نے اس کی بات مان لی۔ کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ اس نے اپنی قوم کو اکسایا کہ اس کے ساتھ تیزی سے چلیں اور یا یہ کہ انہیں اجسام وعزائم کے اعتبار سے ڈھیلا پایا اور بعض نے یہ معنیٰ بھی کئے ہیں کہ انہیں جاہل اور کم عقل سمجھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (۷۔۹) اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے۔

میں اعمال صالحہ کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ﴾ (۳۰:۶۰) اور وہ تمہیں اوچھا نہ بنا دیں۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ شبہات پیدا کر کے تمہیں تمہارے عقائد سے متزلزل اور برگشتہ نہ کر دیں۔

خَفُّوا عَنْ مَنَازِلِهِمْ: وہ تیزی سے کوچ کر گئے۔

اَلْخُفُّ: موزہ۔ انسان کے موزہ سے تشبیہ دے کر خُفُّ النَّعَامَةِ وَالْبَعِيرِ (سپل شتر وسم شتر مرغ) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(خ ف ت)

اَلْمُخَافَتَةُ وَالْخَفْتُ پوشیدہ گفتگو کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰۔۱۰۳) وہ آپس میں آہستہ آہستہ کہیں گے۔

﴿وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ (۱۷۔۱۱۰) اور نہ آہستہ۔ کسی شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۳۷) وَشَتَّانَ بَيْنَ الْجَهْرِ وَالْمَنْطِقِ الْخَفْتِ

کہ بلند اور پوشیدہ گفتگو میں بیّن فرق ہوتا ہے۔

---

[1] البیت فی الصحاح واللسان (خفت) بغیر عزو وصدره: اخاطب جهراً اذلهن تخافت ۱۲۔

(خ ف ض)

اَلْخَفْضُ یہ رَفْعٌ کی ضد ہے اور خَفْضٌ کے معنیٰ نرم رفتاری اور سکون وراحت بھی آتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ (۱۷۔۲۴) اور عجز ونیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ میں ماں باپ کے ساتھ نرم برتاو اور ان کا مطیع اور فرمابردار ہو کر رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ گویا یہ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ (کہ مجھ سے سرکشی نہ کرنا) کی ضد ہے اور قیامت کے متعلق فرمایا:

﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۵۶۔۳) کسی کو پست کرے اور کسی کو بلند۔

کیونکہ وہ بعض کو پست اور بعض کو بلند کردے گی پس خَافِضَةٌ میں آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ (۹۵۔۵) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

(خ ف ی)

خَفِیَ (س) خُفْيَةً الشَّیْءُ: پوشیدہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً﴾ (۷۔۵۵) اپنے پروردگار سے عاجزی اور چپکے چپکے سے دعائیں مانگا کرو۔

اَلْخِفَاءُ: (مثل غِطَاءَ) کے معنیٰ پردہ کے ہیں۔

خَفَيْتُهُ: میں نے اس سے پوشیدگی دور کردی۔ یعنی ظاہر کر دیا۔ اَخْفَيْتُهُ پوشیدہ کرنا۔ چھپانا یہ اِبْدَاء اور اعلان کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور وہ بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

﴿وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ﴾ (۱۔۶۰) جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔

﴿بَلْ بَدَالَهُمْ مَّاكَانُوا يُخْفُوْنَ﴾ (۶۔۲۸) ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہو گیا ہے۔

اَلْاِسْتِخْفَاءُ: چھپنا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ﴾ (۱۱۔۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ خدا سے پردہ کریں۔

اَلْخَوَافِی: پرند کے بازوں کے نیچے چھپے ہوئے پر۔ اس کا مفرد خَافِيَةٌ ہے اور یہ اَلْقَوَادِمُ کی ضد ہے۔

(خ ل ل)

اَلْخَلَلُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو کہتے ہیں مثلاً بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ یا راکھ وغیرہ کا اندرونی حصہ اس کی جمع خِلَالٌ ہے۔ چنانچہ بادل کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَرَی الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهٖ﴾ (۳۰۔۴۸) تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔

اور گھروں کے متعلق فرمایا:

﴿فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ﴾ (۱۷۔۵) اور وہ شہروں

کے اندر پھیل گئے۔

شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۳۹) اَرَیٰ خَلَلَ الرَّمَادِ وَمِیْضَ جَمْرٍ

میں راکھ کے اندر آگ کے انگارے کی چمک دیکھتا ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَاْ اَوْضَعُوا خِلٰلَكُمْ﴾ (۹۔۴۷) اور تم میں دوڑے دوڑے پھرتے۔ یعنی چغل خوری اور فساد سے تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے۔

اَلْخِلَالُ: دانت وغیرہ صاف کرنے کا تنکا کہا جاتا ہے۔ خَلَّ سِنَّهٗ اس نے اپنا دانت صاف کیا۔ خَلَّ ثَوْبَهٗ کپڑے میں سوراخ کرنا۔ خَلَّ (ن) لِسَانَ الْفَصِیلِ اونٹ کے بچے کی زبان کو چھید کر تھوتھنی ڈالنا تاکہ اونٹنی کا دودھ نہ پی سکے۔

خَلَّ الرَّمِیَّةَ بِالسَّهْمِ نشانہ پر تیز مار کر سوراخ کر دیا۔

حدیث میں ہے: [2]

(۱۱۷) خَلِّلُوا اَصَابِعَكُمْ (وضو میں انگلیوں کا خلال کیا کرو) اَلْخَلَلُ فِی الْاَمْرِ کسی کام میں خرابی کا پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ دو چیزوں کے درمیان رخنہ پڑ جاتا ہے۔

خَلَّ (ض) خَلًّا وَّ خِلَالًا لَحْمُهٗ گوشت کا دبلا اور کم ہو جانا۔ شاعر نے کہا ہے [3]

(۱۴۰) اِنَّ جِسْمِی بَعْدَ خَالِی لَخَلٌّ

کہ ماموں کے مرنے کے بعد میرا جسم گھل گیا ہے۔

اَلْخَلَّةُ ریگ زار کے اندر راستہ کو کہتے ہیں اور اسے خَلَّة یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دشوار گزار ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ راستہ ریگ زار کے اندر سے گزرتا ہے۔ نیز ترش سرکہ کو بھی خَلَّة کہتے ہیں۔ کیونکہ ترشی اس میں سرایت کئے ہوتی ہے۔ اَلْخِلَّةُ تلوار کی نیام کا چمڑا جو اس کے اوپر منڈھا ہوا ہوتا ہے۔ نیام چونکہ اس کے اندر رہتی ہے اس لئے اس چمڑے کو خِلَّة کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلَّةُ (ایضا) طبیعت کی خرابی یا عارضہ جو کسی چیز کی خواہش یا سخت احتیاج کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَلَّة کے معنیٰ حاجت اور خصلت بیان کئے جاتے ہیں۔

---

[1] قاله بعض شعراء الامويين وتمامه : اخاف ان يكون له ضرام ۔ والبيت في اللسان (ضرم) ونسبه ابن برى لابى مريم وفى روايته خلل الرماد بدل خلال الرماد وفى تاريخ الطبرى (٦ : ٣٦) كتب نصر بن سيار الى مروان بن محمد وفى العقد (٤ : ٤٧٧) اِلٰى هشام بن عبدالملك يخبره بخروج ابى مسلم الخراسانى عليه والبيت ايضاً فى الاخبار الطوال لابى حنيفة الدينورى المتوفى ٢٨٢ھ فى خمسة ابيات كذا فى مجموعة المعانى ١١٢ وعزاه لابى مريم النحلى وفى محاضرات المولف ٣ : ١٧٧) معزولابى مهيم والبيت ايضاً فى الاغانى (٦ : ١٢) وفيه واحربان بدل احاذران وفى ابن عساكر (٤ : ١٩١) خليق ان وفى الاغانى (٦ : ١٢٨) انه ارسل الابيات اى الوليد بن يزيد وفى العقد ١ : ١١١) ناربدل جمر كذافى الاصول سوى العيون ١ : ١٢٨).

[2] راجع (حم) عن ابن عباس و(قط) عن عائشة و(قط) عن ابى هريرة (الفتح للنبهانى ج ٢ص ٩٠).

[3] وصدره فاسقنيها ياسواد بن عمرو والبيت فى قصيدة حماسية لتابط شرافى رثاء خاله بعد ان اخذ بثاره و مطلعها ان بالشعب الذى دون سلع ـ لقتيلاً دمه مايطل ـ وفى نسبته اختلاف كبير نسبه ابو تمام فى الحماسة لتأبط شراً (٢ : ٣١٣ـ٣١٩) المرزوقى ـ والتبريزى الى خلف الاحمر ٢ : ٦٠) وطبقات الشعراء لابن سلام ٩٧ وبعضهم الى ابن اخت تابط شرا ثم اختلف فى ابن اخته فقيل الشنفرىٰ كما فى الاغانى ٥ : ١٦٢) وامالى المرتضىٰ (٢ : ١٨٥ وذيله ١ : ٢٨٠) واللسان (خلل) قال فى السمط ٩٢٠ قوله بعد خالى يريداً اختيالى وقيل اراد بعد قتل خالى وفى امالى القالى (٢ : ٢٧٨) الخل الرجل النحيف الحسم وعده العلماء من الاضداد١٢.

اَلْخُلَّةُ: مودت، دوستی، محبت اور دوستی کو خُلَّة یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دل کے اندر سرایت کر جاتی ہے ۔ اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر داخل ہو کر اس طرح اثر کرتی ہے جس طرح تیر نشانہ پر لگ کر اس میں نشان ڈال دیتا ہے ۔ اور یا اس لئے کہ اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے ۔ اسی لئے کہا جاتا ہے ۔

خَالَلْتُهٗ مُخَالَّةً وَخِلَالًا فَهُوَ خَلِيْلٌ: اور آیت کریمہ: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (۴۔۱۲۵) اور خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا تھا ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا ہے کہ وہ ہر حال میں باری تعالیٰ کے محتاج تھے اور یہ احتیاج ویسے ہی ہے ۔ جس کی طرف آیت: ﴿اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ﴾ (۲۸۔۲۴) میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے ۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے ۔ اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے [1]

(۱۱۸) اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِيْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَيْكَ وَلَا تُفْقِرْنِيْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ: اے اللہ! مجھے اپنی احتیاج کے ساتھ غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے کسی دوسرے کا محتاج نہ بنا ۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلِيْلٌ خُلَّةٌ سے ہے اور اللہ کے حق میں خُلَّة کے لفظ کے وہی معنیٰ ہیں جو لفظ محبت کے ہیں ابوالقاسم البلخی کا کہنا ہے [2] کہ یہ خُلَّة (احتیاج) سے ہے اور خُلَّة (دوستی) سے نہیں ہے ۔ جو لوگ اسے حبیب پر قیاس کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے محبت کرنا تو جائز ہے اس لئے کہ محبت اس کی ثنا میں داخل ہے ۔ لیکن خُلَّة دوستی جائز نہیں ہے کیونکہ خلّة کے معنیٰ دوستی کے دل میں سرایت کر جانے کے ہیں ۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [3]

(۱۴۱) قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّيْ
وَبِهٖ سُمِّيَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلًا

تم میرے لئے بمنزلہ روح کے ہو اور اسی سبب سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے ۔ اسی بنا پر مشہور محاورہ ہے ۔ تَمَازَجَ رُوْحَانَا: ہماری روحیں باہم مخلوط ہیں ۔

اور محبت کے معنیٰ حبۂ قلب میں دوستی رچ جانے کے ہیں ۔ یہ حَبَّتُهٗ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ حبۂ پر مارنے کے ہیں ۔ لیکن جُب اللہ تعالیٰ کے متعلق محبت کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد احسان اور مہربانی کے ہوتے ہیں لہٰذا یہی معنیٰ خُلّة سے مراد ہوں گے ۔ کیونکہ اگر ایک میں یہ تاویل صحیح ہے تو دوسرے میں بھی ہو سکتی ہے ۔ مگر حُبٌّ سے حَبَّةُ الْقَلْبِ مراد لینا اور خُلَّة سے اللہ تعالیٰ کے حق میں تخلل کا معنیٰ لینا صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ان باتوں سے بلند ہے ۔ [4] اور آیت کریمہ: ﴿لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ﴾ (۲۔۲۵۴) جس میں نہ اعمال کا سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی ۔

---

[1] کتاب میں حوالہ نہیں لکھا ۔

[2] راجع لاحواله فی (ذرء).

[3] قاله بشار بن برد الاعمیٰ والبیت فی ادب الدنیا والدین للماوردی ۲۹۰ والبحر ۳: ۳٤۸ ومحاضرات المؤلف ۳: ۱۳.

[4] قال البغدادی فی لباب التاویل ۱: ۵۰۲) وخلة الله للعبدھی تمکینه من طاعته وعصمته وتوفیقه وستر خلله ونصره والثناء علیه۱۲.

کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے دن نہ تو حسنات کی خرید وفروخت ہوگی اور نہ ہی مودت کے ذریعہ حاصل ہو سکیں گی تو گویا یہ آیت:
﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلَالٌ﴾ (۱۴۔۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خِلَالٌ باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ خَلِیْل کی جمع ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَخِلَّۃٌ وَّخِلَالٌ دونوں آتی ہیں اور یہ پہلی آیت کے ہم معنیٰ ہے۔

(خ ل د)

اَلْخُلُوْدُ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں عرصۂ دراز تک تغیر وفساد پیدا نہ ہو اہل عرب اسے خلود کے ساتھ متصف کردیتے ہیں۔ مثلاً چولہے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے۔ "خَوَالِدٌ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیر تک ایک جگہ پڑے رہتے ہیں نہ اس لئے کہ ان کو دوام وبقا حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے۔
خَلَدَ یَخْلُدُ خُلُوْدًا عرصۂ دراز تک رہنا۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۹) شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ اور خَلَدٌ انسان کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو تازندگی ایک حالت پر قائم رہتا ہے اور دوسرے اعضاء کی طرح اس میں تغیر نہیں ہوتا۔
اصل میں مُخَلَّدٌ اسے کہتے ہیں جو عرصۂ دراز تک باقی رہے اس بنا پر جس شخص میں باوجود بڑی عمر کے بڑھاپا نہ آئے اسے مُخَلَّدٌ کہا جاتا ہے۔ اور جس جانور کے (رباعی) دانت نکلنے تک ثنایادانت قائم رہیں اس مُخَلَّدَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور بطور استعارہ ہمیشہ رہنے والی چیز کے متعلق خلود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
جنت میں خلود کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۳) یہی صاحب جنت ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔
﴿اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (۲۔۸۱) تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔
﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ (۴۔۹۳) اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔ تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔ اور آیت کریمہ:
﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۷) نوجوان خدمت گار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔
کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے اور ان کی حالت تبدیل نہیں ہوگی اور بعض نے اس کے معنیٰ مُقَرَّطُوْنَ بِالْخُلْدَۃِ کئے ہیں یعنی بالیاں

پہنے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ خَـلَـدَةٌ ایک قسم کی بالی کو کہتے ہیں۔

اَلْاِخْلَادُ کے معنیٰ کسی چیز کو باقی رکھنے یا اس پر بقا کا حکم لگانے کے ہیں اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿وَلٰـكِـنَّـهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۷۶) یعنی زمین کی طرف مائل ہوگیا یہ خیال کر کے کہ وہ اس پر ہمیشہ رہے گا۔

(خ ل ص)

اَلْـخَـالِصُ: (خالص) اور اَلـصَّـافِیْ دونوں مترادف ہیں مگر الصافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے آمیزش ہو مگر اس سے صاف کرلیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

خَلَصْتُهٗ فَخَلَصَ: میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہوگیا اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۴۲) خُلَاصُ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامُ

جیسے شراب صافی سے صاف ہوکر نکل آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَـالُـوْا مَـافِـیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّـذُكُورِنَا﴾ (۶۔۱۳۹) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بچہ ان چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے۔

محاورہ میں هٰـذَا خَـالِصٌ وَخَالِصَةٌ (مذکر ومؤنث) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسے وَاهِيَةٌ وَرَاوِيَةٌ اور

آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا اسْتَيْـئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہوگئے تو الگ ہوکر صلاح کرنے لگے۔

میں خَـلَـصُوا کے معنیٰ دوسروں سے الگ ہونا کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَنَـحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ (۲۔۱۳۹) اور ہم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

﴿اِنَّـهٗ مِـنْ عِـبَـادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۱۲۔۲۴) بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔ میں مخلص بندہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ نہ تو یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل تھے چنانچہ تثلیث کے متعلق فرمایا:

﴿لَـقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَـلَاثَةٍ﴾ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے اور مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

﴿مُـخْـلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (۹۸۔۵) کہ اخلاص کے ساتھ۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ (۴۔۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہوگئے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّـهٗ كَـانَ مُخْلَصاً وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ (۱۹۔۵۱) بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔ اور حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونے کا نام ہے۔

---

[1] قاله المتنبی یصف حمی فالته بمصر فی ذی الحجة سنة ثمان واربعین وثلاث ماۃ فی قصیدہ ٤١ بیته وصدره : وضاقت خطة فخلصت منها راجع دیوانه ٣٦٦ هندیه بمصر ١٩٢٣۔

(خ ل ط)

اَلْخَلْطُ: (ن) کے معنیٰ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجزا کو جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ چیزیں سیال ہوں یا جامد یا ایک مائع ہو اور دوسری جامد اور یہ مَزْجٌ سے اعم ہے۔ کہا جاتا ہے: اِخْتَلَطَ الشَّیْءُ (کسی چیز کا دوسری کے ساتھ مل جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ..........مل کر نکلا۔
خَلِیْطٌ کے معنیٰ دوست، پڑوسی یا کاروبار میں شریک کے ہیں۔ اسی سے کتب فقہ میں خَلِیْطَان کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا مال اکٹھا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۳۸۔۲۴) اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔
اور خَلِیْطٌ کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (بسیط)

(۱٤۳) بَانَ الْخَلِيْطُ وَلَمْ يَاوُوْا لِمَنْ تَرَكُوْا

ساتھی جدا ہو گئے اور انہوں نے جن کو چھوڑا ان پر رحم نہ کھایا۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (۹۔۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا۔
یعنی نیک اور بد دونوں قسم کے عمل کرتے رہے۔ محاورہ ہے۔
اَخْلَطَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِهٖ (فلاں نے بکواس کی)
اَخْلَطَ الْفَرَسُ فِیْ جَرْیِهٖ: گھوڑے کا دوڑنے میں کوتاہی کرنا۔

(خ ل ع)

اَلْخَلْعُ: اس کے معنیٰ اتار دینے کے ہیں اور یہ انسان کا اپنے کپڑے وغیرہ اور گھوڑے کا جھول اور پوزی وغیرہ اتارنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ (۲۰۔۱۲) تو اپنی جوتیاں اتار دو۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظی معنیٰ مراد ہیں اور انہیں جوتا اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ مردار گدھے کے چمڑے سے بنا ہوا تھا بعض صوفیا نے کہا ہے کہ یہ دراصل تمثیل ہے کہ یہاں اطمینان سے اقامت پذیر ہو جاؤ جیسا کہ جب کسی کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں جم کر بیٹھ جاؤ تو اس کے لئے اِنْزِعْ ثَوْبَكَ اَوْ خُفَّكَ وغیرہ محاورات استعمال کئے جاتے ہیں۔ کبھی اس کا صلہ علیٰ لا کر اس سے بخشش کے معنیٰ بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے خَلَعَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ: فلاں نے اسے خلعت دی یا در ہے کہ عَلٰی (صلہ) کی وجہ سے عطا کے معنیٰ مفہوم ہوتے ہیں ورنہ اس کے بغیر یہ معنیٰ صحیح نہیں ہوتے۔

(خ ل ف)

خَلْفٌ: (پیچھے) یہ قدام کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ (۲۔۲۵۵) جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔

[1] قاله زهير في مطلع قصيدة في ۳۳ بيتاً وتمامه: وزودوك اشتياقاً اية سلكوا والبيت في النقائض ۱٦۹ وديوانه والعقد الثمين ۸٦۔۲۸۳۔

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ﴾ (۱۳۔۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں۔
﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (۱۰۔۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے) نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت ہو۔
اور خَلَفَ کے معنیٰ پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ تَقَدَّمَ اور سَلَفَ کی ضد ہے اور جو مرتبہ میں گرا ہوا ہو اسے بھی خَلْف کہا جاتا ہے اسی بنا پر ردی چیز کو خَلْفٌ کہتے ہیں اور خلف کے معنیٰ متاخر اور جانشین کے بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ (۷۔۱۶۹) پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔
امثال عرب ہے[1] (مثل)
سَكَتَ اَلْفاً وَّ نَطَقَ خَلْفاً: کہ وہ ہزار باتوں سے خاموش رہا اور آخر بات کی تو بے ہودہ اور ردی۔
خُلْفَةٌ: سرین جب اس سے گوز نکل جائے کم عقل جو بے ہودہ بات کرے۔
تَخَلَّفَ فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ: کسی سے پیچھے رہ جانا کسی کا جانشین ہونا۔ اس کا مصدر خِلَافَةٌ ہے جس کے معنیٰ جانشینی کے ہیں مگر خَلَفَ خَلَافَةٌ (بفتح الخاء) کے معنیٰ کم عقل ہونے کے ہیں اور کم عقل آدمی کو خَالِفٌ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی خَلْفٌ سے ناخلف بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ (۱۹۔۵۹) پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو (چھوڑ دیا گوا سے) کھو دیا۔
اور جو کسی کا جانشین اور قائم مقام ہو اسے خَلَفٌ (بفتح اللام) کہا جاتا ہے۔ خِلْفَةٌ: ایک کا دوسرے کے بعد آنا قائم مقام ہونا۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ (۲۵۔۶۲) اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔
کہا جاتا ہے:
اَمْرُهُمْ خِلْفَةٌ: یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)
(۱٤٤) بِهَا الْعِيْنُ وَالْاٰرَامُ يَمْشِيْنَ خِلْفَةً
اس میں گاوان دشتی اور ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی ہیں۔
اَصَابَتْهُ خِلْفَةٌ: پیچش لگ جانا۔
خَلَفَ فُلَانٌ فُلَاناً: وہ اس کا جانشین ہوا خواہ اس کی موجودگی میں ہو یا بعد میں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۰) اگر ہم چاہتے تو تم میں سے

---

[1] المثل فی المیدانی رقم ۱۷۷۲ و الاشتقاق ۱۳۷ وفی جل المعاجم ۱۲.
[2] قاله زهیر فی معلقته وتمامه ـ واطلاؤها ینهضن من کل مجثم والبیت فی دیوانه ٥ وشرح القصائد العشر للتبریزی ۱۰۱ ومختار الشعر الجاهلی (۱ : ۱۵۱) وتفسیر الطبری ۲ : ٦٣/ ۱۹ : ۳۳) واللسان (خلف ، طلی) والاقتضاب ۱٦۱ ومحاضرات المؤلف ٤ : ٦٦۳) والجمهرة ۱۰٥ وغریب القران ۳۱٤ والمعانی الکبیر ٦۹٦ والقرطبی ۳ : ٦٥ ومجاز القران ۲ : ۸۰ والعقد الثمین ۹٤ وایام العرب ۲۷۱ وشرح المعلقات لابن الانباری ٦۱,۲۳۹ والسیوطی ۲٥٥.

فرشتے بنا دیتے جو تمہاری جگہ زمین میں رہتے۔
اَلْخِلَافَۃُ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔
خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب سے ہو۔اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا:
﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (۶۔۱۶۵) اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔
﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۵۔۳۹) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔
﴿وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ﴾ (۱۱۔۵۷) اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لا بسائے گا۔
اَلْخَلَآئِفُ کا واحد خَلِیْفَۃٌ ہے اور خُلَفَآءُ کا خَلِیْفٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۸۔۲۶) اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔
﴿وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ﴾ (۱۰۔۷۳) اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنادیا۔
﴿اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ (۷۔۶۹) جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا۔
اَلِاخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَۃُ کے معنی کسی حالت یا قول میں ایک دوسرے کے خلاف طریق کار اختیار کرنے کے ہیں۔اور خِلَافٌ کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے کیونکہ ضدین کا مختلف ہونا تو ضروری ہوتا ہے مگر مختلفین کا ضدین ہونا ضروری نہیں ہوتا۔پھر لوگوں کا باہم کسی بات میں اختلاف کرنا عموماً نزاع کا سبب بنتا ہے۔اس لئے استعارۃً اختلاف کا لفظ نزاع اور جدال کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ﴾ (۴۳۔۶۵) لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔
﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰۔۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔
﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ﴾ (۷۸۔۳) (یہ لوگ) کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں؟ (کیا) بڑی خبر کی نسبت؟ جس میں یہ اختلاف کررہے ہیں۔
﴿اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱۔۸) (اے اہل مکہ) تم ایک متناقض بات میں (پڑے ہوئے) ہو۔
﴿مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ﴾ (۱۶۔۶۹) جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔
﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ﴾ (۳۔۱۰۵) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہوگئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) اختلاف کرنے لگے۔
﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ (۲۔۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے۔خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔
﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا﴾ (۱۰۔۱۹) اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت (یعنی

ایک ہی دین پر) تھے پھر جدا جدا ہو گئے۔
﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّى جَاءَهُمُ الْعِلْمُ وَإِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ (۱۰۔۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی بڑی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بے شک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔
اور قیامت کے دن کے متعلق فرمایا:
﴿وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (۱۶۔۹۲) اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔
﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾ (۱۶۔۳۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ان پر ظاہر کر دے اور آیت کریمہ:
﴿وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ﴾ (۲۔۱۷۶) اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ اخْتَلَفُوْا بمعنی خَلَفُوْا ہے۔ جیسے کَسَبَ وَاكْتَسَبَ اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف اس میں ردوبدل کر دیا۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ﴾ (۸۔۴۲) تو وقت معین (پر جمع ہونے) میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔
میں اخْتَلَفْتُمْ کا لفظ خلاف سے بھی ہو سکتا ہے اور خُلْفٌ سے بھی۔ نیز فرمایا:
﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ﴾ (۴۲۔۱۰) اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف (ہوگا)۔
﴿فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (۳۔۵۵) تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے...... ان کا فیصلہ کر دوں گا۔ اور آیت کریمہ:
﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۱۰۔۶) رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں (اختلاف سے ان کا یکے بعد دیگرے آنا مراد ہے)۔
اَلْخُلْفُ کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں۔ محاورہ ہے:
وَعَدَنِي فَأَخْلَفَنِي: اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا قرآن پاک میں ہے:
﴿بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ﴾ (۹۔۷۷) کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔
﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ (۳۔۹) بے شک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔
﴿فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا﴾ (۲۰۔۸۶، ۸۷) تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا (اس کے) خلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلافی نہیں کی۔
أَخْلَفْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو وعدہ خلاف پایا۔
اَلْإِخْلَافُ: ایک دوسرے کے بعد پانی پلانا۔
أَخْلَفَ الشَّجَرُ: پت جھڑ کے بعد درخت کا دوبارہ سرسبز ہونا۔
أَخْلَفَ اللَّهُ عَلَيْكَ: اللہ تعالیٰ تجھے ضائع شدہ چیز کا نعم

البدل عطا فرمائے۔

خَلَّفَ اللّٰهُ: اللہ کی جانب سے تیرا خلیفہ ہو۔اور آیت کریمہ:
﴿لَا يَلْبَثُوْنَ خَلْفَكَ﴾ (۱۷۔۷۶) تمہارے پیچھے یہ بھی نہ رہتے۔

میں خَـلف کے معنیٰ بعد کے ہیں ایک قرأت میں خِلافَكَ ہے۔یعنی میری مخالفت کر کے اور آیت کریمہ:
﴿اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ (۵۔۳۳) یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔

یعنی ایک سیدھی جانب سے اور دوسرا الٹی جانب سے خَلَّفْتُهٗ میں نے اسے پیچھے چھوڑا۔قرآن میں ہے:
﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۸۱) جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ گئے۔وہ پیغمبر خدا کی (مرضی) کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے۔یعنی اللہ کے پیغمبر کے مخالفت ہو کر۔
﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾ (۹۔۱۱۸) اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔
﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ﴾ (۴۸۔۱۶)............جو......پیچھے رہ گئے تھے ان سے کہدو۔

اَلْخَالِفُ: نقصان یا کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہنے والا اور یہی معنیٰ مُتَخَلِّفٌ کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِيْنَ﴾ (۹۔۸۳) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے ہو۔

اَلْخَالِفَةُ: خیمے کا پچھلا ستون بطور کنایہ اس سے مراد عورتیں لی جاتی ہے۔کیونکہ یہ مجاہدین سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔اس کی جمع خَوَالِف ہے۔

قرآن پاک میں ہے:
﴿رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾ (۹۔۸۷) یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں) بیٹھ رہیں۔
وَجَدْتُ الْحَيَّ خُلُوْفاً: یعنی مرد گئے ہوئے ہیں۔صرف عورتیں موجود ہیں۔ ❶

اَلْخَلْفُ: (ایضاً)۔کلہاڑی کی دھار۔پہلو کی سب سے چھوٹی پسلی جو پیٹ کے جانب سب سے آخری ہوتی ہے۔

اَلْخِلَافُ: بید کی قسم کا ایک درخت کیونکہ وہ امید کے خلاف اگتا ہے یا اس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے۔

مُخْلِفُ عَامٍ اَوْ عَامَيْنِ: شتر کہ از نہ سالگی یک یا دو سال در گذشتہ باشد۔اَلْخِلِّيْفٰى: خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ❷
(۱۱۸) لَوْ لَا الْخِلِّيْفٰى لَاَذَّنْتُ: اگر بار خلافت نہ ہوتا تو میں خود ہی اذان دیا کرتا۔(اذان کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے)۔

(خ ل ق)

اَلْخَلْقُ: اصل میں خلق کے معنیٰ (کسی چیز کو بنانے کے لئے) پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔اور کبھی خلق

---

❶ ومنه حديث المرئة والمزادتين : والحى خلوف اى رجالنا غيب (النهاية خلف).

❷ وفي الفائق (۱ : ۱۸۲) ولفظه لواطيق الاذان مع الخليفى لاذنت وهو مصدر معناه كثرة جهده فى ضبط امور الخلافة وتصريف اعنتها كذافي النهاية (خلف) ولفظه لواطقت قال وهو مصدر مثل الرميا والدليلا وفى غريب ابى عبيد۳ : ۳۱۹ اسم على وزن هِجِّيْرًا ومعناه الخلافة وامثاله معدودة ۱۲.

بمعنیٰ ابداع بھی آ جاتا ہے۔یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ (۱۶۔۳)

اسی نے آسانوں اور زمین کو مبنی برحکمت پیدا کیا۔ میں خلق بمعنیٰ ابداع ہی ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اسی کو ﴿بَدِیعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱۷) سے تعبیر کیا ہے۔ نیز ایک چیز کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (۴۔۱) تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ (۱۶۔۴) اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا۔

﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ﴾ (۲۳۔۱۲) ہم نے انسان کو خلاصے سے پیدا کیا۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ﴾ (۷:۱۱) اور تم کو ہم نے (ابتدا میں مٹی سے) پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ﴾ (۵۵۔۱۵) اور جنات......کو شعلے سے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ خلق بمعنیٰ ابداع ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ اور دوسروں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۷) تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔

البتہ خلق بصورتِ استحالہ کے ہوتا ہے بعض اوقات ذاتِ باری تعالیٰ دوسروں کو بھی اس کا اختیار دے دیتی ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمائیں گے۔

﴿اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ﴾ (۵۔۱۱۰)

اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر

اور عام لوگوں کے لئے خلق کا لفظ صرف دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اندازہ کرنا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۱۴۵) وَلَانْتَ تَفْرِیْ مَا خَلَقْتَ
وَبَعْضُ الْقَوْمِ یَخْلُقُ ثُمَّ لَایَفْرِیْ

تم جو سوچتے ہو کر گزرتے ہو۔ اور بعض لوگ تجاویز کرتے رہتے ہیں مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

(۲) جھوٹ بولنے کے معنیٰ میں فرمایا:

﴿وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا﴾ (۲۹۔۱۷) اور طوفان باندھتے ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ:

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ (۲۳۔۱۴) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ بڑا بابرکت ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی متصف ہو سکتے ہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ بمعنیٰ اَحْسَنُ الْمُقَدِّرِیْنَ

---

[1] البیت لزھیر بن ابی سلمة من قصیدة یمدح ھرمانی ۲۱ بیتاً راجع دیوانه ۲۴ والعقد الثمین ۸۲ والمعانی للقبتی ۳۲۱، ۵۳۹ والاضداد لابن السکیت ۲۰۵ والاصمعی ۵۵ وابن الانباری (۱۵۹) وابی الطیب (۵۶۱) وشرح شواھد الشافیه (۲۳۹) والکتاب ۲:۲۸۹ ومقاییس اللغه (۲:۲۱۴) والحیوان (۳:۲۸۳) واللسان (خلق ، دی) والطبری (۱۸۔۱۹) والبحرالمحیط (۱:۹۳/۲:۴۶۵/۶:۳۹۸) والمشکل للقتبی ۳۸۸ والصناعتین (۳۸۶ ، ۴۴۷) وفیه وادراك بدل ولانت وفی مختار الشعرالجاھلی (۱ : ۱۹۰) فلابدل ولا والبیت ایضاً فی ثلاثین لابن خالویه ۴۵.

ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب بہتر اندازہ کرنے والا ہے (اور خلق بمعنیٰ تقدیر دوسروں کی صفت بھی آ جاتا ہے) اور دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ یہاں اللہ تعالیٰ پر اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کا اطلاق کفار کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی پیدا کرتے ہیں تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ ان کے اعتقاد کے بموجب، ان سب سے بہتر پیدا کرنے والی ٹھہری جیسے فرمایا:

﴿خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۳۔۱۶) کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سبب ان پر مخلوقات مشتبہ ہوگئی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۱۹) اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا۔ کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَلْقُ اللّٰهِ کی تغییر سے مراد خصاء (یعنی خصی ہونا) اور نتف اللحیة (داڑھی کے بال اکھاڑ ڈالنے) وغیرہ کے ذریعہ (فطرتی صلاحیتوں اور) صورتوں کو تبدیل کرنا مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ احکام الٰہی میں تحریف وتبدیل کرنا مراد ہے [1] (اس صورت میں خلق اللہ سے مراد دین الٰہی ہوگا) اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (۳۰۔۳۰) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ "خلق اللہ" سے قضاوقدر الٰہی مراد لی ہے۔اور بعض نے تغییر خِلقت یعنی شکل وصورت کا بدلنا مراد لیا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ﴾ (۲۶۔۱۶۶) اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لئے (بیبیاں) پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔

میں "مَا خَلَقَ" سے کنایہ عورتوں کی شرمگاہیں مراد ہیں۔ اور وہ ہر مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے متعلق استعمال ہوا ہے۔اس سے جھوٹ ہی مراد ہیں۔اس بنا پر اکثر لوگ قرآن پاک کے متعلق خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۷) یہ تو اگلوں کے ہی طریق ہیں اور ایک قرأت میں ﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا خَلْقُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۷) بھی ہے یعنی یہ تو پہلے لوگوں کی ایجاد واختراع ہے۔

﴿مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ (۳۸۔۷) یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔

خَلْقٌ کا لفظ مخلوق کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خَلْقٌ اور خُلْقٌ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں۔ جیسے شَرْبٌ وَشُرْبٌ وَصَرْمٌ وَصُرْمٌ مگر ان میں اتنا فرق ہے کہ خَلْقٌ بمعنیٰ خِلقت یعنی اس شکل وصورت پر بولا جاتا ہے۔ جس کا تعلق ادراکِ بصر سے ہوتا ہے اور خُلْق کا لفظ قوی باطنہ اور عادات وخصائل کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جن کا تعلق بصیرت سے ہے [2] قرآن

---

[1] ولكلا القولين محمل وكل منهى منقول عن السلف راجع ابن كثير ۱: ۵۵۶ ومعالم التنزيل للبغوى ۱: ۴۹۹۔

[2] والعلماء دون الاخلاق على حدة وصنفوا فيها الكتب ومنها تهذيب الاخلاق ليحيىٰ بن عدى وكتب الامام الغزالى انفع للتربية فى هذا الباب۔

پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (۶۸۔۴) اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں۔
اَلْخَلَاقُ: وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:
﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۲۔۲۰۰) ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔
فُلَانٌ خَلِيْقٌ بِكَذَا: فلاں اس کا اہل ہے گویا وہ خوبی اس میں پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ فُلَانٌ مَّجْبُولٌ عَلٰى كَذَا وَمَدْعُوٌّ اِلَيْهِ مِنْ جِهَةِ الْخَلْقِ کا محاورہ ہے۔
خَلَقَ الثَّوبُ وَاَخْلَقَ: کپڑے کا پرانا ہو جانا اور پرانے کپڑے کو خَلَقٌ وَمُخْلَقٌ وَاَخْلَاقٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ حَبْلٌ اَرْمَامٌ وَاَرْمَاتٌ کا محاورہ ہے اور کپڑے کے پرانا ہونے سے ملائم اور چکنا ہونے کا معنیٰ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔
جَبَلٌ اَخْلَقُ وَصَخْرَةٌ خَلْقَآءُ: چکنا پہاڑ یا چکنا پتھر۔
خَلَّقْتُ الثَّوبَ: میں نے کپڑے کو پرانا کیا۔ اخْلَولَقَ السَّحَابُ اَنْ تُمطِرَ: امید ہے کہ بارش ہوگی۔
یہ یا تو خَلَّقْتُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے اور یا هُوَ خَلِيْقٌ بِكَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔
اَلْخَلُوقُ: ایک قسم کا خوشبو۔

(خ ل و)

اَلْخَلَاءُ: خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور اَلْخُلُوُّ کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مَضِیٌّ (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے اہل لغت خَلَا الزَّمَانُ کے معنیٰ زمانہ گذر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (۳۔۱۴۴) اور محمد ﷺ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزرے ہیں۔
﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ (۱۳۔۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔
﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ (۲۔۱۳۴) یہ جماعت گذر چکی۔
﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ (۳۔۱۳۷) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں۔
﴿اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (۳۵۔۲۴) مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے۔
﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۲۔۲۱۴)...... تم کو پہلے لوگوں کی سی۔
﴿وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۳۔۱۱۹) اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ﴾ (۱۲۔۹) پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔
خَلَا الْاِنْسَانُ: تنہا ہونا۔ خَلَا فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔
خَلَا اِلَيْهِ: کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ (۲۔۱۴) اور جب

وہ اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

خَلَّیْتُ فُلَانًا کے اصل معنیٰ کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ فرمایا:

﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (۹۔۵) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

نَاقَةٌ خَلِيَّةٌ: اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔

اِمْرَأَةٌ خَلِيَّةٌ: مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی گئی ہو۔ اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خَلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلِيُّ: جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مُطَلَّقَةٌ کا لفظ سکون واطمینان کے معنیٰ میں آجاتا ہے۔

چنانچہ شاعر نے ❶ (طویل)

(۱٤٦) مُطَلَّقَةٌ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجَعُ

میں (کبھی اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ درد عود کر آتی ہے) میں مُطَلَّقَةٌ کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔

اَلْخَلَاءُ: خشک گھاس کہا جاتا ہے: خَلَيْتُ الْخَلَاءَ میں نے خشک گھاس کاٹی۔

خَلَيْتُ الدَّابَّةَ: جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سَيْفٌ يَخْتَلِي: تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

(خ م د)

خَمَدَتِ النَّارُ: آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا (جب کہ اس کا انگارہ نہ بجھا ہو) اور اسی سے بطور استعارہ خَمَدَتِ الْحُمّٰى کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ بخار کا جوش کم ہو جانے کے ہیں۔ اور کبھی بطور کنایہ یہ خَمُوْدٌ بمعنیٰ موت بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿جَعَلْنَاهُمْ حَصِيْدًا خَامِدِيْنَ﴾ (۲۱۔۱۵) ہم نے ان کو (کھیتی کی طرح) کاٹ کر (آگ کی طرح) بجھا کر ڈھیر کر دیا۔

﴿فَإِذَاهُمْ خَامِدُوْنَ﴾ (۳۶۔۳۹) سو وہ (اسی سے) ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

(خ م ر)

اَلْخَمْرُ: (ن) اصل میں خَمْرٌ کے معنیٰ کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اسی طرح خُمَارٌ اصل میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے مگر عرف میں خِمارٌ کا لفظ صرف عورت کی اوڑھنی پر بولا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سر کو چھپاتی ہے اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔

کہا جاتا ہے:

اِخْتَمَرَتِ الْمَرْأَةُ وَتَخَمَّرَتْ: عورت نے سر پر اوڑھنی ڈال لی۔

خَمَّرْتُ الْإِنَاءَ میں نے برتن ڈھانپ دیا۔ ایک روایت میں ہے ❷

---

❶ قاله النابغة الذبياني وصدره: تناذرها الراقون من سوء سمها ۔ وفي المطبوع مطلقة محرف والبيت في اللسان (طلق، نذر) والكامل (٨٥٦) ومختار الشعر الجاهلي (١: ٨٢) والبحر (٥: ٤٢٢) والعمدة (١: ٢٣٨) والمخصص (٩: ٦٥) وديوانه ٥٢ والحيوان (٤: ٢٤٨) والعقد الثمين ١٩.

❷ وتمامه واوكوا اسقيتكم واجيفوا ابو ابكم واطفئوا مصابيحكم واكفتوا ابناء كم الخ الحديث في الفائق ١: ١٨٤.

(۱۲۱) خَمِّرُوْا اٰنِیَتَکُمْ: کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھا کرو۔

اَخْمَرْتُ الْعَجِیْنَ: گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ملانا اور خَمْرَۃٌ کو خمیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مخْمُوْرَۃٌ ہوتا ہے دَخَلَ فِی خُمَارِ النَّاسِ: لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔

اَلْخَمْرُ: شراب نشہ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خَمْر کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے۔ ❶

(۱۲۲) اَلْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ، النَّخْلَةِ وَالعِنَبَةِ: (کہ خمر (شرابِ حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف غیر مطبوخ ہے یعنی اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس حد تک پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اَلْخُمَارُ: بیماری جو شراب نوشی سے لگ جاتی ہے۔ یہ بھی زُکَامُ اور سُعَالُ کی طرح فُعَالٌ کے وزن پر ہے جو کہ بیماری کے معنیٰ کے لئے مخصوص ہے۔

خَمْرَۃُ الطِّیْبِ خوشبو خَامِرَۃٌ وَخَمَّرَۃٌ: کسی سے گھل مل جانا اس سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے بطور استعارہ شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)(۱۴۷) "خَامِرِی اُمَّ عَامِرِ" کہ اے ام عامر چھپ جا۔

(خ م س)

اَلْخَمْسُ: (پانچ) اصل میں یہ لفظ اسم عدد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) اور کچھ لوگ کہتے ہیں اصحاب کہف پانچ تھے اور ان کا چھٹا ان کا کتا تھا۔ وَقَالَ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہے۔

اَلْخَمِیْسُ: (جامۂ پانچ گزی) روز شنبہ۔

رُمْحٌ مَخْمُوْسٌ: نیزہ پانچ گزی۔ اَلْخِمْسُ: پیاسے اونٹ جو چوتھے روز پانی پر وارد ہوں۔

خَمَسْتُ الْقَوْمَ: (ن) پانچواں حصہ لینا۔

خَمَسْتُهُمْ (ض) پانچواں ہونا۔

---

❶ رواه الدارمی ۲ : ۳۸ من حديث ابی هريرة والحديث فی مسلم والاربعة واحمد فی مسنده .

❷ قطعة من البيت وتكملته : فلاتدفنونی ان دفنی محرم ـعليكم ولكن ...... قال المرتضیٰ (۲ : ۷۳) البيت لتأبط شراويروی للشنهریٰ (صاحب لامية العرب التی شرحها الزمحشری باعجب العجاب) وللاستاذ الميمنی حقق هذه فی الطرائف (۱ : ۳۶) راجع للبيت وقصته الاغانی (۲۱ : ۱۳۶) وطبقات الشعراء لابن سلام (۱ : ۷۴) والحيوان (۶ : ۵۰) والمعانی الكبير ۲۱۳ وامالی ابن البختری (۱ : ۳۶) والحماسة بالتبريزی (۲ : ۲۴) وذيل الامالی ۳۶ والصناعتين ۸۸۳ والصاجی ۲۲۴ والبحر (۳ : ۳۷۷) ومجمع البيان ۱ : ۷۴ والمحاضرات للمؤلف ۳ : ۳۹۸ وابن ابی الحديد ۱ : ۵۷ واللسان (عمر) وفی رواية ابشری بدل خامری ـ قال صاحب العقد (۱ : ۱۱۸ـ۷/۱۱۹ـ۴ : ۲۱۹) ان رواية خامری بعيد عن المعنیٰ راجع الازمنه والامكنه ومعنیٰ البيت لاتدفنونی بل دعونی للتی يقال لها اذا صيدت خامری ام عامر ای للضبع قال الخَليل ونقل عنه سيبويه فی "الكتاب" والخفاجی فی شرح الدرة (۱۴ـ۱۵) وصدرا لافاضل فعلیٰ هذا ليس فی البيت التفات كماذهب اليه البعص والقطعة ايضاً فی بيت الاخطل اللسان (وشظ) والمرزوقی والقطعة مثل راجع الحرجانی ۹۰ والعسكری والميدانی ۱۲.

(خ م ص)

اَلْمَخْمَصَۃُ: ایسی بھوک جس سے پیٹ پچک جائے۔قرآن میں ہے:
﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ﴾ (۵۔۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے۔کہا جاتا ہے۔
رَجُلٌ خَامِصٌ: پچکے ہوئے۔پیٹ والا اَخْمَصُ الْقَدَمِ پاؤں کے تلوے کا گڑھا۔

(خ م ط)

اَلْخَمْطُ ۔درخت بے خار۔بعض نے کہا ہے کہ خَمْطٌ پیلو کے درخت کو کہتے ہیں۔
اَلْخَمْطَۃُ: ترش شراب۔تَخَمَّطَ: غضب ناک ہونا۔کہا جاتا ہے۔تَخَمَّطَ الْفَحْلُ سانڈ کا مستی سے بر برانا۔

(خ ن ز ر)

اَلْخِنْزِیْرُ کے معنیٰ سور کے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَجَعَلَ مِنْھُمُ الْقِرَدَۃَ وَالْخَنَازِیْرَ﴾ (۵۔۶۰) اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنا دیا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خاص کر سور ہی مراد ہے اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے افعال و عادات بندر اور سور جیسے ہو گئے تھے۔نہ کہ وہ بلحاظ صورت کے بندر اور سور بن گئے تھے۔ ❶ مگر زیر بحث آیت میں دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں۔کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں اور وہ بندر اور سور بن گئے تھے۔ ❷ اسی طرح انسانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شکل وصورت کے لحاظ سے گو انسان نظر آتے ہیں لیکن اخلاق وعادات کے اعتبار سے بندر اور سور بنے ہوئے ہیں۔

(خ ن س)

اَلْخُنُسُ: (ن) کے معنیٰ پیچھے ہٹنے اور سکڑ جانے کے ہیں اسی سے شیطان کو خنَّاس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا۔قرآن میں ہے:
﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۴) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ﴾ (۸۱۔۱۵) ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔
میں خُنَّس سے وہ ستارے مراد ہیں جو دن کو الٹی رفتار چلتے ہیں یہ خَانِسٌ کی جمع ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے زحل، مشتری اور مریخ مراد ہیں۔کیونکہ یہ الٹی چال چلتے رہتے ہیں۔
اَخْنَسْتُ عَنْہُ حَقَّہٗ: میں نے اس کے حق کو مؤخر کر دیا، روک لیا۔

(خ ن ق)

اَلْمُنْخَنِقَۃُ: (۵۔۳) جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے۔
اَلْمِخْنَقَۃُ: کے معنیٰ قلادہ کے ہیں۔

---

❶ ذھب الجمھور الی ان المسخ کان عقوبۃ وحقیقتاً وقال مجاھد بالقول الثانی واول المسخ علی تغییر الاخلاق واللہ اعلم راجع التفاسیر۔
❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

(خ و ر)

اَلْـخُـوَارُ: دراصل یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے پھر استعارۃً اونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿عِـجْلًا جَسَدًا لَهٗ خُوَارٌ﴾ (۲۰۔۸۸)ایک بچھڑا (یعنی اس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

اَرْضٌ خَوَّارَةٌ: دو بلندیوں کے درمیان پست زمین۔

رُمْحٌ خَوَّارٌ کمزور نیزہ۔

اَلْـخَـوْرَانُ: بہائم کی آواز۔جانوروں کے گوبر کرنے کا راستہ۔

(خ و ض)

اَلْخَوْضُ: (ن) کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے پر ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَـئِـنْ سَـاَلْتَهُـمْ لَيَـقُولُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَـلْـعَـبُ﴾ (۹۔۶۵)اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔

﴿وَخُـضْتُـمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا﴾ (۹۔۶۹)اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم بھی باطل میں ڈوبے رہے۔

﴿ثُـمَّ ذَرْهُـمْ فِيْ خَوضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۶۔۹۱) پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔

﴿وَاِذَا رَاَيْـتَ الَّـذِيْـنَ يَـخُـوْضُـوْنَ فِيْٓ اٰيـاتِنَا فَـاَعْـرِضْ عَـنْهُـمْ حَتّٰـى يَخُوْضُوا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْـرِهٖ﴾ (۶۔۶۸)اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ بکواس کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ اور باتوں میں مشغول ہو جائیں۔

اَخَـضْـتُ دَابَّتِـي فِي الْمَآءِ: میں نے اپنی سواری کو پانی میں ڈال دیا۔

تَـخَاوَضُوْا فِي الْحَدِيثِ: باہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

(خ و ف)

اَلْـخَوْفُ : (س) کے معنٰی ہیں قرائن وشواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔جیسا کہ رجاء اور طمع کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے خوف کی ضد امن آتی ہے ۔ اور یہ امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُونَ عَذَابَهٗ﴾(۱۷۔۵۷) اور اس کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

﴿تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوفًا وَّطَمَعًا﴾ (۳۲۔۱۶)ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔(اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔

﴿وَاِنْ خِـفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا﴾ (۴۔۳)اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ...... انصاف نہ کرسکو گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۴۔۳۵) اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بن ہے۔ میں بعض نے خِفْتُمْ کے معنیٰ عَرَفْتُمْ کئے ہیں یعنی اگر تمہیں معلوم ہو مگر اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ اَلْخَوفُ مِنَ اللّٰهِ: (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کے یہ معنیٰ نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الٰہی کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔

اَلتَّخْوِيفُ: (تفعیل) ڈرنا اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ (۳۹۔۱۶) بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۔۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

یعنی شیطان کا حکم مت بجالاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو کر رہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ﴾ (۱۹۔۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔ میں خوف کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال کی فکر تھی کہ موالی اس کے وارث بن جائیں گے۔ جیسا کہ بعض جہلاء نے سمجھا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کہ وہ دینوی مال و اسباب کی فکر کریں بلکہ موالی سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد شریعت کی رعایت اور نظامِ دین کی حفاظت نہیں کریں گے۔

اَلْخِيْفَةُ: کے معنیٰ خوف کی حالت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ﴾ (۲۰۔۶۷) (اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔

اور کبھی خِيفَة بمعنیٰ خوف بھی آ جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهٖ﴾ (۱۳۔۱۳) اور فرشتے سب اس کے خوف سے۔

﴿تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۳۰۔۲۸) (اور کیا) تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو۔

یہاں خوف کی بجائے خیفة کا لفظ لانے سے اس بات کی

---

❶ ذهب الفراء الى ان معناه التنقص والزجاج الى معنى الاخافة راجع التاج واللسان (خوف).

طرف اشارہ ہے کہ ان کی حالت لازمہ بن چکی تھی جوان پر ہر آن طاری رہتی تھی۔

اَلتَّخَوُّفُ: (تفعل) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا۔

تَخَوَّفْنَاهُمْ: ہم نے انہیں اتنا کم کیا جس قدر کہ خوف اس کا مقتضی تھا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ﴾ (۱۶۔۴۷) یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہو گیا ہو اس وقت پکڑے۔ ❶

(خ و ل)

اَلتَّخْوِيْلُ: (تفعیل) کے اصل معنیٰ خَوَل یعنی حشم وخدام عطا کرنے کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنیٰ ایسی چیزیں عطا کرنے کے ہیں جو انسان کو خوَل کا کام دے اور بقول بعض ایسی چیزیں عطا کرنا جن کی نگہداشت کی ضرورت پڑے۔اور یہ فُلَانٌ خَالُ مَالٍ اَوْ خَائِلُ مَالٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے والا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (۶۔۹۴) اور جو مال ومتاع ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

اور "اَلْخَالُ" اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا دیا جاتا ہے۔نیز خَالٌ کے معنیٰ تل یعنی بدن پر سیاہ نشان کے بھی آتے ہیں ❶

(خ و ن)

اَلْخِيَانَةُ: خیانت اور نفاق دونوں ہم معنیٰ ہیں مگر خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ کرنے پر بولا جاتا ہے اور نفاق دین کے متعلق بولا جاتا ہے۔پھر ان میں تداخل ہو جاتا ہے۔پس خیانت کے معنیٰ خفیہ طور پر عہد شکنی کرکے حق کی مخالفت کے آتے ہیں اس کی ضد امانت ہے۔اور محاورہ میں خُنْتُ فُلَانًا وَاَمَانَةَ فُلَانٍ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِكُمْ﴾ (۸۔۲۷) نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَةَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَةَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا﴾ (۶۶۔۱۰) خدا نے کافروں کے لئے نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ (۵۔۱۳) اور .... ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

کے معنیٰ بعض نے عَلٰى جَمَاعَةٍ خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ کئے ہیں یعنی خَآئِنَةٍ کو جماعۃٍ کی صفت مانا ہے اور بعض نے اس کے معنیٰ عَلٰى رَجُلٍ خَائِنٍ کئے ہیں یعنی اسے رَجُلٌ کی صفت مانا ہے اور کہا ہے کہ رَجُلٌ خَائِنٌ وَخَائِنَةٌ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ رَاوِيَةٌ (روایت کرنے والا) اور دَاهِيَةٌ کے الفاظ ہیں۔

---

❶ وايضاً الخال والخالة اخوالام واختها وفي التنزيل خالك ٣٣۔ ٥٠ اوبيوت اخوالكم اوبيوت خالاتكم ٢٤۔ ٦١ خالاتك ٣٣۔ ٥٠ خالاتكم ٤: ٢٣).

بعض نے کہا کہ خَائِنَةٌ یہاں مصدر کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ قُمْ قَائِمًا کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ﴾ (۴۰۔۱۹) وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ﴾ (۸۔۷۱) اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں تو یہ پہلے ہی اللہ سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو (تمہارے) قبضے میں دے دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲۔۱۸۷) خدا جانتا ہے کہ تم اپنے حق میں خیانت کرنا چاہتے تھے۔

میں اخْتِيَان کے معنیٰ خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر تَخُوْنُوْنَ اَنْفُسَكُمْ نہیں کہا کیونکہ ان سے خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا جس کے معنیٰ قصدِ خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں اسی معنیٰ کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ، میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(خ و ی)

اَلْخَوَاءُ: کے معنیٰ خالی ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے: خَوٰی (ض) خَوًی۔ بَطْنُهٗ مِنَ الطَّعَامِ: یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہو گیا۔ اور تشبیہ کے طور پر خَوَی الْجَوْزُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ خالی ہونے کے ہیں۔

خَوَتْ خَوَاءَ الدَّارُ: گھر ویران ہو کر گر پڑا❶ اور جب ستارے کے گرنے سے بارش نہ ہو تو تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ خَوَی النَّجْمُ وَاَخْوٰی یہاں خوٰی کی نسبت اخوٰی کے لفظ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے جیسا کہ سقٰی اور اَسقٰی ہیں۔

اَلتَّخْوِيَةُ: دو چیزوں کے درمیان جگہ خالی چھوڑنا۔

(خ ی ب)

اَلْخَيْبَةُ (ض) کے معنیٰ ناکام ہونے اور مقصد فوت ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ (۱۴۔۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد ہو گیا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی﴾ (۲۰۔۶۱) اور جس نے افترا کیا وہ نامراد رہا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (۹۱۔۱۰)❷ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

(خ ی ر)

اَلْخَيْرُ: وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو۔ مثلاً عقل عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں یہ اَلشَّرُّ کی ضد ہے۔ اور خیر دو قسم پر ہے۔

(۱) خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا❸:

---

❶ وفي التنزيل وهي خاوية على عروشها وايضاً ۲: ۲۵۹) ۶۹۔۷).

❷ وايضاً ۳: ۱۲۶).

❸ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

(۱۱۹) لَا خَيْرَ بِخَيْرٍ بَعْدَهُ النَّارُ وَلَا شَرَّ بِشَرٍّ بَعْدَهُ الْجَنَّةُ کہ وہ خیر کچھ بھی خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے۔

(۲) دوسری قسم خیر وشر مفید کی ہے یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمر کے حق میں شر بن جاتی ہے۔اس بنا پر قرآن پاک نے اسے خیر وشر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ (۲۔۱۸) اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَالٍ وَبَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ﴾ (۲۳۔۵۵،۵۶) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے) ان کی بھلائی میں جلدی کر تے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال طریق سے جمع کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے [1] (۱۲۱) کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کے لئے ”ان ترك خيرا“ فرمایا ہے۔اور خیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے“ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ (۱۰۰۔۸) وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔میں بھی خیر کے معنیٰ مال کثیر کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا میں مال کو خیر کہنے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وصیت صرف اس مال میں بہتر ہے جو محمود طریق سے جمع کیا گیا ہو۔اس معنیٰ میں فرمایا:

﴿قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ (۲۔۱۱۵) کہہ دو (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو (وہ درجہ بدرجہ اہل استحقاق میں) ماں باپ کو۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ﴾ (۲۔۱۹۷) اور جو نیک کام کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا﴾ (۲۴۔۳۳) اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو۔

میں بعض نے خَيْرًا سے مال مراد لیا ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس مال ہے اور بعض نے خیر بمعنیٰ ثواب لیا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہو کہ ان کی آزادی تمہارے اور ان کے حق میں فائدہ مند یعنی باعث ثواب ہوگی۔خیر وشر کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

کبھی بطور اسم کے جیسا کہ گزر چکا ہے۔اور آیت کریمہ:

---

[1] الحديث ذكره في الكشاف قال الحافظ في تخريجه رواه عبدالرزاق عن معمر عن هشام عن ابيه و ايضاً ابن ابى شيبه عن ابى خالد الاحمر عنه ومثله عن عائشة ان رجلا اراد ان يوصى فسألته كم مالك (عبدالرزاق عن عبدالله بن عبيد بن عمير وابن ابى شيبة عن ابن ابى مليكة عن عائشة) انظر تخريج الحافظ (١٤ رقم ١٠٦٩١٠٤).

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ (۳۔۱۰۴) اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔
میں بھی خیر بطور اسم کے استعمال ہوا ہے اور کبھی یہ دونوں بطور وصف کے آتے ہیں اور اَفْعَلُ مِنْ کی تقدیر میں ہوتے ہیں جیسے هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ ذَالِكَ وَاَفْضَلُ: یعنی یہ اس سے بہتر اور افضل ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا﴾ (۲۔۱۰۶) تو اس سے بہتر بھیج دیتے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ......﴾ (۲۔۱۸۴) تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔
میں خیر اسم بھی ہوسکتا ہے اور بمعنیٰ اَفْعَلُ مِنْ بھی۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (۲۔۱۹۷) اور زاد راہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادراہ کا پرہیز گاری ہے۔
میں خیر بمعنیٰ افْعَلُ مِنْ کے ہے۔
پھر کبھی تو خیر لفظ شر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی ضُرٌّ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا:
﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۶۔۱۷) اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اس کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر نعمت (وراحت) عطا کرے (تو کوئی اس کو روکنے والا) نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آیت کریمہ:
﴿فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾ (۵۵۔۷۰) ان میں سے نیک سیرت (اور) خوبصورت۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خَيْرَاتٌ اصل میں خَيِّرات ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ خَيْرٌ وَامْرَأَةٌ خَيْرَةٌ، وَهٰذَا خَيْرُ الرِّجَالِ وَهٰذِهٖ خَيْرَةُ النِّسَاءِ: اور خیرات سے مراد یہ ہے کہ ان میں نیک سیرت عورتیں ہوں گی۔ اَلْخَيِّرُ بہتر جو خیر کے ساتھ مختص ہو۔ نَاقَةٌ خِيَارٌ وَجَمَلٌ خِيَارٌ (مذکر ومؤنث) بہتر اونٹنی یا اونٹ۔
اَلْاِسْتِخَارَةُ: کے معنیٰ طلب خیر کے ہیں اس کا مطاوع خَارَ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
اِسْتَخَارَ اللّٰهَ الْعَبْدُ فَخَارَلَهٗ: بندے نے اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی تو اللہ تعالیٰ نے جو بہتر تھا وہ بتا دیا۔
خَايَرْتُ فُلَانًا كَذَا فَخِرْتُهٗ: میں نے فلاں سے (علم میں) مسابقت کی تو میں غالب رہا۔
اَلْخِيَرَةُ: سے مراد وہ حالت ہے جو طلب خیر یا مختار کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قِعْدَةٌ وَّ جِلْسَةٌ کا لفظ قَاعِدٌ اور جَالِسٌ کی ہیئت اور حالت پر بولا جاتا ہے۔
اَلْاِخْتِيَارُ: (افتعال) بہتر چیز کو طلب کر کے اسے کر گزرنا۔
اور کبھی اختیار کا لفظ کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے گو نفس الامر میں وہ چیز بہتر نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۴۴۔۳۲) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل علم سے دانستہ

منتخب کیا تھا۔
میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں دوسروں پر فوقیت بخشنا مراد ہو۔متکلمین کی اصطلاح میں مختار کا لفظ ہر اس فعل سے متعلق بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو۔لہٰذا ھُوَ مُخْتَارٌ فِی کَذَا کا محاورہ ہے فُلَانٌ لَـهٗ اِخْتِیَارٌ کے ہم معنیٰ نہیں ہے۔ کیونکہ اخْتِیَـارٌ کے معنیٰ اس کام کے کرنے کے ہوتے ہیں جسے انسان بہتر خیال کرتا ہو۔مگر مُخْتَارٌ کا لفظ فاعل اور مفعول دونوں پر بولا جاتا ہے۔

(خ ی ط)

اَلْخَیْطُ: دھاگا۔وَالْجَمعُ الْخُیُوطُ۔
خَـاطَ (ض) خِیَاطَةٌ وَخَیَّطَ الثَّوبَ کے معنیٰ کپڑا سینے کے ہیں اور کپڑا سینے کی سوئی کو الْـخِیَـاط کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾ ''یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکل جائے۔''
اور آیت کریمہ:
﴿حَتّٰـی یَتَبَیَّـنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (۲۔۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔
میں خَیْـطِ اَبْیَـض اور اَسْـود سے صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔اور شاعر کے قول [1] (طویل)

(۱٤۸) تَدَلّٰی عَلَیْهَا بَیْنَ سِبٍّ وَ خَیطَةٍ:
وہ رسی اور میخ کے مابین اس پر اٹک گیا۔
میں خَیْــطَةٌ کا لفظ بطور استعارہ رسی یا میخ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ایک روایت میں ہے [2]
(۱۲۲) کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سیاہ اور سفید دو عقال (ڈورے) رکھ لئے ان کی طرف دیکھتے جاتے اور کھانا کھاتے جاتے یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگے پھر انہوں نے آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:
اِنَّكَ لَـعَرِیْضُ الْقَفَا وَاِنَّمَا ذَالِكَ بَیَاضُ النَّهَارِ وَسَـوَادُ اللیل کہ تم تو نرے ہی عریض القفاء (احمق) ہو۔اس سے مراد تو رات کی سیاہی اور فجر کی سفیدی ہے۔
خَیَّـطَ الشَّـوْبُ فِیْ رَأْسِهٖ: اس کے سر میں دھاگے کی طرح بڑھاپا ظاہر ہوگیا۔اَلْـخَیْطُ: (ایضا) شترمرغ اس کی جمع اَلْـخِیْطَانُ ہے۔نَـعَامَةٌ خَیْطَاءُ: دھاگے کے طرح لمبی گردن والا شترمرغ۔

(خ ی ل)

اَلْخَیَالُ: اس کے اصل معنیٰ صورت مجردہ کے ہیں جیسے وہ صورت جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی عدم موجودگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔پھر (مجازًا) ہر اس امر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا

---

[1] قاله ابو ذویب یصف مشتار العسل وتمامه......... بجرداء مثل الوکف یکبو غرابها وفی التهذیب والقالی (۲: ۲۵۸) شطره الثانی شدید الوصاة نابل وابن نابل والبیت من شواهد الکشاف ۱٤۳ لکن فیه تمامه تدلی ولو المائح المتشمر والله اعلم والبیت فی تهذیب الاصلاح واللسان (سب، خیط.)
[2] حدیث عدی بن حاتم متفق علیه وفی ابی داؤد من حدیث الشعبی عنه والصحیح انه صلی الله علیه وسلم قاله مزاحاً ولم یعیره بالحمق وان کانت اللفظة تاتی بمعنیٰ الحمق ایضاً ۱۲.

جائے اور ہر اس پتلے دبلے شخص کو خیال کہا جاتا ہے جو بمنزلہ خیال اور تصور کے ہو۔

اَلتَّخْلِیلُ: (تفعیل) کے معنیٰ کسی کے نفس میں کسی چیز کا خیال یعنی تصور قائم کرنے کے ہیں اور اَلتَّخَیُّلُ معنیٰ از خود اس قسم کا تصور قائم کر لینے کے ہیں۔ اور خِلْتُ بمعنیٰ ظَنَنْتُ آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مظنون چیز بھی بمنزلہ خیال کے ہوتی ہے۔

خَیَّلَتِ السَّمَاءُ: آسمان میں بارش کا سماں نظر آنے لگا۔

فُلَانٌ مُخِیلٌ بِکَذَا: فلاں اس کا سزاوار ہے اصل میں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ فلاں اس خیال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اَلْخَیْلَاءُ تکبر جو کسی ایسی فضیلت کے تخیل پر مبنی ہو جو انسان اپنے اندر خیال کرتا ہو۔ اسی سے لفظ خیل لیا گیا ہے کیونکہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے اندر نخوت وغرور پاتا ہے۔ دراصل خَیل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ﴾ (۸۔۶۰) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اور کبھی ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے [1]

(۱۲۲) یَا خَیلَ اللّٰہِ ارْکَبِیْ:

اے اللہ! کے سوار! گھوڑے پر سوار ہو جا، تو یہاں خیل بمعنیٰ فارس کے ہے اور ایک حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۲۳) عَفَوتُ لَکُم عَنْ صَدَقَةِ الْخَیْلِ:

شقرا (ایک پرندہ) کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ خیال ہوتا ہے۔ کہ دوسرے رنگ کا ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے [3] (مجردالکامل)

(۱٤۹) کَاَبِیْ بِرَاقِشَ کُلُّ لَونٍ لونُهُ یَتَخَیَّلُ

ابو براقش کی طرح جو ہر آن نیا رنگ بدلتا ہے۔

❀❀❀

---

[1] رواه الشیخ فی الناسخ والمنسوخ وعزاه السھیلی فی الروض لمسلم والحدیث باختلاف الفاظه فی ابی داؤد والمستدرك للحاکم وفی الردة للعواقدی قاله خالد بن الولید لاصحابه یوم الیمامة راجع الکافی رقم ۲۹٤ والحیوان ۱ : ۳۳۵ من کلمات النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یتقدمه فیھن احد وفی اضداد ابی الطیب یقولون یاخیل الله ارکبی علی القلب وعده من المجاز .

[2] رواه ابو داؤد والترمذیٰ من حدیث علی مرفوعاً قال الدارقطنی الصواب وقفه علی علی وفی المسئلة اختلاف راجع لاختلاف الفاظه النیل ٤ : ١٤٦۔١٤٧ وکنزالعمال ٦ رقم ١٢٥٨.

[3] قاله الاسدی فی ذم قوم مشھورین بالمقالج وفی المطبوع مسمادت "کادت" بدل کابی مصحف راجع اللسان (برقش) والاقتضاب ۳٥۳ والعیون ۲ : ۲۹ والحیوان (۳ : ٤۷) وانظر للبیت والروایات ومامثل فیه دیوان المعانی (۱ : ۲۸۲) وخزانة الادب ۳ : ٦٦٠ والصناعتین ۱۰۳ وذیل الامالی ۸۳ والمحاضرات للمولف (۱ : ۱٥).

کِتَابُ الدَّال

(د ء ب)

اَلدَّأْبُ کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں کہا جاتا ہے۔
دَأَبَ فِی السَّیْرِ دَأْبًا: وہ مسلسل چلا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَسَخَّرَا لشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ﴾ (۱۴۔۳۳)
اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔
نیز دَأْبٌ کا لفظ عادۃ مستمرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿کَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَونَ﴾ (۳۔۱۱) ان کا حال بھی فرعونیوں جیسا ہے۔
یعنی ان کی عادات جس پر وہ ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔

(د ب ب)

اَلدَّبُّ وَالدَّبِیْبُ: (ض) کے معنی آہستہ آہستہ چلنے اور رینگنے کے ہیں ۔ یہ لفظ حیوانات اور زیادہ تر حشرات الارض کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور شراب اور کہنگی وغیرہ کے (جسم اور کپڑے وغیرہ میں) سرایت کر جانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔جن کی حرکات کا علم حاسہ بصر سے ادراک نہ ہوسکتا ہو۔ یہ لفظ گو عرف میں خاص کر گھوڑے پر بولا جاتا ہے مگر (لغۃ) ہر حیوان یعنی ذی حیات چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾ (۲۴۔۴۵) اور خدا ہی نے ہر چلتے پھرتے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔
﴿وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ﴾ (۲۔۱۶۴) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں۔
﴿وَمَامِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا﴾ (۱۱۔۶) اور زمین پر چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔
﴿وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ......﴾ (۶۔۳۸) اورزمین پر چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا پرند نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَلَوْیُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ﴾ (۳۵۔۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔
کی تفسیر میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہاں دَآبَّۃ سے خاص کر انسان مراد ہیں [1] مگر اولیٰ یہ ہے کہ اسے عموم پر رکھا جائے اور اس سے ہر ذی حیات چیز مراد لی جائے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَآبَّۃً

[1] ونصه ومجاز دابة ها هنا انسان راجع مجازه (۲: ۱۵۶) وقارن الطبری ۱۲.

مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ﴾ (۲۷۔۸۲) اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین میں سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک غیر معروف قسم کا جانور ہوگا جو قیامت کے قریب خروج کرے گا۔ اور بعض نے اس سے وہ شریر لوگ مراد لئے ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہوں گے۔ اس صورت میں لفظ دَآبَّة جمع ہوگا (جیسا کہ خائن کی جمع خَائِنَة آ جاتی ہے) اور ہر چلنے پھرنے والی چیز کو شامل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۸۔۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانوروں میں سب سے بدتر۔

میں دَوَآبّ کا لفظ جملہ حیوانات کو شامل ہے۔ محاورہ ہے:

نَاقَةٌ دَبُوْبٌ: ضعف اور سستی کی وجہ سے آہستہ چلنے والی اونٹنی۔

مَا بِالدَّارِ دُبِیٌّ ❶: گھر میں کوئی نہیں۔

اَرْضٌ مَدْبُوبَةٌ: وہ زمین جس میں چھوٹے چھوٹے رینگنے والے جانور کثرت سے ہوں۔

(د ب ر)

دُبُرٌ: پشت، مقعد یہ قُبل کی ضد ہے اور یہ دونوں لفظ بطور کنایہ جائے مخصوص کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور اس میں دُبُرٌ اور دُبْرٌ دو لغات ہیں اس کی جمع اَدْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ﴾ (۸۔۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔

﴿يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾ (۸۔۵۰) ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر (کوڑے و ہتھوڑے وغیرہ) مارتے ہیں۔

﴿فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (۸۔۱۵) تو اُن سے پیٹھ نہ پھیرنا۔

یعنی ہزیمت خوردہ ہو کر مت بھاگو اور آیت کریمہ:

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) اور نماز کے بعد (بھی) میں ادبار کے معنی نمازوں کے آخری حصے (یا نمازوں کے بعد) کے ہیں۔ اور ﴿اَدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ (۵۲۔۴۹) میں ایک قرأت اِدْبَارَ النُّجُوْمِ بھی ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر بمعنی ظرف ہوگا یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت جیسا کہ مَقْدَمَ الْحَاجِّ اور خُفُوْقَ النَّجْمِ میں ہے۔ اور اَدْبَارَ (بفتح الھمزۃ) ہونے کی صورت میں جمع ہوگی۔ اور الدبر سے مشتقات (جیسے دَبَرَ وَاَدْبَرَ وَدَابِرٌ) کبھی باعتبار فاعل (یعنی فعل لازم) کے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: دَبَرَ فُلَانٌ (فلاں نے پیٹھ پھیری) اَمْسِ الدَّابِرُ (کل گذشتہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴾ (۷۴۔۳۳) اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے۔

اور کبھی باعتبار مفعول (یعنی فعل متعدی) کے جیسے دَبَرَ السَّهْمُ الْهَدَفَ: (تیر نشانہ سے پرے گر پڑا)۔

دَبَرَ فُلَانٌ الْقَوْمَ: (یعنی وہ قوم سے پیچھے رہ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵)

---

❶ وَدَبِیٌّ قال الحیری ولایتکلم بها الافی الجحد ای النفی .

غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔
﴿اِنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائے گی۔
اور دَابِرٌ کے معنیٰ متاخر یا تابع کے آتے ہیں خواہ وہ تاخر باعتبار مکان یا زمان کے ہو اور خواہ باعتبار مرتبہ کے۔
اَدْبَرَ: اعراض کرنا۔ پشت پھیرنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۷۴۔۲۳) اور پھر پشت پھیر کر چلا اور (قبول حق سے) غرور کیا۔
﴿تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى﴾ (۷۰۔۱۷) ان لوگوں کو بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا۔حدیث میں ہے [1]:
(۱۲۵) لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوا عِبَادَاللهِ اِخْوَانًا: کہ نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور نہ آپس میں روٹھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔
بعض نے لَاتَدَابَرُوْا کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ پس پشت ایک دوسرے کی برائی بیان نہ کرو۔
اَلْاِسْتِدْبَارُ: (استفعال) پشت پھیرنا۔کسی چیز کے پیچھے ہونے کو طلب کرنا۔
تَدَابَرَ الْقَوْمُ: باہم اختلاف کر کے قطع تعلق کرنا۔
اَلدِّبَارُ: یہ دَابَرَہٗ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ پس پشت دشمنی کرنے کے ہیں۔
اَلتَّدْبِيْرُ: (تفعیل) کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور وفکر کرنا قرآن پاک میں ہے:
﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو امور دینوی کے انتظام کے لئے مقرر ہیں۔اَلتَّدْبِيْرُ: (ایضاً) آزاد کردن بندہ پس از مرگ۔
اَلدَّبَارُ: (بفتح الدال) ہلاکت جو قوم کی جڑ کو کاٹ ڈالے۔
نیز ایام جاہلیت میں بدھ کے دن کو دبار کہا جاتا تھا۔کیونکہ عرب لوگ اس سے بدشگونی لیتے تھے۔
اَلدَّبِيْرُ: ریسماں کہ برکشند بوقت رشتن سپس اود یہ (وضد آں قبیل است)
رَجُلٌ مُّقَابَلٌ وَّ مُدَابَرٌ: نجیب الطرفین۔
شَاةٌ مُقَابَلَةٌ مُدَابَرَةٌ: بکری جس کا اگلی اور پچھلی جانب سے کان کٹا ہوا ہو۔
دَابِرَةُ الطَّائِرِ: پرند کے پاؤں کا رخار پرند کی پانچویں انگلی جو دوسری انگلیوں کے اوپر نکلتی ہے۔
دَابِرَةُ الحَافِرِ: ناخن کہ بر بازوئے ستور برآید۔
اَلدَّبُوْرُ: پچھوائی ہوا۔اَلدَّبَرَةُ: قابل کاشت زمین کا ٹکڑا اس کی جمع دِبَارٌ ہے شاعر نے کہا ہے کہ [2] (طویل)
(۱۵۰) جِرْبَةٍ تَعْلُوا الدِّبَارَ غُرُوبُهَا

---

[1] متفق عليه من حديث ابى هريرة ورواه البخارى عن انس بمعناه والطبرانى عن ابى ايوب راجع كنزالعمال ۹: ۲۲۹و۹۳۸ وتخريج الاحياء ۲: ۱۷۸،۱۸۰.

[2] قاله بشر بن ابى حازم وتكملته: تحدرماء البئر عن جرشيته على ...... وفى المطبوع جربه (بالياء) مصحف والصواب بالموحدة والشاء ومعناه المزرعة والدبار جمع دبرة اودبارة وهى القطعة من المزرعة والجرشية ناقة منسوبة الى جرش وهى ارض باليمن واهلها يستقون على الابل فالشاعر شبه تحدردموعه بتحدر ماء على جربة من غروب يستقى عليها كذاقال الجوهرى ...... جرش، دبر) والبيت ايضاً فى اللسان (جرب، دبر، جرش) والمفضليات ۲: ۳۰ وفيه الغرب مكان البئر راجع ايضاً البلدان (رسم جرش) وفيه ان جرش فتحت فى حياة النبى صلى الله عليه وسلم فى سنة عشر من الهجرة صلحاً على الفيء وجرش بالضم والفتح ۱۲.

جیسے کہ یمنی اونٹنی کے پانی سے بھرے ہوئے ڈول زمین پر گرتے ہیں۔

اَلـدَّبْرُ: شہد کی مکھیوں، بھڑوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا غول جن کا ڈنک ان کی مقعد پر ہوتا ہے۔اس کا واحد دَبْرَۃٌ ہے۔

اَلـدِّبْـرُ: مالِ کثیر جو میت چھوڑ مرے۔اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔❶

دَبِـرَ الْـبَـعِیرُ: زخمی پیٹھ والا ہونا۔ایسے اونٹ کو اَدْبَـرُ وَدَبِرٌ کہتے ہیں۔اَلدَّبْرَۃُ: (بفتح الباء وسکونہا) شکست در کارزار۔❷

(د ث ر)

اَلْمُدَّثِّرُ: (از تفعل) اصل میں مُتَدَثِّرٌ تھا۔تاء کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا۔اس کے معنیٰ کپڑا اوڑھنے والے کے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دَثَّـرْتُـہٗ فَتَدَثَّرَ: (میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا چنانچہ وہ لپٹ گیا) قرآن پاک میں ہے:

﴿یٰۤـاَیُّهَـا الْمُدَّثِّرُ﴾ (۷۴۔۱) اے (محمد ﷺ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔اَلدِّثَارُ: وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے جیسے چادر کمبل وغیرہ۔

تَدَثَّرَ الْفَحْلُ النَّاقَۃَ: سانڈھ اونٹنی پر چڑھ گیا۔

تَـدَثَّـرَ الـرَّجُلُ الْفَرَسَ: آدمی گھوڑے پر کود کر سوار ہوگیا۔رَجُلٌ دَثُوْرٌ: گم نام آدمی۔

سَیْفٌ دَاثِرٌ: زنگ آلود تلوار، جسے پالش کئے بہت عرصہ گزر گیا ہو۔اسی سے جس منزل کے نشانات مٹ گئے ہوں اُسے دَاثِرٌ کہا جاتا ہے۔فُـلَانٌ دِثْرُ مَالٍ: وہ مال کی اچھی طرح خبر گیری کرنے والا ہے۔

(د ح ر)

اَلدَّحْرُ وَالدُّحُورُ: (ن) کے معنیٰ دھتکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۷۔۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل دھتکارا ہوا۔

﴿فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۱۷۔۳۹) ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔

﴿وَیُـقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا﴾ (۳۷۔۹) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی وہاں سے) نکال دیئے گئے۔

(د ح ض)

دَاحِـضَۃٌ: (اسم فاعل) باطل اور زائل ہونے والی (دلیل) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُـجَّتُهُـمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۴۲۔۱۶) ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل بالکل بودی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اَدْحَـضْتُ فُلَانًا فِیْ حُجَّتِہٖ فَدَحَضَ وَاَدْحَـضْـتُ حُجَّتَہٗ فَـدَحَضَتْ (میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہوگئی)❸

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ

---

❶ کذا فی الصحاح.

❷ ومنہ المثل شر الرأی الدبری ای الذی یسنح اخیراً عند فوت الحاجۃ.

❸ وفی التنزیل: فساھم فکان من المدحضین ۳۷۔۱۴۱.

الْــحَــقَّ﴾ (۱۸۔۵۶) اور جو کافر ہیں، وہ باطل (سے استدلال کرکے) جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو اس کے مقام سے پھسلا دیں۔

اصل میں دَحْضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے۔جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔اس بنا پر مناظرہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے [1] ع (الکامل)

(۱۵۱) نَـظَـرًا يُزِيْلُ مَوَاقِعَ الْاَقْدَامِ: ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ اور بطور استعارہ دَحَـضَـتِ الشَّمْسُ: کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں۔

(د ح و)

اَلـدَّحْوُ: کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

وَالْاَرْضَ بَـعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا (۷۹-۳۰)

اور اس کے بعد زمین کو اس کے مقر سے دور کیا۔

یعنی اسے اس کی قرار گاہ سے زائل کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ: يَـوْمَ تَـرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْـجِبَـالُ (۷۳-۱٤) میں ہے۔یہ دَحَـا الْـمَـطَرُ الْحَصٰى عَـنْ وَّجْهِ الْاَرْضِ: (کہ بارش زمین سے کنکر بہا کر لے گئی) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔نیز کہا جاتا ہے۔

مَـرَّ الْـفَـرَسُ يَدْحُوْدَحْوًا ، گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا خاک اڑاتا چلا گیا۔اور اسی سے اُدْحِـــيُّ الـنَّعَامِ ہے جس کے معنی ریت میں شترمرغ کے انڈے دینے کی جگہ کے ہیں۔یہ دَحْـوٌ سے اُفْـعُـوْلٌ کے وزن پر ہے۔ دِحْيَةَ ایک مرد کا نام تھا (جو دحیہ کلبی کے نام سے مشہور تھا۔)

(د خ ر)

اَلـدَّخْرُ وَالدُّخُوْرُ: (ف۔س) کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ اَدْخَرْتُهٗ فَدَخِرَ: میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهُمْ دَاخِرُوْنَ﴾ (۱٦-٤٨) اور وہ ذلیل ہوکر۔ ﴿اِنَّ الَّـذِيْـنَ يَسْتَـكْبِـرُوْنَ عَنْ عِبَـادَتِيْ سَيَـدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ﴾ (۴۰-۶۰) جو لوگ میری عبادت سے ازراہ تکبر کنیا تے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہوکر داخل ہوں گے۔

اور يَدَّخِرُ اصل میں يَذْتَخِرُ تھا۔پہلے تاء کو دال سے تبدیل کیا پھر ذال کو دال بنا کر دال کو دال میں ادغام کرکے يَـدَّخِرُ بنالیا اور یہ اس باب (د خ ر) سے نہیں ہے۔

(د خ ل)

اَلدُّخُوْلُ: (ن) یہ خروج کی ضد ہے۔اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ دَخَـلَ مَـكَـانَ كَذَا (فلاں جگہ میں داخل ہوا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اُدْخُـلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (۲-۵۸) کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

---

[1] والبيت من شواهد الكشاف ۱۲۳ واوله : يتقارضون اذاالتقوا فى محلس ـ والبيت فى محاضرات المولف (۱ : ۷۳) والصناعتين ۲۸۱، ۳۵۷ وفيه مواطى بدل مواقع واللسان (نظر،قرض ، زال) وفى روايته فى موطن بدل فى مجلس والشطر فى المقاييس (۳ : ۲۱) والبيت فى المشكل للقتبى ۱۳۰ ومحازات القران للرضى ۳٤۳ والشوكانى ۲٦۹ والقرطبى ۲۵٦ والفخر (۳۰ : ۱۰۰) والبحر ۳۱۷ والطبرى (۲۹ : ۳۰) والغريب للقتبى ٤۸۲ والبيان للجاحظ (۱ : ۱۱) وفى روايته فى موقف بدل فى محلس ۱۲.

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲) جو تم عمل کیا کرتے تھے ان کے بدلے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

﴿اُدْخُلُوا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ (۱۶-۲۹) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (۵۸-۲۲) اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں داخل کرے گا۔

﴿وَيُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ (۷۶-۳۱) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ (۱۷-۸۰) اور کہو کہ اے پروردگار! مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کیجیے۔

میں مَدْخَلٌ (بفتح المیم) دَخَلَ يَدْخُلُ سے ہوگا اور مُدْخَلٌ (بضمہ میم) ہوتو اَدْخَلَ يُدْخِلُ سے جیسے فرمایا:

﴿لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ﴾ (۲۲-۵۹) وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿مُدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (۴-۳۱)

میں ہر دو قراءت منقول ہیں یعنی (میم کا ضمہ اور فتحہ) ابو علی الفسوی لکھتے ہیں ❶ کہ مَدْخَلًا (بفتح المیم) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جنت میں قصد اور ارادہ سے داخل ہوں گے۔

اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہیں ہوگی جن کے بارے میں قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ (۲۵-۳۴) جو لوگ اپنے چہروں کے بل دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔

اور مُدْخَلًا پڑھا جائے تو یہ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ کی طرح ہوگا۔

اِدَّخَلَ: کسی جگہ میں بہ صد مشقت داخل ہونا، گھس جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

لَوْيَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْمَغٰرٰتٍ اَوْمُدَّخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر) گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اَلدَّخَلُ: یہ دَغَلٌ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کنایہ ہوگا۔کہا جاتا ہے۔

دُخِلَ فُلَانٌ ﴿فِيْ عَقْلِهٖ اَوْجَسَدِهٖ﴾ فَهُوَ مَدْخُوْلٌ وَدَخِلَ (س) دَخَلًا (کنایہ) یعنی اس کے عقل و جسم یا اصل میں خرابی پائی جاتی ہے۔اسی سے اندر سے کھوکھلے درخت کو شَجَرَةٌ مَّدْخُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ

---

❶ الفارسی صاحب الایضاح والتکملۃ (المتولد۲۸۸ھ المتوفیٰ ۳۷۷ھ راجع لاحوالہ (من بحث آمین).

(١٦-٩٢) تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ بنانے لگو۔

اَلدِّخَالُ: (اَلابل) وہ اونٹ جو ایک مرتبہ پانی پی چکا ہو اور اسے دوبارہ پیاسے اونٹوں کے درمیان حوض پر داخل کیا جائے تا کہ مزید پانی پی لے۔ اَلدُّخَّلُ: ایک چھوٹا سا دھندلے رنگ کا پرند اور اسے دُخَّلٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گنجان درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔

اَلدَّوْخَلَّةُ: کھجور کے پتوں کا زنبیل۔

دَخَلَ بِـاِمْرَءَتِـهٖ (کنایہ) اس نے اپنی عورت سے مباشرت کی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ نِّسَآئِكُمُ اللَّاتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ (۴-۲۳) جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو.......... ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو (ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں۔

(د خ ن)

اَلـدُّخَانُ: یہ اَلْعُثَان کے ہم معنیٰ ہے یعنی اس دھوئیں کو کہتے ہیں جو آگ کے شعلہ کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ﴾ (۴۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دھوئیں کی مثل تھا یعنی اس میں تماسک نہیں تھا۔

دَخَنَتِ النَّارُ تَدْخُنُ: آگ کا کثرت سے دھواں دینا۔اسی سے دُخْـنَةٌ ہے لیکن عرف میں اس خوشبو کو دُخْنَةٌ کہا جاتا ہے جس سے دھونی دی جاتی ہے۔ دَخَنَ الطَّبِيْخُ پکی ہوئی چیز کا دھوئیں سے خراب ہو جانا۔اور دُخان سے لون (رنگ) کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے۔ شَاةٌ دَخْنَاءُ وَذَاتُ دَخْنَةٍ دھوئیں جیسی سیاہ بکری۔

لَيْلَةٌ دَخْنَانَةٌ: تاریک رات۔

اور اس سے ایذا رسائی کے معنیٰ لے کر هُوَ دَخِنُ الْخُلُقِ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔یعنی وہ بدخلق ہے۔ایک روایت میں ہے۔[1]

(١٢٥) هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ یعنی صلح ہو جائے گی لیکن دلوں میں کینہ ہوگا۔

(د ر ر)

اَلْمِدْرَارُ: (صیغۂ مبالغہ) بہت برسنے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا﴾ (۶-۶) اور ان پر آسمان سے لگا تار مینہ برسایا۔

﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ (۷۱-۱۱) وہ تم پر آسمان سے لگا تار مینہ برسائے گا۔

اصل میں مِدْرَار، دَرٌّ اور دِرَّةٌ سے ہے جس کے معنیٰ دودھ کے ہیں۔پھر بطور استعارہ بارش کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ اونٹ کے دیگر اسماء و اوصاف بطور

[1] من حديث حذيفة بن اليمان وبعده وجماعة على اقذاء مثل لكدورنيا تهم وفقد تصافيهم الفائق ٢: ٣٢٢ وابوداؤد (٢١: ٥٨٣.)

استعارہ ہوتے ہیں۔کہا جاتا ہے۔
لِلّٰـــهِ دَرُّهٗ اس کی خوبی اللہ کے لئے ہے (تعجب)
دَرَّ دَرُّكَ: تمہاری خیر زیادہ ہو۔
پھر بطور استعارہ بازار کے پُررونق ہونے پر لِلسُّوقِ دِرَّةٌ (بازار پُررونق ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
مثل مشہور ہے (مثل) سَبَقَتْ دِرَّتُهٗ غِرَارَهٗ: اس کی تلوار پر خون سبقت کر جاتا ہے۔جیسا کہ ضرب المثل کے طور پر (مثل) سَبَقَ سَيْلُهٗ مَطَرَهٗ (اس کی بارش سے قبل ہی سیلاب آ جاتا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
اسی سے کہا جاتا ہے۔اِسْتَدَرَّتِ الْمِعْزٰى: یعنی بکری نے نر سے جفتی کی خواہش کی کیونکہ بکری حاملہ ہوگی تو بچہ جنے گی اور بچہ جنے گی تو دودھ دے گی لہٰذا اِسْتِــــدْرَار کا لفظ بول کر نر کی خواہش سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

(د ر ی)

اَلـــدَّرْءُ: (ف) کے معنٰی (نیزہ وغیرہ کے) ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔کہا جاتا ہے۔
قَوَّمْتُ دَرْئَهٗ: میں نے اس کی کجی کو درست کر دیا۔دَرَئْتُ عَنْهُ: میں نے اس سے دفع کیا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيَـدْرَؤُنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ (۱۳۔۲۲) اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔
﴿وَيَـدْرَؤُاعَـنْهَـا الْعَذَابَ﴾ (۱۴۔۱۸) اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔
حدیث میں ہے۔(۱۲۶) اِدْرَؤُ الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو اس میں متنبہ کیا گیا ہے حدود کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنا چاہیے قرآن پاک میں ہے:
﴿فَادْرَءُ وْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ (۳۔۱۶۸) تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا۔اور آیت کریمہ:
﴿فَادّٰرَأْتُمْ فِيْهَا﴾ (۲۔۷۲) (تو اس میں تم باہم جھگڑنے لگے۔میں اِدَّرَأْتُمْ اصل میں تَدَارَأْتُمْ ہے تخفیف کے لئے تاء کو دال سے بدل کر ادغام کر دیا گیا ہے اور شروع میں ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے لہٰذا یہ اِفَّاعَلْتُمْ کے وزن پر ہے۔[1] بعض ادباء نے کہا ہے کہ اِدَّرَأْتُمْ بروزن اِفْتَعَلْتُمْ ہے مگر یہ چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔اوّل یہ کہ اِدَّرَأْتُمْ کے آٹھ حروف ہیں اور اِفْتَعَلْتُمْ کے صرف سات حروف ہیں۔[2] دوم یہ کہ اس میں ہمزہ وصلی کے بعد حرف تاء ہے جسے دال سے تبدیل کیا گیا ہے اور اِفْتَعَلْتُمْ (میں ایسے نہیں ہے) سوم یہ کہ اگر اِفْتَعَلْتُمْ کے وزن پر ہوتا ہے تو دوسرے حرف کے بعد دال کو تاء سے تبدیل کرنا چاہئے تھا۔چہارم یہ کہ جس فعل کا عین کلمہ حرف صحیح ہو اس میں تاء افتعال کا مابعد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔مگر یہاں اسے ساکن بنا لیا گیا ہے۔پنجم یہ کہ یہاں تاء اور دال کے درمیان حرف زائد لایا گیا ہے۔حالانکہ باب افتعال میں یہ نہیں ہوتا۔ششم یہ کہ اسے باب افتعال سے ماننے کی صورت میں الف کو عین کلمہ ماننا پڑے گا۔حالانکہ وہ موضع عین میں نہیں ہے۔

---

[1] روی عن علی مرفوعاً لکنه منکر وعن ابن مسعود موقوفاً وفی مسند ابی حنیفة الحارثی عن ابن عباس مرفوعاً وکذا عن عقبة بن عامر ومعاذ وعمرو غیر واحد من الصحابة لکن جملة الآثار لاتخلو عن ضعف اونکارة واصح مافیه قول ابن مسعود راجع النیل (۷: ۱۱۰۔۱۱۱) وبمعناه فی ابن ماجة وعن عائشة فی الترمذی موقوفاً.

[2] قارن الطبری (۱: ۳۵۶۔۳۵۷).

ہفتم یہ کہ دو حروف افْتَعَلَ کی تاء سے قبل ہیں اور اس کے بعد بھی دو ہی ہیں ۔مگر ادَّارَأْتُمْ میں تاء کے بعد تین حروف ہیں۔

(د ر ج)

اَلــدَّرَجَةُ: کا لفظ منزلۃ کے ہم معنیٰ ہے مگران دونوں میں فرق یہ ہے کہ مَــنْــزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو درجۃ اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسیط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اسے درجۃ نہیں کہتے جیسا کہ چھت اور سیڑھی کے درجات ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا اطلاق منزلہ رفیعہ یعنی بلند مرتبہ پر بھی ہو جاتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَلِلـرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (۲۔۲۲۸)

البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ۔میں تنبیہ کی ہے کہ عقل وسیاست وغیرہ کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے جس کی طرف آیت:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (۴۔۳۴)

مرد عورتوں کے قوام اور منتظم ہیں۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔اور اہل جنت کے متعلق فرمایا: ﴿لَهُــمْ دَرَجٰــتٌ عِـنْـدَ رَبِّهِـمْ﴾ (۸۔۴) اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے...... ہیں۔

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَاللّٰهِ﴾ (۳۔۱۶۳) یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب درجات ہوں گے اور تشبیہ کے طور پر ستاروں کے منازل کو دَرَجَاتُ النُّجُومِ کہا جاتا ہے۔

مَدْرَجَةٌ: راستے کا وسط اور وسیع حصہ۔

فُـلَانٌ يَتَدَرَّجُ فِي كَذَا: فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے۔

دَرَجَ الشَّيْـخُ وَالـصَّبِيُّ دَرَجَاناً: بوڑھے اور بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چلتا ہے۔

اَلـدَّرْجُ: کتاب یا کپڑے کی تہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی دَرج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ دَرج بمعنیٰ موت بھی آجاتا ہے۔جیسا کہ طَـوَتْهُ الْمَنِيَّةُ میں طَیٌّ کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے۔اور محاورہ ہے۔

مَنْ دَبَّ وَدَرَجَ: جو زندہ اور چل پھر رہا ہے اور جو مر چکا ہے اور اس نے اپنے دفتر زندگی کو لپیٹ لیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۷۔۱۸۲) ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم نہ ہوگا۔کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں ہم انہیں کتاب کی طرح لپیٹ لیں گے۔

یہ ان کی بے خبری اور غفلت سے کنایہ ہے۔جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تُـطِـعْ مَـنْ اَغْـفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸)

اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے......اس کا کہنا نہ ماننا۔

بعض نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ ہم انہیں بتدریج پکڑیں گے بایں طور کہ انہیں آہستہ آہستہ کسی چیز (جہنم) کے قریب لارہے ہیں جیسا کہ سیڑھیوں اور منزلوں پر چڑھایا ان سے نیچے اترا جاتا ہے۔

دَرْجٌ: چھوٹا سا تھیلا جس میں عورتیں خوشبو اور سنگار کا دیگر سامان رکھتی ہیں۔اَلــدُّرْجَةُ: وہ لتہ جسے لپیٹ کر ناقہ کی کُس میں رکھ دیا جاتا ہے۔

اَلدُّرَّاجُ: تیتر۔کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔

(د ر س)

دَرَسَ الدَّارُ: گھر کے نشان باقی رہ گئے اور نشان کا باقی رہنا چونکہ شے کے فی ذاتہٖ مٹنے کو چاہتا ہے اس لئے دُرُوسٌ کے معنیٰ اِنْمِحَاءٌ یعنی مٹ جانا کرلئے جاتے ہیں اسی طرح دَرَسْتُ الْکِتَابَ وَالْعِلْمَ کے اصل معنیٰ کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قرأت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے دَرَسْتُ الْکِتَابَ کے معنیٰ مسلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَدَرَسُوا مَا فِیہِ﴾ (۷۔۶۹) اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا ہے۔

﴿بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ (۳۔۷۹) کیونکہ تم کتاب (خدا کی) تعلیم دیتے اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

﴿وَمَآ اٰتَیْنَاھُمْ مِّنْ کُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَھَا﴾ (۳۴۔۴۴) اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلِیَقُوْلُوا دَرَسْتَ﴾ (۶۔۱۰۵) میں ایک قرأت دَارَسْتَ بھی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم نے کتاب کو دوسروں سے پڑھ لیا۔بعض نے کہا ہے کہ: ﴿وَدَرَسُوْا مَا فِیْہِ﴾ (۷۔۱۶۹) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے اس پر عمل ترک کردیا اور یہ دَرَسَ الْقَوْمُ الْمَکَانَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔یعنی انہوں نے مکان کے نشانات مٹا دیئے۔دَرَسَتِ الْمَرْأَۃُ (کنایہ) عورت کا حائضہ ہونا۔دَرَسَ الْبَعِیْرُ: اونٹ کے جسم پر خارش کے اثرات ظاہر ہونا۔

(د ر ک)

اَلدَّرْکُ اور دَرْجٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔لیکن اَلدَّرْجُ کا لفظ اوپر چڑھنے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اور اَلدَّرْکُ کا لفظ نیچے اترنے کے لحاظ سے اس لئے دَرَجَاتُ الْجَنَّۃِ اور درکَاتُ النَّارِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ پستی کے اعتبار سے دوزخ کو ھَاوِیَۃ کہا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۴۔۱۴۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔

اور سمندر کی گہرائی کی تہہ اور اس رسی کو جس کے ساتھ پانی تک پہنچنے کے لئے دوسری رسی ملائی جاتی ہے بھی دَرْکٌ کہا جاتا ہے اور دَرْکٌ بمعنیٰ تاوان بھی آتا ہے مثلاً خرید و فروخت میں بیعانہ کو دَرْکٌ کہا جاتا ہے۔قرآن میں ہے:

﴿لَا تَخَافُ دَرَکاً وَّ لَا تَخْشٰی﴾ (۲۰۔۷۷) پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آ پکڑنے کا خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔

اَدْرَکَ: کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، یا پالینا جیسے کہ اَدْرَکَ الصَّبِیُّ: لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا یعنی بالغ ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰی اِذَآ اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰۔۹۰) یہاں تک کہ اس کو غرق (کے عذاب) نے آ پکڑا۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ﴾ (۶۔۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔کو بعض نے ادراک بصری کی نفی پر حمل کیا ہے اور بعض نے ادراک کی نفی بلحاظ بصیرت مراد لی ہے اور کہا ہے کہ اس آیت سے

اس معنیٰ پر تنبیہ کی ہے کہ جو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول "یَامَنْ غَایَةُ مَعْرِفَتِهٖ الْقُصُوْرُ عَنْ مَّعْرِفَتِهٖ": اے وہ ذات جس کی غایت معرفت بھی اس کی معرفت سے کوتاہی کا نام ہے۔) میں پایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء کا کما حقہ علم حاصل ہونے کے بعد یہ یقین ہوجائے کہ ذات باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ کسی چیز کی مثل ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے۔

اَلتَّدَارُكُ: (پالینا) نہ زیادہ تر نعمت اور فریادرسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْلَآ اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (۶۸۔۴۹) اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا﴾ (۷۔۳۸) یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہوجائیں گے۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب سب کے سب اس میں ایک دوسرے کو آملیں گے۔پس اِدَّارَكُوْا اصل میں تَدَارَكُوا ہے۔اسی طرح آیت کریمہ:﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (۲۷۔۶۶) بلکہ آخرت (کے بارے میں) ان کا علم منتہی ہو چکا ہے۔ میں اِدَّارَكَ اصل میں تَدَارَكَ ہے تاء کو دال میں ادغام کرنے کے بعد ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے جس طرح کہ آیات:

﴿اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (۹۔۳۸) اور ﴿اِطَّيَّرْنَا بِكَ﴾ (۲۷۔۴۷) میں ہے ایک قرأت میں بَلْ اَدْرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ہے۔حسن نے اس کے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ وہ امور آخرت سے سراسر غافل ہیں، مگر اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ آخرت کو پالینے سے انکا علم منتہی ہو چکا ہے۔اس بنا پر وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہیں۔بعض نے کہا ہے: اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہیں آخرت میں ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہوجائے گی کیونکہ دنیا میں جو چیزیں محض ظنون نظر آتی ہیں آخرت میں ان کے متعلق یقین حاصل ہوجائے گا۔

(د ر ہ م)

اَلدِّرْهَمُ: چاندی کے ایک سکہ کا نام ہے اس کی جمع دَرَاهِمُ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔

(د ر ی)

اَلدِّرَايَةُ: اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور یہ دَرَيْتُهٗ وَدَرَيْتُ بِهٖ دِرْيَةً: دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔(یعنی اس کا تعدیہ باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔اور باء کے بغیر بھی) جیسا کہ فَطِنْتُ وَشَعَرْتُ ہے اور اِدَّرَيْتُ بمعنیٰ دَرَيْتُ آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۱۵۲) وَمَا ذَا يَدَّرِي الشُّعَرَآءُ مِنِّيْ
وَقَدْ جَاوَزْتُ رَأْسَ الْاَرْبَعِيْنَ

اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں

---

[1] قالہ سحیم بن نیل الریاحی وفی اللسان والمحکم (طبع) حر بدل رأس والبیت فی البحتری ۲۵ والکامل ٤٥٠ وفی ترجمتہ فی الاصابۃ ۲ : ۱۱۰ والسمط (۵۵۸) والسیوطی ۱۵۷ والعینی (۱ : ۱۹۱) والخزانۃ (۱ : ۱۲۶) والاصمعیات ۷۳ واصلاح یعقوب ۵٦ او نقد الشعر ۷۰ وفیہ تبتغی بدل یدری ومجالس ثعلب ۱۷٦ والاشباہ (٤ : ۱۵۲) والبیت کانہ مقیدۃ القافیہ وفیہ اقواء وبعدہ : اخو خمسین مجتمع اشدی ونجذنی مداورۃ السنین ۱۲.

چالیس سے تجاوز کر چکا ہوں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لا تدرِی لَعَلَّ اللّٰہَ یُحدِثُ بَعدَ ذٰلِکَ اَمرًا﴾ (۶۵۔۱۰) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے۔
﴿وَاِن اَدرِی لَعَلَّہٗ فِتنَۃٌ لَّکُم﴾ (۲۱۔۱۱) اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لئے آزمائش ہو۔
﴿مَا کُنتَ تَدرِی مَاالکِتَابُ﴾ (۴۲۔۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے۔
اورقرآن پاک میں جہاں کہیں وَمَآ اَدرٰکَ آیا ہے وہاں بعد میں اس کا بیان بھی لایا گیا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿وَمَآ اَدرٰکَ مَا ھِیَہ نَارٌ حَامِیَۃٌ﴾ (۱۰۱۔۱۰،۱۱) اور تم کیا سمجھے کہ (ہاویہ) کیا ہے؟ (وہ) دہکتی ہوئی آگ ہے۔
﴿وَمَا اَدرٰکَ مَا لَیلَۃُ القَدرِ لَیلَۃُ القَدرِ﴾ (۹۷۔۲،۳) اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر۔
﴿وَمَا اَدرٰکَ مَا الحَآقَّۃُ﴾ (۶۹۔۳) اور تم کو کیا معلوم ہے کہ سچ مچ ہونے والی کیا چیز ہے؟
﴿ثُمَّ مَآ اَدرٰکَ مَا یَومُ الدِّینِ﴾ (۸۲۔۱۷) اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے۔
اورآیت کریمہ: ﴿قُل لَّو شَآءَ اللّٰہُ مَا تَلَوتُہٗ عَلَیکُم وَلَآ اَدرٰکُم بِہٖ﴾ (۱۰۔۱۶) (یہ بھی) کہدو کہ اگر خدا چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ میں اَدرٰکُم دَرَیتُ سے ہے کیونکہ اگر دَرَاْتُ سے ہوتا تو وَلَا اَدرَأتُکُمُوہٗ کہا جاتا [1] اور جہاں کہیں قرآن پاک میں وَمَا یُدرِیکَ آیا ہے اس کے بعد اسکا بیان مذکور نہیں ہے [2]
(جیسے فرمایا): ﴿وَمَا یُدرِیکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی﴾ (۸۰۔۳) اور تم کو کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ ﴿وَمَا یُدرِیکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیبٌ﴾ (۴۲۔۱۷) اور تم کو کیا معلوم کہ شاید قیامت قریب ہی آ پہنچی ہو۔یہی وجہ ہے کہ دِرَایَۃٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔اور شاعر کا قول ہے [3]

(۱۵۳) لَا ھُمَّ لَا اَدرِی وَاَنتَ الدَّارِی

اے اللہ! میں نہیں جانتا اور تو خوب جانتا ہے۔
میں جو اَنتَ الدَّارِی اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے تو یہ سمجھ اور اجڈ بدو کا قول ہے (لہٰذا حجت نہیں ہوسکتا)
اَلدَّرِیَّۃُ: (۱) ایک قسم کا حلقہ جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔
(۲) وہ اونٹنی جسے شکار کو مانوس کرنیکے لئے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔اور شکاری اس کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ شکار کر سکے۔
اَلْمِدْرٰی (۱) بکری کا سینگ کیونکہ وہ اس کے ذریعہ مدافعت کرتی ہے۔اسی سے استعارۃً کنگھی یا باریک سینگ کو مِدرّی کہا جاتا ہے۔ [4]
جس سے عورتیں اپنے بال درست کرتی ہیں۔

---

[1] وفی الصحاح: وقری (ولاادرأکم بہ) والوجہ فیہ ترک الھمزۃ (ھ) وفی اعراب ثلاثین ھمزہ الحسن البصری فی بعض الایات وکذبہ النحویون وکذا الاختلاف فی الدریۃ۔ قال ابوزید ھومھموز لکن الجمھور علی ترک الھمزۃ۔

[2] منقول عن الفراء راجع اعراب ثلاثین لابن خالویہ ۴۰۔

[3] البیت فی الصحاح واللسان (وری، لھم) وتمامہ .... کل مرئی منک علی مقدار ۱۲۔

[4] وفی الحدیث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی یدہ مدری یحلک بہ رأسہ (الفائق ۱:۱۹۶)۔

(د س ر)

اَلدُّسُرُ: میخیں اس کا واحد دِسَارٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴۔۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

اصل میں دَسْرٌ کے معنیٰ کسی چیز کو زور سے مار کر ہٹا دینے کے ہیں۔کہا جاتا ہے: دَسَرَہٗ بِالرُّمْحِ: اسے نیزہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور رَجُلٌ مِطْعَنٌ کی طرح مِدْسَرٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنیٰ بہت بڑے نیزہ باز کے ہیں۔ایک روایت میں ہے۔❶

(۱۲۷) لَیْسَ فِی الْعَنْبَرِ زَکٰوۃٌ اِنَّمَا ھُوَ شَیْءٌ دَسَرَہٗ الْبَحْرُ: کہ عنبر میں زکوۃ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

(د س س)

الدَّسُّ: (ن) کے معنیٰ ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے کہ دَسَسْتُہٗ فَدَسَّ: میں نے اسے ٹھونسا تو وہ ٹھس گیا۔

دُسَّ الْبَعِیْرُ بِالْھِنَاءِ: اونٹ پر زبردستی قطران مل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ قطران کے متعلق دَسٌّ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ﴾ (۱۶۔۵۹) یا زمین میں گاڑ دی۔

(د س ی)

دَسّٰی: (تفعیل) کے معنیٰ کسی چیز کو مٹی میں چھپا دینے اور گم کر دینے کے ہیں۔یہ اصل میں دَسَّسَ تھا تخفیف کے لئے ایک سین کا یاء سے تبدیل کر دیا گیا جیسا کہ تَظَنَّنْتُ سے تَظَنَّیْتُ بنا لیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا﴾ (۹۱۔۱۰) اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد اور نا کام رہا۔

(د ع ع)

اَلدَّعُّ: کے معنیٰ سختی کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں۔ اصل میں یہ کلمہ زجر ہے جس طرح پھسلنے والے کو (بطور دعا، لَعا کہا جاتا ہے اسی طرح دَعْ دَعْ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَھَنَّمَ دَعًّا﴾ (۵۲۔۱۳) جس دن وہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے۔

﴿فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ (۱۰۷۔۲) یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔شاعر نے کہا ہے:❷

(۱۵٤) دَعَّ الْوَصِیِّ عَلٰی قَفَاءِ یَتِیْمِہٖ

جیسا کہ وصی یتیم کو گدّی پر گھونسا مارتا اور اسے دھکے دیتا ہے۔

(د ع و)

اَلدُّعَاءُ: (ن) کے معنیٰ ندا کے ہیں مگر نداء کا لفظ کبھی صرف یَا، اَیَا وغیرہما حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔

---

❶ الحدیث موقوف علی ابن عباس راجع الفائق ۱: ۱۹۷ وبحث عنه صاحب الامالی وعنه ایضًا لیس العنبر برکاز راجع البخاری مع الفتح ۸: ۱۰۵۔

❷ وفی الحدیث العرق وساس من روایة ابن عمر (الفائق ۱: ۲۲)۔

اگرچہ ان کے بعد منادیٰ مذکور نہ ہو لیکن دعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حروف ندا کے ساتھ اسم (منادیٰ) بھی مذکور ہو [1] جیسے: یَافُلَانُ ۔کبھی یہ دونوں یعنی دعا اور ندا ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷۱) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سُن سکے۔

اور کبھی دُعَــــاء بمعنیٰ تسمیہ (نام رکھنا) آجاتا ہے جیسے دَعَـوْتُ ابْنِی زَیْدًا میں نے اپنے بیٹے کا نام زید رکھا۔ اور آنحضرت کی تعلیم پر رغبت دلاتے ہوئے فرمایا: [2]

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (۲۴۔۶۳) مومنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

کیونکہ بعض لوگ آنحضرت ﷺ سے مخاطبت کے وقت آپ کو "یا محمد" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور دَعَـوْتُهٗ کے معنیٰ سوال یا مدد طلب کرنا بھی آتے ہیں۔ [3] قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ انہوں نے کہا (اب کے) اپنے پروردگار سے پھر درخواست کیجئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ﴾ (۶۔۴۰،۴۱) کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم (ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی کو پکارتے ہو۔

میں تنبیہ کی ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور عاجزی کرتے ہو۔

﴿وَادْعُوْا رَبَّكُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (۷۔۵۶) اور خدا سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا۔

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (۲۔۲۳) اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلالو اگر تم سچے ہو۔

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ﴾ (۳۹۔۸) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کو پکارتا (اور) اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے۔

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖ﴾ (۱۰۔۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہوا ہمیں پکارتا ہے۔

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ﴾ (۱۰۔۱۰۶) اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا

---

[1] لم اجده ویرجیٰ۔قارن الفتح للحافظ ۱۳۔۳۳۸.

[2] کذاذکر الحافظ فی الفتح ۱۳۔۳۳۸.

[3] و حملة القول ان لفظ الدعاء جاء فی القران لستة معان العبادة و لم یذکره المؤلف والایة ادعونی استجب لکم بمعنیٰ العبادة بدل مابعدها والاستغاثة والسوال والقول والنداء والثناء راجع شرح الاسماء الحسنیٰ لابی القاسم (القشیری) .

جو نہ تمہارا بھلا کر سکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُورًا كَثِيْرًا﴾ (۲۵۔۱۴) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔

دعائے ثبور سے یَا لَهْفَاهُ یَا حَسْرَتَاهُ وغیرہ کلمات تاسف کہنا اور واویلا کرنا مراد ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آج تم پر ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بہت سے غموم ومصائب کا سامنا ہوگا۔ ❶

اَلدُّعَاءُ (اِلَى الشَّیْءِ) کے معنیٰ کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اُکسانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِیْ اِلَيْهِ﴾ (۱۲۔۳۳) کہ پروردگارا! جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰۔۲۵) اور اللہ تعالیٰ تو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿وَيٰقَوْمِ مَالِیْ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُوْنَنِیْ اِلَى النَّارِ o تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ﴾ (۴۰۔۴۱,۴۲) اور اے قوم میرا حال ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے (دوزخ کی) آگ کی طرف بلاتے ہو۔تم مجھے اس لئے بلاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرو اور......اس کا شریک مقرر کروں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لا جَرَمَ اَنَّ مَا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ﴾ (۴۰۔۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں ہے۔

میں دَعْوَةٌ کے معنیٰ رفعت اور عظمت کے ہیں ❷ اَلدِّعْوَةُ کے معنیٰ خاص کر نسبت کا دعویٰ کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں یہ قِعْدَةٌ وَجِلْسَةٌ کی طرح فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو حالت کے لئے آتا ہے۔مثل مشہور ہے۔

دَعْ دَاعِیَ اللَّبَنِ (مثل) یعنی دودھ اتارنے کے لئے تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دے۔ ❸

اَلادِّعَاءُ کے معنیٰ کسی چیز کے متعلق دعوی کرنے کے ہیں (کہ یہ میری ہے) اور جنگ میں اِدِّعَاءَ کے معنیٰ اپنے کو کسی طرف منسوب کرنا ہوتے ہیں۔ ❹ (کہ میں فلاں قوم سے ہوں یا فلاں کا بیٹا ہوں وغیرہ) اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا﴾ (۴۱۔۳۲) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہوگی) (یہ) مہمانی ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم جنت میں جو چیز طلب کرو گے حاضر کر دی جائے گی۔

---

❶ وایضاً دعا بمعنیٰ جعل کمافی قوله تعالیٰ: ان دعوا للرحمن والداً (۱۹۔۹۱).

❷ کذا نقل عن المؤلف الحافظ فی الفتح ۱۳۔۳۳۸).

❸ امر صلی اللّٰہ علیہ وسلم ضرار بن ازور ان یحلب ناقت فقال له (الفائق ۱: ۱۹۸ والنهاية (دعا) وغريب ابی عبيد.

❹ کماقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم الاحد: انا ابن عبدالمطلب ومن الدعوة الدعی وجمعه ادعیاء ۳۳۔٤).

اور دَعْوٰی کبھی بمعنیٰ اِدِّعَاءٌ بھی آ جاتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَا﴾ (۷۔۵) تو جس وقت ان پر عذاب آتا تھا ان کے منہ سے یہی نکلتا تھا۔
اور کبھی بمعنیٰ دعا کے [1] جیسے فرمایا:
﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۰۔۱۰) اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ خدائے رب العٰلمین کی حمد اور اس کا شکر ہے۔

(د ف ء)

اَلدِّفْءُ: گرمی، حرارت یہ بَرْدٌ (سردی) کی ضد ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ﴾ (۱۶۔۵) ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بہت سے فائدے ہیں۔
میں دِفْءٌ سے جاڑے کا سامان مراد ہے۔
رَجُلٌ دِفْآن: (مؤنث دِفْأَیٰ) گرمی حاصل کرنے والا۔
بَيْتٌ دَفِيْءٌ: گرم مکان۔

(د ف ع)

اَلدَّفْعُ: (دفع کرنا، ہٹا دینا) جب اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہو تو اس کے معنیٰ دے دینے اور حوالے کر دینا ہوتے ہیں۔جیسے فرمایا:
﴿فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ﴾ (۴۔۶) تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔
اور جب بذریعہ عَنْ متعدی ہو تو اس کے معنیٰ مدافعت اور حمایت کرنا ہوتے ہیں۔جیسے فرمایا:
﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۲۔۳۸) اللہ تو مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔
﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۔۲۵۱) اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰۔۲،۳) کوئی اس کو ٹال نہ سکے گا۔(اور وہ) خدائے صاحب درجات کی طرف سے (نازل ہوگا)۔
میں دَافِعٌ کے معنیٰ حامی اور محافظ کے ہیں۔
اَلْمُدَفَّعُ: ہر جگہ سے دھتکارا ہوا۔ذلیل اور رسوا۔
اَلدُّفْعَةُ: بارش کی بوچھاڑ۔اَلدُّفَاعُ سیلاب کا زور۔

(د ف ق)

اَلدَّفْقُ: (مصدر ن) کے معنیٰ سرعت کے ساتھ بہنے کے ہیں۔قرآن میں ہے:
﴿مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ (۸۶۔۶) (اچھل کر تیزی سے گرنے والے پانی سے۔
اسی سے بطور استعارہ جَآءُوْا دُفْقَةً (وہ یکبارگی آ گئے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور تیز رفتار اونٹ کو بَعِيْرٌ اَدْفَقُ کہتے ہیں۔
مَشَى الدِّفْقٰى: اس طرح تیز رفتاری سے چلا جیسے زور سے بہنے والا پانی اچھل کر گرتا ہے اور بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔
مَشَو دِفْقًا: وہ تیز چلے۔

(د ک ک)

اَلدَّكُّ: (اسم) کے معنیٰ نرم اور ہموار زمین کے

---

[1] والدعویٰ ههنا بمعنیٰ القول راجع الفتح للحافظ ۱۳: ۳۳۸۔

ہیں۔اور دَکَّہٗ (ن) دَکًّا کے معنیٰ کوٹ کر ہموار کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً﴾ (۶۹۔۱۴) اورزمین اور پہاڑ دونوں اٹھالئے جائیں گے۔ پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کردیئے جائیں گے۔

﴿وَدُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ [1] (۸۹۔۲۱)

یعنی زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کردی جائے گی۔

﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ (۷۔۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر نمودار ہوا تو (تجلی انوارِ ربانی نے) اس کو ریزہ ریزہ کردیا۔

اوراسی سے دُکَّانٌ ہے جس کے معنیٰ ہموار چبوترہ کے ہیں۔

اَلدَّکْدَاکُ: نرم ریت۔اَرضٌ دَکَّآءُ: ہموارزمین ج دُکٌّ۔ اور ہموار زمین کے ساتھ تشبیہ دے کر نَاقَةٌ دَكَّآءُ اس اونٹنی کو کہہ دیتے ہیں جس کو کوہان نہ ہو۔ [2]

(د ل ل)

اَلدَّلَالَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کی معرفت حاصل ہو، جیسے الفاظ کا معانی پر دلالت کرنا اور اشارات ورموز اور کتابت کا اپنے مفہوم پر دلالت کرنا اور حساب میں عقود کا عدد مخصوص پر دلالت کرنا وغیرہ اور پھر دلالت عام ہے کہ جاعل یعنی واضع کی وضع سے ہوا یا بغیر وضع اور قصد کے ہو مثلاً ایک شخص کسی انسان میں حرکت دیکھ کر جھٹ جان لیتا ہے کہ وہ زندہ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۱۴) تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا۔مگر گھن کے کیڑے سے۔اصل میں دَلَالَةٌ کا لفظ کِنَایَةٌ وَامَارَةٌ کی طرح مصدر ہے۔اوراسی سے دَالٌّ صیغہ صفت فاعل ہے یعنی وہ جس سے دلالت حاصل ہو اور دَلِیْلٌ صیغہ مبالغہ ہے، جیسے عَالِمٌ وَعَلِیْمٌ وَقَدِیْرٌ [3] ہے کبھی دَالٌّ وَدَلِیْلٌ بمعنیٰ دَلَالَةٌ (مصدر آجاتے ہیں) اور یہ تسمیہ الشیء بمصدرہ کے قبیل سے ہے۔

(د ل ک)

دُلُوْکُ: (الشَّمْسِ) کے معنیٰ ہیں آفتاب کا (زوال) مائل بہ غروب ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۷۔۷۸) (اے محمد ﷺ!) سورج کے ڈھلنے سے......... نماز ...... پڑھا کرو۔

یہ اصل میں دَلَکْتُ الشَّمْسَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو دفع کرنا۔اوراسی سے دَلَکْتُ الشَّیْءَ فِی الرَّاحَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کو ہتھیلی میں لے کر ملنے کے ہیں۔دَلَکْتُ الرَّجُلَ: لیت لعل کرنا۔

اَلدَّلُوْکُ: ایک قسم کی خوشبو جسے بدن پر ملا جاتا ہے۔
اَلدَّلِیْکُ: ایک قسم کا کھانا جو مسکہ اور کھجور سے تیار ہوتا ہے۔

---

[1] وفی المطبوع الجبال مکان الارض خطأ مطبعی ۱۲۔
[2] قارن المجاز لابی عبیده (۱: ۴۱۵)۔
[3] وفی التنزیل ثم جعلنا الشمس علیه دلیلاً (۲۵: ۴۵)۔

(د ل و)

دَلَوْتُ الدَّلْوَ: کے معنیٰ کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اور اَدْلَیْتُھَا کے معنیٰ ڈول بھر کر نکالنے کے۔ ابومنصور نے لکھا ہے کہ اَدْلٰی کے معنیٰ ڈول کنویں میں ڈالنے کے آجاتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ❶

﴿فَاَدْلٰی دَلْوَہٗ﴾ (۱۲۔۱۹) اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔ اسی سے بطور استعارۃ اَدْلٰی کے معنیٰ کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی آجاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۱۵۵) وَلَیْسَ الرِّزْقُ عَنْ طَلَبِ حَثِیْثٍ
وَلٰکِنْ اَلْقِ دَلْوَكَ فِی الدِّلَاءِ

رزق جدوجہد سے حاصل نہیں ہوتا ہاں تمہیں اس کے لئے وسائل تلاش کرنا چاہیے۔ اس بنا پر وسیلہ کو مَائِح کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا: ❸

(۱۵٦) وَلِیَ مَائِحٌ لَمْ یُوْرِدِ النَّاسُ قَبْلَهٗ
مُعَلًّی وَاَشْطَانُ الطَّوِیِّ کَثِیْرٌ

میرے پاس اظہار مطلب کے لئے ایسا بلند قدر وسیلہ ہے جو اچھوتے مضامین بیان کرتا ہے۔ اور گفتگو کے اسباب بہت ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ﴾ (۲۔۱۸۸) اور نہ ان اموال کے ذریعہ (رشوت دے کر) حکام تک رسائی حاصل کرو۔

اِتَّدَلّٰی (تفعل) قریب ہونا۔ اور اترانا قرآن میں ہے:

﴿ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی﴾ (۵۳۔۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

(د م دم)

اَلدَّمْدَمَةُ: (فعللة) ہلاک کرنا۔ اور آیت:

﴿فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ﴾ (۹۱۔۱۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ خدا نے انہیں ہلاک کر ڈالا اور پریشان و بے چین کر دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ دَمْدَمَةٌ (اسم صوت ہے اور) بلی کی آواز کی حکایت کو کہتے ہیں۔ اسی سے دَمْدَمَ فُلَانٌ فِی کَلَامِهٖ کا محاورہ ہے یعنی اس نے پریشان کن سی گفتگو کی۔ دَمَمْتُ الثَّوْبَ کپڑے کو رنگ سے طلا کرنا۔

اَلدِّمَامُ: ہر چیز جس سے طلا کی جائے۔

بَعِیْرٌ مَدْمُوْمٌ بِالشَّحْمِ۔ بہت موٹا اور چربی والا اونٹ گویا چربی اس پر طلائی کی گئی ہے۔

اَلدِّمَّاءُ وَالدُّمَمَةُ: جنگلی چوہے کا بل۔

اَلدَّمَّاءُ (بتخفیف میم) وَالدَّیْمُوْمَةُ صحراء، ریگستان۔

---

❶ راجع تاج المصادر لابی جعفر البیهقی.

❷ البیت فی محاضرات المؤلف ۲: ۴۹۲ وفی روایة: وما طلب المعیشة بالتمنی .... ومجموعة المعانی ۷۳ او المیدانی رقم ۳۳۲۰ مع آخر ولم ارفی المراجع من نسبه.

❸ قال العجب السلولی وعنیٰ بالمائح لسانه وفی اللسان (میح) الماء بدل الناس ویعلیٰ بدل معلیٰ والدلاء بدل الطویٰ والبیت فی المحکم (میح) ومجالس ثعلب ۵۲۴۔۵۲۳ فی تسعة والازمنه والامکنة (۲: ۱۵۹) وھی قصیدة فی ۱۱ بیتاً انشدھا الشاعر بین یدی عبدالملک بن مروان والعجیر ھو عمیر بن عبدالله بن عبیدة شاعر مقل وکان خبیثاً راجع الاغانی (۱۱: ۱۴٦۔۱۵۳) والخزانة (۲: ۳۹۹) وابن سلام (۱۹۹۔۲۰۰).

(د م ر)

اَلتَّدْمِیْرُ: (تفعیل) کے معنیٰ ہیں کسی چیز پر ہلاکت لاڈالنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَدَمَّرْنَاھُمْ تَدْمِیْرًا﴾ (۱۷۔۱۶) اور ہم نے انہیں ہلاک کرڈالا۔

﴿ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۷۲) پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کردیا۔

﴿وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۷) اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل بناتے اورا انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ و برباد کردیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ﴾ (۴۷۔۱۰) خدا نے ان پر تباہی ڈال دی۔

میں دَمَّرَ کا مفعول محذوف ہے۔

محاورہ ہے: مَا بِالدَّارِ تَدْمُرِیٌّ: یعنی گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

(د م ع)

دَمَعَتِ(ف) الْعَیْنُ دَمْعًا وَّ وَدَمْعَانًا: آنسو جاری ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تَوَلَّوْا وَّ اَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ (۹۔۹۲) تو وہ لوٹ گئے۔اور اس غم سے..........ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔معلوم ہوا کہ الدمع اسم بھی آتا ہے جس کے معنیٰ ہیں آنسو اور (باب مذکور کا) مصدر بھی۔

(د م غ)

اَلدَّمْغُ:(ف) کے اصل معنیٰ دماغ پھوڑ دینے کے ہیں (اس سے نیست و نابود کرنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ﴾ (۲۱۔۱۸) (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز توڑ دیتا ہے۔

حُجَّةٌ دَامِغَةٌ: حجت قاطع،سر پھوڑ دلیل۔نیز دَامِغَةٌ ایک قسم کے شگوفہ کو کہتے ہیں جو کھجور کے تنا سے پھوٹ نکلتا ہے۔اگر اسے کاٹا نہ جائے تو کھجور کے درخت کو خشک اور خراب کردیتا ہے۔نیز دَامِغَةٌ اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جو پالان کی لکڑی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔

یہ تمام الفاظ دَمْغٌ سے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔جس کے معنیٰ دماغ کو توڑنا کے ہیں۔

(د م ی)

اَلدَّمُ: خون۔یہ اصل میں دَمْیٌ تھا (یاء کو برائے تخفیف حذف کردیا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ﴾ (۵۔۳) تم پر مردار جانور اور (بہتا) ہوا لہو.......... یہ سب حرام ہے۔

دَمٌ کی جمع دِمَآءٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ﴾ (۲۔۱۴۰) کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔

دَمِیَتِ (س) الْجِرَاحَةُ: زخم سے خون بہنا۔

فَرَسٌ مَدْمِیٌّ: خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔

اَلدُّمْیَةُ: گڑیا (جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو)

شَجَّةٌ دَامِیَةٌ: سر کا زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

(د ن ر)

اَلدِّیْنَارُ: (اشرفی) اصل میں دِنَّارٌ تھا۔ایک نون

گویا سے تبدیل کیا گیا ہے (والجمع دنانیر) بعض نے کہا ہے کہ یہ فارسی لفظ دین آر سے معرب ہے یعنی وہ جسے شریعت لے آئی ہو۔ ❶ قرآن میں ہے۔

مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ (۳-۷۵) کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو۔

(د ن و)

اَلدُّنُوُّ (ن) کے معنیٰ قریب ہونے کے ہیں اور یہ قریب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی، اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ (۶-۹۹) اور کھجور کے گابھے میں سے قریب جھکے ہوئے خوشے کو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى﴾ (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

میں قرب حکمی مراد ہے اور لفظ ادنیٰ کبھی بمعنیٰ اَصْغَرَ (آتا ہے) اس صورت میں اَکْبَر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا ❷:

﴿وَ لَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَآ اَكْثَرَ﴾ (۵۸-۷) اور نہ اس سے کم نہ زیادہ۔

اور کبھی اَدْنیٰ بمعنیٰ اَرْذَلُ استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ﴾ (۲-۶۱) بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

اور کبھی بمعنیٰ اول (نشأة اولی) استعمال ہوتا ہے۔

اور الآخر۔(نشأة ثانیه) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ (۲۲-۱۱) اس نے دنیا میں بھی نقصان اُٹھایا اور آخرت میں بھی۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (۱۶-۱۲۲) اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اور کبھی اَدنیٰ بمعنیٰ اقرب آتا ہے اور اقصیٰ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ (۸-۴۲) (جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

اَلدُّنْيَا کی جمع الدُّنیٰ آتی ہے جیسے اَلْكُبْرٰى کی جمع اَلْكُبَرُ والصُّغْرٰى کی جمع اَلصُّغَرُ۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَا﴾ (۵-۱۰۸) اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت ادا کریں۔

میں اَدْنٰی بمعنیٰ اَقْرَبُ ہے یعنی یہ اَقْرَبُ ہے کہ شہادت ادا کرنے میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں۔

اور آیت کریمہ:

---

❶ المعرب للجواليقي وراجع الاتقان (۱ : ۱۳۹).

❷ والصواب في التمثيل ولنذيقنهم من العذاب الادنىٰ دون العذاب الاكبر (۳۲-۲۱).

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ﴾ (۳۳۔۵۱) یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲۔۲۱۹، ۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو)۔

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے۔ اَدْنَيْتُ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ وَاَدْنَيْتُ اَحَدَهُمَا مِنَ الْآخَرِ: یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔ یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ (۳۳۔۵۹) کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

اَدْنَتِ الْفَرَسُ: گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آ پہنچا۔

اَلدَّنِيُّ: خاص کر حقیر اور رذیل آدمی کو کہا جاتا ہے۔اور یہ سَيِّءٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے۔ هُوَ دَنِيٌّ یعنی نہایت رذیل ہے۔اور جو مروی ہے [1]

(۱۲۸) اِذَا اَكَلْتُمْ فَدِنُوا تو یہ دُوْنَ سے ہے یعنی جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(د ھ ر)

اَلدَّهْرُ: (زمانہ) اصل میں مدتِ عالم کو کہتے ہیں یعنی ابتداء آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک کا عرصہ۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (۷۶۔۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے۔

میں اَلدَّهْرُ سے یہی معنیٰ مراد ہیں پھر (مجازاً) اس سے ہر طویل مدّت مراد لی جاتی ہے۔ برخلاف لفظ ''زمان'' کے کہ یہ مدت قلیلہ اور کثیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔اور دَهْرُ فُلَانٌ کے معنیٰ اس کی مدت حیاۃ کے ہیں اور جو عادت زندگی بھر باقی رہے اس پر بھی استعارۃً دَهْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔مثلاً کہا جاتا ہے: مَا دَهْرِيْ بِكَذَا: میں اس کا عادی نہیں ہوں۔اور خلیل نے حکایت کی ہے: دَهَرَ فُلَاناً نَائِبَةٌ دَهْراً: (یعنی فلاں پر مصیبت نازل ہوگئی) تو یہاں دَهْر کا لفظ مصدر ہے اور بعض نے دَهْرٌ دَاهِرٌ وَدَهِيْرٌ: زمانہ بے انتہا وقت ایک حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۲۹) لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔(کہ زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) بعض نے اللہ تعالیٰ کے دَهْر ہونے کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں کہ جو خیر وشر اور خوشی اور ناخوشی زمانہ کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کا فاعل حقیقی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا جب تم زمانہ کو برا بھلا کہو گے جو تمہارے اعتقاد کے مطابق فاعل ہے۔تو

---

[1] وفي النهاية (دنا) سَمُّوا الله وَدَنُّو اوسمتوا قال وهو فَعِّلُوا من دَنَا يَدْنُوا ومعناه كلوا ممايليكم ومابين يديكم .

[2] اخرجه البخاری واللسان (دھر) والفائق (۱ : ۳۱۵) وانظر لتاويل الحديث امالی المرتضیٰ (۱ : ۴۵-۴۶) وابن کثیر (۴ : ۱۵۱) والطبری (۲۵ : ۱۵۲) بسياق غريب جداً الحديث باختلاف الفاظه فی (م ، حم م ق) (وابن عساکر فی معجمه وابن النجار کلهم عن ابی هريرة) راجع کنزالعمال (۳ : ۳۴۵) ۱۲ .

گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کو گالیاں دے رہے ہو۔اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں دَھر ثانی دَھر اول کا غیر ہے اور یہ مصدر بمعنیٰ فاعل ہے یعنی فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھْرُ اور معنیٰ یہ ہیں کہ ہر قسم کا تصرف وتدبیر اور جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا فیضان اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے مگر معنیٰ اول اظہر وانسب ہے۔اور قرآن پاک نے مشرکین عرب کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:
﴿مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوتُ وَنَحْیٰ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ﴾ (۴۵۔۲۴) کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور یہ صرف زمانہ ہی ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔
اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں دَھْرٌ سے مراد زمانہ ہی ہے۔

(د ھ ق)

اَلدَّھْقُ (ف) کے معنیٰ لبالب بھرنے اور چھلکنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَکَأْساً دِھَاقًا﴾ (۷۸۔۳۴) اور لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔
محاورہ ہے:
اَدْھَقْتُ الْکَأْسَ فَدَھَقَ (میں نے پیالہ بھرا تو وہ بھر گیا) دَھَقَ لِیْ مِنَ الْمَالِ دَھْقَةً (اس نے مجھے بہت مال دیا) جیسا کہ قَبَضَ لِیْ قَبْضَةً کا محاورہ ہے۔

(د ھ م)

اَلدُّھْمَةُ: کے اصل معنیٰ تورات کی سیاہی کے ہیں اور یہ لفظ گھوڑے کی سیاہی پر بولا جاتا ہے کبھی اس سے نہایت گہرا سبز رنگ مراد ہوتا ہے جیسا کہ ہلکے سیاہ رنگ کو خُضْرَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔کیونکہ یہ دونوں قسم کی رنگت قریباً ملتی جلتی سی ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿مُدْھَآمَّتَانِ﴾ (۵۵۔۶۴) دونوں خوب گہرے سبز۔یہ اِدھامَّ اِدھِیمَاماً سے مُفْعَالٌ کے وزن پر ہے۔کسی شاعر نے رات کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔[1] (البسیط)

(۱۳۶) فِی ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوھَا مَہٗ الْیَومُ

یعنی تاریک رات جس میں کہ بوم اپنے ہام کو بلا رہا ہوتا ہے۔

(د ھ ن)

اَلدُّھْنُ: تیل، چکناہٹ، ج اَدْھَان قرآن پاک میں ہے:
﴿تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ﴾ (۲۳۔۲۰) جو روغن...... لئے ہوئے اگتا ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّھَانِ﴾ (۵۵۔۳۷) پھر......تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔میں بعض نے کہا ہے کہ دِھان کے معنیٰ تلچھٹ کے ہیں۔

اَلْمُدْھُنُ: ہر وہ برتن جس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔
یہ اسم آلہ کے منجملہ ان اوزان کے ہے جو (بطور شاذ) مُفْعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں اور بطور تشبیہ (پہاڑ میں) اس مقام (چھوٹے سے گڑھے) کو بھی مُدْھَنٌ کہا جاتا ہے۔جہاں تھوڑا سا پانی ٹھہر جاتا ہو اور دُھْنٌ سے بطور استعارہ کم دودھ والی اونٹنی کو دَھِیْنٌ کہا جاتا ہے اور یہ فعیل بمعنیٰ فاعل کے وزن پر ہے یعنی وہ بقدر دہن کے

---

[1] قالہ ذوالرمة والبیت فی اللسان (عسف، ھوم) وقد مر تخریجه فی (خضر).

دودھ دیتی ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ فَعِیلٌ بمعنیٰ مفعول ہے۔گویا اسے دودھ کا دُھن لگایا گیا ہے۔یہ بھی دودھ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے یہ دوسرا قول اقرب الی الصحۃ معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ اس کے آخر میں "ہ" تانیث نہیں آتی۔(جو فعیل بمعنیٰ مفعول ہونے کی دلیل ہے)

دَھَنَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ: بارش نے زمین کو ہلکا سا نم کر دیا جیسا کہ سر پر تیل ملا جاتا ہے۔

دَھَنَہٗ بِالْعَصَا (کنایۃ) لاٹھی سے اس کی تواضع کی۔یہ بطور تہکم کے بولا جاتا ہے۔جیسا کہ مَسَحْتُہٗ بِالسَّیْفِ وَحَیَّیْتُہٗ بِالرُّمْحِ: کا محاورہ ہے۔لیکن یہ تصنع، نرمی برتنے اور حقیقت کا دامن ترک کر دینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ تَقْرِیْدٌ کا لفظ جس کے اصل معنیٰ اونٹ سے چیچڑ دور کرنا کے ہیں پھر تصنع اور نرمی برتنا کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَبِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْھِنُوْنَ﴾ (۵۶۔۸۱) کیا تم اسی کتاب سے انکار کرتے ہو؟

شاعر نے کہا ہے ❶ (السریع)

(۱۵۷) اَلْحَزْمُ وَالْقُوَّۃُ خَیْرٌ مِنَ
الدِّھَانِ وَالْقِلَّۃِ وَالْھَاعِ

کہ حزم و احتیاط اور قوت چاپلوسی اور جزع فزع سے بہتر ہیں۔

دَاھَنْتُ فُلَانًا مُدَاھَنَۃً: میں نے فلاں کے سامنے چاپلوسی کی۔قرآن میں ہے:

﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ﴾ (۶۸۔۹) کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم مداہنت سے کام لو یہ بھی نرم ہو جائیں۔

(د و د)

دَاوٗد (داؤد علیہ السلام) یہ عجمی نام ہے (اور عجمہ وعلمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے)۔

(د و ر)

اَلدَّارُ: منزل، مکان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔بعض نے دَارَۃٌ بھی کہا ہے۔اس کی جمع دِیَارٌ ہے۔پھر دار کا لفظ شہر، علاقہ بلکہ سارے جہاں پر بولا جاتا ہے اور اَلدَّارُ الدُّنْیَا اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃ سے نشأۃ اولیٰ اور نشأۃ ثانیہ میں دو قرار گاہوں کی طرف اشارہ ہے۔بعض نے دَارُ الدُّنْیَا وَدَارُ الْاٰخِرَۃِ (باضیافت) بھی کہا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَھُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ (۶۔۱۲۷) ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی

---

❶ قاله ابو قيس بن الاسلت الانصارى وفى رواية الاكثر :الكيس والقوة خيرمن ال :اشفاق والفهة والهاع ـ والبيت من كلمة مفضلية ٢٣٥فى ٢٤ بيتاً وفى روايته الفكة بدل القلة وفى رواية احمد بن عبيد الفهة كمافى اللسان (فلك) ومعناه الضعف والهاع سوء الحرص مع الضعف والبيت فى الحيوان (٣: ٤٦) والبيان (١: ٢٠٤) والامالى (٢: ٢١٢) والسمط (٧٣٧) والبحر (٨: ٢٠٨) وابدال ابى الطيب (٢: ٣٧٥) وفى العمدة (٢: ١٨) اثناء الامثلة مماعيب فى المقابلة وابو القيس اختلف فى اسمه ذكره الحافظ فى الاصابة والراجح صيفى بن الاسلت وكان الدوس اسندامرها اليه فى الحروب الاخيرة بين الدوس والخزرج فكفى وساد حتىٰ شحب وتغير ولبث اشهراً لايقرب من امرأتِهٖ ثم انه جاء ليلة فدق على امرئه ففتحت له فاهوىٰ اليها بيده فدفعته وانكرته فقال انا ابو قيس فقالت والله عرفتك حتىٰ تكلمت فقال فى ذالك القصيدة مطلعها قالت ولم تقصد لقيل الخناء مهلاً فقد ابلغت اسماعى ـوفيها الشاهد واختلف فى اسلامه راجع الاصابة (: ١٥٨ـ٥: ٢٥٧/٤: ٢٥٢) والاغانى (١٥: ١٥٤) واسدالغابة (١: ١٨٤) والخزانة (٣: ٣٧٥ـ ٣٧٨.)

کا گھر ہے۔

یہاں دارالسلام سے جنت مراد ہے اور ﴿دَارُ الْبَوَارِ﴾ (۱۴۔۲۸) ہلاکت کا گڑھا اسے جہنم۔ نیز فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ (۲۔۹۴) کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر...... تمہارے لئے ہی مخصوص ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ (۲۔۲۴۳) بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو...... اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔

﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا﴾ (۲۲۔۲۴۶) جب کہ ہم وطن...... سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔

﴿سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (۷۔۱۴۵) میں عنقریب تم کو نافرمان لوگوں کا گھر دکھاؤں گا۔

کہا جاتا ہے مَـابِهَـا دَيَّارٌ یعنی یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ دَارٌ سے فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کیونکہ اگر فَعَّالٌ کے وزن پر ہوتا تو دَيَّارٌ کی بجائے دَوَّارٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ (قول سے) قَوَّالٌ اور (جور سے) جوَّارٌ ہے۔

اَلـدَّائِـرَةُ: خط محیط (سرکل) کو کہتے ہیں یہ دَارَ يَدُوْرُ دَوْرَانـًا سے ہے جس کے معنیٰ چکر لگانا کے ہیں پھر مصیبت گردش زمانہ کو بھی دائرۃ (یـا دارـۃ) کہہ دیا جاتا ہے اسی مناسبت سے زمانہ کو...... الـدَّوَّارِیُّ کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردشیں بھی انسان پر گھومتی رہتی ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الرجز)

(۱۵۸) وَالـدَّهْرُ بِالْاِنْسَانِ دَوَّارِیٌّ

کہ زمانہ انسان کو گھمار رہا ہے۔

اور الدورۃ و الدائرۃ کا لفظ مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دَولَة کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ﴾ (۵۔۵۲) ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آ جائے دَآئِـرَة کی جمع دَوَآئِرُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ (۹۔۹۸) کہ وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انہی پر بری مصیبت واقع ہو یعنی تباہی اور بربادی انہیں ہر طرف سے اس طرح گھیر لے جیسا کہ کوئی شخص دائرہ کے اندر ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے اس بربادی سے نکلنے کی صورت باقی نہ رہے۔

اَلـــــدَّوَّارُ: ایک بت کا نام ہے جس کے گرداگرد لوگ طواف کیا کرتے تھے۔

اَلـدَّارِیْ: یہ الدار کی طرف منسوب ❷ ہے مگر عطار (عطر

---

❶ بیت من مشطورة الرجز للعجاج في وصف الدهر وبعده : افني القرون وهو قعسری وقبله : أطَرَباً وانتَ قِنّسْری والرجز فی اللسان (قعسردور) والصحاح (دور) وتفسیر الطبری (۱۹ : ۱٤) واراجیز العرب للسید توفیق البکری ۱۷٤ ومجموع اشعار العرب ۲ : ٦٦) والخزانة ۳ : ۵۱۱) وابن هشام (۱ : ۱۲) رقم ۱۲ وثلاثین ۱۹ والسیوطی ۱۸ والمزروقی ٤ : ۸۱۸ والمحکم (قعسر)۱۲.

❷ ذکر علماء اللغة والغریب قولین فی هذه النسبة الاول نسبة الی الدار وهی عَلَمٌ لموضع بین البصرة والبحرین کمافی الیاقوت (رسم : الدار) وذکره ابن دریدفی الملاحم وقال : الدار موضع بالبحرین معروف والیه ینسب الداری العطار والثانی انه نسبة الی فرضة البحرین یقال لها دارین : قال الیاقوت : والنسبة الیها داری والیه ذهب ابن الاثیر فی النهایة (دار) والجوهری فی الصحاح (دار) وفی البلدان هی بلدة فتحت فی ایام ابی بکر رضی الله عنه سنة ۱۲ وکان علی الغزاة العلاء بن الحضرمی وفیه یقول الفرز دق کان تریکة من ماء مزن۔ وداری الذکی من المدام راجع البلدان (ارسم : دارین)۱۲.

فروش) کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے [2] جیسا کہ اَلْھَالِکِیُّ کالفظ قَیْــــن یعنی لوہار پر خاص کر بولا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔ [1]

(۱۲۹) مَثَلُ الْجلِیْسِ الصَّالِحِ کَمَثَلِ الدَّارِیِّ کہ نیک صحبتی کی مثال عطار کی سی ہے۔

اور جو شخص گھر کے اندر ہی جم کر بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے اسے بھی دَارِیٌّ کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَھَا بَیْنَکُمْ﴾ (۲۔۲۸۲) ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔

یعنی نقد اور ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔

(د و ل)

اَلدَّوْلَةُ وَالدُّوْلَةُ: دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ یعنی گردش کرنا۔بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کا لفظ مال وزر کے گھومنے پر بولا جاتا ہے اور دُوْلَةٌ لڑائی اور عزت وجاہ کے ادلنے بدلنے پر۔بعض نے ان دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ دَوْلَةٌ اسم ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ لین دین کیا جائے اور دُوْلَةٌ (بضم الدال) مصدر ہے یعنی لین دین کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ﴾ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں یہ پھرتا رہے۔

تَدَاوَلَ الْقَوْمُ کَذَا: کسی چیز کو دولت کی طرح باری باری لینا۔

دَاوَلَ اللّٰهُ کَذَا بَیْنَھُمْ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان اسے گھمایا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ (۳۔۱۴۰) اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

اَلدُّؤْلُوْلُ: بڑی مصیبت۔ج اَلدَّآلِیْلُ وَالدُّؤْلَاءُ۔

(د و م)

اَلدَّوَامُ: اصل میں دوام کے معنیٰ سکون کے ہیں کہا جاتا ہے۔دَامَ الْمَآءُ (پانی ٹھہر گیا) اور (حدیث میں [2]

(۱۳۰) اَلْمَآءُ الدَّآئِمُ: یعنی کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اَدَمْتُ الْقِدْرَ وَدَوَّمْتُھَا: تھوڑا سا پانی ڈال کر ہانڈی کو ٹھنڈا کر دیا۔اسی سے دَامَ الشَّــیْءُ کا محاورہ ہے یعنی وہ چیز جو عرصہ دراز تک رہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ﴾ (۵۔۱۱۷)

---

[1] وتتمة الحدیث ذکره المؤلف فی الاخوانیات من محاضراته (۳: ۶) والزمخشری فی الفائق (۱: ۲۰۶) والنهایة (دار) راجع للحدیث (د،ك عن انس) ودع والرامهرمزی، د، حب، فی روضة العقلاء عن شبل عن انس وابن حبان والرامهرمزی ایضاً عن ابی موسیٰ ولفظ الاکثر مثل العطار لان اصحاب الغریب ذکروالفظ الداری بدل العطار راجع للمراجع کنزالعمال ۹،۵،۵ والفتح للنبهانی ۳: ۱۲۸ ومجمع البحار (۱: ۴۵۲)۱۲.

[2] ولفظة الحدیث ولایبولن احدکم فی الماء الدائم راجع تخریجه فی کنزالعمال ۹: ۱۷۷۲۔۱۷۸۶ وفی کتب الغریب النهایة (دوم) والفائق ۱: ۲۰۵).

اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا رہا۔

﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا﴾ (۳۔۷۵) جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔

﴿لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا﴾ (۵۔۲۴) جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔

اور یہ باب دِمْتَ تَدَامُ سے آتا ہے اور بعض نے دُمْتَ تَدُوْمُ کہا ہے جیسے مُتَّ تَمُوْتُ دَوَّمَتِ الشَّمْسُ فِی کَبِدِ السَّمَآءِ: وسط آسمان میں سورج ٹھہر گیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۵۹) وَالشَّمْسُ حَیْرٰی لَهَا فِی الْجَوِّ تَدْوِیْمُ:

سورج حیران پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا ہے۔

دَوَّمَ الطَّیْرُ فِی الْهَوَاءِ پرند فضا میں منڈلایا۔

اِسْتَدَمْتُ الْاَمْرَ: میں نے اس پر دیر تک غور و فکر کیا۔

اَلظِّلُّ الدُّوْمُ: (دَائِمٌ) ہمیشہ رہنے والا سایہ۔

اَلدِّیْمَةُ: بارش جو لگا تار کئی روز تک برستی رہے۔

(د و ن)

اَلدُّوْنَ: جو کسی چیز سے قاصر اور کوتاہ ہو وہ "دون" کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے اور اَلْاَدْوَنُ بمعنی دَنِیْءٌ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ﴾ (۳۔۱۱۸) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان لوگوں کو راز دار مت بناؤ جو دیانت میں تمہارے ہم مرتبہ (یعنی مسلمان) نہیں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جو قرابت میں تم سے نیچے ہیں۔ یعنی تمہارا ان سے تعلق نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ﴾ (۴۔۴۰) اور اس کے سوا اور گناہ.........معاف کردے۔

میں مَادُوْنَ سے وہ گناہ مراد ہیں جو شرک سے کم درجہ کے ہیں یا وہ جو شرک کے علاوہ ہیں۔ اور یہ دونوں معنیٰ ایک دوسرے کے لازم ملزوم ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۵۔۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو۔ میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے معنیٰ غَیْرُ اللّٰهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم دونوں کو معبود بنا لو۔ بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ دو معبود جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ﴾ (۶۔۱۵) اس کے سوا نہ تو ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔ اور نیز آیت:

﴿وَمَالَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾ (۲۔۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی مدد کر سکے اور یہی معنیٰ آیت کریمہ: ﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا﴾ (۶۔۷۱) کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے نہ برا۔

---

❶ قاله ذوالرمة فی میمیته یصف جندباً الذی یصیح فی حرالشمس واوله: معروریاً رمض الرضراض یرکضه ۔ والبیت فی اللسان (دوم) والاقتضاب ۱۵۹ والبحر (۲: ۴۹۸) والمحاضرات للمؤلف ۵۴۹ والمعانی الکبیر ۶۱۱ دیوانه ۵۷۸ ابو الطیب فی اضداده (۲۶۷).

میں مراد ہیں کہ دُوْنَ میں ایک لغت دَون (بفتح الدال) بھی ہے کہا جاتا ہے کہ دَوْنَكَ كَذَا: یعنی یہ پکڑلو۔قتیبی نے کہا ہے کہ دَانَ يَدُوْنُ دَوْنًا کے معنیٰ کمزور ہونے کے ہیں۔ ❶

(د ی ن)

دِنْتُ الرَّجُلَ کے معنیٰ قرض لینے اور اَدَنْتُهٗ کے معنیٰ ہیں کہ میں نے اُسے دائن بنادیا یعنی قرض دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ کے معنیٰ اَقْرَضْتُهٗ یعنی قرض دینا کے ہیں۔اور مقروض کو مَدِيْنٌ وَمَدْيُوْنٌ کہا جاتا ہے دِنْتُهٗ کے معنیٰ قرض لینا بھی آتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۱۶۰) نَدِيْنُ وَيَقْضِي اللّٰهُ عَنَّا وَقَدْ نَرٰى
مَصَارِعَ قَوْمٍ لَّا يَدِيْنُوْنَ ضُيَّعًا

ہم قرض لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس قرض کو ادا کردیتا ہے اور جو لوگ قرض نہیں لیتے ان کی قبریں ضائع ہونے والی دیکھتے ہیں اور اَدَنْتُ دِنْتُ کی طرح ہے یعنی اس کے معنیٰ قرض لینا کے ہیں اور اَدَنْتُ کے معنیٰ قرض دینا بھی ہیں۔

اَلتَّدَايُنُ وَالْمُدَايَنَةُ: قرض کا معاملہ کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ﴾ (۴۔۱۲) (یہ حصے بھی) بعد ادائے وصیت وقرض۔

اَلدِّيْنُ کے معنیٰ طاعت اور جزا کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنیٰ شریعت بھی آتا ہے۔اور دین ملّت کی طرح ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (۳۔۱۹) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ (۴۔۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہوگئے۔اور آیت کریمہ:

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ (۵۔۷۷) اے اہل کتاب! اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو۔

میں آنحضرت کے دین یعنی اسلام کی اتباع پر ترغیب پائی جاتی ہے جو تمام ادیان سے معتدل دین ہے اور افراط وتفریط سے پاک ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (۲۔۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (۲۔۲۵۶) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔

میں بعض نے دین کے معنیٰ طاعت کیے ہیں۔ کیونکہ طاعت حقیقت میں وہی ہے جو مبنی بر اخلاص ہو اور

---

❶ قال في الصحاح ولا يشتق منه فعل وبعضهم يقول منه: دان يدون دونًا راجع ايضاً اللسان (دون).

❷ وفي اللسان ضُيَّع بالخفض على الصفة للقوم والبيت للعجير السلولي (قبله): فعد صاحب اللحام سيفاتبيعه ـ وزدد رهمًا فوق المغالين واخنع۔ والبيت في الصحاح (دين) وفي روايته ايضاً ضَيَّعًا وقال ابن برى: صوابه ضيع بالخفض على الصفة (لقوم).

اخلاص کی صورت میں اکراہ وجبر کیسے ہوسکتا ہے بعض نے کہا ہے کہ عدم جبر کا حکم ان اہل کتاب کے ساتھ مختص ہے جو جزیہ ادا کریں۔اور آیت کریمہ:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ (۳۔۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟

میں دِيْنِ اللّٰهِ سے دین اسلام مراد ہے۔کیونکہ (قرآن پاک نے) دوسری آیت میں تصریح فرمادی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (۳۔۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہ معنیٰ مراد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (۹۔۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔

﴿وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ﴾ (۹۔۲۹) اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَلَوْلَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ﴾ (۵۶۔۸۶) میں غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ کے معنیٰ غَيْرَ مَجْزِيِّيْنَ کے ہیں۔یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا نہیں دی جائے گی۔

اَلْمَدِيْنُ وَالْمَدِيْنَةُ: (ایضاً) کے معنیٰ غلام اور لونڈی کے بھی آتے ہیں۔ابوزید نے کہا ہے [1] کہ دُيِّنَ فُلَانٌ يُدَانُ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ کسی ناپسند کام پر مجبور کیے جانے کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ طاعت کی جزا دینے کے ہیں بعض نے لفظ مَدِيْنَة (شہر) بھی اسی معنیٰ سے لیا ہے۔

❀❀❀

[1] ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری وحده من الصحابة باشديد العناية لجمع اللغات واللمحات توفی ۲۱۴ھ وقد قارب المأة كان من تلامذة عمرو بن العلاء و زليزيدي كان رفيقه في الدرس راجع لاحواله (بشد)۱۲۔

كِتَابُ الذَّال

(ذ ی ب)

اَلذِّئْبُ: کے معنیٰ بھیڑیا کے ہیں اصل میں یہ ذِئْبٌ یعنی مہموز ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ﴾ (۱۲۔۷) تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اَرْضٌ مَذْءَبَةٌ: بہت بھیڑیوں والی سرزمین۔

ذِئِبَ فُلَانٌ۔ درگوسپنداں وے گرگ افتاد۔

تَذَاءَبَتِ الرِّيْحُ: ہوا ہر طرف سے چلی۔ یہ بھیڑیئے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءَبَتِ الرِّيْحُ: ہوا ہر طرف سے چلی یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءَبْتُ لِلنَّاقَةِ: اونٹنی کو بچے پر مہربان کرنے کیلئے بھیڑیئے کا روپ دھار لینا اور ہیئت کذائی میں مشابہت کے پیش نظر پالان کے پہلوؤں کے درمیان کی کشادگی کو ذِئْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ذ ی م)

ذَأَمَهُ يَذْءَمُهُ ذَأْماً اور ذَمَّهُ (ن) ذَمًّا اور ذَامَهُ کے ایک ہی معنیٰ ہیں کسی کو حقیر اور مذموم گرداننا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۷۔۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل راندہ ہوا۔

(ذ ب ب)

اَلذُّبَابُ: کے معنیٰ مکھی کے ہیں اور یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑ وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ [1] (طویل)

(۱۶۱) فَهٰذَا اَوَانُ الْعِرْضِ حَيٌّ ذُبَابُهٗ
زَنَابِيْرُهٗ وَالْاَزْرَقُ الْمُتَلَمِّسُ

یہ وادی کے پر رونق ہونے کا موسم ہے اس کے زنابیر اور سبز مکھیاں خوب بھن بھنا رہی ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا﴾ (۲۲۔۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے میں ذباب کے معنیٰ مکھی کے ہیں۔

ذُبَابُ الْعَيْنِ: آنکھ کی پتلی۔ اسے ذُبَاب یا تو ہیئت میں تشبیہ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ آنکھ کی پتلی سے بھی مکھی کی طرح شعاعیں نکلتی ہیں۔ اور ایذا رسانی میں مکھی کے ساتھ تشبیہ دے کر تلوار کی دھار کو ذُبَابُ السَّيْفِ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح موذی شخص کو بھی ذُبَابٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

---

[1] قال المتلمس ولقب به بهذا البيت فی الحماسة (۲: ۱۰۲) والخزانة (۳: ۲۷۰) والاغانی (۲۱: ۲۰) والسمط ۲۵۰ والاقتضاب وديوانه رقم ٥ والسيوطی ۱۰٤،۱۷ والمختارات ۳۳ والمحكم (عرض) والحيوان (۳: ۳۹۱) والمعانی الكبير للقتبی وفی روايته وذاك بدل فهذا والمرزوقی ٦٦٢ وفی روايته حن ذبابه بدل حی ذبابه والمتلمس شاعر جاهلی اسمه جرير بن عبد المسيح الضبعی راجع لترجمته السيوطی ۱۰۲۔۱۰٤ والاغانی (۲۱: ۱۲۷: ۱۳۵) والخزانة (۱: ٤٧٦) والشعراء (۱۳۱۔۱۳٦).

ذَبَّبَ عَنْ فُلَانٍ: کسی سے مکھی کو دور ہٹانا۔
اَلْمِذَبَّةُ: مورچھل، مکھیاں اڑانے کا آلہ۔
استعارہ کے طور پر ذَبٌّ کا لفظ ہر چیز کے دفع کرنے پر بولا جاتا ہے۔مثلاً کہا جاتا ہے:
ذَبَّبْتُ عَنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے مکھیوں کو دور ہٹایا۔ذُبَّ الْبَعِيْرُ: اونٹ کی ناک میں مکھی داخل ہوگئی۔
یہ بھی بیماری کے دوسرے صیغوں کی طرح (جیسے زُكِمَ وغیرہ) فعل مجہول استعمال ہوتا ہے۔
بَعِيْرٌ مَذْبُوبٌ وَذُبَّ جِسْمُهٗ: اونٹ دبلا ہوکر مکھی یا تلوار کی دھار کی طرح ہوگیا۔
اَلذَّبْذَبَةُ: اصل میں معلق چیز کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذَالِكَ﴾ (۴۔۱۴۳) بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں۔
یعنی وہ ہمیشہ مضطرب سے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی کفار کی طرف۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۱٦۲) تَرىٰ كُلَّ مُلْكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

کہ اس کی سلطنت کے ورے ہر ایک سلطنت مضطرب نظر آتی ہے۔
ذَبَّبْنَا اِبِلَنَا: ہم نے اونٹوں کو سخت ہنکایا۔شاعر نے کہا ہے۔[2] (متقارب)

(۱٦۳) يُذَبِّبُ وَرْدٌ عَلىٰ اِثْرِهٖ

کہ وَرْد اس کے پیچھے سخت دوڑ رہا تھا۔

(ذ ب ح)

الذَّبْحُ: (ف) اصل میں اس کے معنیٰ حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذِبْحٌ بمعنیٰ مَذْبُوحٌ آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ (۲۷۔۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کا ان کو فدیہ دیا۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً﴾ (۲۔٦۷) کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔
ذَبَحْتُ الْفَارَةَ: میں نے نافہ مشک کو چیرا۔یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔اسی طرح ذَبَحَ الدَّنَّ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ مٹکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ﴾ (۲۔۴۹) تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے۔
میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔
سَعْدُ الذَّابِحِ: (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے۔اور سیلاب کے گڑھوں کو مَذَابِحُ کہا جاتا ہے۔

(ذ خ ر)

اَلادِّخَارُ: (افتعال) اصل میں اِذْتِخَارٌ تھا۔کہا جاتا ہے:

---

[1] قاله النابغة فی قصیدة یمدح فیها النعمان بن المنذر واوله: الم تر ان الله اعطاك سورة وسیأتی فی (سور).

[2] وتمامه: و ادرکه وقع مردی خشب والبیت لغنترة بن مشداد والعبسی ابو المغلس راجع المرزوقی ۱۴۴ وفی روایة المختار الجاهلی ۱: ۳۱۰ والعقد الثمین ۳۵ تذائب بدل یذیب ومردبدل مردی والبیت فی اللسان (خشب) والمعانی ۱۸۲۰.

ذَخَرْتُهٗ وَادَّخَرْتُهٗ: (مستقبل کے لئے ذخیرہ جمع کرنا) ایک روایت میں ہے۔ ❶

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ لَا یَدَّخِرُ لِغَدٍ کہ آنحضرت ﷺ کل کے لئے کوئی چیز جمع نہ کرتے تھے۔

اَلْمَذَاخِرُ: پیٹ اور انتڑیاں جن میں طعام کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطویل)

(۱۶۴) فَلَمَّا سَقَیْنَاھَا الْعَکِیْسَ تَمَلَّأَتْ
مَذَاخِرُھَا وَامْتَدَّ رَشْحًا وَرِیْدُھَا

جب ہم نے اس عکیس یعنی شوربے میں ملا ہوا دودھ پلایا تو اس کا پیٹ بھر گیا اور رگیں پھول کر پسینہ بہنے لگا۔

اَلْاِذْخِرُ: ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔

(ذ ر ر)

اَلذُّرِّیَّۃُ: نسل، اولاد۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (۲۔۱۲۴) اور میری اولاد میں سے بھی۔

﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ﴾ (۲۔۱۲۸) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بناتے رہیو۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ﴾ (۴۔۴۰) خدا کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔

اور کہا گیا ہے کہ ذُرِّیَّۃٌ اصل میں مہموز اللام ہے اور (ذرء) میں اس پر بحث آرہی ہے۔

(ذ ر ی)

اَلذَّرْءُ کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا۔کہا جاتا ہے:

ذَرَءَ اللّٰہُ الْخَلْقَ: یعنی ان کے اشخاص کو موجود کیا قرآن میں ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَءْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۷۔۱۷۹)

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کیے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ ذَرَءْنَا لِجَھَنَّمَ مِمَّا ذَرَءَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا﴾ (۶۔۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں (یعنی) کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَّذْرَؤُکُمْ فِیْہِ﴾ (۴۲۔۱۱) اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی طریق پر تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔

اور ﴿تَذْرُوْہُ الرِّیٰحُ﴾ (۱۸۔۴۵) میں ایک قرأت

---

❶ رواہ الترمذی عن انس مسندًا وعن ثابت مرسلاً وتاویل الحدیث ای لنفسہ فلاینافی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحبس لاھلہ قوت سنتھم والحدیث رواہ ابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۵۵۰۔۲۱۳۹ قال المناوی فی شرح الجامع الصغیر اسنادہ جید وفی الترمذی غریب (راجع التحفۃ ج (۳ص ۲۷۲).

❷ وفی اللسان (مدح) قالہ الراعی ابومنصور الاسدی یصف فرساً والصواب انہ للراعی النمیری یصف امْرَءَۃً وھی ام خنزر بن ارقم وکان بینہ وبین خنزر ھجاء فَھجاہ بکون امہ تطرقہ وتطلب من القریٰ ویدل علیہ ماقبلہ: فلماعرفنا انھا ام خنزر۔حناھا موالیھا وغاب مفیدھا الی آخر ماقال ثلاثۃ ابیات اللسان (مدح) والصحاح (مدح، ذخر) وتھذیب الالفاظ ۶۴۰ مع آخر والحماسۃ لابی تمام بالتبریزی (۴: ۳۹) والمعانی للقتبی ۳۸۴ والمحکم (عکس مدح) ومشاھد الانصاف ۱۳۷ وفی روایۃ البیت اختلاف ففی روایۃ تمدحت بدل تملأت کمافی الصحاح واللسان وخواصرھا بدل نداخرھا وازداد بدل امتد ۱۲.

تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ بھی ہے۔ ❶

اَلذَّرْءَةُ: بڑھاپے یا نمک کی سفیدی۔

کہا جاتا ہے کہ مِلْحٌ ذَرْاٰنِیٌّ: نہایت سفید نمک ❷ اور جس کے بال سفید ہو جائیں اسے رَجُلٌ اَذْرَءُ کہا جاتا ہے۔ اس کی مؤنث ذَرْآءُ ہے۔

ذَرِئَ شَعْرُهٗ (وَذَرَءَ کفرح ومنع) اس کے بال سفید ہوگئے۔

(ذ ر ع)

اَلذِّرَاعُ: ہاتھ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک) کبھی ذِراع کا لفظ بول کر مَذْرُوْع یعنی وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جس کی پیائش کی گئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ (۶۹۔۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔

اور ذِرَاعٌ مِّنَ الثَّوبِ وَذِرَاعٌ مِّنَ الْاَرْضِ وغیرہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور حیوان کے بازو کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک ستارے کو بھی ذِرَاعُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔

ذِرَاعُ الْعَامِلِ: نیزے کا اگلا حصہ محاورہ ہے۔

هٰذا عَلٰی حبْلِ ذِرَاعِكَ: یہ تیرے اختیار میں ہے جیسا کہ هُوَ فِیْ كَفِّكَ کا محاورہ ہے

ضَاقَ بِكَذَا ذِرَاعِیْ: یعنی میں اس سے عاجز ہوں۔ ❸ جیسا کہ ضَاقَتْ بِهٖ يَدِیْ محاورہ ہے۔

ذَرَعْتُهٗ: (۱) بازو پر مارنا۔ اور ذَرَعْتُ کے معنیٰ (۲) بازو پھیلانا بھی آتے ہیں اور اسی سے ذَرَعَ الْبَعِيْرُ فِی سَيْرِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے بازو پھیلا کر چلنے کے ہیں۔ (تیز چلنا) فَرَسٌ ذَرِيْعٌ وَذَرُوْعٌ۔ کشادہ قدم گھوڑا (تیز رو) مُذَرَّعٌ (سفید بازو والا گھوڑا یا بیل) اور زِقٌّ ذِرَاعٌ کے معنیٰ بعض کے نزدیک بڑی مشک کے ہیں اور بعض کے نزدیک چھوٹی مشک کو کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں بازوؤں والی مشک کو کہتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں بغیر بازو مشک کے یعنی جس کے بازو کاٹ دیئے گئے ہوں۔

محاورہ ہے کہ ذَرَعَةُ الْقَیْءُ اس پر قے غالب آگئی ذَرَعَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا کشادہ قدم چلنا۔

تَذَرَّعَتِ الْمَرْأَةُ الْخُوْصَ: عورت کا ٹوکری وغیرہ بنانے کے لئے کھجور کی شاخوں کو کاٹنا۔ اسی سے تشبیہ کے طور پر تَذَرَّعَ فِیْ كَلَامِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کلام میں تیزی کرنے کے ہیں جیسا کہ سَفْسَفَ فِیْ كَلَامِهٖ (لغوگوئی کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جو اصل میں سَفِيْفُ الْخُوصِ کھجور کے پتوں کی ٹوکری) سے ماخوذ ہے۔

(ذ ر و)

ذِرْوَةُ السَّنَامِ وَذُرَأُهٗ: کوہان کا بلند حصہ۔ اسی سے محاورہ ہے اَنَا فِیْ ذُرَاكَ میں تیری جناب میں

---

❶ قرأة شاذة وفي حرف ابن مسعود تذريه الرياح وايضاً تذريه فهذه ثلاث ذكرها اصحاب التفاسير (راجع الطبري والشوكاني).

❷ وفي المعاجم بفتح الراء وسكونها.

❸ وفي التنزيل: وضاق بهم ذرعاً (۱۱۔۷۷).

باعزت ہوں ❶ (میں تیری پناہ میں ہوں) اَلْمِذْرَاوَان: سرین کے دونوں کنارے (وَلا وَاحِدَ لَہ) ❷

ذَرَتْہُ الرِّیْحُ تَذْرُوْہُ وَ تَذْرِیہِ: ہوا کا کسی چیز کو بکھیر دینا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا﴾ (۵۱-۱) کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

اَلذُّرِّیَّۃُ کے اصل معنیٰ چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں مطلق اولاد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذُرِّیَّۃً بَعْضُھَا مِنْ بَعْضٍ﴾ (۳-۳۴) ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔

﴿ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ (۱۷-۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔

﴿وَاٰیَۃٌ لَّھُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَھُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۳۶-۴۱) اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (۲-۱۲۴) میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا انہوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد سے بھی۔

ذُرِّیَّۃٌ کے اصل میں تین اقوال ہیں۔

(۱) بعض نے کہا ہے کہ یہ ذَرَءَ اللّٰہُ الْخَلْقَ سے ہے یعنی اصل میں مہموز اللام ہے مگر کثرت استعمال کے سبب دُوِّیَّۃٌ وَبَرِیَّۃٌ کی طرح ہمزہ کو ترک کردیا گیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں ذُرْوِیَّۃٌ بروزن فُعْلِیَّۃٌ تھا اور ذَرٌّ سے مشتق ہے۔جیسے قُرِّیَّۃٌ قَرٌّ سے۔

(۳) ابوالقاسم البلخی کہتے ہیں: ❹ کہ آیت کریمہ: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ﴾ (۷-۱۷۹) اور ہم نے...... جہنم کے لئے پیدا کیے۔

میں ذَرَاْنَا ذَرَیْتُ الْحِنْطَۃَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ گندم کو اَساوَن کرنے کے ہیں گویا وہ اسے بھی مہموز نہیں سمجھتے۔❺

(ذ ع ن)

اَلْاِذْعَانُ: (افعال) کے معنیٰ کسی کا مطیع اور منقاد ہوجانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿یَاْتُوْا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ﴾ (۲۴-۴۹) تو ان کی طرف مطیع ہو کر چلے آتے۔

نَاقَۃٌ مِذْعَانٌ: سوار کی مطیع اور فرمانبردار اونٹنی۔

---

❶ والمعروف بفتح الذال ای فی ظلك و کنفك.

❷ راجع الامالی ج (۱ ص ۱۹۹).

❸ وفی اشتقاقه اختلاف ذکره اصحاب المعاجم فی (ذرر) وفی (ذرء) وفی (ذرو).

❹ ابو القاسم البلخی عبدالله بن احمد الحنفی المعروف بالکعبی احد شیوخ المعتزلة وراس طائفة فیهم یقال لهم الکعبیة وفی النحل للشهرستانی (۱: ۳۷) وکان تلمیذاً لابی الحسین الخیاط المعتزلی ومذهبه وفی کشف الظنون (۱: ۲۳۴) وابن الندیم ۱۵۷ انه الف تفسیراً کبیراً فی اثنی عشر جلداً توفی رحمه الله فی سنة ۳۱۷،۳۱۹ راجع لترجمه لسان المیزان ۳: ۲۵۵ وابن خلکان ۱: ۲۵۲

❺ لان المهموز معناه یخالف الاعتزال فتجهم وتلوی راجع الکشاف ۱۲.

(ذ ق ن)

ذَقَن: ٹھوڑی۔ اس کی جمع اَذْقَانٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ﴾ (۱۸۔۱۰۹) اور ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں۔

ذَقَنْتُهٗ میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔

نَاقَةٌ زَقُوْنٌ: وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے پر چلتی ہو۔ ❶ پھر تشبیہ کے طور پر ڈول کو جو ایک جانب مائل ہوا سے بھی دَلْوٌ ذَقُوْقٌ کہہ دیتے ہیں۔ ❷

(ذ ک ر)

اَلذِّكْرُ: یہ کبھی تو اس ہیئت نفسانیہ پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قریباً حفظ کے ہم معنیٰ ہے مگر حفظ کا لفظ احراز کے لحاظ سے بولا جاتا ہے اور ذِکْرٌ کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔ اور کبھی "ذِکْرٌ" کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ "ذِکْرٌ" دو قسم پر ہے۔ ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو قسم پر ہے نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا:

﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيْهِ ذِكْرُكُمْ﴾ (۲۱۔۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔

﴿وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ﴾ (۲۱۔۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔

﴿وَهٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مِنْ قَبْلِيْ﴾ (۲۱۔۲۴) یہ میری اور میرے ساتھ والوں کی کتاب ہے اور مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا﴾ (۳۸۔۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔

میں ذکر سے مراد قرآن پاک ہے۔ نیز فرمایا:

﴿صٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (۳۸۔۱) ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ (۴۳۔۴۴) اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے۔

میں ذکر بمعنیٰ شرف ہے یعنی یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے باعث شرف ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ (۱۶۔۴۳) تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔

میں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا﴾ (۶۵۔۱۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت (کی کتاب) اور اپنے پیغمبر (بھی بھیجے) ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلذِّكْرُ آنحضرت ﷺ کا وصف ہے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وصف میں كَلِمَة کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کو اَلذِّکر اس لحاظ

---

❶ وفي الصحاح ترخي ذقنها في السير وفي الاساس تمدخطاها وتحرك رأسها قوة ونشاطافي السير ١٢۔

❷ وفي الصحاح والمحيط اذا حرزتها فحالت شفتها مائلة (التاج) ١٢۔

سے کہا گیا ہے۔ کہ کتب سابقہ میں آپ ﷺ کے متعلق خوش خبری پائی جاتی تھی۔ اس قول کی بنا پر رَسُوْلًا ذِكْرًا سے بدل واقع ہوگا۔ ❶ بعض کے نزدیک رَسُوْلًا پر نصب ذِكْرٌ کی وجہ سے ہے گویا آیت یوں ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا ذِكْرًا رَسُوْلًا یَتْلُوا﴾ ❷ جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَتِیْمًا﴾ (۹۰-۱۴) میں یَتِیْمًا اِطْعَامٌ کی وجہ سے منصوب ہے اور نسیان کے بعد ذکر کے متعلق فرمایا:

﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ (۱۸-۶۳) تو میں مچھلی (وہیں) بھول گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

اور ذکر قلبی اور لسانی دونوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (۲-۲۰۰) تو (منیٰ میں) خدا کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ (۲-۱۹۸) تو مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (۲۱-۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

میں اَلذِّکْر سے کتب سابقہ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ (۷۶-۱) انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔

میں شَیْئًا مَّذْكُوْرًا کے معنی یہ ہیں کہ بذات خود اس کا وجود نہ تھا اگرچہ علم الٰہی میں اس وقت بھی موجود تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَوَلَا یَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۹-۶۷) کیا (ایسا) انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا۔

کے معنی یہ ہیں کہ حشر ونشر کے منکر کو اپنی پہلی پیدائش یاد نہیں ہے جس سے وہ دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال کر سکتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۳۶-۷۹)

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ﴾ (۳۰-۲۷)

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (۲۹-۴۵) اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔

کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنا بندے کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے بڑھ کر ہے۔ گویا اس میں کثرت سے ذکر الٰہی کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اَلذِّكْرٰی: کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں "اَلذِّکر" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (۳۸-۴۳) (یہ) ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے

---

❶ علی سبیل المبالغة او علی حذف مضاف من الاول تقدیرہ: انزل ذاذکر رسولا (فتح القدیر ۵: ۲۴۶-۲۴۷)۔

❷ قالہ ابوعلی الفارسی لان المصدر المنون یعمل (السابق) فالمراد بالذکر القران راجع الطبری ۱۲۔

لئے نصیحت ہے۔

﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۵۱۔۵۵) اور نصیحت کرتے رہو کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔

اسی طرح بہت سی آیات میں ذِکرٰی کا لفظ آیا ہے۔

اَلتَّذْكِرَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کو یاد دلایا جائے۔اور یہ دلالت اور امارت سے اعم ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ﴾ (۷۴۔۴۹) ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔

﴿كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾ (۸۰۔۱۱) دیکھو یہ قرآن نصیحت ہے۔مراد قرآن پاک ہے۔

ذَكَرْتُهٗ كَذَا: کسی کو کچھ یاد دلانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ﴾ (۱۴۔۵) اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (۲۔۲۸۲) تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنا دے گی بعض علماء نے آیت کریمہ:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ﴾ (۲۔۱۵۲) سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

اور ﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ﴾ (۲۔۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو۔میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اُذْكُرُوْنِيْ کے مخاطب آنحضرت ﷺ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس کے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور و فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

اَلذَّكَرُ: یہ اُنْثٰى (مادہ) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ (۳۔۳۶) اور (نذر کے لئے) لڑکا (موزوں تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا۔

﴿ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۴) کہ (اللہ تعالیٰ نے) دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو۔

ذَكَرٌ کی جمع ذُكُوْرٌ وَذُكْرَانٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا﴾ (۴۲۔۵۰)...... بیٹے اور بیٹیاں۔

اور ذَكَرٌ کا لفظ بطور کنایہ عضو تناسل پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور جو عورت نرینہ بچہ دے اسے مُذْكِرٌ کہا جاتا ہے۔مگر اَلمِذْكَارُ وہ ہے جس کی عادت نرینہ اولاد کو جنم دینا ہو۔

نَاقَةٌ مُذَكَّرَةٌ: وہ اونٹنی جو عظمت جثہ میں اونٹ کے مشابہ ہو۔

سَيْفٌ ذُوْذُكْرٍ وَّمُذَكَّرٍ: آبدار اور تیز تلوا صارم ذُكُوْرُ الْبَقَلِ: وہ ترکاریاں جو لمبی اور سخت ہوں۔

(ذ ک و)

ذَكَتِ (ن) النَّارُ کے معنیٰ آگ جلنے اور روشن ہونے کے ہیں اور ذَكَّيْتُهَا (تفعیل) کے معنیٰ جلانے اور روشن کرنے کے ہیں۔ذُكَآءُ: سورج اور فجر کو سورج کا بیٹا تصور کر کے اسے اِبْنُ ذُكَاءَ: کہا جاتا ہے اور اس کا

حاجب اور دربان تصور کر کے اسے حَاجِبُ الشَّمْسِ کہہ دیتے ہیں۔

اور بطور کنایہ ذُکَاءٌ کے معنی ذہانت اور زود فہمی کے بھی آتے ہیں۔جیسا کہ فُلَانٌ هُوَ شُعْلَةُ نَارٍ۔کا محاورہ ہے کہ فلاں آتش کا پرکالا ہے۔ذَكَّيتُ الشَّاةَ: بھیڑ ذبح کرنا۔

اصل میں تَذْكِيَةٌ (تفعیل) کے معنی حرارت غریزی خارج کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاۃ زائل کرنے کو تذکیۃ کہتے ہیں۔❶ اس اشتقاق کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ میت کو خَامِدٌ اور هَامِدٌ کہا جاتا ہے۔اور دوسری طرف بجھی ہوئی آگ کو مَيْتَةٌ کہا جاتا ہے۔

ذَكِيَ الرَّجُلُ: جب کوئی شخص سن رسیدہ ہو کر کثرت تجارب کی بنا پر ذکاوت اور فہم سے بہرہ مند ہو جائے تو اس کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اس اشتقاق کے اعتبار سے صرف اسی عمر رسیدہ کو مُذَكّی کہا جائے گا جو کار آزمودہ ور یاضت چشیدہ ہو اور پھر تجارب اور ریاضت عام طور پر چونکہ عمر رسیدہ آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں ذکاوت کا لفظ استعمال ہوا تو اس مناسبت سے عمدہ اور عمر رسیدہ گھوڑوں کے متعلق بھی ذُکَاء کا لفظ بولا جانے لگا چنانچہ محاورہ ہے: جَرْيُ الْمُذْكِيَاتِ غِلَابٌ: کہ بوڑھے گھوڑے دوڑ میں غالب رہتے ہیں۔❷

(ذ ل ل)

اَلذُّلُّ: (ن) یہ ذَلَّ يَذُلُّ کا مصدر ہے اور ذُلٌّ (بضمہ ذال) زور وقہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذِلٌّ (بکسرۂ ذال) کہا جاتا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (۱۷-۲۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور و مجبور بن کر رہو۔اور ایک قرأت میں جَنَاحَ الذِّلِّ (بکسرۂ ذال) ہے۔❸ یعنی ان کے سامنے نرم خو اور طاعت کیش بن کر رہا کرو۔بغیر تاء کے ذُلٌّ اور تاء کے ساتھ ذِلَّةٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ قُلٌّ اور قِلَّةٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ (۱۰-۲۷) اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (۲-۶۱) اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (وبے توانائی) ان سے چمٹا دی گئی۔

﴿سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ﴾ (۷-۱۵۲) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور ذلت (نصیب ہوگی)

ذَلَّتِ الدَّابَّةُ ذُلًا منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہو جانا اور اس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کو ذَلُولٌ (صفت

---

❶ ای فی التنزیل الاما ذکیتم ای الاان تذبحوا.

❷ المثل لقیس بن زهیر العبسی ویضرب عن یوصف بالتبریز علی اقرانه فی حلبة الفضل راجع للمثل اللسان (ذکی) والمیدانی رقم ۸۲۱) وجمهرة الامثال ۷۸ والمشکل للقتبی ٦٥ وسمط اللا لی ۵۸۳ قال المیمنی فی طرته ویروی غلاء والمثل فی الکامل ۲۱۹ والمستقصی والثمار ۲۸۵ والعسکری ۱۰۷۷:۳۰۳ والنریری ۳:۲۳.

❸ وهی قرائة ابن عباس وعروة بن جبیر وغیرهما وبالضم قرأة الجمهور (ابو حیان ٦:۲۸ وابن الانباری ۴۷۳).

فاعلی) کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ﴾ (۲۔۷۱) کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو۔نہ تو زمین جوتتا ہو۔
پھر اگر انسان کی ذلت خود اس کے اپنے اختیار وارادہ سے ہو تو وہ محمود سمجھی جاتی ہے جیسا کہ قرآن پاک نے مؤمنین کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:
﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۔۵۴) جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں۔
﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (۳۔۱۲۳) اور خدا نے جنگِ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت بھی تو تم بے سروسامان تھے۔
﴿فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ (۱۶۔۶۹) یعنی بغیر کسی قسم کی سرکشی کے نہایت مطیع اور منقاد ہوکر اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔اور آیت کریمہ:
﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا﴾ (۷۶۔۱۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ گچھے اس طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔کہ ان کو نہایت آسانی سے توڑ سکیں گے۔
محاورہ ہے: مثل۔
اَلْأُمُورُ تَجْرِي عَلٰی أَذْلَالِهَا: کہ تمام امور اپنے راستوں پر اور حسب مواقع جاری ہیں۔

(ذ م م)

ذَمَّهٗ (ن) ذَمًّا کے معنیٰ مذمت کرنے کے ہیں۔
اس سے صیغۂ صفت مفعولی مَذْمُومٌ وَّ ذَمِيمٌ آتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿مَذْمُومًا مَّدْحُورًا﴾ (۱۷۔۱۸) نفرین سنکر اور (درگاہِ خدا سے) راندہ ہوکر۔
اور بعض ذَمَمْتُهٗ صیغۂ واحد متکلم میں دوسری میم کو تاء سے بدل کر ذَمَتُّهٗ بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلذِّمَامُ: وہ عہد وغیرہ جس کا ضائع کرنا باعث مذمت ہو۔یہی معنیٰ ذِمَّةٌ وَمَذِمَّةٌ کے ہیں۔کہا گیا ہے لِي مَذَمَّةٌ فَلَا تَهْتِكْهَا کہ میرے عہد یا حرمت کا پاس کیجئے توڑیئے نہیں۔
اَذْهِبْ مَذَمَّتَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کے حق احترام کا بدلہ اتاریئے۔
اَذَمَّ بِكَذَا: اس کی حرکت کو ضائع کردیا۔تہاون سے کام لیا۔رَجُلٌ مِذَمٌّ: بےحس وحرکت [1] بِئْرٌ ذَمَّةٌ: کم پانی والا کنواں [2] چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سا مادہ جو ناک پر ظاہر ہوجاتا ہے اسے اَلذَّمِيمُ کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔[3]

(۱٦۵) وَتَرَى الذَّمِيمَ عَلٰی مَرَاسِنِهِمْ
يَوْمَ الْهِيَاجِ كَمَازِنِ النَّمْلِ

لڑائی کے دن ان کی ناک پر چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سی پھنسیاں نظر آتی ہیں۔

---

[1] ایضاً مُذِم ومُذَم (الصحاح).
[2] وجمعها ذمام.
[3] قاله الحاورة الذبیانی وفی روایة اللسان: کمازن الجثل وفی الجمهرة لابن درید غب العجاج اوغب الهیاج (۱۹) بدل یوم الهیاج وفی روایة الابدال لابی الطیب (۱: ۱۹٦) وتری الذفیق قال فی الصحاح الذمیم المخاط والبول الذی یذم ویذن من قضیب التیس الذمیم ایضاً شیء یخرج من سام المارن کبیض النمل وذهب ابن دریدالی ان الذمیم ههنا هو الندی۔ راجع للبیت اللسان والتاج (جثل، ذمم، مزن) والصحاح (ذمم) والمخصص (۲: ٥٦/٥: ٨٤) والاساس (رسن) ومبادی اللغة للاسکافی ٧٦.

(ذ ن ب)

ذَنَبُ الدَّآبَّةِ وَغَیْرِھَا: چوپایہ وغیرہ کی دم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق کم مرتبہ اور رذیل آدمی پر ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

ھُمْ اَذْنَابُ الْقَومِ: یعنی وہ رذیل ہیں اور اسی سے بطور استعارہ ٹیلوں میں پانی کے راستوں کو مَذَانِبُ التِّلاعِ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِذْنَبُ: (ایضاً) وہ کھجور جو پچھلی جانب سے پکنا شروع ہو۔

اَلذَّنُوبُ: لمبی دم والا گھوڑا۔ دم دار ڈول سَجْلٌ کی طرح بطور استعارہ ذَنُوبٌ کے معنیٰ بھی نصیبہ اور حصہ آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحَابِھِمْ﴾ (۵۲۔۵۹) کہ ان ظالموں کے لیے بھی (عذاب کی) نوبت مقرر ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کی نوبت مقرر تھی۔

اَلذَّنْبُ: (ض) کے اصل معنیٰ کسی چیز کی دم کو پکڑنا کے ہیں کہا جاتا ہے کہ ذَنَبْتُہٗ: میں نے اس کی دم پر مارا۔ دم کے اعتبار سے ہر اس فعل کو جس کا انجام برا ہو اسے ذَنْبٌ کہہ دیتے ہیں اسی بنا پر انجام کے اعتبار سے گناہ کو تَبِعَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ ذَنْبٌ کی جمع ذُنُوبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ﴾ (۳۔۱۱) تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا۔

﴿فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِہٖ﴾ (۲۹۔۴۰) تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔

﴿وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ (۳۔۱۳۵) اور اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ وَغَیْرُ ذٰلِکَ مِنَ الْاٰیَاتِ

(ذ ھ ب)

اَلذَّھَبُ: سونا۔ اسے ذَھَبَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ ذَھَبٌ: جو کان کے اندر زیادہ سونا دیکھ کر ششدر رہ جائے۔

شَیْءٌ مُذَھَّبٌ (او مُذْھَب) زراندودہ طلاء کی ہوئی چیز۔

کُمَیْتٌ مُّذَھَّبٌ (اَو مُذْھَبٌ) کمیت گھوڑا جس کی سرخی پر زردی غالب ہو۔ گویا وہ سنہری رنگ کا ہے۔

اَلذَّھَابُ (وَالذُّھُوْبُ) کے معنیٰ چلا جانے کے ہیں۔

ذَھَبَ (ف) بِالشَّیْءِ وَاَذْھَبَہٗ: لے جانا۔ یہ اعیان ومعانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ (۳۷۔۹۹) کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔

﴿فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱۔۷۴) جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرَاتٍ﴾ (۳۵۔۸) تو ان لوگوں پر افسوس کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے۔ میں ذَھَابِ نَفْس موت سے کنایہ ہے اور فرمایا:

﴿اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ (۱۴۔۱۹) اگر وہ چاہتے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا کر دے۔

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ (۳۵۔۳۴) وہ کہیں گے کہ خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُاللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ (۳۳۔۳۳) اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے۔

اورآیت: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ﴾ (۴۔۱۹) کے معنٰی یہ ہیں کہ تم ان کو اپنے گھروں میں اس لیے نہ روک رکھو کہ اس طرح مہر وغیرہ کی کچھ رقم ان سے واپس لو۔ اورفرمایا:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (۸۔۳۶) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا (ایسا کروگے تو) تم بزدل ہوجاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ (۲۔۱۷) تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کردی۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ﴾ (۲۔۲۰) اور اگر اللہ چاہتا توان کے کانوں (کی شنوائی)...... کو زائل کردیتا۔

﴿لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ﴾ (۱۱۔۱۰) تو (خوش ہوکر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہوگئیں۔

(ذ ھ ل)

اَلذُّهُوْلُ (ف): ایسی مشغولیت جوغم ونسیان کی موجب ہو۔ کہاجاتا ہے۔ ذَهَلَ عَنْ كَذَا: وہ اس سے غافل ہوگیا۔ اَذْهَلَهٗ كَذَا: فلاں چیز نے غافل کردیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ (۲۲۔۲) (اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی۔

(ذ و)

ذُوْ: (والا، صاحب) یہ دوطرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(ا) یہ کہ اسماء اجناس وانواع کے ساتھ توصیف کے لیے اُسے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع بھی آتا ہے۔ اور مؤنث کے لیے ذَاتُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ ذَوَاتَا اور جمع ذَوَاتٌ آتی ہے۔ اور یہ تمام الفاظ مضاف ہوکر استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ﴾ (۲۔۲۵۱) لیکن اللہ تعالیٰ اہل علم پر بڑا مہربان ہے۔

﴿ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى﴾ (۵۳۔۶) (یعنی جبرئیل علیہ السلام) طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿وَذِي الْقُرْبٰى﴾ (۲۔۸۳) اور رشتہ داروں۔

﴿وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ﴾ (۱۱۔۳) اور ہر صاحب فضل کو اس کی بزرگی (کی داد) دے گا۔

﴿ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى﴾ (۲۔۱۷۷) رشتہ داروں اور یتیموں۔

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (۱۱۔۵) وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (۱۸۔۱۸) اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلاتے ہیں۔

﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ (۸۔۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان وشوکت

(یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔

﴿ذَوَاتَـآ اَفْنَانٍ﴾ (۵۵۔۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں)۔علمائے معانی (منطق، فلسفہ) ذات کے لفظ کو بطور استعارہ عینِ شی کے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جوہر اور عرض بدونِ اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔اور کبھی اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوکر اور کبھی معرف باللام ہوکر۔اور یہ لفظ بمنزلہ نفس اور خاصہ کے بولا جاتا ہے۔اور نَـفْسُـــهٗ وَخَـاصَّتُهٗ کی طرح ذَاتُهٗ بھی کہا جاتا ہے۔مگر یہ عربی زبان کے محاورات سے نہیں ہے۔

(۲) بنی طیی ذُو بمعنیٰ اَلَّـــذِیْ استعمال کرتے ہیں اور یہ رفعی، نصبی، جری، جمع اور تانیث کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۱٦٦) وَبِئْرِیْ ذُو حَفَرْتُ وَذُوطَوَيْتُ

یعنی کنواں جسے میں نے کھودا اور صاف کیا ہے۔

(ذ ا)

ہاں "هٰـذَا" میں "ذا" کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے۔هٰـذَا وَهٰـذِیْ وَهَاتَا۔ان میں سے صرف هَـاتَا کا تثنیہ هَاتَانِ آتا ہے۔هٰذِهٖ اور هٰذِیْ کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَرَاَيْتَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ﴾ (۱۷۔۶۲) کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۳۸۔۵۳) یہ چیزیں ہیں جن کا ......تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

﴿هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۴) یہ وہی ہے جس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

﴿اِنْ هٰـذٰيـنِ لَسٰـحِرٰنِ﴾ (۲۰۔۶۳) کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

﴿هٰـذِهِ الـنَّـارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ﴾ (۵۲۔۱۴) یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (۵۵۔۴۳) یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

"هٰـذَا" کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔اس کے لیے ذَاکَ اور ذٰلِکَ استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿الٓمّٓ۝ ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ (۲۔۲،۱) الٓمّٓ یہ کتاب۔

﴿ذٰلِكَ مِـنْ اٰيـاتِ الـلّٰـهِ﴾ (۱۸۔۱۷) یہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّـمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰی﴾ (٦۔۱۳۱) یہ اس لیے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو...... ہلاک کردے۔

(ما ذا)

اور "مَاذا" بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے۔اول یہ "مَـا" ذَا کے ساتھ مل کر بمنزلہ ایک اسم کے ہو۔دوم یہ کہ ذَا بمنزلہ اَلَّذِیْ کے ہو (مَا بمعنیٰ ای شیء کے ہو)

---

[1] قـالـه سنان بن فحل الطائی حين اختصم الى عبدالرحمن بن الضحاك والی المدينة (۱۰۳۔۱۰٤) ايام يزيد بن عبدالملك والبيت من خمسة اوردها ابوتمام فی الحماسة رقم ۱۹۲ المرزوقی وقد عيب به علی المولف ايراده فی باب الحماسة (راجع شرح الحماسة امين الدين الطبری) وفی اللسان (زود) غير منسوب واماليی الشجريه (۲:۳۰٦) والخزانة (۲:۵۱۱) ۱۲.

پہلی قسم کی مثال جیسے:
عَمَّاذَا تَسأَلُ (کہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہو) اس صورت میں چونکہ "ذا" کے ساتھ مل کر ایک اسم بنتا ہے۔اس لیے "مَـا" کے الف کو حذف نہیں کیا گیا۔
اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۱٦۷) دعِـي مَاذَا عَلِمْتِ سأتَّقِيْهِ

یعنی جو چیز تجھے معلوم ہے اسے چھوڑ دے میں اس سے بچنے کی کوشش کروں گا۔اور آیت کریمہ: ﴿يَسْـئَـلُوْنَكَ مَـاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (۲-۲۱۹) اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں (کہ خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں۔
میں جولوگ قُلِ الْعَفْوَ میں اَلْعَفْوَ کو نصب پڑھتے ہیں۔ وہ "مَـاذَا" کو بمنزلہ ایک اسم کے مانتے ہیں یعنی کونسی چیز صرف کریں مگر جن کے نزدیک "العفو" مرفوع ہے ان کے نزدیک "ذا" بمعنیٰ اَلَّذِیْ ہے اور مَا استفہامیہ ہے اَیْ مَـا الَّـذِيْ يُـنْـفِـقُونَ یعنی وہ کونسی چیز ہے جسے خرچ کریں۔اس بنا پر آیت کریمہ:
﴿مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۱٦-۲۴) کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔
میں اَساطِيْر پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں۔ ❷

(ذ و د)

ذُدْتُهٗ: (ن) عَنْ كَذَا کے معنیٰ کسی چیز سے دفع کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَءَ تَيْنِ تَذُوْدَانِ﴾ (۲۸-۲۳) اور دیکھا ان کے ایک طرف دوعورتیں (اپنے مال کو) روکے کھڑی ہیں۔یعنی اپنے ذَوْدٌ کو روکے کھڑی ہیں۔اور ذَوْدٌ دس اونٹوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

(ذ و ق)

اَلذَّوْقُ: (ن) کے معنیٰ چکھنے کے ہیں۔اصل میں ذَوْقٌ کے معنیٰ تھوڑی چیز کھانے کے ہیں۔کیونکہ کسی چیز کو زیادہ مقدار میں کھانے پر اَكْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک نے عذاب کے متعلق ذوق کا لفظ اختیار کیا ہے اس لیے کہ عرف میں اگرچہ یہ قلیل چیز کھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر لغوی معنیٰ کے اعتبار سے اس میں معنیٰ کثرت کی صلاحیت موجود ہے۔لہٰذا معنیٰ عموم کے پیش نظر عذاب کے لیے یہ لفظ اختیار کیا ہے۔تاکہ قلیل وکثیر ہر قسم کے عذاب کو شامل ہوجائے قرآن پاک میں بالعموم یہ لفظ عذاب کے ساتھ آیا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (۴-۵۹) تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔
﴿وَقِيلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۳۲-۲۰) اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے مزے چکھو۔
﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ (٦-۳۰) اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے

❶ قاله المثقب العبدى عائذ بن محصن وتمامه : لئكن بالمغيب نبئيني ـ والبيت فى الخزانة (۲ : ٥٥٤) وابن هشام (۱ : ۳۳۳) والعينى (۱ : ٤۸۸) والسيوطى ٦۹ قال السيوطىُ اورده المؤلف في ماذا على انها موصول اوجنس بمعنىٰ اى شيء وعلمت ضبطه النحاس بكسر التاء والاخفش عن ابى اسحاق بضمها واللسان (ذو) ونسبه الى ابى حية النميرى والبحر ۱ : ۱۱۹ والكتاب ۱ : ٤٠٥ والشنتمرى بغير عزو۱۲.

❷ قارن المشكل للقتبى (۱۲٤-۱۲٥)۱۲.

مزے) چکھو۔

﴿ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ﴾ (۴۴۔۴۹) (اب) مزہ چکھو تو بڑی عزت والا (اور) سردار ہے۔

﴿اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ﴾ (۳۷۔۳۸) بے شک تم تکلیف دینے والے عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو۔

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ (۳۲۔۲۱) اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔

اور بعض مقامات پر رحمت کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۱۱۔۹) اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں۔

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ (۱۱۔۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور کبھی بطور استعارہ ابتلاء اور اختیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے اَذَقْتُهٗ كَذَا فَذَاقَ: میں نے اسے مزہ چکھایا چنانچہ اس نے چکھ لیا۔ فُلَانٌ ذَاقَ كَذَا وَاَنَا اَكَلْتُهٗ (مثل) فلاں نے تو اسے چکھا ہے اور میں کھا چکا ہوں یعنی میں نے اس سے زیادہ باخبر ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ (۱۶۔۱۱۲)

تو اللہ نے ان کے اعمال کے سبب انکو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھایا۔

میں لباس کے ساتھ ذوق کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس سے اختبار وابتلاء مراد ہے یعنی بھوک اور خوف سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ انکا تجربہ کرنے لگے بعض نے کہا ہے کہ یہاں دراصل دو جملے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہے اَذَاقَهَا طَعْمَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَهُمَا: یعنی انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا اور ان دونوں کو لباس اوڑھا دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۴۲۔۴۸) اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں۔

میں رَحْمَةً کے ساتھ اَذَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رحمة کے بالمقابل سَيِّئَة (یعنی سختی اور مصیبت) کے لیے اَصَابَ کا لفظ آتا ہے تو لفظ اَذَاقَ لاکر تنبیہ کی ہے کہ انسان ادنیٰ سی نعمت پاکر اترا جاتا ہے اور گھمنڈ کرنے لگ جاتا ہے اس سے آیت کریمہ:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ (۹۶۔۷۔۶) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

❀❀❀

کِتَابُ الرَّاءِ

(ر ب ب)

اَلـــرَّبُّ: (ن) کے اصل معنیٰ تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور رَبَّہٗ ، وَرَبَّاہٗ وَرَبَّبَہٗ تینوں ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ ❶ لَاَنْ یَـرُبَّـنِـیْ رَجُلٌ مِنْ قُرَیْشٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یُرَبِّنِیْ رَجُلٌ مِنْ هَـوَازِنَ: کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔ رَبٌّ کالفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنیٰ فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے:

﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ﴾ (۳۴۔۱۵) عمدہ شہر اور (آخرت میں) گناہ بخشنے والا پروردگار نیز فرمایا:

﴿وَلَا یَـأْمُـرُکُـمْ اَنْ تَتَّخِذُوْا الْمَلٰئِکَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَـــابًـا﴾ (۳۔۸۰) اور وہ تم سے (کبھی بھی) یہ نہیں کہے گا کہ فرشتوں اور انبیاء کرام کو خدا مانو (یعنی انہیں معبود بناؤ) اور مسبب الاسباب اور مصالح عباد کو کفیل سمجھو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۱۔۱) ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

﴿اَللّٰهَ رَبَّکُمْ رَبَّ اٰبَآءِ کُمُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۳۷۔۱۲۶) یعنی اللہ کو جو تمہارا (بھی) پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤاجداد کا بھی۔

رَبُّ الدَّارِ: گھر کا مالک رَبُّ الْـفَـرَسِ: گھوڑے کا مالک اسی معنیٰ کے اعتبار سے فرمایا:

﴿اُذْکُـرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ فَاَنْسَاهُ الشَّیْطَانُ ذِکْرَ رَبِّهٖ﴾ (۱۲۔۴۲) اپنے آقا سے میرا بھی تذکرہ کرنا۔ سو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا۔

﴿اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ﴾ (۱۲۔۵۰) اپنے سرکار کے پاس

---

❶ قـالـه صـفـوان بـن امية كـمـافـي الـكـشاف (١ : ٨) والمغازی لان اسحاق ومن طريقة اخرجه ابن حبان فی صحيحه والبهيقی فی الـدلائـل وذكـرالدارقطنی فی الغرائب عن الزهری مرسلاً كذاذكره والصواب ان صفوان قاله لكلدة بن حنبل اخيه من امه وحديثه انه لـمـاانهـزم الـنـاس عـن الـرسـول الله صلی الله عليه وسلم يوم حنين وتكلم الناس فقال سفيان بن حرب لاتنتهی هزيمتهم دون البحر وصرخ كـلـدة بـن حـنـبـل الابـطـل السحر واليوم فقال له صفوان اسكت فض الله فاك انظر للكلمة سيرة ابن هشام ٤ : ٨٦ واللسان (ريـب) والفائق (٢ : ١٤٥) واضداد ابن السكيت ٢٠٤ واضداد ابن الطيب ٣١٤ وفی اللسان (ريب) وكذا قال ابن عباس فی حوار لابن الزبير لان يربنی نبوعمی احب الی من ان يربنی غير هم يعنی ان بنی امية خيرمنك ١٢.

لوٹ جاؤ۔اور آیت:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ﴾ (۱۲۔۲۳) (یوسف نے کہا) معاذ اللہ وہ (تمہارا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رَبِّیۡ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا ہے۔ ❶

رَبَّانِیٌّ بقول بعض یہ رَبَّانَ (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔لیکن عام طور پر فِعْلَانٌ (صفت) فَعِلَ سے آتا ہے۔جیسے عَطْشَانُ سَکْرَانُ اور فَعِلَ (فتحہ عین سے بہت کم آتا ہے) جیسے نَعْسَانَ (مِنْ نَعَس) بعض نے کہا کہ یہ رَبٌّ (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَبٌّ مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے جو علم سے اپنی پرورش کرے درحقیقت یہ دونوں معنیٰ باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ بمعنیٰ اللہ کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ بمعنیٰ اِلٰهِیٌّ ہے (یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائدتان ہیں جیسا کہ جِسْمٌ وَلِحْیٌ کی نسبت میں جِسْمَانِیٌّ وَلِحْیَانِیٌّ کہا جاتا ہے ❷ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۱۶۸) اَنَا رَبَّانِیُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ: میں اس امت کا عالم ربانی ہوں اس کی جمع رَبَّانِیُّوْنَ ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوۡلَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ﴾ (۵۔۶۳) انہیں ان کے رَبِی (یعنی مشائخ) کیوں منع نہیں کرتے۔

﴿کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ (۳۔۷۸) (بلکہ دوسروں سے کہے گا) کہ تم خدا پرست ہو کر رہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ رَبَّانِیٌّ اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول انسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے۔ ❸ اور آیت کریمہ: ﴿رِبِّیُّوۡنَ کَثِیۡرٌ﴾ (۳۔۴۵) بہت سے اللہ والوں نے۔ میں رِبِّیٌّ بمعنیٰ رَبَّانِیٌّ ہے۔ ❹

اَلرَّبُوۡبِیَّةُ وَالرَّبَّانِیَّةُ: یہ دونوں مصدر ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے رَبُوۡبِیَّةٌ اور دوسروں کے لیے رَبَابِیَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اَلرَّبُّ (صیغہ صفت) جمع ارباب قرآن پاک میں ہے:

﴿ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ﴾ (۱۲۔۳۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا

---

❶ وهذا هو قول الزجاج راجع فتح القدير للشوكاني ۳: ۱۷ او الفيوضات الالهيه (۲: ۴۴۵).

❷ والزائدتان للمبالغة في النسبة كمافي رقباني وشعراني راجع الكتاب لسيبويه واضداد ابي الطيب (۳۰۵).

❸ قال ابو عبيدة في مجازه (۱: ۹۷) لم يعرفو ربانيين وفي العرب للجواليقي (۱۶۱) قال ابو عبيد احسن الكلمة ليس بعربية انما هي عبرانية او سريانية وذلك لان اباعبيدة زعم ان العرب لاتعرف الربانيين ۔زادابو عبيدوانما عرفها الفقهاء واهل العلم راجع ايضاً اللسان (ربي) وانظر في القرطبي (۴: ۱۲۲) وغريب ابي عبيد.

❹ في مجاز ابي عبيدة: الربيون الجماعة الكثيرة والواحد منها ربي ايضاً قارن الفتح (۸: ۱۵۵).

خدائے یگانہ اور زبردست۔

اصل تو یہ تھا کہ رَبٌّ کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدۂ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور اَرْبَابٌ کے علاوہ اس کی جمع اَرِبَّةٌ وَرُبُوبٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (بسیط)

(۱۶۸) كَانَتْ اَرِبَّتُهُم بَهْزٌ وَغَرَّهُمْ
عَقْدُ الْجِوَارِ وَكَانُوا مَعْشَرًا غُدُرًا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کردیا اور درحقیقت وہ غدار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۱۶۹) وَكُنْتَ امْرَءًا اَفْضَتْ اِلَيْكَ رِبَابَتِيْ
وَقَبْلَكَ رَبَّتْنِيْ فَضِعْتُ رُبُوبُ

تم وہ آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں۔ مگر میں ضائع ہوگیا ہوں۔ رِبَابَةٌ: عہدو پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رَابَّةٌ: وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کررہی ہو۔ اس کا مذکر رَابٌّ ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پارہی ہو۔ اسے رَبِيبٌ يَّارَبِيبَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع رَبَائِبُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہاری بیویوں کی (پچھلی) اولاد جو تمہاری گودوں میں (پرورش پاتی) ہے۔

رَبَّيْتُ الْاَدِيْمَ بِالسَّمْنِ: میں نے چمڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔

رَبَّيْتُ الدَّوَاءَ بِالْعَسَلِ: میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی۔ سِقَاءٌ مَرْبُوْبٌ: پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔ شاعر نے کہا ہے ❸ (طویل)

(۱۷۰) فَكُوْنِيْ لَهٗ كَالسَّمْنِ رُبَّتْ لَهُ الْاَدَمُ

تم اس کے لیے ایسی ہو جاؤ جیسے رُبّ لگا ہوا چمڑا گھی کے لیے ہوتا ہے۔

اَلرَّبَابُ: بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنیٰ کے اعتبار سے مَطَرٌ کو دَرٌّ (دودھ) اور بادل کو تشبیہاً اَلْقُوحُ (یعنی دودھیل اونٹنی) کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔

---

❶ قاله ابو ذهيب الهزلي وبهزى بطن من سليم والبيت في اللسان (رب) والمعاني الكبير (۴۰ .۴)

❷ قاله علقمة بن عبده في قصيدة مفضلية (۲: ۱۹۴) وفي روايته امانتي بدل ربابتي وربتنى)بتاء التانيث والبيت فى منتهى الطلب (۱: ۲۹) والطبرى (۱: ۶۲ / ۳۱: ۳۲۷) واللسان (رب) ومختار الشعر الجاهلى (۱: ۳۲۱) والعقد الثمين (۱۰۷) وايام العرب ۵۷ وفي الهامش قال بعض مصحح اللسان قال الصاغاني والرواية "انت امرء" والمخاطب حارث بن نضلة ۱۲.

❸ قال عمرو بن شاس الاسدى يخاطب امرئته ام احسان ابنة الحارث وكانت تكره ابنه عرارافطلقها ثم ندم ولام نفسه وصدره فان كنت منى او تريدين صحبتي ۔ وقوله ربت له الادم اى جعل فيها الرب لئلا تفسد والادم واحدها اديم يريد الاسقية التي يجعل فيها الرب لتصلح للسمن وفي رواية اسد الغابة به بدل له والبيت في الحماسة مع المرزوقى ۲۸۰ والشعراء ۳۸۹ والكامل ۱۵۴ والطبقات للجمحى ۷۶ وانظر والابيات ايضاً في الاغانى (۱۰: ۶۰) والامالى (۲: ۱۸۴ـ۱۸۵) وفي روايته رب له الادم والتبريزى (والسمط ۸۰۳).

اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ: بدلی متواتر برستی رہی اور اس کے اصل معنیٰ ہیں بدلی صاحب تربیت ہوگئی۔اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنیٰ لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسے اَرَبَّ فُلَانٌ بِمَکَان کَذا: اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رُبَّ تقلیل کے لیے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے معنیٰ بھی دیتا ہے۔❶

جیسے فرمایا:

﴿رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا لَوکَانُوا مُسْلِمِیْنَ﴾ (۱۵۔۲) کافر بہتیرے ہی ارمان کریں گے (کہ) اے کاش (ہم بھی) مسلمان ہوئے ہوتے۔

(ر ب ح)

اَلرِّبْحُ: وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرۂ اعمال کو بھی رِبْحٌ کہا جاتا ہے۔اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ﴾ (۲۔۱۶) سو نہ تو ان کی تجارت سودمند ہوئی۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

(۱۷۱) قَرَوْا اَضْیَافَھُمْ رُبَحًا بِبَحٍ

بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ بمعنیٰ چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں رُبَحٌ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو رِبْحٌ سے حاصل ہوئی ہو جیسا کہ نَقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نُقص کہا جاتا ہے۔اور بُحَّ قرعہ اندازی یا قمار بازی کے تیر کو کہتے ہیں۔تو شعر کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمان داری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔❷ (طویل)

(۱۷۲) فَاَوْسَعَنِی حَمْدًا و اَوْسَعْتُهٗ قِرِیً
وَاَرْخِصْ بِحَمْدٍ کَانَ کَاسِبُهٗ الْاَکْلُ

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

(ر ب ص)

اَلتَّرَبُّصُ کے معنیٰ انتظار کرنے کے ہیں۔خواہ وہ انتظار سامان تجارت کی گرانی یا ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا ہو۔تَرَبَّصْتُ لِکَذَا وَلِیْ رُبْصَةٌ لِکَذَا وَتَرَبُّصٌ: کسی چیز کا انتظار کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ﴾ (۲۔۲۲۸) مطلقہ عورتوں کو چاہیے کہ انتظار کریں۔

﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّی مَعَکُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ﴾ (۵۲۔۳۱) ان سے کہو کہ (بہت اچھا) تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

﴿قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّا اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِکُمْ﴾ (۹۔۵۲) اے پیغمبر! ان

---

❶ قاله خفان بن ندبه وتمامه يعيش بفضلهن الحي سمر ـ والبيت في اللسان والمحكم والتاج (ربح بح) وقبله : اذا الحسناء لم ترخص يديها ولم يقصر لها بصر بستر.

❷ البيت في الفاضل للمبرد (٢٨) والحماسة (٤ : ٦٣) والمرزوقي (١٥٦٩) في ثلاثة بغير عزو ١٢.

لوگوں سے) کہو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے (خواہ نخواہ) ایک نہ ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں۔

(ر ب ط)

رَبْطُ الْفَرَسِ کے معنیٰ گھوڑے کو کسی جگہ پر حفاظت کے لیے باندھ دینے کے ہیں اور اسی سے رِبَاطُ الْجیْشِ ہے یعنی فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں اسے رِبَاط کہا جاتا ہے۔ اور رَبَطْتُ وَرَابَطْتُ کا مصدر بھی رِبَاط آتا ہے۔ اور مُرَابَطَةٌ کے معنیٰ حفاظت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھے رکھنے سے جس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کرو۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ (۳۔۱۹۹) (ان تکلیفوں کو جو راہ خدا میں تم کو پیش آئیں) برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہو۔

پس معلوم ہوا کہ مُرَابَطَة کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی سرحدوں پر دفاع کے لیے پہرہ دینا اور دوسرے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا اور اس میں کوتاہی نہ کرنا۔ جیسے مجاہدۂ نفس کی صورت میں ہوتا ہے اور اس مجاہدہ نفس کا ثواب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے [1]: مِنَ الرِّبَاطِ اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ: کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی "رباط" ہے۔ فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ فلاں مضبوط دل ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ (۲۸۔۱۰) اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کیے رہتے (تو عجب نہ تھا کہ وہ ہمارا معاملہ ظاہر کر دیتیں)۔

﴿وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ﴾ (۸۔۱۱) تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھائے۔

اور اسی معنیٰ کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸۔۲۲) وہ خدا ہی تو تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل ڈالا اور اپنے فیضان غیبی سے ان کی تائید کی۔

کیونکہ ان کے دل ایسے نہیں تھے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (ہیں کہ) ہوا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اور اسی سے فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنیٰ مضبوط دل شخص کے ہیں۔

(ر ب ع)

اَرْبَعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ وَرُبُعٌ وَرِبَاعٌ: ان سب کی ایک ہی اصل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) (اصحاب

---

[1] اخرجه ابن حبان فی زوائده من حدیث جابر انظر رقم ۱۶۱ وفی روایته افضل الرباط انتظار الصلوة بعدالصلوة (عب وابن جریر عن ابی هریرة) راجع کنزالعمال ۱۲.

کہف) تین تھے اور چوتھا (ان کے ساتھ) ان کا کتا تھا۔
﴿اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس تک (وہ سرزمین ان کے نصیب نہ ہوگی اور) اس بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔
﴿اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ (۷۔۱۴۲) (یوں) چالیس رات (کا وعدہ پورا ہوگیا)
﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ (۴۔۱۲) اور تم کچھ (ترکہ) چھوڑ مرو تو بیویوں کا حصہ چوتھائی ہے۔
﴿مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (۴۔۳) دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔
رَبَعْتُ الْقَوْمَ: (۱) میں نے قوم سے چوتھائی حصہ وصول کیا۔ (۲) میں نے انہیں چار بنادیا۔
رَبَعْتُ الْحَبْلَ: رسی کو چار ریشوں سے بٹنا۔
رِبْعٌ (۱) چار دن کے پیاسے اونٹ۔ (۲) چوتھیا بخار
اَرْبَعَ اِبِلَهٗ: اونٹوں کو چوتھے روز پانی پلانا۔
رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ وَمُرْبَعٌ: جسے چوتھیا بخار ہو۔
اَلْاَرْبِعَاءُ چہارشنبہ۔ کیونکہ عربی میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے۔ جسے یوم الاحد کہا جاتا ہے۔
رَبِیْعٌ: موسم بہار (کیونکہ یہ سال کا چوتھا موسم ہے) اسی سے محاورہ ہے:
رَبَعَ فُلَانٌ وَارْتَبَعَ: اس نے فلاں جگہ پر موسم بہار گذارا مجازاً کسی جگہ پر اقامت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقامت موسم بہار میں ہو یا کسی اور موسم میں ہو۔ حتیٰ کہ ہر منزل کو رَبْعٌ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصل معنیٰ موسم ربیع کی اقامت گاہ کے ہیں۔
اَلرُّبَعُ وَالرِّبْعِیُّ: جانور کا وہ بچہ جو موسم ربیع میں پیدا ہو اور موسم بہار جانوروں کی ولادت کے لیے چونکہ سال میں پہلا اور بہتر موسم ہے اس لیے استعارہ کے طور پر وہ بچہ جو کسی کے ہاں عالم شباب میں پیدا ہوا ہو رِبْعِیٌّ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:[1]
اَفْلَحَ مَنْ کَانَ لَهٗ رِبْعِیُّوْنَ: سعادت مند ہے وہ شخص جس کے ہاں عالم شباب میں اولاد ہو جائے۔
اَلْمِرْبَاعُ: موسم بہار میں بچہ دینے والی اونٹنی۔
غَیْثٌ مُرْبِعٌ: موسم بہار کی بارش۔
رَبَعَ الْحَجَرَ وَالْحِمْلَ پتھر یا بوجھ کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھانا۔
اَلْمِرْبَعُ: لکڑی جس کے ذریعہ چوپایہ پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ اِرْبَعْ عَلٰی ظَلْعِكَ: یعنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرو یا تو رَبَعَ بمعنیٰ اقامۃ سے ہے اور یا رَبَعَ الْحَجَر سے
اَلْمِرْبَاعُ: اموال غنیمت کا چوتھا حصہ جو رئیس قبیلہ وصول کیا کرتا تھا یہ رَبَعْتُ الْقَوْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ رُبْع وصول کرنے کے ہیں اور اسی سے استعارہ کے طور پر رِبَاعَة بمعنیٰ سیادت آتا ہے۔ مشہور مثل ہے:

---

[1] وقبله : ان بنی صبية صفيون والشطر قد اصبح مثلاً يضرب فی التندم علی مافات وقد تمثل بهما سليمان بن عبدالملك وهو يجود بنفسه الفائق (۲ : ۲۵) و الاخبار الطوال (۳۳۰) والمثل فی الميدانی (۱ : ۱۴) والرجز ايضاً فی الاصلاح (۲۶۲، ۴۷۰) والحيوان (۱ : ۱۰۹) والاشتقاق : (۴۳، ۱۰۲) والعقد (۳ : ۱۰۳) والمقاييس (۳ : ۳۲۶) والالفاظ (۳۹۶) والفائق (۲ : ۴۷) والمخصص (۱ : ۳۰) والمحكم والتاج (ربع) وجمهرة الامثال (۱ : ۴۰) واللسان (ربع ،صيف) والشطر الثانی فی شرح الحماسة للمرزوقی ۱۳۹۵ والاول فی المعانی للقتبی ۳۱۱ واختلف فی اول قائله ففی نوادر ابی زيد ۸۷ هو اكثم بن صيفی وفی الميدانی سعد بن مالك بن ضبعة وقيل بن معاوية بن قشير وفی محاضرات المؤلف (۳ : ۲۰۱) قاله دهقان لملك من ملوك العجم وفيه الخبر و فی اللسان او اكثم بن صيفی ۱۲.

لَا یُقِیمُ رِبَاعَۃَ الْقَوْمِ اِلَّا فُلَانٌ کہ قوم کی سیاست کی باگ ڈور فلاں شخص ہی سنبھال سکتا ہے۔

رَبِیعَۃٌ: (ایضاً) اصل میں ڈبیہ کو کہا جاتا ہے۔کیونکہ اس کے چار طبقے یا چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔

اَلرُّبَاعِیَّتَان: دو دانتوں کا نام۔بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان چونکہ چار دانتوں کا فاصلہ ہوتا ہے اس لیے انہیں رباعیتان کہا جاتا ہے۔

اَلْیَرْبُوعُ: جنگلی چوہا۔کیونکہ یہ چوکھا بل بناتا ہے۔

اَرْضٌ مَرْبَعَۃٌ: بہت چوہوں والی زمین جیسا کہ زیادہ سوسماروالی زمین کو مُضَبَّۃ کہا جاتا ہے۔

(ر ب و)

رَبْوَۃٌ: (مثلثۃ الراء) وَرَبَاوَۃ (بفتح الراء وکسرھا) بلند جگہ یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ﴾ (۲۳۔۵۰)ایک اونچی جگہ جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب (بھی تھی)۔

ابوالحسن نے کہا ہے کہ رَبْوَۃٌ کا لفظ زیادہ جید ہے۔کیونکہ اس کی جمع رُبًی آتی ہے۔اور رَبَا فُلَانٌ فلاں اونچی جگہ پر چلا گیا۔اور رَبْوَۃ کو رَابِیَۃ بھی کہا جاتا ہے گویا وہ خود بلندی پر ہے اور اسی سے رَبَا ہے جس کے معنیٰ بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (۲۲۔۵) پھر جب ہم اس پر پانی برسادیتے ہیں تو وہ لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے۔

﴿فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً﴾ (۶۹۔۱۰) تو خدا نے بھی انہیں بڑا سخت پکڑا۔

اَرْبٰی عَلَیْہِ: کسی پر بلند ہونا یا کسی کی نگرانی کرنا۔

رَبَّیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا: میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں رَبَّبْتُ ہے۔تخفیف کے لیے ایک باء کو یاء سے بدل دیا۔جیسا کہ تَظَنَّیْتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے تخفیفاً ایک نون کو یاء سے تبدیل کردیا ہے۔

اَلرِّبَا: (سود) رأس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھوتی لی جائے وہ رِبٰو کہلاتی ہے۔لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَ فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ﴾ (۳۰۔۳۹) اور تم جو چیز (عطیہ) زیادہ لینے کے لیے دو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔

اور آیت:

﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۲۔۲۷۶) اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

میں مَحق کا لفظ لاکر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ "ربا" یعنی سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوٰۃ کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۹) اور جو تم (محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوٰۃ دیتے ہو تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے ہاں بڑھا رہے ہیں۔

اَلْاُرْبِيَّتَان: سرینوں کے جڑھے۔

اَلـرَّبْوُ: سانس پھولنا۔ سانس پھول کر چونکہ اوپر کو چڑھتا ہے اس لیے اس کو رَبْـــــو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سانس پھولے ہوئے آدمی کے متعلق هُـوَ يَتَنَفَّسُ الصَّعْدَاء کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلـــرَّبِيئَةُ: جس کے معنیٰ جاسوس ہیں (ر ب ء) سے ہے اور اس مادہ (ر ب و) سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(ر ت ع)

رَتَـعَ (ف) رَتْعًا وَرُتُوعًا ۔ وَرَتْعَةً کے اصل معنی جانوروں کے چرنے کے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَـرْتَـعْ وَيَـلْـعَـبْ﴾ (۱۲۔۱۲) کہ (جنگل کی پھل پھلاری) کھائے پیئے اور کھیلے (کودے)

اور تشبیہ کے طور پر (بدگوئی کے معنیٰ میں بھی آتا ہے (جیسا کہ) شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۱۷٤) وَاِذَا يَـخْـلُوْلَهٗ لَحْمِيْ رَتَعْ

جب تنہائی میں اس کے پاس ہوتا تو میرا گوشت کھانے لگ جاتا ہے یعنی غیبت کرتا ہے۔

مویشی کے لیے راتـع کی جمع رِتَـاعٌ آتی ہے اور انسان کے لیے رَاتِعُوْنَ۔

(ر ت ق)

اَلـرَّتْقُ: اس کے اصل معنی جوڑنا اور ملانا کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طریقہ سے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَـانَتَـا رَتْـقًا فَفَتَقْنَاهُمَا﴾ (۲۱۔۳۰) (کہ آسمان وزمین) دونوں ایک ہیولیٰ تھے تو ہم نے (اس کو توڑ کر) زمین وآسمان کو الگ الگ کیا۔

رَتْـقَاء: وہ عورت جس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے باہم چسپیدہ ہوں اور اس سے ہم بستری نہ ہو سکے۔

مشہور محاورہ ہے:

فُـــلَانٌ رَاتِـقٌ وَفَـاتِقٌ فِيْ كَذَا (مثل) فلاں اس معاملہ میں کرتا دھرتا ہے۔

(ر ت ل)

اَلرَّتَلُ: کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ منتظم اور مرتب ہونا۔ رَجُـلٌ رَتَـلُ الْاَسْـنَـانِ آدمی جس کے دانت آبدار اور حسن ترتیب کے ساتھ ہوں اور تَـرْتِيل کے معنیٰ سہولت اور حُسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو ادا کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَتِّـلِ الْـقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (۷۳۔۴) اور تم قرآن پاک کو خوب حسن ترتیب کے ساتھ پڑھا کرو۔

﴿وَرَتَّـلْـنَـــاهُ تَرْتِيْـلًا﴾ (۲۵۔۳۲) اور ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب اور تناسب کے ساتھ اتارا۔

(ر ج ج)

اَلـــرَّجُّ (ن) اس کے معنیٰ کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں اور اِرْتِـــجَـــاج (افتعال) اس کا

---

[1] مقید القافیہ قالہ سوید بن کاهل الیشکری فی کلمة مفضلیة ۱۸۸ بیتاً بعضها فی الامالی (۱:۱۰۱,۲:۳۱۹) وصدره : ویحیني اذا لاقلیته والبیت فی اللسان (رتع) والشعراء ۲۵۱ والخزانة (۲:۵٤۷) وشواهد الکشاف ۷۲ وفی روایة اذا یخلو بدل خلوا وحبیب لی بدل ویحیین ۱۲.

مطاوع ہے جس کے معنی ہلنے اور مضطرب ہونے کے ہیں۔جیسے رَجَّهٗ فَارْتَجَّ: اسے ہلایا چنانچہ وہ ہلنے لگا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا﴾ (۵۶۔۴) اور قیامت اس وقت واقع ہوگی۔ جب کہ زمین بڑے زور سے ہلنے لگے گی۔

اسی کو دوسرے مقام پر: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ﴾ (۹۹۔۱) (جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے گی۔ سے تعبیر کیا ہے۔

اَلرَّجْرَجَةُ: اضطراب۔ كَتِيبَةٌ رَجْرَاجَةٌ: لشکر جرار۔ جَارِيَةٌ رَجْرَاجَةٌ: تھرتھرا کر چلنے والی چھوکری۔ اِرْتَجَّ كَلَامُهٗ: کلام کرتے وقت آواز میں گونج اور لہر پیدا ہونا۔

رِجْرِجَة: تھوڑا سا پانی جو ہلانے سے گدلا ہو جائے۔

(ر ج ز)

اَلرِّجْزُ: اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں۔ اور اسی سے رَجَزَ الْبَعِيرُ ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کی کپکپائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو اَرْجَزُ اور ناقہ کو رَجْزَاء کہا جاتا ہے اور شعر کے ایک بحر کا نام بھی رَجَزٌ ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے اُرْجُوزَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرَاجِيزُ آتی ہے اور رَجَزَ فُلَانٌ وَارْتَجَزَ کے معنی بحر رجز پر شعر بنانے یا ارجوہ پڑھنے کے ہیں اور رجز گوشاعر کو رَاجِزٌ ، رَجَّازٌ اور رجَّازَة کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ اَلِيمٍ﴾ (۳۴۔۵) (ان کے لیے عذاب دردناک کی سزا ہے۔ میں لفظ رِجز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے اور فرمایا:

﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۹۔۳۴) ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۷۴۔۵) اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رُجْزٌ سے بت مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ندی بمعنی شحم آ جاتا ہے اور آیت:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ﴾ (۸۔۱۱) اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔

میں رِجْزَ الشَّيْطَان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی، فساد انگیزی وغیرہا گناہ مراد ہیں جس کی شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رِجَازَةٌ وہ کمبل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ...... کا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک طرف باندھ دیتے ہیں۔ اس میں بھی حرکت واضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

(ر ج س)

اَلرِّجْسُ: پلید، ناپاک، جمع اَرْجَاسٌ کہا جاتا ہے رَجُلٌ رِجْسٌ: ناپاک آدمی۔ وَرِجَالٌ

اَرْجَاسٌ: قرآن پاک میں ہے:

﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ (۵-۹۰)(تو یہ) ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔

جاننا چاہئے کہ رِجْسٌ چار قسم پر ہے۔(۱) صرف طبیعت کے لحاظ سے (۲) صرف عقل کی جہت سے۔(۳) صرف شریعت کے رو سے۔ (۴) ہر سہ کی رو سے جیسے میتہ (مردار) سے انسان کی طبعی نفرت بھی ہے اور عقل وشریعت کی رو سے بھی ناپاک ہے۔ رجس شرعی، جیسے جوا اور شراب ہے کہ شریعت نے انہیں رجس قرار دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ چیزیں عقل کی رو سے بھی رجس ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲-۲۱۹)(مگر) فائدہ سے ان کا گناہ (اور نقصان) بڑھ کر۔ میں اسی معنیٰ پر تنبیہ کی ہے کیونکہ جس چیز کا نقصان اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے اسی طرح کفار کو رجس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کرتے ہیں اور شرک عندالعقل قبیح ترین چیز ہے جیسے فرمایا:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ رِجْسٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ﴾ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) خباثت پر ایک اور خباثت بڑھادی۔

﴿وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (۱۰-۱۰) اور خدا (شرک وکفر کی) نجاست انہیں لوگوں میں ڈالتا ہے جو (دلائل وحدانیت) میں عقل کو کام میں نہیں لاتے۔

بعض نے رِجْسٌ سے نتن (بدبودار) اور بعض نے عذاب مراد لیا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (۹-۲۸) مشرک تو (نرے) گندے ہیں۔

میں مشرکین کو اور آیت کریمہ:

﴿اَوْلَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾ (۶-۱۴۵)(یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں۔ میں خنزیر کے گوشت کو رجس کہا گیا ہے یعنی شرعاً ناپاک ہونا مراد ہے۔

رَجْسٌ وَرَجْزٌ: سخت آواز چیخ۔ بَعِيْرٌ رَجَّاسٌ: مست اونٹ غَمَامٌ، رَاجِسٌ وَرَجَّاسٌ: بہت گرجنے والا بادل۔

(ر ج ع)

اَلرُّجُوْعُ: اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کے اپنے مبدأ حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں۔ خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز ؤ کے اور یا باعتبار (فعل کے ہو) الغرض رجوع کے معنیٰ عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رَجْعٌ کے معنیٰ لوٹانے کے اور رَجْعَةٌ کا لفظ طلاق کے بعد رجوع کرنے یا موت کے بعد دنیا کی طرف لوٹنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے [1]: فُلَانٌ يُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ: فلاں رجعت پر ایمان رکھتا ہے اور رِجَاع کا لفظ خاص کر پرند کے اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس اس طرف لوٹ آنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ رجوع کے معنیٰ میں فرمایا:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ﴾ (۶۳-۸) اور یہ منافق

[1] قال فی اللسان ومن جملتهم طائفة من الرافضة یقولون ان علی بن ابی طالب مستتر فی السحاب فلایخرج مع من خرج من ولده حتیٰ ینادی منادمن السماء : اخرج مع فلان ۱۲.

کہتے ہیں کہ اگر مدینے لوٹ کر گئے۔
﴿فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰٓی اَبِیْهِمْ﴾ (۱۲۔۶۳) تو جب (یہ لوگ) اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے۔
﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰٓی اِلٰی قَوْمِهٖ﴾ (۷۔۱۵۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے۔
﴿وَاِنْ قِیلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوْا﴾ (۲۴۔۲۸) اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ آؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ۔ رَجَعْتُ عَنْ كَذَا: میں نے فلاں بات سے رجوع کر لیا رَجَعْتُ الْجَوَابَ: (متعدی) جواب دینا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰی طَآئِفَةٍ﴾ (۹۔۸۳) اگر خدا تم کو (جہاد پر سے ان منافقوں کے) کسی گروہ کی طرف (صحیح وسلامت) لوٹا کر لے جائے۔
﴿اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ (۱۱۰۔۴) تم (سب) کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔
﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی﴾ (۹۶۔۸) بے شک (ان سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ (۱۰۔۴) اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔
مَرْجِعٌ رُجُوعٌ سے بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۔۲۸) پھر اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔
میں ہے اور رَجْعٌ (متعدی) سے بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ایک قرأت: ﴿ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۔۲۸) پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

بھی ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَاتَّقُوا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیهِ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۸۱) اور دیکھو اس دن (کی پرسش) سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹائے جاؤ گے۔
میں ایک قرأت تَرْجِعُوْنَ (بصیغۂ معروف) بھی ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۸) کہ (اب بھی) یہ لوگ باز آ جائیں۔
میں رُجُوعٌ عَنِ الذَّنْبِ: یعنی گناہ سے باز آ جانا مراد ہے اسی طرح آیت:
﴿وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ توبہ کر کے شرک وکفر یا گناہوں سے باز آ جائیں کیونکہ مرنے کے بعد توبہ نہیں ہے اسی بنا پر منافقین کو استہزاء کے طور پر کہا جائے گا۔
﴿ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ (۵۷۔۱۳) (الآیۃ) تو (ان سے کہا جائے گا) کہ (نہیں) اپنے پیچھے (یعنی دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) کوئی اور روشنی تلاش کرو۔
(یعنی توبہ کر کے ایمان لاؤ جو اس روشنی کا سبب ہے۔ اور آیت:
﴿بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۵) کہ ایلچی کیا لے کر آتے ہیں۔
میں یَرْجِعُ رجوع سے بھی ہو سکتا ہے اور رَجْعَ الْجَوَابِ سے بھی جیسا کہ فرمایا:
﴿یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضِ نِ الْقَوْلَ﴾ (۳۴۔۳۱) اور ایک کی بات ایک رد کر رہا ہو گا۔

اورآیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ﴾ (۲۷۔۲۸) پھر ان سے (الگ) ہٹ جا۔ اور دیکھتا رہ کہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔

میں يَرْجِعُوْنَ رَجَعَ الْجَوَابَ سے ہے نہ کہ رجوع سے اورآیت کریمہ:

﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ (۸۶۔۱۱) اور پانی برسانے والے آسمان کی قسم۔

میں رَجْعٌ کے معنیٰ بارش کے ہیں اور بارش کو رَجْعٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ اولاً سمندروں سے بخارات بن کر پانی اوپر چلا جاتا ہے اور پھر ہوا بارش کی صورت میں انہیں زمین پر واپس لے آتی ہے اور تالاب کو بھی رَجْعٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لیے کہ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس کی لہروں میں تلاطم ہوتا رہتا ہے محاورہ ہے:

لَيْسَ لِكَلَامِهٖ مَرْجُوْعٌ: اس کی بات کا جواب نہیں۔

دَابَّةٌ لَّهَا مَرْجُوْعٌ: وہ جانور جسے استعمال کے بعد بیچنا ممکن ہو۔

نَاقَةٌ رَاجِعٌ: اونٹنی جو جفتی سے حاملہ نہ ہو گویا وہ نر کے نطفہ کو واپس لوٹا دیتی ہے۔

اَرْجَعَ يَدَهٗ اِلٰى سَيْفِهٖ: اس نے تلوار سونتنے کے لیے ہاتھ کو واپس لوٹایا۔

اَلْاِرْتِجَاعُ: (افتعال) واپس لے لینا۔ اِرْتَجَعَ اِبِلًا۔ نر شتر بیچ کر ان کے عوض مادہ شتر خریدنا اس میں اگرچہ بعینہٖ چیز کو لوٹانے کے معنی نہیں پائے جاتے لیکن پہلی تقدیراً واپس لوٹانے کے معنیٰ ملحوظ ہیں۔

اِسْتَرْجَعَ فُلَانٌ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا۔

اَلتَّرْجِيْعُ: (۱) غنا یا قرأت کے وقت آواز کو حلق میں لوٹانا۔ (۲) کوئی بات دوبارہ کہنا، اسی سے ترجیع فی الاذان ہے جس کے معنیٰ اذان میں شہادتین کو ایک مرتبہ پست آواز سے کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنے کے ہیں۔

اَلرَّجِيْعُ: (۱) انسان یا چوپایہ کا فضلہ، اسے اگر رجوع سے مانا جائے تو فعیل بمعنی فاعل ہوگا اور اگر رَجْعٌ (متعدی) سے مانا جائے تو فعیل بمعنیٰ مفعول ہوگا۔

جُبَّةٌ رَجِيْعٌ: وہ جبہ جسے ادھیڑ کر دوبارہ سلا گیا ہو۔

(۲) نیز رجیع اس سواری کو کہتے ہیں کہ جو ایک سفر سے واپس آنے کے بعد متصل ہی دوسرے سفر پر چلی جائے اس کی مؤنث رَجِيْعَةٌ ہے اور کنایہ کے طور پر کثرت اسفار کی وجہ سے لاغر اور دبلی سواری کو بھی دَابَّة رَجِيع وَرَجْعُ سَفَرٍ کہہ دیتے ہیں۔

(۳) نیز مکرر کلام کو بھی رَجِيْعٌ کہا جاتا ہے۔ (۴) وہ کلام جو بوجہ کراہت متکلم کی طرف لوٹا دی جائے اسے بھی رَجِيْعٌ ہی کہا جاتا ہے۔

(ر ج ف)

اَلرَّجْفُ: (ن) اضطراب شدید کو کہتے ہیں اور (رَجَفَتِ الْاَرْضُ اَوِالْبَحْرُ) کے معنیٰ زمین یا سمندر میں زلزلہ آنا کے ہیں۔ بَحْرٌ رَجَّافٌ: متلاطم سمندر قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۷۳۔۱۴) جب کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے۔

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ (۷۹۔۶) جب کہ زمین لرز جائے گی۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ (۷۔۷۸) پس ان کو زلزلے

نے پالیا۔

اَلْاِرْجَافُ: (افعال) کوئی جھوٹی افواہ پھیلا کر یا کسی کام کے ذریعہ اضطراب پھیلانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ﴾ (۳۳-۶۰) اور جو لوگ مدینے میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں۔

مثل مشہور ہے۔❶ اَلْاَرَاجِیْفُ مَلَاقِیْحُ الْفِتَنِ: کہ جھوٹی افواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔

(ر ج ل)

اَلرَّجُلُ: کے معنیٰ مرد کے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا﴾ (۶-۹) اگر ہم (رسول کا مددگار) کوئی فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی ہی بناتے۔

رَجُلَةٌ: عورت جو مردسی وضع اختیار کرلے۔

شاعر نے کہا ہے۔❷

(۱۷۵) "لَمْ یُبَالُوا حُرْمَةَ الرَّجُلَةِ"

اس مردنما عورت کی حرمت کی پرواہ نہ کی۔

اور رَجُلٌ کے معنیٰ مرد کامل بھی آتے ہیں جس میں مردانگی کے جوہر نمایاں ہوں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی﴾ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا۔

رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: فرعون کے لوگوں میں سے ایک مرد مومن یعنی جو قوی اور بہادر تھا (یہ ماجرا سن کر بولا) ﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ﴾ کیا تم (صرف اتنی بات پر) ایک شخص کے قتل کے درپے ہو کہ وہ اللہ ہی کو اپنا پروردگار بناتا ہے۔محاورہ ہے: هُوَ اَرْجَلُ الرَّجُلَیْنِ: کہ وہ دونوں میں زیادہ جوانمرد ہے۔

اَلرِّجْلُ: پاؤں۔اس کی جمع اَرْجُلٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ﴾ (۵-۶) اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھولیا کرو۔

رَاجِلٌ وَرَجِلٌ: پاپیادہ چلنے والا۔یہ بھی الرجل بمعنیٰ پاؤں سے مشتق ہے اور راجل کی جمع رِجَالَة اور رَجْلٌ آتی ہے جیسے رَكْبٌ جو کہ رَاكِبٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ کی جمع رِجَالٌ بھی آجاتی ہے جیسے رَاكِبٌ وَرِكَابٌ۔ اور رَجُلٌ رَاجِلٌ اسے کہتے ہیں جو چلنے پر قدرت رکھتا ہو اس کی جمع رِجَالٌ آجاتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (۲-۲۳۹) تو پاؤں پیدل یا سوار اسی طرح رَجِیْلٌ وَذُو رَجْلَةٌ کے معنیٰ بھی بہت زیادہ یا پیادہ چلنے والے شخص کے ہیں۔

حَرَّةٌ رَجْلَاءُ: جس میں صعوبت سے چلا جاسکے۔

اَلْاَرْجَلُ: سفید پاؤں والا گھوڑا۔بڑے پاؤں والا۔

رَجَّلْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو پاؤں سے باندھ کر لٹکا دیا۔اور بطور استعارہ رَجُلٌ کے معنیٰ (۱) ٹڈی دل اور پانی بہنے کا راستہ بھی آجاتے ہیں اس کا واحد رِجْلَةٌ ہے اور سَیْلُ الْمَاءِ کو رِجْلٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے

---

❶ راجع للمثل المعاجم وفی المیدانی ۱۲.

❷ لم احده قائله واوله : خرقوا جیب فتاتهم ـ والبیت فی اللسان (رحل) والکامل ۲۴۱ وتفسیر الطبری (۸ : ۱۴۶) والبحر (۲ : ۱۷۶) وفی المطبوع لم ینالوا مصحف۔ کل جار ظل مغتبطا۔ غیر جیران بنی جبلة۔ والبیت ایضاً فی امالی ابن الشجری (۲ : ۲۸۷) واعراب ثلاثین لابن خالویه (۴۴) وفی روایته صولة بدل حرمة والاعجاز للباقلانی .

مذانب کہہ دیتے ہیں۔

رِجْلَةٌ: بـقلة الحمقاء: کیونکہ وہ بھی عموماً راستہ میں اگتا ہے۔

اور کسی شخص کے عہد حکومت کو بھی رِجْـل کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: کَـانَ ذَالِكَ عَـلـىٰ رِجْلِ فُـلَانٍ (کہ فلاں کے عہد حکومت میں تھا) جیسا کہ عَلىٰ رأسِ فُلَان کا محاورہ ہے۔

اِرْتَـجَـلَ الْـكَلَامَ فـى البديهـه کہنا۔ اِرْتَـجَلَ الْفَرَسُ فِي عدوِه: گھوڑے کا درمیانی دوڑ دوڑنا۔

تَرَجَّلَ الرَّجُلُ: سواری سے اتر کر پیدل چلنا۔

تَرَجَّلَ فِي الْبِئْرِ: بغیر رسی کے کوئیں میں اترنا۔

تَرَجَّلَ النَّهَارُ: سائے کا دیواروں سے نیچے اترنا گویا وہ پیدل چل رہا ہے۔

رَجَّـلَ شَعرَهٗ کے معنیٰ بالوں کو کنگھی کرنا کے ہیں کیونکہ کنگھی کرنے سے بال نیچے پاؤں کی طرف اتر آتے ہیں۔

اَلْمِرْجَلُ: نصب کی ہوئی دیگ۔ اَرْجَلْتُ الْفَصِيلَ اونٹنی کے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا۔

(ر ج م)

اَلـرِّجامُ: پتھر۔ اسی سے الـرجم ہے جس کے معنیٰ سنگسار کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ رَجَـمَـهٗ: اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا ہو اسے مَـرْجُـوْمٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَتَـكُـوْنَـنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۶) کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

پھر استعارۃ کے طور پر رَجْـم کا لفظ جھوٹے گمان، توہم، سب وشتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجْـمًا بِالْغَيْبِ﴾ (۱۸۔۲۲) یہ سب غیب کی باتوں میں اٹکل کے تکے چلاتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ [1] (طویل)

(۱۷۶) "وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالحَدِيثِ المرجَّم"

اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔

اور شیطان کو رجیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ﴾ (۱۶۔۹۸) تو شیطان مردود کے وسواس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ (۳۸۔۷۷) تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔

اور شُـهُـبٌ (ستاروں) کو رُجُـوْمٌ کہا گیا ہے قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قاله زهير في معلقته من السبعة واوله : وما الحرب الاما علمتم وذقتم ۔ والبيت في مجازابی عبيدة ۳۹۸ رقم٤٦٤ وعنه في الفتح ٦ : ۲۹۳) والعقد الثمين ۹٥ وايام العرب ۲۷٤ والاساس رجم والمحاضرات للمؤلف (۳ : ۱۷٦) والجمهرة ۱۰۷ وديوانه ۱۷ وشرح العشر للتبريزی (۱۱۲) والبحر (٦ : ١١٤) والقرطبی (۱۰ : ۳۸۳) والخزانة (۳ : ٤٣٥ ومختار الشعر الجاهلی (۱ : ١٥٤) وشرح السبع لابن الانباری (۲٦۷)۔

﴿رُجُوْمًا لِّلشَّیَاطِیْنِ﴾ (۶۷۔۵) ان کو شیاطین کے لیے ایک طرح کا زور بنایا ہے۔

رَجْمَة ورُجْمَة: قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس سے قبر مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع رِجَامٌ وَرُجُمٌ آتی ہے۔ اور رَجَمْتُ الْقَبْرَ کے معنیٰ قبر پر پتھر نصب کرنا کے ہیں۔ حدیث میں ہے: ❶

(۱۵۰) لَا تَرْجُمُوْا قَبْرِیْ۔ کہ میری قبر پر پتھر نہ لگانا۔

اَلْمُرَاجَمَةُ: باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا۔ مُقَاذَفَةٌ کی طرح یہ لفظ بھی اس معنیٰ میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور رَجْمٌ سے تَرْجُمَان بروزن تَفْعُلَان آجاتا ہے۔

(ر ج و)

رَجَا الْبِئْرِ: کنویں کا کنارہ۔ رَجَا السَّمَاءِ: آسمان کا کنارہ۔ اس کی جمع اَرْجَاءٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا﴾ (۶۹۔۱۷) اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے۔

اور رَجَاءٌ ایسے ظن کو کہتے ہیں جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾ (۷۱۔۱۳) تو تمہیں کیا بلا مار گئی کہ تم نے خدا کا وقار دل سے اٹھا دیا۔

میں بعض مفسرین نے اس کے معنیٰ لَا تَخَافُوْنَ کیے ہیں یعنی کیوں نہیں ڈرتے جیسے کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (طویل)

(۱۷۷) اِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ یَرْجُ لَسْعَهَا
وَحَالَفَهَا فِیْ بَیْتِ نوبٍ عَوَاسِلُ

جب اسے مکھی ڈنگ مارتی ہے تو وہ اس کے ڈسنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اس نے شہد کی مکھیوں سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف ورجاء باہم متلازم ہیں (جب کسی محبوب چیز کے حصول کی توقع ہوگی) ساتھ ہی اس کے تضیع کا اندیشہ بھی دامن گیر رہے گا۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس صورت میں اندیشہ کے ساتھ ہمیشہ امید پائی جاتی ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ﴾ (۴۔۱۰۴) اور تم کو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔

﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۱۰۶) اور کچھ اور لوگ ہیں کہ حکم خدا کے انتظار میں ان کا معاملہ ملتوی ہے۔

اَرْجَتِ النَّاقَةُ: اونٹنی کی ولادت کا وقت قریب آ گیا۔ اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ اونٹنی نے اپنے مالک کو قرب ولادت کی امید دلائی۔

---

❶ وصية اوصى بها عبدالله بن مغفل وقت الموت اى لاتجعلوا عليها الرجم ومعناه النهى عن التسنيم والرفع انظر الفائق ۱: ۲۳۳ والنهاية (۲: ۲۰۵) قال الجوهرى المحدثون يرونه بتخفيف الجيم والصحيح تشديدها ۱۲.

❷ قاله ابوذهيب الهذلى فى وصف مشتاروالبيت من شواهد الكشاف ۱۴۴ والطبرى (۱: ۳۱۳) والطبرسى وديوان الهذليين (۱: ۱۴۳) والاساس (۲: ۴۷۹) واللسان (نوب) ومجازالقران رقم ۳۰۹ والخزانة (۲: ۴۹۲) ورسالة المبرد (مااتفق لفظه واختلف معناه) والاضداد لابن الانبارى ۹ وابن السكيت ۷۹ والمقاييس (نوب) وابن ولاد ۴۳ والمعانى الكبير ۶۲۷ والجمهرة (اشعار) ۶۲ والقرطبى (۸: ۳۱۱) والدرة للحريرى ۱۰۷ وتهذيب اصلاح المنطق (۲/۱۴۲: ۱/۲۰۴) ومعانى القران المنسوب الى الفراء (۱: ۲۸۶) وفيه عوامل بدل عواسل والمشكل للقتبى ۱۴۷ وغريبه ۲۷۱ وفى روايه ابى الطيب (ابدال ۲: ۳۸۴) ورسالة الغفران (۲: ۴۳۲) والمخصص (۸: ۱۲۸/۱۷: ۱۱) والصحاح (نوب) واللسان والتاج (حلف) رجاء، دبر) واضداد ابى الطيب ۲۹۹ خالفها (بالخاء المعجمة) ورواية الاضداد اوللثلاثة حالفها (بالحاء المهملة) ۱۲.

اَلْاُرْجُوَان: ایک قسم کا سرخ رنگ جو رَجاء کی طرح فرحت بخش ہوتا ہے۔

(ر ح ب)

اَلرَّحْبُ: (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اسی سے رَحْبَةُ الْمَسْجِد ہے جس کے معنیٰ مسجد کے کھلے صحن کے ہیں اور رَحُبَتِ الدَّارُ کے معنیٰ گھر کے وسیع ہونے کے۔ پھر یہ رَحْبٌ کا لفظ استعارۃً پیٹ یا سینہ کی وسعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے رَحِبُ الْبَطْنِ: (بسیار خور) رَحِبُ الصَّدْرِ (فراخ سینہ) عالی ظرف کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے برعکس ضیق الصدر کا لفظ مجازاً تنگ سینہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:
﴿وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ (۹۔۲۵) اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی۔

اور بطور استعارہ جس کے نوکر چاکر بہت زیادہ ہوں اسے رَحِيبُ الْفِنَاءِ کہا جاتا ہے۔

مَرْحَبًا وَّاَهْلًا: تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے اہل میں آیا (یہ لفظ خوش آمدید کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے)

قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ۔ قَالُوا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ﴾ (۳۸۔۵۹،۶۰) ان پر خدا کی مار بے شک یہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں۔ (یہ سن کر وہ کہیں گے) بلکہ تم پر خدا کی مار۔

(ر ح ق)

رَحِيقٌ: (خالص عمدہ شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو) قرآن پاک میں ہے:
﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُوْمٍ﴾ (۸۳۔۲۵) ان کو شراب خالص سربند پلائی جائے گی۔

(ر ح ل)

اَلرَّحْلُ: ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لیے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے پھر یہ لفظ مجازاً خود اونٹ پر بولا جانے لگا ہے اور کبھی رَحْلٌ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ اس کی جمع رِحال آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ﴾ (۱۲۔۶۲) تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ ان کے کجاووں میں رکھ دو۔

اَلرِّحْلَةُ: (مصدر) اس کے اصل معنیٰ سفر یا کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۱۰۶۔۲) جاڑے اور گرمی کے سفروں کو (اکٹھا رکھنے والے)

اَرْحَلْتُ الْبَعِيْرَ: میں نے اونٹ پر پالان کسا۔

اَرْحَلَ الْبَعِيرُ: نے اونٹ کا اس قدر موٹا ہو جانا گویا موٹاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر پالان رکھا ہوا ہے۔

رَحَلْتُهٗ: میں نے اسے اس جگہ سے دور ہٹایا۔

اَلرَّاحِلَةُ: اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے۔

رَاحَلَهٗ: سفر کرنے میں اس کی مدد کی۔ مُرَحَّلٌ: وہ کپڑا جس پر کجاوے کی تصوریں بنی ہوئی ہوں۔

(ر ح م)

اَلرَّحِمُ: عورت کا رحم۔ اور رَحوم اس عورت کو

---

❶ ملاحظہ ہو فقہ اللغۃ للثالبی ۱۲ مترجم۔

کہتے ہیں جسے خرابی رحم کی بیماری ہو اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔کیونکہ تمام اقرباء ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔اور اس میں رِحِمٌ وَرُحْمٌ دولغت ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَقْرَبُ رُحْمًا﴾ (۱۸۔۸۱) اور قرابت میں (اس سے) بہتر (ہو)

اَلرَّحْمَةُ: وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنیٰ میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔جیسے: رَحِمَ اللّٰهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جب اس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے:
(۱۵۱) اِنَّ الرَّحمة مِنَ اللّٰهِ اِنْعام وافضال وَمن الادميين رقة وتعطف: کہ اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام وفضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقّت اور شفقت کے معنیٰ میں آتی ہے۔اسی معنیٰ میں آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے۔❶
(۱۵۲) ((اَنَّهُ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الرَّحِمَ قَالَ لَهُ اَنَا الرَّحْمٰنُ وَاَنْتَ الرَّحِمُ شَقَقْتُ اسْمَكَ مِنْ اسْمِی فَمَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهُ.)) کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس نے فرمایا: ''میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے پس جو تجھے ملائے گا۔(یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کروں گا''❷

اس حدیث میں بھی معنیٰ سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کردی ہے اور احسان کو اپنے لیے خاص کرلیا ہے تو جس طرح لفظ رحم، رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنیٰ جو لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس معنیٰ سے ماخوذ ہے جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنیٰ میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ، اَلرَّحِيْمُ: یہ دونوں فَعلانَ وَفَعِیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں❸ جیسے نَدْمَانٌ و نَدِيْمٌ پھر رحمٰن کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو،اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنیٰ بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۲۔۱۷۳) بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔
اور آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا:
﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ

---

❶ اخرجه ابوداود.
❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔
❸ راجع غريب القران للقتبي ٦ ومجازالقران لابی عبيدة ٢١ والطبری (١: ٥٨، ٥٩) وعلی ابی عبيدة ردا غيفا لقوله: ان الرحمن مجازه ذوالرحمة والرحيم مجازه الرحيم.

مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۹۔۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔

بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دُنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مؤمن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ (۷۔۱۵۶) اور ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل وناہل) سب چیزوں کو شامل ہے پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے جو پرہیز گاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مؤمنین کے ساتھ مختص ہوگی (اور کفار اس سے کلیۃً محروم ہوں گے)۔

(ر خ و)

اَلرُّخَاءُ: لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور یہ شَیْءٌ رِخْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ نرم چیز کے ہیں اور باب رَخِي يَرْخٰى بروزن عَلِمَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ﴾ (۳۸۔۳۶) تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کر دیا کہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق اسی طرف وہ نرمی سے چلتی۔

اور اسی سے اَرْخَيْتُ السِّتْرَ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنیٰ پردہ لٹکانے کے ہیں پھر اِرْخَاءُ السِّتْرِ سے بطور استعارہ اِرْخَاءُ سَرْحَانٍ بولا جاتا ہے جس کے معنیٰ بھیڑیئے کی تیزی کے ہیں۔ اور ذویب نے کہا ہے: [1] (الکامل)

(۱۷۸) "فَهِيَ رِخْوٌ تَمْزَعُ"

اور وہ ہوا کی طرح تیز اور نرم رفتار ہے۔

فَرَسٌ مِرْخَاءٌ: تیز گھوڑی۔ خیل مراخ تیز رو گھوڑے۔

اَرْخَيْتُه: میں نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی کہ تیز رفتاری سے چلے۔

(ر د د)

اَلرَّدُّ: (ن) اس کے معنیٰ کسی چیز کو لوٹا دینے کے ہیں خواہ ذات شے کو لوٹایا جائے یا اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کو۔ محاورہ ہے۔ رَدَدْتُهُ فَارْتَدَّ: میں نے اسے لوٹایا پس وہ لوٹ آیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۶۔۱۴۸) (مگر تا بکے) لوگوں سے اس کا عذاب تو ہمیشہ کے لیے ٹلنے والا ہی نہیں۔

اور ذات شے کو واپس لوٹانے کے متعلق فرمایا:

---

[1] قطعة من عجز البيت لابی ذؤيب وتكملته: فعدوابه خوصا يفصم جريها ۔حلق الرحالة .... والبيت من كلمة مفضلية جمهرية طويلة فی ٦٥ بيتاً (٢٢١-٢٢٩) والبيت فی السمط (٤٤٨-٧٤١) والسيوطی ٩٢ والجمهرة ٢٤٦ و الاقتضاب ٤١٣ والمحكم (رحل) وديوان الهذليين (١ : ١٦) واللسان (خو).

﴿لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (۶۔۲۸) اور اگر (دنیا میں) واپس بھیج دیئے گئے تو جس چیز سے ان کو منع کیا گیا ہے اس کو دوبارہ کریں۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۷۔۶) پھر ہم نے (تم کو) دشمنوں پر (غلبہ دے کر دوبارہ) تمہارے دن پھر دیئے۔

﴿رُدُّوْهَا عَلَيَّ﴾ (۳۸۔۳۳) (تو) ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔

﴿فَرَدَدْنَاهُ اِلٰى اُمِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۳) غرض ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

﴿يَالَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ﴾ (۶۔۲۷) اے کاش ہم پر دنیا میں واپس بھیج دیے جائیں اور پروردگار کی آیتوں (کو) نہ جھٹلاتے۔

اور کسی کو اس کی پہلی حالت کی طرف رد کرنے کے متعلق ہے۔فرمایا:

﴿يَرُدُّوْكُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ﴾ (۳۔۱۴۱) تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا کرلے جائیں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ (۱۰۔۱۰۷) اگر (اللہ تعالیٰ) تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کا روکنے والا نہیں۔ میں رَآدَّ کے معنیٰ روکنے والا اور دفع کرنے والا کے ہیں۔اور یہ معنیٰ آیت:

﴿عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ﴾ (۱۱۔۷۶) (اور ان لوگوں پر ایسا) عذاب آنے والا ہے جوٹل نہیں سکتا۔ میں مراد ہے اور اسی سے اَلرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴾ (۱۸۔۳۶) (تو جب) میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹا جاؤں گا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا۔(بہر حال) اس دنیا سے (تو اس جگہ کو) بہتر ہی پاؤں گا۔

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۹۔۹۴) پھر آخر کار تم اس (قادر مطلق) کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے۔

﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ﴾ (۶۔۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے۔

تو یہاں رَدٌّ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں رَجْعٌ کا لفظ ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اَلرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں۔(۱) ایک معنیٰ وہ ہے جس کا ذکر آیت کریمہ: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾ (۲۰۔۵۵) میں ہے (یعنی فوت کر کے) زمین کی طرف لوٹا دینا اور دوسرے معنیٰ وہ ہیں جس کی طرف کہ:

﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (۲۰۔۵۵) میں ارشاد فرمایا ہے یعنی فوت کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا لیکن یہ دو معنیٰ دو حالتوں کے اعتبار سے ہیں اور رَدٌّ کا لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے دونوں معنیٰ کو شامل ہے اور آیت: ﴿فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴۔۹) کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں ایک یہ کہ غصہ سے پشت دست کاٹنے لگے۔ دوم یہ کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی طرف اشارہ ہے تیسرے یہ کہ اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر کا مرجع انبیاء کو قرار دیا جائے یعنی انہوں نے انبیاء کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں خاموش کر دیا

اور ردٌّ کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہو کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا۔ ❶

اور آیت: ﴿لَو یَرُدُّوْنَکُمْ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہِمْ کُفَّارًا﴾ (۲۔۱۰۹) کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو کافر بنا دیں۔

میں رَدٌّ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ حالت کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں جسے تم چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ یَرُدُّوْا بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کَافِرِیْنَ﴾ (۳۔۹۹) لوگو! تم اہل کتاب کے کسی فرقے کا بھی کہا مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔

اَلْاِرْتِدَادُ وَالرِّدَّۃُ: اس راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو۔لیکن رِدَّۃ کا لفظ کفر کی طرف لوٹنے کے ساتھ مختص ہو چکا ہے اور ارتداد عام ہے جو حالت کفر اور غیر دونوں کی طرف لوٹنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی﴾ (۴۷۔۲۵) بے شک جو لوگ اپنی پشتوں پر لوٹ گئے (اس کے) بعد کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہوگئی۔اور آیت کریمہ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ﴾ (۵۔۵۴) میں اسلام سے کفر کی طرف لوٹنا مراد ہے اور یہی معنیٰ آیت:

﴿وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ﴾ (۲۔۲۱۷) میں مراد ہیں: ﴿وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا﴾ (۶۔۷۱) تو (کیا اس کے بعد) بھی الٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائیں گے۔

اور غیر کفر کی طرف لوٹنے کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ﴾ (۵۔۲۱) اور اپنی پشتوں پر مت پھرو یعنی کسی کام کی تحقیق کر لینے اور اس کی اچھائی کو جان لینے کے بعد اسے مت چھوڑو۔

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) پھر دونوں اپنے (پیروں کے) نشانوں کے کھوج لگاتے الٹے پاؤں پھرے۔

﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا﴾ (۱۲۔۹۶) پھر جب یوسف علیہ السلام کے زندہ وسلامت ہونے کی خوشخبری دینے والا (یعقوب علیہ السلام کے پاس) آ پہنچا تو اس نے (آنے کے ساتھ ہی یوسف کا کرتہ) یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ فوراً بینا ہو گئے۔یعنی ان کی بینائی ان کی طرف لوٹ آئی اور رَدَدْتُ الْحُکْمَ اِلٰی فُلَانٍ کے معنیٰ کسی کے فیصلہ سپرد کر دینے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ﴾ (۴۔۵۹) پھر اگر کسی امر میں تم (اور حاکم وقت) آپس میں جھگڑ پڑو تو اس امر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طرف رجوع کرو۔

---

❶ والبسط ما رایت البحث فی الآیۃ فی امالی المرتضیٰ راجع (۳۶۵۔۳۶۷)۔

عام محاورہ ہے: رَادَّهٗ فِیْ کَلَامِہٖ: کسی سے بحث کرنا حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۳) اَلْبَیِّعَانِ یَتَرَادَّانِ: یعنی بائع اور مشتری بیع کو رد کر دیں۔

رَدَّةُ الْاِبِلِ: اونٹوں کا دوبارہ پانی پینے کو جانا۔

اَرَدَّتِ النَّاقَةُ: (۱) اونٹنی کا ولادت سے قبل پستان نکالنا۔ (۲) نمناک زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے اونٹنی کے پستان اور مخصوص جگہ پر ورم ہو جانا۔

اِسْتَرَدَّ الْمَتَاعَ: سامان واپس لے لینا۔

(ر د ی)

اَلرِّدْءُ: جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْ﴾ (۲۸۔۳۴) ان کو مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دو کہ میری تصدیق کریں۔

اور اَرْدَئَهٗ کے معنیٰ کسی کی مدد کرنا کے ہیں اور رَدِیءٌ (ردی) بھی اصل میں رِدْءٌ کے ہم معنیٰ ہے مگر عرف میں متاخر مذموم پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَدُءَ الشَّیْءُ رَدَائَةً فَهُوَ رَدِیءٌ: کسی شے کا ردی ہونا۔

(ر د ف)

اَلرِّدْفُ: تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو اور رِدْفُ الْمَرْءَةِ کے معنیٰ عورت کی سرین کے ہیں۔

اَلتَّرَادُفُ: یکے بعد دیگرے آنا۔ ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔

اَلرَّادِفُ: متاخر، یعنی پچھلا۔

اَلْمُرْدِفُ: اگلا جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ﴾ (۸۔۹) سو اس نے تمہاری سن لی (اور فرمایا) کہ ہم لگاتار ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدِفَ وَاَرْدَفَ: یعنی مجرد اور مزید فیہ ایک ہی معنیٰ میں آتے ہیں ❷ اس لیے انہوں نے مُرْدِفِیْنَ کا معنیٰ ''بعد میں آنے والے'' کیا ہے۔ اور یہ شاہد پیش کیا ہے۔ ❸

(۱۷۹) ''اِذَا الْجَوْزَاءُ اَرْدَفَتِ الثُّرَیَّا''

جب ثریا کے پیچھے جوزاء ستارہ نکل آیا۔

---

❶ رواه النسائی عن سمرة وابوداؤد وابن ماجة عن ابی بردة والمستدرك عن ابن عمرو والبخاری عن ابن عمرومتفق علیه عن حکیم ابن حزام (راجع الفتح للنبهانی (۲ : ۲۰).

❷ وکذا قال ابن الاعرابی راجع شرح الدرة ۲۰۱ ومجازابی عبیدة (۱ : ۲٤۱) والحجة لابی علی الفارسی (۱ : ۱۹۳) والقرطبی (۷ : ۳۷۱) ونقل عن ابی عبیدة الحافظ فی الفتح (۸ : ۲۳).

❸ راجع اللسان (ردف ، قرط) قاله خزیمة بن نهدو کان یعشق فاطمة بنت یشکروفیها یقول وتمامه : ظننت بآل فاطمة الظنونا۔ وبعده یقول : حالت دون ذالك من هموم ۔ هموم تورث الداء الدفینا والبیت فی الطبری (۹ : ۱۹۱) وشرح الدرة ۲۰۱ والبحر (۷ : ۲۱٦) غیر منسوب وفی السمط (۱ : ۹۹) انه لخزیمة (مثل کریمة) بن نهد قال الاستاذ المیمنی هذا هوالصحیح وهو مصحف فی حل الکتب بخزیمة اوجذیمة الافی المعجم البکری ١٤ والمشتبه فانه ضبطه بالصواب والبیت فی التاج (ردف) وشرح المعلقات لابن الانباری ۷۸ والتبریزی ۳۷ وحزیمة هذا مترجم له فی المعجم البکری ١٤ ورجع ایضاً المیدانی (۲۸۸، ۳۷٤، ۳۹۰) وکتاب البسوس ۷ وانظر لمعناه الانواء للقتبی والخبربطوله فی الاغانی (۱۱ : ۱۵٤).

مگر ابوعبیدہ کے علاوہ دوسرے علماء نے مُرْدِفِیْنَ کے معنیٰ یہ کیے ہیں "دوسرے فرشتوں کو پیچھے لانے والے" تو اس لحاظ سے گویا دو ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی گئی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ مُرْدِفِیْنَ سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو اسلامی لشکر کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیں۔

اور ایک قرأت میں مُرْدَفِیْنَ فتح دال کے ساتھ ہے [1] یعنی ہر ایک مسلمان فوجی کے پیچھے اس کی مدد کے لیے ایک فرشتہ متعین تھا۔

ایک اور قرأت میں مُرَدِّفِیْنَ بتشدید دال ہے جو دراصل مُرْتَدِفِیْنَ باب افتعال سے ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تاء کو دال میں ادغام کرکے اس کی حرکت دال کو دے دی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ o بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ﴾ (۳۔۲۳،۲۴) کیا تم کو اتنا کافی نہیں کہ تمہارا رب (آسمان سے) تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد فرمائے (ضرور کافی ہے) بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو (اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو اور دشمن (ابھی) اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو بڑی سج دھج سے آموجود ہوں گے۔

اَرْدَفْتُهٗ: میں نے اسے اپنے پیچھے سوار کیا۔

اَلرِّدَافُ: سواری پر ردیف کے بیٹھنے کی جگہ۔

دَابَّةٌ لَا تُرَادِفُ اَوْلَا تُرْدَفُ: سواری جو ردیف کو سوار نہ ہونے دے۔

جَاءَ وَاحِدٌ فَاَرْدَفَهٗ اٰخَرُ۔ ایک کے بعد دوسرا آیا۔

اَرْدَافُ الْمُلُوْكِ۔ بادشاہوں کے جانشین، نائب۔

(ر د م)

اَلرَّدْمُ: پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا﴾ (۱۸۔۹۵) میں تم (لوگوں) میں اور ان (لوگوں) میں ایک روک بنا دوں۔

رَدْمٌ بمعنیٰ مَرْدُوْمٌ یا مُرْدَمٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے [2] (الکامل)

(۱۸۰) هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ

کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح مقام چھوڑا ہے (جس پر طبع آزمائی کی جائے)

اَرْدَمَتْ عَلَیْهِ الْحُمّٰی: کسی کو دائمی بخار رہنا۔

سَحَابٌ مُرْدِمٌ ساکن اور ایک جگہ پر ٹھہرنے والا بادل۔

(ر د ی)

اَلرَّدٰی: (س) کے معنیٰ ہلاکت کے ہیں اور اَلتَّرَدِّیْ: (تفعل) کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو ہلاکت

---

[1] قرء اهل المدینة ویعقوب مردفین بفتح الدال والباقون بالکسر وقریء فی الشواذ مردّفین (راجع الطبری ۹ : ۱۱۱).

[2] قاله عنترة العبسی وتمامه : ام هل عرفت الدار بعد هم والبیت من معلقته تسمیٰ المذهبة راجع السیوطی ۱٦٤ والامالی (۲ : ۱٤۲) قال المیمنی فی السمط ۷٦۹ البیت لایوجد فی شرحی التبریزی والزوزنی ویوجدفی دیوان الستة ٤٤ (العقد الثمین) رقم ۲۱ مطلع قصیدة وانظر ایضاً ابن الانباری ۲۹٤ والتبریزی ۱۷۲ رواه ابو عمرو عن ابی حزام العکلی فقط والبیت من شواهد الطبری (۱٦ : ۲۳) والشعراء الجاهلی (۱ : ۳۷۹) واللسان (روم) ویروی من مترجم وفی روایة ابی عبیدة مترجم راجع ابدال ابی الطیب (۲ : ۵۸) والجمهرة ۱٦۱ والشطرفی المثل السائر (۱ : ۳٤۷).

کے سامنے پیش کرنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى﴾ (۹۲۔۱۱) اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔
﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى﴾ (۲۰۔۱۶) اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا (اگر ایسا کروگے) تو تم تباہ ہوجاؤ گے۔
۔(اَلْاِرْدَاءُ: (افعال) ہلاک کرنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ﴾ (۳۷۔۵۶) خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کرنے کو تھا۔
اَلْمِرْدَاةُ: پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جاتے ہیں۔

(ر ذ ل)

اَلرَّذْلُ وَالرُّذَالُ: وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔
قرآن میں ہے:
﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۶۔۷۰) اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو بدترین حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔
﴿اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ﴾ (۱۱۔۲۷) مگر جو ہم میں سے رذالے ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے۔
﴿اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۱) کیا ہم تمہاری بات تسلیم کرلیں۔حالانکہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے متبع ہیں۔
یہ ارذل کی جمع ہے جس کے معنیٰ حقیر اور ذلیل شخص کے ہیں۔

(ر ز ق)

اَلرِّزْقُ: وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنیٰ نصیبہ بھی آجاتا ہے۔اور کبھی اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بنتی ہے۔کہا جاتا ہے۔
اَعْطَى السُّلْطَانُ رِزْقَ الْجُنُوْدِ: بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔
رُزِقْتُ عِلْمًا: مجھے علم عطا ہوا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۶۳۔۱۰) یعنی جو کچھ مال وجاہ اور علم ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے صَرف کرو اسی طرح آیت:
﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ (۲۔۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) صَرف کرتے ہیں۔میں بھی رزق عام ہے جو ان تینوں کو شامل ہے۔
﴿كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (۲۰۔۸۱) اور ہم نے جو تم کو عمدہ اور پاکیزہ (روزیاں) دی ہیں (شوق سے) کھاؤ۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ (۵۶۔۸۲) میں رزق کے معنیٰ حصہ اور نصیبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنا لیا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ﴾ (۵۱۔۲۲) اور تمہارا رزق آسمان میں ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد بارش ہے جو ہر

ذی حیات کے لیے باعث حیات ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ اورہم نے آسمان سے بارش کی اوربعض نے کہا ہے کہ رزق سے مرادنصیبہ ہے اور آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ حظوظ یعنی نصیبے مقادیر کے ساتھ ہیں اور آیت:

﴿فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ﴾ (۱۸۔۱۹) تو اس میں سے (بقدرضرورت) کھانا تمہارے پاس لے آئے۔

میں رزق سے مراد طعام ہی ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ﴾ (۵۰۔۱۰،۱۱) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کے گیلیں خوب گتھی ہوئی ہیں بندوں کوروزی دینے کے لیے۔

میں رزق سے مراد غذائی اشیاء مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کھانے پہننے اور ہرقسم کے استعمال کی چیزیں مراد ہیں۔کیونکہ یہ تمام چیزیں قدرت الٰہی کے ساتھ بارش کے ذریعہ ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔اور آیت:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوا فِيْ سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (۳۔۱۶۸) اور (اے پیغمبر!) جولوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کومراہوا خیال نہ کرنا (یہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں ان کوان کے پروردگار کے ہاں روزی ملتی ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر اخروی نعمتوں کا برابر فیضان ہورہا ہے۔

اسی طرح آیت:

﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا﴾ (۱۹۔۶۲) اور وہاں ان کا کھانا صبح وشام (جس وقت وہ چاہیں گے ان کو ملا کرے گا) میں انعامات اخروی ہی مراد ہیں۔اور آیت:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) اللہ تعالیٰ خود بڑا روزی دینے والا،قوت والا اور زبردست ہے۔

میں رزق کا لفظ عموم پر محمول ہوگا اور ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے۔لیکن رَازِقٌ کا لفظ خالق رزق اوراس کے دینے والے اور مسبب تینوں پر بولا جاتا ہے اس لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اوراس انسان پر بھی جو دوسروں تک رزق پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔لہٰذا آیت: ﴿وَجَعَلْنَالَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرَازِقِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۰)......اورہم (ہی) نے زمین میں تمہارے لیے سامان معیشت پیدا کیا اوران کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔یعنی جن کی روزی کا نہ تم سبب بنتے ہواور نہ ہی تمہیں ان کی روزی میں کسی قسم کا دخل ہے اسی طرح آیت:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ان (معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں وزمین میں ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی (ایسے اختیار پر) دسترس پاسکتے ہیں۔میں لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا سے مراد یہ ہے کہ انہیں رزق دینے میں کسی قسم کا بھی دخل نہیں ہے (اور تمام اسباب رزق خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔) عام محاورہ ہے: اِرْتَزَقَ الْجُنْدُ: یعنی لشکر نے اپنا مقررہ راشن حاصل کیا اور وہ راشن جو ایک دفعہ دیا جائے

اسے رَزْقَۃ کہا جاتا ہے۔

(ر س س)

﴿وَاَصْحٰبُ الرَّسِّ﴾ (۵۰۔۱۲) اور رس کے رہنے والوں نے۔

بعض نے کہا ہے: رَسٌّ ایک وادی کا نام ہے [1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الطویل)

(۱۸۱) وَھُنَّ لِوَادِی الرَّسِّ کَالْیَدِ لِلْفَم

اور وہ وادی رس کے لیے جیسے ہاتھ منہ کی طرف اصل میں رَسٌّ کسی چیز کے تھوڑے سے نشان کو کہا جاتا ہے۔ عام محاورہ ہے:

سَمِعْتُ رَسًّا مِّنْ خَبَرٍ: میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی رَسَّ الْحَدِیثُ فِی نَفْسِی: میرے دل میں تمہاری بات کا تھوڑا سا اثر ہوا۔

وَجَدَ رَسًّا مِنْ حُمَّی: اس نے بخار کا تھوڑا سا اثر محسوس کیا۔

رُسَّ الْمَیِّتُ: میت دفن ہوگئی اور اس کی شخصیت کے بعد اب اس کے آثار باقی رہے۔

(ر س خ)

رَسُوخُ الشَّیْءِ: کسی چیز کا محکم اور جائے گیر ہوجانا۔ رَسَخَ الْغَدِیرُ: جوہڑ کا پانی خشک ہوکر زمین میں جذب ہوگیا۔

اَلرَّاسِخُ فِی الْعِلْمِ: وہ محقق جسے کوئی اشکال اور شبہ پیش نہ آئے گویا یہ راسخ فی العلم لوگ وہی ہیں۔ جو آیت: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾ (۴۹۔۱۵) پس سچے مسلمان تو وہ ہیں) جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک وشبہ نہیں کیا میں مذکور صفات کے ساتھ متصف ہیں۔ اور اسی طرح سورۂ نسا میں فرمایا: ﴿لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْھُمْ﴾ (۴۔۱۶۲) لیکن (اے پیغمبر) ان میں سے جو علم میں بڑی پائے گاہ رکھتے ہیں۔

(ر س ل)

اَلرِّسْلُ: اصل میں اس کے معنیٰ آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَۃٌ رِسْلَۃٌ: نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اور سبکی کے ساتھ اٹھنے والے اونٹوں کو اِبِلٌ مَرَاسِیلُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے رسول ہے جس کے معنیٰ ہیں روانہ ہونے والا پھر کبھی رفق اور نرمی کے لحاظ سے عَلٰی رِسْلِكَ کہہ دیتے ہیں یعنی اپنے حال پر سکون سے ٹھہرے رہیے اور کبھی صرف روانہ ہونے کا معنیٰ لے لیتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اس سے رسول مشتق ہے مگر کبھی رسول کا لفظ صرف پیغام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [3]

(۱۸۲) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا

---

[1] ابن کثیر (۳: ۳۱۹) عن ابن عباس قریة من قریٰ ثمود وفی روية ابن ابی حاتم عن ابن عباس انها اسم بئر فی آذر بائیجان قیل ان قوماً دفنوا فیها نبیهم وفی تفسیر الطبری ان اصحاب الرس هم اصحاب الاخدود وفی البخاری الرس معدن وجمعه ارساس وقیل قوم شعیب راجع البخاری مع الفتح.

[2] قاله زهیر فی معلقته دیکھیے صفحہ ۳۹۶ حاشیہ نمبر ۱۔

[3] قاله زهیر بن ابی سلمیٰ واوله: بکرن بکوراواستحرن بسحرة ۔ والبیت فی الکامل ۸۱۴ ومختار الشعرالجاهلی (۱: ۱۵۲) والبحر (۲: ۳۹۸) والعقد: ۵۴ وایام العرب ۲۷۲ والتبریزی فی العشر ۱۰۵ وابن الانباری ۵۰ وفی روایته فهن ووادی الرس ۱۲.

ابوحفص (عمر رضی اللہ عنہ) کو میرا پیغام پہنچادو۔

اور کبھی اس شخص پر جسے پیغام دے کر بھیجا گیا ہو اور واحد جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (۹۔۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿اِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۶) ہم تمام جہان کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اور شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۸۳) اَلِكْنِي اِلَيْهَا وَخَيرُ الرسُولِ
اَعْلَمُ بِنَواحِي الْخَبَر

اسے میرا پیغام پہنچادو اور بہتر پیغام بر تو وہ ہوتا ہے جو خبر کو اچھی طرح جانتا بھی ہو۔

اور رسول کی جمع رُسُلٌ آتی ہے اور قرآن پاک میں رسول اور رُسُلُ اللّٰهِ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ (۸۱۔۱۹) کہ یہ (قرآن) بے شک معزز فرشتے (یعنی جبریل) کا (پہنچایا ہوا) پیام ہے۔

﴿اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ﴾ (۱۱۔۸۱) ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

﴿وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْءَ بِهِمْ﴾ (۱۱۔۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ غمزدہ ہوئے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيمَ بِالْبُشْرٰى﴾ (۱۱۔۶۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔

﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا﴾ (۷۷۔۱) قسم ہے ان فرشتوں کی جو پیام الٰہی دے کر بھیجے جاتے ہیں۔

﴿بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) کیوں نہیں (ضرور سنتے ہیں) اور (سننے کے علاوہ) ہمارے فرشتے ان کے پاس (تعینات ہیں کہ وہ ان کی سب باتیں) لکھے جاتے ہیں۔

اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ (۳۔۱۴۴) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہے اور بس۔

﴿يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۵۔۶۷) اے پیغمبر! جو احکام تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلاکم وکاست) ان کو لوگوں تک پہنچادو۔

اور آیت: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (۶۔۴۸) اور پیغمبروں کو ہم صرف اس غرض سے بھیجا کرتے ہیں کہ (نیکوں کو خوشنودیِ خدا کی) خوشخبری سنائیں اور (بروں کو عذاب سے) ڈرائیں۔

---

❶ قاله جعدة بن عبدالله السلمي وتمامه : فدى لك من اخى ثقة ازارى ـ والبيت في اللسان (ازر) في ستة ابيات قال احد مصحح اللسان ولعل الاولىٰ ان يقول قول نضيلة الاكبر الاشجعي بدل جعدة والبيت في الوحشيات ١٠٨ مع الخمسة قال في زيله لبقيلة الاكبرا ولرجل من الانصار مع سلمة راجع الآمدى ٦٣٠ وكنايات الثعالبى ٣ واللسان (قلص ، ازر) والعمدة (١ : ٢١٤) والفصول والغايات ١٦٥ قال احمد شاكر ووهى ايضاً طبقات ابن سعد (٣ : ٢٠٥) والفائق (٢ : ١٣١) والصناعتين ٣٥٣.قاله ابوذؤيب الهذلي والبيت من شواهد الطبرى (٣٦-١٥٨) والطبرسى.......... واللسان (رسل ، الك) والمحكم (حى)١٢.

میں ملائکہ اور انسان دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور آیت:
﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (۲۳۔۵۱) (ہم تو اپنے پیغمبروں سے یہی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ اے گروہِ پیغمبراں! ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔
میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے تمام برگزیدہ اصحاب مراد ہیں اور صحابہ کرام پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تبعاً رُسُل کا لفظ بولا گیا ہے جیسا کہ مُهَلَّبُ اور ان کی اولاد کو مَهالبه کہا جاتا ہے۔

اَلْاِرْسَالُ: (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری محبوب یا مکروہ چیزوں کے لیے بھی آتا ہے کبھی (۱) یہ تسخیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے ہوا، بارش وغیرہ کا بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِدْرَارًا﴾ (۶۔۶) اور (اوپر سے) ان پر موسلا دھار مینہ برسایا۔ اور کبھی (۲) کسی با اختیار وارادہ شخص کے بھیجنے پر بولا جاتا ہے جیسے پیغمبر بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً﴾ (۶۔۶۱) اور تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات رکھتا ہے۔
﴿فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۵۳) اس پر فرعون نے (لوگوں کی بھیڑ) جمع کرنے کے لیے شہروں میں ہرکارے دوڑائے۔
اور کبھی (۳) یہ لفظ کسی چیز کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینے اور اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا﴾ (۱۹۔۸۳) (اے پیغمبر) کیا تم نے (اس بات پر) غور نہیں کیا کہ ہم نے شیاطین کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے اور وہ انہیں انگیخت کر کے اکساتے رہتے ہیں۔
اور کبھی (۴) یہ لفظ امساک (روکنا) کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (۳۵۔۲) تو اللہ جو اپنی رحمت (کے لنگر لوگوں کے لیے) کھول دے تو کوئی اس کا بند کرنے والا نہیں اور بند کرے تو اس کے (بند کیے) پیچھے کوئی اس کا جاری کرنے والا نہیں۔
اور رَسْلٌ اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو پیہم اور نرم رفتاری سے چلے اور اگر لوگ یکے بعد دیگرے متواتر آئیں تو کہا جاتا ہے جَاؤُا اَرْسَالًا یعنی وہ یکے بعد دیگرے آئے۔ اور اسی سے رِسْلٌ اس زیادہ دودھ کو کہتے ہیں جو مسلسل آرہا ہو۔

(ر س و)

رَسَا الشَّیْءُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے کسی جگہ پر ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں اور اَرْسٰی کے معنی ٹھہرانے اور استواء کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ﴾ (۳۴۔۱۳) اور بڑی بھاری بھاری دیگیں جو ایک جگہ پر جمی رہیں۔
﴿وَرَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ﴾ (۷۷۔۲۷) اور اونچے اونچے پہاڑ۔ یہاں پہاڑوں کو بوجہ ان کے ثبات اور استواری کے رَوَاسِیْ کہا گیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا﴾ (۷۹۔۳۲) اور پہاڑوں

کو (اس میں گاڑ کر) پلایا۔

اسی طرح معنیٰ ثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اوتاد فرمایا ہے۔ جیسے: ﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ (۷۸۔۵) اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (البسیط)

(۱۸۴) وَلَا عِمَادَ اِذَا لَمْ تُرْسِ اَوْتَادَ

اور میخوں کے بغیر ستون نہیں ٹھہر سکتے۔ عام محاورہ ہے: اَلْقَتِ السَّحَابَةُ مَرَاسِيْهَا کہ بادل نے اپنے لنگر ڈال دیے یعنی جم کر برسنے لگا جیسا کہ اسی معنیٰ میں اَلْقَتْ طُنُبَهَا کہا جاتا ہے اور قرآن پاک میں ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مُجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا﴾ (۱۱۔۱۴) اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔

تو یہ اَجْرَيْتُ وَاَرْسَيْتُ (باب افعال) سے ماخوذ ہے اور مُرْسًی کا لفظ مصدر میمی بھی آتا ہے اور صیغۂ ظرف زمان و مکان اور اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت مذکورہ الصدر میں ایک قرأت مَجْرٰهَا وَمَرْسٰهَا بھی ہے۔ ❷ اور آیت:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا﴾ (۷۔۱۸۷) (اے پیغمبر! لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا تھل بیڑا بھی ہے؟ (یعنی کب واقع ہوگی۔

میں مُرْسَاهَا سے اس کے بپا ہونے کا زمانہ مراد ہے۔ عام محاورہ ہے: رَسَوْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ: میں نے قوم کے درمیان صلح کو پختہ کر دیا۔

(ر ش د)

اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ: یہ غَیٌّ کی ضد ہے اور ہدایت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور یہ باب نَصَرَ وَعَلِمَ دونوں سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ (۲۔۱۸۶) تاکہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۲۔۲۵۶) گمراہی سے ہدایت الگ ہوچکی۔

﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا﴾ (۴۔۶) اور اگر تم ان میں صلاحیت دیکھو۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ (۲۱۔۶۱) اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔

ان آیات میں ابراہیم اور یتیم دونوں کے متعلق رُشد کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دونوں میں بون بعید پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا کہ رَشَدٌ (بفتح الراء والشین) رُشد بضم الراء سے اخص ہے کیونکہ رُشد کا لفظ امور دینوی اور اخروی دونوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ (۴۹۔۷) یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

﴿وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ﴾ (۱۱۔۹۷) اور فرعون کی

---

❶ قاله الافوه الاودی (واسمه، صلاءة بن عمرو يكنى ابا ربيعة) وصدره : والبيت لا يبتنى الا ماعمدة .... وفى القالى الاله عمدٌ۔ وفى المطبوع ولاحبال ۔اخشى ان يكون مصحفا والبيت من باب التمثيل اى لاينال الامرالابتو فراسبابه وفى الطرائف من شعر الافوه الاودى والبيت فى روضة العقد ۲۴۶ والبحر ۸ : ۴۱۱ وانظر لتخريجه ايضاً (امر) .

❷ نسبه ابن كثير ابى رجاء العطاردى (۲ : ۴۴۶).

بات کچھ راہ کی بات تو تھی نہیں۔

(ر ص ص)

رَصٌّ (ن) کے معنیٰ دو چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ دینے کے ہیں اور رَصَاصٌ سیسہ کو کہتے ہیں اور اسی سے فرمایا:

﴿کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ (۶۱۔۴) گویا ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔

اور رَصَصْتُہٗ (ن) وَرَصَّصْتُہٗ (تفعیل) کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی کسی چیز کو سیسہ پلا کر مضبوط کرنا اور جوڑنا اور تَرَاصُّوْا فِی الصَّلٰوۃِ کے معنیٰ ہیں نماز میں صف میں باہم پیوستہ ہو کر کھڑے ہونا اور تَرْصِیْصُ الْمَرْءَۃِ کے معنیٰ ہیں عورت کا نقاب مضبوطی سے باندھنا اور اس میں تَرَصُّصٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ر ص د)

اَلرَّصْدُ: گھات لگا کر بیٹھنا۔ اور رَصَدَلَہٗ وَتَرَصَّدَ کے معنیٰ ہیں کسی کے لیے گھات لگانا اور اَرْصَدْتُـہٗ: کسی کو گھات لگانے کے لیے مقرر کرنا اور اَرْصَدَلَـہٗ کے معنیٰ پناہ دینا بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ﴾ (۹۔۱۰۷) اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (۸۹۔۱۴) بے شک تیرا پروردگار (نافرمانوں کی) تاک میں (لگا رہتا ہے)

رَصَدٌ: (صیغہ صفت) یہ معنیٰ فاعلی اور مفعولی دونوں کے لیے آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا﴾ (۷۲۔۲۷) تو ان کے آگے اور ان کے پیچھے (فرشتوں سے) پہرہ دینے والے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

تو یہاں رَصَدًا سے واحد اور جمع دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اَلْمَرْصَدُ: گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (۹۔۵) اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔

اور مِرْصَاد بمعنیٰ مَرْصَدٌ آتا ہے لیکن مِرْصَاد اس جگہ کو کہتے ہیں جو گھات کے لیے مخصوص ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ جَھَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا﴾ (۷۸۔۲۱) بے شک دوزخ گھات میں ہے۔

تو آیت میں اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ جہنم کے اوپر سے لوگوں کا گزر ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا﴾ (۱۹۔۷۱) اور تم میں سے کوئی (ایسا بشر) نہیں جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔

(ر ض ع)

رَضَعَ الْمَوْلُوْدُ: (ض س) رِضَاعًا وَّرَضَاعَۃً: بچے کا دودھ پینا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر انتہائی کمینے کو لَئِیْمٌ رَاضِعٌ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس کنجوس شخص پر بولا جاتا ہے جو انتہائی بخل کی وجہ سے رات کے وقت اپنی بکریوں کے پستان سے دودھ چوس لے تاکہ کوئی ضرورت مند دودھ دوہنے کی آواز سن کر سوال نہ کرے۔ پھر اس سے رَضُعَ فُلَانٌ بمعنیٰ لَئُمَ استعمال ہونے

لگا ہے۔رَاضِعَتَان: بچے کے اگلے دو دانت جن کے ذریعہ وہ ماں کی چھاتی سے دودھ چوستا ہے۔اور اَرْضَاع (افعال) کے معنیٰ دودھ پلانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (۲۔۲۳۳)اور جو شخص پوری مدت تک دودھ پلانا چاہے تو اس کی خاطر مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔نیز فرمایا:

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (۶۵۔۶)اگر وہ (بچے کو) تمہارے لیے دودھ پلانا چاہیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی دو۔

عام محاورہ ہے:

فُلَانٌ اَخُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ: (بضم الراء)وہ فلاں کا رضاعی بھائی ہے۔حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۵)يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ: جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ بوجہ رضاعت کے بھی حرام ہوجاتے ہیں۔

اَلِاسْتِرْضَاعُ: کسی سے دودھ پلوانا۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ﴾ (۲۔۲۳۳)اگر تم اپنی اولاد کو(کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو۔یعنی انہیں مزدوری دے کر دودھ پلوانے کا ارادہ ہو۔

(ر ض و)

رَضِيَ (س) رِضًا فَهُوَ مَرْضِيٌّ وَّمَرْضُوٌّ۔ ❷

راضی ہونا۔واضح رہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ قضائے الٰہی سے اس پر وارد ہو وہ اسے خوشی سے برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کے بندے پر راضی ہونے کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اسے اپنے اوامر کا بجا لانے والا اور منہیات سے رکنے والا پائے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (۵۔۱۱۹)اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۱۸)تو اللہ تعالیٰ ضرور ان مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔

﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۵۔۳)اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا۔

﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۹۔۳۸) کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو رضا مند کردیتے ہیں اور ان کے دل ہیں کہ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں۔

﴿وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا اٰتَيْتَهُنَّ﴾ (۳۳۔۵۱) اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ (بھی) تم ان کو دو گے وہ (لے کر سب کی سب) راضی ہوجائیں گی۔

اَلرِّضْوَانُ: رضائے کثیر یعنی نہایت خوشنودی کو کہتے ہیں۔چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اس لیے قرآن پاک میں خاص کر رضائے الٰہی کے

---

❶ الحديث في (حم ، ق، د، ن ، ه عن عائشة حم ، م ، ن ، ه، عن ابن عباس) وفي رواية من الولادة بدل النسب وابن جرير عن عائشة بمعناه (ت، حسن ، صحيح) والطبراني عن ابن عباس .

❷ قال في الصحاح فجاء وابه على الاصل والقياس ۱۲.

لیے رِضْوانٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ فرمایا:
﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ (۵۷۔۲۷) اور (لذت) دنیا کا چھوڑ بیٹھنا جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے وہ طریق ان پر فرض نہیں کیا تھا............... مگر (ہاں) انہوں نے اس کو خدا (ہی) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔
﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ (۴۸۔۲۹) اور خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلب گاری میں لگے رہتے ہیں۔
﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ﴾ (۹۔۲۱) ان کا پروردگار ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی کی خوشخبری دیتا ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲: ۲۳۲) جب جائز طور پر آپس میں وہ راضی ہو جائیں۔میں تَرَاضَوْا باب تفاعل سے ہے جس کے معنیٰ باہم اظہار رضامندی کے ہیں۔

(ر ط ب)

اَلرَّطْبُ: (تر) یہ یَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے۔
قرآن میں ہے:
﴿وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ......﴾ (۶۔۵۹) اور (دنیا کی) تر اور خشک چیزیں (سب ہی تو) کتاب واضح (یعنی لوحِ محفوظ میں) لکھی ہوئی موجود ہیں۔
اور رُطَبٌ کا لفظ (پختہ اور) تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ (۱۹۔۲۵) اور کھجور کی شاخ کو اپنی طرف ہلا تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
اَرْطَبَ النَّخْلُ کے معنیٰ ہیں درخت خرما پکی کھجوروں والا ہوگیا۔اس میں صاحب ماخذ ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔جیسے اَثْمَرَ وَاَجْنٰی میں ہے۔عام محاورہ ہے:
اَرْطَبْتُ الْفَرَسَ وَرَطَّبْتُهٗ: میں نے گھوڑے کو تازہ گھاس کھلائی اور رَطِبَ الْفَرَسُ: (باب عَلِمَ سے لازمی ہے اور اس) کے معنیٰ گھوڑے کا تر گھاس کھانا کے ہیں۔
رَطِبَ الرَّجُلُ: تر و خشک ہر قسم کی باتیں کرنا خوش گپیاں اڑانا یہ محاورہ رَطِبَ الْفَرَسُ کے ساتھ بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے۔
اَلرَّطِيْبُ۔ نرم و ملائم کو کہتے ہیں۔

(ر ع ب)

اَلرُّعْبُ: اس کے اصل معنیٰ خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهٗ فَرَعَبَ رُعْباً۔ میں نے اسے خوف زدہ کیا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔اور خوف زدہ شخص کو رَعِبٌ کہا جاتا ہے۔ اَلتِّرْعَابَةُ: (صیغہ صفت) بہت زیادہ ڈرپوک۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (۳۔۱۵۱) ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں بٹھا دیں گے۔
﴿وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ (۱۸۔۱۸) اور ان کی (صورت حال سے) تجھ میں ایک دہشت سما جائے۔پھر کبھی یہ صرف بھرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے رَعَبْتُ الْحَوْضَ: میں نے حوض کو پانی سے پر کر دیا۔

سَیْلٌ رَاعِبٌ: سیلاب جو وادی کو پُر کر دے۔ اور جَارِیَةٌ رُعْبُوبَةٌ کے معنیٰ جوانی سے بھرپور اور نازک اندام دوشیزہ کے ہیں اور اس کی جمع رَعَابِیْبُ آتی ہے۔

(ر ع د)

اَلرَّعْدُ: (اسم) بادل کی گرج مروی ہے۔

(۱۵٦) اَنَّهٗ مَلَكٌ یَسُوْقُ السَّحَابَ کہ رَعْدٌ اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔ ❶ کہا جاتا ہے: رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ: بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنیٰ اَرْعَدَتْ وَاَبْرَقَتْ کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صَلَفٌ تَحْتَ رَاعِدَةٍ ضرب المثل ہے، جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو نرا باتونی ہو اور کچھ کر کے نہ دکھاتا ہو۔ ❷

اَلرَّعْدِیْدُ: بزدلی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے: اُرْعِدَتْ فَرَائِصُهٗ خَوْفًا یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کانپنے لگے۔

(ر ع ن)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ (۲۔۱۰۴) یعنی راعنا کہہ کر خطاب نہ کیا کرو۔

﴿رَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ﴾ (۴۔۴٦) اور اپنی زبانیں مروڑ کر اور دین اسلام میں طعنے کی راہ سے کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں۔

اس کلمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بطور تہکم خطاب کرتے تھے اور آپ ﷺ پر رعونت کا الزام دھرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ ہم رَاعِنَا کا کلمہ کہتے ہیں جس کے معنیٰ ہیں ہمارا خیال کیجئے اور رَاعِنًا (رعن سے مشتق ہے) اور رَعُنَ الرَّجُل (ک) کے معنیٰ کسی آدمی کے سست اور بے وقوف ہونے کے ہیں اس سے صیغۂ صفت اَرْعَنُ اور رَعِنٌ آتا ہے جس کے معنیٰ کم فہم آدمی کے ہیں یہ دراصل رَعْنٌ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے معنیٰ بنی کوہ کے ہیں یعنی پہاڑ کا وہ حصہ جو باہر نکلا ہوا ہو اور اَرْعَنُ کی مؤنث رَعْنَاءُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۱۸۵) لَوْلَا ابْنُ عُتْبَةَ عَمْرٍو وَالرَّجَاءُ لَهٗ
مَا کَانَتِ الْبَصْرَةُ الرَّعْنَاءُ لِیْ وَطَنًا

اگر عمرو بن عتبہ اور اس کے عطایا کی امید نہ ہوتی تو میں بَصْرة رعنا کو کبھی وطن نہ بناتا۔

بصرة کو رَعْنَاء یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بادیہ کی بنسبت نشیبی ہونے کے سبب کو یا رَعْنَاءُ (سست عورت) کے مشابہ ہے اور یا اس لیے کہ اس کی ہوا میں تغیر اور تکسر پایا جاتا ہے۔

---

❶ هكذا وردفی الحديث مرفوع عن ابن عباس والحديث فی الترمذی والنسائی واحمد والطبرانی فی الاوسط من رواية جابر وابی عمران الكوفی ـ عن ابن جريج راجع التفاسير تحت الاية (۱۳ـ۱۳) وتخريج الكشاف رقم: ۲۲۵ وقد ذكر كلا معنيه ابوعبيدة فی مجازه (۱ : ۳۲۵).

❷ مثل فی جل المعاجم وفی الصحاح : لمن يكثر الكلام ولا خير فيه .

❸ قاله الفرزوق فی عمروبن عتيبة وفی اللسان (رعن) صدره : لولاابومالك المرجو نائلهُ وفی رواية الحمقاء بدل الرعناء والبيت فی الاقتضاب ٤٠١ وديوانه والبلدان (رسم : بصرة) وفيه وجة تلقيبها بالرعاء ۱۲.

(ر ع ی)

اَلــرَّعْــیُ: اصل میں حیوان یعنی جاندار چیز کی حفاظت کو کہتے ہیں۔خواہ غذا کے ذریعہ ہو جو اس کی زندگی کی حافظ ہے۔یا اس سے دشمن کو دفع کرنے کے ذریعہ ہوا اور رَعَیْتُــہٗ کے معنیٰ کسی کی نگرانی کرنے کے ہیں اور اَرْعَیْتُہٗ کے معنیٰ ہیں میں نے اس کے سامنے چارا ڈالا اور رِعْـیٌ چارہ یا گھاس کو کہتے ہیں مَرْعیٰ (ظرف) چراگاہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿کُلُوْا وارْعَوْ اَنْعَامَکُمْ (۲۰:۵۴)﴾تم بھی کھاؤ اور اپنے چارپاؤں کو بھی کھلاؤ ﴿اَخْـرَجَ مِـنْھَا مَآئَھَا وَمَرْعَاھَا﴾ (۷۹:۳۱)اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

﴿وَالَّـذِیْ اَخْـرَجَ الْـمَرعیٰ﴾ (۸۷۔۴)اور جس نے (خوش نما) چارہ (زمین سے) نکالا۔

رَعْـیٌ اور رِعَـاءٌ کا لفظ عام طور پر حفاظت اور حسنِ انتظام کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَـمَـا رَعَـوھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا﴾ (۵۷۔۲۷)لیکن جیسے اس کی نگداشت کرنا چاہئے تھی انہوں نے نہ کی۔

اور ہر وہ آدمی جو دوسروں کا محافظ اور منتظم ہو اسے رَاعِـیٌ کہا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۷) ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُم مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ))

تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (السریع)

(۱۸۶)...... وَلَا اَرْمَرعِی فِی الاَقْوَامِ کالرَاعِی

اور محکوم قومیں حاکم قوموں کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

اور رَاعِیٌ کی جمع رِعَاءٌ وَرُعَاۃ آتی ہے۔اَلْـمُرَاعَاۃ: کسی کام کے انجام پر غور کرنا اور دیکھنا کہ اس سے کیا صادر ہوتا ہے کہا جاتا ہے:رَاعَیتُ النَّجُومَ: میں نے ستاروں کے غروب ہونے پر نگاہ رکھی قرآن پاک میں ہے:

﴿لا تَـقُـولُـوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا﴾ (۲۔۱۰۴) (مسلمانو! پیغمبر سے) رَاعِـنَـا کہہ کر مت خطاب کیا کرو بلکہ اُنظُرنَا کہا کرو۔

کہا جاتا ہے:

اَرْعَیتُـہٗ سَمْعِی: میں نے اس کی بات پر کان لگایا یعنی غور سے اس کی بات کو سنا۔اسی طرح محاورہ ہے:اَرْعِنِیْ سَمْعَكَ: میری بات سنیے۔

اور اَرْعِ عَلیٰ کَذَا کے معنیٰ کسی پر رحم کھانے کے اور اس کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

(ر غ ب)

اَلرَّغْبَۃُ: اس کے اصل معنیٰ کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ :رَغُــبَ الشَّــیءُ کسی چیز کا وسیع ہونا اور حَــوضٌ رَغِیــبٌ: کشادہ حوض کو کہتے ہیں۔عام محاورہ ہے:

فُـلَانٌ رَغِیْبُ الْجَو فِ فلاں پیٹو ہے۔

فَـرَسٌ رَغِیــبُ الْـعَدْوِ: تیز رفتار اور کشادہ قدم گھوڑا

اَلــرَّغْبَۃ وَالــرَّغَــبُ والرَّغْبیٰ: ارادہ اور خواہش کی

---

❶ اصـل الـحـديـث متـفـق عـلـيـه وايضاً فی الترمذی وابی داؤد والبيهقی من انس وابن عباس والطبرانی من حديث ابن عباس راجع لتخريجه احياء العلوم للغزالی بتخريج العراقی (۲ : ۳۱) وكنزالعمال (٦ : ١٩ ,١٣١) والفتح الكبير (۲ : ۳۳۰۔۳۳۱) .

❷ قـالـه ابـوقـيـس بـن الاسـلـت وتـكـمـلـته ليس قطاً مثل قطی .... والبيت من كلمة مفضلية (۲ : ۵۸) جمهرة فی ۱۹ بيتاً راجع السمط ۸۳۷ والميدانی (۲ : ۱۰۹) واللسان (قطا) (رعی) وايام العرب ۸۳ وخاص الخاص للثعالبی ١٤ والمثل ايضاً فی الميدانی (۲ : ۸٦،۱۱٦) والعسكری (۲،۱۷۹ : ۱۷٦).

وسعت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ (۲۔۹۰) اور وہ ہم کو (ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے غذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں۔

اور رَغِبَ فِيهِ وَاِلَيْهِ کے معنیٰ کسی چیز پر رغبت اور حرص کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ﴾ (۹۔۵۹) ہم تو اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن رَغِبَ عَنْ کے معنیٰ کسی چیز سے بے رغبتی اختیار کرنا کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ رَغِبَ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۲۔۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے سے انحراف کرے۔

﴿اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ﴾ (۱۹۔۴۶) (اے ابراہیم علیہ السلام) کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔

اور رَغِيْبَة کے معنیٰ بہت بڑے عطیہ کے ہیں (ج: رَغَائِبُ) یہ رغبت سے مشتق ہے یا تو اس لئے کہ وہ مرغوب فیہ ہوتی ہے اور یا اصل معنیٰ یعنی وسعت کے لحاظ سے عطیہ کو رغیبہ کہا جاتا ❶ ہے۔شاعر نے کہا ہے:

(۱۸۷) "يعطِي الرغائب مَنْ يَّشاء وَيمنع"

وہ جسے چاہتا ہے بڑے بڑے عطایا بخشتا اور جس سے چاہتا ہے روک دیتا ہے۔

(ر غ د)

رَغَداً وَرَغِيداً: آسودہ زندگی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا﴾ (۲۔۳۵) اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

﴿يَأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ (۱۶۔۱۱۲) ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

اَرْغَدَ الْقَوْمُ: آرام وراحت میں بسر کرنا۔

اَرْغَدَ مَا شِيَتَهٗ: اس نے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔

ان میں اول یعنی اَرْغَدَ الْقَوْمُ جَدَبَ وَاَجْدَبَ کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی اَرْغَدَ مَا شِيَتَهٗ اَدْخَلَ کی طرح متعدی ہے۔

اَلْمِرْغَادُ: ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

(ر غ م)

الرُّغَامُ: اصل میں خاک کو کہتے ہیں اور رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنیٰ اس کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل ہوا اور اَرْغَمَهٗ: کسی کو ذلت کے ساتھ خاک میں ملا دینا مجازًا رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنیٰ ناراض ہونا بھی آتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❷

(۱۸۸) اِذَا رَغِمَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعُتْبىٰ وَلٰكِنْ اَزِيْدُهَا

اگر وہ ناراض ہوں گے تو میں ان کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ اس کی ناراضگی کو اور بڑھادوں گا۔

یہاں رغم کو ارضاء کے بالمقابل لانا اس بات کی

---

❶ لعبدة بن الطيب من قصيدة يعظ فيها بنيه وصدره : اوصيكم بتقى الاله فانه .... راجع للبيت شرح شواهد التلخيص (۱ : ۳۶) .

❷ قد مرفي (انف) رقم ۳۱ وفيه غضب بدل اغمت.

دلیل ہے کہ اس کے معنیٰ سَــخِـطَ یعنی غصے اور ناراض ہونے کے ہیں اسی بنا پر کہا جاتا ہے:

اَرْغَـمَ اللّٰهُ اَنْفَ فُـلَان اَوْ اَرْغَمَهٗ: یعنی اللہ اسے ذلیل کرے اور رَاغِـمَهٗ (باب مفاعلہ) کے باہم ناراض ہونے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کے ہیں بعد ازاں مُـرَاغَمَهٗ کا لفظ منازعت کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور آیت:

﴿یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّ سَعَةً﴾ (۴۔۱۰۰) تو روئے زمین میں اس کو رہنے سہنے کی وافر جگہ اور ہر طرح کی کشائش ملے گی۔

میں مُرٰغَمًا سے مراد پناہ گاہ ہے یعنی برائی کو دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے اگر اس سلسلہ میں اسے وطن بھی ترک کرنا پڑے تو ہراساں نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی اچھی پناہ گاہ دے گا۔ جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی اور یہ رَغَمْتُ اِلَیْهِ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسے غَـضِبْتُ اِلٰی فُـلَانٍ مِنْ كَذَا یعنی ناراض ہوکر فلاں کے پاس چلا گیا۔

(ر ف ف)

رَفِیفُ الشَّـجَـرِ: درخت کی شاخوں کا ہوا سے لہلہانا اور منتشر ہونا۔ کہا جاتا ہے:

رَفَّ الـطَّیْرُ جَنَاحَیهِ: پرند کا اپنے بچے کی حفاظت کے لئے دونوں بازو پھیلانا۔ یہ باب رَفَّ یَـرُفُّ (ن) سے ہے اور استعارہ کے طور پر رَفٌّ کا لفظ کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ عام محاورہ میں کہا جاتا ہے:

مَـا لِفُلَانٍ حَافٌّ وَّلَا رَافٌّ: یعنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اس پر کوئی شفقت کرنے والا نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے۔[1]

مَـنْ حَفَّنَا اَوْ رَفَّنَا فَلْیَقْتَصِدْ: جو ہم پر شفقت کرے اسے چاہیئے کہ اعتدال سے کام لے۔

اَلرَّفْرَفُ: کے معنیٰ درخت کے منتشر پتوں کے ہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے:

﴿عَـلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ﴾ (۵۵۔۷۶) وہ سبز قالینوں پر (تکیہ لگائے)

رَفْرَفٍ سے خاص قسم کے کپڑے مراد ہیں جو مرغزار کے مشابہ ہوتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ رَفْرَفٌ سے خیمے کا کنارہ مراد ہے جو زمین پر پڑا رہتا ہے اور حسن (بصری) سے مروی ہے کہ اس سے گل تکئے مراد ہیں۔

(ر ف ت)

اَلـرَّفْـتُ: یہ باب نصر کا مصدر ہے اور رَفَـتِ الشَّـیْءَ کے معنیٰ کسی چیز کا چورا چورا کر دینے کے ہیں اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے اسے رفات کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَـالُوْا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا﴾ (۱۷۔۴۹) اور کہا کرتے کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اور استعارہ کے طور پر رُفَـات اس رسی کو بھی کہتے ہیں جو بوسیدہ ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہو۔

---

[1] انظر للمثل النهاية لابن الاثير (۲ : ۹۸) واللسان والصحاح (رفف) ومجالس ثعلب (۲ : ۴۱۱) وفی اتباع ابی الطیب ۴۸ فلیترك بدل فلیقتصد وكلهم جعل الكلمة من قبیل المثل الا اباالطیب فانه قال جاء فی الحدیث ـ ۱۲۔

(ر ف ث)

اَلرَّفَثُ: (ن) وہ فحش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے دواعی کا تذکرہ اور آیت کریمہ:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ (۲۔۱۸۷) مسلمانو! ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔ میں کنایۃً جماع مراد ہے اور اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کو جماع کے لئے بلانا اور ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اور اسے بواسطہ الیٰ متعدی کر کے معنیٰ افضاء کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور آیت:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ......﴾ (۲۔۱۹۷) (اور حج میں) نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ گناہ کی۔ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جماع کی ممانعت کی گئی ہو اور یہ بھی کہ اس کے متعلق گفتگو سے منع کیا گیا ہو کیونکہ یہ گفتگو جماع کے مقدمات میں شامل ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دوران طواف میں یہ شعر پڑھا۔[1] (رجز)

(۱۸۹) وَهُنَّ يَمْشِيْنَ بِنَا هَمِيْسَا
اِنْ تَصْدُقِ الطَّيْرُ نَنِكْ لَمِيسَا

اور اونٹ ہمیں لے کر آہستہ آہستہ نرم رفتاری سے چلتے ہیں اگر پرندہ سچ بولتا ہے تو ہم لمیس سے جماع کریں گے۔

اور رَفَثَ وَاَرْفَثَ دونوں ایک دوسرے کی جگہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ رَفَثَ کے معنیٰ مباشرت کرنے کے ہیں اور اَرْفَثَ کے معنیٰ رَفَثَ (ماخذ) کے ساتھ متصف ہونا کے اور یہ دونوں باتیں لازم ملزوم ہیں۔

(ر ف د)

اَلرِّفد: (ن) اس کے معنیٰ عطا اور مدد کے ہیں اور رَفْدٌ مصدر (ض) ہے جس کے معنیٰ مدد دینے کے اور عطا کرنے کے ہیں اور مِرْفَدٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے عام طور پر پیالوں میں خیرات ڈال کر دی جاتی ہے اس لئے مِرْفَدٌ بمعنیٰ پیالہ آتا ہے اور رَفَدْتُهٗ کے معنیٰ عطیہ دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ﴾ (۱۱۔۹۹) بہت ہی برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔

اور اَرْفَدْتُهٗ کے معنیٰ کسی کے لئے عطا مقرر کرنے کے ہیں کہ وہ مقررہ مقدار میں اس سے لیتا رہے۔ رَفَدَهٗ وَاَرْفَدَهٗ دونوں سَقَاهٗ وَاَسْقَاهٗ کی طرح متعدی بن کر استعمال ہوتے ہیں۔

اور رُفِدَ فُلَانٌ فَهُوَ مُرْفَدٌ سے بطور استعارہ وہ شخص بھی مراد ہوتا ہے جسے ریاست (سرداری) دی گئی ہو۔

اَلرَّفُوْدُ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک بار دودھ دوہنے سے پیالہ بھر دے لہٰذا یہ (فعول) بمعنیٰ فاعل کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مَرَافِید ان اونٹنیوں اور بکریوں کو کہتے

---

[1] راجع للقصة والبیت الکشاف والمستدرك للحاکم والطبری (۲ : ۲٦٥) وفی روایته خرجن یسرین مکان هن یمشین والرجز ایضاً فی البحر (۱٦ : ۲۷۱) والعمدة (۱ : ۳۰) والمحاضرات للمؤلف (۱ : ۷۹) وابن کثیر (۱ : ۲۳۷) والحیوان للجاحظ (۳ : ٤۰) والعیون (۱ : ۳۲۱/۳ : ۲۲)۔

ہیں جو موسم گرما اور سرما میں برابر دودھ دیتی ہوں اور ان کا دودھ کبھی خشک نہ ہوتا۔ ہو شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۱۹۰) اَطْعَمْتَ الْعِرَاقَ وَرَافِدَیْهِ
فَزَارِیًّا اَحَذَّ یَدِ الْقَمِیْصِ

یعنی تو نے عراق اور دجلہ وفرات پر ایک فزاری کو عامل بنا کر بھیجا ہے جو خیانت میں نہایت ماہر ہے۔

یہاں رافدیہ سے دجلہ اور فرات مراد ہیں کیونکہ ان کا پانی مسلسل جاری رہتا ہے۔

تَرَافَدُوْا کے معنیٰ ایک دوسرے سے تعاون کرنا کے ہیں اسی سے رِفَادہ ہے یعنی وہ فنڈ جو قریش نادار حجاج کی مدد کے لیے جمع رکھتے تھے (رف ع) اَلرَّفْعُ (ف) کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (۲۔۶۳) اور ہم نے طور پر پہاڑ کو تمہارے اوپر لا کر کھڑا کیا۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳۔۲) اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بدوں کسی سہارے کے اونچا بنا کھڑا کیا۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ﴾ (۲۔۱۲۷) اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۹۴۔۴) اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کا آوازہ بلند کیا۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کے لئے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (۶۔۱۶۶) اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی۔

﴿نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ (۱۲۔۷۶) اور ہم جس کو چاہتے ہیں (حسن تدبیر میں) اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں۔

﴿رَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ﴾ (۴۰۔۱۵) خدا بڑا عالی مرتبہ (اور) عرش (بریں) کا مالک ہے۔

اور آیت: ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ﴾ (۴۔۱۵۸) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔

میں رفع کے معنیٰ آسمان کی طرف اٹھا لے جانا بھی ہو سکتے ہیں اور رفع [2] بلحاظ شرف بخشی بھی اور (قیامت کے متعلق) آیت:

---

[1] قاله الفرزوق يهجو عمربن هبيرة الفزارى ويخاطب يزيدبن عبدالملك لماولاه العراق ۱۰۲ هـ وقبله : تفهيق بالعراق ابو المثنیٰ وعلم قومه اكل الخبيص والبيت فى السمط ۸۶۲ واللسان والمحكم والصحاح (حذذ) وديوانه (۲ : ۴۸۸) رقم ۳۰۴ والحصرى (۱ : ۵۷) والجرجانى ۷۴ والكامل ۸۰۸ والرافدان : الدجلة والفرات والبيت ايضاً فى الحيوان (۵ : ۶/۱۹۷ : ۵۱۰) فى اربعة ابيات والخبر فى الفاضل ۱۱۱ وادب الكاتب للصولى والبيت ايضاً فى مجازات القران ۲۹۱ والمعارف للقتبى ۱۷۹ والمعانى للقتبى ۵۹۷ والرواية فى معظم المصادر "أطعمت" وفى الاغانى (۱۹۔۱۷) والامالى (۱۲۳ت) والصحاح أوليت وفى الحيوان والاساس واللسان (رفد) "بعثت الى" فاظن ان الفاء فى المطبوع مصحف قال القتبى فى المعانى الاحذ معناه سريع اليد واراد خفة يده فى السرقة والخيانة (كذا فى الصحاح) وزكرالقميص لتسديد القافيه وذكر الاخباريون : فعزله يزيد ۱۰۵هـ ثم لم يسمع له ذكر.

[2] لكن الرفع الى السماء متعين فى الآية لان الاحاديث تدل بالتواتر على هذا المعنى راجع (ى ق ن) .

﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۵۶۔۳) بعض کو نیچا دکھائے گی اور بعض کو (بلحاظ درجہ) بلند کرے گی۔
(میں زمین بھی) رَافِعَةٌ کا لفظ خافضۃ کے مقابلہ میں آیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رفع بلحاظ درجات مراد ہے۔اور آیت:
﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ﴾ (۸۸۔۱۸) اور آسمان کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کیسا اونچا بنایا۔
میں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی بلحاظ محل اور بلندی بلحاظ شرف ومنزلت اور آیت ﴿وَفُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ﴾ (۵۶:۳۴) اور اونچے اونچے فرش میں فرش کی بلندی سے ان کے عمدہ اور نفیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔اسی طرح آیت:
﴿فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ (۸۰۔۱۳،۱۴) ان اوراق میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ پاکیزہ اونچی جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔
میں بھی بلندی بلحاظ شرف ومنزلت ہی مراد ہے۔اور آیت:
﴿فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ.........﴾ (۲۴۔۳۶) ایسے گھروں میں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔
میں بھی رَفَعَ بلحاظ عزوشرف مراد ہے یعنی ان کی تعظیم کی جائے اور ان کے اندر کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے جوان کے ادب واحترام کے خلاف ہو اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:
﴿اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ﴾ (۳۳۔۳۳) (اے پیغمبر کے) گھر والو! خدا کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) گندگی کو دور کرے۔
میں رَجس کے دور کرنے سے عزوشرف بخشا مراد ہے اور رفع کے معنیٰ تیز رفتاری بھی آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: رَفَعَ الْبَعِیرُ فِی سَیرِہٖ: اونٹ تیز رفتاری سے چلا اَرْفَعْتُہٗ اَنَا: میں نے اسے تیز چلایا بَعِیرٌ مَرْفُوْعُ السَّیر: تیز رفتار اونٹ۔اور رَفْعٌ کے معنیٰ کسی کے راز کو فاش کرنا بھی آتے ہیں جیسے: رَفَعَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَان میں نے اس سے پردہ اٹھادیا یعنی اس کے راز کو فاش کردیا اور رِفَاعَةٌ اس چھوٹی سی گدی کو کہتے ہیں جسے عورتیں اپنی سرین پر باندھ لیتی ہیں تاکہ وہ بڑی معلوم ہوں۔

(ر ق ق)

اَلرِّقَّةُ: (باریکی) اور دِقَّةٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔لیکن رقۃ بلحاظ کناروں کی باریکی کے استعمال ہوتا ہے اور دِقَّةٌ بلحاظ عمق کے بولا جاتا ہے۔پھر اگر رقت کا لفظ اجسام کے متعلق استعمال ہوتو اس کی ضد صفاقت آتی ہے جیسے ثَوْبٌ رَقِیْقٌ: (باریک کپڑا) اور ثوب صفیق (موٹا کپڑا) اور دل کے متعلق استعمال ہوتو اس کی ضد قساوت اور جفاء آتی ہے مثلاً نرم دل کے متعلق کہا جاتا ہے۔فُلان رَّقِیْقُ الْقَلْبِ اور اس کے بالمقابل سخت دل آدمی کو قَاسِیَ الْقَلْبِ کہتے ہیں۔
اَلرَّقُّ: کاغذ کی طرح کی کوئی چیز جس پر لکھا جائے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ﴾ (۵۲۔۳) (اور چوڑے چکلے) کاغذ پر لکھی ہوئی (کتاب کی قسم ہے)
اور نر کچھوے کو بھی رِقٌّ کہا جاتا ہے۔

اَلرِّقُّ کے معنیٰ غلاموں کا مالک ہونے کے ہیں اسی سے مملوک غلام کو رَقِیق کہتے ہیں اس کی جمع اَرِقَّاءُ آتی ہے اوراِسْتَرَقَّ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنیٰ کسی کو غلام بنانے کے ہیں۔

اَلرَّقْرَاقُ: شراب کی چمک دمک کو کہتے ہیں اور رَقْرَقَۃٌ کے معنیٰ شفاف شراب کے ہیں نیز ہر وہ قطعہ زمین جو پانی سے متصل ہوا سے رِقَّۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ مرطوب ہونے کی وجہ سے وہ نرم رہتی ہے مثال مشہور ہے۔

اَعَنْ صَبُوْحٍ تُرَقْرِقُ: کیا تمہارا اشارہ صبح کی شراب سے ہے۔ یہ حسنِ طلب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ ❶

(ر ق ب)

اَلرَّقَبَۃُ: اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رَقَبَۃَ کا لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور عرف عام میں اَلرَّقَبَۃَ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ لفظ رَأْسٌ اور ظَھْرٌ بول کر مجازاً سواری مراد لی جاتی ہے چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ یَرْبُطُ کَذَا ظَھْرًا اَوْ کَذَا رَأْسًا...... یعنی فلاں کے پاس اتنی سواریاں ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ﴾ (۴۔۹۲) کہ جو مسلمان کو غلطی سے (بھی) مار ڈالے تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرائے۔

اور رَقَبَۃٌ کی جمع رِقَابٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَفِی الرِّقَابِ﴾ (۲۔۷۷) اور غلام کو آزاد کرنے میں۔ مراد مکاتب غلام ہیں۔ کیونکہ مال زکوۃ کے وہی مستحق ہوتے ہیں اور رَقَبْتُـــہٗ (ن) کے معنیٰ گردن پر مارنے یا کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً ....﴾ (۹۔۱۰) کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔

اسی سے نگران کو رَقِیْبٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی منظور ہوتی ہے اور یا وہ نگرانی کے لئے بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَارْتَقِبُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ﴾ (۱۱۔۹۳) تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

﴿اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ (۵۰۔۱۸) مگر ایک چوکیدار (اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔

اَلْمَرْقَبُ: بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ کر چوکسی کرتا ہے اور قمار بازوں کے محافظ کو بھی رَقِیب کہا جاتا ہے جو قمار بازی کے بعد شراب نوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح قمار بازی کے تیسرے درجہ کے تیر کو بھی رَقِیبٌ کہتے ہیں۔

تَرَقُّبٌ: (تفعل) کے معنیٰ ہیں انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْھَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ﴾ (۲۸۔۲۱) چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) شہر سے نکل بھاگے اور دوڑتے ہوئے جاتے تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

رَقُوْبٌ: اس عورت کو کہتے ہیں جو کثرت اولاد کی وجہ سے اپنے بچوں کی موت کی منتظر ہو۔ نیز وہ اونٹنی جو پانی پینے کے لئے باری کے انتظار میں ہو اسے بھی رَقُوْبٌ کہا

❶ راجع للمثل المعاجم.

جاتا ہے اَرْقَبَ: (افعال) کے معنیٰ رُقْبیٰ کرنے کے ہیں یعنی کسی کو اس کی زندگی بھر کے لئے مکان وغیرہ ہبہ کر دینا اور اس کی موت کے بعد اس عطا کو واپس لے لینا اور اسے رُقْبیٰ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہبہ کے بعد گویا وہ اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور ایسے ہبہ کو عمریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ❶

(ر ق د)

اَلرُّقَادُ: خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے رَقَدَ (ن) رُقُوْدًا فَھُوَ رَاقِدٌ اور رَاقِدٌ کی جمع رُقُوْدٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَھُمْ رُقُوْدٌ﴾ (۱۸۔۱۸) حالانکہ وہ (اصحاب کہف) سوئے ہوئے ہیں۔

اصحاب کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر رقود کا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلہ میں وہ نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اصحابِ کہف فوت ہو چکے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَھُمْ رُقُوْدٌ﴾ کہہ کر ان سے موت کی نفی کی ہے۔

اور مَرْقَدٌ (ظرف) خواب گاہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (۳۶۔۵۱) ہم پر افسوس ہے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا اٹھایا۔

اور اَرْقَدَ الظَّلِیْمُ: کے معنیٰ شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے ہیں گویا اس نے تیز روی سے اپنی نیند کو دور کر دیا۔

(ر ق م)

اَلرَّقْمُ: کے معنیٰ گاڑھے خط کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ رَقْمٌ کے معنیٰ کتاب پر اعراب اور نقطہ لگانے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ﴾ (۸۳۔۹) وہ ایک کتاب ہے (وقتاً فوقتاً) اس کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔

میں مَرْقُوْمٌ کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا نقطے لگائی ہوئی۔ اور جو شخص کسی کام کا ماہر اور حازق ہو اس کے متعلق ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ یَرْقُمُ فِی الْمَآءِ: یعنی وہ ماہر ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اَصْحَابَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۹) کہ غار اور لوح والے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رَقِیْم ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس پتھر کی طرف نسبت ہے جس میں ان کے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازؤوں پر جو نشان ہوتے ہیں انہیں رَقْمَتَا الْحِمَارِ کہا جاتا ہے اور اَرْضٌ مَرْقُوْمَۃٌ تھوڑی گھاس والی زمین کو کہتے ہیں گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے۔

اَلرَّقْمِیَّاتُ: تیروں کو کہتے ہیں جو مدینہ کے ایک مقام کی طرف منسوب ہیں۔

(ر ق ی)

رَقِیَ (س) رُقِیًّا۔ فِی السُّلَّمِ کے معنیٰ سیڑھی پر چڑھنے کے ہیں اور اِرْتَقٰی (افتعال) بھی اسی معنیٰ میں

---

❶ لکن اصحاب غریب الحدیث فرقوابین العمرٰی والرقبی ۱۲۔

استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ﴾ (۳۸۔۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں۔

مثل مشہور ہے ❶: اِرْقَ عَلٰى ظَلْعِكَ: یعنی اپنی طاقت کے مطابق چلو اور طاقت سے زیادہ اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔

اور رَقَيْتُ بمعنیٰ رقیہ یعنی افسوں کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔محاورہ ہے:

كَيْفَ رَقْيُكَ اَوْ رُقْيَتُكَ: کہ تمہارا افسوں کیسا ہے۔

اس میں رَقْیٌ مصدر ہے اور رُقْيَةٌ اسم۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ﴾ (۱۷۔۹۳) یعنی ہم تیرے افسوں پر یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

میں رُقِیٌّ بمعنیٰ رُقْيَةٌ کے ہے اور آیت:

﴿وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ﴾ (۷۵۔۲۷) اور کون افسوں کرے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس وقت جھاڑ پھونک سے کوئی اس کی جان نہیں بچا سکے گا۔چنانچہ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔❷ (الکامل)

(۱۹۰) وَاِذَا الْمَنِيَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا
اَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيْمَةٍ لَا تَنْفَعُ

کہ جب موت اپنا پنجہ گاڑ دیتی ہے تو کوئی افسوں کارگر نہیں ہوتا۔

ابن عباس نے مَنْ رَاقٍ کے معنیٰ کئے ہیں کہ کون سے فرشتے اس کی روح لے کر اوپر جائیں یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب۔

اَلتَّرْقُوَةُ: ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس لحاظ سے کہ سانس پھول کر وہیں تک چڑھتی ہے اس کی جمع تَرَاقِیْ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ﴾ (۷۵۔۲۶) سنو جی! جب جان بدن سے نکل کر گلے تک پہنچ جائے گی۔

(ر ک ب)

اَلرُّكُوْبُ: کے اصل معنیٰ حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً﴾ (۱۶۔۸) تاکہ ان سے سواری کا کام لو اور (سواری کے علاوہ یہ چیزیں) موجب زینت (بھی) ہیں۔

مگر کبھی کشتی وغیرہ پر سوار ہونے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ﴾ (۲۹۔۶۵) پھر جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔

مگر عرف میں رَاكِبٌ کا لفظ شتر سوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔اس کی جمع رَكْبٌ وَرُكْبَانٌ اور رُكُوْبٌ تینوں آتی ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۸۔۴۲) اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو (ہٹا ہوا) تھا۔

---

❶ المثل فی حل المعاجم.

❷ قاله ابو ذؤیب الهذلی یرثی بنیه والبیت من كلمة مفضلية (۲ : ۲۲۰) جمهرية (۳٤۱) فی ٦۲ بیتاً مذکوره بعضها فی اللسان (نسب) والخزانة (۱ : ۲۰۲) والسیوطی (۳،۹۲/٤۹۳) ودیوان الهذلیین (۱ : ۳) والعقد (۲ : ۱۵) والاصابة ۲۵۰۷ والاسد (۵ : ۱۹۰) والسمط (٤٤۹،۸۸۸) والحماسة للبحتری ۹۹ والکامل ۵۱۸ وشواهد الکشاف ونقد الشعر ٦۷ ومحاضرات المؤلف (٤ : ٤۸۹) وخاص الخاص ۱۸۲ والفاضل للمبرد ۵۱ وفی تاریخ الطبری ان معاویة تمثل به عند موته ۱۲.

﴿فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (۲۔۲۳۹) تو پیادہ یا سوار ہو کر۔

اور ''رکاب'' خاص کر مرکوب یعنی سواری پر بولا جاتا ہے۔

اَرْكَبَ الْمُهْرُ: بچھیرا سواری کے قابل ہوگیا۔

اَلْمُرْكَبُ خاص کر اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے گھوڑے پر سوار ہو یا جو شخص سواری نہ کر سکے یا سوار ہونا نہ جانتا ہو۔

اَلْمُتَرَاكِبُ: وہ چیز جو تہ بر تہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا﴾ (۶۔۱۰۰) پھر ہم سبز کونپلیں نکالتے ہیں کہ ان سے گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔

رُكْبَةٌ کے معنیٰ زانو کے ہیں اور رَكَبْتُهٗ کے معنیٰ ہیں: میں نے اس کے زانو پر مارا جیسے فَأَدْتُهٗ (میں نے اس کے دل پر مارا) رَأَسْتُهٗ میں نے اس کے سر پر مارا۔اور نیز رَكَبْتُهٗ کے معنیٰ گھٹنے سے مارنا بھی آتے ہیں۔جیسے يَدَيْتُهٗ: میں نے اسے ہاتھ سے مارا۔عِنْتُهٗ: میں نے اسے نظر لگادی وغیرہ۔پھر کنایہ کے طور پر عورت کے ستر کو بھی رَكَبٌ کہہ دیتے ہیں۔[1] جیسا کہ مجازاً عورت کو مطیۃ (سواری) یا مَعِيْدَةٌ (بمعنیٰ مُقْتَعِدَةٌ) کہا جاتا ہے۔

(ر ک د)

رَكَدَ(ن) رُكُوْدًا کے معنیٰ پانی یا ہوا وغیرہ کے ٹھہر جانے کے ہیں۔اسی طرح کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی رُكُوْدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ﴾ (۴۲۔۳۲،۳۳) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے (بادبانی) جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (اونچے اونچے) دکھائی دیتے ہیں اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

جَفْنَةٌ رَكُوْدٌ: لبالب بھرا ہوا پیالہ۔

(ر ک ز)

اَلرِّكْزُ: دھیمی آواز (یا آہٹ) کو کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ (۱۹۔۹۸) اب تم ان میں سے کسی کو (بھی) دیکھتے ہو یا ان کی بھنک بھی سنتے ہو۔

اور رَكَزْتُ كَذَا کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے مخفی طور پر دفن کردیا اسی سے اَلرِّكَازُ ہے جس کے معنیٰ دفینہ ہیں۔خواہ اسے کسی انسان نے دفن کیا ہو، جیسے خزانہ وغیرہ یا قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جائے جیسے معدنیات اور اَلرِّكَازُ کا لفظ ان دونوں کو شامل ہے۔اور حدیث ہے۔[2]

(۱۵۹) وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ: (رکاز میں خمس ہے) میں رکاز کے دونوں معنیٰ بیان کئے گئے ہیں۔عام محاورہ ہے: رَكَزَ رُمْحَهٗ: اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا۔اور فوج کی فرودگاہ کو مَرْكَزٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ

---

[1] وفی الصحَاح : الركب (بالتحريك) منبت العانة وقال الخليل يختص بالمرئة وقيل يعم .

[2] الاول عند اهل الحجاز والثانی عند اهل العراق (القولات تحتملها اللغة (النهاية) والحديث رواه الجماعة عن ابی هريرة وله الفاظ وطرق راجع النيل ٤ : ١٥٧ ومالك فی مؤطاهٔ عن الزهری والشافعی فی الام (٢ : ٣٧) والرسالة رقم (٥٣٣) تحقيق احمد شاكر ومسند احمد (٣ : ٣٣٥) رقم (٤٦٤٤) (ايضاً عن ابن عباس (طب عن ثعلبة طس عن جابر وابن مسعود.

جہاں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ وہاں زمین میں اپنے نیزے (جھنڈے) گاڑ دیتے ہیں۔

(ر ک س)

اَلــرَّکْــسُ: کے معنیٰ کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا کر دینا یا اس کے اول سرے کو موڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ ملا دینا کے ہیں۔ محاورہ ہے:
اَرْکَسْتُــهٗ: میں نے اسے الٹا کر دیا اور رُکِـسَ اس کا مطاوع آتا ہے اور ارتَـکَـسَ فِیْ اَمْرِہٖ کے معنیٰ کسی معاملہ میں الجھ جانے کے ہیں (یعنی کسی مصیبت سے رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاللّٰهُ اَرْکَسَهُمْ بِمَا کَسَبُوْا﴾ (۴۔۸۸) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا ہے۔

(ر ک ض)

اَلــرَّکْضُ: اس کے اصل معنیٰ ٹانگ کو حرکت دینے کے ہیں اگر سوار کے متعلق بولا جائے جیسے: رَکَضْتُ الْفَرَسَ: تو اس کے معنیٰ گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑھ لگانا کے ہوتے ہیں اور پیادہ یا آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنیٰ پاؤں کے ساتھ زمین کو روندنا کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿اُرْکُـضْ بِـرِجْلِكَ﴾ (۳۸۔۴۲) یعنی اپنی ٹانگ زمین پر مارو۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَا تَرْکَضُوْا وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ﴾ (۲۱۔۱۱۳) مت بھاگو! اور ساز وسامان (دنیا کی) طرف لوٹ جاؤ جس میں تم چین کرتے تھے۔

میں انہیں شکست خوردہ ہو کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے۔ (اور یہ نہی تہدید اور تعجیز کے لئے ہے)

(ر ک ع)

اَلرُّکُوْعُ: اس کے اصل معنیٰ انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنیٰ میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ (۲۲۔۷۷) مسلمانو! (خدا کے حضور) سجدے اور رکوع کرو۔
﴿وَارْکَـعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ﴾ (۲۔۴۳) جو (ہمارے حضور بوقت نماز) جھکتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ جھکا کرو۔
﴿وَالْعَاکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (۲۔۱۵۲) مجاوروں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے)
﴿اَلـرَّاکِـعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ﴾ (۹۔۱۱۲) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔
شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الطویل)

(۱۹۱) اُخَبِّرُ اَخْبَارَ الْقُرُوْنِ الَّتِیْ مَضَتْ
اَدِبُّ کَـاَنِّـیْ کُـلَّـمَـا قُـمْـتُ رَاکِـعٖ

میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) رینگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا ہوتا ہوں۔

(ر ک م)

رَکْــمٌ: (ن) کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا قرآن پاک میں ہے: ﴿سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ﴾ (۵۲۔۴۴)

[1] قاله لبيد في قصيدة له في الحكم راجع (۱: ۳۶) والمعمرين (۶۱) والشعراء ۱۵۲ والاغانی (۱۴: ۹۶، ۱۳۴) مجاز القران (۱: ۵۴) واضداد ابی الطیب (۶۵۸) والمعانی للقتبی (۱۲۱۶) واللسان والتاج (رکع) ومجموعة المعانی ۱۲۳ فی ثلاثة ابیات والبحر (۱: ۱۷۳) والعقد (۲: ۷۸).

تہ بہ تہ بادل۔

اَلرُّکَامُ: اوپر تلے رکھی ہوئی چیزیں جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا﴾ (۲۴۔۴۳) پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔

اسی سے ریت کے ٹیلے اور لشکر کو بھی رُکام کہا جاتا ہے اور مُرْتَکَمُ الطَّرِیْقِ: شاہراہ کو کہتے ہیں جس میں آمدورفت کے نشانات بکثرت ہوں۔

(ر ک ن)

رُکْنٌ: کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے پردہ قائم ہوتی ہے استعارہ کے طور پر زور اور قوت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ﴾ (۱۱۔۸۰) اے کاش! (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اور رَکَنْتُ اِلٰی فُلَانٍ اَرْکُنُ کے معنیٰ کسی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ یہ فتح کاف کے ساتھ ہے مگر صحیح رَکَنَ یَرْکُنُ (ن) یا رَکِنَ یَرْکَنُ (س) ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۱۱۔۱۱۳) اور جن لوگوں نے ہماری نافرمانی کی ان کی طرف نہ جھکنا۔

نَاقَۃٌ مُرَکَّنَۃُ الضَّرْعِ: بڑے تھنوں والی اونٹنی۔

لَہٗ اَرْکَانٌ تُعَظِّمُہٗ: اس کی قوم اسے عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

اَلْمِرْکَنُ: لگن۔ ٹب اور اَرْکَانُ الْعِبَادَاتِ سے عبادات کے وہ جوانب مراد ہوتے ہیں جو ان کا مبنی بنتے ہیں اور ان کے ترک سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔

(ر م م)

الرَّمُّ: (ن) کے معنیٰ پوشیدہ چیز کی اصلاح اور مرمت کرنے کے ہیں رِمَّۃٌ خاص کر بوسیدہ ہڈی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ﴾ (۷۲۔۷۸) ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔

﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ اِلَّا جَعَلَتْہُ کَالرَّمِیْمِ﴾ (۵۱۔۴۲) جس چیز پر سے ہو کر وہ گزرتی ہے اُسے پرانی ہڈی کی طرح (چورہ) کئے بغیر نہ چھوڑتی۔

اَلرُّمَّۃُ: خاص طور پر بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور اَلرِّمُّ: لکڑی، بھوسہ وغیرہ کے چورہ کو کہتے ہیں۔

رَمَّمْتُ الْمَنْزِلَ: عمارت کی مرمت کرنا۔ جیسے تَفَقَّدْتُ (کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا) مشہور محاورہ ہے۔[1] (مثل) (اِدْفَعْہُ اِلَیْہِ بِرُمَّتِہٖ) اسے کُلِّیَۃً اس کے سپرد کر دیجئے۔

اَلْاِرْمَامُ: اس کے معنیٰ خاموش ہونے کے ہیں اور اَرَمَّتْ عِظَامُہٗ کے معنیٰ ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر باریک ہو جانا کہ پھونکنے سے اڑ جائیں اور آواز نہ آئے تَرَمْرَمَ الْقَوْمُ کے معنیٰ مہمل بڑبڑانے یا گفتگو کے لئے ہونٹ ہلا کر رہ جانے کے ہیں۔

اَلرُّمَّانُ: (فعلان) انار کو کہتے ہیں۔

(ر م ح)

اَلرُّمْحُ: کے معنیٰ نیزہ کے ہیں اس کی جمع رِمَاحٌ آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] انظر للکلمۃ ادب الکاتب لابن قتیبہ ۴۲ والمیدانی (۱: ۳۳)

﴿تَنَالُهٗ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ﴾ (۵۔۹۴) جہاں تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں۔
اور رَمَحَهٗ کے معنیٰ کسی کو نیزہ سے مارنے کے ہیں اور رَمَحَتْهُ الدَّابَّةُ: کے معنیٰ جانور کے دولتی جھاڑنے کے ہیں۔ اَلسِّمَاكُ الرَّامِحُ: ایک ستارے کا نام ہے۔ کیونکہ اس کے پیش پیش ایک دم دار ستارہ ہوتا ہے۔ جو دیکھنے میں نیزے جیسا معلوم ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ [1]
اَخَذَتِ الْاِبِلُ رِمَاحَهَا: اونٹوں نے اپنے نیزے سنبھال لئے یعنی شیر دار یا موٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ذبح سے بچالیا۔
اَخَذَتِ الْبُهْمٰى رُمْحَهَا: گھاس خاردار ہوگئی کیونکہ وہ بھی خاردار ہونے کی وجہ سے چرواہوں سے محفوظ ہوجاتی ہے۔

(ر م د)

رَمَادٌ وَ رِمْدَادٌ وَاَرْمَدٌ وَاَرْمِدَاءُ: (خاکستر) راکھ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) گویا راکھ کا ڈھیر ہے جسے آندھی کے دن ہوا اڑا کر لے جائے۔
رَمَدَتِ النَّارُ کے معنیٰ آگ کے بجھ کر راکھ بن جانے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ هُمُوْدٌ کا لفظ مجازاً بمعنیٰ ہلاکت آجاتا ہے۔ اور رَمِدَ الْمَاءُ کے معنیٰ پانی کے گدلا ہوجانے کے ہیں۔ گویا اس میں راکھ ڈال دی گئی ہے اور اَلْاَرْمَدُ: خاکستری رنگ کی چیز کو کہتے ہیں اور مچھر کو رَمْدٌ کہا جاتا ہے (جو اَرْمَدُ کی جمع ہے) اور رَمَادَةٌ کے معنیٰ قحط سالی کے ہیں۔

(ر م ز)

اَلرَّمْزُ: (ن) ہونٹ کے ساتھ اشارہ کرنے یا ہلکی سی آواز کے ہیں۔ اور ابرو کے ساتھ اشارہ کرنے کو غمز کہا جاتا ہے۔ پھر استعارہ کے طور پر ہر وہ کلام جو اشارہ کی طرح ہو رَمْزٌ کہلاتی ہے۔ جیسا کہ شکایت کو غَمْزٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ (۳۔۴۱) نشانی (جو تم مانگتے ہو) یہ ہے کہ تین روز تک لوگوں سے بات نہ کرو مگر اشارہ سے۔
اور مَا اَرْمَازَّ کے معنیٰ ہیں اس نے اشارہ سے بھی بات نہ کی اور كَتِيْبَةٌ رَمَّازَةٌ: بڑے لشکر کو کہتے ہیں کیونکہ بوجہ کثرت ازدحام کے اس میں آواز سنائی نہیں دیتی اور صرف اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

(ر م ض)

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ (۲۔۸۵) روزوں کا مہینہ یہ رَمَضٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ سورج کی سختی و تپش کے ہیں۔ اَرْمَضَتْهُ: سخت تپش نے اسے جھلس دیا۔ فَرَمِضَ چنانچہ وہ جھلسا گیا۔
اَرْضٌ رَمِضَةٌ: سخت گرم سرزمین۔ رَمِضَتِ الْغَنَمُ: سخت گرمی میں باہر چرنے کی وجہ سے بکریوں کے جگر زخمی ہوگئے۔
فُلَانٌ يَتَرَبَّضُ الظِّبَاءَ: فلان سخت گرم جگہ میں ہرن کا شکار کرتا ہے۔

(ر م ی)

اَلرَّمْیُ: (ض) کے معنیٰ پھینکنے کے ہیں یہ اجسام

---

[1] ویروی اسلحتها المیدانی (۱: ۲۴).

(مادی چیزیں) جیسے تیر اور پتھر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (۸۔۱۷) اے پیغمبر! جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیر چلائے۔

اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو" قـذف" کی طرح اس کے معنیٰ سب وشتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ﴾ (۲۴۔۹) جو لوگ اپنی بیبیوں پر زنا کا عیب لگائیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ (۲۴۔۴) جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔

محاورہ ہے: اَرْمٰى عَلٰى مِائَةٍ: وہ سو سے زائد ہیں۔ خَرَجَ يَتَرَمّٰى: وہ نکل کر نشانہ بازی کرنے لگا۔

(ر ھ ب)

اَلرَّهْبُ وَالرَّهْبَةُ: ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔قرآن میں ہے:

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۰۔۱۳) تمہاری ہیبت تو (ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے) بڑھ کر ہے۔

﴿جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸۔۳۲) (اور دفع) خوف کے لئے اپنے بازو سکیڑ لو۔

اس میں ایک قرأت رُهْــب بضمہ الراء بھی ہے۔جس کے معنیٰ فَزَعٌ یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔

مقاتل کہتے ہیں کہ میں رَهْــبٌ کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا۔ دریں اثناء کہ میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک اعرابی عورت آئی۔اور اُس نے کہا "اے اللہ کے بندے! مجھے کچھ خیرات دیجئے جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگی: هٰهُنَا فِىْ رَهْبِىْ یعنی یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے۔ (تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی رھب بمعنیٰ آستین کے ہیں) لیکن پہلے معنیٰ یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ (۲۱۔۹۰) (ہمارے فضل کی) توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے (ہمیں پکارتے رہتے ہیں۔

﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ﴾ (۸۔۶۰) اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔

اور آیت:

﴿وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (۷۔۱۱۶) اور ان کو دہشت میں ڈال دیا، میں اِسْتِرْهَاب کے معنیٰ دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (۲۔۴۰) اور مجھ ہی سے ڈرو۔

اور تَرَهُّبٌ (تفعّل) کے معنیٰ تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گذاری میں غلو کرنے کو رَهْبَانِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا﴾ (۵۷۔۲۷) اور رہبانیت (لذت دنیا کا چھوڑ بیٹھنا) جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔

اور رُهبان (صومعہ نشین لوگ) واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رَهَابِيْن آتی ہے لیکن اس کی جمع رَهَابِيَّةٌ بنانا زیادہ

مناسب ہے۔

اَلْاِرْھَابُ: (افعال) کے اصل معنیٰ اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں۔اوراسی سے "رَھْبٌ" ہے جس کے معنیٰ لاغر اونٹنی (یا شتر نر قوی وکلاں جثہ) کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔ ❶

رَھَبُوْتٌ خَیْرٌ مِنْ رَّحَمُوْتٍ: کہ رحم سے خوف بہت ہے۔

(ر ھ ط)

اَلرَّھْطُ: دس آدمیوں سے کم جماعت کو رھط کہتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس آدمیوں تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تِسْعَةُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ﴾ (۴۸:۲۷)نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے۔

﴿وَلَوْلَا رَھْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ﴾ (۱۱۔۹۱)اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کردیتے۔

﴿یٰقَوْمِ اَرَھْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْکُمْ﴾ (۱۱۔۹۲)میری قوم! کیا میری برادری کے لوگ تمہیں (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ عزیز ہیں۔

اَلرُّھَطَاءُ: جنگلی چوہے کا بل اوراس کو رَھْطَةٌ بھی کہا جاتا ہے اورشاعر کے شعر ❷ (المتقارب)

(۱۹۲) اَجْعَلْكَ رَھْطًا عَلٰی حُیَّضٍ

(میں تجھے حیض والی عورتوں کا لتہ بنادوں گا یعنی نہایت ذلیل کروں گا)

میں بعض نے رَھط کے معنیٰ اس چمڑے کے لئے ہیں جو حائضہ عورتیں ایام ماہواری میں پہنا کرتی تھیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں رھط سے مراد وہ چیتھڑا ہے جو حائضہ عورت جائے مخصوص میں رکھتی ہے۔اوراسی سے مشہور محاورہ ہے: ھُوَ اَذَلُّ مِنَ الرَّھْطِ وہ حیض کے چیتھڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔

(ر ھ ق)

رَھِقَهٗ (س) رَھَقاً۔ اَلْاَمْرُ: کسی معاملہ نے اسے بزور وجبر دبالیا۔اور رَھِقَهٗ وَاَرْھَقَهٗ: (مجرد ومزید فیہ) دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں جیسے رَدِفَهٗ وَاَرْدَفَهٗ وَبَعَثَهٗ وَاَبْعَثَهٗ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّةٌ﴾ (۱۰۔۲۷)اوران پر ذلت چھا رہی ہوگی۔

﴿سَاُرْھِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ (۷۴۔۱۷)ہم عنقریب اس کو عذاب سخت میں مبتلا کریں گے۔

اوراسی سے اَرْھَقْتُ الصَّلٰوةَ ہے، جس کے معنیٰ نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنے کے ہیں حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(ر ھ ن)

اَلرَّھْنُ: (گروی رکھی ہوئی چیز) اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔اور

---

❶ ای لان یفرق منك خیرمن ان تحب راجع المیدانی ۳: ۷۷ رقم ۲۷۵۸ واللسان (رھب) وغریب القران للقتبی۱۹ وفی الکامل ۱۷ رھبوتی اخیر لك من رحموتی.

❷ قاله ابو المثلم الھذلی وصدره: متیٰ ما أشاء غیر زھو الملوك .... والبیت فی اللسان (رھط بزھو) والمقاییس (۲: ۴۵/۳: ۲۹) بغیر عزو والمعانی الکبیر (۱: ۴۸۴، ۵۹۳) والمشکل للقتبی (۱۱۹) فی اربعة وتھذیب الالفاظ ۶۶۱ (باب الشیاب) ودیوان الھذلیین (۲: ۲۲۳ ـ ۲۲۴) والشاعر من بنی خزاعة بن سعد بن ھذیل وترجمته فی المؤلف (۲۷۷ـ۲۷۸) قال القتبی فی المعانی الرھط جلد یشق اسفله ویترك اعلاه فیلبسه الصبیان وقد وکانوا فی الجاھلیة یطوفون عراة والنساء فی ارھاط وھو شقة قدر مابین الرکبة الی السرة.

یہی معنیٰ رِھَانٌ کے ہیں۔ لیکن رھان خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے اصل میں یہ دونوں لفظ مصدر ہیں جیسے رَھَنْتُ الرِّھْنَ وَرَاھَنْتُهٗ رِھَاناً اور رَھِیْنٌ وَمَرْھُوْنٌ: صیغۂ صفت ہیں اور رَھْنٌ کی جمع رِھَانٌ، رَھْنٌ اور رُھُوْنٌ آتی ہے۔ اور آیت:

﴿فَرِھَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ (۲۔۲۸۳) تو کچھ رہن قبضہ میں رکھ لو۔

میں ایک قرأت رُھُنٌ بھی ہے۔ اور آیت: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (۷۴۔۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَھِیْنَةٌ فعیل بمعنیٰ فاعل سے ہے اور اس کے معنیٰ ثابت اور قائم رہنے والی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فعیل بمعنیٰ مفعول سے ہے اور اس کے معنیٰ ہیں کہ ہر شخص اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکا رہے گا۔

پھر رَھْنٌ میں چونکہ حبس (روکنے) کے معنیٰ پائے جاتے ہیں اس لئے کبھی مجازاً رَھْن بمعنیٰ حبس یعنی مطلق کسی چیز کو روکنے کے آ جاتا ہے جیسا کہ آیت مذکور میں ہے۔ اور رَھَنْتُ فُلَاناً وَرَھَنْتُ عِنْدَهٗ کے معنیٰ کسی کے پاس گروی رکھنے کے ہیں اور اِرْتَھَنْتُ (افتعال) کے معنیٰ گروی لینے کے ہیں۔

اور اَرْھَنْتُ (افعال) فِی السِّلْعَةِ کے معنیٰ بعض نے سامان تجارت کو گراں فروخت کرنا کئے ہیں۔ اصل میں اس کے معنیٰ بیعانہ کے طور پر کچھ سامان دے دینے کے ہیں۔ جو قیمت ادا کرنے تک بطور ضمانت بائع کے پاس رہتا ہے۔

(ر ھ و)

اَلرَّھْوُ: ساکن چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ (۴۴۔۲۴) اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔

میں رَھْو کے معنیٰ ساکن کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے اور یہی معنیٰ صحیح ہیں۔ [1] اور اسی سے رَھَاءٌ ہے جس کے معنیٰ ہموار جنگل کے ہیں اور ہر وہ ہموار قطعۂ زمین جہاں پانی جمع ہوتا ہو اسے رَھْو کہا جاتا ہے اسی سے ایک حدیث ہے۔ [2]

(۱۶۰) لا شُفْعَةَ فِی رَھْوٍ...... کہ پانی کی گذرگاہ کی مشترک ہونے سے حق شفع ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اعرابی نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوئے اونٹ کو دیکھ کر کہا:

رَھْوٌ بَیْنَ سَنَامَیْنِ: کہ یہ دونوں بلندیوں کے درمیان رَھْوٌ یعنی کشادگی ہے۔

(ر و ح)

اَلرَّوْحُ وَالرُّوْحُ: دراصل ایک ہی ہیں۔ رُوْح کا اطلاق سانس پر ہوتا ہے۔ شاعر نے آگ کے متعلق کہا ہے۔ [3] (طویل)

---

[1] قال الطبری (۲۵: ۱۲۱۔۱۲۲) واولی الاقوال فی ذالك بالصواب ای الساکن.

[2] الحدیث فی الفائق (۳: ۱۲۲) وغریب ابی عبید (۳: ۱۲۱) وفی الصحاح (رهو) والتاج واللسان (رها).

[3] قاله ذولرمة وفی لسان العرب وحایها واقتت لها قیتة قدرابدل واجعل لها الخ یقال واقتت ضارك قبتة ای اطعمها والبیت من شواهد الطبری (۶: ۳۶) واللسان (قتت، نفخ، حی) ودیوانه ۲۴ من قصیدة له والمشکل للقتبی (۳۷۱) فی ثلاثة ابیات والبحر (۳: ۴۰۱).

(۱۹۵) فَقُلْتُ لَهُ ارْفَعْهَا اِلَیْكَ وَاَحْیِهَا
بِرُوْحِكَ وَاجْعَلْ لَهَا قِیْتَةً قَدْرًا

تو میں نے کہا کہ اسے اٹھاؤ اور قدرے نرم پھونک مار کر اسے سلگاؤ اور اس میں تھوڑا سا ایندھن ڈال دو۔اور سانس بھی چونکہ روح کا ایک جزء ہے...... اس لئے مجازاً اسے روح کہہ دیا ہے۔جیسا کہ نوع کو اسم جنس سے تعبیر کر لیتے ہیں مثلاً: تَسْمِیَةُ الْاِنْسَانِ بِالْحَیَوَانِ: اور کبھی روح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ زندگی حرکت، منافع کا حصول اور مضرات سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (۱۷۔۸۵) اور تجھ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔

﴿وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۱۵۔۲۹) اور میں نے اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دی۔

میں روح کے یہی معنیٰ مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملک کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿وَطَهِّرْ بَیْتِیَ﴾ (۲۔۲۶۲) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔اسی طرح آیت کریمہ: ﴿یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا﴾ (۳۹۔۵۳) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی۔

میں عباد کی نسبت بھی یاء متکلم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف اضافت تشریفی ہے۔

اور قرآن پاک میں ذوشرف ملائکہ کو بھی اَرْوَاح سے موسوم کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا﴾ (۷۸۔۳۸) جس روز کہ روح (فرشتہ) اور دیگر ملائکہ صفیں باندھ کر کھڑے ہوں گے۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ (۷۰۔۴) فرشتے اور جبریل علیہ السلام اس کی طرف چڑھتے ہیں۔

اور آیت: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۶۔۱۹۳) اسے روح امین لے کر اترا۔

میں روح امین سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور دوسری آیت میں جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ (۲۔۷۲) اس قرآن پاک کو روح القدس لے کر آتے ہیں۔

قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہہ کر پکارا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ (۴۔۱۷۱) وہ ایک روح تھی جو خدا کی طرف سے آئی۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کو روح اس لئے کہا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

اور قرآن پاک کو بھی روح کہا گیا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (۴۲۔۵۲) اس طرح ہم نے اپنے حکم سے (دین کی) جان (یعنی یہ کتاب) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی۔ اس لئے قرآن پاک سے حیات اخروی حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق فرمایا:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ (۲۹۔۶۴) اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

اور رَوح (بفتح الراء) کے معنی سانس کے ہیں اور اَرَاحَ الْاِنْسَانُ کے معنی تنفس، یعنی سانس لینے کے اور آیت کریمہ: ﴿فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ﴾ (۵۶۔۸۹) تو راحت اور رزق ہے۔ میں رَیحان سے خوشبودار چیزیں مراد ہیں اور بعض نے رزق مراد لیا ہے اور کھانے کے اناج کو بھی ریحان کہتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾ (۵۵۔۱۲) اور ہر طرح کے اناج جو (بھوسی کے) خول کے اندر ہوتے ہیں اور کھانے کا اناج۔

ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ کہاں جارہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا: "اَطْلُبُ مِنْ رَّيْحَانِ اللّٰهِ" کہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ (یعنی خوشبودار چیز) ایک حدیث میں ہے ❶: (۱۶۲) اَلْوَلَدُ مِنْ رَّيْحَانِ اللّٰهِ کہ اولاد بھی اللہ کے ریحان سے ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔❷

(۱۹۶) يَا حَبَّذَا رِيْحُ الْوَلَدْ
رِيْحُ الْخُزَامِيْ فِي الْبَلَدْ

اولاد کی خوشبو کیسی پیاری ہے یہ خزامی گھاس کی خوشبو ہے جو شہر میں مہکتی ہے اور اولاد کو ریحان اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے۔

اَلرِّيْحُ کے معنی معروف ہیں۔ یعنی ہوا متحرک کو کہتے ہیں عام طور پر جن مواضع میں ارسال الرِّیح صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے وہاں عذاب مراد ہے اور جہاں کہیں لفظ جمع کے ساتھ مذکور ہے وہاں رحمت ❸ مراد ہے۔ چنانچہ رِیحٌ کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا﴾ (۵۴۔۱۹) ہم نے ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا﴾ (۳۳۔۹) تو ہم نے ان پر آندھی چلائی۔

﴿كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ﴾ (۳۔۱۱۷) مثال اس ہوا کی ہے جس میں بڑی ٹھر بھی ہو۔

﴿اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) اس کو سخت ہوا لے اڑی۔

اور رِیَاح (جمع کا لفظ) کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی ہوا کو چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی بار دار کرتی ہے۔

﴿اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ﴾ (۳۰۔۴۶) کہ وہ ہواؤں کو اس غرض سے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بارش کی خوشخبری پہنچائیں۔

﴿يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا﴾ (۷۔۵۷) باران رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ لوگوں کو مینہ کی آمد

---

❶ كلمة من حديث طويل راجع الفائق (۱: ۸٦) (جبن) انكم لمن ريحان الله وفى (الحكيم عن خولة بنت حكيم الولد من ريحان الجنة وفى العيون (۳: ۹٤) والعقد (۲: ٤۳۸) الولد من ريحان الله راجع العراقى (۲: ۲۱۸) والطبرانى فى الصغير ۱٦۹ والفتح الربانى (۱: ٤۳۳.)

❷ الا عرابيه كانت ترقص ولدها راجع ادب الدنيا والدين بشرحه لخان زاده والعيون ۳: ۹٤).

❸ نسبه فى الاتقان الى ابى ابن كعب يؤيده ماورد فى الادعية المأثورة اللهم اجعلها رياحا ولاتجعلها ريحاً (الفائق ۱: ۲٥٤) وقد رواه الخفاجى فى شرح الدرة ۱۲۳۔۱۲٤ وردفى القران خلافه ولسليمان الريح عاصفة ۱٤: ۱۸) وجرين بهم بريح طيبة ۱۰: ۲۲) وفى الحديث نصرت بالصبادى ريح الانبياء ۱۲.

کی خوشخبری پہنچادیں۔
اور آیت: ﴿یُرۡسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا﴾ (۳۰۔۴۸) اور وہ قادر مطلق ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے ابھارتی ہے۔
میں بھی چونکہ معنیٰ رحمت اغلب ہے اس لئے یہاں لفظ جمع کی قرأت زیادہ صحیح ہے۔
کبھی مجازاً رِیح بمعنیٰ غلبہ بھی آ جاتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿فَتَذۡهَبَ رِیۡحُكُمۡ﴾ (۸۔۴۶) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔
محاورہ ہے۔
اَرْوَحَ الْمَاءُ: پانی متغیر ہوگیا۔ خاص کر بد بودار ہونے کے وقت بولتے ہیں۔
رِیْحَ الْغَدِیرُ یَرَاحُ: جوہڑ پر ہوا کا چلنا۔ اور اَرَاحُوا کے معنیٰ رَوَاح یعنی شام کے وقت میں داخل ہونے کے ہیں اور خوشبودار تیل کو دُھْنٌ مُرَوَّحٌ کہا جاتا ہے ایک حدیث میں ہے۔ ❶ (۱۶۳) لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔
اَلْمَرْوَحَةُ: ہوا چلنے کی سمت۔ اَلْمِرْوَحَةُ (آلہ) پنکھا۔
اَلرَّائِحَةُ: مہکنے والی خوشبو۔
محاورہ ہے:
رَاحَ فُلَانٌ اِلٰی اَهْلِهٖ: (۱) فلاں اپنے اہل کی طرف ہوا کی طرح تیزی کے ساتھ گیا۔ (۲) اس نے اپنے اہل وعیال میں پہنچ کر راحت حاصل کی۔
اَلرَّاحَةُ: آرام یہ بھی رَوحٌ سے ماخوذ ہے مشہور محاورہ ہے: اِفْعَلْ ذَالِكَ فِی مَرَاحٍ وَرَوَاحٍ کہ آرام سے یہ کام کرو۔
اَلْمُرَاوَحَةُ کے معنیٰ ہیں دو کاموں کو باری باری کرنا۔ اور استعارہ کے طور پر رَوَاح سے دوپہر کو آرام کا وقت مراد لیا جاتا ہے اور اسی سے کہا جاتا ہے اَرَحْنَا اِبِلَنَا کہ ہم نے اونٹوں کو آرام دیا (یعنی باڑہ میں لے آئے) اور پھر اَرَحْتُ الْاِبِلَ سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔
اَرَحْتُ اِلَیهِ حَقَّهٗ کہ میں نے اس کا حق واپس لوٹا دیا اور مُرَاح باڑے کو کہا جاتا ہے اور تَرَوَّحَ الشَّجَرُ وَرَاحَ یَرَاحَ کے معنیٰ درخت کے شگوفہ دار ہونا اور نئے پتے نکالنے کے ہیں اور کبھی رَوحٌ سے وسعت اور فراخی کے معنیٰ بھی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔
قَصْعَةٌ رَوْحَاءُ: فراخ پیالہ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَایۡئَسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ......﴾ (۱۲۔۸۷) اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔
میں بھی وسعت رحمت مراد ہے جو لفظ رَوحَ سے مفہوم ہوتی ہے۔

(ر و د)

اَلرَّوْدُ: اس کے اصل معنیٰ نرمی کے ساتھ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمدورفت کے ہیں اور اس معنیٰ میں فعل رَادَ وَارْتَادَ آتا ہے اسی سے رَائِدٌ ہے جس کے معنیٰ ہیں وہ شخص جسے پانی اور چارہ کی تلاش کے لئے قافلہ سے آگے بھیج دیا گیا ہو اور رَادَ الْاِبِلَ کے معنیٰ گھاس کی تلاش

---

❶ حدیث لم یرح رائحة الجنة وردفی قتل المعاهد (حم، خ، ن، ہ عن ابن عمر) والفائق (۱: ۵٤) والغریب لابی عبید (۱۰۵) راجع کنزالعمال ج ٤ رقم ۱۸۲۱، ۱۸۳٤، ۱۸۳۵ وزوائد ابن حبان رقم ۱۳۳۰، ۱۳۳۳ عن ابی بکرة ۱۲.

میں اونٹوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا کے ہیں پھر رونق کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: رَادَتِ الْاِبِلُ فِي مَشْيَتِهَا يَرُوْدُ رَوَدَانًا: اونٹ نرم رفتار چلے۔ اوراسی سے مِرْوَدٌ ہے جس کے معنیٰ سرمہ لگانے کی سلائی یا حلقہ لگام کے لوہا کے ہیں اور اَرْوَدَ يُـرْوِدُ (افعال) کے معنیٰ ہیں نرمی کرنا اوراس سے رَوَيْدًا (اسم فعل) ہے۔ جیسے رُوَيْدَكَ الشِّعْرَ يَغِبّ: کل تک شعر کو مہلت دو یعنی اس پر غور کرلو۔

اَلْاِرَادَةُ: یہ رَادَ يَرُوْدُ سے ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہیے یا نہیں بعد ازاں یہ کبھی دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے بولا جاتا ہے جو کہ ارادہ کا مبدأ ہے اور کبھی صرف منتہیٰ کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں۔ یعنی محض فیصلہ کے لئے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو منتہیٰ کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں یعنی کسی کام کا فیصلہ نزوع نفس کا معنیٰ مراد نہیں ہوتا کیونکہ ذات باری تعالیٰ خواہشات نفسانی سے مبرا ہے۔ لہٰذا اَرَادَ اللّٰهُ كَذَا کے معنیٰ ہوں گے۔ اللہ نے فلاں کلام کا فیصلہ کیا چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ اَرَادَبِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً﴾ (۳۳۔۱۳) یعنی اگر خدا تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل وکرم کرنا چاہے۔

اور کبھی ارادہ بمعنیٰ امر کے آتا ہے مثلاً: اُرِيدُ مِنْكَ كَذَا کے معنیٰ یہ ہیں کہ تجھے فلاں کام کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ جیسے فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۸۸) اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔

(یعنی آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا حکم نہیں دیتا (جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ) اور کبھی ارادہ بمعنیٰ قصد آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا يُـرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۸۳) وہ دنیا میں کسی طرح کی شیخی نہیں کرنا چاہتے۔

یعنی نہ اس کا قصد کرتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مطلوب بناتے ہیں پھر جس طرح یہ لفظ قوت اختیار یہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قوت تسخیری یعنی اضطراری اور غیر اختیاری امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں دیوار کے متعلق فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ﴾ (۱۸۔۷۷) کہ وہ گرا چاہتی تھی۔ یعنی گرنے کے قریب تھی اور محاورہ ہے:

فَـرَسِيْ تُرِيدُ التِّبْنَ: کہ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔

اَلْـمُرَاوَدَةُ: (مفاعلہ) یہ بھی رَادَ يَرُوْدُ سے ہے اور اس کے معنیٰ ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہوا اور دوسرے کا کچھ اور رَاوَدْتُّ فُـلَانًا عَـنْ كَـذَا کے معنیٰ کسی کو اس کے ارادہ سے پھسلانے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هِـيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ﴾ (۱۲۔۲۶) اس نے مجھے میرے ارادے سے پھیرنا چاہا۔

﴿تُـرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔۳۰) وہ اپنے غلام

سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے درپے ہے۔
یعنی اسے اس ارادہ سے پھسلانا چاہتی ہے۔
﴿سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ﴾ (۱۲۔۶۱) ہم اس کے باپ کو اس سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔
(یعنی اسے آمادہ کریں گے کہ وہ برادر یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔)
﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔۳۲) بے شک میں نے اس سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنا چاہا۔

(ر ء س)

اَلرَّأْسُ: سر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع رُؤُوْسٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور سر بڑھاپے (کی آگ) سے بھڑک اٹھا ہے۔
﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُؤُوْسَكُمْ﴾ (۲۔۱۹۶) اپنے سر نہ منڈاؤ۔ اور کبھی رَأْسٌ بمعنیٰ رئیس بھی آتا ہے اور اَرْئَسُ (اسم تفضیل) کے معنیٰ بڑے سر والا کے ہیں اور سیاہ سر والی بکری کو شَاةٌ رَأْسَاءُ کہتے ہیں اور رِيَاسُ السَّيْفِ کے معنیٰ ''دستۂ شمشیر'' کے ہیں۔

(ر و ض)

اَلرَّوْضُ: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۵) باغ بہشت میں ان کی خاطر داریاں ہو رہی ہوں گی۔
اور پانی کے جمع ہونے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: اَرَاضَ الْوَادِيْ وَاسْتَرَاضَ: وادی میں پانی وافر ہو گیا اور اَرَاضَهُمْ کے معنیٰ ہیں ''اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا''۔
اَلرِّيَاضَةُ: کسی سے بکثرت کوئی کام لینا تاکہ اسے اس میں سدھاؤ اور مہارت پیدا ہو جائے۔ اسی سے رُضْتُ الدَّابَّةَ ہے یعنی سواری کو سدھانا اور مطیع کرنا۔ اور اِفْعَلْ كَذَا مَادَامَتِ النَّفْسُ مُسْتَرَاضَةً کے معنیٰ ہیں کہ اس وقت تک یہ کام کرو جب تک نفس محنت کے قابل رہے یا اس میں وسعت رہے اور یہ اِرَاضَةٌ یا رَوْضٌ سے مشتق ہو گا اور آیت کریمہ:
﴿فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۵) میں رَوْضَةٌ سے جنت کے سبزہ زار یعنی اس کے محاسن اور لذات مراد ہیں اور آیت: ﴿فِيْ رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ﴾ میں (صیغۂ جمع سے) ان ظاہری نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں اصحاب جنت کے لئے تیار کی گئی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ان علوم و اخلاق کی طرف اشارہ ہے جن میں تخصص حاصل کر لینے سے انسان کا دل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

(ر و ع)

اَلرُّوْعُ: کے معنیٰ خَلَدٌ یعنی دل کے ہیں جیسے حدیث میں ہے۔[1]
(١٦٤) اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ...... کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اور رَوْع (بفتح الراء) خوف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱۔۷۴) پھر جب ابراہیم علیہ السلام کے دل سے خوف دور ہوا۔

[1] وفی الصحاح (تربع السراب) (ریع).

محاورہ ہے: رُعْتُہٗ وَرَوَّعْتُہٗ: خوف زدہ کرنا، گھبرا دینا۔
نَاقَۃٌ رَوْعَاءُ: ڈرپوک اونٹنی۔
اَرْوَعٌ: وہ چیز جو اپنے حسن و جمال سے دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دے گویا خوف زدہ کر رہی ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❶

(۱۹۸) یَھُوْلُکَ اِنْ تَلْقَاہُ فِی الصَّدْرِ مَحْفَلاً:
کہ محفل میں اس سے ملاقات کرے تو دل میں ہول پیدا کردے۔

(روغ)

اَلــرَّوْغُ: کے معنیٰ کسی حیلہ اور تدبیر کی خاطر ایک جانب مائل ہونے کے ہیں اسی سے رَاغَ الثَّعْلَبُ (ن) رَوَغَـاناً ہے: یعنی لومڑ کا فریب دہی کے طور پر ادھر اُدھر جانا اور کج راستہ کو رَائِــغ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے پیچ و خم سے فریب دے رہا ہے۔
رَاوَغَ فُلَانٌ فُلَانًا: کسی سے فریب کھیلنا۔
اور رَاغَ فُـلَانٌ اِلـٰی فُـلَان کے معنیٰ ہیں فلاں کی طرف اس طرح لوٹا کہ اپنا مقصد حیلے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ﴾ (۵۱۔۲۶) پھر وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔
﴿فَـرَاغَ عَـلَیْھِـمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ﴾ (۳۷۔۹۳) تو بڑی قوۃ سے ان کے مارنے کے لئے مائل ہوئے۔
اور اصل میں اس کے معنیٰ ہیں داؤ لگا کر کسی چیز کو حاصل کرنا اور علٰی (صلہ) کے لفظ سے معنیٰ استیلاء کا اظہار مقصود ہے۔

(روم)

رُوْمٌ: ایک مشہور قوم ہے۔کبھی یہ لفظ رُوْمِــیٌّ کی جمع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے جیسے عَــجَـمٌ وَعَجَمِیٌّ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿آلٓـمّٓ غُـلِبَـتِ الرُّوْمُ﴾ (۳۰۔۱،۲) رومی مغلوب ہو گئے۔

(روی)

مَـــاءٌ رَوَاءٌ وَرِوًی: بہت زیادہ سیراب کرنے والے پانی کو کہتے ہیں اور رِوًی بروزن عِـــدًی اور سِوًی ہے۔شاعر نے کہا ہے۔❷ (رجز)

(۱۲۲) مَـنْ شَکَّ فِـیْ فَلَجٍ فَھٰذَا فَلَجْ
مَـــاءٌ رَوَاءٌ وَطَـــرِیـــقٌ نَھْـــجْ

جسے مقام فلج میں شبہ ہو وہ دیکھ لے کہ یہی فلج ہے (یعنی سیراب کرنے والا پانی اور کھلا راستہ۔
اور آیت:
﴿ھُـمْ اَحْسَـنُ اَثَـاثاً وَّرِئْیًا﴾ (۱۹۔۷۴) جن کے ساز و سامان اور جن کی (ظاہری) رواداری اِن سے کہیں عمدہ تھی۔
جو لوگ اسے مہموز نہیں بناتے ان کے نزدیک رَوِیَ سے

---

❶ راجع للحدیث اللالی ۴۰۸ واللسان و شرح السنۃ من روایۃ عبداللہ بن مسعود والعسکری حی الامثال والغزالی فی الاحیاء وفی روایۃ روح الامین قال العراقی فی تخریج الاحیاء اخرجہ ابن ابی الدنیا فی القناعۃ والحاکم (۳۳۸:۳) و کنزالعمال (۱۱۷:۴۔۱۱۹) لم اجدہ ویرجی ۱۲۔

❷ البیت لراجر من بنی العنبر من تمیم والفلج ماء لھم قالہ فی البلدان وابو عبیدۃ البکری فی معجمہ (رسم للج) ومجازالقران لابی عبیدہ (۱۶۸:۱) والبیت فی السحاو ندی (۱۴۴:۱) بغیر عزو ۱۲۔

مشتق ہے اور خوبصورت کو رِیٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ حسن سے پر ہے۔لیکن اگر اسے مہموز پڑھا جائے تو رِئیاً سے مراد وہ چیز ہوگی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھتی ہوں بعض کے نزدیک بغیر ہمزہ کے بھی رُؤْيَةٌ سے مشتق ہے اور رِیٌّ کے معنیٰ منظر (ظاہری حالت) کے ہیں اور اسی سے رِوَاءٌ (خوش نمائی) ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ رَوَاءٌ میں قلب ہوا ہے اور یہ رَأيتُ سے مشتق ہے۔ابوعلی الفسوی کہتے ہیں کہ لفظ مَرْوْئَةٌ بھی حَسَنَ فِیْ مِرءَةِ الْعَيْنِ كَذَا: (ظاہر دیکھنے میں خوبصورت ہے) سے ماخوذ ہے۔لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مِرأةٌ میں میم زائدہ ہے اور مَرُوْئَةٌ بروزن فَعُوْلَةٌ ہے۔اور اس میں میم اصلی ہے اور اَنْتَ بِمَرِیءٍ وَمَسْمَعٍ کے معنیٰ ہیں کہ تم اس قدر میرے قریب ہو کہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔اور تمہاری بات سن سکتا ہوں۔ بعض یاء کو حذف کر کے اَنْتَ مِنِّيْ مَرْأًى وَمَسْمَعٌ بولتے ہیں اور مَرْئَى بروزن مَفْعَلٌ ہے اور رَأَيْتُ سے ماخوذ ہے۔

(ر ی ب)

رَابَنِيْ كَذَا وَاَرَابَنِيْ کے معنیٰ ہیں فلاں معاملہ نے مجھے رَیْب میں ڈال دیا اور رَیب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ﴾ (۲-۲۵) اگر تم کو (قیامت کے دن) پھر جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہو۔اور آیت:

﴿فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا﴾ (۲-۲۳) (اگر تمہیں) مَا اَنْزَلْنَا میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے۔

اور آیت:

﴿رَیْبَ الْمَنُوْنُ﴾ (۵۲-۳۰) گردش زمانہ (کا انتظار کرتے ہیں)۔

گردش زمانہ کو رَیْب کہنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے وقوع میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے انہیں ریب کہا ہے کہ ان کے تعین اوقات میں انسان متردد رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آ جائے لہٰذا انسان نفس گردش کے وقوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے تعین اوقات کے لحاظ سے ہمیشہ رَیْبَ الْمَنُوْنِ میں مبتلا رہتا ہے۔اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۱۹۳) اَلنَّاسُ قَدْ عَلِمُوْا اَنْ لَا بَقَآءَ لَهُمْ
لَوْ اَنَّهُمْ عَلِمُوْا مِقْدَارَ مَا عَلِمُوْا

کہ لوگوں کو اس بات کا تو یقین ہو چکا ہے کہ ان کے لئے بقا نہیں ہے کاش انہیں اس کا وقت بھی معلوم ہوتا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔[2]

(۱۹۴) اَمِنَ الْمَنُوْنِ وَرَيْبِهَا تَتَوَجَّعُ

کہ کیا تو زمانہ اور اس کی گردشوں پر جزع فزع کرتا ہے

[1] قاله ديك الجن راجع المحاضرات للمؤلف (٤ : ٤٩١).

[2] قاله ابو ذؤيب الهذلي في مطلع رثاء نبيه راجع الانصاف ٧٦ وخاص بيتاً وتمام البيت والدهر ليس بمعتب من يجزع والبيت في الاستيعاب ٦٦٧ والاغاني (٦ : ٩٥) والخزانة (١ : ٢٠٢) والسيوطي (٩٢) والبيهقي (٣ : ٤٩٣) والعقد (٢ : ١٠٥) والاصابة (٤٥٤) واسد الغابة (٥ : ١٩٠) رقم (٢٥٠٧) ومجازات القران للرضي (٢٨٣) وتهذيب الالفاظ ٤٥٤ ونظام الغريب ٢٣٠ وشواهد المغني (٢ : ٤٧٢) واضداد ابي الطيب ٦٢٣ وشرح السبع لابن الانباري ٤٦ والبحر (٧ : ض ٤٩٤).

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِیْ شَكٍّ مِنْهُ مُرِیْبٍ﴾ (۱۱۔۱۰) قرآن پاک کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے انہیں حیران کر رکھا ہے۔

﴿مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ﴾ (۵۰۔۲۵) حد (عبودیت) سے بڑھے ہوئے اور شک وشبہ پیدا کرنے والے (کی اطاعت مت کر)

اور اِرْتِیَابٌ (افتعال) اَرَابَهٗ کے ہم معنیٰ ہے جس کے معنیٰ شک وشبہ میں پڑنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ یَخَافُوْنَ﴾ (۲۴۔۵۰) یا شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں۔

﴿وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ﴾ (۵۷۔۴) اور اس بات کے منتظر رہے (کہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو) اور (اسلام کی طرف سے) شک میں پڑے ہوئے۔

اور مومنین سے ارتیاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۴۔۳۱) اور اہل کتاب اور مسلمانوں (ان باتوں میں کس طرح کا) شک وشبہ نہ لائیں۔

﴿ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾ (۴۹۔۱۵) پھر کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کیا۔

ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۱) دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ کہ شک وشبہ چھوڑ کر وہ کام کرو جس میں شک وشبہ نہ ہو۔

اور گردش زمانہ کو رَیْبُ الدَّھْرِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فریب کاری کا وہم ہوتا ہے (کَمَا مَرَّ) اور رِیْبَةٌ رَیْب سے اسم ہے جس کے معنیٰ شک وشبہ کے ہیں (جمع رِیَبٌ) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۹۔۱۱۰) کہ وہ عمارت ان کے دلوں میں رِیبَة بنی رہے گی۔

یعنی ہمیشہ ان کے دلی کھوٹ اور خلجان پر دلالت کرتی رہے گی۔

(ر ی ش)

رِیْشُ الطَّائِرِ: پرند کے پروں کو کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ بازوؤں کے پروں پر بولا جاتا ہے اور چونکہ پرند کے پر اس کے لئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے استعارہ کے طور پر یہ لفظ لباس کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرِیْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰی﴾ (۷۔۲۶) اور موجب زینت اور پرہیزگاری کا لباس۔

عام محاورہ ہے:

اَعْطَاهُ اِبِلًا بِرِیْشِهَا: اسے سامان سمیت اونٹ دے دیئے۔ یعنی مال ومتاع سمیت جو ان کے اوپر تھا۔

اور رِشْتُ السَّهْمَ اَرِیْشُهٗ رِیْشًا کے معنیٰ تیر کو پر لگانے کے ہیں اور تیر پر نہادہ کو مَرِیْشٌ (کمبیع) کہتے ہیں پھر

---

[1] الحدیث بطوله رواه الترمذی فی آخر الطب والحاکم فی الاحکام والبیوع والطبرانی والبزار من حدیث الحسن بن علی وطس عن عمرو النسائی عن الحسن بن علی وابن حبان فی زوائده رقم ۵۱۲ عن الحسن والحدیث بطرقة واختلاف الفاظه فی کنز العمال (۳: ۲۴۵۔۲۴۶) والکاف الشاف لابن حجر رقم ۱۷ والفتح الباری (۴: ۲۳۴).

استعارہ کے طور پر اصلاح امر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا رِشْتُ فُلَانًا فَارْعَاشَ کے معنیٰ ہیں: میں نے اس کی اصلاح کی تو اس کی حالت سدھر گئی۔شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۹۷) فَرِشْنِیْ بِحَالٍ طَالَمَا قَدْ بَرَیْتَنِی
فَخَیرُ الْمَوَالِیْ مَنْ یَرِیْشُ وَلَا یَبْرِیْ

مجھے عرصہ دراز تک تم نے تراشا ہے کبھی تو میری اصلاح کیجئے۔ بہتر موالی وہ ہیں جو بگاڑتے نہیں بلکہ سنوارتے ہیں۔

اور نیزہ کے پرسے کمزوری کے معنیٰ کے تصور کی بنا پر کمزور ... محاورہ ہے: نیزہ کو رُمح راش کہہ دیتے ہیں۔

(ر ی ع)

اَلرِّیْعُ: بلند جگہ کو کہتے ہیں۔جو دور سے ظاہر ہو اس کا واحد رِیعَۃٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۸) کیا تم ہر اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو۔

اور معنیٰ ارتفاع کے لحاظ سے کنویں کی منڈیر کو رِیْعٌ کہا جاتا ہے پھر ہر چیز کے اوائل کو رَیعَانٌ کہا جاتا ہے۔اور استعارہ کے طور پر رَیْعٌ ہر چیز کے زائد حصہ اور بلندی کے لئے آتا ہے اور اسی سے تَرَیَّعَ السَّحَابُ ہے جس کے معنیٰ بادل کے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

(ر ی ن)

اَلــرَّیْنُ: اس زنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (۸۳۔۱۴) نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

یعنی ان کے مجلیٰ قلوب پر زنگ بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خیر وشر میں تمیز نہیں کر سکتے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (البسیط)

(۱۹۹) اِذَا رَانَ النُّعَاسُ بِهِمْ

جب نیند نے ان پر غلبہ پالیا۔

رِیْنَ عَلٰی قَلْبِہٖ: اس کے دل پر زنگ بیٹھ گیا۔

(ر ء ف)

اَلرَّأْفَۃُ یہ رَؤُفَ (ک) سے ہے اور اس کے معنیٰ شفقت اور رحمت کے ہیں صفت کا صیغہ رَؤُوْفٌ اور رَئِفٌ مثل حَذِرٌ وَیَقِظٌ آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ﴾ (۲۴۔۲) اور اللہ کے حکم (کی تعمیل) میں تم کو ان کے حال پر کسی طرح کا ترس دامن گیر نہ ہو۔

(ر ء ی)

رأی: یہ مہموز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْیَۃٌ آتا ہے چنانچہ اسی سے شاعر نے قلب

---

❶ قاله سويد بن الصامت الانصاري لكامل في قومه راجع السيرة (۲: ٦٧) والاساس (۱: ۳۸۸) والاصابة ( ) والعيون (۳: ۸۱) في اربعة ابيات وفي اللسان (نشر) في ستة ولسبه لمعر بن حباب قال احد مصححيه عبارة شارح القاموس قال سويد الانصاري هو الصواب ۱۲.

❷ قطعة من البيت قاله عبدة بن الطبيب من كلمة مفضلية (۱: ۱۳۹) وتكملته: اوردته القوم........ فقلت اذانكهو امن حمة قيلوا والبيت في الامالي (۱: ۲۷۰) والسمط ٦٠٥ والمفضليات وفي المطبوع اذا ابدل قد مصحف والتصويب من المراجع.

کر کے کہا ہے۔ [1]

(۲۰۰) وَكُلُّ خَلِيْلٍ رَاٰئِنِیْ فَهُوَ قَائِلٌ
مِنْ اَجْلِكَ هٰذَا هَامَةُ الْيَوْمِ اَوْ غَدِ

جو دوست مجھے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ بدحالی تمہاری وجہ سے ہے اور یہ آج یا کل مرجائے گا۔

اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے تَـرٰی ، یَـرٰی اور نـرٰی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا﴾ (۱۹۔۲۶) اگر کوئی آدمی نظر پڑے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۴۱۔۲۹) شیطان اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ایک نظر ان کو ہمیں بھی تو دکھاؤ۔

میں ایک قرأت اَرْنَا بھی ہے۔

اَلـرُّؤْيَةُ: کے معنیٰ کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار سے رُؤْيَة کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) حاسہ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا جو حاسہ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿لَتَـرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ (۱۰۲۔۶) تم ضرور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۶۰) اور تم قیامت کے روز دیکھو گے کہ جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا۔

اور آیت:

﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ﴾ (۹۔۱۰۵) اللہ تعالیٰ بھی تمہارے کردار کو دیکھے گا۔

میں اللہ تعالیٰ کے علم کو آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی طرح قرار دے کر یَـرٰی کا لفظ لایا گیا ہے ورنہ آنکھ سے دیکھنا اللہ تعالیٰ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ کہ وہ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ لیتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) وہم وخیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے: اَرٰی اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ میرا خیال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۸۔۵۰) اور کاش تم اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب فرشتے کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(۳) کسی چیز کے متعلق تفکرا اور اندیشہ محسوس کرنا جیسے فرمایا:

﴿اِنِّیْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ﴾ (۸۔۴۹) میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

(۴) عقل وبصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے فرمایا:

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ (۵۳۔۱۱) پیغمبر نے جو دیکھا تھا اس کے دل نے اس میں کوئی جھوٹ نہیں ملایا۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] قاله كثير عزة يخاطب حبيبته والبيت في اللسان (ر ء ى) هوم وامالى ابن الشجرى (۲ : ۱۹) والكامل ۲۲۶۔۱۱۳ و البحر (۶ : ۲۱۱) واستشهد القلب في الكتاب (۲ : ۱۳۰) وفي مصارع الشاق ۷۶ مثله لبذ يدوقف على قبر جارية يقول وهناك وفيه عليل بدل خليل ۱۲.

﴿وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰی﴾ (۵۳۔۱۳) ایک دفعہ اور بھی (اصلی صورت پر) دیکھا۔
اور رائی کے جب دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنیٰ ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
﴿وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (۳۴۔۱۶) اور اے پیغمبر! جن لوگوں کو صحف آسمانی کا علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں۔
﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ﴾ (۱۸۔۳۹) اگر مال اور اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ اور اَرَاَیْتَ (ہمزہ استفہام) اَخْبِرْنِیْ کے قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس پر کاف (ضمیر خطاب) داخل ہو۔ تو حالت تثنیہ، جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اِن حالتوں میں تاء کی بجائے کاف میں حسب مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿اَرَأَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ﴾ (۱۷۔۶۲) بھلا بتایئے یہی وجہ ہے۔
﴿قُلْ اَرَأَیْتَكُمْ﴾ (۶:۴۰) اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ بھلا دیکھو تو سہی۔
﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی﴾ (۹۶۔۹) (اے پیغمبر) تم نے اس شخص کے حال پر (بھی) نظر کی جو منع کرتا ہے۔
﴿قُلْ اَرَأَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ﴾ (۴۶۔۴) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ جن کو تم (اللہ کے سوا) پکارتے ہو۔
﴿قُلْ اَرَئَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ......﴾ (۲۸۔۹۰) اے پیغمبر! ان سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اللہ تعالیٰ لے آئے۔
﴿قُلْ اَرَئَیْتُمْ اِنْ كَانَ﴾ (۴۶۔۱۰) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے) کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر یہ ہو۔

﴿اَرَئَیْتَ اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَةِ﴾ (۱۸۔۶۳) آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہم (دریا کے کنارے) اس پتھر کے پاس ٹھہرے۔
اِن تمام آیات میں تنبیہ کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔
رَأْیٌ: غلبۂ ظن کی بنا پر کسی معاملہ کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک کی صحت کا یقین کر لینا رائے کہلاتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿یَرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَأْیَ الْعَیْنِ﴾ (۳۔۱۳) جن کو آنکھوں دیکھتے مسلمانوں کا گروہ اپنے سے دو چند دکھائی دے رہا ہے۔
میں "یَـرَوْنَ رأیٌ" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ گمان کرنے کے ہیں اور معنیٰ یہ ہیں کہ عینی مشاہدے کی رو سے وہ انہیں اپنے سے دو چند خیال کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے:
فَعَلَ ذَالِكَ رَأْیَ عَیْنِیْ اَوْ رَائَةَ عَیْنِیْ کہ اس نے یہ کام میرے سامنے کیا ہے۔
اَلرَّوِیَّةُ وَالتَّرْوِیَّةُ کے معنیٰ کسی چیز پر غور و فکر کرنے اور ایک رائے اختیار کرنے کے لئے یکسوئی سے اس کی طرف توجہ دینے کے ہیں۔ اور اَلْمُرْتَئِیُّ وَالْمُرَوِّیْ بمعنیٰ متفکر ہے اور رَأَیْتُ متعدی بہ اِلٰی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز کی طرف اس طرح نظر ڈالنے کے ہیں کہ اس کے بعد انسان کو عبرت حاصل ہو جیسے فرمایا:
﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ......﴾ (۲۵۔۴۵) (اے پیغمبر) کیا تو نے اپنے پروردگار کی (قدرت کی) طرف نظر نہیں کی۔
اور آیت: ﴿بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ﴾ (۴۔۱۰۵) میں اَریٰ (افعال) بمعنیٰ تعلیم کے ہے یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے۔

اَلرَّایَۃُ اس علامت کو کہتے ہیں جو دیکھنے کے لئے نصب کی گئی ہو اور محاورہ ہے:

مَعْ فُلَان رَئِیٌّ مِّنَ الْجِنِّ: یعنی وہ آسیب زدہ ہے۔

اور اَرْاَئَتِ النَّاقَۃُ فَھِیَ مُرْءٍ: اونٹنی کا حاملہ ہونا ظاہر ہو جانا۔

اَلرُّؤْیَا بمعنیٰ خواب کے ہیں اور یہ ہمزہ کے ساتھ بروزن فُعْلٰی ہے اور کبھی ہمزہ کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ اَلرُّوْیَا کہہ دیتے ہیں ایک حدیث میں ہے۔❶

(١٦٥) لَمْ تَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْیَا کہ مبشرات نبوت سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہُ الرُّؤْیَابِالْحَقِّ﴾ (۴۸۔۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعی سچا خواب دکھایا تھا۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ﴾ (۱۷۔۶۰) اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تھا تو بس اس کو لوگوں (کے ایمان) کی آزمائش (کا ذریعہ) ٹھہرایا۔

﴿فَلَمَّا تَرَآئَی الْجَمْعَانِ﴾ (۸۔۴۷) پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

یعنی جب وہ باہم اس طرح آمنے سامنے ہوئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اسی سے وہ حدیث ہے جس میں فرمایا:❷

(١٦٦) لَایُتَرَای نَارُھُمَا کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے محاورہ ہے:

مَنَازِلُھُمْ رِئَاءٌ کہ ان کے مکانات باہم متقابل ہیں۔

فَعَلَ ذَالِکَ رِئَاءَ النَّاسِ: اس نے نمودار اور دکھاوے کے لئے یہ کام کیا۔

یہ رَأَیْتُ سے مِفْعَلَۃ کے وزن پر ہے جیسے صَحَفْتُ سے مِصْحَفَۃٌ اور اس کی جمع مَرَائِیْ آتی ہے۔

اَلرِّئَۃُ پھیپھڑا۔اس کی جمع مِنْ لَفْظِہٖ رِؤُوْنَ آتی ہے۔

اس پر ابوزید نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔❸

(١٢١) حَفِظْنَاھُمُوْا حَتّٰی اَتَی الْغَیْظُ مِنْھُمُوا
قُلُوْبًا وَاَکْبَادًا لَھُمْ وَرِئِیْنَا

ہم نے انہیں غصہ دلایا حتیٰ کہ غیظ وغضب ان کے دل وجگر اور پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا۔

اور اسی سے رِئْتُہٗ ہے جس کے معنیٰ پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔

❀❀❀

---

❶ رواہ ابوداؤد باب علی مایقال المشرکون من حدیث جریر بن عبداللہ والنسائی فی باب القود بغیر حدیدۃ مرسلاً والحدیث فی اللآلی ٥٧ وانظر لتخریجہ الکاف الشاف لابن حجر ٥٥ وتخریج العراقی علی الاحیاء (٢: ١٦٩) والفائق (١: ٢١٩) وغریب ابی عبید ١٢.

❷ البیت فی اللسان (رای) بغیر عزو فیہ فعظناھم بدل حفظناھم.

❸ رواہ ابوداؤد فی باب الدعاء فی الرکوع والسجود من حدیث ابن عباس وفیہ الرؤیا الصالحۃ راجع العون (١: ٣٢٧) والحدیث ایضاً رواہ مسلم (١: ١٩١) طبع ھند والنسائی وابن ماجۃ ١٢.

كِتَابُ الزَّاءَ

(ز ب د)

اَلزَّبَدُ: جھاگ کو کہتے ہیں اور اَزْبَدَ الْمَاءُ کے معنیٰ ہیں: پانی کے اوپر جھاگ آ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً﴾ (۱۳۔۱۷) سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے۔

پھر محض رنگ میں مشابہت کی وجہ سے مسکہ کو بھی زُبْدٌ کہا جاتا ہے اور زَبَدْتُهٗ زَبْدًا کے معنیٰ ہیں ''میں نے اسے جھاگ کی طرح بکثرت مال دیا'' یا ''میں نے اسے مسکہ کھلایا''

اَلزَّبَادُ: پھول یا کلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔

(ز ب ر)

اَلزُّبْرَةُ: لوہے کی بڑی سل کو کہتے ہیں اور اس کی جمع زُبَرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ﴾ (۱۸۔۹۶) (اچھا) لوہے کی سلیں ہم کو لا دو۔

اور کبھی زُبْرَةٌ کا لفظ بالوں کے گچھا پر بولا جاتا ہے اس کی جمع ''زُبَــر'' آتی ہے اور استعارہ کے طور پر پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو زُبُرٌ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا﴾ (۲۳۔۵۳) پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کر کے اپنا (اپنا) دین جدا جدا کر لیا۔

زَبَرْتُ الْكِتَابَ: میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا اور ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہوا سے زَبُــوْرٌ کہا جاتا ہے لیکن عرف میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہو چکا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ (۴۔۱۶۳) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (۹۔۱۰۵) اور ہم نصیحت (کی کتاب یعنی توراۃ) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

اس میں ایک قرأت زُبُــوْر (بضمہ زاء) بھی ہے جو یا تو زَبُوْرٌ بفتحہ الزاء کی جمع ہے، جیسے ظَرِيفٌ کی جمع ظُرُوْفٌ آ جاتی ہے اور یا زِبْرٌ (بکسرۂ زاء) کی جمع ہے۔ اور زِبر گو اصل میں مصدر ہے لیکن بطور استعارہ اس کا اطلاق کتاب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود کتاب کا لفظ ہے کہ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے پھر جس طرح کتاب کی جمع کتب آتی ہے اس طرح زِبْرٌ کی جمع زُبُــرٌ آ جاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ زبور کتب الٰہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۶) اس میں شک نہیں کہ یہ (یعنی اس کی پیشین گوئی) اگلے پیغمبروں کی

(1) هو مستعار من زبرت الفضة وقال قتادة ومجاهد الزبر بمعنى الكتب جمع زبور راجع تفسير الكشاف (ص ٦٦ ج ٢ معالم ج ٣ ص ٥٢).

کتابوں میں موجود ہے۔

﴿وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ﴾ (۳۔۸۳) اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔

﴿أَمْ لَهُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ (۵۴۔۴۳) یا تمہارے لئے صحیفوں میں معافی (لکھی ہوئی) ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف حِکم عقلیہ پر مشتمل ہو اور اس میں احکام شرعیہ نہ ہوں۔ اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام و حِکم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔

زِئْبِرُ الثَّوبِ: کپڑے کا رواں۔ اسی سے کہا جاتا ہے: هَاجَ زِئْبِرُهٗ: وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔

اور بڑے کندھوں والے شخص کو اَزْبَرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ج ج)

اَلزُّجَاجُ: ایک قسم کا شفاف پتھر (شیشہ) اس کا مفرد زُجَاجَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ زُجَاجَةٍ: الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (۲۴۔۳۵) ایک شیشہ میں ہے (اور) شیشہ گویا چمکتا ہوا تارا ہے۔

اَلزُّجُّ: نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ جمع زِجَاجٌ اور زَجَجْتُ الرَّجُلَ کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے نیزہ کی نوک سے مارا۔ اَزْجَجْتُ الرُّمْحَ: میں نے نیزہ میں زج لگائی یا اس سے زج کو نکال لیا۔

اَلزَّجَجُ: ابرو کی درازی اور باریکی جو نیزہ کی انی کے مشابہ ہو۔

ظَلِيمٌ اَزَجُّ وَنَعَامَةٌ زَجَّاءُ: دراز گام شتر مرغ۔

(ز ج ر)

اَلزَّجْرُ: اصل میں آواز کے ساتھ دھتکارنے کو کہتے ہیں۔ زَجَرْتُهٗ: میں نے اسے جھڑکا، روکا۔

اِنْزَجَرَ: (جھڑکنے پر) کسی کام سے رک جانا۔ یہ زَجَرَ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا﴾ (۳۷۔۲) میں زَاجِرَاتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ڈانٹ کر چلاتے ہیں۔

اور آیت: ﴿فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ (۷۹:۱۳) اور قیامت تو ایک ڈانٹ ہے۔

﴿مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ﴾ (۵۴۔۴) جس میں (کافی) تنبیہ ہے۔ میں مُزْدَجَرٌ سے ایسی باتیں مراد ہیں جو ارتکاب معاصی سے روکتی اور سختی سے منع کرتی ہیں۔ اور آیت:

﴿وَازْدُجِرَ﴾ (۵۴۔۹) اور اسے جھڑکیاں دی گئیں۔ کے معنیٰ ہیں: ڈانٹ کر نکال دیا گیا۔ یہاں زجر کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مار بھگانے کے وقت تہدید آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے جا چلا جا، دور ہو جا وغیرہ۔

(ز ج و)

اَلتَّزْجِيَةُ کے معنیٰ کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ چل پڑے مثلاً: پچھلے سوار کا اونٹ کو چلانا یا ہوا کا بادلوں کو چلانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُزْجِيْ سَحَابًا﴾ (۲۴۔۴۳) (اللہ ہی) بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

﴿يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (۱۷۔۶۶) جو تمہارے لئے (سمندروں میں) جہازوں کو چلاتا ہے۔

اور اسی سے کہا جاتا ہے کہ رَجُلٌ مُزْجًى: ہنکایا ہوا آدمی۔ یعنی کمزور اور ذلیل آدمی۔

اَزْجَیْتُ رَدِیْءَ التَّمْرِ: میں نے ردی کھجوروں کو دور پھینک دیا۔ اور زَجَا (لازم) اَزْجٰی کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

زَجَاالْخَرَاجُ(ن) خراج کا سہولت سے جمع ہو جاتا۔ اور " خَرَاجٌ رَاجٍ "اس خراج کو کہتے ہیں جو معمولی ہونے کی وجہ سے سہولت سے جمع ہو جائے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۲۰۳) وَحَاجَةٍ غَیْرُ مُزْجَاةٍ عَنِ الْحَاجِ

اور حاجت مندوں کی بعض حاجتیں معمولی نہیں ہوتیں کہ انہیں پورا کیا جا سکے۔

(ز ح ز ح)

اَلزَّحْزَحَةُ کے معنیٰ ہیں دور ہٹانا اور برطرف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ﴾ (۳-۱۸۴) پس جو شخص آگ سے دور رکھا گیا۔

(ز ح ف)

اَلزَّحْفُ: اصل میں اس کے معنیٰ پاؤں کے گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے اور اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں گھسیٹ کر چلتا ہے یا فوج کثرت ازدحام کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا﴾ (۸-۱۵) جب کفار سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے۔

اور زَاحِفٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ورے گر جائے۔

(ز خ ر ف)

اَلزُّخْرُفُ: اصل میں زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو۔ اسی سے سونے کو بھی زُخْرُفٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ یہ زیبائش کے کام آتا ہے۔) قرآن پاک میں ہے:

﴿اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا﴾ (۱۰-۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی۔

﴿بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ (۱۷-۹۳) طلائی گھر۔

﴿وَزُخْرُفًا﴾ (۴۳-۳۵) اور سونے کے (دروازے)

اور ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶-۱۱۲) کے معنیٰ ہیں "ملمع کی ہوئی باتیں"

(ز ر ب)

اَلزَّرَابِیُّ: یہ زِرْبٌ کی جمع ہے جو ایک عمدہ قسم کا کپڑا ہے اور ایک مقام کی طرف منسوب ہے پھر تشبیہ واستعارہ کے طور پر زَرَابِیٌّ بمعنیٰ فرش کے بھی آ جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ﴾ (۸۸-۱۶) اور بچھائے ہوئے فرش۔

اور زَرْبٌ وَزَرِیْبَةٌ: بکریوں کے باڑہ اور تیر انداز کے چھپنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔

(ز ر ع)

اَلزَّرْعُ: اس کے اصل معنیٰ اِنْبَات یعنی اگانے کے ہیں اور یہ کھیتی اگانا دراصل قدرت کا کام ہے اور انسان کے کسب وہنر کو اس میں دخل نہیں ہے اسی بنا پر آیت کریمہ:

﴿اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ (۵۶-۶۴) بھلا بتاؤ کہ جو تم بوتے

ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ میں حَـرْث (بونا) کی نسبت تو انسان کی طرف کی ہے مگر زَرْعٌ (اگانے) کی انسان سے نفی کر کے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور کھیتی اگانے کے اسباب مثلاً زمین کو تیار کر کے اس میں تخم ریزی کرنا اور مناسب احتیاطیں برتنا چونکہ انسان سرانجام دیتا ہے اس لئے مجازاً انسان کی طرف بھی زَرع کی نسبت کر دیتے ہیں جیسا کہ اَنْبَـتُّ کَـذَا کا محاورہ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان منجملہ اگانے کے اسباب سے ہے۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مَـــزْرُوْع (اسم مفعول) یعنی کھیتی مراد ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿فَـنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا﴾ (۳۲-۲۷) پھر ہم اس (پانی) کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَـقَـامٍ کَرِیْمٍ﴾ (۴۴-۲۶) اور کتنی ہی کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ عمدہ مکانات۔

اور تشبیہ کے طور پر جس طرح انسان کے متعلق اَنْبَتَـهُ اللّٰهُ کا محاورہ ہے استعمال ہوتا ہے اس طرح محاورہ میں زَرَعَ الـلّٰهُ وَلَدَكَ (اللہ تمہاری اولاد کو نمو بخشے) بھی کہہ دیتے ہیں اور مُــــزْرِع بمعنیٰ زرّاع یعنی کسان کے ہیں اور اِزْدَرَعَ النَّبَاتُ کے معنیٰ ہیں نباتات بڑھ گئی۔

(ز ر ق)

اَلزُّرْقَةُ: (نیلاہٹ) ایک رنگ جو سپیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: زَرِقَـتْ عَيْنُهٗ زُرْقَةً وَزُرُقَانًا: اس کی آنکھ نیلی ہوگئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿زُرْقًـا یَتَـخَـافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰-۱۰۲، ۱۰۳) نیلی آنکھوں والے جو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔

میں زُرقًا کے معنیٰ اندھے، جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو۔

اَلــزُّرْقُ: ایک پرند کا نام ہے (سفید شاہین) محاورہ ہے زَرَقَ الـطَّائِرُ: پرند کا بیٹ کرنا اور زَرَقَـهٗ بِالْمِزْرَاقِ کے معنیٰ ہیں ''اسے چھوٹے نیزہ سے مارا''

(ز ر ی)

زَرَيْـتُ عَـلَيْـهِ کے معنیٰ کسی پر عیب لگانے کے ہیں اور اَزْرَيْتُ بِهٖ وَازْدَرَيتُ (افتعال) کے معنیٰ ہیں ''کسی کو حقیر اور بے وقعت گرداننا'' قرآن پاک میں ہے:

﴿تَـزْدَرِیْ اَعْيُـنُـكُمْ﴾ (۱۱-۳۱) (جنہیں) تمہاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں۔

یہ اصل میں تَـزْدَرِيْهِمْ اَعْيُنُكُمْ ہے یعنی اس کا مفعول محذوف ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ تم انہیں نظر حقارت سے دیکھتے ہو۔

(ز ع ق)

الــزُّعَــاقُ: سخت کھاری اور کڑوے پانی کو کہتے ہیں اور جس کھانے میں حد سے زیادہ نمک ہو اسے طعام مزعوق کہا جاتا ہے۔

زَعَقَ (ف) بِهٖ کے معنیٰ کسی پر چلا کر اسے گھبرا دینے کے ہیں اور اِنْزَعَقَ (لازم) گھبرا جانا۔

اَلزَّعِقُ: بہت چلانے والا۔

اَلزَّعَّاقُ: بہت بلند آواز نکالنے والا۔

(ز ع م)

اَلزَّعْمُ: اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ کا احتمال ہو اس لئے قرآن پاک میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت

مقصود ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۶۴۔۷) کفار (یہ) زعم کرتے ہیں۔

﴿بَلْ زَعَمْتُمْ﴾ (۱۸۔۴۸) مگر تم یہ خیال کرتے ہو۔

﴿كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ (۶۔۲۲) (جن کو تم شریک خدائی سمجھتے تھے۔

﴿زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ (۱۷۔۵۶) (جنہیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا۔

اور زَعَامَةٌ کے معنیٰ ذمہ داری اٹھانے اور ریاست (سرداری) کے ہیں اور کفیل (ضامن) اور رئیس کو زَعِيمٌ کہا جاتا ہے۔کیونکہ ان دونوں کی بات میں جھوٹ کا احتمال ہوسکتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴾ (۱۲۔۷۲) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

﴿اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ﴾ (۶۸۔۴۰) ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔یہاں زَعِيمٌ یا تو زَعَامه بمعنیٰ کَفالة سے ہے اور یا زعم بالقول سے ہے۔

(ز ف ف)

زَفَّ الْاِبِلُ يَزِفُّ زَفًّا وَزَفِيفًا کے معنیٰ ہیں: اونٹ کا تیز چلنا اور اَزَفَّهَا (افعال) کے معنیٰ تیز چلانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ﴾ (۳۷۔۹۴) وہ اس کی طرف دوڑتے آئے۔

اور ایک قرأت میں يُزِفُّوْنَ (بضمہ یاء) ہے یعنی وہ اپنے ساتھیوں کو تیز روی پر برانگیختہ کرتے ہیں۔

اصل میں زِفِيفٌ کے معنیٰ ہوا کے تیز چلنے یا شتر مرغ کے اس قدر تیز چلنے کے ہیں جس میں نیم پرواز پائی جائے۔ کہا جاتا ہے: زَفْزَفَ النَّعَامُ: شتر مرغ تیز چلا پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زَفَّ الْعَرُوْسُ کہا جاتا ہے۔ یعنی دلہن کو شوہر کے پیش کیا۔اس میں بھی معنیٰ سرعت ملحوظ ہے۔مگر اس کا تعلق چلنے سے نہیں ہے بلکہ پیش کرنے والوں کے وفور شوق سے ہے۔

(ز ف ر)

اَلزَّفِيْرُ: اس کے اصل معنیٰ سانس کی اس قدر تیزی سے آمد و شد کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ﴾ (۱۱۔۱۰۶) ان کے لئے اس میں چیخنا ہے۔

اِزْدَفَرَ (افتعال) فُلَانٌ كَذَا: کسی چیز کو مشقت سے اٹھانا جس سے سانس پھول جائے اس لئے پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ق م)

اَلزَّقُّوْمُ: تھوہر کا درخت اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ﴾ (۴۴۔۴۳) بے شک سینڈھ کا درخت۔میں زَقُّومٌ سے دوزخ کے کریہہ کھانے مراد ہیں۔اور اس سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

زَقَمَ فُلَانٌ وَتَزَقَّمَ: اس نے کوئی کریہہ چیز نگل لی۔

(ز ک و)

اَلزَّكَاةُ: اس کے اصل معنیٰ اس نمو (افزونی) کے ہیں جو برکت الٰہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ

کہا جاتا ہے۔
زَکَاالزَّرْعُ یَزْکُوْ: کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا اور آیت کریمہ:
﴿اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَامًا﴾ (۱۸۔۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔
میں اَزْکٰی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوٰۃ کا لفظ مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوۃ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو امور کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوۃ میں موجود ہیں۔
قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:
﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوالزَّکٰوۃَ﴾ (۲۔۴۳) نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرتے رہو۔
اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا۔ اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے۔ اور فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا﴾ (۹۱۔۹) کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔
اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَاءُ﴾ (۴۔۴۹) بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا﴾ (۹۔۱۰۳) کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔
﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْھِمْ﴾ (۲۔۱۵۱) وہ پیغمبر انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں بذریعہ تعلیم (اخلاق رذیلہ) سے پاک کرتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے چنانچہ یحیٰی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:
﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً﴾ (۱۹۔۱۳) اور اپنی جناب سے رحمدلی اور پاکیزگی دی تھی۔
﴿لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ (۱۹۔۱۹) تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔
یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتباء حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و ممارست سے نہیں بلکہ محض توفیق الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ

ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہٰذا زَکِیًّا کا تعلق زمانۂ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ﴾ (۲۳۔۴) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کردے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں۔ وَالْمَالُ وَاحِدٌ۔ لہٰذا لِلزّکٰوۃ میں لام تعلیل کے لئے ہے جسے لام علت وقصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فَاعِلُونَ کا مفعول ہو۔

انسان کے تزکیۂ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰاھَا﴾ (۹۱۔۹) اور آیت: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی﴾ (۸۷۔۱۴) میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔ دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان دوسرے کے اچھا ہونے کا دعویٰ کرے اور خودستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿لَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ﴾ (۵۳۔۳۲) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نہی تادیبی ہے۔ کیونکہ انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا یہ عقلاً ہی درست نہیں ہے۔ اور نہ ہی شرعاً۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا۔ مَدْحُ الْاِنْسَانِ نَفْسَہٗ کہ خودستائی کرنا۔

(ز ل ل)

اَلزَّلَّۃُ: کے اصل معنیٰ بلاقصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: زَلَّتْ (ض) رِجْلٌ تَزِلُّ اور پھسلنے کی جگہ کو زَلَّۃٌ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلاقصد سرزد ہوجائے تو اسے بھی بطور تشبیہ زَلَّۃٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ﴾ (۲۔۲۰۹) اگر تم لغزش کھا جاؤ۔

﴿فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ﴾ (۲۔۱۳۶) انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

اِسْتَزَلَّہٗ: (استفعال) کسی کو پھسلانے کا قصد وارادہ کرنا اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ﴾ (۳۔۱۵۴) شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے یہ معنیٰ ہیں کہ شیطان انھیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پھسل گئے۔ کیونکہ جب انسان صغائر سے بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔[1]

(۱۶۶) مَنْ اُزِلَّتْ اِلَیہِ نِعْمَۃٌ فَلْیَشْکُرْھَا کہ جسے بلاطلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلاقصد نعمت حاصل ہونے

---

[1] فی الفائق مرفوعاً (۱: ۳۶۸) وفی غریب ابی عبید (۱: ۱۵) ھب ـعن یحییٰ بن عبداللہ بن صیفی مرسلا بلفظ من اولیت الیہ ومن انزلت قال ابوعبید لیس ھذا بمحفوظ فی ابن عساکر عنہ مرسلاً من ازلفت الیہ ید راجع کنزالعمال (۶: رقم ۱۹۸۸، ۱۹۹۲.)

پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکریہ بالا ولیٰ ضروری ہے۔

اَلتَّزَلْزُلُ: اس کے معنیٰ اضطراب کے ہیں اور اس میں تکرار حروف تکرار معنیٰ پر دال ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۹۹۔۱) جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔

﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ﴾ بے شک قیامت کا زلزلہ (بڑی سخت) مصیبت ہوگی۔

﴿وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا﴾ (۳۳۔۱۱) اور وہ (دشمنوں کے رعب سے) خوب ہی جھڑجھڑائے گئے۔

(ز ل ف)

اَلزُّلْفَةُ: اس کے معنیٰ قرب اور مرتبہ کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً﴾ (۶۷۔۲۷) سو جب وہ قریب دیکھیں گے۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ جب وہ مومنین کے مراتب قرب کو دیکھیں گے اور وہ ان سے محروم ہوں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں زُلْفَةً سے مراد عذاب کا قرب ہے اور عذاب کو زُلْفَةً کہنا، حالانکہ یہ مراتب محمودہ میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور تہکم ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت یا اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور منازل لیل یعنی رات کے حصوں کو بھی زُلَفٌ کہا گیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) اور رات کے کچھ حصوں میں۔

شاعر نے کہا ہے۔❶ (رجز)

(۲۰۴) طَیُّ اللَّیَالِیْ زُلَفًا فَزُلَفًا

اور راتوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے گزرنا۔

اَلزُّلْفیٰ: قرب و مرتبہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفیٰ﴾ (۳۹۔۳) کہ خدا کے ہم کو قریب کر دیں۔

﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (۲۶۔۹۰) اور بہشت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی۔

اور لَیْلَةُ الْمُزْدَلِفَةِ کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ حجاج کرام عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات منیٰ کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور حدیث میں ہے۔❷

(۱۶۷) اِزْدَلِفُوْا اِلَی اللّٰهِ بِرَکْعَتَیْنِ: کہ دو رکعت نماز سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔

(ز ل ق)

زَلَقٌ اور زَلَلٌ تقریباً ہم معنیٰ ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿صَعِیْدًا زَلَقًا﴾ (۱۸۔۴۰) صاف میدان۔

یعنی چکنی زمین جس میں کوئی سبزہ نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَتَرَکَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۴) اسے سپاٹ کر (کے بہہ بہا) گیا۔

اَلْمُزْلَقُ: پھسلنے کی جگہ۔ اور آیت کریمہ:

---

❶ وقبلٌ: ناج طواه الاین هماً وجفاً وثالثه: سماوة الهلال حتیٰ احقوقفا ـ والشطر من ارجوزة للعجاج راجع اراجیز العرب للسید البکری ۵۲ ومجاز القران لابی عبیدة (۱: ۳۰۰) والطبری (۱۹: ۸۱) والکامل ۱۲۹, ۸۲٤ فی ثلاثة اشطار وادب الکتاب للصولی (۱۲۳) والصحاح والتاج واللسان (زنف) والشنتمری (۱: ۱۸۰) ودیوانه ۸٤ والکتاب (۱: ۱۵۰) والبحر (۱: ۸۳) وابن خالویه ۹۸ والعینی (۱: ۲۹).

❷ وفی النهایة (زلف) فی حدیث مصعب بن عمیر: فاذازالت الشمس فازدلف الی الله برکعتین واخطب فیهما ای تقرب ۱۲.

﴿لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ﴾ (۶۸۔۵۱) اپنی نظروں سے (گھور کر) تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں۔ میں ابصار کے متعلق زَلَقَ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الکامل)

(۲۰۵) نَظَرٌ يُزِيْلُ مَوَاضِعَ الْاَقْدَامِ

ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔

کہا جاتا ہے زَلَقَهٗ وَاَزْلَقَهٗ: اسے پھسلایا فَزَلِقَ چنانچہ پھسل گیا۔

یونس لغوی کا قول ہے کہ زَلَقٌ اور اِزْلَاق کا یہ محاورہ صرف قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے اور ابی بن کعب نے اَزْلَقْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۲۶۔۶۴) میں ازلقنا (قاف کے ساتھ) پڑھا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نے وہاں دوسرے لوگوں کو لا کر ہلاک کر ڈالا۔

(ز م ر)

زُمْرَةٌ کے معنیٰ چھوٹی سی جماعت کے ہیں۔ اس کی جمع زُمَرٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (۳۹۔۷۳) اور جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کر کے چلے جائیں گے۔ اور اسی سے شَاةٌ زَمِرَةٌ ہے جس کے معنیٰ کم اُون والی بھیڑ کے ہیں اور بے مروت آدمی کو زَمِرٌ کہا جاتا ہے اور زَمَرَتِ النَّعَامَةُ تَزْمِرُ زِمَارًا کے معنیٰ ہیں شتر مرغ نے سیٹی بجائی اور اس سے کنایہ کے طور پر فاجرہ عورت کو زَمْرٌ وَزَمَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔❷

(ز م ل)

﴿يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ (۷۳۔۱) اے اوڑھنے والے۔ تو مُزَّمِّلٌ اصل میں مُتَزَمِّلٌ ہے جس کے معنیٰ کپڑے میں لپیٹنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر سستی اور کوتاہی کرنے والے کو بھی تعریضاً مُزَّمِّلٌ کہا جاتا ہے اسی سے زُمَّيْلٌ ہے جس کے معنیٰ کمزور اور ناتواں کے ہیں تَاَبَّطَ شَرًّا کے متعلق اس کی والدہ نے کہا ہے۔❸

لَيْسَ بِزُمَّيْلٍ شَرُوْبٍ لِلْغِيْلِ

کہ وہ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ دوپہر کے وقت دودھ پینے کی ضرورت ہو۔

(ز ن م)

اَلزَّنِيْمُ یا مُزَنَّمٌ اسے کہتے ہیں جو کسی قوم سے نسبتی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ یونہی ملحق ہو۔ جیسے زَنَمَتَا الشَّاةِ: یعنی گوشت کے دو زائد ٹکڑے جو بکری کے گلے یا کان سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۳) سخت جھگڑالو اس کے علاوہ بد ذات بھی۔

---

❶ وفی اللسان انشده ابواسحاق راجع (زلق قرض) وقد مر تخریجه فی (دحض) والبیت فی المعانی للقبتی ۸۴۵، ۱۱۲۹ والصناعتین ۲۸۱ والطبرسی (۲۸: ۳۷) ۱۲۔

❷ وفی الحدیث نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن کسب الزمارة وهی التی تزمر او الزانیة (راجع غریب ابی عبید (۱: ۳۴۱) والفائق (۱: ۵۳۹).

❸ ترثیه انظر المعانی فی الکبیر ۱۲۳۰ وفیه وفی اللسان (قیل) رثائها: وابناه، وابن اللیل ـ لیس بزمیل شروب للقیل، کمقرب الخیل ـ ترید بابن اللیل ـ انه صاحب غارات والقیل اللبن الذی یشرب وقت القیلولة ای نوم الظهیر والفعل من قال واقتال ای لیس هو شروب للقیل مهیانا دقیق الخصر یحتاج الی الشرب نصف النهار وفی المطبوع الفیل مکان القیل والتصحیح من اللسان (زمل) ۱۲۔

اور زَنِیْمٌ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو۔ یعنی زَلَمَة یا زَنَمَة کی طرح لٹک رہا ہو درحقیقت ان سے نہ ہو شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۰۷) فَاَنْتَ زَنِیْمٌ نِیْطَ فِیْ اٰلِ هَاشِمٍ
کَمَا نِیْطَ خَلْفَ الرَّاکِبِ الْقَدَحُ الْفَرْ

اور تو حرام زادہ ہے جو آل ہاشم کے ساتھ اس طرح معلق ہے جیسے لکڑی کا خالی پیالہ سوار کے پیچھے لٹک رہا ہوتا ہے۔

(ز ن ی)

اَلزِّنَا: عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہم بستری کرنے کا نام زنا ہے یہ اسم مقصور ہے اگر اسے ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلہ کا مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت زَنَوِیٌّ کہا جائے گا اور فُلَانٌ لِزِنْیَةٍ (بکسرہ زا و فتح آں) کے معنیٰ ہیں: فلاں حرام زادہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَا اِلَّا زَانٍ﴾ (۲۴-۳) زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرکہ عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرتا اور فاجرہ عورت سوائے فاجر کے کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرتی۔

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ﴾ (۲۴-۲) زانیہ عورت اور زانی مرد۔

اور اگر مہموز اللام سے ہو جیسے: زَنَأَ فِی الْجَبَلِ زَنَاءً وَزُنُوءً: تو اس کے معنیٰ پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔

اَلزَّنَاءُ حاقن: یعنی پیشاب روکنے والے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۶۸) لَا یُصَلِّیْ الرَّجُلُ وَهُوَ زَنَاءٌ: کہ آدمی کو چاہیے کہ حاقن ہونے کی صورت میں نماز نہ پڑھے۔

(ز ه د)

اَلزَّهِیْدُ کے معنیٰ حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیری چیز پر راضی ہوجانے والے کو زَاهِدٌ فِی الشَّیْءِ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَانُوا فِیْهِ مِنَ الزَّاهِدِیْنَ﴾ (۱۲-۲۰) اور اس کے بارہ میں وہ بے رغبت تھے۔

(ز ه ق)

زَهَقَتْ نَفْسُهٗ کے معنیٰ ہیں کسی چیز پر رنج وغم سے اس کی جان نکل گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۹-۵۵) اور ان کی جانیں (اس حال میں) نکلیں۔

(ز ی ت)

زَیْتٌ وَزَیْتُوْنَةٌ مثل شَجر وَشَجرة: ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ﴾ (۲۴-۳۵) زیتون کے درخت سے روشن ہورہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

اَلزَّیْتُ: زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ﴾ (۲۴-۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی کرے۔

اور زَاتَ طَعَامَهٗ کے معنیٰ ہیں اس نے طعام میں زیتون

---

❶ قاله حسان بن ثابت یهجو ابا سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب من شواهد الکشاف ۳۸ ودیوانه ۸۹ والبحر (۸: ۳۰۵) والحصری (۱: ۶۳) واللسان (زنم) وفیه وانت والمرزوقی (۵۰۴).

❷ الحدیث فی اللسان (زنا) الفائق (۱: ۲۷۰) وراجع لتاویله المرتضیٰ (۲: ۲۸۵ ـ ۲۸۶) وغریب ابی عبید (۱: ۱۴۹).

کا تیل ڈالا جیسے سَمِنَہٗ اور دَھَنَہٗ بِہٖ کی طرح رَاتَ رَأْسَہٗ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا جس کے معنیٰ ہیں۔(اس نے سر پر تیل لگایا) اور اِزْدَاتَ بمعنیٰ اِدَّھَنَ کے ہیں۔

(ز و ج)

اَلزَّوْجُ: جن حیوانات میں نراور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نراور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زَوْجٌ کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ۔پھر ہر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى﴾ (۷۵۔۳۹) اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

﴿وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (۲۔۳۵) (تو) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زَوْجَۃٌ (تاء کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۲۰۸) فَبَكَا بَنَاتِي شَجْوَهُنَّ وَزَوْجَتِي

تو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زَوْجٌ کی جمع اَزْوَاجٌ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ﴾ (۳۶۔۵۶) وہ اور ان کے جوڑے۔اور آیت:

﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ﴾ (۳۷۔۲۲) جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو ہر فعل میں ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا﴾ (۲۰۔۱۳۱) اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔

اشباہ واقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں۔اور آیت:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ﴾ (۳۶۔۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم) کی چیزیں پیدا کیں۔

نیز فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱۔۴۹) اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض، مادہ وصورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے۔بلکہ نفس ترکیب سے تو

---

[1] قالہ عبدۃ بن الطبیب التمیمی والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۲۷ فی ۳۰ بیتاً ینصح فیھا بنیہ حین کبر وتمامہ: والاقربون الی ثم تصدعوا والبیت فی اضداد ابن الانباری ۳۷۴ والمخصص (۱۷: ۳۴) واضداد ابی الطیب ۳۴۰.

کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے۔ لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت:

﴿اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى﴾ (۲۰۔۵۳) طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنیٰ آیت:

﴿مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ (۳۰۔۱۰) ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)

اور آیت کریمہ: ﴿ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (۶۔۴۴) (نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔ میں مراد ہیں اور آیت:

﴿كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ (۵۶۔۷) میں اَزْوَاجٌ کے معنیٰ ہیں۔ قُرَنَاء یعنی امثال ونظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ (۸۱۔۷) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زُوِّجَتْ کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ ہر پیروکار کو اس کے پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کردیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت: ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ﴾ (۳۷۔۲۲) میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائے گا جیسا کہ آیت:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (۸۹۔۲۷،۲۸) اے اطمینان پانے والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

میں بعض نے رَبِّكِ کے معنیٰ صَاحِبِكِ یعنی بدن ہی کے کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زُوِّجَتْ سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کردیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت کریمہ ہے:

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ (۳۔۳۰) جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔

میں بھی اس معنیٰ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ (۵۲۔۲۰) اور ہم انہیں حورعین کا ساتھی بنادیں گے۔

میں زَوَّجْنَا کے معنیٰ باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زَوَّجْنَا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بِحُوْرٍ کی بجائے زَوَّجْنٰهُمْ حُوْرًا کہتا۔ جیسا کہ زَوَّجْتُهٗ امْرَئَةً کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کردیا۔ [1]

---

[1] هذا ذهب اليه يونس وابو عبيدة من علماء العربية قال الواحدى والتنزيل يدل على ما قال يونس (راجع الفخر ۲۷۔۲۵۳) وفى البخارى: زوجناهم بحوارى انكحناهم قال فى الفتح (۶: ۳۵۵) وتعقب بان زوج لايتعدى بالباء ...... وفيه نظر لان صاحب المحكم حكاه لكن قال انه قليل والله اعلم.

(ز و د)

اَلــزَّادُ: موجودہ ضرورت سے زائد اندوختہ کو کہتے ہیں اور اَلتَّــزَوُّدُ (تفعل) کے معنیٰ توشہ لینا ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ (۲۔۱۹۷) اور زادِ راہ ساتھ لے جاؤ بے شک بہترین توشہ سوال سے بچنا ہے۔

اور اَلْـمِـزْوَدُ اس توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے۔اور اَلْمَزَادَةُ مشکیزہ جس میں پانی بطور زادِ راہ رکھا جاتا ہے۔

(ز و ر)

الزَّوْرُ: سینہ کا بالائی حصہ اور زُرْتُ فُـلَانًا کے معنیٰ ہیں: میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا، یا اس کے سینہ کا قصد کیا (اس کی ملاقات کی) جیسا کہ وَجَّهْتُــهٗ کا محاورہ ہے یعنی اس کے سامنے اپنا چہرہ کیا یا اس کے چہرہ کا قصد کیا۔رَجُلٌ زَائِرٌ: ملاقاتی زَائِرٌ کی جمع زَوْرٌ آتی ہے جیسا کہ سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ مگر کبھی رَجُلٌ زَوْرٌ بھی آ جاتا ہے اس صورت میں یہ مصدر ہوتا ہے جیسا کہ ضَـعِیْفٌ کا لفظ ہے نیز اَلـزَّوْرُ: کے معنیٰ سینہ کے ایک طرف جھکا ہوتا کے ہیں اور جس کے سینہ میں ٹیڑھا پن ہو اسے اَلْاَ زْوَرُ کہتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ﴾ (۱۸۔۱۷) کے معنیٰ یہ ہیں کہ سورج ان کے غار سے ایک طرف ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ یہاں "تَـزَاوَرُ" میں حرف زاء پر تشدید بھی پڑی جاتی ہے اور بغیر تشدید کے بھی اور بعض نے تَزْوَرُّ (افعلال) پڑھا ہے۔ ❶ مگر الحسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ قرأت یہاں موزوں نہیں ہے کیونکہ اَلْاِزْوِرَارُ کے معنیٰ ہیں: منقبض ہونا۔کہا جاتا ہے: تَـزَاوَرَعَـنْـهُ وَازْوَرَّعَنْهُ: اس نے اس سے پہلوتہی کی۔اس سے ایک جانب ہٹ گیا اور جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہوا سے بِـئْـرٌ زَوْرَاءُ کہا جاتا ہے اسی سے جھوٹ کو اَلــزُّوْرُ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جہت راست سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ظُلْمًا وَّ زُوْرًا﴾ (۲۵۔۴) ظلم اور جھوٹ سے۔

﴿قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (۲۲۔۳۰) جھوٹی بات سے۔

﴿مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا﴾ (۵۸۔۲) اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔

﴿لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ (۲۵۔۷۲) وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔

اور شاعر کا قول ہے۔

(۲۰۹) وَجَاءُوْا بِـزُوْرَيْهِـمْ وَجِئْنَا بِالْاَصَمِّ

وہ اپنے دو جھوٹے خدا لے کر آ گئے اور ہم اپنے بہادر سردار کو۔

میں زُوْرٌ کے معنیٰ بت کے ہیں۔ ❷ کیونکہ بت پرستی بھی

---

❶ بالتشـديـد قرائة الحرمين وابی عمرو بالتخفيف قرائة الكوفيين والاعمش وطلحة وابن ابی ليلیٰ واماتزور فهی قرائة قتادة وابن ابی اسحاق وابن عامر وفيه قرائة اخریٰ ای تزوار علی مثال تحمار روهی قرائة ابی رجاء وايوب السختيانی وابن ابی عبلة وجابر وقرائة ابن مسعود راجع ابی حيان (٦: ١٠٧ـ١٠٨).

❷ الرجز للاغلب العجلی قاله يوم الزويرين حرب كانت بين بكر وبين بنی تميم ـ والاصم لقب لعمربن قيس بن عامر الشيبانی رئيس بكر بن وائل يومئذ ويعنی بزوريهم بكرين مجللين قد قيدوهما وقالوهذان زوراناای الاهنا وبعده شيخ لناقد كان من عهد ارم ـ وفی المطبوع بزور بينهم مصحف والزجر فی الامالی (٢: ١٨٠) والسمط (٨٠١) والعقد (٣: ٣٤٣) (٥: ٢٠٦) وايام العرب ٢١٤ والحماسة وابن الشجری ٣٧ واللسان والتاج (زور،اصم) وفيه عن ابی عبيدة والرجز ليحیٰ بن منصور راجع ابدال ابی الطيب (٢: ٩٩) وابدال يعقوب ٦٥ وشرح السبع لابن الانباری ٤٩٢ وفی روايته بشيخيهم وزاد الثالث: قد كدم الشيخ قفاه وكدم والاغلب العجلی (٢١ ھ) راجز جاهلی اسلامی احد المعمرين واستشهد فی وقعة نها وند انظر الموتلف ٢٣ والخزانة البغدادية (١: ٣٣٣) والاعلام للزركلی (١: ٣٣٩)١٢.

جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔

(ز و ل)

زَالَ الشَّیءُ یَزُوْلُ زَوَالًا: کسی چیز کا اپنا صحیح رخ چھوڑ کر ایک جانب مائل ہو جانا (اپنی جگہ سے ہٹ جانا) اور اَزَلْتُهٗ وَزَوَّلْتُهٗ کے معنیٰ ہیں: ایک جانب مائل کر دینا کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ تَزُوْلَا﴾ (۳۵۔۴۱) کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

﴿وَلَئِنْ زَالَتَا﴾ (۳۵۔۴۱) اگر وہ ٹل جائیں۔

﴿لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (۱۴۔۴۶) کہ اس سے پہاڑ ہی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔

(ز ی د)

اَلزِّیَادَةُ: اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد بڑھایا جائے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: زِدْتُهٗ: میں نے اسے بڑھایا فَازْدَادَ: چنانچہ بڑھ گیا اور آیت:

﴿وَنَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ﴾ (۱۲۔۶۵) اور (اس کے حصہ کا) ایک بار شتر غلہ اور لیں گے۔

میں نَزْدَادُ فعل متعدی ہے حتیٰ کہ كَیْلَ بَعِیْرٍ کو اس کا مفعول کہا جائے گا، بلکہ یہ اِزْدَدْتُ فَضْلًا کی طرح ہے جس کے معنیٰ فضل میں زیادہ ہونے کے ہیں اور یہ باب سَفِهَ نَفْسَهٗ کے قبیل سے ہے۔

اور زیادہ (زیادتی) کبھی مذموم ہوتی ہے یعنی کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا: مثلاً انگلیوں اور جانور کی ٹانگ میں زیادتی اور اسی طرح جگر میں جو گوشت کا زائد ٹکڑا پایا جاتا ہے وہ چونکہ کھایا نہیں جاتا اس لئے اسے زائد اور بے فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی زیادتی محمود ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ﴾ (۱۰۔۲۶) جو نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر کئی طرق سے مروی ہے۔ (۱۶۹) کہ یہاں زیادہ سے نظر الی وجه الله مراد ہے اور اس سے ان انعامات اور احوال کی طرف اشارہ ہے جن کا اس زندگی میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ [1] اور آیت:

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (۲۔۲۴۷) اور علم وجسم میں اسے زیادہ کشائش بخشی۔

میں زیادہ سے مراد یہ ہے کہ وہ علم وجسم میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (۱۹۔۷۶) اور اللہ ان کو روز بروز زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔ اور مذموم زیادتی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۲) ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

﴿زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ (۱۶۔۸۸) اور ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے۔

﴿فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ﴾ (۱۱۔۶۳) (الٹا) میرا اور نقصان ہی کر رہے ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (۲۔۱۰) سو اللہ نے ان کے مرض میں اور اضافہ کر دیا۔

---

[1] قال ابن کثیر (۲: ٤١٤) فی تفسیره وهذا هو المروی عن السلف والخلف وقد وردت فیه احادیث کثیرة عن السلف.

میں مرض کے بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی سرشت کچھ ایسی ہے کہ جب وہ کوئی برا یا اچھا فعل سرانجام دیتا ہے تو جوں جوں اس فعل کو انجام دیتا رہتا ہے توں توں اس فعل کا ملکہ اس میں قوی ہوتا رہتا ہے اور آیت:

﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ (۵۰۔۳۰) کیا کچھ اور ہے؟

میں طلب زیادہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں دوزخ کے بھر جانے پر تنبیہ ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو دوزخ سے وعدہ کیا ہے کہ:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (۱۱۔۱۱۹) کہ ہم (کیا) جنات اور (کیا) بنی آدم سب سے دوزخ بھر دیں گے۔

وہ پورا ہو کر رہے گا اور زِدْتُـــهٗ فعل متعدی ہے اور زَادَ بمعنی اِزْدَادَ (لازم) بھی آیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَازْدَادُوْا تِسْعاً﴾ (۱۸۔۲۵) اور نو (برس اس کے اوپر) اور ہیں۔

﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ (۳۔۹۰) پھر وہ کفر میں (اور) بڑھ گئے۔

﴿وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَاتَزْدَادُ﴾ (۱۳۔۸) اور نیز (ہر ماہ کے پیٹ کا گھٹنا اور بڑھنا) اور شرٌ، زَائِدٌ وَزَيْدٌ دونوں طرح کہا جاتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۱۰) وَاَنْتُمُوْا مَعْشَرٌ زَيْدٌ عَلٰى مِائَةٍ
فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ كَيْدًا فَكِيْدُوْنِي

اور تم سو سے زیادہ آدمی ہو تو تم میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کرو۔

(ز ی غ)

اَلــزَّيْــغُ: کے معنی حالت استقامت سے ایک جانب مائل ہو جانا کے ہیں اور اَلتَّزَايُغُ کے معنی تَمَايُلٌ یعنی بہت زیادہ مائل ہو جانا ایک دوسرے سے مائل ہونا۔ رَجُــلٌ زَائِــغٌ: مائل ہونے والا۔ اس کی جمع زَاغَةٌ وَزَائِغُوْنَ آتی ہے۔ زَاغَـتِ الشَّمْسُ: سورج مائل بزوال ہوگیا۔ زَاغَ الْبَـصَرُ: نگاہ نے غلطی کی ایک طرف ہٹ گئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذْزَاغَـتِ الْاَبْصَارُ﴾ (۳۳۔۱۰) کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ خوف وہراس کی وجہ سے انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا اور یہ بھی کہ یہ آیت:

﴿يَـرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ (۳۔۱۳) کے ہم معنی ہو یعنی نگاہیں صحیح طور پر کسی چیز کا ادارک نہیں کرسکیں گی۔ نیز فرمایا:

﴿مَـا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ (۵۳۔۱۷) نظر نہ تو حقیقت سے ایک طرف ہٹی اور نہ ہی اس نے حد سے تجاوز کیا۔

﴿مِـنْ بَـعْـدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ﴾ (۹۔۱۱۷) اس کے بعد کہ...... پھر جانے کو تھے۔

---

[1] قالہ ذوالاصبع العدواني واسمه حرثان بن محدث وفي الصحاح (زيد) والامالي (۱:۲۵۳) طراً بدل كيداً وفي المفضليات (۱:۱۶۱) والسيوطي ۱۴۸ شتى بدله ۔ والبيت في اللسان (زيد) والمحكم (عشر) هو من قصيدة مفضلية ۳۶ والبيت ۲۹ والقصيدة بتمامهافي الامالي (۱:۲۵۲۔۲۵۴) والكامل (۴۵۰) وفيه كيدكم بدل امركم وانظر للقصيدة منتهى الطلب (۱:۱۹۶۔۱۹۷) والاغاني (۳:۸۔۱۰) والشعراء (۶۳۶۔۶۳۸) والبيت في الكتاب والحماسة لابن الشجرى ۷۱ والخزانة (۳:۲۲۶) والعين (۳:۲۸۷) والمرتضىٰ ۲۵۲ ولترجمة الشاعر راجع الاشتقاق ۱۶۳ والمعمرين ۹ والشعراء (۲۸۸ ۔ ۲۹۰) والخزانة (۲۰۶۔۲۰۹)۔

اورآیت کریمہ: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ﴾ (۶۱۔۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب وہ ازخود صحیح راہ سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

(ز ی ل)

زَالَهٗ يَزِيْلُهٗ زَيْلًا کے معنیٰ کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کرنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۱۱) "زَالَ زَوَالُهَا"

کہ اللہ تعالیٰ محبوبہ کے خیال کو میرے دل سے زائل کر دے۔

اور زَوَالٌ کے معنیٰ التصرف یعنی پھرنا بھی آتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْكَتَ اللّٰهُ نَامَتَهٗ کی طرح محاورہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو ختم کر دیا۔ اور یہی معنیٰ زِيلَ زَوِيلُهٗ کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۱۲) اِذَمَا رَأَتْنَا زَالَ مِنْهَا زَوِيْلُهَا

جب وہ ہمیں دیکھتی ہے تو بدک کر بھاگ جاتی ہے اور جن کے نزدیک زال متعدی نہیں ہے وہ شعر اول میں زَوَالَهَا کو منسوب علی المصدر مانتے ہیں یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تَزَيَّلُوْا: وہ متفرق ہوگئے قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا﴾ (۴۸۔۲۵) اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

اور آیت: ﴿فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰۔۲۸) پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔

میں اگر زَيَّلْنَا کو متعدی کہا جائے تو باب تفعیل تکثیر کے لئے ہوگا یعنی بالکل الگ الگ کر دینا جیسے: مِزْتُهٗ وَمَيَّزْتُهٗ اور مَازَالَ اور لَا يَزَالُ ہمیشہ حرف نفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ كَانَ فعل ناقص کی طرح اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں اور اصل میں یہ اجوف یائی ہیں کیونکہ عربی زبان میں زَيَّلْتُ (تفعیل) یاء کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور مَازَالَ کے معنیٰ ہیں: مَا بَرِحَ یعنی وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾ (۱۱۔۱۱۸) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمْ﴾ (۹۔۱۱۰) وہ عمارت ہمیشہ (ان کے دلوں میں باعث اضطراب بنی) رہے گی۔

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۵۵) کافر لوگ ہمیشہ......رہیں گے۔

﴿مَازِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ﴾ (۴۰۔۳۴) تم برابر شبہ میں رہے۔ اور محاورہ میں مَازَالَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہنا صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ مَاكَانَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہا جاتا ہے کیونکہ زَالَ میں ثَبَتَ کی ضد ہونے کی وجہ سے نفی کے

---

❶ قطعة بن عجز البيت قاله الاعشىٰ وتكملته : هذا النهار يدالها من همها۔ مابالها بالليل زال زوالها ۔ والبيت من قصيدة يمدح فيها قيس بن معديكرب مطلعها : (حلت ، سمية غدوة اجمالها ۔غضبى عليك) فما تقول بدالها دويوانه (۱۵۰۔۱۵٤) واللسان (زول) مثل للعرب قديم واختلف فى اى زوالها منصوب اللام اومرفوعها ومن رواه برفع اللام (زط لها) قال فيه اقواء راجع اللسان (قوى) وفى ذيل الامالى ۵۷ يقال : زال زوالا وزيل زويله (دعاء) اى ذهب ومات .

❷ قاله ذوالرمة يصف بيضة وصدره وبيضاء لاتحاش منا وامها ...... وفى رواية اللسان (منازول ، حوش ، زيل) منها بدل زال منها ومعناه ذعرت مناونفرت والبيت فى ديوانه ۵۵٤ والاضداد لابن الانبارى ۲۷۷ والفائق (۱ : ۱۵٦) والاضداد لابى الطيب (۱ : ۳۲٤) والحيوان (۵ : ۵۷٤) والمعانى للقتبى ۲۵۵ والفائق (۱ : ۸۲ ، ۱۵۷) وفى كل المراجع زيل منها بدل زال منها ولكلا الروايتين محمل وان كان الاول اكثر ولم يروالثانى سوى المولف .

معنی پائے جاتے ہیں اور "مَا" و "لَا" بھی حروف نفی سے ہیں اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے لہٰذا مَازَالَ مثبت ہونے میں کَانَ کی طرح ہے تو جس طرح کَانَ زَیدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کی ترکیب صحیح نہیں ہے اسی طرح مَازَالَ زَیْدٌ اِلَّا مُنطَلِقًا بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(ز ی ن)

اَلزِّیْنَۃُ: زینت حقیقی وہ ہوتی ہے جو انسان کے لئے کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو یعنی نہ دنیا میں اور نہ ہی عقبٰی میں اور وہ چیز جو ایک حیثیت سے موجب زینت نہ ہو وہ زینت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف ایک پہلو کے اعتبار سے زینت کہہ سکتے ہیں اور اجمالاً زینت کی تین اقسام ہیں۔

(۱) زینت نفسی جیسے علم اور اعتقادات حسنہ جو نفس انسانی کے لئے باعث آرائش بنتے ہیں۔

(۲) زینت بدنی جیسے قوت اور طول قامت وغیرہ چیزیں جو جسم کے لئے خوبصورتی کا سبب بنتی ہیں۔

(۳) زینت خارجیہ جیسے مال وجاہ وغیرہ جو انسان کے لئے باعث زینت بنتے ہیں۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (۴۹۔۷) خدا نے تمہیں ایمان کی محبت دے دی اور اس کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

میں زینت سے نفسانی زینت مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ﴾ (۷۔۳۲) (ان سے پوچھو کہ) اللہ نے جو زینت (کے ساز و سامان پیدا کئے ہیں) ان کو کس نے حرام کیا ہے۔

کو بعض نے زینت خارجی پر محمول کیا ہے جیسا کہ مروی ہے [1] کہ کچھ لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے تو اس آیت کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں زِیْنَۃَ اللّٰہِ سے وہ کرم مراد ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (۴۹۔۱۳) اور تم میں بڑا شریف تو وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔ میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(۱۲۳) وَزِیْنَۃُ الْمَرْءِ حُسْنُ الْاَدَبِ

کہ حسن ادب ہی انسان کے لئے باعث زینت بن سکتا ہے۔ اور آیت:

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ﴾ (۲۸۔۷۹) الغرض (ایک دن قارون) اپنے تزک سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ میں مال وجاہ اور ساز و سامان وغیرہ دینوی زینت مراد ہے۔ زَانَہٗ کَذَا وَزَیَّنَہٗ کے معنیٰ کسی چیز کے حسن کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ بالفعل آراستہ کرکے یا بذریعہ قول کے (جیسے کسی چیز کو لوگوں کی نظر میں بھلا کر کے دکھانا) اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر تزیین کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے مگر بعض آیات میں اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بعض آیات مواقع میں بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے چنانچہ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایمان کے متعلق فرمایا:

---

[1] راجع ابن کثیر۔

[2] لم اجده۔

﴿وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (۴۹۔۷) اور اس ایمان کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

اور کفار کے متعلق فرمایا:

﴿زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۲۷۔۴) ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لئے عمدہ کر دکھایا۔

﴿زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ (۶۔۱۰۹) اور ہم نے ہر امت کے لئے ان کا عمل اچھا کر دکھایا۔

اور شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۸۔۴۸) اور شیطان نے ان لوگوں کے اعمال بد ان کو اچھے کر دکھائے۔

﴿لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (۱۵۔۳۹) میں دنیا میں ساز و سامان زندگی کو انہیں عمدہ کر دکھاؤں گا۔

اور بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں فرمایا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ (۳۔۱۴) (طبعی طور پر) لوگوں کو (دنیا کی) مرغوب چیزوں کے ساتھ وابستگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ﴾ (۹۔۳۷) ان کی بد کرداریاں ان کو بھلی کر کے دکھائی گئیں۔

﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (۲۔۲۱۲) جو لوگ دینِ حق کے منکر ہیں دنیا کی زندگی انہیں عمدہ کر دکھائی گئی۔

اور آیت:

﴿زُيِّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ﴾ (۶۔۱۳۷) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔ میں زُيِّنَ اصل میں زَيَّنَهُ شُرَكَآئُهُمْ ہے اور آیات:

﴿زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ (۶۷۔۵) ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ﴾ (۳۷۔۶) اور ہم ہی نے آسمان دنیا (ایک) زینت یعنی ستاروں سے آراستہ کیا۔

﴿وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ﴾ (۱۵۔۱۶) اور ہم نے دیکھنے والوں کے لئے اسے خوبصورت بنایا۔

میں اس زینت کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق حاسۂ بصر سے ہے اور جسے عوام و خواص محسوس کرتے ہیں نیز اس میں زینت معنوی یعنی ستاروں کی رفتار ان کے احکام کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جس کی معرفت خواص کو حاصل ہوسکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت بخشنا تکوین وابداع سے ہوتا ہے یعنی ان کو آراستہ حالت میں پیدا کرنا اور لوگوں کا کسی چیز کو زینت بخشنا یا تو ملمع سازی سے ہوتا ہے اور یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کی تعریف کرنا اور اسے خوشنما صورت میں پیش کرنا۔

❀❀❀

کِتَابُ السِّین

(س ء ل)

اَلسُّؤْل: دراصل اس حاجت کو کہتے ہیں جس پر نفس حریص ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یَا مُوْسٰی﴾ (۲۰۔۳۶) موسیٰ تمہاری دعا قبول کرلی گئی۔اور یہ سُؤْل وہی ہے جس کا تذکرہ آیت:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ (الایۃ) میں ہے السُّؤْل اور الْاُمْنِیَّۃ کے قریب قریب ایک ہی معنیٰ ہیں لیکن امنیۃ کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تا حال انسان کے دل میں ہو اور اس کا اظہار نہ کیا ہو۔لیکن سُؤْل اس حالت کو کہتے ہیں جو طلب بھی کی جا چکی ہو تو گویا سُؤْل کا درجہ امنیہ کے بعد کا ہے۔

(س ب ب)

اَلسَّبَبُ: اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا (اور اس سے اترا) جاتا ہے اس کی جمع اسباب ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ﴾ (۳۸۔۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھیں۔

اور یہ معنوی لحاظ سے آیت:

﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ﴾ (۵۲۔۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر (آسمان سے باتیں) سن کر آتے ہیں۔کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سَبَبٌ کہا جاتا ہے جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَاٰتَیْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا﴾ (۱۸۔۸۴) اور اسے ہر قسم کے ذرائع بخشے سو وہ ایک راہ پر چلا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر چیز کی معرفت اور سامان و ذرائع عطا کئے تھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک ذریعہ اختیار کیا اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلِّیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۴۰۔۳۶،۳۷) تاکہ جو آسمان تک پہنچنے کے ذرائع ہیں ہم ان تک جا پہنچیں۔

میں بھی اسباب سے مراد ذرائع ہی ہیں۔یعنی تاکہ ہم ان اسباب و ذرائع کا پتہ لگائیں جو آسمان میں پائے جاتے ہیں اور ان سے موسیٰ (علیہ السلام) کے مزعومہ خدا کے متعلق معلومات حاصل کریں اور عمامہ،دوپٹہ اور ہر لمبے کپڑے کو طول میں رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی سَبَبٌ کہا جاتا ہے۔اسی جہت سے شاہراہ کو بھی سَبَبٌ کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاہراہ کو بھی خَیْطٌ (دھاگہ) اور کبھی محدود کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلسَّبُّ: (مصدر ن) کے معنیٰ مغلظات اور فحش گالی دینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۹) تو جو لوگ خدا کے سوا (دوسرے) معبودوں کو حاجت روائی کے لئے بلایا (یعنی ان کی پرستش کیا کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی ازراہ نادانی ناحق، خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

ان کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی مشرک بھی نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر شان الٰہی میں گستاخی کریں گے۔ اور ایسے الفاظ استعمال کریں گے جو اس کی ذات کے شایان شان نہیں، جیسا کہ عام طور پر مجادلہ کے وقت ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔[1]

فَمَا كَانَ ذَنْبُ بَنِيْ مَالِكٍ
بِاَنْ سُبَّ مِنْهُمْ غُلَامٌ فَسَبَّ
بِاَبْيَضَ ذِيْ شَطْبٍ قَاطِعٍ
يَقُدُّ الْعِظَامَ وَيَبْرِي الْقَصَبَ

بنی مالک کا صرف اتنا گناہ ہے کہ ان میں سے ایک لڑکے کو بخل پر عار دلائی گئی اور اس نے عار کے جواب میں سفید دھاری دار قاطع تلوار سے اپنی موٹی اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا جو ہڈیوں کو کاٹ ڈالتی ہو اور قصب یعنی بانس کو تراش دیتی ہو۔ ان اشعار میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کو دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔[2]

نَشْتِمُ بِالْاَفْعَالِ لَا بِالتَّكَلُّمِ

کہ ہم زبان کی بجائے افعال سے گالی دیتے ہیں۔ اور سِبٌّ (فِعلٌ) بمعنیٰ دشنام دہندہ کے لئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔[3]

لَا تَسُبَّنِيْ فَلَسْتَ بِسِبِّيْ
اِنَّ سِبِّيْ مِنَ الرِّجَالِ الْكَرِيْمِ

مجھے گالی نہ دو تم مجھے گالی دینے کے لائق نہیں ہو کیونکہ نہایت شریف درجہ کا آدمی ہی مجھے گالی دے سکتا ہے۔

اَلسُّبَّةُ: ہر وہ چیز جو عار و ننگ کی موجب ہو اور کنایہ کے طور پر دبر کو بھی سُبَّةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے سوْءَةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اَلسَّابَّةُ انگشت شہادت یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کیونکہ گالی دیتے وقت اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے جیسا کہ اس انگلی کو مُسَبِّحَةٌ (انگشت شہادت) کہا جاتا ہے کیونکہ تسبیح کے وقت اشارہ کے لئے اسے اوپر اٹھایا جاتا ہے۔

---

[1] قاله زوالحزق الطهورى واسمه قرط يتعصب لغالب بن صعصعة ابى الفرزدق و كان بينه وبين سحيم بن دشيل الرحاحى معاقرة يوم صوءر (موضع قريب من الكوفة) واختلف الروايات فى القصيدة راجع الخبر والاختلاف فى ذيل الامالى ۵۲۔۵۴ والسمط ۷۴۶۔۷۴۷ والابيات مقيلة القافيه فى اللسان (سب) والنقائض ۱۰۷۰ والامالى (۲: ۱۱۷) والموتلف اللآمدى ۱۷۲ وايام العرب ۴۰۱۔۴۰۶ وفى روايةبنى عامر بدل بنى مالك وهو وهم نبه عليه ابن دريد والازهرى وردالبكرى فى التبنيه راجع ايضاً المعانى للقتبى ۱۰۸۷ والمحكم (عقر) والثانى من الابيات : عراقيت كوم طوال الذرىٰ ـ تخربوا ئكها للركب ۱۲.

[2] قاله معبدبن علقمة يخاطب زهيراً واوله : تحهل ايدينا ويحلم رأينا ـ والبيت من كلمة فى الحماسة رواه التبريزى (۲: ۹۱) وفى السمط (۱: ۳۴۳) فى ثلاثة والتنبيه للبكرى ۴۵ وفى العيون (۱: ۲۸۶) والشطر منسوب لاياس بن قتادة وعجزه فيه : تعاقب ايدينا ويحلم رأينا والبيت فى المضنون ۸۳ والصناعتين ۴۹ .

[3] البيت فى اصلاح يعقوب ۱۴ (دار المعارف ۱۳۷۵ھ) ولم ينسبه التبريزى فى تهذيبه ۲۱ وهو لعبدالرحمان بن حسان يهجو مسكينا الدارى قال والسب الذى يسابك ۱۲.

(س ب ت)

اَلسَّبْتُ کے اصل معنیٰ قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ سَبَتَ السَیرَ اس نے تسمہ کو قطع کیا سَبَتَ شعرَہٗ: اس نے اپنے بال مونڈے سَبَتَ اَنْفَہٗ اس کی ناک کاٹ ڈالی۔

بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو بھی یومَ السَّبْتِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنیچر کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سَبَتَ فُلَانٌ ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں: وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔

اور آیت کریمہ:

﴿یَومَ سَبْتِھِمْ شُرَّعًا﴾ (۸۔۱۶۳) سنیچر کے دن (مچھلیاں) سینہ سپر ہو کر ان کے سامنے آجاتیں۔

میں بعض نے یَومَ سَبْتِھِمْ سے ان کے کاروبار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یَومَ لَا یَسْبِتُونَ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار نہ چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ جس روز سنیچر نہ ہوتا ان ہر دو معنیٰ کا مآل ایک ہی ہے اور آیت:

﴿اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ﴾ (۱۶۔۱۲۴) میں سبت سے مراد سنیچر کے دن ترک عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنیچر کے روز کام کاج چھوڑنے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا......اور آیت:

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا﴾ (۷۸۔۹) اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔ میں سبات کے معنیٰ ہیں، حرکت وعمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

﴿لِتَسْکُنُوا فِیہِ﴾ (۲۸۔۱۷۳) تاکہ تم رات میں راحت کرو میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت وسکون کے لیے بنایا ہے۔

(س ب ح)

اَلسَّبْحُ: اس کے اصل معنیٰ پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں۔ سَبَحَ (ف) سَبْحًا وَسَبَاحَۃً: وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارہ کے طور پر یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُونَ﴾ (۲۱۔۳۳) سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دوائر میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا﴾ (۷۹۔۳) اور فرشتوں کی (قسم جو آسمانوں اور زمین کے درمیان) تیرتے پھرتے ہیں۔ اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ کر گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیلًا﴾ (۷۳۔۷) دن کے وقت تو تم بہت مشغول کار رہتے ہو۔

اَلتَّسْبِیْحُ کے معنیٰ تنزیہ الٰہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنیٰ عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں...... پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا ہے جیسا کہ اِبْعَاد کا لفظ شر پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے: اَبْعَدَہُ اللّٰہُ خدا اسے ہلاک کردے۔ پس تسبیح کا لفظ قولی، فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَولَآ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ﴾ (۳۷۔۱۴۳) تو

اگر یونس علیہ السلام اس وقت (خدا کی تسبیح وتقدیس) کرنے والوں میں نہ ہوتے۔

یہاں بعض نے مُسَبِّحِیْنَ کے معنیٰ مُصَلِّیْنَ کئے ہیں لیکن انسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ (۲۔۳۰) اور صبح وشام اسی کی تسبیح وتقدیس کرتے رہنا۔

﴿فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) (اور رات میں بھی) اس کی تسبیح وتقدیس کرو اور نمازوں کے بعد بھی۔

﴿لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۸) یعنی اس کی عبادت اور شکرگزاری کیوں نہیں کرتے ہو۔

بعض نے اسے استثنا کے معنیٰ پر محمول کیا ہے یعنی تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے اور اس کی دلیل آیت کریمہ: ﴿اِذْ اَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) ہے یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے اور استثناء نہ کیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (۱۷۔۴۴) ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو (فرشتے اور آدمی) آسمان وزمین میں ہیں (سب) اس کی تسبیح (وتقدیس) کرتے ہیں اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد وثناء کے ساتھ اس کی تسبیح وتقدیس کررہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

میں تسبیح کے وہی معنیٰ مراد ہیں جو کہ آیت کریمہ:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾ (۱۳۔۱۶) اور جس قدر مخلوق آسمانوں وزمین میں ہے (سب) چاروناچار اللہ ہی کے آگے سربسجود ہے۔

اور آیت:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۱۶۔۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں۔

میں سجدہ کے ہیں یعنی تسبیح کے حقیقی معنیٰ مراد ہیں جیسا کہ سجدہ کے ہیں مگر ان کا ادراک ہماری سمجھ سے بالاتر ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ کے استدراک اور آسمان وزمین کے ذکر کے بعد وَمَنْ فِيْهِنَّ کے عطف سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے اس کی تقدیر یہ بیان کی ہے۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَيَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي الْاَرْضِ مگر یہ صحیح نہیں ہے اولاً تو اس لئے کہ "مَنْ" یعنی ذوالعقول کی تسبیح کو ہم سمجھتے ہیں اور قرآن پاک نے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کہا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ بعد میں وَمَنْ فِيْهِنَّ عطف کے ساتھ مذکور ہے پھر اگر شروع آیت میں بھی مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کی تقدیر کو مان لیا جائے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے) تو اس عطف کا بے معنی ہونا لازم آتا ہے (لہٰذا صحیح یہ ہے کہ سب اشیاء (بشمول آسمان وزمین) کی تسبیح اور سجود کو حقیقی معنیٰ پر محمول کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں اور اس کے سامنے سربسجود رہتی ہیں لیکن بعض تسخیری طور پر اور بعض اپنے اختیار اور ارادہ سے اور یہ بات تو بلا

اختلاف بھی مانتے ہیں کہ آسمان وزمین اور دواب، جانوروں کی تسبیح تسخیری ہے یعنی ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ پر دال ہیں۔البتہ اختلاف اس میں ہے کہ آیا آسمان وزمین تسبیح بالاختیار کرتے ہیں؟ تو آیت اسی معنیٰ کی مقتضی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

سُبْحَانٌ یہ اصل میں غُفْرَانٌ کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۷) سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا﴾ تو پاک ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔شاعر نے کہا ہے۔❶ (سریع)

(۲۱۸) سُبْحَانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الْفَاخِرِ

سبحان اللہ! علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ عَلْقَمَةَ ہے اس میں مِنْ معنیٰ اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمہ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تہکم ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ مِنْ اَجْلِ عَلْقَمَةَ ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔

اَلسُّبُّوحُ الْقُدُّوْسُ: یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فُعُّولٌ کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کَلُّوبٌ وَسَمُّودٌ۔

اَلسُّبْحَةُ: بمعنیٰ تسبیح ہے اور اُن منکوں کو بھی سُبْحَةٌ کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

(س ب خ)

اَلسَّبْخُ: کے معنیٰ وسعت کے ہیں اور آیت:

﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْخًا طَوِيْلًا﴾ (۷۳۔۷) کہ تیرے لئے دن میں بڑا مشغلہ ہے۔میں ایک قرأت سَبْخاً بھی ہے۔

سَبَخَ اللّٰهُ عَنْهُ الْحُمّٰى: اللہ تعالیٰ نے اس کا بخار ہلکا کر دیا۔

اَلسَّبِيْخُ: پرند کے پر اور دھنکی ہوئی روئی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن میں اکتناز اور ثقل نہیں ہوتا۔

(س ب ط)

اَلسَّبْطُ: اس کا اصل معنیٰ سہولت کے ساتھ کسی چیز کا منبسط ہونا ہیں اور سَبَطَ (س) سُبُوطًا وَسَبَاطَةً وَسَبَاطًا کے معنیٰ بالوں کے سیدھا اور دراز ہونے کے ہیں اور سیدھے بالوں کو جن میں گھنگٹ نہ ہوں سَبِطٌ یا سَبْطٌ کہا جاتا ہے۔اسی طرح خوش قامت عورت کو بھی سَبِطَةٌ کہا جاتا ہے اور دراز کفِ دست آدمی کو سَبْطُ الْكَفَّيْنِ کہتے ہیں اور یہ سخاوت سے کنایہ ہوتا ہے۔اَلسِّبْطُ اس کے معنیٰ اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے کے ہیں گویا اس میں فروع کے امتداد کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

---

❶ قاله الاعشیٰ فی هجوعلقمة وصدره : اقول لماجاء فی فخره ـانظر الخبر وترجمة الشاعر فی الاغانی (۱۵ و ۵۵) والخزانة (۲ : ۴۲۔ ۴۴) والبيت فی ديوانه ۱۰۶ والجمهرة (۱ : ۲۲۹) والشنتمری (۱ : ۱۶۳) ومجازالقران رقم ۳۶ واللسان والتاج والاساس والمحكم (سبح) والسمط (۱ : ۵۵۵) والقرطبی (۱ : ۲۷۶) والطبری (۱ : ۲۱۱) والصحاح (سبح) وغريب القران للقتبی ۸ وعلقمة هو علقمة ابن علاثة صحابی قدم علی رسول الله صلی الله عليه وسلم وهوشيخ فاسلم وبايع وروی حديثاً واحداً واستعمله عمربن الخطاب علی حوران فمات بها والبيت فی مجالس ثعلب (۱ : ۲۱۶) وامالی الشجری (۲ : ۲۵۰) وابن خالويه (۵۴.)

﴿وَيَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ (۲۔۱۴۰) اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد۔
یہاں اسباط سے مراد قبائل ہیں۔ ہر قبیلہ ایک شخص کی اولاد سے تھا۔ جیسے فرمایا:
﴿اَسْبَاطًا اُمَمًا﴾ (۷۔۱۶۰) (الگ الگ) بارہ قبیلے بنا دیئے۔ اَلسَّابَاطُ: وہ مسقّف راستہ جو دو مکانوں کے درمیان ہو۔ اور اَخَذَتْ فُلَانًا سَبَاط کے معنیٰ ہیں فلاں کو بخار چڑھ گیا مثل مشہور ہے۔ ❶ (مثل)
اَلسُّبَاطَةُ خَيْرٌ مِنْ قُمَامَةٍ کہ خاک روبہ کوڑے سے بہتر ہے۔
سَبَطَتِ النَّاقَةُ وَلَدَهَا: اونٹنی نے ناتمام بچہ گرادیا۔

(س ب ع)

اَلسَّبْعُ اصل میں "سَبْعٌ" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (۲۔۲۹) سات آسمان، ﴿سَبْعًا شِدَادًا﴾ (۷۸۔۱۲) سات مضبوط (آسمان بنائے)۔ ﴿سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ﴾ (۱۲۔۴۶) سات بالیں۔ ﴿سَبْعَ لَيَالٍ﴾ (۶۹۔۴۶) سات راتیں۔ ﴿سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) (وہ) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔
﴿سَبْعُونَ ذِرَاعًا﴾ (۶۹۔۳۲) ستر گز۔ ﴿سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ (۹۔۸۰) ستر مرتبہ۔ اور آیت:
﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ (۱۵۔۸۷) (الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں) جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّبْعُ الطِّوَالُ یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں اور منجملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں۔
اَلسَّبِيْعُ وَالسِّبْعُ: اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرنا۔ اَلْاُسْبُوْعُ: ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اَسَابِيْعُ طُفْتُ بِالْبَيْتِ اُسْبُوْعًا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے۔ سَبَعْتُ الْقَوْمَ: میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اَخَذْتُ سُبْعَ اَمْوَالِهِمْ: میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔
اَلسَّبُعُ: درندہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد "عدد تام" ہوتا ہے هُذَلِیْ نے کہا ہے۔ ❷

(۲۱۹) ......كانه عَبْدٌ لِاٰلِ اَبِیْ رَبِيعَة مُسْبَعٌ

گویا وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔
بعض نے کہا ہے کہ مُسْبَعٌ کا معنیٰ مُهْمَلٌ مَعَ السِّبَاعِ کے ہیں۔ یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مُسْبَعٌ (بفتح باء) پڑھا ہے۔ اور یہ دَعِیٌّ سے

---

❶ المثل في حل المعاجم ١٢.
❷ قاله ابو ذؤيب الهذلي يصف حمارا لوحشي واوله: صحب الشوائب لايزال ...... والبيت من كلمة مفضلية في ٦٥ بيتاً وفي الجمهرة (٢: ٢٤٢) اوردمنها المولف (٣٦٦، ٣٧٥، ٣٤٧) راجع نظام الغريب للربعي ١٣٣ واصلاح يعقوب ٢٤٧ والمحكم (سبع۔ ربع) واللسان (شرب) سبع والاغاني (١: ٢٩) والمزهر (١: ٣٥) والصاحبي ٦٩ قال يعقوب في اصلاحه اسبعت عبدى اذااهملته فهو سبع وفي الصاحبي لفظة مسبع مافسر حتىٰ الان تفسيراً شافيا.

کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔
سَبَعَ فُلَانًا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ اَلْمُسْبِعُ: درندوں کی سرزمین۔

(س ب غ)

دِرعٌ سَابِغٌ پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿اَن اعْمَلْ سَابِغَاتٍ﴾ (۳۴۔۱۱) کہ کشادہ (اور پوری) پوری زرہیں بناؤ۔
اسی سے استعارہ کے طور پر اِسْبَاغُ الْوُضُوءِ (پورا وضو کرنا) اور اِسْبَاغُ النِّعَمِ: پورا پورا انعام کرنا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ﴾ (۳۱۔۲۰) اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔

(س ب ق)

اَلسَّبْقُ: اس کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا﴾ (۷۹۔۴) پھر وہ (حکم الٰہی) کو سننے کے لئے لپکے ہیں۔
اَلِاسْتِبَاقُ کے معنی تسابق یعنی ایک دوسرے سے سبقت کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ (۱۲۔۱۷) ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرنے لگ گئے۔
﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔
مجازاً ہر شے میں آگے بڑھ جانے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿مَا سَبَقُوْنَا اِلَيْهِ﴾ (۴۶۔۱۱) تو یہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ کر جاتے۔
﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۲۰۔۱۲۹) اگر تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ فرمائی ہوتی۔
پھر استعارہ کے طور پر احراز فضیلت کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ فرمایا:
﴿اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۰) اور آگے نکل جانے والے ہی اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔
تو سَابِقُوْنَ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمال صالحہ کے ذریعہ ثواب الٰہی اور جنت کی طرف پیش پیش جانے والے ہیں۔جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:
﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۱) یہی لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لئے لپکتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ (۵۶۔۶۰) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ہماری گرفت اور رقبضہ سے باہر نہیں نکل سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:
﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا﴾ (۸۔۱۵۹) کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے قابو سے نکل گئے ہیں۔
﴿وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ﴾ (۲۹۔۳۹) اور نہ وہ (ہم سے کہیں) بھاگ کر جا سکے۔

(س ب ل)

اَلسَّبِيْلُ: اصل میں اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت سے چلا جا سکے، اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا﴾ (۱۶۔۱۵) دریا اور راستے۔
﴿وَجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا﴾ (۷۱۔۳۰) اور تمہارے لئے اس میں راستے بنا دیئے۔

اور آیت:
﴿وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ﴾ (۴۳۔۳۷) اور وہ صحیح راہ سے روکتے ہیں۔

میں "السَّبِيْل" سے مراد طریق حق ہے کیونکہ اسم جنس جب مطلق استعمال ہو تو حق (یعنی فرد کامل) ہی مراد ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ (۸۰۔۲۰) پھر (اس پر) راہ آسان کر دی۔

اور راہ گیر کو سَابِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَابِلَةٌ ہے اور جس راہ پر بہت زیادہ آمدورفت ہو اسے سَبِيْلٌ سَابِلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ ہے۔ [1]

اِبْنُ السَّبِيْلِ اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنی منزل مقصود سے دور ہو اور سبیل کی طرف اس کی نسبت بوجہ ممارست کے ہے۔ پھر سبیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو عام اس سے کہ وہ چیز خیر ہو یا شر چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ (۱۶۔۱۲۵) اللہ کے راستہ کی طرف دعوت دو۔

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ﴾ (۱۲۔۱۰۸) (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سبیل سے مراد راہ حق ہی ہے لیکن پہلی آیت میں مبلغ (پہنچانے والے) کی طرف نسبت ہے اور دوسری آیت میں ان کو لے کر چلنے والے یعنی پیغمبر کی طرف۔

﴿قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۴۷۔۴) جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو گئے۔

﴿اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ (۴۰۔۲۹) اور وہی راہ دکھاتا ہوں جو سیدھی ہے۔

﴿وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (۶۔۵۵) تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔

﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ﴾ (۱۶۔۱۶۹) (مزے سے) اپنے پروردگار (کے تعلیم کئے ہوئے آسان) راستوں پر چل۔

اور سبیل کے معنی شاہراہ بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ﴾ (۱۲۔۱۰۸) (اے پیغمبر) کہہ دو یہی میرا راستہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (۵۔۱۶) سلامتی کے راستوں (کی طرف) میں سبل السلام سے جنت کے راستے مراد ہیں۔

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ﴾ (۹۔۱۹) محسنین پر کوئی الزام نہیں۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ﴾ (۴۱۔۴۱،۴۲) تو یہ لوگ (معذور ہیں) ان پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان پر ہی ہے۔

﴿اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ (۱۷۔۴۲) مالک عرش (یعنی خدا تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔)

عام محاورہ ہے:

---

[1] ولمثل هذا الكلام يقال له مجاز في الاسناد ۱۲۔

اَسْبَلَ السِّتْرَ وَ الذَّیْلَ: اس نے پردہ دامن لٹکا دیا۔
فَرَسٌ مُسْبِلُ الذَّنَبِ: دراز دم گھوڑا۔ سَبَلَ الْمَطَرُ وَاَسْبَلَ: بارش برسنا اور وہ بارش جو آسمان سے بہہ کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو اسے سَبَلٌ کہا جاتا ہے اور سَبَلَۃٌ خاص کر مونچھوں کے بالوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ (بھی بڑھ کر) نیچے کو لٹکے پڑتے ہیں۔

اَلسُّنْبُلَۃُ: بال۔ اس کی جمع سَنَابِل آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ﴾ (۱۲۔۴۶) سات سبز بالیں۔

اَسْبَلَ الزَّرْعُ: کھیتی میں بالیں پڑ گئیں (ماخذ کے ساتھ متصف ہونا کے معنیٰ پائے جاتے ہیں) جیسے اَحْصَدَ الزَّرْعُ واجنی النخل کا محاورہ ہے۔

اَلْمُسْبِلُ: جوئے کے تیروں سے پانچواں تیر۔

(س ب ء)

سَبَأٌ: ایک شہر کا نام ہے جو پرانے زمانے میں (سیل العرم سے) تباہ ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِيْنٍ﴾ (۲۷۔۲۲) اور میں سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ اور اسی سے ایک ضرب المثل ہے۔

ذَهَبُوْا اَيَادِيْ سَبَا: یعنی وہ تتر بتر ہو گئے اور اہل سبا کی طرح ان کا نام ونشان مٹ گیا۔

سَبَأْتُ الْخَمْرَ: میں نے پینے کے لئے شراب خریدی۔

اَلسَّابِيَاءُ: مشیمہ یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے۔

(س ت ت)

سِتَّةٌ: چھ کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ (۷:۵۴) چھ روز میں۔ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (۵۸:۴) ساٹھ مساکین کو۔
اور سِتٌّ اصل میں سِدْسٌ ہے جسے اس کی بحث میں ذکر کیا جائے گا۔ (انشاء الله)

(س ت ر)

اَلسِّتْرُ: (مصدر ن) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کو چھپا دینے کے ہیں سِتْرٌ وَسُتْرَۃٌ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِنْ دُوْنِهَا سِتْرًا﴾ (۱۸۔۹۰) جن کے لئے ہم نے اس (سورج) سے بچنے کے لئے کوئی اوٹ نہیں بنائی۔
﴿حِجَابًا مَسْتُوْرًا﴾ (۱۷۔۴۵) ایک گاڑھا پردہ (حائل کر دیتے ہیں)

اَلْاِسْتِتَارُ: اس کے معنیٰ چھپ جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ﴾ (۴۱۔۲۲) اور اس لئے نہ چھپتے تھے۔

(س ج د)

اَلسُّجُوْدُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ فروتنی اور عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سُجُوْدٌ کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ) سجود کی دو قسمیں ہیں سجود اختیاری جو انسان کے ساتھ خاص ہے۔ اور اسی سے ثواب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْهُ﴾ (۵۳۔۶۲) سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

اور سجود تسخیری جو انسان، حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی الْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۱۳۔۱۵) (فرشتے) جو آسمانوں میں ہیں اور جو (انسان) زمین میں ہیں چاروناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح وشام ان کے سایے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور نیز فرمایا:

﴿یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ﴾ (۱۶۔۴۸) اس کے سائے (کبھی) دائیں طرف کو اور (کبھی) بائیں طرف کو جھکے (ہوتے ہیں گویا) اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔

تو اس سے مراد سجود تسخیری ہے یعنی وہ زبان حال سے گویا ہیں کہ ان کو کسی صانع حکیم نے بنایا ہے۔اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔اور آیت:

﴿وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۱۶۔۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں اور فرشتے (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور (ذرا بھی) تکبر نہیں کرتے۔

دونوں قسم کے سجود یعنی تسخیری اور اختیاری پر مشتمل ہے اور آیت:

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۴) اور نجم وشجر اس کے سامنے سربسجود ہیں۔میں سجود تسخیری مراد ہے۔اور آیت:

﴿اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (۲۔۳۴) آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اس کو قبلہ بنانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے انکساری اور ان کی اولاد کے مصالح کا بندوبست کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔سو بجز ابلیس کے تمام فرشتے یہ حکم بجالائے تھے۔اور آیت:

﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ (۲۔۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ انکسار وانقیاد کے ساتھ وہاں جانا اصطلاح شریعت میں سجود کو نماز کا خاص رکن قرار دیا گیا ہے۔اور اس کا اطلاق سجود قرآن اور سجود شکر پر بھی ہوتا ہے جو سجدہ نماز کے حکم میں ہے اور کبھی اس سے مراد نفس نماز ہوتی ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) اور نماز کے پیچھے بھی۔یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اور چاشت کی نماز کو سُبْحَةُ الضُّحیٰ اور سُجُوْدُ الضُّحیٰ کہتے ہیں۔اور آیت:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ (۵۲۔۴۸) اپنے پروردگار کی حمد وثناء کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو۔میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں تسبیح سے نماز مراد ہے۔اَلْمَسْجِدُ (ظرف) کے معنیٰ جائے نماز کے ہیں اور آیت: ﴿وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ﴾ (۷۲۔۱۸) اور مسجدیں تو خدا ہی (کی عبادت کے لئے ہیں) میں بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے روئے زمین مراد ہے۔کیونکہ آنحضرت علیہ السلام کے لئے تمام زمین کو مَسْجِدًا اور طَهُوْرًا بنایا گیا ہے۔جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے۔[1]

[1] ولفظه: جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً اخرجه الجماعة.

(۱۷۰) اور بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے اعضاء سجود یعنی پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں زانوں اور دونوں پاؤں مراد ہیں۔ [1] اور آیت:

﴿اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ﴾ (۲۷۔۲۵) (اور نہیں سمجھتے) کہ اللہ کو...... سجدہ کیوں نہ کریں۔

میں لا زائدہ ہے اور معنٰی یہ ہیں کہ میری قوم اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اور آیت:

﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

میں اظہار عاجزی مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد سجدۂ خدمت ہے جو اس وقت جائز تھا اور شعر [2] (الکامل)

(۲۲۰) وَافٰی بِهَا کَدَرَاهِمِ الْاَسْجَادِ

میں شاعر نے وہ دَرَاهِــم مراد لئے ہیں جن پر بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی اور لوگ ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔

(س ج ر)

اَلسَّـــجْـــرُ: اس کے اصل معنٰی زور سے آگ بھڑکانے کے ہیں۔ اور سَـجَـرْتُ التَّنُّوْرَ کے معنٰی ہیں میں نے تنور جلا دیا اسے ایندھن سے بھر دیا اسی سے فرمایا:

﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ﴾ (۵۲۔۶) اور (نیز) جوش مارنے والے سمندر کی۔

شاعر نے کہا ہے۔ [3] (المتقارب)

(۱۲۲) اذا شَـاءَ طَـالِعَ مَسْجُوْرَةً

تَـرٰی حَـوْلَهَـا الـنَّبْعَ وَالسَّمْسَمَـا

جب وہ چاہتا ہے تو پانی سے پُر گڑھا اسے نظر آ جاتا ہے جس کے گرد اگرد نبع اور سمسم کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔

اور آیت: ﴿وَاِذَا الْبِـحَارُ سُجِّرَتْ﴾ (۸۱۔۶) اور جس وقت دریا پاٹ دیے جائیں۔

کے معنٰی حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ کئے ہیں کہ جب دریا آگ سے بھڑکا دیئے جائیں اور بعض نے یہ معنٰی کیا ہے کہ جب ان کے پانی خشک کر دیئے جائیں اور یہ ان میں آگ بھڑکانے کی غرض سے ہوگا۔ ﴿ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ﴾ (۴۰۔۷۲) پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

سَـجَـرَتِ النَّـاقَةُ: اونٹنی دوڑ میں بھڑک اٹھی یعنی سخت

---

[1] ابن عطاء کمافی البحر (۸: ۳۵۲) واللسان (۱: ۲۰۴و ۴: ۱۸۸) والکشاف (۴: ۱۴۸) وقد اشار الیه ابن قتیبه فی غریبه ۱۲.

[2] قاله اسود بن یعفرالنهشلی وصدره: من خمرذی نطف اغن منطق .... والبیت فی اللسان (سجد) والمفضلیات (۲: ۱۸) وفیه لدراهم بدل کدراهم والاسجاد بکسر الهمزة السجود قال الاصمعی: وراهم الایجاد، وراهم الاکاسرة ای النصاری وهی دراهم الحزیة التی اذلتهم ۱۲.

[3] البیت لنمربن تولب العکل والشاعر یصف دغلاًوفی روایة السماسمابدل السمسما وهو شجریشبه الآبنوس اونفسه والبیت من شواهد الطبری (۲۷. ۱۹) والطبرسی (۲۹: ۴۵) والخزانة (۴: ۴۳۸) ومجازالقران لابی عبیدة ...... وتهذیب الالفاظ ۵۶۰ وکتاب الابدال لابی الطیب (۱: ۴۷,۳۵۱) واللسان والتاج (اسم) والمختارات الشجریة ۱۷۴ (مسمورة بدل مسجورة) والاضداد للاصمعی ۱۶۸ والقرطین (۲: ۴۱) والجمهرة ۲۱ وابن درید (۲: ۷۶) والسیوطی ۹۶وشرح السبع لابن انباری ۵۵۶ واضداد ابن الانباری ۵۴ وابن السکیت ۱۶۸ والسجستانی ۲۶ واضداد لابی الطیب ۳۶۲وغریب القران للقتبی ۴۲۴.

دوڑی جیسے اِشْتَعَلَتِ النَّاقَةُ کا محاورہ ہے اور اَلسَّجِیْرُ کے معنیٰ مخلص دوست کے ہیں گویا وہ محبت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ مُحْرَقٌ فِیْ مَوَدَّةٍ: کہ فلاں سوختہ محبت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۲۲) سُجَرَاءُ نَفْسِی غَیْرُ جَمْعِ اُشَابَةٍ

(س ج ل)

اَلسَّجْلُ: بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور سَجَلْتُ الْمَاءَ فَانْسَجَلَ کے معنیٰ ہیں: میں نے پانی بہایا تو وہ بہہ گیا، اور اَسْجَلْتُهٗ کے معنیٰ ہیں میں نے اسے پانی سے بھرا ہوا ڈول دیا اور استعارہ کے طور پر عطائے کثیر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمَسَاجَلَةُ: کے اصل معنیٰ ڈول کے ساتھ کھیتی سیراب کرنے کے ہیں اور پھر مبارات اور مناضلت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۲۳) مَنْ یُسَاجِلْنِیْ یُسَاجِلْ مَاجِدًا

جو میرے ساتھ مقابلہ کرے گا تو وہ ایک شریف آدمی سے مقابلہ کرے گا۔ یعنی میں ماجد اور شریف ہوں۔

اَلسِّجِّیْلُ: سنگِ گِل کو کہتے ہیں۔ اور اصل میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ فارسی سے معرب ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلسِّجِّلُّ کے اصل معنیٰ اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا بعدہ ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے، سِجِلٌّ کہنے لگے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ﴾ (۲۱۔۱۰۴) جیسے خطوں کا مکتوب لپیٹ لیا جاتا ہے یعنی لکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کے لئے اسے لپیٹ کر رکھ لیتے ہیں۔

(س ج ن)

اَلسَّجْنُ: (مصدر ن) قید خانہ میں بند کر دینا۔ اور آیت: ﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ﴾ (۱۲۔۳۳) اے میرے پروردگار! قید خانہ میں رہنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ میں ایک قرأت اَلسَّجْنُ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

﴿لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ﴾ (۱۲۔۳۵) (ان کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ) ایک وقت خاص تک اس کو قید رکھیں۔

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیَانِ﴾ (۱۲۔۳۶) اور (اتفاق سے) یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو جوان (اور بھی) جیل خانہ میں داخل ہوئے۔

اَلسِّجِّیْنُ یہ عِلِّیِّیْنُ کے مقابلہ میں جہنم کا نام ہے اور اس میں الفاظ کی زیادتی، معنیٰ کی زیادتی پر دال ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ زمین کے ساتویں طبقہ کا نام ہے۔ قرآن

---

❶ قاله ابو کبیر الهذلی (عامر بن الحلیس) وتمامه: حُشداً والاسلك المفارش عزل والبیت فی تهذیب الاصلاح ٤٦٧ مع آخر دیوانه دون الهذلیین (۲: ۹۰) والمعانی الکبیر ٥۲۱ والمرزوقی ۲۳۳ والمحکم (عزل، حشد) وفیه قال ابن جنی: روی حشد مثلث الدال.

❷ قاله الاخضر اللبهی (فضل بن عباس) وتمامه: یملأ الدلو الی عقد الکرب ـ والبیت فی اللسان (سجل) وتفسیر الطبری (۲: ۹٤) والامالی (۲: ٥٤) والسمط (۷۰۰) والکامل ٦٥ والاغانی (١٤: ١٧١ / ۳: ١٥) وکنایات الجرجانی ٥١ والمعانی للقتبی ۷۹٥ والاضداد لابن الانباری ۳۳٥ وبعده: انا الاخضر من یعرفنی ـ اخضر الجلد فی بیت العرب وانما قال انا الاخضر لانه کان شدیدا الادمة والخضرة انما اتته من قبل جدته (وامه ام الفضل بنت العباس بن عبدالمطلب) وکانت حبشیة وفی مصارع العشاق ۳۷۹ تمامه: اخضر الجلدة فی بیت العرب قال وتغنی به عبدالله بن جعفر فی مجلس معاویة بالابطح وفی الحصری (۳: ١٦١) واختلاط.

پاک میں ہے:
﴿لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَآ اَدْرٰاكَ مَا سِجِّیْنٌ﴾ (۸۳۔۸۷) (بدکارلوگوں کے نامۂ اعمال) سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو قرآن پاک نے مَـآ اَدْرٰاكَ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسے بعد میں بیان کردیا گیا ہے اور جسے مَا یُدْرِیْكَ کے ساتھ بیان کیا ہے اسے مبہم چھوڑ دیا ہے لیکن یہاں باوصف اس کے کہ سِجِّیْنَ اور عِلِّیِّیْنَ کو ماادراک کے بعد بیان فرمایا ہے پھر بھی انہیں مبہم رکھا گیا ہے اور کتاب کی تفسیر بیان فرمادی ہے۔تو اس میں ایک باریک نکتہ ہے جسے اس کتاب کے بعد دوسری جگہ پر بیان کیا جائے گا۔

(س ج و)

سَجَا اللَّیْلُ: رات پرسکون ہوگئی۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی﴾ (۹۳۔۲) اور رات کی (قسم) جب ساکن ہوجائے۔
اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ رات کے پرسکون ہونے کے لئے کہا جاتا ہے۔
هَـدَأَتِ الْاَرْجُـلُ: یعنی پاؤں کی چاپ رک گئی۔اور عَیْنٌ سَاجِیَةٌ کے معنیٰ خاموش آنکھ کے ہیں اور سَجَی الْبَحْرُ کے معنیٰ ہیں سمندر پُرسکون ہوگیا اسی سے استعارہ کے طور پر میت کو کفن میں چھپانے کے لئے تَسْجِیَةُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے۔

(س ح ب)

اَلسَّـحْـبُ: اس کے اصل معنیٰ کھینچنے کے ہیں۔
چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسیٹنے پر سَـحْـبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سَـحَـابٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ اسے ہوا کھینچ کر لے چلتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے۔اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ﴾ (۵۴۔۴۸) جس دن ان کو ان کے منہ کے بل (دوزخ کی) آگ میں گھسیٹا جائے گا۔
اور فرمایا:﴿یُسْحَبُوْنَ o فِی الْحَمِیْمِ﴾ (۴۰۔۷۱، ۷۲) انہیں دوزخ میں کھینچا جائے گا۔
محاورہ ہے۔
فُـلَانٌ یَتَسَـحَّبُ عَلٰی فُـلَانٍ: کہ فلاں اس پر جرأت کرتا ہے۔جیسا کہ یَتَجَرَّءُ عَلَیْهِ کہا جاتا ہے۔
اَلسَّـحَـابُ: ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے پر ہو یا خالی اس لئے خالی بادل کو سَـحَـابٌ جَهَـامٌ کہا جاتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَلَـمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا﴾ (۲۴۔۴۳) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے۔
﴿حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا﴾ (۷۔۵۷) حتیٰ کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھالاتی ہیں۔
﴿وَیُنْشِیءُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳۔۱۲) اور وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔
اور کبھی لفظ سحاب بول کر بطور تشبیہ کے اس سے سایہ اور تاریکی مراد لی جاتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ

مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۴۰) یا (ان کے اعمال کی مثال) بڑے گہرے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی ہے کہ دریا کو لہرنے ڈھانپ رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہر ان کے اوپر بادل (کی تاریکی غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک۔

(س ح ت)

اَلسُّحْتُ: اصل میں اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے۔ (اور اس سے ہلاک کردینے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ﴾ (۲۰۔۶۱) ورنہ وہ (تم پر کوئی) عذاب (نازل کرکے اس) سے تم کو ملیا میٹ کر دے گا۔ اس میں ایک قرأت فَيَسْحَتُكُمْ (فتح یاء کے ساتھ) بھی ہے اور سَحَتَهٗ (ض) وَاَسْحَتَهٗ (افعال) کے ایک ہی معنیٰ آتے ہیں یعنی بیخ کنی اور استیصال کرنا۔ پھر اسی سے سُحْتٌ کا لفظ ہر اس ممنوع چیز پر بولا جانے لگا جو باعث عار ہو کیونکہ وہ انسان کے دین اور مروت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (۵۔۴۲) اور مال حرام کو کھاتے چلے جاتے ہیں۔

یعنی وہ چیز جوان کے دین کا ناس کرنے والی ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۷۱) كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ...... جو گوشت مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ آگ کے لائق ہے اور اسی سے "رشوت" کو سُحت کہا گیا ہے۔[2] (۱۷۲) ایک روایت میں ہے۔[3] (۱۷۳) کہ حجام (پچھنا لگانے والے) کی کمائی "سحت" ہے تو یہاں سُحت بمعنیٰ حرام نہیں ہے۔ جو دین کو برباد کرنے والا ہو بلکہ سُحت بمعنیٰ مکروہ ہے یعنی ایسی کمائی مروت کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت علیہ السلام نے ایسی کمائی سے اونٹنی کو چارہ ڈالنے اور غلاموں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے۔

(س ح ر)

اَلسَّحَرُ کے معنیٰ حلق کے کنارہ اور پھیپھڑے کے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

اِنْتَفَخَ سَحْرُهٗ: اس کا پھیپھڑا پھول گیا (یعنی وہ بزدل ہے) اور بڑے حلق والے اونٹ کو بَعِيْرٌ سَحْرٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز ذبح کے وقت نرخرے سے اتار کر پھینک دی جاتی ہے اسے "سُحَارَةٌ" کہا جاتا ہے۔ اور یہ نُفَايَةٌ وَسُقَاطَةٌ کے وزن پر ہے اور فُعَالَةٌ کا وزن ردی اشیاء کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اسی سے سِحْرٌ مشتق ہے جس کے معنیٰ گلے یا پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔ اور سِحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں

---

[1] الحديث بهذااللفظ فی شعب الايمان من حديث كعب بن عجرة وباختلاف الفاظ فی الدارمی (۲ : ۳۲۸) والمستدرك للحاكم والترمذی ولفظه لا يربو لحم نبت من سحت فالناراولىٰ به (هب حل عن ابی بكروابن جرير ـ عن ابن عمر كنزالعمال (٤ رقم ٦٦ وبمعناه ۷۰، ۷۵، ۱٦/۷۹ : ۵۲۷) راجع تخريج العراقی علی الاحياء (ج ۱ ص ۲) وتخريج الكشاف رقم (٤٥٦.)

[2] راجع للحديث الفائق (۱ : ۸۲) ابن جرير عن ابن عمرو (وابن مردويه عن ابی هريرة ست خصال من السحت رشوة الامام (الحديث .)

[3] الطبرانی عن رافع بن خديج والخطيب عن ابی هريرة وابن النجار ـ عن السائب بن يزيد ايضاً ق عن ابی هريرة وضعفه .انظر ضمن حديث رافع بن خديج المذكور الآن والترمذی وابو داؤد وحسنه وابن ماجة من حديث محيصته تخريج احياء العلوم (۲ : ۱۱٤.)

استعمال ہوتا ہے اول دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نَـمَّامٌ ملمع سازی کی باتیں کر کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے چنانچہ آیت:

﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (۷۔۱۱۶) تو انہوں نے جادو کے زور سے لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان سب کو دہشت میں ڈال دیا۔

﴿يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ﴾ (۲۰۔۶۶) (تو) موسیٰ علیہ السلام کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا۔ میں سِحْرٌ کا لفظ اسی معنیٰ پر محمول ہے اور بنابریں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو سَاحِرٌ کہہ کر پکارا تھا چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ (۴۳۔ ۴۹) تو ان لوگوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کر۔

دوم: شیطان سے کسی طرح کا تقرب حاصل کر کے اس سے مدد چاہنا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰي مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰي كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۶۔۲۲۲) (کہ) کیا میں تمہیں بتاؤں کس پر شیطان اترا کرتے ہیں (ہاں تو وہ اترا کرتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر۔

اور اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۲۔۱۰۲) بلکہ کفر (کیا تھا تو) شیاطین نے کیا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔

اور اس کے تیسرے معنیٰ وہ ہیں جو عوام مراد لیتے ہیں یعنی سِحْرٌ وہ علم ہے جس کی قوت سے صور اور طبائع کو بدلا جا سکتا ہے۔ (مثلاً) انسان کو گدھا بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس علماء کے نزدیک ایسے علم کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ ❶

پھر کسی چیز کو سِحْرٌ کہنے سے کبھی اس شے کی تعریف مقصود ہوتی ہے جیسے کہا گیا ہے۔ ❷ (۱۷۴) اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا (کہ بعض بیان جادو اثر ہوتا ہے۔)

اور کبھی اس کے عمل کی لطافت مراد ہوتی ہے چنانچہ اطباء، طبیعت کو "سَاحِرَةٌ" کہتے ہیں اور غذا کو سِحْرٌ سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کی تاثیر نہایت ہی لطیف اور باریک ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ﴾ (۳۔۱۵) یہ تو نہیں کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

یعنی سحر کے ذریعہ ہمیں اس کی معرفت سے پھیر دیا گیا

---

❶ وقد نقد عليهم ابن قتيبه فی مشكله وتلهف علی عقول من انكره وقال فی ختام [illegible] : فمن آمن بمحمد صلی الله عليه وسلم وبان ماجاء به الحق بجميع هذا وشرح صدره به ومن انكره...... لانه لايؤمن الا بماوحد [illegible] والقياس علی ماشاهد ورأی نی الموات والحيوان ......فماذا ابقیٰ علی المسلمين؟ وای شيیء ترك للملحدين انظر نمتخبه من ۸۳......۹۲ وغرائب القران للنيسابوری والطبری والفخر وبجانبه ماكتب صاحب الكشاف والجاحظ فی الحيوان تجدمابين الفريقين من خلاف ۱۲۔

❷ قال صلی الله عليه وسلم حين وفد عليه عمروبن الاهتم والزبر قان بن بدر وقيس بن عاصم والمثل يضرب فی استحسان المنطق وايرادالحجة البالغة راجع للمثل الميدانی (۱ : ۷) والحديث فی (مالك، حم، خ، د، ت،) عن ابن عمرو بدون اللام فی (حم، د) عن ابن عباس وفی (د) عن بريدة.

ہے۔اور اسی معنیٰ میں فرمایا:
﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ﴾ (۱۵-۱۵) تم پر تو بس کسی نے جادو کر دیا ہے۔
بعض نے کہا ہے: مُسَحَّرٌ وہ ہے جس کے سَحَرٌ یعنی پھیپھڑا وغیرہ ہو اور مطلب یہ تھا کہ تم غذا کے محتاج ہو (پھر پیغمبر کیسے ہو سکتے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ (ان کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے قرآن نے) فرمایا:
﴿مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ﴾ (۲۵-۷) یعنی یہ تو ہماری طرح کا کھانے پینے والا انسان ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (۲۶-۱۵۴) کہ تم بھی ہم ہی جیسے آدمی ہو۔
اور بعض نے کہا ہے کہ مُسَحَّرٌ کے معنیٰ ہیں وہ شخص جسے جادو کا علم دیا گیا ہو اور وہ اپنے دعویٰ کو لطف و وقت سے ثابت کر سکتا ہو۔ اور آیت:
﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا﴾ (۱۷-۴۷) کہ تم مسحور آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔
میں مَسْحُوْرًا کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ اور فرمایا:
﴿فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا﴾ (۱۷-۱۰۱) تو فرعون نے ان سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام! میں تیری نسبت ایسا خیال کرتا ہوں کہ کسی نے تجھ پر جادو کر (کے تجھے دیوانہ بنا) دیا ہے۔
لیکن آیت:
﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۵-۱۱۰) کہ یہ صریح جادو ہے۔
دوسرے معنیٰ پر دلالت کرتی ہے۔ اور فرمایا:
﴿وَجَآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ﴾ (۷-۱۱۶) اور (بہت ہی) بڑا (بھاری) جادو (بنا کر) لائے۔
﴿اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴾ (۱۰-۷۷) کیا یہ جادو ہے۔ اور جادوگروں (کا یہ حال ہے کہ ان) کو (کبھی) کامیابی نہیں ہوتی۔
﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۲۶-۳۸) غرض دن مقرر ہوا اور (اس) معین دن کے وعدے پر جادوگر جمع کیے گئے۔
﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ﴾ (۲۶-۴۶) یہ دیکھ کر جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سجدے میں گر پڑے۔
اَلسَّحَرُ وَالسَّحَرَةُ اصل میں تو اس کے معنیٰ آخر شب کی تاریکی کے ہیں جو دن کی ابتدائی روشنی میں مخلوط ہو۔ پھر اس وقت کا نام ہی سَحَرٌ رکھ دیا گیا ہے۔ محاورہ ہے: لَقِيْتُهٗ بِاَعْلَى السَّحَرَيْنِ: یعنی میں اسے صبح کاذب کے وقت ملا۔ اور مُسْحِرًا اس آدمی کو کہتے ہیں جو سحری کے وقت گھر سے نکلا ہو اور اَلسَّحُوْرُ اس طعام کو کہتے ہیں جو بوقت سحر تناول کیا جائے اور تَسَحُّرٌ کے معنیٰ سحور تناول کرنے کے ہیں۔

(س ح ق)

اَلسَّحْقُ: (ض ک) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ زیادہ تر دوا کے پیسنے پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:
سَحَقْتُهٗ فَانْسَحَقَ: میں نے دوا کو پیسا چنانچہ وہ پس گئی
أَسْحَقَ الثَّوْبُ کے معنیٰ کپڑے کا پرانا ہو جانا کے ہیں اور پرانے کپڑے کو سَحْقٌ کہا جاتا ہے اسی سے أَسْحَقَ الضَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں دودھ خشک ہو جانے کی وجہ سے تھن مرجھا گئے ...... اور

ہوسکتا ہے کہ "اِسْحٰق" (علم) بھی اسی سے مشتق ہو اس صورت میں یہ اسم منصرف ہوگا۔ اور کپڑے کے بوسیدہ کردینے پر سَحَقَہٗ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور محاورہ میں اَسْحَقَہُ اللّٰہُ کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اسی سے فرمایا:

﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحَابِ السَّعِيْرِ﴾ (۶۷۔۱۱) کہ دوزخیوں کے لئے دوری ہے۔ اور فرمایا:

﴿اَوْ تَهْوِىْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ (۲۲۔۳۱) یا اس کو ہوا کسی دور جگہ لے کر ڈال دے گی۔

اور استعارہ کے طور پر جاری خون کو مُنْسَحَقٌ وَسَحُوقٌ کہا جاتا ہے جیسے مزرُوْرٌ

(س ح ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲۰۔۳۹) تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔

یہ اصل میں سَحَلَ الْحَدِيْدَ سے ہے جس کے معنیٰ ریتی سے لوہے کا برادہ بنانا اور چھیلنے کے ہیں۔ بعض کا خیال ہے دریا کے کنارے کو ساحل کی بجائے مَسْحُوْلٌ کہنا چاہیے تھا مگر اسم مفعول کی بجائے اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ھَمٌّ نَاصِبٌ کہا جاتا ہے حالانکہ ھَمٌّ مَنْصُوْبٌ ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک سَاحِلٌ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ پانی کو متفرق اور محدود کردیتا ہے اس صورت میں ساحل بمعنیٰ فاعل ہوگا۔

اَلسُّحَالَةُ: برادہ کو کہتے ہیں اور گدھے کی ہنہناہٹ کو سَحِيْلٌ یا سَحَالٌ کہا جاتا ہے گویا کرخت ہونے کے لحاظ سے اس کی آواز لوہے کو رگڑنے کی آواز کے مشابہ ہے۔

اور بلند آواز آدمی کو مِسْحَلٌ کہا جاتا ہے گویا وہ سَجِيْلُ الْحِمَارِ کے مشابہ ہے یعنی رفع صوت کے لحاظ سے نہ کہ آواز کے کرخت ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ قرآن پاک نے گدھے کی آواز کے متعلق کہا ہے:

﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (۳۱۔۱۹) اور وہانہ لگام کے دونوں طرف کے حلقوں کو مِسْحَلَتَانِ کہا جاتا ہے۔

(س خ ر)

اَلتَّسْخِيْرُ: (تفعیل) کے معنیٰ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۴۵۔۱۳) اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔

﴿سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ……﴾ (۱۴۔۳۳) اور (اسی طرح ایک اعتبار سے) سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں پڑے چکر کھا رہے ہیں اور (ایسے ہی ایک طرح سے) رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (۱۴۔۳۲) اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (۲۲۔۳۶) ہم نے یوں ان (جانوروں) کو تمہارے بس میں کر دیا ہے تا کہ تم (ہمارا) شکر کرو۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا﴾ (۴۳۔۱۳) پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے۔

تو مُسَخَّرٌ وہ ہے جسے کسی کام پر مجبور کر کے لگایا گیا ہو اور سِخْرِیٌّ وہ جسے اولاً تو کسی کام پر مجبور کیا جائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِیَتَّخِذَ بَعْضُکُمْ بَعضًا سُخْرِیًّا﴾ (۴۳۔۳۲) تا کہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنائے رہیں۔

اور سَخِرْتُ مِنْہُ وَاسْتَسْخَرْتُہٗ کے معنیٰ کسی سے مذاق کرنے اور اس کی ہنسی اڑانا ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْکُمْ کَمَا تَسْخَرُوْنَ﴾ (۱۱۔۳۸) وہ (حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم ہم پر ہنستے ہو تو جس طرح تم (ہم پر) ہنستے ہو (اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پر ہنسیں گے۔

﴿بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲) (اے پیغمبر) بات یہ ہے کہ تم (ان کے انکار قیامت سے) تعجب کرتے ہو اور یہ (تمہاری باتوں پر) ہنستے ہیں۔ رَجُلٌ سُخَرَۃٌ ہنسی اڑانے والا۔ اور سُخْـرَۃٌ وہ ہے جس کی لوگ ہنسی اڑائیں اور ہنسی اڑانے والے کے اس فعل کو سُخْرِیَّۃٌ وَ سِخْرِیَّۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاتَّخَذْتُمُوْھُمْ سُخْرِیًّا﴾ (۲۳۔۱۱۱) تو تم نے ان کی ہنسی بنائی۔ میں سُخْرِیًّا تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَّۃٌ یعنی ہنسی اڑانے کے معنیٰ میں بھی۔ اور اسی طرح آیت:

﴿وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّھُمْ مِنَ الْاَشْرَارِ ○ اَتَّخَذْنَاھُمْ سِخْرِیًّا﴾ (۳۸۔۶۳) اور دوزخی آپس میں یہ بھی کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے کیا بات ہے کہ ہم ان کو (یہاں دوزخ میں) نہیں دیکھتے کیا ہم نے ان کی (ناحق) ہنسی بنائی۔ میں دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ﴿وَکُنْتُمْ مِنْھُمْ تَضْحَکُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱) سے دوسرے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔

(س خ ط)

اَلسَّخْطُ وَلسُّخْطُ: اس سخت غصہ کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا ھُمْ یَسْخَطُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱) تو وہ فوراً غصہ سے بھر جاتے۔

اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد انزال عقوبت ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذَالِكَ بِاَنَّھُمْ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہُ﴾ (۴۷۔۲۸) (اور ان کی) یہ نوبت اس لئے (ہوگئی) کہ جو چیز خدا کو بری لگتی ہے یہ اسی (کے رستے) پر چلے۔

﴿اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ﴾ (۵۔۸۰) (نتیجہ یہ ہوا) کہ (دنیا میں بھی) خدا ان سے ناراض ہوا۔

﴿کَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ (۳۔۱۶۱) اس شخص جیسا (فعل سرزد) ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں آ گیا ہو۔

(س د د)

اَلسَّدُّ: (دیوار، آڑ)

بعض نے کہا ہے کہ سَدٌّ اور سُدٌّ کے ایک ہی معنیٰ ہیں اور بعض دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ سُـدٌّ (بضمہ

سین) اس آڑ کو کہتے ہیں جو قدرتی ہو اور سَدٌّ (بفتحہ سین) مصنوعی اور بنائی ہوئی روک کو کہتے ہیں۔اصل میں یہ سَدَدْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنیٰ رخنہ کو بند کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بَیْنَنَا وَبَیْنَھُمْ سَدًّا﴾ (۱۸۔۹۴) کہ (آپ) ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر قسم کے موانع کو سَدٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا﴾ (۳۶۔۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی۔

ایک قرأت میں سُدًّا بھی ہے۔

اَلسُّدَّۃُ: برآمدہ، جو دروازے کے سامنے بنایا جائے تاکہ بارش سے بچاؤ ہو جائے کبھی دروازے کو بھی سُدَّۃٌ کہہ دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔ ❶

اَلْفَقِیْرُ الَّذِیْ لَا تُفْتَحُ لَہٗ سُدَدُ السُّلْطَانِ یعنی وہ فقیر جن کے لئے بادشاہ کے دروازے نہ کھولے جائیں

اَلسَّدَادُ وَالسَّدَدُ کے معنیٰ استقامت کے ہیں اور اَلسِّدَادُ اسے کہتے ہیں جس سے رخنہ اور شگاف کو بھرا جائے۔اور استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کو سَدَادٌ کہا جاتا ہے جس سے فقر کو روکا جائے۔

(س د ر)

اَلسِّدْرُ: (بیری کا) درخت جس کا پھل بہت کم غذائیت کا کام دیتا ہے۔اسی بنا پر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ﴾ (۳۴۔۱۶) اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔

اور کبھی (گابھا دے کر) اسے بے کانٹا کر کے اس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے اسے جنت کے آرام اور اس کی نعمتوں کے لئے بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۸) بے خار کی بیریوں میں (مزے کر رہے) ہوں گے۔

کیونکہ ایسا درخت بہت زیادہ سایہ دار ہوتا ہے اور آیت:

﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی﴾ (۵۳۔۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

میں السِّدْرَۃَ سے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں کہ آنحضرت ﷺ کو فیوضات الٰہیہ اور بھاری انعامات سے خاص طور پر نوازا گیا تھا۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے بیعت رضوان لی تھی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر سکینت الٰہیہ نازل فرمائی تھی۔

اَلسَّدْرُ کے معنیٰ خیرہ چشم ہونے کے ہیں اور خیرہ چشم کو سَادِرٌ کہا جاتا ہے اور سَدَرَ شَعْرَہٗ کے معنیٰ بال لٹکانے کے ہیں۔بعض کے نزدیک یہ (دَسَرَ) سے مقلوب ہے۔

(س د س)

اَلسُّدُسُ: (اسم عدد چھٹے حصے کو کہتے ہیں۔)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ﴾ (۴۔۱۱) تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

---

❶ وفی واروی الحوض: ھم الذین لاتفتح لھم السدد (النھایۃ: اسد).

اَلسِّدْسُ: پیاسے اونٹوں کو چھٹے روز پانی پلانے کی باری اور سِتٌّ بھی اصل میں سِدْسٌ ہی ہے۔ سَدَسْتُ الْقَومَ کے معنیٰ قوم میں چھٹا آدمی ہونے یا ان کے اموال سے چھٹا حصہ وصول کرنے کے ہیں۔ اور جَاءَ سَادِساً وَسَاتًّا وَسَادِیًا کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی وہ چھٹے درجہ پر آیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ (۵۸۔۷) اور نہ کہیں پانچ کا (مجمع ہوتا ہے) مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔

﴿وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

محاورہ مشہور ہے: لَا اَفْعَلُ كَذَا سَدِيْسَ عَجِيْسَ: میں کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔

اَلسَّدُوْسُ: طیسان کو کہتے ہیں اَلسُّنْدُسُ: باریک اور اس کے مقابل اِسْتَبْرَقٌ موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔

(س ر ر)

اَلْاِسْرَارُ: کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ (۲۔۲۷۴) اور پوشیدہ اور ظاہر اور فرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ (۲۔۷۷) کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں خدا کو سب معلوم ہے۔

﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ﴾ (۶۷۔۱۳) اور تم لوگ بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اور اس کا استعمال اعیان و معانی دونوں میں ہوتا ہے۔

اَلسِّرُّ: اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) وہ چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

نیز فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ﴾ (۹۔۷۸) کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

سَارَّهٗ: (مفاعلہ) کے معنیٰ ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تَسَارَّ الْقَوْمُ کے معنیٰ لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ﴾ (۱۰۔۵۴) (پچھتائیں گے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اَسَرُّوْا کے معنیٰ چھپانے کے ہیں اور بعض نے اسکے معنیٰ ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:

﴿فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾ (۶۔۲۷) اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنیٰ صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت مذکورہ میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت یٰلَیْتَنَا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

اَسْرَرْتُ اِلٰى فُلَانٍ حَدِيْثاً: کسی سے پوشیدہ طور پر

راز کی بات کہنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا﴾ (۶۶۔۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر علیہ السلام نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔
اور آیت:
﴿وَتُسِرُّوْنَ اِلَیْہِمْ بِالْمَوَدَّۃِ﴾ (۶۰۔۱) اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تُسِرُّوْنَ کے معنیٰ تُظْهِرُوْنَ کئے ہیں اور یہی معنیٰ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِسْرَارُ اِلَی الْغَیْرِ: کسی سے بھید کی بات کہنا۔ جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقتضی ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہٰذا اَسْرَرْتُ اِلٰی فُلَانٍ یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا۔ میں من وجہ اخفا اور من وجہ اظہار کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:
﴿وَاَسْرَرْتُ لَہُمْ اِسْرَارًا﴾ (۷۱۔۹) (ظاہر) اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔
اور کنایہ کے طور پر اَلسِّرُّ کے معنیٰ نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سِرٌّ خالص چیز کو کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے ھُوَ مِنْ سِرِّ قَوْمِہٖ وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ الْوَادِیْ وَسَرَارَتُہٗ ہے۔ جس کے معنیٰ وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔
سُرَّۃُ الْبَطْنِ: ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ عکن بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سُرَّۃُ الْبَطْنِ کہتے ہیں۔ اور وہ چیز جو ناف سے قطع

کی جاتی ہے اسے سُرٌّ وَ سُرُرٌ کہا جاتا ہے۔ ہتھیلی کی لکیروں کو اَسِرَّۃُ الرَّاحَۃِ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اَسَارِیْرُ الْجَبْھَۃِ کہا جاتا ہے اسی طرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند نظر نہیں آتا اسے سَرَارٌ کہا جاتا ہے۔
اَلسُّرُوْرُ: قلبی راحت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَقّٰہُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) (تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔
﴿تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ (۲۔۶۹) (کہ) دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔
اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:
﴿وَّیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَہْلِہٖ مَسْرُوْرًا﴾ (۸۴۔۹) اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔
اور اہل نار کے متعلق فرمایا:
﴿اِنَّہٗ کَانَ فِیْٓ اَہْلِہٖ مَسْرُوْرًا﴾ (۸۴۔۱۳) یہ اپنے اہل وعیال میں مست رہتا تھا۔
تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔
اَلسَّرِیْرُ: (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سُرُوْرٌ سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اَسِرَّۃٌ اور سُرُرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:
﴿مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَۃٍ﴾ (۵۲۔۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں۔ تکیہ لگائے ہوئے۔
﴿فِیْہَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَۃٌ﴾ (۸۸۔۱۳) وہاں تخت ہوں

گے اونچے بچھے ہوئے۔

﴿وَلِبُيُوتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِؤُنَ﴾ (۴۳۔۳۴) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنادیئے) اورتخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔

اورمیت کے جنازہ کو اگر سَرِيرُ الْمَيِّتِ کہا جاتا ہےتو یہ سَرِير (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پاکر جوارالٰہی میں خوش وخرم ہے جس کی طرف کہ آنحضرت علیہ السلام نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا[1]: (۱۷۵) اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

(س ر ب)

اَلسَّرَبُ: (مصدرن) اس کے اصل معنیٰ نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور اسم کے طور پر نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ (۱۸۔۶۱) تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح اپنا رستہ بنالیا۔

سَرَبَ (ن) سَرَبًا وَسُرُوْبًا (جیسے مَرَّ مَرًّا وَمُرُوْرًا) اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے ایک ہی معنیٰ آتے ہیں لیکن سَرَبَ بالذات فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متاثر ہو کر کیا جائے۔

سَرِبَ الدَّمْعُ: (س) آنسو رواں ہونا۔

اِنْسَرَبَتِ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا: سانپ کا اپنے بل میں اتر جانا۔اسی طرح سَرِبَ (س) اَلْمَاءُ مِنَ السِّقَاءِ: کے معنیٰ مشکیزے سے پانی ٹپکنا کے ہیں اور وہ پانی جو مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اسے مَاءٌ سَرَبٌ وَسَرِبٌ کہتے ہیں۔

اَلسَّارِبُ: کسی راستہ پر (اپنی مرضی سے) چلا جانے والا۔﴿وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾ (۱۳۔۱۰) یا رات کو کہیں چھپ جائے یا دن کی روشنی میں کھلم کھلا چلے پھرے۔

سَارِبٌ کی جمع سَرَبٌ آتی ہے۔جیسے رَكْبٌ وَرَاكِبٌ اور عرف میں اونٹوں کے گلہ کو سَرْبٌ کہا جاتا ہے مثلاً محاورہ ہے ذُعِرَتْ سَرْبُهٗ: اس کے اونٹ ڈر کر متفرق ہوگئے (یعنی بدحال ہو گیا) اور هُوَ اٰمِنٌ فِى سِرْبِهٖ: وہ خوش حال ہے میں سِربٌ کے معنیٰ نفس کے ہیں اور بعض نے کنایۃً اہل وعیال مراد لیا ہے۔اسی سے کنایہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اِذْهَبِىْ فَلَا اَنْدَهٗ سِرْبَكِ: جاؤ تجھے طلاق ہے اور اصل معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے اونٹ جدھر جانا چاہیں آزادی سے چلے جائیں میں انہیں نہیں روکوں گا۔

اَلْمَسْرُبَةُ: (بضمہ راء) سینہ کے درمیان کے بال جو نیچے پیٹ تک ایک خط کی صورت میں چلے جاتے ہیں۔

اَلسَّرَابُ: (شدت گرما میں دوپہر کے وقت) بیاباں میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے "سَرَابٌ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے۔پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَرَابٌ کہا جاتا ہے اور اس

[1] وجنة الكافر للحديث راجع (حم ، م ، ت ، ٥) عن ابى هريرة وابن حبان فى زوائده رقم ٢٤٨٨ (طب ، ك ، عن سلمان البزار عن ابن عمر) وفى رواية سجن المؤمن وسنته راجع تخريج عراقى على الاحياء (٣ : ٢٠٢)۔

کے بالمقابل جو چیز حقیقت رکھتی ہو اسے شَرَابٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ (۲۴۔۳۹) جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا اسے پانی سمجھے۔

﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَاباً﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو کر رہ جائیں گے۔

(س ب ل)

اَلسِّرْبَالُ: کرتہ،قمیص خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی ہو۔جیسے فرمایا:

﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ﴾ (۱۴۔۱۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔

﴿سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ﴾ (۱۶۔۸۱) اور تمہارے (آرام کے) واسطے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے یعنی زرہیں جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔

تو بَأْسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(س ر ج)

اَلسِّرَاجُ: (چراغ) وہ چیز جو بتی اور تیل سے روشن ہوتی ہے۔مجازاً ہر روشن چیز کو "سِرَاجٌ" کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (۷۱۔۱۶) اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَاجًا﴾ (۷۸۔۱۳) اور روشن چراغ بنایا۔

تو یہاں "روشن چراغ" سے مراد سورج ہے۔

اَسْرَجْتُ السِّرَاجَ کے معنیٰ چراغ روشن کرنے کے ہیں اور سَرَّجْتُ كَذَا کے معنیٰ چراغ کی مثل کسی چیز کو خوبصورت بنانے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۲۲۴) وَفَاحِماً وَمِرْسَناً مُسَرَّجاً

کوئلہ کی مثل سیاہ بال اور سراج کی مثل خوبصورت ناک

اَلسَّرْجُ کے معنیٰ زین کے ہیں اور زین ساز کو سَرَّاجٌ کہا جاتا ہے۔

(س ر ح)

اَلسَّرْحُ: ایک قسم کا پھلدار درخت ہے اس کا واحد سَرْحَةٌ ہے اور سَرَّحْتُ الْاِبِلَ کے اصل معنیٰ تو اونٹ کو "سـرح" درخت چرانے کے ہیں بعدہ چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینے پر اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ (۱۶۔۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو اور جب صبح کو جنگل چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔

اور چرواہے کو "سَارِحٌ" کہا جاتا ہے اس کی جمع سَرْحٌ

---

[1] قاله العجاج يصف امرئة وقبله : ازمان ابدت واضحاً مفلجا۔اغربراقا وطرفا ابرجا ومقلة وحاجباً مزججا .... وانظر فی دیوانه ۸ واراجيز العرب ۷۳ والامالي وتهذيب الالفاظ ۲۰۷ والمعاهد ٦ والعینی (۱ : ۲۹) وفی المتداولات ان لفظه المسرج فی الشطر غريب وليت شعری ماالغربة فيه الاان يقال ان ماخذه دقيق ولاياباه الذوق .

ہے جیسے شَارِبٌ کی جمع شَرْبٌ اور رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ آتی ہے اور تَسْرِیْحٌ کا لفظ طلاق دینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۲۲۹) یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور اسی طرح آیت:

﴿وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا﴾ (۳۳۔۴۹) اور ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کردو۔

میں بھی سَرِّحُوْھُنَّ کے معنیٰ طلاق دینے کے ہیں اور یہ تَسْرِیْحٌ سے مستعار ہے جس کے معنیٰ جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دینا کے ہیں۔ جیسا کہ خود طلاق کا لفظ اِطْلَاقُ الْاِبِلِ: (اونٹ کا پائے بند کھولنا) کے محاورہ سے مستعار ہے۔ اور کبھی سَرْحٌ میں تیز روی کے معنیٰ کا اعتبار کر کے تیز رو اور سہل رفتار اونٹنی کو نَاقَةٌ سَرْحٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے بطور استعارہ شعر کے ایک بحر کا نام مُنْسَرِحٌ رکھا گیا ہے۔

(س ر د)

اَلسَّرْدُ: اصل میں اس کے معنیٰ کسی سخت چیز کو سینے کے ہیں جیسے زرہ بنانا اور چمڑے کو سینا پھر بطور استعارہ لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ﴾ (۳۴۔۱۱) اور کڑیوں کو اندازہ سے جوڑو۔

اور صِرَاطٌ وَسِرَاطٌ وَزِرَاطٌ کی طرح سَرْدٌ کو زَرْدٌ اور سَرَّادٌ کو زَرَّادٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِسْرَدُ (اسم آلہ) سوراخ کرنے کا اوزار۔

(س ر د ق)

اَلسُّرَادِقُ: فارسی سے معرب ہے [1] کلام عرب میں کوئی ایسا اسم مفرد نہیں ہے جس کا تیسرا حرف الف ہو اور اس کے بعد دو حرف ہوں۔ [2] قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ (۱۸۔۲۶) جس کے شامیانے ان کو گھیر رہے ہوں گے۔

اور بَیْتٌ مُسَرْدَقٌ: اس مکان کو کہتے ہیں جو شامیانہ کی طرز پر بنایا ہو۔

(س ر ط)

اَلسِّرَاطُ کے معنیٰ ''آسان راستہ'' کے آتے ہیں اور اصل میں سَرَطْتُ الطَّعَامَ وَزَارَدْتُهٗ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا رہرو اس کو نگلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ قَتَلَ اَرْضًا عَالِمُهَا وَقَتَلَتْ اَرْضٌ جَاهِلَهَا کہ واقف کار رہرو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کر دیتی ہے۔ ابو تمام نے کہا ہے۔ [3]

رَعَتْهُ الْفَیَافِیْ بَعْدَ مَا کَانَ حِقْبَةً

---

[1] من سرایرده ومن سرادر ۱۲۔

[2] الاحرفان وهما علابط وحلاحلّ ۲۔

[3] قاله ابو تمام من قصيدته التي يمدح فيها عبدالله بن طاهر والبيت في ديوانه ٤٤ والحفاجي ٣٣ والامالي ١: ٥٨٥ وفي المطبوع دعته مصحف وفي رواية الديوان ماء الروض بدل ماء المزن وبعده فكم جزع واوجب ذروة غارب ومن قبل كانت اتمكنه مذانبه (الاتماك الاسمان والمذانب مجارى الماء ١٢۔)

رَعَاهَا اِذَا مَا الْمُزْنُ يَنْهَلُّ سَاكِبُهٗ

اس کے بعد کہ اُس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھا لیا یعنی دبلا کردیا۔

اسی طرح راستہ کو لَقَمٌ اور مُلْتَقَمٌ بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا رہرو اس کو لقمہ بنالیتا ہے۔

(س ر ع)

اَلسُّرْعَۃُ: اس کے معنیٰ جلدی کرنے کے ہیں اور یہ بُطْأٌ (درنگ کردن) کی ضد ہے۔ اجسام اور افعال دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: سَرُعَ (ک) فَھُوَ سَرِیْعٌ وَاَسْرَعَ (افعال) فَھُوَ مُسْرِعٌ: اس نے جلدی کی اور اَسْرَعُوا کے معنیٰ سَارَتْ اِبِلُھُمْ سِرَاعًا: (ان کے اونٹ تیز رفتاری سے چلے گئے) آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل اَبْلَدُوْا کے معنیٰ سست ہونا آتے ہیں۔

سَارَعُوا وَتَسَارَعُوْا: ایک دوسرے سے سبقت کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ (۳۔۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش (اور بہشت کی) طرف لپکو۔

﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ (۳۔۱۱۴) اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔

﴿یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْھُمْ سِرَاعًا﴾ (۵۰۔۴۴) اس روز زمین ان پر پھٹ جائے گی اور جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ (۷۰۔۴۳) اور کسی کام میں قوم سے آگے نکل جانے والوں کو سَرَعَانُ کہا جاتا ہے۔

مثل مشہور ہے [1] سَرْعَانَ ذَااِھَالَۃً یہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو قبل از وقت کسی واقعہ کی پیش گوئی کرے۔ تو یہ سَرَعَ سے مبنی برفتحہ ہے۔ جیسا کہ وَشَكَ سے وَشْكَانَ اور عَجَلَ سے عَجْلَانُ آجاتا ہے اور آیت: ﴿اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ (۳۔۹۹) او رخدا جلد از جلد عذاب دینے والا ہے۔

اور اسی طرح آیت ﴿اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ﴾ ''بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔'' میں سَرِیْعٌ کے لفظ سے اس معنیٰ پر متنبہ کرنا مقصود ہے جو کہ آیت:

﴿اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾ (۳۷۔۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ سے مفہوم ہوتے ہیں۔

(س ر ف)

اَلسَّرَفُ کے معنیٰ انسان کے کسی کام میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کر جانے پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا﴾ (۲۵۔ ۶۷) اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں۔

﴿وَلَا تَاْکُلُوْھَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا﴾

[1] اھالۃ منصوب علی الحال والتقدیر سرعان اھالۃ بھذہ (منتھی الادب).

(۴۔۶) اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اسے فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔

اور یہ یعنی بے جا سرف کرنا مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے بولا جاتا ہے چنانچہ حضرت سفیان (ثوری رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک حبہ بھی صرف کیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ﴾ (۶۔۱۴۲) اور بے جا اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ ھُمْ اَصْحَابُ النَّارِ﴾ (۴۰۔۴۳) اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔

یعنی جو اپنے امور میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ﴾ (۴۰۔۲۸) بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے تجاوز کر جانے والا ہو اور جھوٹا ہو۔

اور قوم لوط علیہ السلام کو بھی مُسْرِفِیْنَ (حد سے تجاوز کرنے والے) کہا گیا ہے۔کیونکہ وہ بھی خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کر کے جائز حدود سے تجاوز کرتے تھے اور عورت جسے آیت:

﴿نِسَائُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔

میں حَرْثٌ قرار دیا گیا ہے......میں بیج بونے کی بجائے اسے بے محل ضائع کر رہے تھے اور آیت:

﴿یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ﴾ (۳۹۔۵۳) (اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو) اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔میں اَسْرَفُوْا کا لفظ مال وغیرہ ہر قسم کے اسراف کو شامل ہے اور قصاص کے متعلق آیت:

﴿فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ﴾ (۱۷۔۳۳) تو اس کو چاہئے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے۔

میں اِسْرَاف فِی الْقَتْل یہ ہے کہ غیر قاتل کو قتل کرے اس کی دو صورتیں ہیں۔مقتول سے بڑھ کر باشرف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔یا قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا۔

عام محاورہ ہے: مَرَرْتُ بِکُمْ فَسَرَفْتُکُمْ کہ تمہارے پاس سے بے خبری میں گزر گیا۔

تو یہاں سَرَفْتُ بمعنیٰ جَھِلْتُ کے ہیں۔یعنی اس نے بے خبری میں اس حد سے تجاوز کیا جس سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہی معنیٰ جہالت کے ہیں۔

اَلسُّرْفَةُ: ایک چھوٹا سا کیڑا جو درخت کے پتے کھا جاتا ہے اس میں اسراف کا تصور کر کے اسے سُرْفَۃٌ کہا جاتا ہے پھر اس سے اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سُرِفَتِ الشَّجَرَۃُ: درخت کرم خوردہ ہو گیا۔

اور ایسے درخت کو سُرْفَۃٌ (کرم خوردہ) کہا جاتا ہے۔

(س ر ق)

السَّرِقَةُ: (مصدر ض) اس کے اصل معنیٰ خفیہ طور پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جس کا لینے کا حق نہ ہو اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ﴾ (۵۔۳۸) اور جو چوری

کرے مرد ہو یا عورت۔

﴿قَالُوْا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۲۔۷۷) (برادران یوسف علیہ السلام نے کہا) کہ اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔

﴿اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۷۰) کہ قافلہ والو! تم تو چور ہو۔

﴿اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ﴾ (۱۲۔۸۱) کہ آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جاکر) چوری کی۔

اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ کے معنیٰ چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ﴾ (۱۵۔۱۸) ہاں! اگر کوئی چوری سے سننا چاہے۔

اَلسَّرَقُ و السَّرَقَةُ: سفید ریشم۔

(س ر م د)

اَلسَّرْمَدُ: کے معنیٰ دائم ہمیشہ کے ہیں۔ [1]

قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا﴾ (۲۸۔۷۱) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات (کی تاریکی) کئے رہے۔

اسی طرح اس کے بعد آیت میں النَّهَارَ سَرْمَدًا فرمایا ہے۔

(س ر ی و)

اَلسُّرٰی کے معنیٰ رات کو سفر کرنے کے ہیں اور اسی معنیٰ میں سَرٰی (ض) وَاَسْرٰی (افعال) دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ﴾ (۱۱۔۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ (۱۷۔۸۱) وہ ذات (پاک) ہے جو ایک رات اپنے بندے کو...... لے گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْرٰی (باب افعال) سَرٰی یَسْرِی سے نہیں ہے جس کے معنیٰ رات کو سفر کرنے کے ہیں۔ بلکہ یہ سَرَاةٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کشادہ زمین کے ہیں۔ اور اصل میں اس کے لام کلمہ میں واو ہے اور اسی سے شاعر نے کہا ہے۔ [2] (البسیط)

(۲۲٦) بِسَرْوِ حِمْیَرِ اَبْوَالُ الْبِغَالِ بِهٖ

حمیر کی کشادہ زمین میں جہاں خچروں کا پیشاب یعنی کہ سراب نظر آتے ہیں۔

پس اَسْرٰی کے معنیٰ کشادہ زمین میں چلے جانا ہیں۔

---

[1] وفی الکشاف انه مشتق من السرد علی وزن فَعْمَلٌ فالمیم فیه زائدة وان کان رباعیاً فوزنه فَعللٌ (اکشاف والروح).

[2] من کلمة جمهرية (۳۰٦۔۳۱۰) فی ۵۰ بیتاً مطلعها طاف الخیال رکب الیمانینا ودون لیلی عوادٍ لوتعدینا قاله تمیم بن مقبل العامری فی مشوبته (ومشحبات العرب سبع قصالد وتمامه: انی اتسدیت وهناً ذالك الینا وسرو حمیر من منا زلهم بالیمن وابواب البغال یراد وبها السراب تشبیهاً لان بول البغال کاذب لایفتح وکذا السراب والبین: الارض الواسعة قد رمدالبصر کمافی المعاجم راجع المقاییس واللسان (بین، سدی) واصلاح یعقوب ۵ واعراب ثلاثین ٤٦ والبیت ایضاً فی امالی المرتضیٰ (۱: ۲۹۱) وتهذیب المنطق (۱: ۷) وفیه سرو حمیر بدون الباء وسرو حمیر مکان یوصف بالبعدوفی حدیث عمر لئن عشت الی قابل لاسوین بین الناس حتیٰ یاتی الراعی حقه بسر و حمیر لم یعرق جبینه راجع للبیت السبع لابن الانباری والاشتقاق ۷۰ والبلدان وراجع ایضًا غریب ابی عبید (۳: ۲٦۷۔۲٦۸).

جیسے اَجْبَلَ کے معنیٰ ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا اور اَتْهَمَ کے معنیٰ وہ تہامہ میں چلا گیا۔

لہٰذا آیت:

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ کے معنیٰ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ سرزمین میں لے گیا۔ نیز سَرَاۃ ہر چیز کے افضل اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں اسی سے سَرَاۃُ النَّھَارِ ہے جس کے معنیٰ دن کی بلندی کے ہیں اور آیت: ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا﴾ (۱۹-۲۴) تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

میں سَرِیٌّ سے نہر جاری مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سَرْوٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ رفعت کے ہیں اور بلند قدر آدمی کو رَجُلٌ سَرْوٌ کہا جاتا ہے تو لفظ سری سے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اس شرف کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر نوازا تھا۔

محاورہ ہے۔

سَرَوْتُ الثَّوْبَ عَنِّیْ: میں نے اپنے اوپر سے کپڑا اتار دیا۔

وَسَرَوْتُ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ: میں نے گھوڑے سے جھول اتار دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ اسی سے رَجُلٌ سَرِیٌّ ہے کیونکہ بلند قدر آدمی ہوشیار رہتا ہے گویا وہ کپڑے اتارے ہوئے ہے اس کے برعکس کاہل سست اور ناتوان آدمی کو مُتَدَثِّرٌ مُتَزَمِّلٌ اور زُمَیْلٌ وغیرہ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا ہوا ہے اور السَّارِیَۃُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو رات کو سفر کرتی ہو اور اس کے معنیٰ رات کے بادل اور ستون بھی آتے ہیں۔

(س ط ح)

اَلسَّطْحُ: مکان کے اوپر کے حصے، یعنی چھت کو کہتے ہیں اور سَطَحْتُ الْبَیْتَ کے معنیٰ چھت ڈالنے کے ہیں۔ لیکن سَطَحْتُ الْمَکَانَ کے معنیٰ کسی جگہ کو چھت کی طرح ہموار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ (۸۹-۲۰) اور زمین کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی۔

اِنْسَطَحَ الرَّجُلُ کے معنیٰ چت لیٹنے کے ہیں اور (بنی ذنب کے) ایک کاہن کا نام سَطِیْحٌ مشہور ہو گیا تھا کیونکہ وہ زمانت (کی مرض میں مبتلا ہونے) کے باعث زمین پر پڑا رہتا تھا۔

اَلْمِسْطَحُ: خیمہ کا ستون جس پر خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔

سَطَحْتُ الثَّرِیْدَۃَ فِی الْقَصْعَۃِ: میں نے پیالہ میں ثرید کو پھیلایا۔

(س ط ر)

اَلسَّطْرُ وَالسَّطَرُ: قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب کی ہو یا درختوں اور آدمیوں کی۔ اور سَطَرَ فُلَانٌ کَذَا کے معنیٰ ایک ایک سطر کر کے لکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ﴾ (۶۸-۱) ن، قلم کی اور جو اہل قلم لکھتے ہیں اس کی قسم۔

﴿وَکِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ (۵۲-۲) اور کتاب جو لکھی ہوئی ہے۔

﴿کَانَ ذَالِكَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا﴾ (۳۳-۶)

یہ حکم کتاب (یعنی قرآن پاک) میں لکھ دیا گیا ہے۔یعنی محفوظ اور ثابت ہے۔

اور سَطْرٌ کی جمع اَسْطُرٌ وَسُطُوْرٌ وَاَسْطَارٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۲۷) اِنّـِیْ وَاَسْطَارِ سُطِرْنَ لَنَا سَطْرًا

یعنی قسم ہے قرآن کی سطروں کی کہ میں......اور آیت ہے:

﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۶۔۲۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ میں مبرد نے کہا ہے کہ یہ اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے جیسے اُرْجُوحَۃٌ کی جمع اَرَاجِیْحٌ اور اُثْفِیَۃٌ کی جمع اَثَافِیٌّ اور اُحْدُوثَۃٌ کی جمع اَحَادِیْثُ آتی ہے۔

اور آیت:

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۱۶۔۲۴) اور جب ان (کافروں سے) کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے۔تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔

یعنی انہوں نے بزعم خود یہ کہا ہے کہ یہ جھوٹ موٹ کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا﴾ (۲۵۔۵) (اور کہتے ہیں کہ یہ) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے وہ صبح وشام ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔اور آیت:

﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُسَیْطِرٍ﴾ (۸۸۔۲۱،۲۲) تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

میں لفظ مُسَیْطِرٍ اور اسی طرح آیت:

﴿اَمْ هُمُ الْمُسَیْطِرُوْنَ﴾ (۵۲۔۳۷) یا یہ (کہیں کے) داروغہ ہیں۔

میں مُسَیْطِرُوْنَ، تَسَیْطَرَ فُلَانٌ عَلٰی كَذَا وَسَیْطَرَ عَلَیْهِ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس پر سطر کی طرح سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں۔پس آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم ان پر (نگہداشت کے لئے) مقرر نہیں ہو۔اور یہاں مُسَیْطِرٌ کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران (ونگہبان) ہے۔

میں قَآئِمٌ کا۔اور آیت:

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِحَفِیْظٍ﴾ میں حفیظ کا لفظ ہے۔ بلکہ بعض نے تو آیت: ﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُسَیْطِرٍ﴾ کے معنیٰ ہی ﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِحَفِیْظٍ﴾ کئے ہیں لہٰذا مُسَیْطِرٌ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

---

❶ قاله رؤبة بن العجاج وتمامه : القائل یانصر نصراً والشطر فی الخزانة (۲ : ۱۹) وفی الشطر الثانی بحث قرءوه علی ثلاثة اوجه وفی الباب للصاغانی و (بالصاد المهملة) مصحف والصواب المعجمة وهواسم الحاجب وتبعه صاحب القاموس لیكنه خطأ والبیت من شواهد الكشاف ۵۲ والطبری (۲۹۔۱۸) ومجازالقران لابی عبیدة (۲ : ۲۳۰۔۴۶۴) وفی روایة وایات بدل واسطا والشنتمری (۱ : ۳۰۴) والسیوطی ۷۴ ودیوانه ۱۷۴ (ط لیبسك) واللسان والصحاح سطر والرجز مما استشهد به النحویون توابع المنادی انظر السیوطی وابن یعیش فی شرح المفصل وابن لیعون فی شرح ابیات الایضاح وحاشیة امیر علی المغنی (۲ : ۵۱) والدسوقی (۲ : ۴۶) والشذ ور ۴۳۷ وابن هشام رقم ۷۲۷.

﴿وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔
میں کتابت کا لفظ ہے اور یہ کتابت وہی ہے جو کہ آیت:
﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذَالِكَ فِيْ كِتَابٍ اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے خدا اس کو جانتا ہے یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب کچھ آسان ہے۔ میں مذکور ہے۔

(س ط و)

اَلسَّطْوَةُ: (تعدیہ بواسطہ باء) کے معنی کسی کو سختی سے پکڑنے کے ہیں۔ جیسے سَطَابِہٖ (ن) اس کو سخت پکڑا یا اس پر حملہ کیا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا﴾ (۲۲۔۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان پر حملہ کردیں۔ یہ اصل میں سَطَاالْفَرَسُ (ن) عَلَى الرَّمْكَةِ سے مشتق ہے جس کے معنی نر گھوڑے کے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اپنی مادہ پر چڑھ جانے کے ہیں خواہ بوجہ نشاط کے ہو یا جفتی کی غرض سے۔ اسی طرح سَطَا الرَّاعِيْ عَلَى النَّاقَةِ کے معنی چرواہے کے اونٹنی کے فرج میں ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکالنے کے ہیں۔ [1]
پھر استعارہ کے طور پر طَغْوٌ کی طرح سَطْوَةٌ کا لفظ بھی پانی کی زیادتی پر بولا جاتا ہے اور طَغَى الْمَاءُ وَسَطَا کے معنی پانی کی طغیانی میں آجانے کے ہیں۔

(س ع د)

اَلسَّعْدُ وَالسَّعَادَةُ: (خوش نصیبی) کے معنی ہیں حصول خیر میں امور الٰہیہ کا انسان کے لئے ممد اور معاون ہونا۔ اس کی ضد شَقَاوَةٌ (بدبختی) ہے سَعِدَ (لازم کے معنی نیک بخت ہونے اور اَسْعَدَهُ اللّٰهُ کے معنی نیت بخت کرنے کے ہیں۔ سَعِيْدٌ (نیک بخت) جمع سُعَدَاءُ) اور سب سے بڑی سعادت مندی جنت میں جانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں فرمایا:
﴿وَاَمَّاالَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ﴾ (۱۱۔۱۰۸) اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں (داخل کئے جائیں گے۔
اور فرمایا:
﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۵) پھر ان میں سے کچھ بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔
اَلْمُسَاعَدَةُ: (کارخیر میں مدد کرنا) کے معنی ایسے کام میں معاونت کے ہیں جس میں سعادت کا گمان ہو۔ اور لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ سعادت بخشے اور تمہاری مساعدت فرمائے۔ لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔
اَلْاِسْعَادُ: خاص کر نوحہ خوانی میں کسی کی مدد کرنا۔
جیسے محاورہ ہے:
اِسْتَسْعَدْتُهٗ فَاَسْعَدَنِيْ: میں نے اس سے مدد مانگی تو اس نے میری مدد کی۔
اَلسَّاعِدُ: کلائی یا بازو کو کہتے ہیں (کیونکہ انسان دفاع اسی کے زور سے کرتا ہے تو) گویا اس میں مُسَاعَدَةٌ کے

---

[1] وفي الحديث لابأس ان يسطُوالرجل على المرئة اذاخيف عليها و لم توجد امرأة تعالجها (النهاية).

معنیٰ پائے جاتے ہیں اسی بنا پر پرند کے بازوں کو سَاعِدَیْنِ کہا جاتا ہے جیسا کہ (معنیٰ قوت کے لحاظ سے) انہیں یَدَیْنِ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اَلسَّعْدَانَةُ: ایک خاردار گھاس جس کے کھانے سے اونٹنی کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔اسی لئے مثال مشہور ہے۔ ❶ مَرْعیً وَلَا کَالسَّعْدَانَةِ کہ گھاس تو ہے لیکن سَعدانۃ کی سی نہیں۔اَلسَّعْدَانَة کے معنیٰ کبوتر، تسمہ کی گرہ اور اونٹ کے سینہ کے بھی آتے ہیں۔اور سَعُوْدُ الْکَوَاکِبِ مشہور دس ستارے ہیں جن میں سے ہر ایک کو سَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

(س ع ر)

اَلسَّعْرُ: کے معنیٰ آگ بھڑکنے کے ہیں۔اور سَعَرْتُ النَّارَ وَاَسْعَرْتُهَا کے معنیٰ آگ بھڑکانے کے۔مجازاً لڑائی وغیرہ بھڑکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔جیسے اِسْتَعَرَا لْحَرْبُ: لڑائی بھڑک اٹھی اِسْتَعَرَ اللُّصُوصُ: ڈاکو بھڑک اٹھے۔یہ اِشْتَعَلَ کے ہم معنیٰ ہے اور نَاقَةٌ مَسْعُوْرَةٌ کے معنیٰ دیوانی اونٹنی کے ہیں جیسے مُوقَدَةٌ وَمُهَيَّجَةٌ کا لفظ اس معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

اَلْمِسْعَرُ: آگ بھڑکانے کی لکڑی (کہرنی) لڑائی بھڑکانے والا۔

اَلسُّعَارُ: آگ کی تپش کو کہتے ہیں اور سَعَرَ الرَّجُلُ کے معنیٰ آگ یا گرم ہوا سے جھلس جانے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾ (۴-۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ﴾ (۸۱-۱۲) اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔

﴿عَذَابُ السَّعِيرِ﴾ (۶۷-۵) دہکتی آگ) کا عذاب (تیار کر رکھا ہے۔

تو یہاں سَعِيرٌ بمعنیٰ مَسْعُوْرٌ ہے۔

نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَّ سُعُرٍ﴾ (۴۷-۵۴) بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

السُّعْرُ کے معنیٰ مروجہ نرخ کے ہیں اور یہ استعارہ النار (آگ کا بھڑکنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

(س ع ی)

اَلسَّعْیُ: تیز چلنے کو کہتے ہیں اور یہ عَدْوٌ (سرپٹ دوڑ) سے کم درجہ (کی رفتار) ہے) (مجازاً) کسی اچھے یا برے کام کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ (۲-۱۱۴) اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔

﴿نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ﴾ (۶۶-۸) (بلکہ)

---

❶ انظر للمثل الكامل (۹-۱۰) كالسعدان بدون الهاء قال الشاعر: ماءٌ والاكصداء مرعیً ولا كالسعدان يضرب للشیء الذی فيه فضل وغيره افضل اول من قال ذالك خنساء بنت عمرو بن الشريد وحكی انه لامرئة من طيی تزوجها امرؤ القيس (لا) حجر الكندی انظر المثل والقصة الميدانی رقم ۳۸۳۷ و۳۸۴۳ والسمط ۳۶۴ والفاخر رقم ۱۲۱ والعسكری ۱۸۷ ۲/۲۰۲ والضبی ۵۴، ۶۹ والالفاظ ۵۵۷ والنويری ۳: ۵۱ والمستقصی ۱۲.

ان کا نور (ایمان) ان کے آگے...... چل رہا ہوگا۔

﴿وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا﴾ (۵۔۳۳) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں۔

﴿وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ فَسَادًا﴾ (۲۔۲۰۵) اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں (فتنہ انگیزی کرنے کے لئے) دوڑتا پھرتا ہے۔

﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی﴾ (۵۳۔۳۹،۴۰) اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

﴿وَاَنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی﴾ (۹۲۔۴) تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔

﴿وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ کَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْکُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۹) اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

﴿فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

لیکن اکثر طور پر سَعْیٌ کا لفظ افعال محمودہ میں استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۲۸) اِنْ اَجْزِ عَلْقَمَةَ بْنَ سَیْفِ سَعْیَهٗ
لَا اَجْزِهٖ بِبَلَآءِ یَوْمٍ وَاحِدٖ

اگر میں علقمہ بن سیف کو اس کی مساعی کا بدلہ دوں تو اک دن کے حسن کردار کا بدلہ نہیں دے سکتا اور قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ﴾ (۳۷۔۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے اور مناسک حج میں سَعْیٌ کا لفظ صفا اور مروہ کے درمیان چلنے کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور سِعَایَة کے معنیٰ خاص کر چغلی کھانے اور صدقہ وصول کرنے کے آتے ہیں اور مُکَاتَبْ غلام کے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے مال کمانے پر بھی سِعَایَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مُسَاعَدَةٌ کا لفظ فسق و فجور اور مَسْعَادَةٌ کا لفظ اچھے کاموں کے لئے کوشس کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ﴾ (۲۲۔۵۱) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں اپنے زعم باطل میں ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی۔ میں سعی کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات میں ہمارے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کر ڈالی۔

(س غ ب)

اَلْمَسْغَبَةُ: (س ن) بھوک۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۴) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔

میں مَسْغَبَةٌ سَغَبٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ بھوک سے درماندہ ہوجانے کے ہیں اور پیاس سے نڈھال ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے: سَغَبَ

---

❶ قاله الغدكي فى مدح علقمة بن سيف العتابى و للشعر قصة انظر التبريزى والبيت فى الحماسة (۲: ۲۶۷) والمرزوقى رقم ۶۷۹ واللسان (لمم) والبيان (۳: ۱۳۸) والمعجم للمرزبانى والبيت معزو للمرناق الطائى وفى المطبوع بن سعد والتصحيح من البيان وشرح الحماسة والبيت ايضاً فى الحيوان (۳: ۴۶۷) فى ثلاثة ۱۲.

(س) سَغَبًا وَسُغُوْبًا وَهُوَ سَاغِبٌ اور صفت کا صیغہ سَغْبَانٌ مثل عَطْشَانٌ بھی آتا ہے۔

(س ف ر)

اَلسَّفْرُ: اصل میں اس کے معنیٰ "کشف غطاء یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں اور یہ اَعْیَان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے سَفَرَ الْعِمَامَةَ عَنِ الرَّأْسِ: اس نے سر سے عمامہ اتار دیا۔ سَفَرَ عَنِ الْوَجْهِ: چہرہ کھولا اور سَفْرُ الْبَیْتِ کے معنیٰ گھر میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے ہیں اور جھاڑو کو مِسْفَر اور اس گرد وغبار کو سَفِیْر کہا جاتا ہے جو جھاڑو دے کر دور کی جاتی ہے۔

اَلْاِسْفَارُ: (افعال) یہ الوان کے ساتھ مختص ہے یعنی کسی رنگ کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ﴾ (۷۴۔۳۴) اور قسم ہے۔ صبح کی جب روشن ہو۔ اور فرمایا:

﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ﴾ (۸۰۔۳۸) کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔

اور حدیث [1]

(۱۷۶) اَسْفِرُوْا بِالصُّبْحِ تُؤجَرُوا: صبح خوب روشن ہونے کے بعد نماز پڑھا کرو تو زیادہ ثواب ملے گا۔ میں اَسْفِرُوْا اَسْفَرْتُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ روشنی میں داخل ہونے کے ہیں۔ جیسے اَصْبَحْتُ (میں صبح میں داخل ہوا)

سَفَرَ الرَّجُلُ: اس نے سفر کیا اور سَافَرَ (مسافر) کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ جیسے رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ (وعلی ہذا القیاس)

اور سَافَرَ کے معنیٰ ہیں "اس نے سفر کیا" یہ خاص کر باب مفاعلہ سے آتا ہے گویا اس میں جانبین یعنی وطن اور آدمی کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنیٰ کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور سَفَرٌ سے ہی سُفْرَةٌ کا لفظ مشتق ہے جس کے معنیٰ طعام سفر یا توشہ دان ہیں جس میں سفری کھانا رکھا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ﴾ (۴۔۴۳) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

اَلسِّفْرُ: اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی ہے اس کی جمع اَسْفَارٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (۶۲۔۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

یہاں مُمَثَّلٌ بِهٖ میں خصوصیت کے ساتھ اَسْفَارَ کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تورات اگرچہ اپنے مضامین کو محقق طور پر بیان کرتی ہے لیکن جاہل (یہود) پھر بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ لہٰذا ان کی مثال بعینہٖ اس گدھے کی سی ہے جو علم وحکمت کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور آیت: ﴿بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰۔۱۵۰،۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار نیکوکار ہیں۔ میں سَفَرَة سے مراد وہ

---

[1] کذا رواہ الشافعی فی اختلاف الحدیث (۲۰۷) والمعروف من الفاظ الحدیث اسفر وابالفجر فانہ اعظم للاجر من حدیث رافع بن خدیج رواہ الترمذی والشافعی فی الرسالۃ رقم ۴۷۳ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۶۴ ـ ۲۶۵ وفی ۲۶۳ اصبحوابالصبح .

فرشتے ہیں جنہیں دوسری جگہ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾ (۸۲۔۱۱) (عالی قدر لکھنے والے۔) کہا ہے اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے۔ جیسے كَاتِبٌ کی جمع كَتَبَةٌ۔

اَلسَّفِيْرُ: اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو مُرْسِلٌ کی غرض کو مُرْسَلُ اِلَيْهِ پر کھولتا اور فریقین سے منافرت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ فَعِيْلٌ بمعنیٰ فاعل سے ہے اور سِفَارَةٌ بمعنیٰ رسالت آتا ہے پیغمبر، فرشتے اور (سماوی) کتابیں لوگوں پر حقائق کی کشادگی کرنے میں باہم شریک ہیں (اس لئے ان سب کو سَفِيْرٌ کہہ سکتے ہیں۔) اور سَفِيْرٌ (فعیل) بمعنیٰ مفعول ہو تو اس کے معنیٰ کوڑا کرکٹ کے ہوتے ہیں۔ جو جھاڑو دے کر صاف کردیا جاتا ہے۔ اور شاعر کے قول ❶

(۲۲۹) وَمَا السِّفَارُ قُبِّحَ السُّفَارِ

میں بعض نے سِفَار کے معنیٰ اس لوہے کے کئے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالا جاتا ہے اور اس معنیٰ پر اگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہ سَافَرْتُ (مفاعلہ) کا مصدر بھی ہوسکتا ہے۔ ❷

(س ف ع)

اَلسَّفْعُ: کے معنیٰ گھوڑے کو سوار ناصیۃ یعنی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ (۹۶۔۱۵) تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

اور سیاہی کے معنیٰ کے اعتبار سے چولہے کے پتھروں (اَثَافِيٌّ) کو بھی سُفْعٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے: بِهٖ سُفْعَةُ غَضَبٍ اس کے چہرہ پر غصے کا اثر ہے کیونکہ سخت غصہ کے وقت چہرہ کا رنگ دخانی سا ہو جاتا ہے۔ اور شکرے کو اَسْفَعُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پردوں میں سیاہ چمک سی پائی جاتی ہے۔ اور اِمْرَأَةٌ سَفْعَاءُ اللَّوْنِ سیاہ رنگ عورت کو کہتے ہیں۔

(س ف ک)

اَلسَّفْكُ (ض) کے معنیٰ خون ریزی کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (۲۔۳۰) اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

(س ف ل)

اَلسُّفْلُ یہ عُلُوٌّ کی ضد ہے اور سَفُلَ (سُفُوْلًا) فَهُوَ سَافِلٌ کے معنیٰ پست اور حقیر ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ (۹۵۔۵) پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کردیا۔

نیز فرمایا:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ (۹۔۴۰) اور کافروں کی بات کو پست کردیا۔

کبھی اَسْفَلُ "فَوْقٌ" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتا

---

❶ لم اجده .

❷ کماقال حسان رضی اللہ عنہ : لولاالسفار وبعده خرق مهمه ۔لترکتها تحبوعلی العرقوب وقول الاخطل یؤید قول البعض وموقع اثر السفار بخطمه من سود عقة اوبنی الجوال ۱۲۔

ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ﴾ (۳۳۔۸) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر (چڑھ) آئے۔

سُفَالَةُ الرِّيْحِ: ہوا کی بائیں جانب یعنی جدھر کو چل رہی ہو۔اس کی ضد عُلَاوَةٌ ہے جس کے معنیٰ اوپر کی جانب کے ہیں یعنی جس طرف سے آ رہی ہو۔

اَلسِّفْلَةُ: کمینے لوگ۔جیسے دُوْنٌ۔

اَمْرُهُمْ فِيْ سَفَالٍ: ان کا معاملہ انحطاط میں ہے یعنی ان کی حالت دگرگوں ہے۔

(س ف ن)

اَلسَّفْنُ: اس کے اصل معنیٰ چوب اور چمڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں۔اور سَفَنَ الرِّيْحُ التُّرَابَ عَنِ الْاَرْضِ کے معنیٰ ہیں، ہوا نے زمین سے مٹی کو گھس ڈالا۔شاعر نے کہا ہے۔❶

(۲۳۰) فَجَاءَ خَفِيًّا يَسْفِنُ الْاَرْضَ صَدْرُهٗ

وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا۔اور تراشی ہوئی چیز کو سِفْنٌ (فعل بمعنیٰ مفعول) کہتے ہیں جیسے نِقْضٌ بمعنیٰ منقوض آ جاتا ہے اور اَلسَّفْنُ خاص کر اس کھردرے چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو تلوار کے قبضہ پر لگاتے ہیں اور چوب تراشی کے اوزار کو بھی سَفَنٌ کہا جاتا ہے۔جیسے تیشہ وغیرہ۔اور چھیلنے کے معنیٰ کے لحاظ سے کشتی کا نام سَفِيْنَةٌ رکھا گیا ہے۔کیونکہ وہ بھی سطح آب کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمَّا السَّفِيْنَةُ﴾ (۱۸۔۷۹) لیکن کشتی پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سَفِيْنَةٌ کہا جاتا ہے۔

(س ف ہ)

اَلسَّفَهُ: اس کے اصل معنیٰ جسمانی ہلکا پن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زِمَامٌ سَفِيْهٌ کہا جاتا ہے اور ثَوْبٌ سَفِيْهٌ کے معنیٰ ردی کپڑے کے ہیں۔پھر اس سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ❷ جو اصل میں سَفِهَ نَفْسُهٗ ہے پھر اس سے فعل کی نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے۔جیسے بَطِرَ مَعِيْشَتَهٗ کہ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيْشَتُهٗ ہے۔❸

اور سَفَهٌ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دینوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ﴾ (۴۔۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال......مت دو۔

---

❶ قاله امرء القيس يصف رَبيئًا يسفن اى يمسح وعجزه : ترى الترب منه لاصقاً كل ملصق والبيت فى اللسان (سفن) وديوانه ۹۰ (صنعة السندوبى) والعقد الثمين ۱٤۱ والمعانى الكبير ۷۷۷ ومختار الشعرالجاهلى (۱ : ٦۱) ونقدالشعرا (٥٦) وفيه لازقا كل ملزق وحضيا(بالمهملة) والبيت ايضاً فى تهذيب اصلاح المنطق (۱ : ۹۷) وفى الاصلاح ٥٤۰ ويروىٰ لبعض الطائيين ۱۲.

❷ وفى الاية (۲ : ۱۳۰) الامن سفه نفسه .

❸ وفيه اختلاف قال المبرد انه متعدبنفسه فلاتاويل كماورد فى الحديث الكبير ان تسفه الحق وعند البعض منصوب على التمييز كما ذَهَبَ اليه المؤلف راجع الكشاف .

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْھُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا﴾ (۷۲۔۴) اور یہ کہ ہم میں سے بعض بے وقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ﴾ (۲۔۱۳) تو کہتے ہیں کیا اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟

میں ان کو سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سُفَھَآءُ کہنا بنا برحماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔ اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿سَیَقُوْلُ السُّفَھَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰھُمْ عَنْ قِبْلَتِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْھَا﴾ (۲۔۱۴۲) احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے چلے آتے تھے) اب اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔

(س ق ر)

سَقَرٌ: (جہنم) یہ اصل میں سَقَرَتْہُ الشَّمْسُ وَصَقَرَتْہُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں اسے دھوپ نے جھلس دیا اور پگھلا دیا۔ پھر جہنم کا علم بن گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ﴾ (۷۴۔۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۵۴۔۴۸) اب آگ کا مزہ چکھو۔

پھر چونکہ سَقَرٌ اپنے اصل کے لحاظ سے جھلسا دینے کے معنیٰ کو مقتضی ہے اس لئے آیات:

﴿وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَۃٌ لِّلْبَشَرِ﴾ (۷۴۔۲۷ تا ۲۹) اور تم کیا سمجھتے ہو کہ سقر کیا ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی اور بدن کو جھلس کر سیاہ کر دے گی۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سقر کے جو احوال تم مشاہدہ سے جانتے ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔

(س ق ط)

اَلسُّقُوْطُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کے اوپر سے نیچے جھک جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا﴾ (۵۲۔۴۴) اور اگر یہ آسمان (سے عذاب) کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔

﴿فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۶۔۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا گراؤ۔

اور اس کے معنیٰ قدر و قیمت اور مرتبہ کے لحاظ سے گر جانا بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے۔

اَلسَّقَطُ وَالسُّقَاطَۃُ: ناکاری اور ردی چیز کو کہتے ہیں اور اسی سے رَجُلٌ سَاقِطٌ ہے جس کے معنیٰ کمینے آدمی کے ہیں۔ اَسقَطَہٗ کَذَا: فلاں چیز نے اس کو ساقط کر دیا۔

اور اَسْقَطَ الْمَرْئَۃُ: (عورت نے ناتمام حمل گرا دیا) میں اوپر سے نیچے گرنا اور ردی ہونا دونوں معنیٰ اکٹھے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اَسْقَطَتِ الْمَرْأَۃُ: اس وقت بولتے

ہیں جب عورت ناتمام بچہ گرادے اور اسی سے ناتمام بچہ کو سَقْطٌ یاسِقْطٌ کہا جاتا ہے۔پھراس کے ساتھ تشبیہ دے کر چقماق کی ہلکی سی (ناقص) چنگاری کو سِقْطُ الزَّنْدِ کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی اس کے ساتھ بچہ کو بھی موسوم کیا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيْدِيْهِمْ﴾ (۷۔۱۴۹)اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں پشیمان ہونا مراد ہے۔[1] اور آیت:

﴿تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ (۹۔۲۵)تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

میں ایک قرأت تَسَّاقَطْ بھی ہے اور اس کا فاعل نَخْلَةٌ ہے اور ایک قرأت میں تَسَاقَطْ ہے جو اصل میں تَتَسَاقَطُ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس میں ایک تاء محذوف ہے اس صورت میں یہ باب تفاعل سے ہوگا اور یہ اگر چہ فَاعَلَ کا مطاوع آتا ہے لیکن کبھی متعدی بھی ہوجاتا ہے۔اور ایک دوسری قرأت میں يَسَّاقَطْ (صیغہ مذکر) ہے اس صورت میں اس کا فاعل جِذْعٌ ہوگا۔[2]

(س ق ف)

سَقْفُ الْبَيْتِ: مکان کی چھت کو کہتے ہیں اس کی جمع سُقُفٌ ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ﴾ (۴۳۔۲۳)(ہم) ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنادیتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ﴾ (۵۲۔۵)اور اونچی چھت کی (قسم) میں مراد آسمان ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ (۲۱۔۳۲) میں آسمان کو محفوظ چھت فرمایا ہے۔

اور ہر وہ جگہ جو مُسَقَّفٌ ہو اسے سقیفہ کہا جاتا ہے۔جیسے صُفَّةٌ (چبوترہ) مکان وغیرہ۔

اور چھت کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس لمبی چیز کو جس میں خم سا پایا جائے سَقْفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(س ق م)

اَلسَّقَمُ وَالسُّقْمُ: خاص کر جسمانی بیماری کو کہتے ہیں۔بخلاف مَرَضٌ کے کہ وہ جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ (۲۔۱۰)ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا۔اور آیت:

﴿فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ (۳۷۔۸۹)اور کہا میں تو بیمار ہوں۔میں سَقِيْمٌ کا لفظ یا تو تعریض کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یہ زمانہ ماضی یا مستقبل کی طرف اشارہ کے لئے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس ہلکی سی بدنی تکلیف کی طرف اشارہ ہو جو اس وقت ان کو عارض تھی۔کیونکہ انسان بہر حال کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتا ہے اگر چہ وہ اسے محسوس نہ کرے اور خوف ناک جگہ کو مَكَانٌ سَقِيْمٌ کہا جاتا ہے۔

(س ق ی)

اَلسَّقْيُ وَالسُّقْيَا کے معنیٰ پینے کی چیز دینے کے

---

[1] راجع (یدی).
[2] راجع للقرائات التاج (سقط).

ہیں۔اور اِسْقَاءٌ کے معنیٰ پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تاکہ حسبِ منشا لے کر پی لے لہٰذا اِسْقَاء بنسبت سَقْیٌ کے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اِسْقَاء میں مَاسَقیٰ مِنْہُ کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمالے۔مثلاً: اَسْقَیْتُہٗ نَھرًا کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔چنانچہ قرآن پاک سَقْیٌ کے متعلق فرمایا:

﴿وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

﴿وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

﴿وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ﴾ (۸۲۔۲۶) اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور اِسْقَاء کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَسْقَیْنَاکُمْ مَاءً فُرَاتًا﴾ (۷۷۔۲۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

﴿فَاَسْقَیْنَاکُمُوْہُ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ میں:

﴿نُسْقِیْکُمْ مِمَّا فِیْ بُطُوْنِھَا﴾ (۲۳۔۲۱) (کہ) جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں۔میں ایک قرأت فتحہ نون کے ساتھ بھی ہے۔

سِقْیٌ کے معنیٰ پانی کا حصہ اور سیراب شدہ زمین دونوں آتے ہیں کیونکہ سِقْیٌ بمعنیٰ مَسْقِیٌّ (اسم مفعول) کے ہے۔جیسے نِقْضٌ بمعنیٰ مَنْقُوضٌ ہے۔اور یہ دونوں چیزیں بھی مفعول بنتی ہیں اس لئے سِقْیٌ کا لفظ ان دونوں چیزوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِسْتِسْقَاءُ کے معنیٰ کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی﴾ (۲۔۶۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے (اللہ سے) پانی مانگا۔

اَلسِّقَاءُ: (مشکیزہ) وہ برتن جس میں پینے کی چیز رکھی جائے اسی سے ہے: اَسْقَیْتُكَ جِلْدًا کہ میں نے تمہیں (مشکیزہ بنانے کے لئے چمڑا دیا) اور آیت کریمہ:

﴿جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ﴾ (۱۲۔۷۰) (تو) اپنے بھائی کے شلیتے میں پینے کا برتن رکھ دیا۔

میں سِقَایَةٌ سے مراد وہی ہے جسے (بعد کی آیت میں) صُوَاعَ الْمَلِكِ کہا گیا ہے اس ایک ہی برتن کے یہ دو نام دو اعتبار سے ہیں یعنی اس کے ساتھ پانی پینے کے لحاظ سے اسے سِقَایَةٌ کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے ساتھ غلہ ماپا جاتا ہے سے صُوَاع کہہ دیا ہے۔

(س ک ب)

مَاءٌ مَسْكُوْبٌ کے معنیٰ بہائے ہوئے پانی کے ہیں۔[1]

اور تیز رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ سَکْبٌ الْجَرْیِ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے: سَکَبْتُہٗ فَانْسَکَبَ: میں نے اسے بہایا تو وہ بہہ پڑا اور دَمْعٌ (آنسوؤں) کو بصورت فاعل تصور کر کے۔سَاکِبٌ (بہنے والے) کہا جاتا ہے اور کبھی دَمٌ مُنْسَکِبٌ بھی بولتے ہیں اور باریک کپڑے کو بھی سیال چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَوبٌ سَکْبٌ کہہ دیتے

[1] وفی القران وماء مسكوب (٥٦۔٣١)۔

ہیں گویا وہ بہتا ہوا پانی ہے۔

(س ک ت)

اَلسُّکُوتُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ تو ترکِ کلام یعنی خاموش ہونے کے ہیں۔ اور بہت زیادہ چپ رہنے والے آدمی کو رَجُلٌ سِکِّیْتٌ وَسَاکُوتٌ کہا جاتا ہے اور سَکْتَۃٌ یا سُکَاتٌ مرض سکتہ کو کہتے ہیں اور موسیقی میں سَکْتٌ کا لفظ سکون نفس کے ساتھ مخصوص ہے اور افتتاح صلوٰۃ کی حالت اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد سکوت کرنے کو سَکَتَاتٌ فِی الصَّلٰوتِ کہا جاتا ہے۔

اَلسُّکَّیْتُ: دوڑ میں سب سے آخر آنے والا گھوڑا۔ پھر چونکہ سُکُوْتٌ میں ایک گونہ سکون پایا جاتا ہے۔ اس لئے آیت:

﴿وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ﴾ (۷۔۱۵۴)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا۔

میں بطور استعارہ غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَکَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(س ک ر)

اَلسُّکْرُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اس کا نام استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے اور کبھی شدت غضب یا غلبۂ عشق کی کیفیت کو سُکر سے تعبیر کر لیا جاتا ہے اسی لئے شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۳۱) سُکْرَانِ سُکْرَ هَوًی وَسُکْرَ مُدَامٍ

نشے دو ہیں ایک نشۂ محبت اور دوسرا شراب۔

اور اسی سے سَکَرَاتُ الْمَوتِ (موت کی بے ہوشی) ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۱۹)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہوگئی۔

اَلسَّکَرُ: (بفتح السین والکاف) نشہ آور چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا......﴾ (۱۶۔۶۷) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق (کھاتے ہو)

اور شراب سے انسان اور اس کی عقل کے درمیان بھی چونکہ دیوار کی طرح کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار سے سَکْرٌ کے معنیٰ پانی کو بند لگانے اور روکنے کے آجاتے ہیں اور اس بند کو جو چوری روکنے کے لئے لگایا جائے سِکْرٌ کہا جاتا ہے۔ (یہ فعل بمعنیٰ مفعول ہے) اور آیت:

﴿اِنَّمَا سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا......﴾ (۱۵۔۱۵) کہ ہماری آنکھیں مخمور ہوگئی ہیں۔ میں سُکِّرَتْ بعض کے نزدیک سُکْر سے ہے اور بعض نے سَکْر سے لیا ہے اور پھر سِکْر سے سکون کے معنیٰ لے کر پرسکون بات کو لَیْلَۃٌ سَاکِرَۃٌ کہا جاتا ہے۔

(س ک ن)

اَلسُّکُوْنُ: (ن) حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سُکُوْنٌ کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَکَنَ فُلَانٌ مَکَانَ کَذَا کے معنیٰ ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار

[1] وتمامه: فمتٰی یفیق فتیً به سُکْرَان والبیت فی الرسالة بغیرعزو وفی المطبوع مدام بغیر هاء ۱۲.

سے جائے رہائش کو مَسْـكَـنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَسَاكِنُ آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا يُرَىٰٓ اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ......﴾ (۴۶۔۲۵) کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔
اور فرمایا:
﴿وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۶۔۱۱۳) اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔
﴿وَلِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾ (۲۸۔۷۳) تاکہ تم اس میں آرام کرو۔
تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سَـكَّـنْتُـهٗ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اَسْكَنْتُهٗ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (۱۴۔۳۷) اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد...... لا بسائی ہے۔
﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (۶۵۔۶) (مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو۔ اور آیت:
﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ﴾ (۲۳۔۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے ساتھ پانی نازل کیا۔ پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔ میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وجود میں لانے اور پھر ایجاد کے بعد اس کے نابود کردینے پر قادر ہے (جیسا کہ آیت کے تتمہ: ﴿وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے) اَلسَّكَنُ کے معنی سُكُوْنٌ کے ہیں

اور ہر وہ چیز جس سے راحت حاصل ہو اسے "سَكَنٌ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ (۱۶۔۸۰) اور خدا ہی نے تمہارے لیے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔ اور فرمایا:
﴿اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۱۰۳) تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔
﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ (۶۔۹۷) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام ٹھہرایا۔
اور سَكَنٌ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سکون حاصل کیا جاتا ہے۔
اَلسُّكْنٰى: کسی کو بغیر کرایہ کے رہائش کے لئے جگہ دینے کو سُكْنٰى کہا جاتا ہے اور ایک مکان میں رہنے والے لوگوں کو سَكْنٌ کہا جاتا ہے یہ سَاكِنٌ کی جمع ہے جیسے سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سَاكِنٌ کی جمع سُكَّانٌ (بضمہ سین) آتی ہے اور سَكَّانٌ (بفتحہ سین) کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کشتی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔
اَلسِّكِّيْنُ: (چھری) کو سکین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کردیتی ہے (تو یہ سکون سے فِعِّيْلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے) اور آیت:
﴿اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۴) (وہی تو ہے) جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ سَكِيْنَةٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کے دل کو تسکین دیتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المؤمنین

(حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے (اِنَّ السَّکِیْنَۃَ لَتَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ) (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سَکِیْنَۃٌ گویا ہے اور بعض نے اس سے عقلِ انسانی مراد لی ہے اور عقل کو بھی جب کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہونے سے روک دے سَکِیْنَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ......﴾ (۱۳۔۲۸)

اور جن کے دل یادِ خدا سے آرام پاتے ہیں۔ بھی اس معنیٰ پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَۃٌ اور سَکَنٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی رعب اور خوف کا زائل ہونا۔ اور آیت

﴿اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾

(۲۔ ۲۴۸) کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی ہوگی۔

میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں اور بعض مفسرین نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ وہ چیز تھی جس کا سر بلی کے سر کے مشابہ تھا وغیرہ تو ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ ❶

اَلْمِسْکِیْنُ: بعض نے اس کی تفسیر مَنْ لَّا شَیْءَ لَہٗ (یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) کے ساتھ کی ہے۔ اور یہ فقیر سے ابلغ ہے (یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ نادار ہوتا ہے) لیکن آیت:

﴿وَاَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ﴾ (۱۸۔۷۹)

اور کشتی غریب لوگوں کی تھی۔

میں (باوجود کشتی کا مالک ہونے کے) انہیں مسکین قرار دینا مَایَؤُوْلُ کے لحاظ سے ہے یعنی کشتی کے چلے جانے کے بعد کی حالت کے لحاظ سے انہیں مسکین کہا گیا ہے۔ یا اس لئے کہ ان کی احتیاج اور مسکنت کے مقابلہ میں کشتی کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی۔ اور آیت:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ﴾ (۲۔۶۱)

(اور آخر کار) ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔

میں اصح قول کے لحاظ سے مَسْکَنَۃٌ کی میم زائد ہے (اور یہ سکون سے ہے)

(س ل ل)

سَلُّ (ن) الشَّیْءِ مِنَ الشَّیْءِ کے معنیٰ ایک چیز کے دوسری سے کھینچ لینے کے ہیں، جیسے تلوار کا نیام سے سونتنا، یا گھر سے کوئی چیز چوری کھسکا لینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴۔۶۳) جو تم میں سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں۔

اسی مناسبت سے باپ کے نطفہ پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ......﴾ (۳۲۔۸)

خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی۔

وہ ہر جوہر جو غذا کا خلاصہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بطور کنایہ نطفہ مراد ہے۔ اور نطفہ پر اس کا اطلاق اس جوہر کے لحاظ سے ہے۔ جس سے نطفہ بنتا ہے۔

اَلسُّلُّ: سل کی بیماری کیونکہ یہ انسان سے گوشت اور قوت کو کھینچ لیتی ہے اور اَسَلَّہُ اللّٰہُ کے معنیٰ ہیں "اللہ

❶ وفیھا حکایات غریبۃ (راجع الدر للسیوطی) ۱۲.

تعالیٰ نے اسے سل کی بیماری میں مبتلا کر دیا" حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۷۷) لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ کہ چوری اور خیانت نہیں ہے۔

تَسَلْسَلَ الشَّیْءِ کے معنیٰ کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں۔گویا اس میں بار بار کھسک جانے کا تصور کر کے لفظ کو مکرر کر دیا ہے تا کہ تکرار لفظ تکرار معنیٰ پر دلالت کرے اسی سے سِلْسِلَةٌ ہے جس کے معنیٰ زنجیر کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے ﴿فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا﴾ (۳۲:۶۹) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے۔(جکڑ دو)

سِلْسِلَةٌ کی جمع سَلَاسِلُ آتی ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿سَلَاسِلَ وَاَغْلَالًا وَّسَعِيْرًا﴾ (۷۶۔۴) زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ (تیار کر رکھی ہے)

﴿وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُوْنَ﴾ (۴۰۔۷۱) اور زنجیریں ہوں گی اور گھسیٹے جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۷۸) يَاعَجَبًا لِّقَوْمٍ يُقَادُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ بِالسَّلَاسِلِ: اس قوم پر تعجب ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جارہے ہیں۔

اور مَاءٌ سَلْسَلٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو اپنی قرار گاہ میں مضطرب ہو کر صاف ہو جائے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۲۳۲) اَشْهٰى اِلَیَّ مِنَ الرَّحِيْقِ السَّلْسَلِ

وہ مجھے شفاف شراب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اور آیت: (۷۶۔۱۸) میں سَلْسَبِيْلًا (سلسبیل) کے معنیٰ تیزی سے بہتے ہوئے صاف،لذیذ اور خوشگوار پانی کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے،اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سَلْ اور سَبِيْل سے بنا ہے اور حَوْقَلَة وَبَسْمَلَةٌ وغیرہ کی طرح الفاظ مرکبہ کے قبیل سے ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر تیز رو چشمے کو سَلْسَبِيل کہا جاتا ہے۔ اور زبان کے باریک سرے کو اَسَلَةُ اللِّسَان کہتے ہیں۔

(س ل ب)

اَلسَّلْبُ: اس کے معنیٰ کسی سے کوئی چیز چھین لینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ (۲۲۔۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

اَلسَّلِيْبُ: لٹا ہوا آدمی۔وہ اونٹنی جس کا بچہ چھن گیا اور اَلسَّلَبُ کے معنیٰ چھینی ہوئی چیز اور درخت سے اتاری ہوئی چھال کے ہیں۔اور شاعر کے قول ❹

(۲۳۳) فِی السُّلُبِ السُّوْدِ وَفِی الْاَمْسَاحِ

(سیاہ ماتمی لباس اور ٹاٹ پہنے ہوتے ہیں)

---

❶ غریب ابی عبید (۱: ۱۹۸) وابوداؤد فی الجهاد والحاکم (٤: ۳۲۵) والفائق (۲: ۲۱۳) والطبرانی عن کثیر بن عبدالله عن ابیه عن جده عن عمرو بن عوف سیاتی فی (غلل).

❷ الحدیث باختلاف الفاظه فی (حم، خ، وعن ابی هریرة) راجع کنزالعمال (۳: ۱۷۸).

❸ قاله ابو کبیر الهذلی (عامر بن الحلیس) وصدره ام لاسبیل الی الشباب وذکره والبیت فی اللسان (سلسل).

❹ قاله لبید حین شرب عامر بن مالك وغنت له قینتان واختلف فی قرینه ففی اللسان (سلب) یخمشن حراوجه صحاح وفی المحبر (٤٧٣) هذا اول البیت وعجزه۔ ابنا ملاعب الرماح وبعده: یاعامراً! یاعامر الصحاح۔ وعامر الکتیبة الرواح۔ وله قصة راجع المحبر والشطر فی الاشتقاق ۳۰٤ واللسان (نوح).

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاہ ماتمی لباس مراد ہے جو مصیبت زدہ شخص پہن لیتا ہے اور ماتمی لباس کو سُلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اصل لباس اتار کر اسے پہنا جاتا ہے۔ پھر جیسا کہ اَحَدَّتِ الْمَرْئَۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ماتمی لباس پہننے کے ہیں ایسے ہی تَسَلَّبَتِ الْمَرْئَۃُ بھی کہا جاتا ہے اَلْاُسْلُوْبُ طریقہ، روش۔ جمع اَسَالِیْبُ۔

(س ل ح)

اَلسِّلَاحُ: (ساز جنگ) یعنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کی جائے جیسے تلوار، کمان، نیزہ، چوب دستی وغیرہ (اس کی جمع) اَسْلِحَۃٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَھُمْ وَاَسْلِحَتَھُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) اور ہوشیار اور مسلح ہو کر (تمہارے ساتھ نماز ادا کریں)

اَلْاِسْلِیْحُ: ایک قسم کی گھاس ہے جس کے کھانے سے اونٹ موٹے ہو جاتے ہیں۔ مادہ اونٹنی کھالے تو اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے گویا وہ موٹے ہو کر مسلح ہو گئے اور ذبح ہونے سے بچ گئے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ❶

(۲۳۴) اَزْمَانَ لَمْ تَأْخُذْ عَلَیَّ سِلَاحَھَا
اِبِلِیْ بِجُلَّتِھَا وَلَا اَبْکَارَھَا

اس زمانہ میں جب کہ میرے بڑے اور جوان اونٹوں نے ہتھیار نہیں پہنے تھے یعنی موٹے نہیں ہوئے تھے۔

اَلسِّلَاحُ: اصل میں اونٹ کے اس گوبر کو کہتے ہیں جو اِسْلِیْح گھاس کھانے کے بعد کرتا ہے پھر بطور کنایہ ہر فضلہ پر بولا جاتا ہے حتیٰ کہ حباری جانور کے متعلق مشہور محاورہ ہے۔

سِلَاحُہٗ سَلَاحُہٗ کہ اس کا فضلہ ہی اس کا ہتھیار ہے۔

(س ل خ)

اَلسَّلْخُ: اس کے اصل معنیٰ کھال کھینچنے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

سَلَخْتُہٗ فَانْسَلَخَ: میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھنچ گئی پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جیسے سَلَخْتُ دِرْعَہٗ: میں نے اس کی زرہ اتاری۔ سَلَخَ الشَّھْرُ وَانْسَلَخَ: مہینہ گزر گیا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ﴾ (۹۔۵) جب عزت کے مہینے گزر جائیں۔

﴿نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ......﴾ (۳۶۔۳۷) کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

اور محاورہ ہے:

اَسْوَدُ سَالِخٌ، سَلَخَ جِلْدَہٗ: نر سیاہ سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی۔ اور کھجور کے جس درخت کی کچی کھجوریں جھڑ جائیں اسے نَخْلَۃٌ مِسْلَاخٌ کہا جاتا ہے۔

(س ل ط)

اَلسَّلَاطَۃُ: اس کے معنیٰ غلبہ حاصل کرنے کے

---

❶ قاله النمر بن تولب في وصف الابل والبيت في اللسان والمحكم (سطح، جلل) وامالي المرتضىٰ (۲ : ۱۱۹) والثمار ۲۷۹ والمعاني للقتبي (۳۹۱۔۲۳۱) والميداني ۱ : ۲۰، ۱۶، ۲۲، ۴۹، ۳۷، ۵۰) وفي اللسان ايام بدل ازمان وفي المطبوع على بدل الى مصحف والمراد من سلاح الابل سمنها وحسنها وانه يمنع صاحبها من العقر والذبح وفي المرتضىٰ في سلاح الابل اشعار والبيت ايضاً في اللالىء مع السمط ۶۳۲، ۷۸۳ وغريب ابي عبيد (۱ : ۲۰۵).

ہیں اور سَلَّطْتُہٗ فَتَسَلَّطَ کے معنیٰ ہیں ''میں نے اسے مقہور کیا تو وہ مقہور ہوگیا'' قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ﴾ (۴۔۸۹) اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کردیتا۔

﴿وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۵۹۔۶) لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کردیتا ہے۔

اور اسی سے بادشاہ کو ''سلطان'' کہا جاتا ہے۔ اور سلطان کا لفظ تسلط اور غلبہ کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا﴾ (۱۷۔۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔

﴿اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ﴾ (۱۶۔۹۹۔۱۰۰) کہ جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ (۵۵۔۳۳) اور زور کے سوا تم نہیں نکل سکتے۔

عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت (دلیل) کو بھی سلطان کہا گیا ہے۔[1] کیونکہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن عام طور پر اس کا تسلط ان اصحاب علم و حکمت پر ہوتا ہے جو ایمان دار (دیانتدار) ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ﴾ (۴۰۔۳۵) جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

﴿فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۱۱۔۹۶) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔

﴿اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا﴾ (۴۔۱۴۴) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا صریح الزام لو۔ اور آیت:

﴿ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ﴾ (۶۹۔۲۹) (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

میں سلطان کے دونوں معنیٰ مراد ہوسکتے ہیں یعنی اس سے مراد دلیل بھی ہوسکتی ہے اور غلبہ بھی۔

اَلسَّلِیْطُ: اہل یمن کی زبان میں زیتون کے تیل کو کہتے ہیں۔ اور سَلَاطَۃُ اللِّسَانِ کے معنیٰ گفتگو پر قدرت کے ہیں اور یہ عموماً مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور زبان دراز عورت کو اِمْرَاَۃٌ سَلِیْطَۃٌ کہا جاتا ہے اور سَنَابِکُ سَلْطَاتٌ کے معنیٰ تیز سموں کے ہیں گویا قوت اور طول کی وجہ سے انہیں تسلط حاصل ہے۔

(س ل ف)

اَلسَّلْفُ: کے معنیٰ متقدم یعنی پہلے گزر جانے والا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلْنٰھُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ﴾ (۴۳۔۵۶) ان کو گئے گزرے کردیا اور پچھلوں کے لئے عبرت بنادیا۔

﴿فَلَہٗ مَا سَلَفَ﴾ (۲۔۲۷۵) تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔ یعنی اس کے پہلے گناہ کو معاف کردیا جائے گا۔ اور اس

[1] وعن ابن عباس: قد جاء السلطان بمعنیٰ الحجۃ فی جمیع القرآن ۱۲.

پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔اسی طرح آیت:

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ (۴-۲۲) مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا)۔

میں مَا سَلَفَ سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ اس سے قبل ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔تو یہاں استثناء جواز فعل سے نہیں ہے کہ جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ جائز اور مباح ہیں بلکہ یہاں استثناء گناہ سے ہے یعنی اس سے قبل جو نکاح ہو چکے ہیں ان کا گناہ معاف کر دیا جائے گا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ ❶ اور لِفُلَانٍ سَلَفٌ کَرِیْمٌ کے معنیٰ ہیں اس کے آباؤ اجداد کریم تھے۔ سَلَفٌ کی جمع اَسْلَافٌ اور سُلُوْفٌ آتی ہے۔

اور کسی چیز کی پیشگی قیمت ادا کرنے کو بھی سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلسَّالِفَةُ: گردن کے کنارے کو کہتے ہیں اور لڑائی میں ہر اول دستہ یا سفر میں قافلہ سے آگے جانے والے لوگوں کو سَابِقَةٌ اور سَلَافٌ کہا جاتا ہے۔

سُلَافَةُ الْخَمْرِ: باقی ماندہ عصیرہ۔اَلسُّلْفَةُ: (ناشتہ) یعنی وہ طعام جو مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کیا جاتا ہے۔

محاورہ ہے:

سَلِّفُوْا ضَیْفَکُمْ وَلَهِّنُوْهُ: اپنے مہمان کو نُگل کھلاؤ۔

(س ل ق)

اَلسَّلْقُ: قہر و غلبہ کے ساتھ دست یا زبان دارزی کرنا کے ہیں اور اسی سے تَسَلَّقَ عَلَی الْحَائِطِ ہے جس کے معنیٰ دیوار پھاندنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ﴾ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں زبان درازی کریں گے۔

محاورہ ہے: سَلَقَ امْرَاَتَهُ: اپنی عورت کو زبردستی لٹا کر اس کے ساتھ جماع کیا۔مسیلمہ نے ایک عورت سے کہا۔ ❷

(۲۳۵) اِنْ شِئْتِ سَلَقْنَاكِ
وَاِنْ شِئْتِ عَلٰی اَرْبَعٖ

چاہو تو چت لیٹ جاؤ اور چاہو تو پٹ لیٹو۔اور سَلْقٌ کے معنیٰ شلیتے کے ایک حلقے کو دوسرے میں داخل کرنے کے ہیں اور میدہ کی روٹی کو سَلِیْقَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَلَائِقُ آتی ہے۔اور سَلِیْقَةٌ بمعنیٰ طبیعت بھی آتا ہے اور سَلْقٌ کے معنیٰ ہموار اور عمدہ زمین کے ہیں۔

(س ل ک)

اَلسُّلُوْكُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ راستہ پر چلنے کے ہیں۔سَلَکْتُ الطَّرِیْقَ: اور یہ فعل متعدی بن کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی راستہ پر چلانا چنانچہ پہلے معنیٰ کے متعلق فرمایا:

﴿لِتَسْلُکُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ (۷۱-۲۰) تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں میں چلو پھرو۔

﴿فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ (۱۶-۶۹) اور اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔

﴿یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ﴾ (۷۲-۲۷) (اور) اس کے آگے......مقرر کر دیتا ہے۔

---

❶ وفی البیضاوی: الاستثناء من المعنیٰ اللازم للنهی ویحتمل الانقطاع (لانوارالتنزیل ج ۱ ص ۸۳ بحلالین علی الهوامش).

❷ فی اربع ابیات مقیدة القافیه خاطب بها سجاح التی تنبأت من بنی تغلب فی خلوة ثم واقعها فصدقت بنبوته انظر القصة فی الطبری (۲: ۴۹۹) والمحاضرات (۴: ۴۳۱) وفی روایته علقناك بدل سلقناك محرف ۱۲.

﴿وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا﴾ (۲۰۔۵۳) اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے۔

اور دوسرے معنیٰ یعنی متعدی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ﴾ (۷۴۔۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

﴿كَذَالِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۱۵۔۱۲) اس طرح ہم اس (تکذیب وضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

﴿كَذَالِكَ سَلَكْنٰهُ﴾ (۲۶۔۲۰۰) اسی طرح ہم نے انکار کو...... داخل کر دیا۔

﴿فَاسْلُكْ فِيهَا﴾ (۲۳۔۲۷)...... کشتی میں بٹھالو۔

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۷۲۔۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

بعض نے سَلَكْتُ فُلَانًا فِي طَرِيقِهٖ کی بجائے سَلَكْتُ فُلَانًا طَرِيقًا کہا ہے اور عَذَابًا کو یَسْلُكْهُ کا دوسرا مفعول بنایا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عَذَابًا فعل محذوف کا مصدر ہے اور یہ اصل میں نُعَذِّبُهٗ ہے اور نیزے کی بالکل سامنے کی اور سیدھی ضرب کو طَعْنَةٌ سُلْكَةٌ کہا جاتا ہے۔ (سُلْكٰی سیدھا نیزہ) اور سُلْكَةٌ مادہ کبک کو کہتے ہیں اس کا مذکر سُلَكٌ ہے۔

(س ل م)

اَلسَّلْمُ وَالسَّلَامَةُ کے معنیٰ ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِقَلْبٍ سَلِيمٍ......﴾ (۲۶۔۸۹) پاک دل (لے کر آیا وہ بچ جائے گا۔ یعنی وہ دل جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو تو یہ سلامت باطن کے متعلق ہے اور ظاہری عیوب سے سلامتی کے متعلق فرمایا:

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ (۲۔۷۱) اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو۔

پس سَلِمَ يَسْلَمُ سَلَامَةً وَسَلَامًا کے معنیٰ سلامت رہنے اور سَلَّمَهُ اللّٰهُ (تفعیل) کے معنیٰ سلامت رکھنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ﴾ (۸۔۴۳) لیکن خدا نے (تمہیں) اس سے بچالیا۔

﴿اُدْخُلُوهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِينَ﴾ (۱۵۔۴۶) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔

اسی طرح فرمایا:

﴿اِهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا......﴾ (۱۱۔۴۸) ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ...... اتر آؤ۔

اور حقیقی سلامتی تو جنت ہی میں حاصل ہوگی جہاں کہ بقا ہے۔ فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے، ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں چنانچہ اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ﴾ (۶۔۱۲۸) ان کے لئے...... سلامتی کا گھر ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰۔۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (۵۔۱۶) جس سے خدا اپنی رضا مندی پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے۔

ان تمام آیات میں سلام بمعنیٰ سلامتی کے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلسَّلَامُ اسمائے حسنیٰ سے ہے اور یہی معنیٰ آیت "لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ" میں بیان کئے گئے

ہیں۔اور آیت:

﴿اَلسَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ﴾ (۵۹۔۲۳) سلامتی امن دینے والا نگہبان۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وصف سلام کے ساتھ موصوف ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ عیوب وآفات مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔اور آیت:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (۳۶۔۵۸) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ (۱۳۔۲۴)(اور کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْيَاسِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۳۰) کہ الیاسین پر سلام اور اس مفہوم کی دیگر آیات میں سلام علیٰ آیا ہے تو ان لوگوں کی جانب سے تو سلامتی بذریعہ قول مراد ہے یعنی سَلٰمٌ عَلٰى...... کے ساتھ دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلامتی بالفعل مراد ہے۔یعنی جنت عطا فرمانا۔ جہاں کہ حقیقی سلامتی حاصل ہوگی۔جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔اور آیت:

﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔میں قَالُوا سَلٰمًا کے معنیٰ ہیں ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں۔تو اس صورت میں سَلٰمًا منصوب بالفعل المضمر ہوگا۔یعنی نَطْلُبُ مِنْكَ السَّلَامَ اور بعض نے قَالُوا سَلٰمًا کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ اچھی بات کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قولاً) کی صفت ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ﴾ (۵۱۔۲۵) جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا۔انہوں نے بھی (جواب میں) سلام کہا۔

میں دوسرے سلام پر رفع اس لیے ہے کہ یہ باب دعا سے ہے اور صیغہ دعا میں رفع زیادہ بلیغ ہے گویا اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے جس کا کہ آیت:

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ﴾ (۴:۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دو۔

میں حکم دیا گیا ہے اور ایک قرأت میں سِلْمٌ ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ سَلَام سِلْم (صلح) کو چاہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف محسوس کر چکے تھے پھر جب انہیں سلام کہتے ہوئے سنا تو اس کو پیغام صلح پر محمول کیا اور جواب میں سِلْمٌ کہہ کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جیسے تم نے پیغام صلح دیا ہے۔ایسے ہی میری جانب سے بھی پیغام صلح قبول ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ٭ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ (۵۶۔۲۵،۲۶) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ۔ہاں ان کا کلام سلام (ہوگا)

کے معنیٰ یہ ہیں کہ بات صرف بذریعہ قول ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ قولاً اور فعلاً دونوں طرح ہوگی۔اسی طرح آیت:

﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۹۱) تو (کہا جائے گا کہ) تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔ میں بھی سلام دونوں معنیٰ پر محمول ہوسکتا ہے اور آیت:

﴿وَقُلْ سَلٰمٌ﴾ (۴۳۔۸۹) اور سلام کہہ دو۔

میں بظاہر تو سلام کہنے کا حکم ہے لیکن فی الحقیقت ان کے شر سے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم ہے اور آیات سلام جیسے۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعَالَمِیْنَ﴾ (۳۷۔۷۹)

(یعنی) تمام جہاں میں ...... نوح علیہ السلام پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲۰) کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ﴾ (۳۷۔۱۰۹) ابراہیم علیہ السلام پر سلام۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء اور ابراہیم علیہ السلام کو اس قدر مرتبہ عطا کیا تھا کہ لوگ ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور ان کے لئے سلامتی کے ساتھ دعا کرتے رہیں گے اور فرمایا:

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ﴾ (۲۴۔۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں) کو سلام کیا کرو۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سلام کہا کرو۔

﴿اَلسَّلَامُ وَالسِّلْمُ وَالسَّلَمُ﴾ کے معنیٰ صلح کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ (۴۔۹۴) اور جو شخص تم سے سلام علیك کہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔

بعض نے کہا ہے: یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی جسے باوجود اظہار اسلام اور طلب صلح کے قتل کر دیا گیا تھا اور فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾ (۲۔۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ﴾ (۸۔۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں۔

اس میں ایک قرأت سَلْمَ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

﴿وَاَلْقَوْا اِلَی اللّٰهِ یَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔

﴿یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سَالِمُوْنَ﴾ (۶۸۔۴۳) (اس وقت) سجدے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جب کہ صحیح وسالم تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾ (۳۹۔۲۸) اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے۔

میں ایک قرأت سَلْمًا وَسِلْمًا بھی ہے اور یہ دونوں مصدر ہیں اور حَسَنٌ وَنَکْدٌ کی طرح صفت کے صیغے نہیں ہیں کہا جاتا ہے۔

سَلِمَ سَلْمًا وَسِلْمًا جیسے رَبِحَ رَبْحًا وَرِبْحًا اور بعض نے کہا ہے کہ سِلْمٌ اسم ہے اور اس کی ضد حَرْبٌ ہے۔

اَلْاِسْلَامُ: اس کے اصل معنیٰ سِلْم (صلح) میں داخل ہونے کے ہیں اور صلح کے معنیٰ یہ ہیں کہ فریقین باہم ایک دوسرے کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے بے خوف ہو جائیں اور یہ اَسْلَمْتُ الشَّیْءَ اِلٰی فُلَانٍ (باب افعال) کا مصدر ہے اور اسی سے بیع سَلَم ہے۔

شرعًا اسلام کی دو قسمیں ہیں کوئی انسان محض زبان سے اسلام کا اقرار کرے، دل سے معتقد ہو یا نہ ہو اس سے انسان کا جان و مال اور عزت محفوظ ہو جاتی ہے مگر اس کا درجہ ایمان سے کم ہے۔ اور آیت:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ

قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ (۴۹۔۱۴) دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو اسلام لائے ہیں۔

میں اَسْلَمْنَا سے یہی معنیٰ مراد ہیں۔ دوسرا درجہ اسلام کا وہ ہے جو ایمان سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔ مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا وقدر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ جیسا کہ آیت:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۔۱۳۱) جب ان سے ان کے رب نے فرمایا: کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں رب العالمین کے آگے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے اور فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (۳۔۱۹) (کہ) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ اور آیت: ﴿وَتَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا﴾ (۱۲۔۱۰۱) تو مجھے اپنی اطاعت (کی حالت) کیجیئو۔ اٹھائیو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں داخل کیجیئو جو تیری رضا کے تابع ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں۔ کہ کلیۃً شیطان کے پنجے سے آزاد کردے۔ جیسا کہ شیطان نے کہا تھا۔

﴿لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۳۸۔۸۳) میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔ اور آیت:

﴿اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۳) تم تو انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں۔

میں مُسْلِمُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے تابع اور فرمانبردار ہیں۔ اور آیت:

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ (۵۔۴۴) اسی کے مطابق انبیا جو (خدا کے) فرمانبردار تھے...... حکم دیتے رہے ہیں۔

میں وہ انبیاء مراد ہیں جو اگرچہ اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے لیکن حکم الٰہی سے ہدایت پاتے تھے اور مستقل شرائع لے کر مبعوث ہوئے تھے۔

اَلسُّلَّمُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ سلامتی حاصل ہو پھر سَبَبٌ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّمٌ کہا گیا ہے جو کسی بلند جگہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ (۵۲۔۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آسمان سے باتیں سن آتے ہیں۔

﴿اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ﴾ (۶۔۳۵) یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو)

اور شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۳۶) وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ

گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جاتے اور سَلْمٌ وَسَلَامٌ ایک قسم کے بڑے درخت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ

---

❶ لزهير واورد (رهن) اسباب المنية ينلنه .... وفي اللسان وام بدل نال وقد مر في (برج) وفي السبع لابن الانباري ۲۸۳ ولورام ان يرقى السماء بسلم۱۲.

ہر قسم کی آفت سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

اَلسِّلَامُ: ایک قسم کا سخت پتھر (اس کا واحد سَلِمَةٌ ہے)

(س ل و)

اَلسَّـلْـوىٰ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے تسلی کا باعث ہو، اسی سے اَلسُّـلْـوَانُ وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنیٰ اطمینان اور راحت ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰىؕ﴾ (۲۔۵۷) اور (تمہارے لئے) من وسلویٰ اتارتے رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بٹیر کی قسم کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ من ایک چیز ہے جو آسمان سے اترتی تھی اور سَلْوىٰ ایک پرند کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مَنّ اور سَلْوىٰ کے الفاظ بطور مثال کے ذکر کئے گئے ہیں اور مراد وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے گوشت اور سبزیوں کی صورت میں انہیں دیا تھا۔ اصل میں سَلْوىٰ کا لفظ تَسَلِّیْ سے ماخوذ ہے اور سَلَیْتُ عَنْ کَذا وَسَلَوْتُ عَنْهُ وَتَسَلَّیْتُ کے معنیٰ کسی چیز سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ سُلْوَان اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سُلْوَانٌ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

(س م م)

اَلسَّمُّ: (فتحہ سین وضمہ آں) کے معنیٰ تنگ سوراخ کے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان کا سوراخ ہوتا ہے۔ اس کی جمع سُمُوْم آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۔۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور سَمَّهٗ (ن) کے معنیٰ کسی چیز میں گھس جانا کے ہیں۔ اور اسی سے "اَلسَّامَّةُ" ہے یعنی وہ خاص لوگ جو ہر معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دُخَّلٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اَلسَّمُّ: زہر قاتل کو کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور یہ اصل میں مصدر بمعنیٰ فاعل ہے۔

اَلسُّمُوْمُ: (لو) گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴾ (۵۲۔۲۷) اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔

﴿فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ﴾ (۵۶۔۴۲) (یعنی دوزخ کی) لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں۔

﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (۱۵۔۲۷) اور جنوں کو اس سے بھی پہلے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

(س م د)

اَلسَّامِدُ: غافل تکبر سے سر اٹھانے والا۔ یہ سَمَدَ الْبَعِيْرُ فِيْ سَيْرِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے گردن اٹھا کر تیز چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ﴾ (۵۳۔۶۱) اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔

اور سَمَدَ رَأْسَهٗ وَسَبَدَ کے معنیٰ سر کے بالوں کو جڑ سے مونڈ ڈالنے کے ہیں۔

(س م ر)

اَلسُّمْــرَۃُ: گندمی رنگ کو کہتے ہیں اور کنایہ کے طور پر سَمْـرَاءُ گندم کو کہا جاتا ہے اور اَلسَّمَـارُ: پتلا دودھ جس میں بکثرت پانی کی آمیزش ہو۔

اَلسُّمْرَۃُ: ببول کا درخت۔ غالبًا اس کی رنگت کے اعتبار سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

اَلسَّمَرُ: اصل میں رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔ ❶ لَا اٰتِیْكَ السَّمَرَ وَالْقَمَرَ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا پھر رات کو باتیں کرنا کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے اور سَمَرَ فُلَانٌ کے معنیٰ ہیں: اس نے رات کو باتیں کیں۔ اسی سے مشہور محاورہ ہے۔ ❷

لَا اٰتِیْكَ مَا سَمَرَا بْنَا سَمِیْرٍ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا اور آیت کریمہ:

﴿مُسْتَكْبِرِیْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۷) ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے۔ اور بے ہودہ بکواس کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سَامِرٌ کے معنیٰ تاریک رات کے ہیں۔ سَامِرٌ کی جمع سُمَّارٌ، سَمَرَۃٌ اور سَامِرُوْنَ آتی ہے۔ اور سَمَرْتُ الشَّیْءَ (ن) کے معنیٰ کسی چیز میں میخ لگا کر مضبوط اور استوار کرنے کے ہیں۔ اور مہمل چھوڑے ہوئے اونٹوں کو اِبِلٌ مُسْمَرَۃٌ کہا جاتا ہے اور سَامِرِیٌّ ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

(س م ع)

اَلسَّمْعُ: قوت سامعہ، کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنیٰ سننا (مصدر) بھی آتے ہیں۔ اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

اور کبھی لفظ سماع کی طرح اس سے مصدری معنیٰ مراد لیا جاتا ہے (یعنی سننا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات) سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔

﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

اور کبھی سَمْعٌ کے معنیٰ فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو: اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَكَ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ لَكَ تم نے میری بات سمجھی نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا......﴾ (۸۔۳۱) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی

---

❶ انظر للمثل المستقصی والثمار ۲۲۴ و لعسکری ۲، ۱۹۶: ۲۲۶ واللسان والتاج (سمر).

❷ ابنا سمیر اللیل والنهار فالمراد الدهر فمعنیٰ المثل لاآتیك ابداً راجع السمط ۵۳۰).

کہہ دیں۔

اور آیت: ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (۲۔۹۳)(وہ کہنے لگے) ہم نے سن تو لیا۔مگر مانتے نہیں ۔ کے معنیٰ ہیں ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے مگر ماننے کے نہیں۔اسی طرح آیت:

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (۲۔۲۸۵) کے معنیٰ ہیں ''ہم نے تیرا حکم سمجھ لیا اور قبول کیا''

اور آیت: ﴿لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ (۸۔۲۱) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم خدا) سن لیا مگر (حقیقت میں) نہیں سنتے۔

میں سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ کے یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں۔کہ ہم نے سمجھ لیا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں۔اور یہ بھی کہ ہم نے سمجھ لیا مگر وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو گویا اس شخص کی طرح ہیں جو سرے سے سنتا ہی نہیں۔پھر اس کے بعد فرمایا: ﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا......﴾ (۸۔۲۳) اگر خدا ان میں نیکی (کا مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ...... بھاگ جاتے۔

تو یہاں بھی وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ کے معنیٰ ہیں اگر وہ انہیں قوت فہم بخشتا جس سے وہ سمجھتے ،اور آیت: ﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ (۴۔۴۶) میں (سنئے نہ سنوائے جاؤ) کا محاورہ دو طرح بولا جاتا ہے۔ایک بد دعا کے طور پر کہ وہ بہرا ہو جائے۔دوم دعا کے طور پر پہلے معنیٰ کے لحاظ سے کہا

جاتا ہے: اَسْمَعَكَ اللّٰهُ: اللہ تجھے بہرہ کردے اور دوسرا معنیٰ کے لحاظ سے اَسْمَعْتُ فُلَانًا بولتے ہیں یعنی میں نے فلاں کو خوب سنائیں۔یعنی گالیاں دیں تو یہ گالی دینے کے معنیٰ میں متعارف ہے۔

مروی ہے کہ اہل کتاب نبی ﷺ کو یہ کلمہ کہا کرتے اور اس سے آنحضرت کو اس فریب میں ڈالنے کی کوشش کرتے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں۔مگر درحقیقت وہ آپ کے حق میں بددعا کرتے تھے۔

ہر وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے سماعت کو ثابت کیا ہے یا کفار سے اس کی نفی کی ہے یا اس کی کوشش پر رغبت دلائی ہے تو اس سے مقصود اس کلام کے معنیٰ کی طرف توجہ دینا اور اس میں غور وفکر کرنا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (۷۔۱۹۵) یا ان کے لئے کان ہیں جن سے سنیں؟

اور (کفار سے نفی کرتے ہوئے) فرمایا:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ﴾ (۲۔۱۸)(یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں۔

﴿وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (۴۱۔۴۴) اور ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہراپن) ہے۔

اور جب سمع کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے مراد تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مسموعات کا علم ہے یا یہ کہ اس نے جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ (۵۸۔۱) (اے پیغمبر!) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے

بارے میں بحث وجدال کرتی ہے.......... خدا نے اس کی التجا سن لی۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَولَ الَّذِيْنَ قَالُوْا﴾ (۳۔۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ...... اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو...... آواز نہ سنا سکتے ہو۔

میں لَا تُسْمِعُ کے معنٰی یہ ہیں کہ تم انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتے۔کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے قوت حافظہ کو جو کہ انسانیت کے لئے مخصوص سرمایۂ حیات ہے کھو بیٹھنے میں مردوں کی طرح ہیں۔اور آیت:

﴿اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ﴾ (۱۸۔۲۶) وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔میں اس شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص حکمت الٰہی کے عجائبات سے کس قدر آگاہ ہے۔اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق مَا اَبْصَرَهٗ وَمَا اَسْمَعَهٗ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو صرف انہی صفات کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جو بطریق سمع ثابت ہوں۔اور کفار کے متعلق جو یہ فرمایا ہے۔

﴿اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا﴾ (۱۹۔۳۸) وہ جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔

تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ جو باتیں ان کے اپنے نفوس پر ظلم کرنے اور نظر وفکر ترک کر دینے کی وجہ سے آج ان پر مخفی ہیں وہ اس روز ان کو سن اور دیکھ رہے ہوں گے۔

اور فرمایا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا﴾ (۲۔۹۳) کہ جو کتاب تم کو دی گئی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو (اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے) اس کو سنو۔

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵۔۴۲) (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے۔

یعنی دوسروں کے سامنے جھوٹی باتیں بنانے کے لئے تمہاری باتیں سنتے ہیں اور جو ابھی تمہارے پاس نہیں آئے۔

یعنی وہ تمہاری باتوں کو ان تک پہنچانے کے لئے سنتے ہیں

اَلْاِسْتِمَاعُ: اس کے معنٰی غور سے سننے کے ہیں جیسے فرمایا:

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ......﴾ (۱۷۔۴۷) یہ لوگ جب تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جس نسبت سے یہ سنتے ہیں ہم سے خوب جانتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ﴾ (۶۔۲۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری (باتوں کی) طرف کان رکھتے ہیں۔

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ﴾ (۵۰۔۴۱) اور سنو جس دن پکارنے والا...... پکارے گا۔

اور آیت: ﴿اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۔۳۱) یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔

یعنی ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی حفاظت کا متولی کون ہے۔

اور مِسْمَعٌ یا مَسْمَعٌ کے معنٰی کان کے سوراخ کے ہیں

اور اسی کے ساتھ تشبیہ دے کر ڈول کے دستہ کو جس میں رسی باندھی جاتی ہے مَسْمَعُ الْغَرْبِ کہا جاتا ہے۔

(س م ک)

اَلسَّمْكُ: چھت کو کہتے ہیں اور سَمَكَهٗ (ن) کے معنیٰ بلند کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰاهَا﴾ (۷۹۔۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کیا۔
شاعر نے کہا ہے۔ ❶
(۲۳۷) اِنَّ الَّذِیْ سَمَكَ السَّمَاءَ بَنٰی لَنَا
وہ ذات جس نے آسمان کو بلند بنایا۔
اور ایک دعاء ماثورہ میں ہے ❷ (۱۷۹) یَـابَـارِیءَ السَّمٰوٰتِ الْمَسْمُوْكَاتِ اے بلند آسمان کے پیدا کرنے والے۔
اور سَنَامٌ سَامِكٌ: بلند کوہان کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس سے کوئی چیز بلند کی جائے۔
اِسے سِمَاكٌ (بکسرۂ سین) کہا جاتا ہے اور سِمَاكٌ ایک ستارے کا نام بھی ہے اور اَلسَّمْكُ کے معنیٰ مچھلی کے ہیں۔

(س م ن)

اَلسِّمَنُ کے معنیٰ موٹاپہ کے ہیں اور یہ هُزَالٌ کی ضد ہے اور سَمِیْنٌ (صیغۂ صفت کے معنیٰ ہیں فربہ) ج سِمَانٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ﴾ (۱۲۔۴۶) ہمیں (اس خواب کی تعبیر) بتایئے کہ سات موٹی گایوں......اور اَسْمَنْتُهٗ وَسَمَّنْتُهٗ کے معنیٰ موٹا کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ﴾ (۸۸۔۷) جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔
اَسْمَنْتُهٗ: فربہ جانور خریدنے یا دینے کے ہیں۔اور اِسْتَمَنْتُهٗ کے معنیٰ فربہ پانے کے۔
اَلسُّمْنَةُ: ایک دوا جو فربہ ہونے کے لئے کھائی جاتی ہے۔
اَلسَّمْنُ: گھی کیونکہ گھی بھی فربہی کی قسم سے ہے اور اس کے کھانے سے انسان موٹا ہوتا ہے اَلسُّمَانٰی: ایک پرند کا نام ہے۔

(س م و)

سَمَاءٌ: ہر شے کے بالائی حصہ کو سَمَاءٌ کہا جاتا ہے شاعر نے ایک گھوڑے کے وصف میں کہا ہے۔ ❸
(۲۳۸) وَاَحْمَرُ كَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَائُهٗ
فَرَیَّا وَاَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلٌ
وہ دیباج کی طرح سرخ ہے اس کا بالائی حصہ موٹا اور گداز ہے اور زیریں حصہ لاغر اور سخت ہے۔بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر "سماء" اپنے ماتحت

---

❶ البیت لـلـفرزدق من نقیضته المشهو رمطلعها هذالبیت وتمامه : بیتاً دعائمه اعزواطول ۔ والقصیدة فی دیوانه (۲ : ۷۱٤ ـ ۷۲۵) والنقائض (۱ : ۱۸۲ ـ ۲۱۱) والبیت فی العمدة (۱ : ۲٥۲) وفیه قصة الفرزدق مع الطرماح ومجازالقران (۲ : ۱۲۱) وشرح الدرة للخفاجی ۷۳ والمرزبانی فی المعجم ٤٦۷ والمواشح ۱۲۳ وابن عقیل رقم ۲۷۸ ومصارع العشاق ۷۷ والصاحبی ۲٥۷ والطبری (۲۱ : ۳۷) والقرطبی (۱٤ : ۲۱) والخزانة (۳ : ۱٤۷ ـ ٤۸۰) والاشباه النحویة (۳ : ۱۹۳) والکامل (۶۹۷) ولعینی (٤ : ٤۲).
❷ وفی النوادر۱۷۳ اللهم واحی المدحوات وباری المسموکات الخ وهذه الصلوة فی ۱۰ اسطار وهذه من جملة من الصلوة علی النبی التی کان علی یعلم اصحابه ۱۲.
❸ قاله طفیل الغنوی وقد مرفی (ارض) ۱۲۔

کے لحاظ سے سَمَاءٌ ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے اَرْضٌ کہلاتا ہے بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور آیت:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (۶۵۔۱۲) خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں

کو اسی معنیٰ پر محمول کیا ہے۔

نیز مَطَرَ (بارش) کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اوپر سے آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سماء اس بارش کو کہا جاتا ہے جو ہنوز زمین پر نہ گری ہو تو اس میں بھی بلندی کے معنیٰ ملحوظ ہیں۔

اور نباتات کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ بارش سے اگتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہوتے ہیں پھر لفظ سماء جو ارض کے بالمقابل ہے مؤنث ہے لیکن کبھی مذکر بھی آجاتا ہے اور واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ﴾ (۲۔۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا۔

اور کبھی اس کی جمع سَمٰوٰتٌ بھی بنا لیتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۳۱۔۱۰) اسی نے آسمانوں کو...... پیدا کیا۔

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۳۔۱۶) ان سے پوچھو کہ آسمانوں...... کا پروردگار کون ہے؟

اور آیت: ﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ﴾ (۷۳۔۱۸) جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔

میں سماء کو مذکور استعمال کیا ہے لیکن کئی ایک آیات جیسے:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ (۸۴۔۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اور آیت: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ (۸۲۔۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔

میں مؤنث استعمال ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماء کا لفظ اشجار میں نَخْلٌ یا اس قسم کے دوسرے اسماء جنس کی طرح ہے جو مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اور سَمَاءٌ کے معنیٰ بارش ہوں تو یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوگا اور اس کی جمع اَسْمِيَةٌ آئے گی۔ اور کسی بلند چیز کے کالبد کو سَمَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۳۹) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰی اِحْقَوْقَفَا

(راتیں تدریجاً) افق پر ابھرے ہوئے چاند کو (لپیٹتی رہیں) حتیٰ کہ وہ ٹیڑھا ہو گیا۔

اور سَمَالِیَ الشَّیْءُ کے معنیٰ ہیں: دور سے کسی چیز کا بلند شکل میں ظاہر ہونا۔

اور سَمَا الْفَحْلُ عَلَی الشَّوْلِ سَمَاوَةً: سانڈھ اونٹ اونٹنی پر چڑھ گیا۔

اَلْاِسْمُ: کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سِمْوٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اَسْمَاءٌ اور تصغیر سُمَیٌّ آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس

---

[1] قاله العجاج واوله ناج طواه الاين هما وجفا طي الليالي زلفا وزلفا والشطر في اللسان (زلف) والحكم حقت وقد مرفي (زلف) ۱۲.

سے مسمّیٰ کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيْهَا﴾ (۱۱۔۴۱) اور (نوح عَلَیْہِ السَّلَام نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔
﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (۲۷۔۳۰) وہ سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام کی طرف سے ہے اور (مضمون یہ ہے) کہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔
اور آیت:﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ (۲۔۳۱) اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔
میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں یا مرکب، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ایک اصطلاحی معنیٰ میں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔جیسے رَجُلٌ و فَرَسٌ دوم وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ میں یہی دوسرے معنیٰ مراد ہیں کیونکہ آدم عَلَیْہِ السَّلَام نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل ہو گیا تھا۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا۔مثلاً اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارا علم انہی چند اصوات تک محدود رہے گا اس

سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے مسمّیٰ کی صورت ذہن میں حاصل ہو سکتی ہے۔لہٰذا آیت:
﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ میں اسماء سے کلام کو انواع ثلاثہ اور صوَر مسمیات بمع ان کی ذوات کے مراد ہیں اور آیت:
﴿مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوْهَا﴾ (۱۲۔۴۰) جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں۔کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری تھے۔جن کا وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔اور آیت:
﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ﴾ (۱۳۔۳۳) اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ان سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تو لو۔
میں سَمُّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات ، عزیٰ وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ جن کو تم اِلٰـهٌ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یعنی نہیں) اسی لئے اس کے بعد فرمایا:﴿اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ......﴾ (۱۳۔۳۳) (کہ) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری (باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو)
اور آیت:
﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ﴾ (۵۵۔۷۸) تمہارے پروردگار......

کا نام بڑا بابرکت ہے۔

میں اسم رب کے بابرکت ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی صفات، الکریم، العلیم، الباری، الرحمن، الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ (۸۷۔۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (۷۔۱۸۰) اور خدا کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔

اور آیت:

﴿اِسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۷) جس کا نام یحییٰ ہے۔اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔

میں سَمِیًّا کے معنیٰ ''ہم نام'' کے ہیں اور آیات:

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

میں سَمِیًّا کے معنیٰ نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتاً اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو ایسا بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہوسکتا ہے یا ہوتا ہے۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔اور آیت:

﴿يُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى﴾ (۵۳۔۲۷) اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

میں لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنیٰ یہ ہیں۔کہ وہ فرشتوں کو ''بنات اللہ'' کہتے ہیں۔

(س ن ن)

اَلسِّنُّ: دانت۔اس کی جمع اَسْنَانٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ﴾ (۵۔۴۵) دانت کے بدلے دانت۔

﴿سَانَّ الْبَعِيْرُ النَّاقَةَ﴾ نر اونٹ نے دانت سے کاٹ کر اونٹنی کو نیچے بٹھالیا۔

اَلسَّنُوْنُ: دانتوں کا منجن ایک دوا جس سے دانتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

سَنُّ الْحَدِيْدِ کے معنیٰ لوہے کو تیز کرنے (اور پگھلانے کے ہیں) اور جس چیز سے لوہے کو تیز کرتے ہیں اسے مِسَنٌّ (سان) کہا جاتا ہے اور اَلسِّنَانُ: (بھالا) خاص کر اس لوہے کو کہتے ہیں جو نیزے کے سرے میں لگایا جاتا ہے۔پھر سَنُّ الْحَدِيْدِ: (تیز کرنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر سَنَنْتُ الْبَعِيْرَ کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ اونٹ کو سخت ہنکا کر دبلا کر دینے کے ہیں اور پگھلانے کے معنیٰ کے لحاظ سے سَنَنْتُ الْمَاءَ بولتے ہیں جس کے معنیٰ پانی بہانے کے ہیں۔محاورہ ہے۔

تَنَحَّ عَنْ سَنَنِ الطَّرِيْقِ: (بسین مثلثہ) راستہ کے کھلے حصہ سے ہٹ جاؤ۔پس سُنَنٌ کا لفظ سُنَّةٌ کی جمع ہے اور سُنَّةُ الْوَجْهِ کے معنیٰ دائرہ رو کے ہیں ار سُنَّةُ النَّبِيِّ سے مراد آنحضرت کا وہ طریقہ ہے جسے آپ ﷺ اختیار فرماتے تھے۔اور سُنَّةُ اللّٰهِ سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت

اور اطاعت کا طریقہ مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا﴾ (۴۸۔۲۳) (یہی) خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا﴾ (۵۔۴۳) اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔

تو آیت میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ شرائع کے فروعی احکام کی گو مختلف صورتیں چلی آئی ہیں لیکن ان سب سے مقصد ایک ہی ہے یعنی نفس کو پاک کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب اور اس کا جواز حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا اور یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں اختلاف یا تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:

﴿مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مسنون کے معنیٰ متغیر کے ہیں۔ اور آیت:

﴿لَمْ یَتَسَنَّهْ ......﴾ (۲۔۲۵۹) (سڑی) بسی نہیں۔ میں لَمْ یَتَسَنَّهْ کے معنیٰ بھی لَمْ یَتَغَیَّرْ ہیں اس میں ہائے استراحت یعنی سکتہ کے ہے۔ [1]

(س ن م)

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ﴾ (۸۳۔۲۷) اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ تَسْنِیْمٍ جنت میں ایک اعلیٰ قسم کے چشمے کا نام ہے جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۸۳۔۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

(س ن و)

اَلسَّنَا: (اسم مقصور) چمک دار روشنی کو کہتے ہیں۔ اور اَلسَّنَاءُ (ممدود) کے معنیٰ رفعت کے ہیں۔ اور معنیٰ رفعت کے اعتبار سے آب کشی کے جانور کو "سَانِیَةٌ" کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:

﴿یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ﴾ (۲۴۔۴۳) اور بادل میں جو چمک آنکھوں کو (خیرہ کرکے بینائی کو) اچکے لئے جاتی ہے۔

اور سَنَتِ النَّاقَةُ تَسْنُوْ کے معنیٰ ہیں اونٹنی نے کنویں سے پانی نکالا اور زمین کو سیراب کیا اور ایسی اونٹنی کو سَانِیَةٌ کہا جاتا ہے (والجمع السوانی)

اَلسَّنَةُ: (سال) اس کی اصل دو طرح بیان کی جاتی ہے ایک یہ کہ اصل میں سَنْهَةٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَهْتُ فُلَانًا کہ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کیا۔ نیز اس کی تصغیر سُنَیْهَةٌ آتی ہے اور ایک قول کے مطابق اسی سے ﴿لَمْ یَتَسَنَّهْ﴾ (۲۔۲۵۹) ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ وہ سالہا سال گزر جانے سے بھی متغیر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی تازگی ختم ہوئی ہے۔

[1] بناء علی قرأة حمزة والکسائی واصله عندهم لم یتسنّی (من الواو) ویحتمل ان یکون اصله لم یتسنن ماخوذاً من سنن فابدلت نونه الاخیرة حرف علة وسقطت بالجزم (راجع انوار التنزیل ۱۲).

بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنْوَۃٌ ہے۔ کیونکہ اس کی جمع سَنَواتٌ آتی ہے اور اسی سے سَانَیتُ فعل ہے اس صورت میں سَـــنَۃٌ میں ہاء برائے وقف ہوگی۔ جیسا کہ کِتَابِیَہ وحِسَابِیَہ میں ہے۔ ❶ قرآن میں ہے:

﴿اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس کے لئے۔

﴿سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا﴾ (۱۲۔۴۷) سات سال متواتر

﴿ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ﴾ (۱۸:۲۵) تین سو برس۔ اور آیت:

﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ﴾ (۷۔۱۳۰)

اور ہم نے فرعونیوں کو کئی سال تک قحط میں مبتلا رکھا۔

میں سنین سے مراد قحط سالی ہے اور زیادہ تر سَـنَۃٌ کا لفظ قحط سالی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

اَسْنَتَ الْقَومُ: لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوگئے۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۴۰) لَهَا اَرَجٌ مَا حَوْلَهَا غَيْرُ مُسْنِتٌ

جس کی خوشبو مہک رہی ہو اور اس کے اردگرد تازگی پھیلی ہوئی ہو۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۲۴۱) فَلَيْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَّبِيَّةٌ

اسے نہ تو خشک سالی نے نقصان پہنچایا ہے اور نہ ہی کمزور ہونے کی وجہ سے اسے ستون لگا کر کھڑا کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ اس شعر میں ہاء اصلی ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا ہے۔ ❹

(۲۴۲) يَـاٰكُـلُ اَزْمَانَ الْهُزَالِ وَالسِّنِىْ

جو ہزال اور قحط سالی کے زمانہ میں چرتا رہا ہو۔

یہاں اَلسِّـنِی سَنَۃٌ سے مرخم نہیں ہے۔ بلکہ یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر جمع ہے جیسے مِـــائَۃٌ کی جمع مِـئِیْـنَ وَمِئُوْنَ آتی ہے اور عَصِیٌّ کی طرح فاء کلمہ مکسور ہے مگر برعایت قافیہ تخفیف کرکے ایک یا کو ساقط کردیا گیا ہے۔

اور آیت:

﴿لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (۲۔۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

میں سِنَۃٌ وَسَنٌ سے ہے اور اس باب سے خارج ہے۔

(س ھ ر)

اَلسَّــــاهِـرَۃُ کے معنیٰ میدان یا روئے زمین کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَاهُـمْ بِـالسَّـاهِرَۃِ﴾ (۷۹۔۱۴) اس وقت وہ (سب) میدان (حشر) میں آجمع ہوں گے۔

---

❶ اصحاب المعاجم ذكره فى (س، ن، ە) و(س، ن، و،)۱۲.

❷ قاله الشنفرىٰ الازدى وصدره : بريحانة من حلية نورت .... والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۰ فى ۳٦ بيتاً انظر الاغانى (۲۱ : ۹۰) والبيت فى اللسان (حلا) والمحكم (روح).

❸ قاله سويد بن الصامت الانصارى وقد نسب الى احيحة بن الجلاح قال فى السمط (۱ : ۳٦۱) والاول اثبت وتمامه ولكن عرايانى السنين الجوائحَ فى ابيات له يصف نخلابالجودة يقول : نخلى ليست بسنهاء ولاممنوعة الثمر ولكن اعربها الناس و"رجبية" يروى بفتحه الجيم بالتخفيف والتشديد وكلاهما نَسَبٌ نَادِرٌ والتشديد اذهب فى الشذود وفى مجالس ثعلب السنها النخلة التى تحمل سنة وسنة لا والرجبية التى يخاف سقوطها فيعمل لها رجبة وفى السمط الرجبة الخطيرة تبنىٰ حول النخلة يمنع بها من ثمرها اى ليست ممنوعة الثمر واللفظان اختلف فى تفسير هما راجع اللسان (رجب، سنة، عرى) ومجالس ثعلب (۲ : ۲۸۵) والقرطبى (۳: ۲۹۳) والقالى (۱ : ۱۲۰) واضداد ابى الطيب ٦۹٤ ومعانى القران المنسوب الى الفراء (۱ :۱۷۳) وغريب القران للقتبى ۹٤.

❹ والبيت فى اللسان (حتم) بغير عزو قال ابن برى الشطر لامرئة من بنى عقيل تفخر باخوالها من اليمن وذكر ابوزيد انه للعامرية وصلته : حيدة خالى ولقيط وعلى وحاتم الطالى وهاب المئى ✿ولم يكن كخالك العبد الدعى .... هياب عمير غير ذكى .

بعض نے کہا ہے کہ سَاهِرَةٌ سے مرادروئے زمین (یعنی یہی زمین) ہے اور بعض کے نزدیک اَرْضِ آخرت مراد ہے اور اصل میں سَاهِرَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کثرت سے آمدورفت ہو۔ گویا وہ آمدورفت سے بیدار ہوچکی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۴۳) تَحَرَّكَ يَقْظَانُ التُّرَابِ وَنَائِمُهٗ

تو بیدار اور سوئی زمین ہل جاتی ہے۔

اور ناک کی دونوں رگوں کو اَسْهَرَان کہا جاتا ہے۔

(س ہ ل)

اَلسَّهْلُ کے معنیٰ نرم زمین کے ہیں اس کی جمع سُهُوْلٌ آتی ہے۔ اور یہ حَزْنٌ کی ضد ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا﴾ (۷۔۷۴) (کہ) نرم زمین سے (مٹی لے کر) محل تعمیر کرتے ہو۔

اور اَسْهَلَ کے معنیٰ نرم زمین میں جانے کے ہیں اور رَجُلٌ سَهْلِيٌّ کے معنیٰ میدانی علاقہ میں رہنے والا آدمی کے ہیں نَهْرٌ سَهْلٌ: جوئے ریگ ناک اور نرم خو آدمی کو رَجُلٌ سَهْلُ الْخُلُقِ کہا جاتا ہے۔ (اس کی ضد) حَزْنُ الْخُلُقِ ہے اور سُهَيْلٌ ایک ستارے کا نام ہے۔

(س ہ م)

اَلسَّهْمُ: وہ تیر جو چلایا جاتا ہے نیز قرعہ اندازی کے تیر وغیرہ کو سَهْمٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۴۱) اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اٹھائی۔

اور اِسْتَهَمُوْا (افتعال) کے معنیٰ قرعہ اندازی کرنے کے ہیں اور بُرْدٌ مُسَهَّمٌ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر تیر کی تصویر ہو۔

سَهُمَ (ف) سُهُوْمًا۔ اَلْوَجْهُ لاغرپن کی وجہ سے چہرے کا متغیر ہونا۔ اور اَلسُّهَامُ (بالضم والفتح) اس مرض کو کہتے ہیں جس سے چہرہ متغیر ہوجاتا ہے۔

(س ہ و)

اَلسَّهْوُ: (ن) وہ غلطی جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اسباب اور مولدات انسان کے اپنے اختیار سے پیدا کردہ نہ ہوں جیسے مجنون آدمی کا کسی انسان کو گالی دینا۔ دوم یہ کہ اس کے مولدات انسان کے خود پیدا کردہ ہوں جیسے کوئی شخص شراب نوشی کرے اور پھر اس سے (نشہ میں) بغیر ارادہ کے کوئی برائی صادر ہو پہلی قسم کی خطا تو عفو کے حکم میں ہے لیکن دوسری قسم کی خطا پر مواخذہ ہوگا۔ اور اس دوسری قسم کے سہو کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۱) بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۵) نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

---

[1] قاله ابان بن عبدة في قصيدة وصدره: وذانحن سرنابين شرق وغرب راجع الحماسة بشرح التبريزى (۲: ۹۴) والمرزوقى ۲۰۸ والحمان لابن ناقياص (۳۶۹).

(س ی ب)

﴿اَلسَّائِبَةُ﴾ (۵۔۱۰۳) وہ جانور ہے جو چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اسے پانی اور چارہ سے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو (جاہلیت میں) اس قسم کی آزادی اس جانور کو دی جاتی تھی جو پانچ بچوں کو جنم دے چکا ہوتا۔[1] اور اَلسَّائِبَۃُ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو آزاد کیا جائے اور اس کی ولاء کا حق دار معتق (آزادکنندہ) ہو۔[2] اور اسے حق حاصل ہو کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور اسی کے متعلق نہی وارد ہوئی ہے۔[3]

اَلسَّیْبُ عطا کو کہتے ہیں اور اَلسِّیْبُ (بکسرہ سین) پانی کے جاری ہونے کی جگہ اصل میں یہ سَیَّبْتُہٗ فَسَابَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا چنانچہ وہ چلا گیا۔ اور اِنْسَابَتِ (انفعال) اَلْحَیَّۃُ کے معنیٰ سانپ پانی کی طرح تیزی سے اپنے بل میں اتر گیا۔

(س ی ح)

اَلسَّاحَۃُ کے معنیٰ فراخ جگہ کے ہیں۔ اسی اعتبار سے مکان کے صحن کو سَاحَۃُ الدَّارِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ﴾ (۳۷۔۱۷۷) مگر جب وہ ان کے میدان میں آ اترے گا۔

اور وسیع مکان میں ہمیشہ جاری رہنے والے پانی کو سَائِحٌ کہا جاتا ہے اور سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ کے معنیٰ پانی کی طرح زمین میں چکر کاٹنا کے ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسِیْحُوا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ (۹۔۲) تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اور اسی سے ہمیشہ سفر کرنے والے آدمی کو سَائِحٌ یا سَیَّاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت: ﴿اَلسَّآئِحُوْنَ﴾ (۹۔۱۱۲) روزہ رکھنے والے۔

میں سَائِحُوْنَ بمعنیٰ صَائِمُوْنَ کے ہے۔ اسی طرح ﴿اَلسَّآئِحَاتُ﴾ (۶۶۔۵) سے روزہ رکھنے والی عورتیں مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو قسم پر ہے ایک حقیقی روزہ جو کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے سے عبارت ہوتا ہے اور دوسرا روزہ حکمی ہے۔ جو کہ جوارح یعنی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی سے روکنے کا نام ہے۔ تو سَائِحُوْنَ سے دوسری قسم کے روزہ دار مراد ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَائِحُوْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو آیت:

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (۲۲۔۴۶) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔

کے مقتضیٰ کے تحت زمین میں سفر کرتے ہیں۔ (یعنی

---

[1] فی الصحاح: عشرۃ ابطن وقد نھی عنه القران ولاسائبة (۵: ۱۰۳)۔

[2] کذافی المطبوع وفی الصحاح: ولایکون ولاءہ وھو الصحیح۔

[3] راجع المعاجم وابن الاثیر۔ راجع المستدرك الحاکم عن ابی ھریرۃ (انظر کنزالعمال ج ۲ رقم ۲۲ وفی الطبری (۱۱: ۲۸) مرفوعاً عن ابی ھریرۃ وفی اللسان قال الزجاج فی قول اھل التفسیر واللغة جمیعاً السائحون بمعنیٰ الصائمون قارن غریب القران للقتبی ۱۹۳۔

قدرت الٰہی کے آثار وعجائبات دیکھتے اور ان پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

(س و د)

اَلسَّوَادُ: (ضد بیاض) سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔اور اِسْوَدَّ (افعال) وَاِسْوَادَّ (افعیلال) کے معنیٰ کسی چیز کے سیاہ ہونے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ﴾ (۳۔۱۰۶)

جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔ تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہار مسرت اور سیاہ ہونے سے مراد اظہار غم ہے اسی طرح آیت:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ﴾ (۱۶۔۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔

میں بھی مُسْوَدًّا سے بھی مغموم ہونا مراد ہے۔بعض نے آیت:

﴿تَبْیَضُّ﴾ میں حسّی سفیدی اور سیاہی کے معنیٰ مراد لئے ہیں۔لیکن پہلا معنیٰ زیادہ بہتر ہے۔کیونکہ یہ چیز تو قیامت کے دن اعمال کے اعتبار سے حاصل ہوگی عام اس سے کہ وہ دنیا میں سیاہ فام ہوں یا سفید فام اور اسی سفیدی اور سیاہی کو دوسری آیات میں یوں فرمایا:

﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ﴾ (۷۵۔۲۲) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔

﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ﴾ (۷۵۔۲۴) اور بہت سے منہ اس روز اداس ہوں گے۔

﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ﴾ (۸۰۔۴۰،۴۱) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی)۔

﴿وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ مَالَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ کَاَنَّمَا اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا﴾ (۱۰۔۲۷) اور ان کے منہ پر ذلت چھا جائے گی اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں (کی سیاہی) کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھا دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح مومنین کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔[1]

(۱۸۰) یُحْشَرُوْنَ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ کہ قیامت کے دن آثار وضو سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔

اور دور سے جو چیز نظر پڑے اسے بھی سَوَاد کہا جاتا ہے اسی طرح آنکھ کی سیاہی کو بھی سَوَادُ الْعَیْنِ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔جیسا کہ کسی نے کہا ہے لَا یُفَارِقُ سَوَادِیْ سَوَادَہٗ میری آنکھ اس کے شخص سے جدا نہیں ہوتی اور بڑی جماعت کو بھی سَوَادٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ مروی ہے۔[2]

عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ: مسلمانوں کی بڑی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو (نہ اس سے علیحدگی اختیار کرو)

اور سَیِّدٌ کے معنیٰ بڑی جماعت کا سردار کے ہیں چنانچہ

---

[1] اخرجه الشيخان عن ابي هريرة وفي روايتهم جميعاً: ان امتي يدعون يوم القيامة غرا.......... راجع كنزالعمال (١٩ رقم ٤٩٧).

[2] رواه ابن ماجة وتتمته ان امتي لن تجتمع على ضلالة عن انس وذكر النبهاني في الفتح (١: ٣٧٥).

اضافت کے وقت سَیِّدُ الْقَوْمِ تو کہا جاتا ہے۔ مگر سَیِّدُ الثَّوبِ یا سَیِّدُ الْفَرَسِ نہیں بولا جاتا اور اسی سے سَادَ الْقَومَ یَسُوْدُھُمْ کا محاورہ ہے چونکہ قوم کے رئیس کا مہذب ہونا شرط ہے اس اعتبار سے ہر فاضل النفس آدمی کو سَیِّدٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت: ﴿وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (۳۔۳۹) اور سردار ہوں گے اور عورت سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں بھی سَیِّدٌ کا لفظ اسی معنیٰ پر محمول ہے۔ اور آیت: ﴿وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں کو...... عورت کا خاوند مل گیا۔

میں خاوند کو سید کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیوی کا نگران اور منتظم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿رَبَّنَا اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا﴾ (۳۳۔۶۷) اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا۔

میں سَادَتَنَا سے ولاۃ اور حکام مراد ہیں۔

(س ی ر)

اَلسَّیْرُ: (ض) کے معنیٰ زمین پر چلنے کے ہیں۔ اور چلنے والے آدمی کو سَائِرٌ وَسَیَّارٌ کہا جاتا ہے اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو سَیَّارَۃَ کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَآءَتْ سَیَّارَۃٌ﴾ (۱۲۔۱۹) (اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب) ایک قافلہ وارد ہوا۔

سِرْتُ: (ض) کے معنیٰ چلنے کے ہیں اور سِرْتُ بِفُلَانٍ نیز سِرْتُہٗ کے معنیٰ چلانا بھی آتے ہیں اور معنیٰ تکثیر کے لئے سَیَّرْتُہٗ کہا جاتا ہے۔

(الغرض سَیْرٌ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے) چنانچہ پہلے معنیٰ کے متعلق فرمایا:

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۱۲۔۱۰۹) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر (وسیاحت) نہیں کی۔

﴿قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۱۱) کہو کہ (اے منکرین رسالت) ملک میں چلو پھرو۔

﴿سِیْرُوْا فِیْھَا لَیَالِیَ﴾ (۳۴۔۱۸) کہ رات...... چلتے رہو۔ اور دوسرے معنیٰ یعنی سِرْتُ بِفُلَانٍ کے متعلق فرمایا:

﴿سَارَ بِاَھْلِهٖ﴾ (۲۸۔۲۹) اور اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر چلے۔

اور تیسری قسم یعنی سِرْتُہٗ (بدوں صلہ) کا استعمال قرآن پاک میں نہیں پایا جاتا اور چوتھی قسم (یعنی معنیٰ تکثیر) کے متعلق فرمایا:

﴿وَسُیِّرَتِ الْجِبَالُ﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے۔

﴿وَھُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۱۰۔۲۲) وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرانے کی توفیق دیتا ہے۔

اور آیت: ﴿سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۱۱) کہ ملک میں چلو پھرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاحت جسمانی ملک میں سیر (وسیاحت کرنا مراد ہے) اور بعض نے سیاحت فکری یعنی عجائبات قدرت میں غور وفکر کرنا اور حالات سے باخبر رہنا مراد لیا ہے جیسا کہ اولیاء کرام کے متعلق مروی ہے۔

اَبْدَانُھُمْ فِی الْاَرْضِ سَائِرَۃٌ وَقُلُوْبُھُمْ فِی الْمَلَکُوْتِ جَائِلَۃٌ (کہ ان کے اجسام تو زمین پر چلتے

پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی روحیں عالم ملکوت میں جولانی کرتی رہتی ہیں) بعض نے کہا ہے اس کے معنیٰ ہیں: عبادت میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس کے ذریعہ ثواب الٰہی تک رسائی ہوسکے اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے۔ [1]

(۱۸۱) سَافِرُوْا تَغْنَمُوْا: سفر کرتے رہو غنیمت حاصل کرلو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے پھر تسییر دو قسم پر ہے ایک وہ جو چلنے والے کے اختیار وارادہ سے ہو، جیسے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ﴾ (۱۰۔۲۲) وہی تو ہے جو تم کو...... چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

دوم وہ جو بذریعہ تسخیر کے ہو اور سَائِرٌ یعنی چلنے والے کے ارادہ واختیار کو اس میں کسی قسم کا دخل نہ ہو جیسے جبال کے متعلق فرمایا:

﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہوکر رہ جائیں گے۔

﴿وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ (۸۱۔۳) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اَلسِّيْرَةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے عام اس سے کہ اس کی وہ حالت طبعی ہو یا اکتسابی۔ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ السِّيْرَةِ: فلاں کی سیرت اچھی ہے۔

فلاں قَبِيْحُ السِّيْرَةِ: اس کی سیرت بری ہے اور آیت:

﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ (۲۰۔۲۱) ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

میں سیرۃ اولیٰ سے اس عصا کا دوبارہ لکڑی بن جانا ہے۔

(س و ر)

اَلسَّوْرُ: اس کے اصل معنیٰ بلندی پر کودنے کے ہیں اور غصہ یا شراب کی شدت پر بھی سَوْرَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: سَوْرَةُ الْغَضَبِ اور سَوْرَةُ الشَّرَابِ: (شراب کی تیزی) سِرْتُ اِلَيْكَ کے معنیٰ ہیں: میں تیری طرف چلا اور سَاوَرَنِيْ فُلَانٌ کے معنیٰ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے ہیں۔ اور سَوَّارٌ بمعنیٰ وَثَّابٌ یعنی عربدہ گر کے ہیں اور اَلْاَسْوَارُ اَسَاوِرَةُ الْفَرَسِ کا مفرد ہے جس کے معنیٰ تیرانداز کے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔

سِوَارُ الْمَرْاَةِ: (عورت کا بازوبند) یہ بھی معرب ہے اور اصل میں دَسْتَوَار ہے بہرحال اس کی اصل جو بھی ہو اہل عرب اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اشتقاق کرکے کہا جاتا ہے۔

سَوَّرْتُ الْمَرْاَةَ: میں نے عورت کو کنگن پہنائے اور جَارِيَةٌ مُسَوَّرَةٌ وَمُخَلْخَلَةٌ: اس لڑکی کو کہتے ہیں جس نے بازو بند اور پازیب پہن رکھی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] ولفظة الحديث سافر وا تصحوا ونغنموا والحديث في (هق عن ابن عباس) الشيرازي في الالقاب ملس وابو نعيم في الطب والقضاعي عن ابن عمر وفي رواية : وترزقوا (عب، عن محمد بن عبدالرحمن مرسلاً) راجع للحديث باختلاف الفاظه كنزالعمال ج (٦ ص ٢٨٨٨-٢٨٩٢) فانه ذكره بطرقة المختلفة وقد عقده ابوالفتح بن ابي حصين في بيت سافر وا تغنموا وقدقا ل عليه السلام صوموا تصحوا(راجع خاص الخاص للثعالبي ١٦٠) وفي المعاهد (٢ : ٨٥) اتمام الحديث بدل عليه السلام وقد نسبه الى عبدالمحسن بن محمد الصوري ١٢۔

﴿اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ (۴۳۔۵۳) سونے کے کنگن۔

﴿اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۶۔۲۱) چاندی کے کنگن۔

اور قرآن پاک میں سونے کے ساتھ اَسْوِرَةٌ جمع لاکر پھر خاص کر اُلْقِیَ کا صیغہ استعمال کرنا اور فِضَّةٌ سے قبل اَسَاوِرَ کا لفظ لاکر اس کے متعلق حُلُّوْا کا صیغہ استعمال کرنے میں ایک خاص نکتہ ملحوظ ہے جس کی تفصیل دوسری کتاب میں بیان ہوگی۔ ❶

اَلسُّوْرَةُ کے معنیٰ بلند مرتبہ کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۴۴) اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ اَعْطَاكَ سُوْرَةً
تَرَىٰ كُلَّ مَلِكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مرتبہ بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔

اور سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ کے معنیٰ شہر پناہ کے ہیں اور سُوْرَةُ الْقُرْاٰنِ (قرآن کی سورت) یا تو سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورہ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن پاک کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے۔اور یا سورۃ بمعنیٰ مرتبہ سے مشتق ہے اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلۃ ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہوسکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سُؤْرَةٌ مہموز مانا جائے تو یہ اَسْأَرْتُ سے مشتق ہوگا جس کے معنیٰ کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں۔اور سورۃ بھی چونکہ قرآن پاک کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے۔اس لئے اس کو سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت:

﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاهَا﴾ (۲۴۔۱) یہ (ایک) سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام وحِکَم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَسْأَرْتُ فِی الْقَدْحِ: سے مشتق ہے جس کے معنیٰ پیالہ میں کچھ باقی چھوڑنے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۲۴۵) لَا بِالْحَصُوْرِ وَلَا فِيْهَا بِسَآرٍ

نہ تنگ دل اور بخیل ہے اور نہ عربدہ گر۔

ایک روایت میں وَلَا بِسَوَّارٍ ہے جو سَوْرَةٌ بمعنیٰ شدت غضب سے مشتق ہے۔

(س و ط)

اَلسَّوْطُ (چمڑے کا کوڑا) بٹے ہوئے چمڑے کو

---

❶ اشارة الى تفسير القران الذى الفه بعد مفرداته .

❷ قاله النابغة فى مدح نعمان بن المنذر معتذراً انظر ديوانه ١٣ ومختار الشعرالجاهلى ١٧٥ وتفسير الطبرى (٥ : ٣٣٥) وامالى المرتضىٰ (١ : ٤٨٧) والصناعتين (٧٠٥) مع آخر ونقد الشعر٢٦ والحيوان (٣ : ٩٥) والعقد (٥) والحصرى (٣ : ٩٢) والسيوطى ٨٠ والعقد الفريد (٢ : ١٦٣) والصاحى ١٩٨.

❸ قاله الاخطل التغلبى واوله : وشارب مربح بالكاس نادمنى والبيت من قصيدة جمهرية ٣٢٦۔٣٣٠ فى ٥٠ بيتاً فيها يزيد بن معاوية والبيت فى ديوانه ١١٦ (ط بيروت ١٨٩١ء والبحر ١ : ١٠١/٢ : ٤٤٨ ومجالس ثعلب ١ : ٣١٥ والطبرى ٣ : ٢٥٥/١٥ : ٤٦ وشواهد الكشاف ٤٣ واللسان والمحكم والصحاح (حصر) والقرطبى ٤ : ٧٨ ومجازالقران ١ : ٩٢ وتهذيب الالفاظ ٢٢٦ وتهذيب الاصلاح ١ : ٢٥ مجموعة المعانى ١٩٨ والقتبى المعانى ٤٦٤ وفى روايته ولابسوارو هى رواية يعقوب فى اصلاحه ١٤٢، ٢٣٠ وابن قتيبه فى المعانى والجوهرى فى صحاحه ١٢.

کہتے ہیں جس کے ساتھ پیٹا جاتا ہے۔اصل میں سَوْطٌ کے معنیٰ کسی چیز کو خلط ملط کرنا کے ہیں اور اس سے فعل سُطْتُہٗ وَسَوَّطْتُہٗ آتا ہے اور کوڑے کو سوط اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی چند تسمے بٹنے سے باہم خلط ملط ہو جاتے ہیں۔اور آیت:

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹۔۱۳)

تو تمہارے پردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا۔
میں عذاب الٰہی کو دنیاوی سزا کے ساتھ تشبیہ دے کر سوط سے تعبیر کیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوڑے سے سزادی جاتی تھی بعض نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ لفظ سے انواع عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف کہ آیت: ﴿حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(س و ع)

اَلسَّاعَةُ: (وقت) اجزاء زمانہ میں سے ایک جزء کا نام ہے اور اَلسَّاعَةُ بول کر قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ (۵۴۔۱) قیامت قریب آ پہنچی۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ﴾ (۸۰۔۴۲) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے دن کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۴۳۔۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

تو قیامت کو سَاعَةٌ کہنا یا تو سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر ہے جیسے فرمایا:

﴿وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ﴾ (۶۔۶۲) اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور یا اس معنیٰ کے پیش نظر اسے سَاعَةٌ کہا ہے جس پر کہ آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا﴾ (۸۰۔۴۶) جب وہ اس کو دیکھیں گے تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے ہیں۔

﴿لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ﴾ (۴۶۔۳۵) (تو خیال کریں گے) کہ گویا دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن۔

اور آیت:

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ﴾ (۳۰۔۱۴) اور جس دن قیامت برپا ہوگی۔میں تنبیہ فرمائی ہے۔اور پہلی آیت یعنی ﴿يَوْمَ يَرَوْنَهَا﴾ میں "ھَا" ضمیر سے مراد قیامت ہے اور دوسری آیت میں سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ سے وقت قلیل مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ سَاعَات جن سے قیامت مراد ہوتی ہے تین ہیں۔

(۱) اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰى: یعنی لوگوں کو محاسبہ کے لئے اٹھانا یا دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

(۱۸۲) لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ........ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگ جائے اور درہم و دینار کی پرستش نہ ہونے لگے اور آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بہت سی

علامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو نہ آپ کے زمانہ میں ظاہر ہوئیں اور نہ بعد میں اب تک ان کا ظہور ہوا ہے۔ ❶

(۲) اَلسَّاعَةُ الْوُسْطیٰ: جو کہ ایک قرن کے لوگ گزر جانے سے عبارت ہے جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا: ❷

(۱۸۳) اِنْ يَّطُلْ عُمُرُ هٰذَا الْغُلَامِ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ: اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ قیامت سے پہلے نہیں مرے گا۔

چنانچہ بعض کا قول ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے آخر فوت ہوئے ہیں۔

(۳) اَلسَّاعَةُ الصُّغْرىٰ: جو کہ انسان کی موت سے عبارت ہے پس اس معنیٰ کے لحاظ سے ہر انسان کی موت اس کے لئے قیامت ہے۔ ❸ چنانچہ اسی معنیٰ کی طرف آیت:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ﴾ (۶۳۔۱۰) جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔اور آیت:

﴿قُلْ اَرَاَيْتَكُمْ اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ﴾ (۶۔۴۰) (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو۔

میں اَلسَّاعَةُ سے مراد موت ہی ہے ایک حدیث میں ہے۔

(۱۸۴) کہ جب سخت آندھی چلتی تو آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہوجاتا اور فرماتے تَخَوَّفْتُ السَّاعَةَ کہ مجھے قیامت کا اندیشہ ہے۔ نیز فرمایا:

(۱۸۵) وَمَا اَحُدُّ طَرْفِيْ وَلَا اَغُضُّهَا اِلَّا وَاَظُنُّ اَنَّ السَّاعَةَ قَدْ قَامَتْ کہ جب میں اپنی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ بس قیامت آچکی یعنی مجھے اپنی موت کا ہر لحہ خیال رہتا ہے جس طرح کہ عَامَلْتُهٗ مُعَاوَمَةً وَ يَا مُشَاهَرَةً کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ سال یا مہینہ کے حساب سے معاملہ کرنے کے ہیں اسی طرح ساعات کے حساب سے معاملہ کرنے کے معنیٰ میں عَامَلْتُهٗ مُسَاوَعَةً استعمال ہوتا ہے اور جَآئَنَا بَعْدَ سَوْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَسَوَاعٍ کے معنیٰ ''سکون شب کے بعد وہ ہمارے پاس آیا'' اور پھر سَاعَةِ سے کبھی اہمال (ضائع کرنا) کے معنیٰ بھی

---

❶ منها خروج الدابة ونزول المسيح وظهور الدجل وطلوع الشمس من مغربها والى ذالك ۱۲.

❷ وفي صحيح مسلم (۲: ۴۰۶) والبخاري من حديث النبي صلى الله عليه وسلم: ان يعش هذاالغلام فعسىٰ ان لايدركه الهرم حتىٰ تقوم الساعة واما اسم هذاالغلام اراه في رعاية صحيحة وفي صحيح مسلم الى غلام من ازد شنوئة وقال انس وكان من اترابي ومعنىٰ الحديث يموت ذالك القرن واولائك المخاطبون قال النووي ويحتمل انه علم ان هذا الغلام لايبلغ الهرم راجع للبحث الفتح للحافظ (۱۴: ۱۴۹۔۵۰).

❸ وفي الحديث من مات فقد قامت قيامته. كماروي في الحديث من مات فقد قامت قيامته انظر الفردوس لابي شجاع الديلمي وبمعناه في الطبري من حديث المغيرة بن شعبة وابن ابي الدنيا من حديث انس بسند ضعيف راجع تخريج الكشاف رقم ۵ وتخريج الاحياء للعراقي (۴: ۶۴)

لئے جاتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

اَسَغْتُ الْاِبِلَ: (افعال) میں نے اونٹوں کو بے کار چھوڑ دیا یا ضائع کردیا۔ ھُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ: وہ مہمل اور بے کار ہے۔

سُوَاعٌ: ایک بت کا نام ہے۔[1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا﴾ (۷۱۔۲۳) اور ودّ اور سُواع...... کو کبھی ترک نہ کرو۔

(س و غ)

سَاغَ الشَّرَابُ فِی الْحَلْقِ: کے معنیٰ شراب کے آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں وَاَسَاغَهٗ كَذَا (افعال) کے معنیٰ حلق سے نیچے اتارنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ﴾ (۱۶۔۶۶) پینے والوں کے لئے خوش گوار ہے۔

﴿وَلَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ﴾ (۱۴۔۱۷) اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔سَوَّغْتُهٗ مَالًا میں نے اس کے لئے مال خوشگوار بنادیا یعنی مباح کردیا اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ سَوْغُ اَخِیْهِ کا محاورہ اس بچے کے متعلق استعال ہوتا ہے جو اپنے بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو (یہ مذکر ومؤنث دونوں کے حق میں بولا جاتا ہے)

(س و ف)

سَوْفٌ: (حرف تسویف) یہ حرف ہے جو فعل مضارع کو معنیٰ حال سے مجرد کرکے معنیٰ استقبال کے لئے خاص کردیتا ہے (اسی لئے سے حرف استقبال بھی کہتے ہیں) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ﴾ (۲۔۹۸) میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا۔

اور آیت:﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (۶۔۱۳۶) عنقریب تم کو معلوم ہوجائے گا۔

میں متنبہ کیا ہے کہ جس بات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ حاصل نہیں ہے۔لیکن وہ لامحالہ ہوکر رہے گی۔ اور اس میں مُمَاطَلَة (ٹال مٹول) اور تاخیر کے معنیٰ پائے جاتے ہیں اور چونکہ وعدہ کرنے والا سَوْفَ اَفْعَلُ كَذَا کا محاورہ استعال کرتا ہے اس لئے اَلتَّسْوِیْفُ (تفعیل) کے معنیٰ ٹال مٹول کرنا بھی آجاتے ہیں۔

اَلسَّوْفُ (ن) کے معنیٰ مٹی یا بول کی بو سونگھنے کے ہیں پھر اس سے اس ریگستان کو جس میں راستہ کے نشانات مٹے ہوئے ہوں اور (قافلہ کا) رہنما اس کی مٹی سونگھ کر راہ دریافت کرے اسے "مَسَافَةٌ" کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے۔[2]

(۲۴۶) اِذَا الدَّلِیْلُ اسْتَافَ اَخْلَاقَ الطُّرُقِ

---

[1] سواع لم يوجد اصله فی كلام العرب ويمكن ان يكون مشتقا من السوع بمعنی الزمان وانظر لود(ورد) وهما من الآلهة التی كانت قوم نوح تعبدها.

[2] قاله رؤية بن العجاج الراجز الاسلامی فی ارجوزة له ۱۷۴ بيتاً وهی فی ديوانه (۱۰۴۔۱۰۸) وقبله، مسودة الاعطاف من وسم العرق وبعده: كانها حقباء بلقاء الزحق والشطر وحده فی خزانة الادب (۱: ۸۸) وديوانه (۱۰۵) والاقتضاب (۳۱۲) وادب الكاتب ۵۱ واضداد ابی الطيب ۶۹۸ واصلاح يعقوب ۳۱۶.

جب رہنما بے نشان راستوں پر سونگھ سونگھ کر چلے۔

اَلسُّوَافُ: اونٹوں کے ایک مرض کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں اور اس سے موت کی بو سونگھ لیتے ہیں یا موت ان کو سونگھ لیتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے جلدی ہی ان کی موت آ جاتی ہے۔

(س و ق)

سَوْقُ الْاِبِلِ: کے معنیٰ اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں یہ سُقْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے اور اِنْسَاق (انفعال) کے معنیٰ ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں۔ ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں، سَیِّقَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سُقْتُ الْمَهْرَ اِلَى الْمَرْأَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ عرب حق مہر میں (عام طور پر) اونٹ دیا کرتے تھے۔ اور آیت: ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ﴾ (۷۵۔۳۰) میں مساق کے معنیٰ پروردگار کی طرف چلنا کے ہیں جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ (۵۱۔۴۲) میں ہے یعنی تمہیں اپنے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

اور آیت: ﴿مَعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ﴾ (۵۰۔۲۱) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا۔

میں سائق سے وہ فرشتہ مراد ہے جو اسے چلا کر حساب کے لئے پیش کرے گا اور دوسرا فرشتہ شہید (بطور گواہ) کے اس کے ساتھ ہوگا جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ﴾ (۸۔۶) گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں۔ کے ہم معنیٰ ہے اور آیت:

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ (۷۵۔۲۹) اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبض روح کے وقت پنڈلیوں کا لپٹنا مراد ہے اور بعض نے پنڈلیوں کا کفن میں لپیٹنا مراد لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اُن کے لپیٹنے سے مراد موت ہے کہ زندگی میں وہ اس کے بوجھ کو اٹھا کر چلتی تھیں لیکن موت کے بعد وہ اس بار کی متحمل نہیں ہو سکیں گی۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک شدت کا دوسری شدت سے لپٹنا مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۶۸۔۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔ میں پنڈلی سے کپڑا اٹھانا صعوبت حال سے کنایہ ہے۔ اور یہ كَشَفَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ لڑائی کے سخت ہو جانے کے ہیں۔ بعض نے اس کی اصل یہ بیان کی ہے کہ جب اونٹنی کے پیٹ میں بچہ مر جاتا ہے تو مُزَمِّرْ (جنوانے والا) اس کے رحم کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے پنڈلیوں سے پکڑ کر زور سے باہر نکالتا ہے اور یہ كَشَفَ عَنِ السَّاقِ کے اصل معنیٰ ہیں پھر ہر ہولناک امر کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہونے لگا ہے تو یہاں بھی شدت حال سے کنایہ ہے اور آیت:

﴿فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ (۴۸۔۲۹) اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سُوْق سَاقٌ کی جمع ہے جیسے لَابَةٌ کی جمع لُوْبٌ اور فَارَةٌ کی جمع فُوْرٌ آتی ہے اور اسی طرح آیت:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳)

پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔
میں بھی سُوْق صیغہ جمع ہے اور رَجُلٌ اَسْوَقُ کے معنیٰ بڑی پنڈلیوں والے آدمی کے ہیں اس کی مؤنث سُوْقَاءُ آتی ہے اور سُوْقٌ کے معنیٰ بازار بھی آتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے اور فروخت کے لئے وہاں سامان لے جایا جاتا ہے۔اس کی جمع اَسْوَاقٌ ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (۲۵۔۷) یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔
اَلسَّوِيْقُ کے معنیٰ ستو کے ہیں کیونکہ وہ بغیر چبائے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

(س و ل)

اَلتَّسْوِيْلُ: کے معنیٰ نفس کے اس چیز کو مزین کرنا کے ہیں جس پر اسے حرص بھی ہو اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا﴾ (۱۲۔۸) بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنا لائے۔
﴿اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۵) شیطان نے (یہ کام) انہیں مزین کر دکھایا۔
بعض ادباء نے [1]
(۲٤۷) سَأَلَتْ هُذَيْلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاحِشَةً
(بنی ہذیل نے آنحضرت ﷺ سے ایک فحش امر کا مطالبہ کیا)
میں کہا ہے کہ یہاں سَأَلَتْ بمعنیٰ طَلَبَتْ ہے اور یہ سَأَلَ (مہموز) سے نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادباء نے خیال کیا ہے۔

(س ی ل)

سَالَ الشَّيْءُ يَسِيْلُ کے معنیٰ کسی چیز کے بہنے کے ہیں۔اور اَسَلْنَا کے معنیٰ بہادینے کے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ﴾ (۳۴۔۱۲) اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔
یہاں اَسَلْنَا کے معنیٰ پگھلا دینے کے ہیں۔لیکن فی الحقیقت اِسَالَةٌ کا لفظ قطر کی اس حالت پر بولا جاتا ہے جو پگھلانے کے بعد ہوتی ہے۔
اَلسَّيْلُ: (ض) یہ اصل میں سَالَ يَسِيْلُ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ بہنے کے ہیں اور بطور اسم اس پانی پر بولا جاتا ہے جو دور سے بہہ کر کسی جگہ پر آجائے اور وہاں برسانہ ہو۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر (برساتی) نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔
﴿سَيْلَ الْعَرِمِ.........﴾ (۳۴۔۱۶) زور کا سیلاب۔
اَلسَّيْلَانُ: (دنبالۂ شمشیر و کارد وغیرہ) اس لمبے لوہے کو کہتے ہیں جو نصاب کی جانب سے تلوار، چھری وغیرہ کے

---

[1] قاله حسان بن ثابت الانصاری وتمامه : ضلت هذيل بماجائت ولم تصب والبيت فی ديوانه ٣٤ والكتاب (٢ : ٣٠) وقال اصله مهموز ۔ وذكر المولف فی محاضراته (٣ : ٢٥٩) ان اباكبير الهذلی جاء الی رسول الله صلی الله عليه وسلم فسأله ان يحل الزنا فقال اتحب ان يوتی اليك فی حرمك مثل ذالك قال لاثم قال فادع الله ان يذهب منی الشبق فدعا له فقال حسان...... وانظر للقصة ايضاً اسد الغابة (٥ : ٢٨٢) ذكر ابوكبير الهذلی وبعده اشعار.

دستہ میں لگا ہوتا ہے۔

(س ء ل)

اَلسُّؤالُ کے معنٰی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں جو مؤدی الی المعرفة ہو۔ نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سُؤَالٌ کہا جاتا ہے جو مؤدی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام بن سکتا ہے پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سوال کے معنٰی استدعا معرفت کیسے صحیح ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سوال کرے گا۔

جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ﴾ (۵۔۱۱۶) اور (اس وقت) کو بھی یاد رکھو۔ جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سوال کرنا کسی قسم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ تو علام الغیوب ہے۔ (وَلَا تَخْفٰى عَلَيْهِ خَافِيَةٌ) بلکہ لوگوں کو بتلانے اور انہیں سرزنش کرنے کی غرض سے ہوگا لیکن پھر بھی یہ سوال سوال عن المعرفة، کبھی کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی محض سرزنش کے لئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ (۸۱۔۸) جب لڑکی سے جو زندہ دفنائی گئی ہے پوچھا جائے گا۔

اور کبھی صرف مسؤل (جس سے سوال کیا جائے) کو جتلانے کے لئے (نہ کہ خود کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے)

اور سوال جب کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف کبھی تو وہ متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے اور کبھی حرف جار کے ذریعہ چنانچہ تم کہو گے: سَأَلْتُهٗ كَذَا وَسَاَلْتُهٗ عَنْ كَذَا وَبِكَذَا: لیکن زیادہ تر بواسطۂ عن کے متعدی ہوتا ہے جیسے کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ (۱۷۔۸۵) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ (۱۸۔۸۳) اور تم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾ (۸۔۱) (اے محمد ﷺ! مجاہد لوگ) تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ﴾ (۲۔۸۲) اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ (۷۰۔۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔

اور جب سوال طلب مال کے لئے ہو تو وہ متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے۔اور بذریعہ "مِنْ" کے بھی چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (۳۳-۵۳) اور جب پیغمبروں کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔

﴿وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (۶۰-۱۰) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو تم ان سے طلب کرو۔اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں۔

﴿وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو اسے سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۹۳-۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

﴿لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمُ﴾ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے۔

(س و م)

اَلسَّوْمُ: کے معنیٰ کسی چیز کی طلب میں جانے کے ہیں پس اس کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے یعنی طلب اور جانا پھر کبھی صرف ذہاب یعنی چلے جانا کے معنیٰ ہوتے ہیں۔جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ: اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لئے چلے گئے۔اور ان اونٹوں کو جو باہر چرنے کے لئے جاتے ہیں سَائِمَةٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صرف طلب کے معنیٰ پائے جاتے ہیں جیسے سُمْتُ كَذَا: میں نے اسے فلاں تکلیف دی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (۲-۴۹) وہ لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے ہیں۔اور سِيْمَ فُلَانٌ الْخَسَفَ (فلاں کو خسف کا عذاب دیا گیا) يَا هُوَ يُسَامُ الْخَسْفَ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے اور اسی سے بَيعَ میں السَّوْمُ ہے جس کے معنیٰ نرخ کرنا کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے۔ ❶

(۱۸۶) صَاحِبُ السِّلْعَةِ اَحَقُّ بِالسَّوْمِ: سامان کا مالک نرخ کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

اور سُمْتُ الْاِبِلَ فِي الْمَرْعىٰ کے معنیٰ چراگاہ میں چرنے کے لئے اونٹ بھیجنے کے ہیں۔اور اسی معنیٰ میں اَسَمْتُ الْاِبِلَ (افعال) وَسَوَّمْتُهَا (تفعیل) آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ﴾ (۱۶-۱۰) اور اس سے درخت بھی (شاداب) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔

اَلسِّيْمَاءُ وَالسِّيْمِيَاءُ کے معنیٰ علامت کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطّويل)

---

❶ البخاری فی ترجمة الباب۔

❷ فی اللسان (سوم) قاله ابن عنقاء الفزاری فی عميلة الفزاری واوله :غلام رماه الله بالخير بافعاً...... وفی رواية ابن الانباری بالحسن بدل الخير وانظر الخبر والشعرفی الحماسة (۴: ۶۸ط مصر) والمرزوقی ۱۵۸۸والحصری (۴: ۱۰۴) والكامل (۱: ۲۲) والاغانی (۱۷: ۱۱۷) والطبری (۳: ۹۸/۴: ۸۴/۸: ۱۹۶) وشواهد الكشاف ۵۲ وابن ولاد ۶۲ والبحر (۲: ۳۱۶/ ۸: ۱۰۲) والمعجم للمرزبانی (۱۹۹) فی خمسة ابيات والمؤتلف للآمدی ۲۳۸ وبعده كان الثرياعلقت فی جبينه وفی انفه الشعرى وفی جيدها القمر وفی رواية فوق نحره وعنقاء امه واسمه قيس بن بجيره الفزاری المخضرمی والبيت الثانی قاله علی بن طلحة حين قال فيه قوم راجع العقد (۴: ۳۲۲)۔

(۲۴۸) لَهٗ سِيْمِيَاءُ لَا تَشُقُّ عَلَى الْبَصَرِ
اس کے چہرے پر نشان ہے جو آنکھوں پر گراں نہیں گزرتا
قرآن پاک میں ہے:
﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (۴۸۔۲۹) (کثرت سجود کے اثر سے) ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔
اور سَوَّمْتُهٗ کے معنیٰ نشان زدہ کرنے کے ہیں۔
اور ﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ (۳۔۱۲۵) کے معنیٰ مُعَلِّمِيْنَ کے ہیں یعنی نشان زدہ اور مُسَوِّمِيْنَ (بصیغہ فاعل) کے معنیٰ ہیں: اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان امتیاز بنانے والے یا ان کو چھوڑنے والے۔
آنحضرت ﷺ سے ایک روایت میں ہے ❶:
(۱۸۷) تَسَوَّمُوْا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ
کہ تم بھی نشان بنا لو کیونکہ فرشتوں نے اپنے لئے نشان بنائے ہوئے ہیں۔

(س ء م)

اَلسَّآمَةُ: اس کے معنیٰ کسی چیز کے زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر یا دل برداشتہ ہوجانے کے ہیں اور یہ فعلاً (کسی کام کو زیادہ عرصہ تک کرنے) اور انفعالًا (کسی چیز سے زیادہ متاثر ہونے) دونوں طرح ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ﴾ (۴۱۔۴۹) اور (کبھی) تھکتے ہی نہیں۔
نیز فرمایا:
﴿لَا يَسْأَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ﴾ (۴۱۔۴۹) انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔❷ (الطویل)
(۲۴۹) سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَّعِشْ
ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا اَبَا لَكَ يَسْأَمِ
میں زندگی کی خوشگواریوں سے اکتا چکا ہوں۔ ہاں جو شخص اسّی کو پہنچ جائے وہ لامحالہ اکتا ہی جاتا ہے۔

(س ی ن)

طُوْرِ سَيْنَاءَ: یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ﴾ (۲۳۔۲۰) (اور وہ درخت بھی ہم ہی نے پیدا کیا) جو طور سیناء میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ حرف اول یعنی سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ فتح کی صورت میں قطعی طور پر الف ممدودہ برائے تانیث ہوگا کیونکہ عربی زبان میں فَعْلَالٌ کا وزن صرف کلمہ مضاعف کے ساتھ مختص ہے جیسے زَلْزَالٌ وَقَلْقَالٌ اور سین کے مکسور ہونے کی صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا الف عِلْبَاءَ اور حِرْبَاءُ کی طرح (برائے تانیث) ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ الف سِرْوَاحٌ کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ہو اور اسی کو (دوسری جگہ) ﴿طُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾ (۹۵۔۲) بھی کہا گیا ہے۔
اَلسِّيْنُ: حروف ہجاء میں سے ایک حرف کا نام ہے۔

---

❶ اخرجه الطبری عن عمير بن اسحاق (٤: ٨٢) وفی النهاية (سوم) سوّموا فان الملائكة قد سومت ١٢.
❷ قاله زهير بن ابی سلمىٰ والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (١: ١٥٧) والبحر (٢: ٣٥١) والمحاضرات (٤: ٤٩٨) والجمهرة ١١٠ والعقد الثمين ٩٦ وايام العرب ٢٧٦ والجامع الكبير للجزری ١٢٠ والمعلقات لابن الانباری ٢٨٧ وفی روايته عاماً بدل حولا وابن الشجری (١: ٣٦٢) والسيوطی ١٣٢.

(س و ی)

اَلْمُسَاوَاۃُ کے معنی وزن، کیل یا مساحت کے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں۔جیسے محاورہ ہے:

ھٰذَا الثَّوْبُ مُسَاوٍ لِّذَاكَ الثَّوْبِ یہ کپڑا اس کپڑے کے مساوی ہے۔ھٰذَا الدِّرْھَمُ مُسَاوٍ لِّذَالِكَ الدِّرْھَمِ: یہ درہم اس درہم کے مساوی ہے اور کبھی لحاظ کیفیت کے برابری ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے: ھٰذَا السَّوَادُ مُسَاوٍ لِّذَالِكَ السَّوَادِ کہ یہ سیاہی اُس سیاہی کے برابر ہے مگر اصل میں یہاں مساوات بلحاظ ذات سواد کے مرادنہیں ہوتی بلکہ بلحاظ محل کے ہوتی ہے اور معنیٰ معادلت (برابر) کے لحاظ سے یہ لفظ یوں عدل وانصاف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۲۵۰) اَبَیْنَا فَلَا نُعْطِي السَّوَاءَ عَدُوَّنَا

ہم انکار کردیتے ہیں اور اپنے دشمن کو عدل وانصاف نہیں دیتے۔اِسْتَوٰی: اس کا استعمال دوطرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک دو یا دو سے زیادہ فاعل کی طرف اس کی اسناد ہو جیسے:اِسْتَوٰی زَیْدٌ وَعَمْرٌو فِیْ کَذَا کہ زید اور عمر وفلاں چیز میں برابر ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۹۔۱۹) یہ لوگ خدا کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔

دوم: یہ کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰی﴾ (۵۳۔۶) (یعنی جبرائیل علیہ السلام) طاقتورنے۔پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ﴾ (۲۳۔۲۸) جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ۔

اور محاورہ ہے:

اِسْتَوٰی اَمْرُ فُلَانٍ کہ فلاں کا معاملہ ٹھیک اور صحیح ہوگیا اور جب عَلٰی کے ذریعہ متعدی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز پر (چڑھنے، قرار پکڑنے اور) مستولی ہونا کے ہوتے ہیں۔جیسے محاورہ ہے:

اِسْتَوٰی فُلَانٌ عَلٰی عُمَالَتِهٖ فلاں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔قرآن میں ہے:

﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ﴾ (۴۳۔۱۳) تاکہ تم ان کی سواری کرو۔

﴿فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ﴾ (۴۸۔۲۹) اور پھر وہ اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

اور اسی سے آیت:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ (۲۰۔۵) (خدائے) رحمٰن، جس نے عرش پر قرار پکڑا ہے اور بعض نے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کے سامنے مساوی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ان کو درست بنانے سے سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست ہوگئی ہیں۔جیسا کہ آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ﴾ (۲۔۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک (سات آسمان) بنادیا۔

میں ہے بعض نے آیت:﴿اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

[1] قاله عنترة وتمامه: قياماً باعضاد السراء المعطف والبيت في مختار الشعر الجاهلي (۱: ۲۹) والعقد الثمين.

کے معنیٰ یہ بیان کئے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ بنسبت دوسری چیز کے اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتے۔

اور جب یہ لفظ (اِسْتَوٰی) متعدی بالٰی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز تک بالذات یا بالتدبیر پہنچ جانے کے ہوتے ہیں اور آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ﴾ (۴۱۔۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

میں دوسرے معنیٰ مراد ہیں یعنی اَلْاِنْتِھَاءُ اِلَیْھَا بِالتَّدْبِیْرِ: یعنی تدبیر کرنا۔

اَلتَّسْوِیَۃُ کے معنیٰ کسی چیز کو ہموار کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ﴾ (۸۲۔۷) (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سَوّٰکَ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا﴾ (۹۲۔۷) اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قویٰ کو برابر بنایا۔

میں لفظ "ھَا" سے ان قوائے نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے مُقَوِّم بنایا ہے چنانچہ فعل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ بحث دوسرے مقام پر مذکور ہو چکی ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعلِ حقیقی کی طرف ہوتی ہے اسی طرح آلہ اور ان تمام چیزوں کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوتی ہے جن کا کہ وہ فعل محتاج ہوتا ہے۔ جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ (کہ یہاں فعل قطع کی نسبت تلوار کی طرف ہے جو آلہ قطع ہے) اور آیت کی یہ توجیہ جو ہم نے بیان کی ہے اس قول سے بہتر ہے جو مَا سَوّٰھَا سے اللہ تعالیٰ مراد لیتے ہیں کیونکہ لفظ ما جنس کے لئے موضوع ہے اور سمع (یعنی کسی دلیل سمعی) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال ہوا ہو۔ لہٰذا اس سے ذات باری تعالیٰ مراد نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی﴾ (۸۷۔۱،۲) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا۔

میں سَوّٰی فعل (بلا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۱۵۔۲۹) جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کرلوں اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ اور اسی طرح دوسری آیت:

﴿رَفَعَ سَمْکَھَا فَسَوّٰھَا﴾ (۷۹۔۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔

میں بھی فعل تَسْوِیَۃ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے اور آیت فَسَوّٰھَا میں آسمان کا تسویہ اس کی بناوٹ اور تزیین دونوں کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ﴾ (۳۷۔۶) بے شک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔ میں مذکور ہے۔

اَلسَّوِیُّ: اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے

لحاظ سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا.........﴾ (۱۹۔۱۰) سالم تین رات اور دن.........
﴿مَنْ اَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ﴾ (۲۰۔۱۳۵) (دین کے) سیدھے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔
اور رَجُلٌ سَوِیٌّ: اس مرد کو کہا جاتا ہے جس میں خلق وخلقت دونوں اعتبار سے اعتدال پایا جائے اور افراط وتفریط سے محفوظ ہو۔اور آیت:
﴿عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ......﴾ (۷۵۔۴) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی پور پور درست کر دیں۔
میں تَسوِیَۃُ الْبَنَانَ سے مراد ہتھیلی کو اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دینا مراد ہے کہ اس کی انگلیاں نہ ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ تَسْوِیَۃُ الْبَنَان سے تمام انگلیوں کو یکساں بنا کر بے کار کر دینا مراد ہے کیونکہ انگلیوں کے قدر وہیئت میں متفاوت ہونے کی حکمت ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں کسی چیز کے پکڑنے میں باہم تعاون کرتی ہیں اور اگر وہ سب برابر ہوتیں تو یہ تعاون ناممکن تھا اور آیت:
﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾ (۹۲۔۱۴) تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا، سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔
میں سَوّٰهَا سے ان کے شہروں کو برباد کر کے زمین کے ساتھ برابر کر دینا مراد ہے جیسا کہ فرمایا:
﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ (۲۔۲۵۹) جو کہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہوئی تھیں۔
اور بعض نے فَسَوّٰهَا کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ ان کے شہروں کو ان پر برابر کر دیا جیسا کہ آیت:
﴿لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ﴾ (۴۔۴۲) کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی۔
میں مذکور ہے اور یہ کفار کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا﴾ (۷۸۔۴۰) اور کافر کہے گا: اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ میں مذکور ہے۔
مَكَانٌ سُوًى وَسَوَاءٌ کے معنیٰ وسط کے ہیں۔اور سَوَاءٌ وَسِوًى وَسُوًى: اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سَوَاءٌ وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف بھی۔لیکن اصل میں یہ مصدر ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ سَوَاءِ الْجَحِيْمِ......﴾ (۳۷۔۵۵) (تو اس کو) وسط دوزخ میں۔
﴿سَوَآءَ السَّبِيْلِ......﴾ (۲۔۱۰۸) (تو وہ) سیدھے راستے سے۔
﴿فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ (۸۔۵۸) تو (ان کا عہد) انہی کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔
تو یہاں عَلٰى سَوَآءٍ سے عادلانہ حکم مراد ہے۔جیسے فرمایا:
﴿اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۳۔۶۴) (اے اہل کتاب!) جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ۔
اور آیات:
﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ (۲۔۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔
﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ

لَهُمْ﴾ (۶۳۔۶) تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۱۴۔۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

میں سَوَاءٌ سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عدم نفع میں برابر ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲۔۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

اور کبھی سِوًى وَسَوَآءٌ بمعنیٰ غیر (حرف استثناء) بھی آجاتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (1)

(۲۵۱) فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا سِوَى هَامِدِ

جسم مردہ کے سوا ان میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (2) (الطّویل)

(۲۵۲) وَمَا قَصَدَتْ مِنْ اَهْلِهَا لِسَوَائِكَا:

اور اس اونٹنی نے اس شہر کے اہل میں سے تیرے سوا کسی کا قصد نہیں کیا۔

وَعِنْدِيْ رَجُلٌ سِوَاكَ: تیرے علاوہ میرے پاس دوسرا آدمی ہے۔

اَلسِّيُّ: کے معنیٰ مساوی کے ہیں۔ جیسے عِدل بمعنیٰ مُعَادِلٌ اور قِتْلٌ بمعنیٰ مُقَاتِلٌ کے آجاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے: سِيَّانِ زَيْدٌ وَعَمْرٌو زید اور عمرو دونوں برابر ہیں۔ اور سِيٌّ کی جمع اَسْوَاءٌ آتی ہے جیسے نِقْضٌ کی جمع اَنْقَاضٌ اور بہت سے ہم مرتبہ یا برابر کے لوگوں کے لئے قَوْمٌ اَسْوَاءٌ وَمُسْتَوُوْنَ کہا جاتا ہے۔

اَلْمُسَاوَاةُ: عرف میں ثمنی اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے هٰذَا الثَّوبُ يُسَاوِيْ كَذَا کہ اس کپڑے کی اتنی قیمت ہے اصل میں یہ سَاوَاهُ فِي الْقَدْرِ یا مرتبہ میں برابر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾ (۱۸۔۹۶) جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا۔

(س و ی)

اَلسُّوْءُ: ہر وہ چیز جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے اسے سوء کہا جاتا ہے خواہ وہ امور دنیوی کے قبیل سے ہو یا اخروی کے۔ اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے یا ان امور خارجیہ سے ہو جن کا تعلق جاہ وجلال کے چلے جانے یا کسی قریبی رشتے دار یا دوست کے فوت ہو جانے سے ہوتا ہے اور آیت:

﴿بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ﴾ (۲۰۔۲۲) وہ کسی عیب کے بغیر (چمکتا دمکتا) نکلے گا۔

میں سوء سے مراد آفت یعنی بیماری ہے بعض نے سُوْءٌ سے برص مراد لی ہے لیکن یہ منجملہ ان امراض کے ایک ہے

---

(1) لم اجده ویرجیٰ.

(2) البیت من قصیدة لاعشیٰ میمون مدح بها هوذة بن علی بن ثمامه رئیس الیمامة وصدره : تجانف عن جوالیمامة ناقتی وفی روایة اللسان والتاج (سوی) عدلت بدل قصدت وفی روایة ابن الشجری (۱ : ۳۵) جل الیمامه بدل الیمامة وفی الخزانة (۳ : ۳۹۹) عمدت بدل قصدرت والبیت ایضاً فی اللسان (جنف) وامالی ابن الشجری (۲ : ۴۵, ۲۵۳) وشرح الدیوان لثعلب ۶۴ وابن ولاد ۶۲ والاشباه (۳ : ۶۹) ودیوانه ۱۳۱ والکامل ۱۱۸ والبحر (۱ : ۴۹۸) والصاحبی ۱۵۴ وشرح شواهد للشنتمری (۱ : ۱۳) والکتاب (۱ : ۲۰۳) والبلدان (جو) واضداد ابی الطیب ۳۵۸ وفیه تزاور بدل تجانف واضداد ابن الانباری وفی روایته عدلت بدل قصدت والبیت من شواهد النحاة علی ان لفظة سواء قد یکون اسماً بمعنیٰ غیر وفیه بحث ۱۲.

جو ہاتھ کو لگ جاتے ہیں اور (عذاب) اخروی کے متعلق فرمایا:
﴿اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکَافِرِیْنَ﴾ (۱۶:۲۷) ان کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔
اور ہر وہ چیز جو قبیح ہو اسے "سُوْآی" سے تعبیر کرتے ہیں۔اسی لئے یہ لفظ "اَلْحُسْنٰی" کے مقابلہ میں آتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَاؤُا السُّوْآیٰ﴾ (۳۰۔۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی انکا انجام بھی برا ہوا۔
جیسے اس کے مقابلہ میں فرمایا:
﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ﴾ (۱۰۔۲۶) جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔
اور سَیِّئَةٌ کے معنیٰ برائی کے ہیں اور یہ حَسَنَةٌ کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً﴾ (۲۔۸۱) ہاں! جو برے کام کرے۔
﴿لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ (۲۷۔۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو۔
﴿یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) گناہوں کو دور کر دیتی ہے۔
﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (۴۔۷۹) (اے آدم زاد!) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔
﴿فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ (۱۶۔۳۴)
﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ﴾ (۲۳۔۹۶) او بری بات کے مقابلہ میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔
اور حدیث میں ہے۔[1] (۱۸٦)
((یَااَنَسُ اَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا)) کہ انس برائی کے بعد نیکی کرو جو نیکی برائی کے اثر کو مٹا ڈالے گی۔
حَسَنَة اور سَیِّئَة دو قسم پر ہیں۔ایک وہ جو عقل اور شریعت دونوں کی رو سے بھلی یا بری ہو۔چنانچہ اس معنیٰ کے لحاظ سے فرمایا:
﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَهَا﴾ (٦۔۱٦۱) جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔
دوسری حَسَنة اور سَیِّئَة وہ ہے جو باعتبار طبیعت کے ہے یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو سبک یا گراں محسوس ہوتی ہیں۔جیسے قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗ﴾ (۷۔۱۳) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔
﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ﴾ (۷۔۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔
اور سَآءَ فِیْ کَذَا وَسُؤْتَنِیْ کہا جاتا ہے۔اور اَسَأْتُ

---

[1] وفی روایة قاله لابی ذر وبعده وخالق الناس بخلق حسن وایضاً بمعاذ راجع ابن اللاثیر ج (۲ ص ٤٦٤)۔

اِلٰی فُلَان (بصلہ الیٰ) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿سِيْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا......﴾ (۶۷۔۲۷) تو کافروں کے منہ برے ہوجائیں گے۔
﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ (۱۷۔۷) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں......اور آیت:
﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (۴۔۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا اسے (اسی طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔
میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:
﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ﴾ (۹۔۳۷) ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔
میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں۔ اور آیت:
﴿عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ (۹۔۹۸) انہیں پر بری مصیبت (واقع) ہو۔
میں دَآئِرَةُ السَّوْءِ: سے مراد ہر وہ چیز ہوسکتی ہے جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:
﴿وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (۴۔۱۱۵) اور وہ بری جگہ ہے۔
﴿سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا﴾ (۲۵۔۶۶) (دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔ میں بھی یہی معنیٰ مراد ہے۔
اور کبھی سَاءَ بِئْسَ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی معنیٰ ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:
﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ (۳۷۔۷۷) مگر جب وہ ان کے مکان میں آ اترے گا۔ تو جن کو ڈر سنایا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔ ﴿سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۵۔۶۶) ان کے عمل برے ہیں۔
﴿سَآءَ مَثَلًا......﴾ (۷۔۷۷) مثال بری ہے۔
اور آیت:
﴿سِيْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۶۷۔۲۷) (تو) کافروں کے منہ برے ہوجائیں گے۔
میں سِيْئَتْ کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ حزن وسرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور آیت:
﴿سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ (۱۱۔۷۷) تو وہ (ان کے آنے سے) غمناک اور تنگدل ہوئے۔
یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے اسے صدمہ لاحق ہوا اور فرمایا:
﴿لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ﴾ (۱۳۔۱۸) ایسے لوگوں کا حساب بھی برا ہوگا۔
﴿وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (۱۳۔۲۵) اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔
اور کنایہ کے طور پر سَوْءَةٌ کا لفظ عورت یا مرد کی شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ﴾ (۵۔۳۱) اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے۔
﴿فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ﴾ (۵۔۳۱) کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔
﴿يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ (۷۔۲۶) کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔
﴿بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا﴾ (۷۔۲۲) تو ان کے ستر کی چیزیں کھل گئیں۔
﴿لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا﴾ (۷۔۲۰) تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے پوشیدہ تھیں کھول دے۔

❀❀❀

کِتَابُ الشِّیْنِ

(ش ب ہ)

اَلشِّبْهُ وَالشَّبَهُ وَالشَّبِیْهُ کے اصل معنیٰ مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں مماثل ہونا یا عدل وظلم میں اور دو چیزوں کا حسّی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں شُبْهَة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ (۲۔۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔ میں مُتَشَابِهًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ بعض کے نزدیک کمال اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ (۶۔۱۰۰) جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

میں ایک قرأت مُتَشَابِهًا ہے مگر دونوں کے معنیٰ قریب قریب ایک ہی ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَیْنَا﴾ (۲۔۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ میں تَشَابَهَ فعل ماضی مذکر کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے اور تَشَابَهَ فعل مضارع مؤنث بھی جو اصل میں تَتَشَابَهُ ہے اور تاء شین میں مدغم ہے۔ اور آیت: ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۲۔۱۱۸) ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

میں ان کے قلوب کا گمراہی اور جہالت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے۔ اور آیت:

﴿وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (۳۔۷) اور بعض متشابہ ہیں۔ میں مُتَشَابِهَاتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معنیٰ سے مقصود کا علم نہ ہوسکے۔

اصل میں آیات تین قسم پر ہیں۔

(۱) بعض علی الاطلاق محکم ہیں۔

(۲) بعض علی الاطلاق متشابہ ہیں۔

(۳) اور بعض من وجہ محکم اور من وجہ متشابہ ہیں۔

پھر متشابہات بھی تین قسم پر ہیں۔

متشابہ بلحاظ لفظ، متشابہ بلحاظ معنیٰ اور متشابہ بلحاظ لفظ و معنیٰ اور متشابہ بلحاظ لفظ پھر دو قسم پر ہے ایک وہ تشابہ جو الفاظ مفردہ میں ہوتا ہے۔ دوم وہ جو کلام مرکب میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت الفاظ کے ہوگا جیسے اَبٌّ وَیَزِفُّوْنَ کے دونوں غریب معنیٰ ہیں اور یا بوجہ لفظ کے مشترک ہونے کے، جیسے یَدٌ وَعَیْنٌ کہ یہ دونوں مختلف معانی کے لئے موضوع ہیں اور کلام مرکب میں تشابہ تین قسم پر ہے۔

بوجہ اختصار، جیسا کہ آیت: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا

تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (۴۔۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ (یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں...... ان سے نکاح کرلو۔

دوسرے بوجہ بسط کلام کے، جیسے فرمایا:

﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (۴۲۔۱۱) اس جیسی کوئی بھی چیز نہیں۔

کیونکہ اگر یہاں کاف نہ بڑھایا جاتا اور لَیْسَ مِثْلَهٗ شَیْءٌ کہا جاتا تو مطلب زیادہ صاف اور واضح ہو جاتا۔

تیسرے وہ اشتباہ جو ترتیب کلام میں تغیر کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا قَیِّمًا﴾ (۱۸۔۱،۲) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اپنی کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی (بلکہ) سیدھی (اور سلیس اتاری)

یہ اصل ترتیب کے لحاظ سے قَیِّمًا وَّلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا تھا۔ نیز فرمایا:

﴿لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ...... الیٰ قوله...... لَوْ تَزَیَّلُوْا﴾ (۴۸۔۲۵) اور اگر ایسے مرد اور (عورتیں) نہ ہوتیں...... اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے۔

متشابہ بلحاظ معنیٰ جیسے صفات باری تعالیٰ اور احوال قیامت کہ یہ اوصاف نہ محسوس ہیں اور نہ محسوسات کی جنس سے ہیں اور جو چیز محسوس یا اس کی جنس سے نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اور متشابہ من حیث اللفظ والمعنیٰ کی پانچ قسمیں ہیں اول تشابہ بلحاظ کمیت کے مثلاً کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے چنانچہ فرمایا:

﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (۹۔۵) تو مشرکوں کو...... قتل کردو۔

دوم: بلحاظ کیفیت کے مثلاً کسی حکم کے واجب یا مندوب ہونے میں شک وشبہ پایا جاتا ہو چنانچہ فرمایا:

﴿فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ﴾ (۴۔۳) تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔

سوم: بلحاظ زمانہ کے یعنی کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے میں تشابہ پایا جاتا ہو جیسے فرمایا:

﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (۳۔۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

چہارم: تشابہ بلحاظ مکان اور اسباب نزول کے جیسے فرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (۲۔۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ تم (احرام کی حالت) میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔ ﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ﴾ (۹۔۳۷) مہینے کو پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے رسم ورواج اور جاہلی عادات سے واقف نہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

پنجم: وہ تشابہ جو کسی فعل کے صحت وفساد کی شروط کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز اور نکاح کی شروط نہ جاننے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔

الغرض تشابہ کے یہ چند اقسام ہیں جن کا تصور کر لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ مفسرین نے تشابہ کی جتنی بھی تشریحات بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مندرجہ بالا اقسام سے خارج نہیں ہے۔ مثلاً بعض کا قول ہے کہ الم

(حروف مقطعات) متشابہات سے ہے اور قتادہ نے کہا ہے کہ ناسخ محکم ہیں اور منسوخ متشابہ میں داخل ہیں اور الاصمؒ کا قول ہے کہ جس آیت کی تفسیر متفق علیہ ہو وہ محکم اور جس کی تفسیر میں اختلاف ہو وہ متشابہ ہے پھر جملہ متشابہات تین قسم پر ہیں۔ایک وہ جن کا علم ہمارے لئے ناممکن ہے جیسے قیامت کا وقت اور دابۃ الارض کا خروج اور اس کی کیفیت وغیرہ۔دوم وہ جن کا علم ہمیں ہوسکتا ہے۔جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مشکلہ۔سوم وہ جو ان دونوں کے بین بین ہیں۔جن کا علم صرف راسخین فی العلم کو ہی ہوسکتا ہے ہر ایک کے لئے ان تک رسائی ممکن نہیں۔اسی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:(۱۸۷) ((اَللّٰھُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ)) کہ اے اللہ! اسے دین میں سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما یہی دعا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی مروی ہے۔❶ (۱۸۸) پس اس بحث کے پیش نظر رکھ لینے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ آیت کریمہ:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ (۳۔۷) حالانکہ مراد، اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔میں اِلَّا اللّٰهُ پر بھی وقف صحیح ہے اور اَلرّٰسِخُوْنَ کے ساتھ ملا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور ہر ایک یعنی وقف اور وصل کی ایک خاص وجہ ہے جو مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوسکتی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں) ملی جلی ہیں۔

میں مُتَشَابِهًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ احکامِ حکمت اور استقامت نظم کے لحاظ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (۴۔۱۵۷) بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔

میں شُبِّهَ کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا شخص مسیح علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا تھا جسے انہوں نے مسیح سمجھ (کر قتل کر دیا تھا)

اَلشَّبَهُ: (پیتل) جواہر میں سے اسے کہا جاتا ہے جس کا رنگ سونے کے مشابہ ہوتا ہے۔

(ش ت ت)

اَلشَّتُّ کے معنیٰ قبیلہ کو متفرق کردینے ہیں۔محاورہ ہے۔

شَتَّ جَمْعُهُمْ شَتًّا وَشَتَاتًا: ان کی جمعیت متفرق ہوگئی۔جَاءُوْا اَشْتَاتًا: وہ پراگندہ حالت میں آئے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ (۹۹۔۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہوکر آئیں گے۔

﴿مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى﴾ (۲۰۔۵۳) (یعنی انواع

❶ واما دعاءه صلى الله عليه وسلم لابن عباس فمعروف (متفق عليه) من حديث ابن عباس دون قوله "وعلمه التاويل" فانه اخرجه بهذه الزيادة احمد وابن حبان والحاكم وصححه (تخريج العراقي على الاحياء (۳: ۲٤)) وفي رواية الترمذي لابن عباس: اللهم علمه الحكمة (۳: ۲۲۲) مع التحفة ۱۲.

واقسام) کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

﴿وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ (۵۹۔۱۴)(مگر) ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

یعنی ان کی حالت مسلمانوں کی حالت کے برعکس ہے جن کے متعلق فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ (۸۔۶۳) مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔

شَتَّانَ: یہ اسم فعل بروزن وَشْكَانَ ہے۔محاورہ ہے۔ شَتَّانَ مَا هُمَا وَشَتَّانَ مَا بَيْنَهُمَا ان دونوں میں کس قدر بُعد اور تفاوت ہے۔

(ش ت و)

قرآن مجید میں ہے:

﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۱۰۶۔۲) (یعنی) ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب۔ اور شَتّٰى اور اَشْتٰى کے معنیٰ کسی جگہ موسم سرما گزارنے یا موسم سرما میں داخل ہونے کے ہیں۔ جیسے صَافَ وَاَصَافَ کے معنیٰ موسم گرما گزارنے یا موسم گرما میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔

اَلْمَشْتٰى وَالْمَشْتَا (جاڑے کا زمانہ) اسم ظرف ہے اور کبھی مصدر بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:[1]

(۲۵۳) نَحْنُ فِي الْمَشْتَاةِ نَدْعُوْا الْجَفَلٰى

ہم موسم سرما یعنی قحط سالی میں دعوت عام دیتے ہیں۔

(ش ج ر)

اَلشَّجَرُ: (درخت) وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شَجَرَةٌ جیسے ثَمَرٌ و ثَمَرَةٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (۴۸۔۱۸) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

﴿ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا﴾ (۵۶۔۷۲) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔

﴿مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۲) تھوہر کے درخت سے۔

﴿اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ﴾ (۴۴۔۴۳) بلاشبہ تھوہر کا درخت۔

وَادٍ شَجِيْرٌ: گنجان درختوں والی وادی۔ بہت درختوں والی جگہ۔

هٰذَا الْوَادِيْ اَشْجَرُ مِنْ ذَالِكَ: اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔

اَلشِّجَارُ وَالْمُشَاجَرَةُ وَالتَّشَاجُرُ: باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۔۶۵) اپنے تنازعات میں۔

شَجَرَنِيْ عَنْهُ: مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا۔ حدیث میں ہے۔[2] (۱۸۹) فَاِنْ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيٌّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهٗ: اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے۔

---

[1] قاله عنترة وتمامه : لاترى الآدب فيها ينتقر والبيت في الكامل (۲ : ۷۷۸) وديوانه ٦٨ واللسان (جفل، نقر، ادب) والاقتضاب ٣٤٦ والبخلاء ٣١٦ واصلاح يعقوب ٣٨١ والمرتضىٰ في اماليه (١ : ٣٥٤) ومختار الشعر الجاهلي (١ : ٢٤٤) وابن دلاو ١٢ وتهذيب الالفاظ (٦١٤ رقم ٤٩٠) والعقد الثمين ٦٢ والمعاني للقتبي ٣٧٧ .

[2] اخرجه ابن حبان في زوائدة من حديث عائشة رقم ٢٤٧ وفي الدار قطني عنها بلفظة : فان اشتجروا بدل تشاجروا (راجع النيل (٦ : ١٢٤۔١٢٥)

اَلشِّجَارُ: ہودہ کی لکڑی، چھوٹی پالکی۔
اَلْمِشْجَرُ: لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔
شَجَرَہٗ بِالرُّمْحِ: اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اسی میں چھوڑ دیا۔

(ش ح ح)

اَلشُّحُّ: (اسم) کے معنیٰ حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبائع تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔
﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ﴾ (۵۹۔۹) اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا۔
رَجُلٌ شَحِیْحٌ: بخیل آدمی۔ قَوْمٌ اَشِحَّۃٌ: بخیل لوگ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَشِحَّۃً عَلَی الْخَیْرِ﴾ (۳۳۔۹) مال میں بخل کریں۔
﴿اَشِحَّۃً عَلَیْکُمْ﴾ (۳۳۔۱۹) (یہ اس لئے کہ) تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔
خَطِیْبٌ شَحِیْحٌ: خوش بیان اور بلیغ لیکچرار یہ شَحْشَحَ الْبَعِیْرُ فِیْ ھَدِیْرِہٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے مستی میں آواز کو پھرانے کے ہیں۔

(ش ح م)

اَلشَّحْمُ: (چربی ج شُحُوْمٌ) قرآن مجید میں ہے:
﴿حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھُمَا......﴾ (۶۔۱۴۷) انکی چربی حرام کر دی تھی۔

شَحْمَۃُ الْاُذُنِ: کان کا نرم حصہ جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں۔ یہ نرم ہونے کے لحاظ سے چونکہ چربی جیسا ہوتا ہے اس لئے اسے شَحْمَۃ کہا جاتا ہے اور شَحْمَۃُ الْاَرْضِ: (کیچوا) گرگٹ کی قسم کا ایک جانور، جو زمین یا ریت میں گھس کر رہتا ہے۔
رَجُلٌ مُشْحِمٌ: گھر میں بہت زیادہ چربی رکھنے والا۔
شَحِمٌ: چربی کھانے کا حریص۔ لیکن جو اپنے دوستوں کو بہت چربی کھلانے والا ہو اسے شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ اور شَحِیْمٌ کے معنیٰ موٹے تازے اور چربی دار کے ہیں۔

(ش ح ن)

اَلشَّحْنُ: کشتی یا جہاز میں سامان لادنا، بھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۲۶۔۱۱۹) بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے۔
اَلشَّحْنَاءُ: کینہ و عداوت جس سے نفس پُر اور بھرا ہوا ہو۔
عَدُوٌّ مُشَاحِنٌ: بہت سخت دشمن گویا وہ دشمنی سے پُر ہے۔
اَشْحَنَ لِلْبُکَاءِ: غم سے بھر کر رونے کے لئے آمادہ ہونا۔

(ش خ ص)

(اَلشَّخْصُ) کھڑے انسان کا جسم جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے اور شَخَصَ مِنْ بَلَدِہٖ کے معنیٰ شہر سے چلے جانا کے ہیں۔ شَخَصَ بَصَرُہٗ: اس کی آنکھ پتھرا گئی۔ شَخَصَ سَھْمُہٗ: تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اَشْخَصَ (افعال) اس نے نشانے سے اونچا نکال دیا۔ قرآن مجید میں ہے:
﴿تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ﴾ (۱۴۔۴۲) جب کہ

(دہشت کے سبب) آنکھ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔

﴿شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۲۱۔۹۷) کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(ش د د)

اَلشَّدُّ یہ شَدَدْتُ الشَّیْءَ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنیٰ مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

﴿وَشَدَدْنَآ اَسْرَھُمْ﴾ (۷۶۔۲۸) اوران کے مفاصل کومضبوط بنایا۔

﴿شُدُّوا الْوَثَاقِ﴾ (۴۷۔۲۸) ان کی مضبوطی سے قید کرلو۔

اور شِدَّۃٌ کا لفظ عہد، بدن، قوائے نفس اورعذاب،سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَانُوْا اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً﴾ (۵۔۴۴) وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔

﴿عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی﴾ (۵۳۔۵) ان کونہایت قوت والے نے سکھایا۔

نہایت قوت والے سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔

﴿غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (۶۶۔۶) تندخواور سخت مزاج (فرشتے)

﴿بَأْسُھُمْ بَیْنَھُمْ شَدِیْدٌ﴾ (۵۹۔۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

اَلشَّدِیْدُ وَالْمُتَشَدِّدُ: بخیل۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ﴾ (۱۰۰۔۸) اوروہ تو مال کی سخت محبت والے ہیں۔

یہاں شَدِیْدٌ بمعنیٰ مفعول بھی ہوسکتا ہے۔گویا وہ خرچ کرنے سے باندھ دیا گیا ہے کہ اس معنیٰ میں غُلٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ﴾ (۵۔۶۴) یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ باندھے جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شَدِیْدٌ بمعنیٰ فاعل کے ہوتو گویا مُتَشَدِّدٌ وہ ہے جس نے تھیلی کو (بوجہ بخل کے) مضبوطی سے باندھ رکھا ہوا۔اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً﴾ (۴۶۔۱۵) یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جب انسان اس عمر یعنی چالیس (برس کو پہنچ جاتا ہے) جس میں اس کے قویٰ مضبوط ہو جاتے ہیں تو اس کی عادات پختہ ہوجاتی ہیں اور وہ انہیں ترک نہیں کر سکتا شاعر نے کیا ہی خوب اشارہ کیا ہے۔[1] (۲۵۴،۵۵)

وَاِذَا الْمَرْءُ وَافِی الْاَرْبَعِیْنَ وَلَمْ یَکُنْ
لَہٗ دُوْنَ مَا یَھْوٰی حَیَاءٌ وَلَا سَتْرٌ
فَدَعْہُ وَ لَا تَنْفِسْ عَلَیْہِ الَّذِیْ مَضٰی
وَاِنْ جَرَّ اَسْبَابَ الْحَیَاۃِ لَہُ الْعُمُرُ

---

[1] فی سبعۃ ابیات نسبھا القالی ۱۷۷ الی ایمن بن خریم بن فاتك الاسدی قال البکری ۲۶۱ والصحیح انھا لاقیشر مغیرۃ بن اسود من بنی اسدبن خزیمۃ وفی الوحشیات ۲۷۷ منسوبۃ لاعرابی نزل بیحیٰ بن جبریل ۔یقال من لم یرو ھذہ الابیات فلامروئۃ لہ انظر لتخریجہ السمط ۲۶۱ والشعراء ٥٤٤ (تحقیق احمد شاکر) وفی روایۃ الوحشیات (الحماسۃ الصغریٰ) وفی بدل وافی ویاتی بدل یھوی واتی بدل مضی والدھر بدل العمروالبیت فی الروح آلوس (۲۶۔۱۷).

جب انسان چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے اس کی خواہش سے حیا کا پردہ مانع نہ ہو تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دے اور گزشتہ پر کسی قسم کا دریغ نہ کر اگرچہ عمر اس کے لئے زندگی کے تمام اسباب کھینچ کر کیوں نہ لے آئے۔

شَدَّ فُلَانٌ وَاشْتَدَّ: تیزی سے چلنا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شَدَّ حِزَامَهٗ لِلْعَدْوِ کے محاورہ سے مشتق ہو جس کے معنیٰ دوڑنے کے لئے کمربستہ ہونے کے ہیں جیسا کہ اسی معنیٰ میں اَلْقٰى ثِيَابَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اِشْتَدَّتِ الرِّيْحُ: کے محاورہ سے ماخوذ ہو جس کے معنیٰ زور کی ہوا چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) کہ اس پر زور کی ہوا چلے۔

(ش ر ر)

اَلشَّرُّ: وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کراہت کرتا ہو۔ جیسا کہ خیر اسے کہتے ہیں جو ہر ایک کو مرغوب ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا﴾ (۱۹۔۷۵) کہ مکان کس کا برا ہے۔ ﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ﴾ (۸۔۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے...... ہیں۔

شر کا اصل معنیٰ اور اس کے جملہ اقسام خیر کی بحث میں بیان ہوچکے ہیں۔

رَجُلٌ شَرِيْرٌ وَشِرِّيْرٌ: شریر آدمی وَقَوْمٌ اَشْرَارٌ: برے لوگ۔ اَشْرَرْتُهٗ: کسی کی طرف شر کی نسبت کرنا بعض نے کہا ہے کہ اَشْرَرْتُ كَذَا کے معنیٰ کسی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔[1]

(۲۵۶) اِذَا قِيْلَ اَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَبِيْلَةٍ
اَشَرَّتْ كُلَيْبُ بِالْاَكُفِّ الْاَصَابِعَا

جب یہ پوچھا جائے کہ کونسا قبیلہ سب سے برا ہے تو ہاتھ انگلیوں سے بنی کلیب کی طرف اشارہ کردیتے مگر اس شعر کے علاوہ اس معنیٰ پر اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہاں اَشَرَّتْ کے معنیٰ یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہاتھ انگلیوں سے ان کی طرف شر کی نسبت کردیتے ہیں۔

اَلشُّرُّ: (بضمہ الشین) شر مکروہ چیز۔ شَرَارُ النَّارِ: آگ کی چنگاری۔ آگ کی چنگاری کو شَرَارٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ﴾ (۷۷۔۳۲) اس سے آگ کی (اتنی اتنی بڑی) چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے محل۔

(ش ر ب)

اَلشُّرْبُ: کے معنیٰ پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

---

[1] قاله الفرزوق فی هجو جرير و لفظه كليب بالجرعلی حذف الجار وابقاء عمله ويروى بالرفع على تقديرهذه كليب ففی البيت حذف وقلب واصله : اشرت الاكف بالاصابع الى كليب وفی رواية اشارت والبيت فی ابن عقيل رقم (۲۱۸) والخزانة (۳ : ٦٦٩) وديوانه ۵۲۰ والمغنی ۳ فی الخطبة والسيوطی ٤ والعينی (۲ : ٥٤٢) و كليب هی كليب بن يربوع قبيلة جريرى.

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ.........﴾ (۶۔۷۰) ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شَرَابٌ کی جمع اَشْرِبَةٌ ہے اور شَرِبْتُهٗ شَرْبًا وَشُرْبًا کے معنیٰ پینے کے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ (۲۔۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔نیز فرمایا:

﴿هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۲۶۔۱۵۵) یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔

﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ (۵۴۔۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔

اَلْمَشْرَبُ: (مصدر) پانی پینا (ظرف زمان یا مکان پانی پینے کی جگہ یا زمانہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ (۲۔۶۰) تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر کے پانی پی لیا۔

اَلشَّرِيْبُ: ہم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کے اندرونی رگ کو شَارِبٌ کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شَوَارِبُ آتی ہے۔ھُذلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے۔❶ (الکامل)

(۲۵۷) "صَخْبُ الشَّوَارِبِ لَا يَزَالُ كَاَنَّهٗ"

اس کی مونچھیں سخت گویا وہ..........

اور آیت کریمہ:

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ (۲۔۹۳) اور ان (کے کفر کے سبب) بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَشْرَبْتُ الْبَعِيْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔❷

(۲۵۸) وَاَشْرَبْتُهَا الْاَقْرَانَ حَتّٰى وَقَصْتُهَا
بِقُرْحٍ وَقَدْ اَلْقَيْنَ كُلَّ جَنِيْنٍ

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتیٰ کہ قُرح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرا دیئے تھے۔تو آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔اور بعض نے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے لئے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔شاعر نے کہا ہے۔❸ (الوافر)

---

❶ قاله ابو ذؤيب وتمامه: عبد الآل ابی ربیعة مسبع۔ والبيت فی اللسان (سبع) وقد مر.

❷ انشده فی هذا المعنیٰ ایضاً ثعلب والبيت لبعض بنی اسد من اللصوص انظر مجالس ثعلب (۳۱۱) واللسان (شرب) والبلدان والمحكم (قرح) فی اربعة ابيات مع خلاف فی الترتيب والقرح اسم سوق وادی القرى وقصبتها والعائد زود الكلابی وقبله: لقد علمت ذروا الكلابی اننی ينهن باجواز الفلاة مهين والذو واسم جماعة من الابل اذا كانت اناثا.

❸ قاله عبدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود احد الفقهاء السبعة فی المدينة فی زوجته عثمة وله فيها اشعار كثيرة والبيت فی الحماسة مع المرزوقی رقم (۵۵۰) ومجالس ثعلب ۲۸۴ وامالی المرتضىٰ (۱: ۲۱۷۔۴۰۰) والقالی (۳: ۲۱۹) فی خمسة والاغانی (۸: ۹۳) والسمط (۷۸۱) والحماسة بالتبريزی (۳: ۱۶۷) والاصبهانی (۸ص ۹۴) والحصری (۱: ۲۱۲) فی ثلاثة اشعار ومجموعة المعانی (۱۶۲) وعزاه فی المحاضرات (۳: ۴۴) الی ابی عبدالله بن طاهر وقبله: شققت القلب ثم ذرأت فيه هواك فليم فالتزام الفطور.

(۲۵۹) تـغلغل حَيْثُ لَمْ يَبْلغ شَرَابٌ
وَلَا حُـزْن وَلَـمْ يَبْـلُـغْ شَـرُوْرٌ

اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن وسرور پہنچ سکتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہوگئی تھی کہ محو نہیں ہوسکتی تھی مثل مشہور ہے۔اَشْـرَبْتَـنِـیْ مَالَمْ اَشْرَبْ: یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

(ش ر ح)

شَـرَحْتُ اللَّحْمَ وَشَرَّحْتُهٗ کے معنیٰ گوشت (وغیرہ کے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ کر) پھیلانے کے ہیں اور اسی سے شرح صدر ہے یعنی نور الٰہی اور سکون واطمینان کی وجہ سے سینے میں وسعت پیدا ہو جانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ (۲۰۔۲۵) (کہا) اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔

﴿اَلَـمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۴۔۱) (اے محمدؐ) ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا؟

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ﴾ (۳۹۔۲۲) بھلا جس کا سینہ اللہ نے ......کھول دیا ہو۔

شَـرْحُ الْمُشْكِلِ مِنَ الْكَلَامِ کے معنیٰ مشکل کلام کی تشریح کرنے اور اس کے مخفی معنیٰ کو ظاہر کرنے کے ہیں۔

(ش ر د)

شَـرَدَ الْبَعِيْرُ کے معنیٰ ہیں: اونٹ بدک کر بھاگ نکلا۔شَـرَّدْتَ فُـلَانًـا فِی الْبِـلَادِ میں نے شہروں میں بھگا دیا وَشَـرَّدْتَ بِـهٖ: یعنی میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام نہ کریں جیسے: نَـكَّلْتُ بِهٖ کہ میں نے اسے دوسروں کے لئے عبرت بنادیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَشَرِّدْبِهِـمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ﴾ (۸۔۵۷) تو انہیں ایسی سزادو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ ان کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔

مشہور محاورہ ہے۔

فُـلَانٌ طَرِیْدٌ شَرِیْدٌ: فلاں راندہ درگاہ ہے۔

(ش ر ذ م)

اَلشِّرْذِمَةُ: تھوڑی سی جماعت جو لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿شِـرْذِمَةٌ قَـلِيْـلُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۵) یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔

یہ ثَـوْبٌ شَرَاذِمٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ پھٹے پرانے چیتھڑوں کے ہیں۔

(ش ر ط)

اَلشَّرْطُ: وہ معین حکم جس کا وقوع کسی دوسرے امر پر معلق ہو اسے شرط کہتے ہیں۔وہ دوسرا امر اس کے لئے بمنزلہ علامت کے ہوتا ہے اور شَـرِیْطٌ بمعنی شرط آتا ہے

---

❶ واشراط الساعة بمعنیٰ العلامات اوالبیانات ثم الاشراط بمعنیٰ العلامات علی نوعین وهی التی لم تبق الدنیا بعد وقوعها الایسر یسیر کخروج المهدی وظهور الدجال وخروج الدابة وطلوع الشمس من مغربها وغیر ذالك وغیر مضیقة وهی اکثر الاشراط راجع الفخر والفت فیها کتب مختصرة ومطولة وللسیوطی رسالة سماها "الکشف" عن مجاوزة هذه الامة الالف وبحور الزاخرة فی علوم الآخرة للسفارینی .

اس کی جمع شرائط ہے۔ اِشْتَرَطْتُ كَذَا: کوئی شرط لگانا۔ اور اسی سے شَــرَطٌ بمعنیٰ علامت ہے۔ اور اَشْــرَاطُ السَّاعَةِ کے معنیٰ علامت قیامت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقَدْ جَاءَتْ اَشْـرَاطُهَا﴾ (۴۷۔۱۸) سو اس کی نشانیوں (وقوع میں) آچکی ہیں۔

اور پولیس کو شُــرَط کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بھی ایسی علامت لگا لیتے ہیں جس سے ان کی پہچان ہو سکتی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اشراط الابل سے مشتق ہے جس کے معنیٰ رذیل اونٹوں کے ہیں۔ اور پولیس میں بھی چونکہ (عام طور پر) رذیل لوگ ہوتے تھے اس لئے انہیں شُرَطٌ کہہ دیا گیا ہے۔

اَشْـرَطَ نَفْسَهٗ لِلْهَلَكَةِ: اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یا کسی کام میں ہلاکت کی بازی لگانا۔

(ش ر ع)

اَلشَّــــرْعُ: سیدھا راستہ جو واضح ہو، یہ اصل میں شَـرَعْـتُ لَهٗ طَرِيْقًا: (واضح راستہ مقرر کرنا) کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح راستہ کو شَرْعٌ وَشِرِيْعَةٌ کہا جاتا ہے پھر استعارہ کے طور پر الٰہیہ پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شِـرْعَةً وَّمِنْهَـاجًـا﴾ (۵۔۴۸) ایک دستور اور طریق۔ اس میں دو قسم کے راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے چنانچہ آیت:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَـعْـضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ (۴۳۔۳۲) اور ہر ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرما کر انہیں حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شرائع کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ ہوتا رہا ہے اور جس پر کہ آیت:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ (۴۵۔۱۸) پھر ہم نے تمہیں دین کے کھلے راستہ پر (قائم) کر دیا تو اسی (راستے) پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ شِــرْعَةٌ وہ راستہ ہے جسے قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔ اور مِنْهَاج وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ﴾ (۲۔۱۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جو تمام ملل میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ان میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ جیسے معرفت الٰہی اور وہ امور جن کا بیان آیت:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ (۴۔۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کرے۔ میں پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شریعت کا لفظ شَـرِيْـعَةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ پانی کے گھاٹ کے ہیں اور شریعت

کو شریعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی صحیح حقیقت پر مطلع ہونے سے سیرابی اور طہارت حاصل ہو جاتی ہے ۔ سیرابی سے مراد معرفت الٰہی کا حصول ہے جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ میں پیتا رہا لیکن سیر نہ ہوا ۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی تو بغیر پینے کے سیری حاصل ہوگئی اور طہارت سے مراد وہ طہارت ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (۳۳-۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کی میل کچیل صاف کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے، میں پایا جاتا ہے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا﴾ (۷-۱۶۳) (یعنی) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں ۔

میں شُرَّعًا ، شَارِعٌ کی جمع ہے ۔ اور شَارِعَةُ الطَّرِيْقِ کی جمع شَوَارِعُ آتی ہے جس کے معنیٰ کھلی سڑک کے ہیں ۔

اَشْرَعْتُ الرُّمْحَ قِبَلَهٗ: میں نے اس کی جانب نیزہ سیدھا کیا ۔ بعض نے شَرَعْتُهٗ فَهُوَ مَشْرُوْعٌ کہا ہے اور شَرَعْتُ السَّفِيْنَةَ کے معنیٰ جہاز پر بادبان کھڑا کرنے کے ہیں جو اسے آگے چلاتے ہیں ۔ هُمْ فِيْ هٰذَا شِرْعٌ: یعنی وہ سب اس میں برابر ہیں ۔ یعنی انہوں نے اسے ایک ہی وقت میں شروع کیا ہے اور شَرْعُكَ مِنْ رَجُلٍ زَيْدٌ بمعنیٰ حَسْبُكَ ہے یعنی زید ہی اس قابل ہے کہ تم اس کا قصد کرو یا اس کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کرو ۔

اَلشِّرْعُ: بربط کے وہ تار جن سے راگ شروع کیا جاتا ہے ۔

(ش ر ق)

شَرَقَتْ (ن) شُرُوْقًا الشَّمْسُ: آفتاب طلوع ہوا ۔ مثل مشہور ہے (مثل)

لَا اَفْعَلُ ذَالِكَ مَا ذَرَّ شَارِقٌ وَاَشْرَقَتْ: جب تک آفتاب طلوع ہوتا رہے گا میں یہ کام نہیں کروں گا ۔ یعنی کبھی بھی نہیں کروں گا ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ﴾ (۳۸-۱۸) صبح اور شام ۔ یہاں اشراق سے مراد وقتِ اشراق ہے ۔

اَلْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ: جب مفرد ہوں تو ان سے شرقی اور غربی جہت مراد ہوتی ہے اور جب تثنیہ ہوں تو موسم سرما اور گرما کے دو مشرق اور دو مغرب مراد ہوتے ہیں اور جمع کا صیغہ ہو تو ہر روز کا مشرق اور مغرب مراد ہوتا ہے یا ہر موسم کا ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷۳-۹) وہی مشرق اور مغرب کا مالک (ہے)

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۵۵-۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے ۔

﴿وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ (۳۷-۵) اور مشرقوں کا رب ہے ۔

﴿مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾ (۱۹-۱۶) مشرق کی طرف (چلی گئی)

اَلْمِشْرَقَةُ: جاڑے کے زمانہ میں دھوپ میں بیٹھنے کی جگہ جہاں سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی دھوپ پڑتی ہو ۔ شَرَّقْتُ اللَّحْمَ: گوشت کے ٹکڑے کر کے دھوپ میں خشک کرنا ۔ اَلْمُشَرَّقَ: عیدگاہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں طلوع شمس کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے ۔ شَرِقَتِ

الشَّمْسُ آفتاب کا غروب کے وقت زردی مائل ہونا اسی سے اَحْمَرُ شَارِقٌ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ نہایت سرخ کے ہیں۔
اَشْرَقَ الثَّوْبَ: کپڑے کو خالص گہرے رنگ کے ساتھ رنگنا۔
لَحْمٌ شَرَقٌ: سرخ گوشت جس میں بالکل چربی نہ ہو۔

(ش ر ک)

اَلشِّرْکَۃُ وَالْمُشَارَکَۃُ کے معنیٰ دو ملکیتوں کو باہم ملا دینے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ ایک چیز میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے شریک ہونے کے ہیں۔ خواہ وہ چیز مادی ہو یا معنوی، مثلاً انسان اور فرس کا حیوانیت میں شریک ہونا یا دو گھوڑوں کا سرخ یا سیاہ رنگ کا ہونا اور شَرِکْتُہٗ وَشَارَکْتُہٗ وَتَشَارَکُوْا اور اِشْتَرَکُوْا کے معنیٰ باہم شریک ہونے کے ہیں۔ اور ﴿اَشْرِکْہُ فِیْ اَمْرِیْ﴾ (۲۰۔۳۲) اور اسے میرے کام میں شریک کر۔
اور حدیث میں ہے۔ (۱۹۱)
((اَللّٰھُمَّ اَشْرِکْنَا فِیْ دُعَاءِ الصّٰلِحِیْنَ)) اے اللہ! ہمیں نیک لوگوں کی دعا میں شریک کر۔
ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو فرمایا: (۱۹۲) ((اِنِّیْ شَرَّفْتُكَ وَفَضَّلْتُكَ عَلٰی جَمِیْعِ خَلْقِیْ وَاَشْرَکْتُكَ فِیْ اَمْرِیْ)) کہ میں نے تمہیں تمام مخلوق پر شرف بخشا اور تجھے اپنے کام میں شریک کر لیا۔ یعنی میرے ذکر کے ساتھ تمہارا ذکر ہوتا رہے گا اور میں نے اپنی طاعت کے ساتھ تمہاری طاعت کا بھی حکم دیا ہے جیسے فرمایا:
﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (۵۔۹۲) اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول خدا کی اطاعت کرتے رہو۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿وَفِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ﴾ (۳۷۔۳۳) (اس دن) عذاب میں شریک ہوں گے۔
شَرِیْكٌ: ساجھی۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ﴾ (۱۷۔۱۱۱) اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔
اس کی جمع شُرَکَآءُ ہے جیسے فرمایا:
﴿شُرَکَآءُ مُتَشَاکِسُوْنَ﴾ (۳۹۔۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں۔ (مختلف المزاج) اور بدخو۔
﴿شُرَکَآءُ شَرَعُوْا لَھُمْ﴾ (۴۲:۲۱) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لئے ایسا دین منفرد کیا ہے۔
﴿اَیْنَ شُرَکَآءِیَ﴾ (۴۱۔۴۷) میرے شریک کہاں ہیں۔ دین میں شرک دو قسم پر ہے۔ شریک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا اور اَشْرَكَ فُلَانٌ بِاللّٰہِ کے معنیٰ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے ہیں اور یہ سب سے بڑا کفر ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ......﴾ (۴۔۱۱۶) خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور فرمایا:
﴿وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا﴾ (۴۔۱۱۵) اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔
﴿اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ......﴾ (۵۔۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شریک

کرے گا خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔
﴿یٰۤاَیُّہَا ... یُبَایِعْنَکَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا﴾ (۶۰۔۱۲) اس بات پر بیعت کرنے آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ شرک کریں گے۔
﴿سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشْرَکْنَا﴾ (۶۔۱۴۹) جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔
دوم: شرک صغیر کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرنا اسی کا دوسرا نام ریا اور نفاق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
﴿شُرَکَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىہُمَا فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (۷۔۱۹۰) تو اس (بچے) میں جو وہ ان کو دیتا ہے اس کا شریک مقرر کرتے ہیں جو وہ شرک کرتے ہیں خدا کا (رتبہ) اس سے بلند ہے۔
﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَہُمْ مُّشْرِکُوْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔
بعض نے اِلَّا وَھُمْ مُشْرِکُوْنَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ مگر وہ شَرَكٌ یعنی دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اسی سے علیہ السلام نے فرمایا: [1] (۱۹۳) ((اَلشِّرْکُ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ......)) یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہوگا پس لفظ شِرْكٌ الفاظ مشترکہ سے ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۱۱۰) پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔
میں دونوں قسم کا شرک مراد ہے اور آیت کریمہ:
﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (۹۔۵) مشرکوں کو...... قتل کردو۔ میں اکثر فقہاء نے تمام کفار مراد لئے ہیں۔ کیونکہ یہود بھی (اہل کتاب تھے) عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَتِ الْیَہُوْدُ عُزَیْرُ ن ابْنُ اللّٰہِ﴾ (۹۔۳۰) یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار مراد ہیں کیونکہ آیت:
﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ہَادُوْا وَالصّٰبِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْۤا﴾ (۲۲۔۱۷) جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک۔
میں مشرکین کو یہود ونصاریٰ سے الگ عطف کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب مشرکین سے خارج ہیں۔

(ش ر ی)

شِرَاءٌ اور بَیْعٌ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ

---

[1] اللسان والنہایۃ (شرک) والحکیم عن ابن عباس وعائشۃ وعن ابی بکروحل عن ابی عباس وفی جمیع الروایات فی امتی بدل ھذہ الامۃ وفی روایۃ الذربدل النمل وفی تخریج العراقی (۳: ۳۰۶) اتقوا ھذاالشرك فانہ اخفیٰ من دبیب النمل رواہ ابن حبان فی الضعفاء من حدیث ابی بکرالصدیق والطبرانی من حدیث ابی موسیٰ الاشعری ونزھۃ المجالس للصفوری ص ۷ راجع کنزالعمال ج ۳: رقم ۲۳۷۴، ۲۳۷۶، ۲۳۷۷، ۲۳۹۶۔

مُشْتَرِیْ کے معنیٰ قیمت دے کراس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کر قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو۔ لیکن جب خرید وفروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شِراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر شَرَیْتُ بمعنیٰ بِعْتُ اور اِبْتَعْتُ بمعنیٰ اِشْتَرَیْتُ آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اس کو تھوڑی سے قیمت پر بیچ ڈالا۔

﴿يَشْرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۴۔۷۴) جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں۔

پھر شِرَاءٌ اور اِشْتِرَاءٌ کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری چیز لی جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقرار کو بیچ کر اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۹۹) وہ خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔

﴿اِشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۲۔۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

﴿اِشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ﴾ (۲۔۱۶) جنہوں نے گمراہی خریدی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۱۱) خدا نے مومنوں سے.........خرید لئے ہیں۔

اور جس چیز کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں خرید کی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (یعنی خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوتے ہیں) اور خوارج اپنے آپ کو شُراۃ کے نام سے موسوم کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہو۔

سے استدلال کرتے تھے کہ یہاں یَشْرِیْ بمعنیٰ يَبِيْعُ ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ش ط ط)

اَلشَّطَطُ: کے معنیٰ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے کے ہیں۔ جیسے شَطَّتِ الدَّارُ وَاَشَطَّ (گھر کا دور ہونا) اور یہ کسی مقام یا حکم یا نرخ میں حد مقررہ سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۶۰) شَطَّ الْمَزَارُ بِجَذْوٰى وَانْتَهَى الْاَمَلُ

یعنی حذویٰ (محبوبہ) کی زیارت مشکل ہوگئی اور ہر قسم کی

---

[1] وتمامه: فلاخيال ولاعهد ولاطلل وبعده الارجاء فماندری أندركه ـ ام يستمرفياتی دونه الاحل والبيت من قصيدة لابن احمر مدح بها النعمان بن بشير بن سعد الانصاری وهو اول ولد فی الاسلام من الانصار وآخر من ولی الكوفة لمعاوية بن ابی سفيان قتلته بنو كلب فی فتنة مروان وكان عثمانيا وابو ه بشر بن سعد عقبی بدری والشطرا فی الذيل ۸ والبيت فی التاج (شط) واللسان (جدا) والالفاظ ۳۳۹ والسمط ۳ : ۷ وجدویٰ اسم امرئة.

امیدیں منقطع ہوگئیں۔
اور کبھی شَطَطٌ بمعنیٰ جَوْر بھی آجاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:
﴿لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا﴾ (۱۸۔۱۴)تو ہم نے بعید از عقل بات کہی۔
شَطُّ النَّهْرِ: دریا کا کنارہ۔جہاں سے پانی دور ہو۔

(ش ط ر)

شَطْرُ الشَّيءِ کے اصل معنیٰ نصف یا وسط شے کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲۔۱۴۴)اور اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف پھیر لو۔
یہاں شطر بمعنیٰ سمت ہے۔جیسے فرمایا:
﴿فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (۲۔۱۴۴)(نماز کے وقت)اس مسجد کی طرف منہ کرلیا کرو۔
شَاطَرْتُهٗ شِطَارًا: آدھا آدھا تقسیم کرلینا۔
شَطَرَ بَصَرَهٗ: اس طرح دیکھنا کہ تمہاری طرف بھی نظر رہے اور دوسرے کی طرف بھی۔
حَلَبَ فُلَانٌ الدَّهْرَ اَشْطُرَهٗ: اس نے زمانہ کے خیر و شر کو پہچان لیا۔اصل میں یہ لفظ اونٹنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ جب کوئی شخص اونٹنی کے اگلی طرف کے تھنوں سے دودھ نکال لے اور پچھلی طرف کے چھوڑ دے تو اس کے متعلق حَلَبَ اَشْطُرَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور شَطُوْرٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے ایک جانب کے تھن خشک ہوگئے ہوں اور شُطُوْرٌ اس بکری کو بھی کہا جاتا ہے جس کا ایک تھن دوسرے سے لمبا ہو۔
شَطَرَ کے معنیٰ ایک جانب ہوجانے کے ہیں۔اور شَاطِرٌ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دور رہتا ہو اس کی جمع شُطُرٌ آتی ہے۔
شاعر نے کہا ہے۔[1] (المتقارب)
(۲۶۱) اَشَاقَكَ بَيْنَ الْخَلِيْطِ الشُّطُرُ
دوستوں میں تجھے رہنے والوں نے اپنا مشتاق بنالیا ہے۔
اور شاطر بعيد عن الحق کو بھی کہتے ہیں اور اس کی جمع شُطَّارٌ آتی ہے۔

(ش ط ن)

اَلشَّيْطَانُ: اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ دور ہونے کے ہیں۔[2] اور بِئْرٌ شَطُوْنٌ (بہت گہرا کنواں)
شَطَنَتِ الدَّارُ: گھر کا دور ہونا۔غُرْبَةٌ شَطُوْنٌ: (وطن سے دوری) وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ لفظ شَيْطَانٌ میں نون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ يَشِيْطُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ غصہ سے سوختہ ہوجانے کے ہیں اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے۔جیسا کہ فرمایا:
﴿خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵۔۱۵) اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ اس سے قوت غضبیہ

---

[1] وتمامه : وفيمن اقام من الحی و البيت لامرئ القيس رواه فی اللسان (شطر) وفی رواية "اشاقك" وفی رواية الديوان (صنعة السندوبی) ۵۲۔وفيمن اقام من الحی هر۔ام الظاعنون بهافی الشطر وهذا البيت مع آخر قد نقد عليه رسائل البلغاء (۳۳۔۳۳۲) وفيه شاقك بدل شاقك .
[2] راجع مجازه ۱ : ۳۲ واللسان (شطن) وفيهما كل عاتٍ متمرد مكان كل عارم .

اور حمیت مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اس بنا پر اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے۔❶ کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَیَاطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۶۔۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

﴿وَاِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۱) اور شیطان (لوگ)...... دلوں میں (یہ بات) ڈالتے ہیں۔

﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِهِمْ﴾ (۲۔۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

یعنی جب جنوں اور انسانوں میں سے اپنے اصحاب کے پاس جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿کَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ﴾ (۳۷۔۶۵) جیسے شیطانوں کے سر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ شیاطین سے باریک جسم کے سانپ مراد ہیں اور بعض نے سرکش جن مراد لئے ہیں اور (ناگ پھنی تھوہر کے پتوں کو) بدنما ہونے کی وجہ سے بطور تشبیہ رؤس الشیاطین کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّیَاطِیْنُ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو (سلیمان علیہ السلام کے عہد سلطنت میں) شیاطین پڑھا کرتے تھے۔

میں شیاطین سے سرکش جن مراد ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرکش انسان بھی مراد ہوں شاعر نے کہا ہے۔❷

(۲۶۲) لَوْ اَنَّ شَیْطَانَ الذِّئَابِ الْعُسَّلِ

اگر سرکش تیز رو بھیڑیا۔

یہاں عُسَّلٌ ، عَاسِلٌ کی جمع ہے اور عَاسِلٌ کے معنیٰ نہایت سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے ہیں اور عَسَلَانٌ کا لفظ بھیڑیے کی تیز روی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔❸ (الزجر)

(۲۶۳) مَا لَیْلَةُ الْفَقِیْرِ اِلَّا شَیْطَانٌ

کہ مقام فقیر میں رات شیطان کی طرح بھیانک ہوتی ہے۔

اور انسان کی ہر بری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے چنانچہ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔❹ اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ کہ حسد بھی شیطان ہے اور غصہ بھی شیطان ہے۔

(ش ط ی)

شَاطِیءُ الْوَادِیْ کے معنیٰ وادی کے کنارہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ﴾ (۲۸۔۳۰) تو میدان کے دائیں کنارے سے آواز آئی۔

شَاطَأْتُ فُلَانًا کے معنیٰ ہیں میں اس کے ساتھ ساتھ وادی کے کنارے پر چلا۔

---

❶ فعلی هذا یکون وزنه فیعالا واذا کانت نونه زائدة فوزنه فعلان من شاط (اعراب ثلاثین لابن خالویه ۷۔۸).

❷ لم اجده .

❸ وتمامه مجنونة تودی بروح الانسان والبیت فی اللسان (فقر) بغیر عزو وفی البلدان (فقر) عجزه محبون توذی قریح الاسنان وسیاتی فی (فقر).

❹ لم اجده ۱۲ .

شَطْأُ الزَّرْعِ کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے ج اَشْطَاءٌ قرآن پاک میں ہے جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔
ایک قرأت میں شَطَأَہٗ ہے جیسے: شَمْعٌ وَشَمَعٌ وَنَهْرٌ وَنَهَرٌ وغیر ذالك۔

(ش ع ب)

اَلشِّعْبُ: اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم سے پھیلا ہو۔ اس کی جمع شُعُوْبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ﴾ (۴۹۔۱۲) قومیں اور قبیلے (بنائے)
اَلشِّعْبُ مِنَ الْوَادِیْ وادی کا وہ مقام جہاں اس کا کنارہ ملتا اور دوسرا جدا ہوتا ہو جب تم اس جگہ کو دیکھو جہاں اس کا کنارہ جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا اس سے ملتا ہے تو ایسا محسوس ہو کہ دونوں سرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شِعْبٌ کے معنیٰ جمع کرنا اور متفرق کرنا دونوں آتے ہیں اور شُعَیْبٌ یا تو شَعْبٌ کی تصغیر ہے جو مصدر یا اسم ہے اور یا شِعْبٌ کی تصغیر ہے۔ اَلشَّعِیْبُ: پرانی مشک جو مرمت اور درست کی گئی ہو۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ﴾ (۷۷۔۳۰) اس سائے کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں۔
کی تشریح اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔

(ش ع ر)

اَلشَّعْرُ: بال۔ اس کی جمع اَشْعَارٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا﴾ (۱۶۔۸۰) اون اور ریشم اور بالوں سے۔
شَعَرْتُ کے معنیٰ بالوں پر مارنے کے ہیں۔ اور اسی سے شَعَرْتُ كَذَا مستعار ہے جس کے معنیٰ بال کی طرح باریک علم حاصل کر لینے کے ہیں اور شاعر کو بھی اس کی فطانت اور لطافت نظر کی وجہ سے ہی شاعر کہا جاتا ہے تو لَیْتَ شِعْرِیْ كَذَا کے محاورہ میں شعر اصل میں علم لطیف کا نام ہے پھر عرف میں موزون اور مقفیٰ کلام کو شعر کہا جانے لگا ہے اور شعر کہنے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (۲۱۔۵) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے نہیں۔ بلکہ (یہ شعر ہے جو اس) شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔
نیز آیت کریمہ:
﴿لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ﴾ (۳۷۔۳۶) ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔
اور آیت: ﴿شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهٖ﴾ (۵۲۔۳۰) شاعر ہے اور ہم اس کے حق میں...... انتظار کر رہے، میں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ پر شعر بمعنیٰ منظوم اور مقفیٰ کلام بنانے کی تہمت لگائی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قرآن پاک میں ہر اس آیت کی تاویل کرنے لگے جس میں وزن پایا جاتا ہے جیسے ﴿وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رَّاسِيَاتٍ﴾ اور ﴿تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾
لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفیٰ کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن پاک اسلوب شعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عوام عجمی بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء

عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ آپ ﷺ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنیٰ کذب اور شاعر بمعنیٰ کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّۃٌ شِعْرِیَّۃٌ کہا جاتا ہے اسی لئے قرآن پاک نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس لئے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ: سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہوا اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ میں نے کوئی متدین اور راست گو انسان ایسا نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو۔

اَلْمُشَاعِرُ: حواس کو کہتے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (۴۹۔۲) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادارک نہیں کر سکتے۔ اور اکثر مقامات میں جہاں لَا تَشْعُرُوْنَ کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے لَا یَعْقِلُوْنَ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتیں لیکن عقل سے ان کا ادارک ہو سکتا ہے اور مَشَاعِرُ الْحَجِّ کے معنیٰ رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں اس کا واحد مَشْعَرٌ ہے اور انہیں شَعَائِرُ الْحَجِّ بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شَعِیرَۃٌ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ﴾ (۲۲۔۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے۔

﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (۲۔۱۹۸) مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ﴾ (۵۔۲) خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میں شَعَآئِرُ اللّٰهِ سے مراد قربانی کے وہ جانور ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ اور قربانی کو شَعِیْرَۃٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ شَعِیْرَۃٌ (یعنی تیز لوہے) سے اس کا خون بہا کر اس پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔

اَلشِّعَارُ: وہ لباس جو انسان کے جسم کے ساتھ ملا رہتا ہے نیز لڑائی میں فوجی اشارہ کو بھی شِعَارٌ کہا جاتا ہے اَشْعَرَہُ الْحُبُّ: محبت اس کا لباس بن گئی۔

اَلْاَشْعَرُ: لمبے بالوں والا آدمی یا وہ گھوڑا جس کے کھر کے اردگرد لمبے بال ہوں اور سخت مصیبت کو کہا جاتا ہے اور شُعْرَاءُ کتے مکھی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اس کے بالوں پر بیٹھی رہتی ہے۔

اَلشَّعِیرُ: جو کا دانہ۔ اَلشِّعْرٰی ایک ستارے کا نام ہے (جو سخت گرمی کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے) اور آیت کریمہ:

﴿هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی﴾ (۵۳۔۴۹) وہی شعریٰ کا مالک ہے، میں شِعْرٰی کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ایک قوم کا معبود تھا۔

(ش ع ف)

آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ (۱۲۔۳۰) میں ایک قرأت قَدْ شَعَفَهَا بعین مہملہ ہے۔ [1] جو کہ

---

[1] وفی مجاز ابوعبیدۃ ویقرؤہ قوم (قد شعفھا) وھو من المشعوف قال فی الطبری (۲: ۱۱۰) (۱۱۱) قرء بالمھملۃ ابو رجاء والاعرج وعرف وزویت عن علی والجمھور بالمعجمۃ (راجع الفتح ۸: ۲۷۲)۔

شَغْفَةُ الْقَلْبِ سے مشتق ہے اور شَغْفَۃُ الْقَلْبِ دل کے اس سرے کو کہتے ہیں جو شہ رگ کیساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے اور شَغْفَۃُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے:

فُلَانٌ مَشْغُوْفٌ بِکَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے گویا محبت اس کے شغفہ قلب تک پہنچ گئی ہے۔

(ش ع ل)

اَلشَّعْلُ: آگ کا بھڑکنا یا بھڑکانا کہا جاتا ہے شُعْلَۃٌ مِّنَ النَّارِ: آگ کا شعلہ اور قَدْ اَشْعَلْتُھَا کے معنیٰ ہیں: میں نے آگ بھڑکائی۔

ابوزید کے نزدیک شَعَلْتُھَا (فعل مجرد) کہنا بھی جائز ہے۔اَلشَّعِیْلَۃُ: جلتی ہوئی بتی۔بعض نے سفیدی کے چمکنے کے لئے بھی بَیَاضٌ یَشْتَعِلُ کا محاورہ استعمال کیا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور سر ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے شعلہ مارنے لگا ہے۔

یہاں رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے اِشْتَعَلَ فُلَانٌ غَضَبًا: فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا۔یہاں غصہ کو حرکت کے لحاظ سے آگ کے بھڑکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اسی سے اَشْعَلْتُ الْخَیْلَ فِی الْغَارَۃِ کا محاورہ ہے یعنی میں نے غارت گری کے لئے سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔جیسا کہ اَوْقَدْتُھَا وَھَیَّجْتُھَا وَاَضْرَمْتُھَا کے محاورات ہیں۔

(ش غ ل)

اَلشُّغْلُ وَالشَّغْلُ: ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْ شُغُلٍ فَاکِھُوْنَ﴾ (۳۶۔۵۵) عیش ونشاط کے مشغلے میں ہوں گے۔

ایک قرأت میں شُغُلٌ ہے یہ شَغِلَ فَھُوَ مَشْغُوْلٌ (باب مجرد) سے آتا ہے اُشْغِلَ استعمال نہیں ہوتا شُغُلٌ شَاغِلٌ مصروف رکھنے والا کام۔

(ش ف ع)

اَلشَّفْعُ: کے معنیٰ کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں اور جفت چیز کو شَفْعٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۸۹۔۳) اور جفت اور طاق کی۔

بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے مراد مخلوق ہے کیونکہ وہ جفت بنائی گئی ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾ (۵۱۔۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

اور وتر سے ذات باری تعالیٰ مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے یگانہ ہے بعض نے کہا کہ شفع سے مراد یَوْمَ النَّھْرِ ہے کیونکہ اس کے بعد دوسرا دن اس کی مثل ہوتا ہے اور وَتْرٌ سے مراد یوم عرفہ ہے۔[1] اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے اولادِ آدم اور وتر سے آدم علیہ السلام مراد ہیں

[1] قول ابن عباس وعکرمة والضحاك.

کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا کئے گئے تھے۔ ❶

اَلشَّفَاعَةُ: کے معنیٰ دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا شفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے شامل ہوجانے پر بولا جاتا ہے اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی۔ ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾ (۱۹۔۸۷) (تو لوگ) کسی کی سفاش کا اختیار رکھیں گے مگر جس نے خدا سے اقرار لیا ہو۔

﴿لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ (۲۰۔۱۹) اس روز کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔

﴿لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا﴾ (۵۳۔۲۶) جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

﴿وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی﴾ (۲۱۔۲۸) وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کرسکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ﴾ (۷۴۔۴۸) (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا سفارش کے لئے پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کرسکیں گے۔

﴿مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ﴾ (۴۰۔۱۸) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔

﴿وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّکُنْ لَّهُ نَصِیْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّکُنْ لَّهُ کِفْلٌ مِّنْهَا﴾ (۴۔۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع ونقصان میں اس کا شریک ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❸

(۱۹۵) ((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اجرها وَاَجرُ مَن عَمِلَ بِهَا وَمَن سَن سُنَّةً سَیِّئَةً فعلَیهِ وزرها وَوزرمن عمل بِهَا)) کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ (۱۰۔۳) کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لئے بغیر کسی کی سفارش نہیں

---

❶ مجاهد والحسن وفی تفسیر الآیة اقول اخریٰ (الطبری۔۳: ۱۷۰۔۱۷۲).

❷ انکر الشفاعة المعتزله وقالوا اخلاف العدل وانکر ولاحادیث الواردة فی اثباته وهی اول فرقة انکرالحدیث (راجع کتب الاصول).

❸ رواه الحاکم ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجة ۔عن جریر وباختلاف الفاظه ۔عن ابی جحیفة (راجع الفتح ۳: ۲۰۰).

کر سکتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

اِسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلٰی فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِیْ: میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

شَفَّعَهٗ کے معنی کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔اور اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔❶ (۱۹۶) ((اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ)) کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

اَلشُّفْعَةُ: کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کر لینا یہ شَفْعٌ سے مشتق ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❷ (۱۹۷) ((اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فَلَا شُفْعَةَ)) جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

(ش ف ق)

اَلشَّفَقُ: غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں مل جانے کو شفق کہتے ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿فَلَا اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴾ (۸۴۔۱۶) ہمیں شام کی سرخی کی قسم!

اَلْاِشْفَاقُ: کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب سمجھتا ہے اور اسے تکلیف پہنچنے سے ڈرتا رہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ﴾ (۲۱۔۴۹) اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

اور جب یہ فعل حرف مِنْ کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اگر بواسطہ فِیْ کے متعدی ہو تو عنایت کے معنی نمایاں ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ﴾ (۵۲۔۲۶) اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے۔

﴿مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا﴾ (۴۲۔۱۸) وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

﴿مُشْفِقِیْنَ مِمَّا كَسَبُوْا﴾ (۴۲۔۲۲) وہ اپنے اعمال (کے وبال سے) ڈر رہے ہوں گے۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ..... پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔

(ش ف و)

شفا: کنوئیں وغیرہ کے کنارہ کو کہتے ہیں۔یہ قرب ہلاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ﴾ (۹۔۱۰۹) گر جانے والی

---

❶ الحدیث اخرجه ابن حبان من روایة جابر والحاکم من حدیث معقل بن یسار والطبرانی من حدیث ابن مسعود وابو عبیدة فی فضائل القرآن (راجع لتخریجه الکاف ۹۲ وکنز العمالج ۱ رقم ۲۳۰۷ و۲۳۶۳).

❷ رواه الترمذی من حدیث جابر بن عبدالله قال وقد رواه بعضهم مرسلا عن ابی سلمة والمسئلة مختلف فیها بین الفقهاء راجع التحفة شرح الترمذی (۲ ض ۲۹۴) وباختلاف الفاظه فی البخاری ومسند احمد وابی داؤد وابن ماجة والشافعی عن الزهری عن ابی سلمة وسعید بن المسیب مرسلاً (راجع کنز العمال ۷: ۳).

کھائی کے کنارہ پر۔
﴿عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰۳) (اور تم) آگ کے گڑھے کے کنارے تک.........
اَشْفٰى فُلَانٌ عَلَى الْهَلَاكِ: فلاں ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے مَا بَقِيَ مِنْ كَذَا اِلَّا شَفًى ...... کہ فلاں چیز تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے (یہ چاند یا سورج کے غروب ہونے یا کسی کی موت کے وقت بولا جاتا ہے) شَفَا تثنیہ شفوان اور جمع اَشْفَاء آتی ہے۔

(ش ف ی)

اَلشِّفَاءُ (ض) مِنَ الْمَرَضِ: سلامتی سے ہمکنار ہونا۔ یعنی بیماری سے شفا پانا۔ یہ مرض سے صحت یاب ہونے کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں شہد کے متعلق فرمایا:
﴿فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (۱۶۔۶۹) اس میں لوگوں کے (امراض کی) شفا ہے۔
﴿هُدًى وَّ شِفَاءٌ﴾ (۴۱۔۴۴) وہ ہدایت اور شفا ہے۔
﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۱۰۔۵۷) وہ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔
﴿وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۴) اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

(ش ق ق)

اَلشَّقُّ: شگاف کو کہتے ہیں، شَقَقْتُه بِنِصْفَيْنِ میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ (۸۰۔۲۶) پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔
﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ﴾ (۵۰۔۴۴) اس روز زمین (ان پر سے) پھٹ جائے گی۔
﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ﴾ (۶۹۔۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا۔
﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۸۴۔۱) اور چاند شق ہوگیا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے معنیٰ وَضَحَ الْاَمْرُ: کئے ہیں۔ یعنی معاملہ واضح ہوگیا۔
اَلشِّقَّةُ: پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے:
طَارَ فُلَانٌ مِنَ الْغَضَبِ شِقَاقًا: فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔ جیسا کہ قُطِعَ غَضَبًا کا محاورہ ہے۔ طَارَتْ مِنْهُمْ شُقَّةٌ ان کا ایک حصہ اڑ گیا یعنی غضب ناک ہوئے۔
اَلشِّقُّ: اس مشقت کو کہتے ہیں جو تنگ دو سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ (۱۶۔۷) زحمت شاقہ کے بغیر۔
اَلشُّقَّةُ: وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ﴾ (۹۔۴۲) لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔
اَلشِّقَاقُ: (مفاعلہ) کے معنیٰ مخالفت کے ہیں گویا ہر فریق جانب مخالف کو اختیار کر لیتا ہے اور یا یہ شَقَّ الْعَصَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ باہم افتراق پیدا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۴۔۳۵) اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔

﴿فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ﴾ (۲۔۱۳۷) تو وہ تمہارے مخالف ہیں۔

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْ﴾ (۱۱۔۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے۔

﴿لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ﴾ (۲۔۱۷۶) وہ ضد میں (آ کر نیکی سے) دور ہو گئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۸۔۱۳) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔یعنی اس کے اولیاء کی صف کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے ساتھ مل جاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۹۔۶۳) یعنی جو شخص خدا اور رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ﴾ (۴۔۱۱۵) اور جو شخص پیغمبر کی مخالفت کرے۔

اَلْمَالُ بَيْنَنَا شَقَّ الشَّعْرَةِ اَوْ شَقَّ الْاُبْلُمَةِ ❶ یعنی مال ہمارے درمیان برابر برابر ہے۔

فُلَانٌ شَقُّ نَفْسِیْ اَوْ شَقِيْقُ نَفْسِیْ: یعنی وہ میرا بھائی ہے میرے ساتھ اسے گونہ مشابہت ہے۔

شَقَائِقُ النُّعْمَانِ: گلِ لالہ یا اس کا پودا۔ ❷

شَقِيْقَةُ الرَّمْلِ: ریت کا ٹکڑا۔

اَلشَّقْشَقَةُ: اونٹ کا ریہ جو مستی کے وقت باہر نکالتا ہے اس میں چونکہ شگاف ہوتا ہے اس لئے اسے شَقْشَقَةٌ کہتے ہیں۔ ❸

بِيَدِهٖ شُقُوْقٌ: اس کے ہاتھ میں شگاف پڑ گئے ہیں

شِقَاقٌ: سم کا شگاف فَرَسٌ اَشَقُّ: راستہ سے ایک جانب مائل ہو کر چلنے والا گھوڑا۔

اَلشُّقَّةُ: اصل میں کپڑے کے نصف حصہ کو کہتے ہیں اور مطلق کپڑے کو بھی شُقَّةٌ کہا جاتا ہے۔

(ش ق و)

اَلشَّقَاوَةُ: بدبختی۔یہ سعادت کی ضد ہے اور شَقِیَ (س) شَقْوَةٌ وَشَقَاوَةٌ وَشَقَاءً کے معنٰی بدبخت ہونے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب آ گئی۔

میں ایک قرأت شَقَاوَتُنَا ہے۔ ❹ تو شِقْوَةٌ بروزن رِدَّةٌ ہے۔سعادت کی طرح شقاوت بھی امور اضافیہ سے ہے۔جیسا کہ سعادت دو قسم پر ہے، دنیوی واخروی اور پھر سعادت دینوی تین قسم پر ہے۔نفسانی، بدنی، اور خارجی، اسی طرح شقاوت بھی انہی اقسام طرف منقسم ہوتی ہے۔ چنانچہ شقاوت اخروی کے متعلق فرمایا:

---

❶ والابلمة الخوصة ای نحن متساوون فيه لان الخوصة اذاشقت طولا انشقت نصفين۔

❷ واحده شقيقة واضيف الى النعمان بن المنذر لانه حمى ارضا فكثر فيهاوقيل النعمان اسم الدم فشهت حمرتها لحمرة الدم واللسان : شق.

❸ وفی اللسان : ولاتكون الاللجمل العربی والجمع اشق ومن سميت الخطب شقا وفی حديث علی ان كثير امن الخطب شقائق الشيطان لان الشطان يدخل فيهامن الكذب وفی الفائق القول منسوب لمعر.

❹ وهی قرأة ابن مسعود والاول قراة اهل المدينة (اللسان).

﴿فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾ (۲۰۔۱۲۳) وہ نہ گمراہ اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

﴿رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب آ گئی۔

اور شقاوت دنیوی کے متعلق فرمایا:

﴿فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ (۲۰۔۱۱۷) تو یہ کہیں تو دونوں کو جنت سے نکلوانہ دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی شِقَاءٌ کا لفظ تَعَبٌ کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے شَقَيْتُ فِيْ كَذَا: یعنی میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اٹھائی اور ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے۔ ہر شقاوت کو تعب کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تعب شقاوت نہیں ہوتی لہٰذا تعب شقاوت سے عام ہے۔

(ش ک ک)

اَلشَّكُّ: کے معنیٰ دو نقیضوں کے ذہن میں برابر و مساوی ہونے کے ہیں یہ یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پائی جاتی ہیں اور یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر بھی دلیل نہیں ہوتی۔

اَلشَّكُّ: کبھی تو نفس شے میں ہوتا ہے کہ کون سی جنس سے ہے اور کبھی اس کی صفت میں اور کبھی اس غرض کے بارے میں جس کے لئے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔

شک جہالت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہی نہیں ہوتا پس ہر شک جہل ہے مگر ہر جہل شک نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ (۱۱۔۱۰) وہ تو اس سے قوی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ﴾ (۴۴۔۹) لیکن یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں۔

﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ﴾ (۱۰۔۹۴) اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں کچھ شک ہے۔

اور یہ (شک) یا تو شَكَكْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ چاک کر ڈالنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۲٦٤) وَشَكَكْتُ بِالرُّمْحِ الْاَصَمِّ ثِيَابَهٗ
لَيْسَ الْكَرِيْمُ عَلَى الْقَنَا بِمُحَرَّمٖ

میں نے ٹھوس نیزے سے اس کا دل (یا درع کو) چاک کر ڈالا اور شریف آدمی نیزے پر حرام نہیں ہوتا۔

تو گویا شک کے معنیٰ کسی چیز میں شگاف ڈالنے کے ہیں اور کسی شی کے اس طرح ہونے کے ہیں کہ اس میں رائے کو قرار حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس پر اعتماد ہو سکے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اس شَكٌّ سے مستعار ہو جس کے معنیٰ بازو کے پہلو سے چمٹ جانے کے ہیں اس طرح شک کا مفہوم یہ ہوگا کہ دو متضاد چیزوں کا باہم دیگر اس طرح مل جانا کہ رائے اور فہم ان میں داخل ہو کر ایک دوسری سے الگ نہ کر سکے اور اِلْتَبَسَ الْاَمْرُ واخْتَلَطَ وَاَشْكَلَ وغیرھا استعارات سے بھی اس اشتقاق کی

---

[1] قاله عنترة انظر اللسان (شك) والطبرسي (۲۹: ۱۰۷) ومحاضرات المؤلف (۳: ۱٦۰) والجمهرة ۱٦۷ والمعلقات لابن الانباري ٤٦,۳٤۷ والعشر للتبريزي ۱۹٦ والمعاني للقتبي وديوانه ۲۱.

تائید ہوتی ہے۔

اَلشِّکَّۃُ: ہتھیار، جس سے کسی چیز کو پھاڑا جاتا ہے۔

(ش ک ر)

اَلشُّکْرُ کے معنیٰ کسی نعمت کا تصور اور اسکے اظہار کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہ کَشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنیٰ کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنیٰ نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فربہی سے یہ ظاہر کررہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عَیْنٌ شَکْرٰی سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ آنسوؤں سے بھرپور آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنیٰ ہوں گے منعم کے ذکر سے بھر جانا۔

شکر تین قسم پر ہے شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا۔شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی مکافات کرنا۔اور آیت کریمہ:

﴿اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا﴾ (۳۴۔۱۳) اے داؤد کی آل میرا شکر کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں شُکْرًا منصوب علی التمیز ہے اور معنیٰ یہ ہیں کہ جو عمل کرو وہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے لئے کرو۔اور بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے۔اور اُشْکُرُوا کی بجائے اِعْمَلُوْا اس لئے کہا گیا ہے تاکہ شکر کی انواع ثلاثہ یعنی شکر قلبی، شکر لسانی، اور شکر بالجوارح کے التزام پر تنبیہ ہوجائے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ (۳۱۔۱۴) کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

﴿وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ﴾ (۳۔۱۴۵) اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب (بہت اچھا) صلہ دیں گے۔

﴿وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ﴾ (۲۷۔۴۰) اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے۔اور آیت کریمہ:

﴿قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر گزار ہونا بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء میں سے شکر گزاری پر صرف دو پیغمبروں کی تعریف کی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ﴾ اس کی نعمتوں کا شکر گزار ٹھہرے تھے۔دوم حضرت نوح علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا﴾ (۱۷۔۶) بے شک نوح ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔

اور جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے: ﴿اِنَّہٗ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (۶۴۔۱۷) بے شک خدا قدر شناس اور بردبار ہے۔

تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی عبادت گزاری کی پوری پوری جزا دینا مراد ہوتا ہے نَاقَۃٌ شَکِرَۃٌ: دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں والی اونٹنی (یہ شکر سے صیغہ صفت ہے) مقول مشہور ہے۔[1]

ھُوَ اَشْکَرُ مِنْ بَرُوْقٍ: وہ بروق گھاس سے بھی زیادہ

---

[1] انظر للمثل اللسان (برق) والمیدانی رقم (۲۰۵۳) وفیہ تخصر من غیر مطربل تنبت بالسحاب اذانشا ۱۲۔

شکر گزار ہے۔ بروق گھاس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہلکی سی بارش سے ہری بھری ہو جاتی ہے اور شَکْرٌ کے معنیٰ کنایہ کے طور پر عورت کی شرمگاہ اور اس سے جماع کے بھی آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ ❶

اِنْ سَأَلَتْكَ ثَمَنَ شَكْرِهَا وَشَبْرِكَ اَنْشَأَتَ تَطُلُّهَا: اگر وہ تجھ سے اپنی شرمگاہ اور جماع کی اجرت طلب کرتی ہے تو تو اس میں حیلے بہانے کرتا ہے۔

اَلشَّكِيرُ: تروتازہ گھاس جو درخت کے تنہ میں ہو۔ اور شِكَرَت (س) اَلشَّجَرَةِ کے معنیٰ درخت کی شاخوں کے گنجان ہونے کے ہیں۔

(ش ک س)

اَلشَّكِسُ: بدمزاج کو کہتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ﴾ (۳۹۔۲۹) جس میں کوئی آدمی شریک ہیں (مختلف المزاج) اور بدخو۔ یعنی اپنی بدمزاجی کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے والے ہیں۔

(ش ک ل)

اَلْمُشَاكَلَةُ: کے معنیٰ شکل وصورت میں مشابہ ہونے کے ہیں اور نِـــد کے معنیٰ جنس میں شریک ہونے کے ہیں اور شَبَہٌ کے معنیٰ کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ﴾ (۳۸۔۵۸) اور اس طرح کے اور بہت سے (عذاب ہوں گے) میں ہیئت اور تعاطی فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ شَكْلٌ کے معنیٰ دَلٌّ یعنی عورت کے ناز و انداز کے ہیں لیکن اصل میں اس نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب و ہم پیشہ شخصوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔ اَلنَّاسُ اَشْكَال وَاُلَّافُ کہ لوگ باہم مشابہ اور الفت کروالے ہیں۔

اصل میں مُشَاكَلَةٌ شکل سے ہے اور شَكَّلْتُ الدَّابَّةَ کے معنیٰ ہیں "میں نے جانور کی ٹانگیں (اشکال سے) باندھ دیں اور شکال اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اس کی ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں پھر اس سے استعارہ کے طور پر قَيَّدْتُ الْكِتَابَ کی طرح شَكَّلْتُ الْكِتَابَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کتاب کو اعراب لگانے کے ہیں۔

دَابَّةٌ بِهَا شِكَالٌ: وہ جانور جس کے ایک اگلے اور ایک پچھلے پاؤں میں شِكَال یعنی پائے بند کی طرح سفیدی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (۱۷۔۱۸۴) کہو کہ ہر ایک اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔

یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسے پائے بند کے ہوئے ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "اَلذَّرِيْعَةُ اِلٰى مَكَارِمِ الشَّرِيْعَةِ" میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے

---

❶ قاله يحيىٰ يعمر لرجل خاصمته اليه امرئته فى مهرها اورده القتبى فى ادب الكتاب ص ۱۲ مثلاً للتقعير والتقعيب وفيه الخبر ومجالس ثعلب (٤٦٥) قال وانشكر: الفرج والكامل للمبرد٦٨ وكتب تراجم النحويين مع اختلاف فى الرواية وفى اللسان (ضهل، طلل) والفائق (١: ٣٣٣) بزيادة تضهلها اى تعطيها القليل من حقها والنهاية (شكر) وفيه أان بزيادة همزة الاستفهام وفى المطبوع تصحيف وارتباك .

ہی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا [1]:

(۱۹۹) كُلٌّ متيسرٌ لِمَا خُلِقَ لهٗ (فکر ہر کسی بقدر ہمت اوست)

اَلْاَشْكَلَةُ: حاجت جو انسان کو پابند کردے اور اَلْاِشْكَالُ کے معنیٰ (بطور استعارہ) کسی کام کے پیچیدہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اشتباہ کا لفظ شَبَهٌ سے مشتق ہے اور مجازاً کسی امر کے مشتبہ ہونے پر بولا جاتا ہے۔

(ش ک و)

اَلشَّكْوُ وَالشِّكَايَةُ وَالشَّكَاةُ وَالشَّكْوٰى کے معنیٰ اظہار غم کے ہیں اور شكَوتُ وَاَشْكَيتُ دونوں ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۱۲۔۸۶) کہ میں تو اپنے غم اور اندوہ کا اظہار (خدا سے کرتا ہوں۔

﴿وَتَشْتَكِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۵۸۔۱) اور خدا سے شکایت (رنج وملال) کرتی ہے۔

اَشْكَاهُ: (افعال) کے معنیٰ کسی کو صاحب شکوہ کردینے کے آتے ہیں جیسے اَمْرَضَهٗ (اس کو صاحب مرض کردیا) اور کسی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۰۰) شَكَوْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَرَّ الرَّمْضَاءِ فِيْ جِبَاهِنَا وَاَكُفِنَا فَلَمْ يُشْكِنَا: کہ ہم نے آنحضرت کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی شکایت کی لیکن آپ ﷺ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

اصل میں شَكْو کے معنیٰ شَكْوة یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں لہٰذا یہ دراصل بَثَثْتُ لَهٗ مَا فِيْ وِعَائِيْ اور نَفَضْتُ مَا فِيْ جِرَابِيْ کی طرح استعارہ ہے جس کے معنیٰ دل کی بات کو ظاہر کردینے کے ہیں۔ اَلْمِشْكوةُ: طاق جو آر پار نہ ہو قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمِشْكَاةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ (۲۴۔۳۵) گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔

تو مِشْكوةٌ سے مراد مومن کا دل اور مصباح سے نور الٰہی مراد ہے۔

(ش م ت)

اَلشَّمَاتَةُ: کے معنیٰ دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِتَ بِهٖ فَهُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے اور اَشْمَتَ اللّٰهُ بِهِ الْعَدُوَّ: کے معنیٰ ہیں اللہ اسے مصیبت پہنچائے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاءَ﴾ (۷۔۱۵۰) تو ایسا نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر ہنسیں۔

تُشْمِتْ کے معنیٰ چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالۂ شماتة کی دعا ہے جیسے تعْرِيْضٌ کے معنیٰ مرض کو

---

[1] رواہ الحاکم وابوداؤد واصلہ متفق علیہ عن عمران بن حصین والترمذی عن عمر والحاکم ایضاً عن ابی بکرفی حدیث طویل.

[2] اخرجہ مسلم بعدان اوردا حادیث ابرادالظھر والبیھقی من حدیث خباب راجع النیل (۲ : ۳۲۹) والزرقانی علی الموطا (۱ : ۴۰) والحدیث فی حل کتب الحدیث وفی الفائق (۱ : ۲۵۲) والنہایة (شکو) ۱۲.

زائل کرنے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۲۶۵) فَبَاتَ لَهُ ....

طَوعَ الشَّوامِتِ ....

تو اس نے خوف وہراس اور سردی میں کھڑے ہوکر رات گزاری۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شوامت سے قوائم یعنی ٹانگیں مراد ہیں،لیکن یہ معنیٰ محل نظر ہیں اس لئے کہ اس بیت کے علاوہ اس معنیٰ پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ش م خ)

اَلشَّامِخُ: بلند،ج مؤنث شَامِخَاتٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَوَاسِیَ شَامِخَاتٍ﴾ (۷۷۔۲۷) اونچے اونچے پہاڑ۔اور اسی سے شَمَخَ بِاَنْفِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ تکبر کرنے کے ہیں۔

(ش م ء ز)

اَلاِشْمِأْزَازُ: منقبض وگرفتہ ہوجانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ﴾ (۳۹۔۴۵) (تو) ان لوگوں کے دل منقبض ہوجاتے ہیں۔

(ش م س)

اَلشَّمْسُ: کے معنیٰ سورج کی ٹکیہ یا دھوپ کے ہیں ج: شُمُوسٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ (۳۶۔۳۸) اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔

﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (۵۵۔۵) سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

شَمَسَ يَوْمُنَا وَاَشْمَسَ: دن کا دھوپ والا ہونا۔

شَمَسَ فُلَانٌ شِمَاسًا: گھوڑے کا بدکنا ایک جگہ پر قرار نہ پکڑنا۔گویا قرار نہ پکڑنے میں سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(ش م ل)

اَلشِّمَالُ: بایاں۔ضد یمین۔قرآن پاک میں ہے:

﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۷) جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔

نیز چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے اسے بھی شِمَالٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ عربی زبان میں دوسرے اعضاء کی مناسبت سے لباس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔مثلاً قمیص کی آستین کو یَدٌ (ہاتھ) اور جو حصہ سینہ اور پشت پر آئے اسے صَدْرٌ اور ظَهْرٌ کہا جاتا ہے اور پائجامہ کے پائنتہ کو رِجْلٌ سے موسوم کردیتے ہیں۔وغیر ذالک

اور اَلْاِشْتِمَالُ بِالثَّوْبِ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے حدیث میں ہے۔[2]

(۱۰۱) ((نُهِیَ عَنْ اشْتِمَالِ الصَّمَّاءِ)) کہ اشتمال الصماء ممنوع ہے۔

---

[1] قالہ النابغة والبيت بتمامه : فارتاع من صوت كلاب خباب له طوع انشوامت من خوف ومن بردا والبيت فى اللسان (شمت) ومختار الشعرالجاهلى (۱ : ۷۵) والمحكم (طوع) وفيه "من صرد" والكلاب صاحب الكلاب والشوامت القوائم اى بات الثور طوع قوائم (يعنى قائما) وهذاعلى رواية من روىٰ طوع بالنصب ومن رفعه فانه يريد من طوع الشوامت اى ماتشتهيه اعداده راجع للبيت ايضاً البحر (۵ : ۲۳۷) والعقدالثمين ٦ والعشر للتبريزى ۲۹۴ والبيت من ابيات المعانى راجع اللسان والمعانى الكبير للقتبى (۷۳۹).

[2] متفق عليه وابوداؤد والبيهقى من حديث ابن عمر راجع ايضاً الزرقانى على المؤطا (۴ : ۲۸۷) والفائق (۲ : ۲۰).

اور استعارہ کے طور پر کمبل کو جو جسم پر لپیٹا جاتا ہے۔ شَمْلَةٌ وَمِشْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شَمَلَهُمُ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ کسی امر کے سب کو شامل اور عام ہو جانے کے ہیں۔ پھر شَمال کے لفظ سے مجازاً کہا جاتا ہے۔

شَمَلْتُ الشَّاةَ: بکری کے تھنوں پر غلاف چڑھنا۔ اور شِمَالَ کے معنیٰ عادت بھی آتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی چادر کی طرح انسان پر مشتمل ہو جاتی ہے۔

اَلشَّمُوْلُ: شراب۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور شراب کو شمول کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ عقل کو ڈھانپ لینے کی وجہ سے خَمْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلشِّمَالُ: (بکسر الشین) وہ ہوا جو کعبہ کی بائیں جانب سے چلتی ہے اور اس میں ایک لغت شَمَالٌ (بفتحہ شین) بھی ہے۔

شَامَلَ وَاشْمَلَ کے معنیٰ شمال کی جانب میں جانے کے ہیں۔ جیسے جنوب سے اَجْنَبَ (جنوب کو جانا) کنایہ کے طور پر تلوار کو مشْتَمَلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے رِدَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے مُرْتَدٍ بالسَّيْفِ وَمُتَدَرِّعًا لَهٗ کی طرح جَاءَ مُشْتَمِلًا بِسَيْفِهٖ کا محاورہ ہے۔

نَاقَةٌ شَمِلَّةٌ وَشِمَالٌ: بادشمالی کی طرح تیز رو اونٹنی۔ اور شاعر کے قول۔ ❶ (الکامل)

(٢٦٦) وَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مَشْمُوْلَةً
وَلَتَنْدَمَنَّ وَلَاتَ سَاعَةَ مَنْدَمٍ

تم عمدہ اخلاق کو پہچان لو گے اور تم پشیمانی اٹھاؤ گے لیکن وہ وقت پشیمانی کا نہیں ہوگا۔

میں مَشْمُوْلَةٌ سے مراد پاکیزہ اخلاق ہیں گویا بادشمالی نے (شراب کی طرح) انہیں ٹھنڈا اور خوش گوار بنا دیا۔

(ش ن ی)

شِنِئْتُهٗ: (ف س) کے معنیٰ بغض کی وجہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔ اسی سے اَزْدِشَنُوْئَة مشتق ہے جو ایک قبیلہ کا نام اور آیت کریمہ: ﴿شَنَاٰنُ قَوْمٍ﴾ (۵۔۲) لوگوں کی دشمنی۔

میں شَنَاٰنُ کے معنی بغض اور دشمنی کے ہیں ایک قرأت میں شِنْاٰنٌ بسکون نون ہے۔ پس تخفیف (یعنی سکون نون) کی صورت میں اسم اور فتح نون کی صورت میں مصدر ہوگا۔ ❷ اور اسی سے فرمایا:

﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (۱۰۸۔۳) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

(ش ھ ب)

اَلشِّهَابُ: کے معنی بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ جلتی ہوئی آگ کا ہو یا فضا میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾ (۳۷۔۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگتا ہے۔

﴿شِهَابٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۵۔۱۸) روشنی کرنے والا انگارہ۔

﴿شِهَابًا رَّصَدًا﴾ (۷۲۔۹) انگارہ تیار۔

❶ والبيت من شواهد الطبرى (٢٣-٢٢) وراجع له ايضاً اضداد ابى الطيب (٤١٣) والاصمعى (١٨) وابن السكيت ١٧٣ وابن الانبارى ١٦٨ وفى كل المراجع بغير عزو والخزانة البغدادية ٢: ١٤٨.

❷ الاسم مثل سكران وعطشان من سكر وعطش والمصدر مثل طيران ونسلان وعسلان ورملان قال الطبرى (٦: ١٦٤) واولى القرائتين قراءة من يفتح النون لان المصادر ياتى على فعلان.

اَلشُّهْبَةُ: سفیدی۔ جس میں کچھ سیاہی ملی ہوئی ہو۔ جیسا کہ انگارہ کی روشنی کے ساتھ دھواں ملا ہوتا ہے اسی سے کَتِیبَةٌ شَھْبَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ مسلح لشکر کے ہیں کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ سیاہی اور سفیدی ملی ہوئی ہیں۔

(ش ھ د)

اَلْمَشْھُودُ وَالشَّھَادَةُ کے معنیٰ کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ﴾ (۵۹۔۱۲) پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا۔

لیکن اولیٰ یہ ہے کہ شُھُوْدٌ کے معنیٰ صرف حاضر ہونا ہوں اور شَھَادَةٌ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے۔ اَلْمَحْضَرُ: بمعنیٰ مشھد یعنی حاضر ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے مُشْھِدٌ وہ عورت جس کا خاوند حاضر ہو اور مَشْھَدٌ کی جمع مَشَاھِدُ آتی ہے اسی سے مَشَاھِدُ الْحَجِّ ہیں یعنی وہ مواضع شریفہ جہاں کہ فرشتے اور نیک لوگ حاضر ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ مَشَاھِدُ الحَجِّ کے معنیٰ مناسک حج کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ﴾ (۲۲۔۲۸) تا کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے حاضر ہوں۔

﴿وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا﴾ (۲۴۔۲) اور ان کی سزا کے وقت...... موجود ہو۔

﴿مَا شَھِدْنَا مَھْلِكَ اَھْلِهٖ﴾ (۲۷۔۴۹) ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔

﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ (۲۵۔۷۲) اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

یعنی نہ تو زَوْرٌ کے موقع پر خود ہی حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا قصد یا ارادہ کرتے ہیں۔

اَلشَّھَادَةُ: وہ بات جو کامل علم و یقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدۂ بصر سے حاصل ہوا ہو یا بصیرت سے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَشْھِدُوْا خَلْقَھُمْ﴾ (۴۳۔۹) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے۔

میں مشاہدہ بصر مراد ہے اور پھر سَتُكْتَبُ شَھَادَتُھُمْ (عنقریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی) سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ﴾ (۲۔۷۴) اور تم اس بات کے گواہ ہو۔

میں تَشْھَدُوْنَ کے معنیٰ تَعْلَمُوْنَ کے ہیں یعنی تم اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا اَشْھَدْتُّھُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۸۔۵۲) میں نے نہ تو ان کو آسمان کے پیدا کرنے وقت بلایا تھا۔

میں تنبیہ کی ہے کہ اس لائق نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے خلق آسمان پر مطلع ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿عَالِمُ الغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ﴾ (۲۳۔۹۳) وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔

میں غائب سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کا ادارک نہ تو ظاہری حواس سے ہو سکتا ہو اور نہ بصیرت سے اور شہادت

سے مراد وہ اشیاء ہیں جنہیں لوگ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

شَہِدْتُّ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) علم کی جگہ آتا ہے اور اسی سے شہادت ادا ہوتی ہے مگر اَشْھَدُ بِکَذَا کی بجائے اگر اَعْلَمُ کہا جائے تو شہادت قبول نہیں ہوگی بلکہ اَشْھَدُ ہی کہنا ضروری ہے۔

(۲) قسم کی جگہ پر آتا ہے چنانچہ اَشْھَدُ بِاللّٰهِ اَنَّ زَیْدًا مُنْطَلِقٌ میں اَشْھَدُ بمعنیٰ اُقْسِمُ ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر اَشْھَدُ کے ساتھ باللّٰهِ نہ بھی ہو تب بھی یہ قسم کے معنیٰ میں ہوگا اور کبھی عَلِمْتُ بھی اس کے قائم مقام ہو کر قسم کے معنیٰ دیتا ہے اور اس کا جواب بھی جواب قسم کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الکامل)

(۲۶۷) وَلَقَدْ عَلِمْتُ کِتَاتِیَنَّ مَنِیَّتِیْ

مجھے یقین ہے کہ میری موت ضرور آ کر رہے گی۔

شَاھِدٌ اور شَھِیْدٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں شَھِیْدٌ کی جمع شُھَدَاءُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا یَاْبَ الشُّھَدَآءُ﴾ (۲۔۲۸۲) اور وہ مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔

شَھِدتُ کے معنیٰ کسی جگہ پر حاضر ہونے کے ہیں اور شَھِدتُ عَلٰی کَذَا کے معنیٰ کسی واقعہ کی شہادت دینے کے قرآن پاک میں ہے:

﴿شَھِدَ عَلَیْھِمْ سَمْعُھُمْ﴾ (۴۱۔۲۱) ان کے کان ان کے خلاف (ان کے اعمال کی) شہادت دیں گے۔

اور کبھی شہادت کے معنیٰ فیصلہ اور حکم کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ اَھْلِھَا﴾ (۱۲۔۲۶) اس کے قبیلہ میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کیا۔

اور جب شہادت اپنی ذات کے متعلق ہو تو اس کے معنیٰ اقرار کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ شُھَدَاءُ اِلَّآ اَنْفُسُھُمْ فَشَھَادَةُ اَحَدِھِمْ اَرْبَعُ شَھَادَاتٍ بِاللّٰهِ﴾ (۲۴۔۶) اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار بار خدا کی قسم کھائے۔

اور آیت کریمہ: ﴿مَا شَھِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ (۱۲۔۸۱) اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق (اس کے لے آنے کا) عہد کیا تھا۔

میں شَھِدْنَا بمعنیٰ اَخْبَرْنَا کے ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَاھِدِیْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ بِالْکُفْرِ﴾ (۹۔۱۷) جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں گے۔

میں شَاھِدِیْنَ بمعنیٰ مُقِرِّیْنَ کے ہیں یعنی کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔

﴿لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا﴾ (۴۱۔۲۱) تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

اور آیت کریمہ: ﴿شَھِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ (۳۔۱۸) خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنی وحدانیت کی شہادت دینے سے مراد

---

❶ والسیوطی ۲۸۰ البیت منسوب للبید ولم اجدہ فی دیوانہ وتمامہ ان المنایا لاتطیش سہامہا وقد روی عجزہ ماخوف علی ولاعدم ۱۲ کذاقال العینی فی شرح الشواھد راجع رقم ۲۵۲۔

عالم اور انفس میں ایسے شواہد قائم کرنا ہے جو اس کی واحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲٦۸) فَفِیْ كُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

ہر چیز کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اس کے یگانہ ہونے پر دلالت کر رہے۔

بعض نے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کے اپنی ذات کے لئے شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو نطق بخشا اور ان سب سے اس کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی﴾ اور فرشتوں کی شہادت سے مراد ان کا ان افعال کو سرانجام دینا ہے جن پر وہ مامور ہیں۔ جس پر کہ آیت:

﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔ دلالت کرتی ہے اور اُولُوالعزم کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلوق کے رموز واسرار پر مطلع ہوتے اور ان کا اقرار کرتے ہیں۔ اور شہادت بایں معنیٰ اہل علم کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ جہلاء اس قسم کی شہادت سے کوسوں دور ہیں اسی لئے کفار کے متعلق فرمایا:

﴿مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۱۸۔۵۱) میں نے ان کو نہ تو آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

میں بھی اسی معنیٰ پر تنبیہ کی ہے اور آیت:

﴿وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ﴾ (۴۔۶۹) اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔

میں بھی شہداء سے یہی لوگ مراد ہیں۔

شَهِیْدٌ: یہ کبھی شاہد یعنی گواہ آتا ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿سَآئِقٌ وَّ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۲۱) اس کے ساتھ (ایک چلانے والا) اور ایک گواہ ہوگا۔ میں شہید بمعنیٰ گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دے گا۔ اسی طرح آیت:

﴿فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا﴾ (۴۔۴۱) بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ طلب کریں گے۔

میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیْدٍ﴾

---

[1] البیت فی البحر (۲: ۲۰۴/۳: ۱۳۹/۴: ۴۳۲) ومحاضرات المؤلف (۴: ۳۹۸) فی ثلاثة ابیات والطبرسی (وفی ابن کثیر قبله) فواعجباً کیف یعصی الاله ۔ام کیف یجحده الجاهد ۔ونسبه الی ابن المعتز وفی طبقات ابن المعتز ۲۰۷ انه لابی العتاهیة وفیه قصة ابی نواس حجاراته ایاه وهوالصواب کمافی زهر الآداب للحصری (۲: ۴۹) وطرازالمجالس ۱۱۶.

(۴۱۔۴۴) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ .... اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (۱۷۔۷۸) کیونکہ صبح کے وقت..... قرآن پاک کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

میں قرآن پاک کے مشہود ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی قرأت کرنے والے پر شفا، رحمت، توفیق، سکینت، اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔جن کا کہ آیت:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۷۔۸۲) اور ہم قرآن پاک کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔اور آیت:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ (۲۔۲۳) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلالو۔میں شُهَدَاء کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنیٰ شہادت مشتمل ہے چنانچہ ابن عباس نے اس کے معنیٰ اَعوَان یعنی مددگار کے لئے ہیں اور مجاہد نے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۶۹) مُخْلِفُوْنَ وَيَقْضِي النَّاسُ اَمْرَ هُمُوْ
وَهُمْ بِغَيْبٍ وَفِيْ عَمْيَاءَ مَا شَعَرُوْا

وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا اور آیت:

﴿وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ (۲۸۔۷۵) اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔

میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ (۱۰۰۔۱۷) اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

﴿اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾ (۱۸۔۲۸) اور (حق ظاہر کرنے کو) خدا ہی کافی ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔جیسا کہ فرمایا:

﴿لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ﴾ (۴۰۔۱۶) اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنیٰ (یعنی علم باری تعالیٰ) کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا﴾ (۴۱۔۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔

میں بھی اسی معنیٰ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا:

﴿وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ (۵۷۔

[1] قاله الاخطل فی كليب بن يربوع رهط جرير وبعده : الآكلون خبيث الزاد وحدهم ۔ والسائلون بظهر الغيب : ما الخبر والبيت فی الكامل ومحاضرات المؤلف (۱ : ۳۱۱) وديوانه ۱۰ والسيوطی ۳۲۸ وفيه يعصی بدل يقضی وقبله : اما كليب بن يربوع فليس لها عند التفاخر ايراد ولاصدر.

۱۹) اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔ اور شُھَـدَاءُ کو شُھَـدَاء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کو مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا﴾ (۳۔۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھنا اور آیت کریمہ:

﴿وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۵۷۔۱۹) اور پروردگار کے نزدیک شہید ہیں۔ بھی اسی معنیٰ پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَّشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ﴾ (۸۵۔۳) اور حاضر ہونے والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی قسم۔ میں بعض نے کہا ہے کہ مَشْھُوْدٌ سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے اور بعض نے یوم قیامت اور شَاھِدٌ سے ہر وہ شخص مراد لیا ہو سکتا جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۳) (اور یہی وہ) دن ہے (جس میں خدا کے روبرو) حاضر کئے جائیں گے۔ میں مَشْھُوْدٌ بمعنیٰ مُشَاھِدٌ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آکر رہے گا۔

اَلتَّشَهُّدُ کے معنیٰ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنیٰ اَلتَّحِيَّاتُ اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

(ش ھ ر)

اَلشَّھْرُ: (مہینہ) وہ مدت معینہ جو چاند کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ یا دورانِ شمس کے بارہ کے حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ہے جو ایک نقطہ سے شروع ہو کر دوسرے نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ﴾ (۲۔۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں............

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ﴾ (۲۔۱۹۷) حج کے مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ (۹۔۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں۔

﴿فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ (۹۔۲) تو مشرکو! زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اَلْمُشَاھَرَۃُ کے معنیٰ ہیں مہینوں کے حساب سے معاملہ کرنا۔ جیسے مُسَانَھَۃٌ (سال وار معاملہ) کرنا اور مُیَاوَمَۃٌ (دنوں کے حساب سے معاملہ کرنا) اَشْھَرْتُ بِالْمَکَانِ: کسی جگہ مہینہ بھر قیام کرنا۔ شَھَرَ فُلَانٌ وَاشْتَھَرَ کے معنیٰ مشہور ہونے کے ہیں خواہ وہ شہرت نیک ہو یا بد۔

(ش ھ ق)

اَلشَّهِيْقُ کے معنیٰ لمبی سانس کھینچنا کے ہیں لیکن شَھِیْقٌ سانس لینے اور زَفِیْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾ (۲۵۔۱۲) اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

اصل میں یہ لفظ جَبَلٌ شَاھِقٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔

(ش ھ و)

اَلشَّھْوَۃُ کے معنی نفس کا اس چیز کی طرف کھنچ جانا جسے وہ چاہتا ہے خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صادقہ اور کاذبہ۔

سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام مختل ہوجاتا ہے۔ جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا اور جھوٹی خواہش وہ جس کے عدم حصول سے بدن میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر شَھْوَۃٌ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس قوت شہویہ پر اور آیت کریمہ:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ (۳-۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں (بڑی) زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں شہوت سے دونوں قسم کے خواہشات مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ (۱۹-۵۹) اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔

میں جھوٹی خواہشات مراد ہیں یعنی ان چیزوں کی خواہش جن سے استغنا ہوسکتا ہو۔ اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ﴾ (۴۱-۳۱) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا۔

﴿فِيمَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ﴾ (۲۱-۱۰۲) اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اس میں ....

رَجُلٌ شَھْوَانٌ وَشَھْوَانِیٌّ: خواہش کا بندہ شَیْءٌ شَھِیٌّ: لذیذ چیز، مرغوب شے۔

(ش و ب)

اَلشَّوْبُ: (ن) کے معنی ہیں: خلط ملط کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ﴾ (۳۷-۶۷) گرم پانی ملا کر۔

اور عَسَلٌ یعنی شہد کو شَوْبٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تمام مشروبات میں ملایا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ساتھ موم ملا ہوا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔[1]

مَا عِنْدَہٗ شَوْبٌ وَّلَا رَوْبٌ: نہ اس کے پاس شہد ہے اور نہ دودھ بالکل قلاش ہے۔

(ش و ر)

اَلشَّوَارُ: کے معنی ظاہری سامان آرائش کے ہیں اور کنایہ کے طور پر اندام نہانی پر بولا جاتا ہے اور شَوَّرْتُ بِہٖ کے معنی ہیں: میں نے اسے شرمندہ کیا۔ گویا اس کے ستر کو ننگا کردیا۔

شِرْتُ الْعَسَلَ وَاَشَرْتُہٗ: چھتے سے شہد نکالنا شاعر نے کہا ہے۔[2]

(۲۷۰) وَحَدِیْثٍ مِثْلُ مَا ذِیْ مُشَارٍ

---

[1] کذافی النوادر لابی سھل ۵۱ وراجع للمثل اللسان (روب۔ شوب) ومنہ فی الحدیث : لاشوب ولا روب ای انی بری منھن عیبھا قال ابن الاثیر فی تفسیر ھذاالحدیث ای لاغش والتخلیط.

[2] قالہ عدی بن زید العبادی وھومن اشھر شعرائھم ذکرہ بردکلن فی تاریخہ (۱ : ۱۲۴) وایضاً الخزانۃ (۲ : ۲۰) واولہ فی سماع یأذن الشیخ لہ والبیت فی اللسان (اذن ، شوذ، موذ،) والفائق (۱ : ۱۳ و ۱ : ۲۳۷) والطبرسی (۳۰ : ۷۷) والتراجمہ الاغانی (۲ : ۱۸، ۴۳) وجمھرۃ اشعار العرب (۱۰۳) وتاریخ الطبری والبیت فی الامالی المرتضیٰ (۱ : ۴۲۳) بغیر عزو والصحاح (موذ) وملاب قد تلھیت بھا۔ قصرت الیوم فی بیت غدارہ والقصیدۃ مقیدۃ القافیۃ . وفی الصحاح : ایاك والخطب فانھا : مشوار کثر العشار ۱۲.

اور باتیں جو چھتے سے نکالے ہوئے تازہ شہد کی طرح شیریں تھیں۔

اور شہد نکالنے کے اعتبار سے شِرتُ الدَّابَةَ کے معنیٰ ہوئے: گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے اور خطبوں کے متعلق کہا جاتا ہے: مشوار کثیر العثار کے خطبے ایسی منڈی ہے جہاں بہت زیادہ لغزش کا خطرہ ہے۔

اور اَلتَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَۃُ وَالْمَشُوْرَۃُ کے معنیٰ ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر رائے معلوم کرنا یہ بھی شِرْتُ العَسْلَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ چھتہ سے شہد نکالنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (۳۔۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اَلشُّوْرٰی: ہر وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ﴾ (۴۲۔۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

(ش و ظ)

اَلشُّوَاظُ: آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٍ﴾ (۵۵۔۳۵) آگ کے شعلے اور دھواں۔

(ش و ک)

اَلشَّوْكُ: کانٹا اور کبھی شَوْكٌ اور شِكَّةٌ کے لفظ سے اسلحہ اور شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ﴾ (۸۔۷) کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی ہتھیار) ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنگ کو بھی شَوْكٌ کہا جاتا ہے اور خاردار درخت کو شَجَرَةٌ شَاكَةٌ وَشَائِكَةٌ کہہ دیتے ہیں۔ شَاكَنِي الشَّوْكُ: مجھے کانٹا چبھ گیا شَوَّكَ الْفَرْخُ: چوزے نے کانٹے اور پر نکال کئے شَوَّكَ ثَدْيُ الْمَرْأَةِ: عورت کی چھاتی ابھر آئی۔ شَوَّكَ الْبَعِيْرُ: اونٹ کے انیاب کا لمبا اور کانٹے کی طرح تیز ہونا۔

(ش و ی)

شَوَيْتُ اللَّحْمَ وَاشْتَوَيْتُهُ کے معنیٰ گوشت بھوننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَشْوِي الْوُجُوْهَ﴾ (۱۸۔۲۹) ان کے چہروں کو جھلس دے گا۔

شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۲۷۱) فَاشْتَوٰى لَيْلَةَ رِيْحٍ وَاجْتَمَلَ

تو اس نے ٹھنڈی رات (یعنی قحط سالی) میں گوشت بھونا اور چربی پگھلا کر کھائی۔

اَلشَّوٰی: جسم کے اطراف، ہاتھ، پاؤں، وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو۔ محاورہ ہے: رَمَاهُ فَاَشْوَاهُ: اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا یعنی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے انسان مر جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی﴾ (۷۰۔۱۶) کھال ادھیڑ ڈالنے والی۔

---

[1] قاله لبيد اوله: اونهته فاتاه رزقه وقبله: وغلام ارسلته امه۔ بالوك فبذلنا ماسأل۔ وفي رواية واحتمل بالحاء بدل الجيم وقال في شواهد الكشاف ۱۰ ورواية الجيم انسب وافيد والبيت في تهذيب الالفاظ (٦١١) وديوانه ۳۹ والمعاني للقتبي ٤١٠ (ط، حيدرآباد ١٣٣٨).

اور اسی سے غیر اہم معاملہ کو بھی شَوٰی کہا جاتا ہے کیونکہ شَوٰی مَقْتَل: یعنی عضو رئیس نہیں ہوتا (جس پر زخم لگنے سے انسان مرجائے)

اَلشَّاۃُ: بھیڑ۔ یہ اصل میں شَاہَۃٌ ہے کیونکہ اس کی جمع شِیَاہٌ اور تصغیر شُوَیْھَۃٌ آتی ہے۔

(ش ی ء)

اَلشَّیْءُ: بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہوسکے اور اس کے متعلق خبری دی جاسکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے اور موجودات اور معدومات سب کو شی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ شی صرف موجود چیز کو کہتے ہیں یہ اصل میں شَاءَ کا مصدر ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق شے کا لفظ استعمال ہوتو یہ معنیٰ شَاءٍ یعنی اسم فاعل کے ہوتا ہے اور غیر اللہ پر بولا جائے تو مَشِیْءٌ (اسم مفعول) کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ پس آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۳۹۔۶۲) خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

میں لفظ شی چونکہ دوسرے معنیٰ (اسم مفعول) میں استعمال ہوا ہے اس لئے یہ عموم پر محمول ہوگا اور اس سے کسی قسم کا استثناء نہیں کیا جائے گا کیونکہ شی مصدر بمعنیٰ المفعول ہے مگر آیت کریمہ:

﴿قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً﴾ (۶۔۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔

میں شی اسم فاعل ہے اور اللہ تعالیٰ کو اَكْبَرُ شَهَادَةً کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت: ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (۲۳۔۱۴) (تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے) میں ذات باری تعالیٰ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ کہا گیا ہے۔

اَلْمَشِيْئَةُ: اکثر متکلمین کے نزدیک مشیت اور ارادہ ایک ہی صفت کے دو نام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے۔ (۱) مشیت کے اصل معنیٰ کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پالینے کے ہیں۔ اگرچہ عرف میں مشیت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے معنیٰ اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیت کے معنیٰ کسی چیز کو پالینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ (مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَاْ لَمْ يَكُنْ) کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (۴۰۔۳۱) اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عُسْرٌ اور ظلم پائے جاتے ہیں۔

(۲) مشیت اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہوسکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا

ہے لیکن مشیت انسانی مشیت الٰہی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (۸۱۔۲۹) اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر وہی جو خدائے رب العلمین چاہے۔

ایک روایت ہے کہ جب آیت:

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ (۸۱۔۲۸) یعنی اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔ نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کردیں اس پر آیت کریمہ:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہوسکتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۰۴) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پاؤ گے۔

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾ (۱۸۔۶۹) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

﴿يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ......﴾ (۱۱۔۳۳) اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کرے گا۔

﴿اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ (۱۲۔۹۹) مصر میں داخل ہوجایئے خدا نے چاہا تو.........

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ (۷۔۱۸۸) کہدو کہ میں اپنے فائدہ اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے: ﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ......﴾ (۷۔۹۸) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں)۔

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (۱۸۔۲۳) اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کردوں گا مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) خدا چاہے۔

(ش ی ب)

اَلشَّيْبُ وَالْمَشِيْبُ: بڑھاپا۔ بالوں کی سفیدی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور بڑھاپے سے سر شعلہ مارنے لگا۔

يَاتَتِ الْمَرْئَةُ بِلَيْلَةٍ شَيْبَاءَ: عورت نے شب زفاف گزاری۔ یعنی جس میں اس کی بکارت زائل کی گئی ہو اس کے برعکس بَاتَتِ الْمَرْئَةُ بِلَيْلَةٍ حَرَّةٍ: وہ رات جس میں اس کی بکارت زائل نہ کی گئی ہو۔

(ش ی ت)

شِيَةٌ: اصل میں وِشْيَةٌ ہے اس کی بحث باب الواو میں بیان ہوگی۔

(ش ی خ)

اَلشَّيْخُ کے معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہہ دیا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:

شَيْخٌ بَيِّنُ الشَّيْخُوخَةِ وَالشَّيْخِ وَلَتَيَشُّخِ یعنی وہ

بہت بڑا عالم ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿هٰذَا بَعْلِي شَيْخًا﴾ (۱۱۔۷۲) یہ میرے میاں (بھی) بوڑھے ہیں۔
﴿اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ﴾ (۲۸۔۲۳) ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔

(ش ی د)

اَلْمَشِيْدُ: (پلستر کیا ہوا، بلند) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے بلند محل ہیں۔تو مَشِيْدٌ کے معنی یا تو پلستر کی ہوئی عمارت کے ہیں اور یا مُطَوَّلٌ یعنی بلند کے ہیں۔اگرچہ یہ بھی مآل کے لحاظ سے پہلے معنی کی طرف راجع ہے محاورہ ہے: شَيَّدَ قَوَاعِدَهٗ: اس کی بنیادوں کو اسی طرح محکم بنایا جیسے گچ کی ہوئی ہوتی ہیں۔
اَلْاِشَادَةُ: (افعال) کے معنی بلند آواز سے شعر پڑھنا (یا گانا) کے ہیں۔

(ش ی ط)

اَلشَّيْطَانُ: اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔[1]

(ش ی ع)

اَلشِّيَاعُ: کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے ہیں۔کہا جاتا ہے:
شَاعَ الْقَوْمُ: قوم منتشر اور زیادہ ہوگئی۔
شَيَّعْتُ النَّارَ بِالْحَطَبِ: ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔
اَلشِّيْعَةُ: وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔اور وہ اس کے اردگرد پھیلے رہتے ہیں۔اسی سے بہادر کو مَشِيْعٌ کہا جاتا ہے۔
شِيْعَةٌ کی جمع شِيَعٌ وَاَشْيَاعٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ (۳۷۔۸۳) اور ان ہی یعنی نوح علیہ السلام کے پیروں میں ابراہیم علیہ السلام تھے۔
﴿هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۵) ایک تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا۔
﴿وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا﴾ (۲۸۔۴) وہاں کے باشندوں کو گروہ در گروہ کر رکھا تھا۔
﴿فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۱۵۔۱۰) پہلے لوگوں میں (بھی)۔
﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ﴾ (۵۴۔۱۵۱) اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

(ش ی ن)

شَأْنٌ: کے معنی حالت اور اس اتفاقی معاملہ کے ہیں جو کسی کے مناسب حال ہو اس کا اطلاق صرف اہم امور اور حالات پر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔
شَأْنُ الرَّأْسِ: کھوپری کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جس سے انسان کا قوام ہے اس کی جمع شُؤُوْنٌ آتی ہے۔

تمت الجزالاول

❀❀❀

---

[1] راجع (ش ط ن)۔